فَلْيَحْذَرِ الَّذِينَ يُخَالِفُونَ عَنْ أَمْرِهِ أَنْ تُصِيبَهُمْ فِتْنَةٌ أَوْ يُصِيبَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿٦٣﴾

توجولوگ اس کی حکم عدولی کرتے ہیں کسی فتنے کی لپیٹ میں
آنے یا مبتلائے عذابِ الیم ہونے سے بچیں۔ (النور: ٦٣)

حدیث کا شرعی مقام

22863
DATA ENTERED

ڈاکٹر سید سعید احسن عابدی

AL-FURQAN TRUST

الفرقان ٹرسٹ، خان گڑھ ضلع مظفر گڑھ، پاکستان

Marfat.com

فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖٓ اَنْ تُصِيْبَهُمْ فِتْنَةٌ اَوْ يُصِيْبَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ

تو جو لوگ اس کی حکم عدولی کرتے ہیں کسی فتنے کی لپیٹ میں
آنے یا مبتلائے عذابِ الیم ہونے سے بچیں۔ (النور: ٦٣)

حدیث کا شرعی مقام

ڈاکٹر سید سعید احسن عابدی

AL-FURQAN TRUST

الفرقان ٹرسٹ، خان گڑھ ضلع مظفر گڑھ، پاکستان

Marfat.com

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

ادارہ تمام کتب معاشرتی اصلاح وتربیت اور نیک نیتی سے شائع کرتا ہے، البتہ مصنف ومترجم کی آراء سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں، تاہم فنی وطباعتی خرابی کی صورت میں کتاب کسی بھی وقت تبدیل کی جاسکتی ہے۔ (ادارہ)

حدیث کا شرعی مقام

ڈاکٹر سید سعید احسن عابدی

١٢٧٩٨٦
جلد ٢

جلد دوم

AL-FURQAN TRUST

پاکستان

مکتبہ الکتاب: حق سٹریٹ، اردو بازار لاہور فون: 0321-4210145

سعودی عرب

دار العلوم الندیه للنشر والتوزیع
س ت: ١٠١٠٢٠٤٨٧٦
فرع: مرکز الجامع التجاری شارع باخشب جده
معرض: ٠٢٦٣٣٦٦٤٠ فاکس: ٠٢٦٨٧٤٥٥٧

المکتب الرئیسی الریاض، حي الفیصلة
هاتف: ٠١٢٤٢٣١٢٦

مکتبه دار الفرقان، الریاض
هاتف: ٠١-٤٣٥٨٦٤٦، ٠٥٦٣٠٦٤٧٣٦، ٠٥٠٧٤١٩٩٢١

مکتبه بیت السلام، الریاض
هاتف: ٠١-٤٤٦٠١٢٩، ٠٥٠٥٤٤٠١٤٧، ٠٥٠٢٠٣٣٢٦٠

Marfat.com

فہرست مضامین

باب پنجم......حدیث واحد اور حدیث متواتر

- سورۂ حجرات کی آیت کی تشریح ---------- ۲۷
- راویٔ عدل کی خبر تحقیق طلب نہیں ---------- ۲۷
- راوی فقیہہ اور غیر فقیہہ ---------- ۲۹
- نتیجہ بحث ---------- ۳۰
- خبر متواتر کا ہوّا ---------- ۳۱
- عقیدہ کے باب میں حدیث واحد کے دلیل ہونے کی مثال ---------- ۳۳
- حدیث کی تبلیغ کے لیے نبی ﷺ کا طریقہ تعلیم ---------- ۳۴
- حکومت الٰہیہ کے نمائندے ---------- ۳۵
- خبر واحد کے قابل اعتماد ہونے کی مثالیں ---------- ۳۷
- خبر کے عناصر ترکیبی ---------- ۳۷
- امام شافعی اور منکرین حدیث ---------- ۴۰
- حدیث واحد بعض قدیم وجدید منکرین کے نزدیک ---------- ۴۲
  - ۱۔ رازی کا نقطہ نظر ---------- ۴۳
  - ۲۔ غزالی کا نظریہ حدیث ---------- ۴۳
  - ۳۔ ڈاکٹر رمضان بوطی کی بڑ ---------- ۴۴
  - ۴۔ سیّد سلیمان ندوی کی تحقیق ---------- ۴۵
  - ۵۔ غامدی کی بڑ ---------- ۴۶
- دین کی عقیدہ وعمل میں تقسیم ---------- ۴۷
- علامہ ندوی کا دعویٰ اہل کلام کے دعویٰ کی صدائے بازگشت ہے ---------- ۴۸
- حدیث واحد کی ظنیت کا دعویٰ ---------- ۴۹
- ظن اور یقین کا مفہوم ---------- ۵۰
- یقین کے درجات ---------- ۵۲

Marfat.com

- روایت حدیث میں یقین کے درجات ---------- ۵۲
- اصلاحی کا مبلغ علم ---------- ۵۴
- حدیث واحد کی ظنیت پر غلط استدلال ---------- ۵۵
- حدیث واحد کی ظنیت پر استدلال ---------- ۵۶
- تبصرہ ---------- ۵۷
- روایت حدیث اور علم حدیث ---------- ۵۸
  - ۱۔ پہلی مثال ---------- ۵۹
  - ۲۔ دوسری مثال ---------- ۶۰
- نتیجہ ---------- ۶۲
- حدیث نبی کریم ﷺ کا اجتہاد ہے؟ ---------- ۶۳
- سلیمان ندوی کی بڑ ---------- ۶۴
- نبی ﷺ کے بعض علوم وحی پر مبنی ہیں ---------- ۶۴
- حدیث وحی ہے ---------- ۶۶
- مسک الختام ---------- ۶۹
- ایک اشکال اور اس کا جواب ---------- ۷۱
- نتیجہ بحث ---------- ۷۶
- وحی متلو اور وحی غیر متلو ---------- ۷۷
- وحی متلو ---------- ۷۷
- آپ کو عربی بھی نہیں آتی ---------- ۷۸
- اعظمی صاحب سے ایک سوال ---------- ۷۹
- قرآن وحدیث سے استدلال کا اصول ---------- ۸۰
- توسط یا واسطہ ---------- ۸۲
- اعظمی کا اصلی چہرہ ---------- ۹۰
- اعظمی کی غلط بیانی ---------- ۹۰
- شاہ ولی اللہ نے لکھا ہے ---------- ۹۲
- اعظمی کا خلط مبحث ---------- ۹۵

PANJAB UNIVERSITY LIBRARY

Marfat.com

✦ ایحاء، توصیہ اور انزال میں حقیقت کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں ---------- ۹۵

✦ نبوت ورسالت کی حقیقت ---------- ۹۷

✦ بصیرت نبوی ---------- ۱۰۰

✦ اعظمی صاحب سے سوال ---------- ۱۰۳

✦ حدیث بصیرت نہیں وحی ہے ---------- ۱۰۳

✦ نبی ﷺ صرف مفسر قرآن تھے؟ ---------- ۱۰۶

✦ شاطبی کی لغزش ---------- ۱۰۸

✦ قرآن کے اس مجمل بیان کی دو قسمیں ہیں ---------- ۱۱۲

✦ قرآن میں کل شیء کی تعبیر کا مفہوم ---------- ۱۱۲

✦ قرآنی تعلیمات رسول کے لیے ---------- ۱۱۵

✦ رسول اللہ ﷺ کے فرائض منصبی قرآن کی روشنی میں ---------- ۱۱۶

✦ اہل ایمان سے قرآن کا مطالبہ ---------- ۱۱۷

✦ نتیجہ بحث ---------- ۱۲۱

✦ سنت اور امام شافعی رحمہ اللہ ---------- ۱۲۲

✦ فتنہ کیا ہے؟ ---------- ۱۲۵

✦ اعظمی کی ہرزہ سرائیاں ---------- ۱۲۵

✦ کلام اور وحی ---------- ۱۲۶

✦ ہر وحی حقیقی تھی ---------- ۱۲۶

✦ فتنہ وہ نہیں یہ ہے ---------- ۱۲۸

باب ششم:...... حدیث واحد کے حجت ہونے کے دلائل

✦ امام شافعی رحمہ اللہ کی خدمات حدیث ---------- ۱۲۹

✧ ۱۔ پہلی دلیل، حدیث جساسۃ ---------- ۱۳۱

✧ ۲۔ دوسری دلیل، آغاز وحی کی حدیث ---------- ۱۳۵

✦ حدیث پر ایک نظر ---------- ۱۳۶

✦ سند کے راویوں کا مختصر تعارف ---------- ۱۳۷

✦ حدیث سے وجہ استدلال ---------- ۱۳۹

Marfat.com

✧ ٣۔ تیسری دلیل، نیت کی حدیث ---------- ١٣٩
✧ ٤۔ چوتھی دلیل، تحویل قبلہ کی حدیث ---------- ١٣٩
✦ حدیث پر ایک نظر ---------- ١٤٠
✦ حدیث کی تشریح ---------- ١٤١
✦ وجہ استدلال ---------- ١٤٢
✦ تحویل قبلہ اور تحریف قرآن ---------- ١٤٢
✦ ''ندوی تحویل قبلہ کی بحث'' کے تحت لکھتے ہیں ---------- ١٤٣
✦ شبیر احمد میرٹھی کی ہرزہ سرائیوں کا جواب ---------- ١٤٤
✦ ایک قابل غور نکتہ ---------- ١٤٥
✦ تحویل قبلہ کی روایات کی استنادی حیثیت ---------- ١٤٥
✦ رسول اللہ ﷺ امر الٰہی کے پابند تھے ---------- ١٤٦
✦ آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟ ---------- ١٤٦
✧ ٤۔ ولّٰی یُوَلِّی تَولیة کی لغوی تحقیق ---------- ١٤٦
ولّٰی یُوَلِّی تولیة ---------- ١٤٧
✦ لازم کی مثال ---------- ١٤٧
✦ متعدی کی مثال ---------- ١٤٧
✦ ولی یولی کے دوسرے معنی ---------- ١٤٧
✦ فعل لازم کی مثال ---------- ١٤٨
✦ فعل متعدی کی مثال ---------- ١٤٨
✦ ولی یولی کے تیسرے معنی ---------- ١٤٨
✦ ولی یولی کے چوتھے معنی ---------- ١٤٨
✦ قرآن عربی قواعد کی اصل ہے ---------- ١٥٠
✦ اصل قبلہ کعبہ ہی ہے ---------- ١٥١
✦ قدیم مسجدیں محراب سے خالی ہوتی تھیں ---------- ١٥١
✦ میرٹھی جنون العظمة کے مریض تھے ---------- ١٥٢
✧ ٥۔ پانچویں دلیل، تحریم خمر کی حدیث ---------- ١٥٢

Marfat.com

✦ وجہ استدلال ---------- ۱۵۳
✧ ۶۔ چھٹی دلیل، ہاتھ اور پاؤں کی انگلیوں کی دیت کی حدیث ---------- ۱۵۳
✦ حدیث کی اسنادی حیثیت ---------- ۱۵۴
✦ عمر رضی اللہ عنہ کی مقرر کردہ دیت ---------- ۱۵۴
✦ انگلیوں کی دیت میں فرق کی بنیاد ---------- ۱۵۴
✦ وجہ استدلال ---------- ۱۵۵
✦ ساتویں دلیل، شوہر کی دیت میں بیوی کے حصے کی حدیث ---------- ۱۵۵
✦ حدیث میں بیان کردہ واقعہ کی تفصیل ---------- ۱۵۵
✦ حدیث سے وجہ استدلال ---------- ۱۵۵
✦ امام شافعی کا قول مبنی بر حق ہے ---------- ۱۵۶
✦ آٹھویں دلیل، رحم مادر کے بچہ کی دیت کی حدیث ---------- ۱۵۶
✦ ضحاک اور حمل کی حدیثوں سے امام شافعی کا استدلال ---------- ۱۵۷
✦ نویں دلیل، طاعون زدہ بستی میں نہ جانے کی حدیث ---------- ۱۵۸
✦ دسویں دلیل، مجوسیوں سے جزیہ لینے کی حدیث ---------- ۱۵۸
✦ امام شافعی کا استدلال ---------- ۱۵۸
✦ ایک اعتراض اور اس کا جواب ---------- ۱۵۹
✦ قول مزید ---------- ۱۵۹
✦ گیارہویں دلیل، مدرسہ رسالت سے تحصیل علم کی حدیث ---------- ۱۶۰
✦ وجہ استدلال ---------- ۱۶۱
✦ بارہویں دلیل، بٹائی پر کھیتی کرنے کی حدیث ---------- ۱۶۱
✦ وجہ استدلال ---------- ۱۶۲
✦ بٹائی پر کھیتی کرنے کا حکم ---------- ۱۶۲
✦ تیرہویں دلیل، متوفی عنہا زوجہا کے اپنے شوہر کے گھر میں عدت گزارنے کی حدیث ---------- ۱۶۳
✦ وجہ استدلال ---------- ۱۶۳
✦ حدیث واحد سے متعلق ائمہ اسلام کا طرز عمل ---------- ۱۶۳
✦ ایک ضروری وضاحت ---------- ۱۶۴

Marfat.com

✦ جملۂ معترضہ ---------- ۱۶۶
✦ حدیث واحد کے شرعی حجت ہونے کے مسئلہ میں استثنائی حالت ---------- ۱۶۶
✦ راویان حدیث کی حیثیت عرفی ---------- ۱۶۶
✦ اصلاحی کا دعویٰ ---------- ۱۶۸
✦ راوی کی روایت اور سرکاری اہل کار کی خبر میں فرق ---------- ۱۶۹
✦ برنی دو قدم آگے ---------- ۱۷۰
✦ برنی سے ایک سوال ---------- ۱۷۰
✦ تبصرہ ---------- ۱۷۲
✦ صحابہ اور صحابیت اصلاحی کی نظر میں ---------- ۱۷۳
✦ اصلاحی کی بدحواسی ---------- ۱۷۴
✦ پہلی حدیث ---------- ۱۷۶
✦ حدیث کی سند ---------- ۱۷۶
✦ حدیث کا متن ---------- ۱۷۷
✦ دوسری حدیث ---------- ۱۷۷
✦ سعید بن مسیّب سے منسوب قول بھی ضعیف ہے ---------- ۱۷۸
✦ اصلاحی کی سعی مذموم ---------- ۱۷۸
✦ اصلاحی سے ایک مطالبہ ---------- ۱۷۹
✦ حدیث کی سند میں جھول ---------- ۱۸۱
✦ محدثین کی نظر صرف سند پر نہیں تھی ---------- ۱۸۲
✦ سند کا پہلا خلا ---------- ۱۸۴
✦ اصلاحی کی غلط بیانیاں ---------- ۱۸۴
✦ راویوں کی جرح وتعدیل تجرباتی ہے ---------- ۱۸۶
✦ سند کا دوسرا خلا ---------- ۱۸۸
✦ بس کی گانٹھ ---------- ۱۸۹
✦ جرح وتعدیل مشکل ہے ناممکن نہیں ---------- ۱۸۹
✦ بیت القصید ---------- ۱۹۱

Marfat.com

- انسان فرشتہ نہیں ہے تو شیطان بھی نہیں ہے ---------- ۱۹۱
- محدثین اور راویان حدیث عام آدمی نہیں تھے ---------- ۱۹۲
- جرح وتعدیل کے موضوع معلوم ہیں ---------- ۱۹۲
- جرح وتعدیل کی تعریف ---------- ۱۹۳
- مذکورہ بالا وضاحتوں کا خلاصہ ---------- ۱۹۳
- ثقہ اور عدل راوی کی تعریف ---------- ۱۹۴
- مجروح اور غیر ثقہ راوی کی تعریف ---------- ۱۹۴
- عدل راوی کے درجات ---------- ۱۹۵
- ضعیف اور غیر ثقہ کے درجات ---------- ۱۹۵
- نقاد رجال مردم شماری کے اہل کار نہیں تھے ---------- ۱۹۶
- محدثین عام آدمی نہیں تھے ---------- ۱۹۸
- جمہور علمائے رجال تعصب سے پاک تھے ---------- ۱۹۸
- علامہ کشمیری کی رائے ---------- ۲۰۱
- علامہ کشمیری سے سوال ---------- ۲۰۲
- مذکورہ جھوٹی روایت کی یہ سب سے عمدہ سند ہے ---------- ۲۰۴
- تافہمی بھی علم ---------- ۲۰۵
- حدیث کے ثبوت کے مسئلہ میں بخاری اور مسلم کے اختلاف کی حقیقت ---------- ۲۰۶
- حدیث صحیح کی تعریف ---------- ۲۰۷
- حدیث معنعن ---------- ۲۰۸
- تدلیس کی تعریف ---------- ۲۰۸
- حدیث معنعن کے قبول کے لیے بخاری کی شرط ---------- ۲۰۹
- امام مسلم رحمہ اللہ کے نزدیک حدیث "مُعنعن" کے قبول کی شرط ---------- ۲۰۹
- امام مسلم کے قول کی وضاحت ---------- ۲۱۰
- امام بخاری کی شرط ---------- ۲۱۰
- نتیجہ ---------- ۲۱۱
- برنی کا دوسرا جھوٹ ---------- ۲۱۲

Marfat.com

- ✦ مثالیں ---------- ۲۱۳
- ✦ وہی اپنے امام کی راگنی ---------- ۲۱۵
- ✦ عمر رضی اللہ عنہ کی سیرت کا ذکر بے محل ہے ---------- ۲۱۹
- ✦ عمر رضی اللہ عنہ سے منسوب اثر صحیح نہیں ہے ---------- ۲۲۱
- ✦ اثر عمری کا متن ---------- ۲۲۱
- ✦ اثر عمری سے وجہ استدلال ---------- ۲۲۲
- ✦ مولانا شبلی کی لغزش پا ---------- ۲۲۴
- ✦ راوی کی عدالت معلوم کرنا انسانی بس سے باہر نہیں ---------- ۲۲۶
- ✦ اہل بدعت سے حدیث روایت کرنے اور حدیث لینے میں فرق ---------- ۲۳۰
- ✦ حب علی یا بغض معاویہ؟ ---------- ۲۳۳
- ✦ شرم ان کو مگر نہیں آتی ---------- ۲۳۴
- ✦ بغدادی اور قرطبی نے حدیث کی سند پر کوئی تنقید نہیں کی ہے ---------- ۲۳۴
- ✦ قرآن وحدیث میں مبتدعین سے حدیث روایت کرنے کی ممانعت نہیں آئی ہے ---------- ۲۳۵
- ✦ حاصل کلام ---------- ۲۳۷
- ✦ حدیث کا مجموعی مزاج ---------- ۲۳۹
- ✦ سند کا چوتھا خلا ---------- ۲۳۹
- ✦ امام احمد کے قول کی استنادی حیثیت ---------- ۲۴۰
- ✦ امام احمد کا مسلک ---------- ۲۴۱
- ✦ حسن حدیث کی تعریف ---------- ۲۴۳
- ✦ حسن لذاتہ ---------- ۲۴۵
- ✦ حسن لغیرہ ---------- ۲۴۶
- ✦ تعدد طرق سے ہر ضعیف حدیث کا ضعف دور نہیں ہوتا ---------- ۲۴۷
- ✦ فضائل اعمال کے باب میں ضعیف حدیث پر عمل ---------- ۲۴۸
- ✦ ضعیف حدیث پر عمل کے بارے میں ابن العربی کا نقطۂ نظر ---------- ۲۴۹
- ✦ نووی کا نقطۂ نظر ---------- ۲۴۹
- ✦ حافظ ابن حجر کا کارنامہ ---------- ۲۵۰

Marfat.com

- وضاحت ---------- ۲۵۱
- نتیجہ بحث ---------- ۲۵۱
- روایت بالمعنیٰ کا ہوا ---------- ۲۵۲
- روایت بالمعنیٰ کے دعاوی ایک نظر میں ---------- ۲۵۳
- تبصرہ ---------- ۲۵۴
- پہلا دعویٰ ---------- ۲۵۴
- قرآن میں مترادفات کا استعمال ---------- ۲۵۴
- دوسرا دعویٰ ---------- ۲۵۵
- حاصل کلام ---------- ۲۵۷
- تیسرا دعویٰ ---------- ۲۵۷
- چوتھا دعویٰ ---------- ۲۵۸
- پانچواں دعویٰ ---------- ۲۵۸
- چھٹا دعویٰ ---------- ۲۵۸
- ساتواں دعویٰ ---------- ۲۵۸
- آٹھواں دعویٰ ---------- ۲۵۸
- آثار صحابہ ---------- ۲۶۰
- پہلا اثر ---------- ۲۶۰
- دوسرا اثر ---------- ۲۶۱
- تبصرہ ---------- ۲۶۲
- روایت بالمعنیٰ کی حقیقت ---------- ۲۶۲
- روایت بالمعنیٰ کی مثالیں ---------- ۲۶۴
- اللہ تعالیٰ کے دونوں ہاتھ داہنے ہیں ---------- ۲۶۵
- اس طویل بحث کا سبب ---------- ۲۶۶
- قرآن سے روایت بالمعنیٰ کی مثال ---------- ۲۶۶
- روایت بالمعنیٰ کی دوسری مثال ---------- ۲۶۷
- کذب علیؐ کے مترادفات ---------- ۲۶۸

Marfat.com

- ایک ضروری وضاحت ---------- ۲۶۸
- خلاصۂ بحث ---------- ۲۷۰
- نواں دعویٰ ---------- ۲۷۰
- دسواں دعویٰ ---------- ۲۷۰
- حدیث میں راوی کی تعریف ---------- ۲۷۰
- براء بن عازب کی حدیث سے استدلال بے محل ہے ---------- ۲۷۱
- حدیث کا متن ---------- ۲۷۲
- اصلاحی کی ہرزہ سرائی ---------- ۲۷۳
- آپ کی توجیہ صحیح نہیں ---------- ۲۷۳
- براء کی تعبیر قرآنی ہے ---------- ۲۷۳
- نبی ﷺ کی تنبیہ کی اصل وجہ ---------- ۲۷۳
- حدیث میں عیب جوئی کی ایک اور مثال ---------- ۲۷۵
- واقعہ کی غلط تصویر ---------- ۲۷۵
- ابوہریرہ کی حدیث ---------- ۲۷۶
- ام المومنین عائشہ کی حدیث ---------- ۲۷۷
- ام المومنین کی دوسری حدیث ---------- ۲۷۷
- مسلم کی روایت ---------- ۲۷۸
- پہلی حدیث ---------- ۲۷۸
- دوسری حدیث ---------- ۲۷۸
- تمام روایات ایک نظر میں ---------- ۲۷۹
- گیارھواں دعویٰ ---------- ۲۸۱
- جاوید احمد غامدی کی ہرزہ سرائیاں ---------- ۲۸۲
- دروغ گورا حافظہ نہ باشد ---------- ۲۸۳

باب ہفتم:......قرآن کے ساتھ حدیث کا تعلق

- قرآن کے ساتھ حدیث کے تعلق کی صورتیں ---------- ۲۸۶
- اصلاحی کی حدیث بیزاری کی بدترین مثال ---------- ۲۸۷

Marfat.com

- حدیث سے قرآن کے مشکل کی تفسیر کی دوسری مثال ---- ۲۸۷
- حدیث سے اعراض کیوں؟ ---- ۲۸۸
- قرآن کے ساتھ حدیث کے تعلق کی دوسری صورت ---- ۲۸۹
- قرآن کے ساتھ حدیث کے تعلق کی تیسری صورت ---- ۲۸۹
- قرآن وحدیث کے بیان میں فرق ---- ۲۹۰
- قرآن کے ساتھ حدیث کے تعلق کی چوتھی صورت ---- ۲۹۱
- احناف کے فقہی اصول شاہ ولی اللہ کی نظر میں ---- ۲۹۲
- حدیث پر ایک نظر ---- ۲۹۳
- ایک اشکال اور اس کا جواب ---- ۲۹۵
- شاہ ولی اللہ کی گرفت ---- ۲۹۵
- پہلی آیت ---- ۲۹۶
- دوسری آیت ---- ۲۹۶
- تیسری آیت ---- ۲۹۷
- دوسرا اصول، عام بھی خاص کی طرح قطعی ہے ---- ۲۹۸
- ''شرعی ہدیٰ'' ---- ۲۹۹
- حاصل کلام ---- ۲۹۹
- حدیث مصراۃ ---- ۲۹۹
- حدیث کی شرح ---- ۳۰۰
- احناف کا دعویٰ ---- ۳۰۰
- عبداللہ بن مسعود کی حدیث ---- ۳۰۰
- ایک لطیفہ ---- ۳۰۱
- اختیار سے مشروط بیع وشراء ---- ۳۰۱
- حدیث کی تشریح ---- ۳۰۲
- حدیث کا مطلب ---- ۳۰۲
- خرید وفروخت کے معاملے میں شرط لگانے کا اختیار ---- ۳۰۳
- شرط عائد کرنے کا اختیار ---- ۳۰۴

Marfat.com

- حدیث واحد سے قرآن پر اضافہ ---------- ۳۰۵
- غامدی کی یاوہ گوئیاں ---------- ۳۰۷
- غامدی کے دعاوی ایک نظری میں ---------- ۳۰۸
- قرآن کے کسی حکم کی تحدید و تخصیص کا مجاز کوئی نہیں ---------- ۳۰۹
- میزان اور فرقان کیا ہے؟ ---------- ۳۰۹
- البینات ---------- ۳۱۲
- نتیجہ ---------- ۳۱۲
- قرآن کی عدالت کے فیصلے ---------- ۳۱۴
  - ۱۔ پہلا فیصلہ ---------- ۳۱۶
  - ۲۔ دوسرا فیصلہ ---------- ۳۱۶
  - ۳۔ تیسرا فیصلہ ---------- ۳۱۷
  - ۴۔ چوتھا فیصلہ ---------- ۳۱۸
  - ۵۔ پانچواں فیصلہ ---------- ۳۱۹
  - ۶۔ چھٹا فیصلہ ---------- ۳۱۹
  - ۷۔ ساتواں فیصلہ ---------- ۳۲۰
- غامدی کا رسول ---------- ۳۲۰
- ہمارے رسول ---------- ۳۲۲
- سنت ابراہیمی کی روایت ---------- ۳۲۴
- ملت اور دین ---------- ۳۲۶
- حنیف کی لغوی تحقیق ---------- ۳۲۶
- دین کیا ہے؟ ---------- ۳۳۰
- غامدی کی سنت ---------- ۳۳۵
- بعثت سے پہلے عرب کھلی گمراہی میں مبتلا تھے ---------- ۳۳۶
- فطرت ماخذ شرع نہیں ہے ---------- ۳۳۸
- نزول قرآن کے وقت دین ابراہیم کا کوئی وجود نہیں تھا ---------- ۳۳۹
- اہل مکہ کے بعض مشرکانہ اعمال کی جھلکیاں ---------- ۳۴۰

Marfat.com

- دعوت حق اور اہل مکہ کا ردعمل ---------- ۳۴۲
- زمانہ فترت کے عقائد و اعمال ---------- ۳۴۲
- ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کا واقعہ ---------- ۳۴۵
- زید بن نفیل رضی اللہ عنہ کا واقعہ ---------- ۳۴۵
- معروف و منکر ---------- ۳۴۶
- معروف و منکر کیا ہے؟ ---------- ۳۴۸
- حدیث واحد سے قرآن پر اضافے کی مثالیں ---------- ۳۴۹
- پہلی مثال، اللہ تعالیٰ کا رات کے تیسرے پہر میں آسمانِ دنیا پر نزول ---------- ۳۴۹
- اللہ تعالیٰ کی ذاتی اور فعلی صفات ---------- ۳۵۰
- اللہ تعالیٰ کی فعلی صفات کا ذکر قرآن میں بھی آیا ہے ---------- ۳۵۱
- اللہ تعالیٰ کی حرکی فعلی صفات قرآن میں ---------- ۳۵۳
- لزوم مالا یلزم ---------- ۳۵۵
- متکلمین اہل سنت و جماعت نہیں ہیں ---------- ۳۵۷
  - ۱۔ تفویض ---------- ۳۵۸
  - ۲۔ تاویل ---------- ۳۶۰
  - ۳۔ نتیجہ اور انجام ---------- ۳۶۲
  - ۴۔ تعمیل اور تنفیذ ---------- ۳۶۲
  - ۵۔ ظاہر لفظ سے متبادر معنیٰ کے علاوہ کوئی اور معنیٰ مراد لینا ---------- ۳۶۳
- ایک جملۂ معترضہ ---------- ۳۶۴
- عرش ---------- ۳۶۵
- استوی علی العرش ---------- ۳۶۶
- چند ضروری وضاحتیں ---------- ۳۶۷
- تعطیل ---------- ۳۶۸
- تکییف ---------- ۳۶۸
- تمثیل ---------- ۳۶۹
- تشبیہ ---------- ۳۶۹

Marfat.com

- تجسیم ---------- ۳۷۰
- اہل سنت و جماعت کا عقیدہ ---------- ۳۷۱
- دوسری مثال، عیسیٰ علیہ السلام کا نزول ---------- ۳۷۱
- عیسیٰ علیہ السلام زندہ ہیں یا وفات پا گئے؟ ---------- ۳۷۲
- اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کو کس طرح بچایا؟ ---------- ۳۷۲
- اللہ تعالیٰ کی صفتِ مکر و کید ---------- ۳۷۴
- تَوَفّٰی یَتَوَفّٰی کی لغوی تحقیق ---------- ۳۷۴
- نزول عیسیٰ حدیث میں ---------- ۳۷۶
  - ۱۔ پہلی حدیث ---------- ۳۷۶
  - ۲۔ دوسری حدیث ---------- ۳۷۷
  - ۳۔ تیسری حدیث ---------- ۳۷۷
  - ۴۔ چوتھی حدیث ---------- ۳۷۸
  - ۵۔ پانچویں حدیث ---------- ۳۷۸
- نتیجہ بحث ---------- ۳۷۹
- ظہور مہدی ---------- ۳۷۹
- تیسری مثال اقامت نماز ---------- ۳۸۰
- چوتھی مثال پھوپھی اور بھتیجی اور خالہ اور بھانجی کو نکاح میں جمع کرنا ---------- ۳۸۱
- قرآن میں محرمات کا بیان ---------- ۳۸۱
- حدیث سے قرآن پر اضافہ ---------- ۳۸۲
- غامدی کی بڑ ---------- ۳۸۲
- نکاح میں پھوپھی اور بھتیجی اور خالہ اور بھانجی کو جمع کرنا قرآن کا بیان نہیں ہے ---------- ۳۸۲
- حدیث قرآن کا نسخ نہیں ہے ---------- ۳۸۲
- عجیب اتفاق ---------- ۳۸۳
- پانچویں مثال، حرام ماکولات ---------- ۳۸۳
- قرآن میں حرام ماکولات کا بیان ---------- ۳۸۳
- حدیث سے قرآن کے حرام ماکولات میں اضافہ ---------- ۳۸۴

Marfat.com

✦ ملت ابراہیمی کے حرام ماکولات ---------- ۳۸۴
✦ بیان شریعت یا بیان فطرت ---------- ۳۸۶
✦ فطرت کیا ہے؟ ---------- ۳۸۷
✦ فطرت کے مترادف ---------- ۳۸۷
✦ فطرت احکام وشرائع کی معرفت کا ذریعہ نہیں ---------- ۳۸۷
✦ فطرت شرعی احکام سے ہم آہنگ ہے ---------- ۳۸۸
✦ نبی بیان شریعت کا مکلف ہوتا ہے بیان فطرت کا نہیں ---------- ۳۸۹
✦ حدیث سے قرآن کا نسخ ---------- ۳۸۹
✦ انسانوں کی اکثریت کی لغت میں ممنوعات کا وجود نہیں ---------- ۳۹۰
✦ استدلال کا ایک انداز یہ بھی ---------- ۳۹۰

باب ہشتم:......حدیث اور فقہاء

✦ و شهد شاهد من أهلها ---------- ۳۹۱
✦ تحصیل حدیث کا مقصد مسلک حنفی کی تائید ---------- ۳۹۲
✦ احساسِ ندامت ---------- ۳۹۲
✦ علامہ کشمیری کا مبلغ علم ---------- ۳۹۳
✦ امام بقی بن مخلد ---------- ۳۹۴
✦ عذر گناہ بدتر از گناہ ---------- ۳۹۵
✦ ایک سوال ---------- ۳۹۶
✦ ایک قابل غور واقعہ ---------- ۳۹۷
✦ حدیث سے کشمیری کا تعلق ---------- ۳۹۸
✦ کشمیری کا عقیدہ ---------- ۳۹۸
✦ کشمیری کی بدعقیدگی کی ایک مثال ---------- ۴۰۰
✦ کشمیری کے دعاوی ---------- ۴۰۱
✦ تبصرہ ---------- ۴۰۱
✦ لطیفہ ---------- ۴۰۶
✦ حدیث اور کوثری ---------- ۴۰۷

Marfat.com

✦ کوثری کی غلط بیانیاں ---------- ۴۰۹
✦ تمہید ---------- ۴۰۹
✦ پہلی غلط بیانی ---------- ۴۱۰
✦ کوثری کی ہرزہ سرائیاں ---------- ۴۱۰
✦ تبصرہ ---------- ۴۱۰
✦ زیلعی کا سہو ---------- ۴۱۴
✦ صورت مسئلہ ---------- ۴۱۴
✦ صحیح حدیثوں کا انکار اور ضعیف حدیثوں سے استدلال ---------- ۴۱۵
✦ چوری کے جرم میں ہاتھ کاٹنے کی سزا ---------- ۴۱۶
✦ دس درہم کی حدیثوں کی استنادی حیثیت ---------- ۴۲۰
✧ ۱۔ پہلی حدیث ---------- ۴۲۰
✧ ۲۔ دوسری حدیث ---------- ۴۲۰
✧ ۳۔ تیسری حدیث ---------- ۴۲۱
✦ کوثری کا مسلک ---------- ۴۲۱
✦ تبصرہ ---------- ۴۲۲
✦ تمام حدیثوں میں تطبیق کا انوکھا انداز ---------- ۴۲۳
✦ کوثری کے عقائد ---------- ۴۲۴
✦ فقہاء کی نگاہوں میں قرآن و حدیث کا مقام و مرتبہ ---------- ۴۲۶
✦ ابوبکر احمد بن علی جصاص کی احکام القرآن ---------- ۴۲۷
✦ قرآن کو مسلک کا تابع بنانے کی مثال ---------- ۴۲۷
✦ دوسری حدیث ---------- ۴۲۹
✦ صحیح حدیث سے غلط استدلال ---------- ۴۳۰
✦ صحیح احادیث میں من مانی تبدیلی اور اضافہ ---------- ۴۳۱
✦ نماز میں امامت کا حق دار کون؟ ---------- ۴۳۱
✦ پہلی حدیث ---------- ۴۳۲
✦ دوسری حدیث ---------- ۴۳۳

Marfat.com

✦ تیسری حدیث ---------- ۴۳۳
✦ فرمان نبوی کی صریح مخالفت ---------- ۴۳۴
✦ ہدایہ میں امامت نماز کے لازمی اوصاف ---------- ۴۳۵
✦ تبصرہ ---------- ۴۳۶
✦ باطل روایت سے استدلال ---------- ۴۳۶
✦ ملا علی قاری کی غلط بیانی ---------- ۴۳۷
✦ امامت کے مزید من گھڑت اوصاف ---------- ۴۳۹
✦ تبصرہ ---------- ۴۴۱
✦ امامت کے نا اہل ---------- ۴۴۲
✧ ۱۔ غلام کی امامت ---------- ۴۴۳
✧ ۲۔ نابینا کی امامت ---------- ۴۴۴
غیر معتبر روایت سے استدلال ---------- ۴۴۵
✧ ۳۔ نابالغ لڑکے کی امامت ---------- ۴۴۶
✦ تبصرہ ---------- ۴۴۶
✦ جائز اور ناجائز اور مکروہ شرعی اصطلاحیں ہیں ---------- ۴۴۶
✦ بے اصل روایت سے استدلال ---------- ۴۴۶
✧ ۱۔ پہلی حدیث ---------- ۴۴۷
✧ ۲۔ دوسری حدیث ---------- ۴۴۸
✧ ۳۔ تیسری حدیث ---------- ۴۴۸
✧ ۴۔ چوتھی حدیث ---------- ۴۴۹
✦ جمعہ کی نماز فجر میں سورۂ سجدہ اور سورۂ دہر کی تلاوت ---------- ۴۵۰
✧ ۱۔ پہلی حدیث ---------- ۴۵۰
✧ ۲۔ دوسری حدیث ---------- ۴۵۱
✧ ۳۔ تیسری حدیث ---------- ۴۵۱
✧ ۴۔ چوتھی حدیث ---------- ۴۵۱
✦ مستحب نہیں سنت ---------- ۴۵۲

Marfat.com

- صاحب ہدایہ کی مذموم جسارت ---------- ۴۵۲
- قرآنی آیات اور سورتوں میں درجات ---------- ۴۵۳
- جہالت دلیل نہیں ہے ---------- ۴۵۴
- مولانا عبدالحی لکھنوی کا مسلک ---------- ۴۵۴
- نتیجۂ بحث ---------- ۴۵۵

باب نہم:......حدیث اور صوفیا

- مقام عبرت ---------- ۴۵۸
- صوفی کا پیر اللہ کا پرتو ہے ---------- ۴۵۸
- ولایت کا ہوّا ---------- ۴۵۹
- راہِ ہدایت صرف ایک ہے ---------- ۴۶۰
- مطلوبِ مومن راہ ---------- ۴۶۰
- تصوف طریق نبوت نہیں ہے ---------- ۴۶۱
- صوفی ولی نہیں ہوسکتا ---------- ۴۶۱
- تزکیۂ نفس صرف طریقۂ نبوی کے ذریعہ ممکن ہے ---------- ۴۶۱
- شرفِ صحابیت اور اتباعِ رسول ---------- ۴۶۱
- رائپوری کے مغالطے ---------- ۴۶۲
- تبصرہ ---------- ۴۶۳
- ایک سوال ---------- ۴۶۷
- مشائخ کون ہیں؟ ---------- ۴۶۷
- صوفیا اہل سنت و جماعت نہیں ہیں ---------- ۴۶۷
- خضر اور ولی کی ملاقات کا ایک جھوٹا واقعہ ---------- ۴۶۹
- دروغ گورا حافظہ نہ باشد ---------- ۴۷۱
- حدیث کا نور ---------- ۴۷۱
- متکلمین اہل سنت و جماعت نہیں ہیں ---------- ۴۷۴
- مولانا زکریا کا رسوخ فی العلم ---------- ۴۷۷

Marfat.com

✦ تبصرہ ---------- ۴۷۸
✦ مولانا زکریا کے مغالطے ---------- ۴۷۹
✦ اسلام میں دین داری کا معیار ---------- ۴۷۹
✦ نمونۂ عمل صرف سیرت پاک ہے ---------- ۴۸۰
✦ سنت سے اعراض کرنے والے کا آپ سے کوئی تعلق نہیں ---------- ۴۸۰
✧ ۱۔ پہلی قسم (توحید الوہیت یا عوام کی توحید) ---------- ۴۸۳
✦ ہروی کی لغزش ---------- ۴۸۴
✧ ۲۔ توحید کی دوسری قسم ---------- ۴۸۵
✦ توحید کی دوسری قسم کے مآخذ ---------- ۴۸۶
✦ خلاصۂ کلام ---------- ۴۸۷
✦ قرآن میں اسباب و ذرائع کا اثبات ---------- ۴۸۸
✦ صحیح مسلک ---------- ۴۸۹
✧ ۳۔ تیسری توحید ---------- ۴۹۰
✦ ایک ضروری وضاحت ---------- ۴۹۳
✦ صوفیا کی توحید اہل شرک اور کفر کی توحید ہے ---------- ۴۹۴
✦ صوفیا کے بعض عقائد کا بیان ---------- ۴۹۵
✦ فنا و بقا ---------- ۴۹۶
✦ فنا و بقا کا عملی طریقہ ---------- ۴۹۸
✦ تبصرہ ---------- ۴۹۸
✦ فنا و بقا کی مقبول صورت ---------- ۴۹۹
✦ صحیح نقطۂ نظر ---------- ۵۰۱
✦ جمع ---------- ۵۰۱
✦ مقام جمع پر قرآن سے استدلال ---------- ۵۰۳
✦ آیت سے غلط استدلال ---------- ۵۰۴
✦ ایک ضروری وضاحت ---------- ۵۰۵
✦ ایک اعتراض ---------- ۵۰۵

Marfat.com

✦ تصوف اور اس کی اصطلاحات اسلام میں اجنبی ہیں ---------- ۵۰۷
✦ حلولی اور وحدۃ الوجود ---------- ۵۰۷
✦ وحدۃ الوجود پر سرہندی کی تنقید ---------- ۵۰۹
✦ وحدۃ الوجود کے آثار بد ---------- ۵۱۰
✦ تھانوی کے مغالطے ---------- ۵۱۰
✦ قول فیصل ---------- ۵۱۱
✦ کائنات کا وجود ظلی نہیں ہے ---------- ۵۱۱
✦ کلمۂ توحید سے وحدۃ الوجود پر استدلال ---------- ۵۱۲
✦ وحدۃ الوجود کی ایک مثال ---------- ۵۱۴
✦ پیر پرستی ---------- ۵۱۵
✦ تبصرہ ---------- ۵۱۸
✦ کرامات الاولیا حق ہیں، مگر...... ---------- ۵۲۰
✦ صوفی اللہ کا ولی نہیں ---------- ۵۲۲
✦ صوفیا کو انبیاء سے تشبیہ دینا کفر ہے ---------- ۵۲۲
✦ رسول اور غیر رسول کے درمیان موازنہ کرنا حرام ہے ---------- ۵۲۳
✦ اتباع سنت سے سب سے زیادہ دور صوفیا ہیں ---------- ۵۲۳
✦ حاجی امداد اللہ کی جسارت ---------- ۵۲۴
✦ تبصرہ ---------- ۵۲۴
✦ غوث صرف اللہ تعالیٰ ہے ---------- ۵۲۵
✦ مقام عروج ونزول ---------- ۵۲۶
✦ صوفیا کو رسولوں سے تشبیہ دینے کی ایک اور مثال ---------- ۵۲۹
✦ تبصرہ، معراج نبی ﷺ ---------- ۵۲۹
✦ امداد اللہ کی تحریفات قرآنی ---------- ۵۳۰
✦ توضیح اور تبصرہ ---------- ۵۳۱
✦ امداد اللہ کی تحریف قرآنی کی دوسری مثال ---------- ۵۳۴
✦ الفاظ و معانی کا باہمی تعلق ---------- ۵۳۵

۱۲۷۹۸۶

Marfat.com

✦ تقلید پر قرآن سے غلط استدلال ---------- ۵۳۶
✦ تصورِ شیخ، شیخ کا مقام و مرتبہ ---------- ۵۳۸
✦ روایت بالمعنی ---------- ۵۴۰
✦ باطل کی ہمنوائی باطل ہے ---------- ۵۴۰
✦ حدیث کشفی ---------- ۵۴۱
✦ خواب ماخذ شرع نہیں ہے ---------- ۵۴۸
✦ جھوٹی روایتوں کی تصحیح کا ایک اور انداز ---------- ۵۵۱
✦ شیخ عالم کا ہم معنی نہیں ہے ---------- ۵۵۲
✦ تصور شخص کا تعارف ---------- ۵۵۲
✦ ایک سوال ---------- ۵۵۴
✦ تصورِ شیخ بت پرستی ہے ---------- ۵۵۶
✦ تبصرہ ---------- ۵۵۸
✦ مولانا مدنی کی غلط بیانی ---------- ۵۶۰
✦ صوفیا کے اکابر تنقید سے بالاتر ہیں ---------- ۵۶۴
✦ ایک مثال ---------- ۵۶۴
✦ ایک غلط توجیہ ---------- ۵۶۵
✦ سلطان المشائخ نہیں پیر کا بندہ ---------- ۵۶۶
✦ سیرت پاک کا ایک تابناک واقعہ ---------- ۵۶۷
✦ وجہ استدلال ---------- ۵۶۸
✦ ذکر ایک معشوق الٰہی کا ---------- ۵۶۹
✦ اہل حق سے عداوت و دشمنی ---------- ۵۷۱
✧ ۱۔ پہلا واقعہ ---------- ۵۷۱
✦ تبصرہ ---------- ۵۷۴
✧ ۲۔ دوسرا واقعہ ---------- ۵۷۵
✦ بالآخر وہ گھڑی آن پہنچی ---------- ۵۷۷
✦ مولانا آزاد کی حق گوئی ---------- ۵۷۸

Marfat.com

✦ فتنہ پرداز کون تھے؟ ---------- ۵۷۸
✦ فتنہ کا سبب کیا تھا؟ ---------- ۵۸۱
✦ ان واقعات کے ذکر کا مقصد؟ ---------- ۵۸۳

قبر پرستی

✦ حدیث کی وضاحت ---------- ۵۸۵
✦ قبروں کو مسجد بنانے کا مفہوم ---------- ۵۸۶
✦ قبروں پر مسجد تعمیر کرنا بدترین شرک ہے ---------- ۵۸۷
✦ اہل کتاب کے صلحا کی قبروں اور صوفیا کی قبروں میں فرق ---------- ۵۸۸
✦ نماز میں قبر کو قبلہ بنانا حرام ہے ---------- ۵۸۹
✦ قبروں کی زیارت صرف جائز ہے ---------- ۵۸۹
✦ زیارت قبور کا مقصد اصحاب قبور کی تعظیم نہیں ہے ---------- ۵۹۱
✦ رسول اللہ ﷺ نے اپنی قبر مبارک کی زیارت کا حکم نہیں دیا ہے ---------- ۵۹۲
✦ دعائے رسول ﷺ اے اللہ! میری قبر کو بت نہ بننے دیجیو! ---------- ۵۹۳
✦ قبر مبارک کے پاس میلہ لگانا منع ہے ---------- ۵۹۴
✦ قبر مبارک کی ترغیب دلانے والی روایتوں کی حقیقت ---------- ۵۹۶
✦ صحابہ اور تابعین کا طرزِ عمل ---------- ۵۹۸
✦ صوفیا کے دلائل ---------- ۶۰۰
✦ مقام عبرت ---------- ۶۰۲

Marfat.com

باب پنجم:

حدیث واحد اور حدیث متواتر

میں نے کتابوں میں متداول تعبیر، خبر واحد اور خبر متواتر کے بجائے حدیث واحد اور حدیث متواتر کی تعبیر دو وجوں سے اختیار کی ہے:

(۱) نبی کریم ﷺ کے قول، فعل اور تقریر کا نام حدیث یا سنت ہی ہے۔ ❶

(۲) خبر حدیث کی صرف ایک صفت کو بیان کرتی ہے۔ یعنی اس کی روایت اور تبلیغ: یعنی یہ حدیث کے ہم معنی نہیں ہے۔

اسی وجہ سے جمہور محدثین اور فقہاء رسول اللہ ﷺ کے قول، فعل اور تقریر کے لیے حدیث یا سنت کی تعبیر ہی اختیار کرتے رہے ہیں اور یہ دونوں نام احادیث میں آئے بھی ہیں جیسا کہ مذکورہ بالا حوالوں سے معلوم ہوتا ہے۔

اللہ ورسول نے حدیث کے ماخذ شریعت ہونے کے اعتبار سے حدیث واحد اور حدیث متواتر میں کوئی تفریق نہیں کی ہے۔

دراصل حدیث کے ماخذ شریعت یا شرعی دلیل ہونے کے اعتبار سے قرآن وحدیث میں حدیث واحد اور حدیث متواتر کی اصطلاح استعمال ہی نہیں ہوئی ہے۔ ان میں تفریق تو دور کی بات ہے۔ یہ اپج تو معتزلہ کی ہے، پھر متکلمین نے یہی راگ الاپ کر اسے عقیدہ بنا دیا جس کو ان کے نقش قدم پر چلنے والے فقہاء اور ترقی پسند ادباء اور مصنفین نے ایک مسلمہ قاعدہ قرار دے دیا۔ انکار حدیث کی تاریخ کے مطالعہ سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ حدیث واحد اور حدیث متواتر میں تفریق کو تمام احادیث کے انکار کے حربے کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ سوائے چند ایسی حدیثوں کے جن سے بظاہر ان منکرین کے افکار کی تائید ہوتی ہے اور ان میں ایسی حدیثیں زیادہ ہیں جن کی نسبت نبی کریم ﷺ سے ثابت نہیں ہے۔

حدیث کی صحت جانچنے کا قرآنی قاعدہ:

﴿يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِنْ جَآئَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْا اَنْ تُصِيْبُوْا قَوْمًۢا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوْا عَلٰى مَا فَعَلْتُمْ نَادِمِيْنَ﴾ (الحجرات: ٦)

”اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو اگر کوئی فاسق تمہارے پاس کوئی خبر لائے تو تحقیق کرلو، ایسا نہ ہو کہ تم نادانی

❶ صحیح مسلم، ۱، ۱۶۔۱۷، ترمذی: ۲۶۶۴۔ ابوداود: ۴۶۰۴۔ ابن ماجہ ۱۲۔ مسند احمد ۱۷۳۲۶

Marfat.com

میں کسی قوم کو نقصان پہنچا دو، پھر اپنے کیے پر پشیمان ہو۔"

اس نہایت چھوٹی اور مختصر سی آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے راویان خبر کی جرح وتعدیل کا پورا قاعدہ بیان فرما دیا ہے اور کسی خبر کی صحت وسقم کو جانچنے کا اصول بتا دیا ہے۔ آیت میں مذکور "نبأ" (خبر) کا تعلق نبی کریم ﷺ کے ارشادات، افعال، سیرت پاک کے واقعات اور غزوات کی تفصیلات بیان کرنے سے بھی ہوسکتا ہے اور خود مسلمانوں اور ان کے درمیان پائے جانے والے غیر مسلموں کی نقل وحرکت اور اعمال سے بھی۔

آیت میں "تبینوا" تبین یتبین سے جمع مذکر کے امر کا صیغہ ہے یہ فعل بڑی وسعت رکھتا ہے جس کا اندازہ اس کے کثیر مترادفات سے کیا جا سکتا ہے مثال کے طور پر "تبینوا" کے مترادفات ہیں: "تثبتوا، تأکدوا، تحققوا، توثقوا اور تیقنوا"

ارشاد الٰہی میں "فاسق" سے مراد ایسا شخص نہیں ہے جو مسلمان نہ ہو، بلکہ ایسا مسلمان مراد ہے جو عدالت کی صفت سے عاری ہو؛ محدثین نے "عدل" راوی کے اوصاف اس آیت کی روشنی میں بیان کیے ہیں۔ میں محدثین کے "عدل" کے اوصاف بیان کر دیتا ہوں۔ تاکہ فاسق کی صحیح تصویر پر سامنے آجائے جو عدل کی ضد ہے۔

"عَدْلٌ" عَدُلَ یعدُلُ کا مصدر ہے جو صفت کے معنی میں ہے عربی میں مبالغہ کا مفہوم ادا کرنے کے لیے کبھی کبھار مصدر کو صفت کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔

عدُل یعدُلُ کرُم یکرُم کے باب سے ہے اس باب سے آنے والے افعال "لازم" ہوتے ہیں جو انسان کی طبعی اور فطری خصلتوں پر دلالت کرتے ہیں اس تناظر میں علمائے حدیث "عَدْل" اس راوی کو کہتے ہیں جو ایسے پاکیزہ نفسیاتی خصائل، اوصاف حمیدہ اور سیرت وکردار کی ایسی بلندی سے موصوف ہو جو اس کو تقویٰ کا پابند بنائے رکھے اور اس کو انسانیت سے گری ہوئی حرکتوں اور لوگوں کے ساتھ معاملات اور بات چیت اور حدیث رسول کی روایت ونقل میں دروغ گوئی اور کذب بیانی جیسی مذموم صفت سے باز رکھے۔

محدثین کی قبروں کو اللہ تعالیٰ قیامت تک روشن رکھے اور ان پر اپنی رحمتیں نازل فرماتا رہے کہ انہوں نے راویان حدیث کی عدالت میں کثرت صوم وصلوٰۃ اور روحانی ریاضتوں اور اوراد وازکار کے بکثرت ورد کو شمار نہیں کیا ہے، کیونکہ صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کے بعد ان صفات میں جن بزرگوں کو شہرت حاصل ہوئی ان کی اکثریت روایت حدیث میں کذب بیانی سے موصوف تھی۔

علمائے حدیث نے رسول اللہ ﷺ کی حدیث اور سنت کی عظمت واہمیت اور اس کے ماخذ شریعت ہونے کی وجہ سے راویان حدیث کی ثقاہت کے لیے "عدالت" کے ساتھ ضبط سینہ اور ضبط سفینہ سے موصوف ہونا بھی لازمی قرار دیا ہے۔ جس کا مفہوم یہ ہے کہ راوی حدیث "عدل" ہونے کے ساتھ عمدہ اور قوی حافظہ کا مالک ہو اور اگر حافظہ مطلوبہ معیار

Marfat.com

کا نہ پایا ہو تو اپنی مسموعات کو نہایت درجہ احتیاط اور بیدار مغزی کے ساتھ ضبط تحریر میں لاتا رہا ہو اور ان کو کسی غلط ہاتھ میں پڑنے سے بچاتا رہا ہو۔ محدثین نے ایسا اس لیے کیا ہے کیونکہ راوی میں ''ضبط'' کے فقدان سے اس کی عدالت بھی متاثر ہو جاتی ہے اور حدیث محفوظ طریقے سے دوسروں تک نہیں پہنچتی۔ اس طرح ضبط کی صفت ''عدالتِ راوی'' کی تکمیلی صفت قرار پائی۔

یہ ہے اس راوی حدیث کی مختصر مگر جامع تصویر جس کو محدثین نے ''ثقہ'' قرار دیا ہے، یاد رہے کہ جس طرح ہر اچھی اور بری صفت میں درجات ہوتے ہیں، اسی طرح راویان حدیث کی عدالت اور ضبط میں بھی درجات ہوتے ہیں اور اس کی روشنی میں علوم الحدیث کی کتابوں میں حدیث کے راویوں کی جرح وتعدیل کے مراتب اور درجات بیان کیے گئے ہیں اور یہ بھی اجتہاد یا ظن وگمان سے نہیں، بلکہ مشاہدات اور تجربات کی روشنی میں۔

سورۂ حجرات کی آیت کی تشریح:

اللہ تعالیٰ نے سورۂ حجرات کی زیر بحث آیت کا آغاز ﴿یاأیھا الذین اٰمنوا﴾ سے کیا ہے، اور جب کوئی حکم بیان کرنے سے قبل کلام کا آغاز ''حرف نداء'' سے کیا جائے تو مقصد اس حکم کی اہمیت بیان کرنا ہوتا ہے۔ پھر منادی کو صفت ایمان سے موصوف کرنا اس بات پر دلیل ہوتا ہے کہ اس حکم کی تعمیل کرنا مقتضائے ایمان ہے اس تناظر میں فاسق کی دی ہوئی خبر کی تحقیق وتدقیق مقتضائے ایمان ہونے کی وجہ سے فرض ہے۔ فاسق ''عدالت'' کی صفت سے عاری ہونے کی وجہ سے ثقہ نہیں ضعیف راوی ہے، بایں ہمہ اللہ تعالیٰ نے اس کی دی ہوئی خبر کو رد کر دینے کا حکم دینے کے بجائے تحقیق کرنے کا حکم دیا ہے۔ اسی وجہ سے مشاہیر محدثین نے بعض ایسے راویوں سے حدیثیں روایت کی ہیں جو مجموعی اعتبار سے تھے تو ضعیف، لیکن ان محدثین کی تحقیق کی رو سے وہ حدیثیں صحیح ہیں جو انہوں نے ان سے روایت کی ہیں، لیکن اس کے لیے جو فہم، جو تحقیق اور جو وسیع اطلاع درکار تھی اس سے ہر کوئی بہرہ ور نہیں تھا۔

راویٔ عدل کی خبر تحقیق طلب نہیں:

اللہ تعالیٰ نے فاسق کی خبر کی تحقیق کرنے کا حکم دے کر یہ حکم بھی دے دیا کہ عدالت کی صفت سے موصوف راوی کی خبر کی تحقیق نہ کی جائے، ورنہ فاسق کا ذکر بے معنی ہو جائے گا جس سے کلام الٰہی پاک ہے، اس طرح وہ مسند حدیث جس کی سند کی تمام کڑیاں باہم متصل ہوں نیچے سے اوپر تک ہر راوی عدالت سے موصوف ہو، نہایت قوی اور قابل اعتماد حافظہ کا مالک ہو اور حدیث نہ شاذ ہو اور نہ معلول وہ لازماً صحیح ہے اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد کے مطابق کسی تحقیق وتدقیق کی محتاج نہیں ہے، اور اس کی صحت کو نشانہ بنانا ارشاد الٰہی پر اعتراض کرنا ہے!!!

امام ابوعبداللہ محمد بن احمد قرطبی اشعری متکلم اور صوفی ہونے کے باوجود فرماتے ہیں:

((فی ھذہ الآیۃ دلیل علی قبول خبر الواحد إذا کان عدلاً، لأنہ إنما أمر فیھا

Marfat.com

بالتثبت عند نقل خبر الفاسق .))

اس آیت میں ایک شخص کی خبر کو قبول کر لینے کی دلیل موجود ہے اگر وہ عدل ہو، اس لیے کہ اس میں صرف فاسق کی خبر نقل کرنے کے موقع پر تحقیق سے کام لینے اور غور وفکر کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ ❶

اس زیر بحث آیت مبارکہ سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اصل شرعی دلیل خبر واحد ہے۔ اور میرے ایک مضمون پر جس میں میں نے عرض کیا تھا کہ: صرف فاسق کی دی ہوئی خبر تحقیق طلب ہے، کسی ثقہ اور عدل کی دی ہوئی خبر نہیں، قطع نظر اس کے کہ خبر دینے والا ایک ہے یا متعدد افراد، اعتراض کرتے ہوئے مکتبۂ اصلاحی کے وکیل ڈاکٹر افتخار برنی نے جو یہ فرمایا تھا: اس آیت میں خبر کی تحقیق پر یقیناً زور دیا گیا ہے۔ مگر حدیث کے راویوں کی تعداد کی اہمیت سے انکار نہیں کیا گیا ہے۔ ❷

تو یہ اعتراض بیمار ذہنیت کی پیداوار ہے، موصوف نے اس مختصر سی عبارت میں قصداً کئی غلطیاں کی ہیں: اولاً تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں صرف فاسق کی دی ہوئی خبر کی تحقیق کا 'حکم' دیا ہے، تحقیق پر زور نہیں دیا ہے؛ حکم اور ''زور'' میں زمین وآسمان کا فرق ہے، زور میں صرف تاکید ہے، جبکہ حکم واجب التعمیل ہے۔

ثانیاً جس خبر کا دینے والا ایک ہو، وہی خبر دینے والے ایک سے زیادہ بھی ہو سکتے ہیں آیت میں اس امکان کی نفی کی گئی ہے، رہا یہ دعویٰ کہ آیت میں ''حدیث کے راویوں کی تعداد کی اہمیت سے انکار نہیں کیا گیا ہے'' مردود اور قرآن میں اپنی رائے سے اضافہ کرنا ہے۔ اس لیے کہ اگر حدیث کی صحت وسقم میں راویوں کی کثرت وقلت کا اثر ہوتا تو اللہ ''علّام الغیوب'' نے اسے واضح کر دیا ہوتا اور اتنی اہم بات کو ایک ایسے شخص کے فہم واجتہاد پر نہ چھوڑ دیا ہوتا جو قرآن وحدیث کے ایک چھوٹے سے جملے کا ترجمہ بھی نہیں کر سکتا۔ میری اس بات کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کی طویل ترین آیت میں ''دلین دین'' کے احکام بیان کرتے ہوئے دو مردوں کو گواہ بنانے کا بھی حکم دیا ہے اور اس ''دو'' کی اہمیت واضح کرتے ہوئے فرمایا ہے: اگر دو مرد نہ ہوں تو اپنی پسند کے لوگوں میں سے ایک مرد اور دو عورتوں کو گواہ بنا لو۔'' (سورۃ بقرہ: ۲۸۲)

معلوم ہوا کہ سورۂ حجرات کی آیت مبارکہ میں خبر دینے والوں یا روایت کرنے والوں کی تعداد سے صراحتاً یا ضمناً بحث ہی نہیں کی گئی ہے، بلکہ صرف ان کی عدالت بیان کی گئی ہے، اور وہ بھی اس طرح کہ صرف اس شخص کی دی ہوئی خبر کو قبول کر لینے کے بجائے یا قبول کر لینے سے پہلے اس کی صحت یا عدم صحت کی تحقیق کر لینے کا حکم دیا گیا ہے جو عدالت سے موصوف نہ ہو جس سے یہ لازمی قرار پایا کہ جو شخص عدالت سے موصوف ہو اس کی دی ہوئی خبر تحقیق کے بغیر واجب

---

❶ الجامع لأحکام القرآن، ص: ۲۲۴ ج ۸

❷ روشنی، ۱۹ اکتوبر ۲۰۰۹ء

Marfat.com

التصدیق اور واجب القبول ہے۔ ایسا اس لیے ہے کہ ''عدل'' فاسق کی ضد ہے اور جب فاسق کی دی ہوئی خبر تحقیق طلب ہے تو ''عدل'' کی خبر لازماً تحقیق طلب نہیں ہے۔

میں نے ابھی جو کچھ عرض کیا ہے اس کو قرآن پاک ہی کی ایک آیت سے سمجھئے جس میں اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی ہے کہ آخرت میں کفار اس کی رویت اور دید سے محروم ہوں گے اس سے یہ لازمی نتیجہ نکلا کہ مومنین اللہ تعالیٰ کی رویت اور دید سے سرفراز ہوں گے، کیونکہ آخرت دار الجزاء ہے، ارشاد الٰہی ہے:

﴿كَلَّا إِنَّهُمْ عَن رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوبُونَ﴾ (المطففين: ١٥)

''ہرگز نہیں، یقیناً وہ اس دن اپنے رب سے حجاب میں ہوں گے''

حقیقت یہ ہے کہ قرآن یا حدیث میں کسی خبر کی صحت وسقم یا قبول ورد سے متعلق تعدد رواۃ کی طرف اشارہ تک نہیں کیا گیا ہے، اس کے برعکس خبر واحد یا حدیث واحد کے شرعی دلیل وحجت ہونے کی مثالوں سے قرآن اور ارشادات رسول اللہ ﷺ بھرے پڑے ہیں، جن میں سے بعض کا ذکر ان شاء اللہ آگے کروں گا۔

راوی فقیہہ اور غیر فقیہہ:

جس طرح کسی حدیث کے شرعی دلیل وحجت ہونے کے لیے تعدد رواۃ کی شرط باطل اور من گھڑت ہے اسی طرح کسی روایت کو قبول کرنے کے لیے اس کے راوی کے فقیہہ ہونے کی شرط بھی اللہ ورسول کے حکم کے خلاف چیلنج ہے اس شرط کا سورۂ حجرات کی زیر استدلال آیت یا کسی اور آیت میں کوئی ذکر نہیں ہے اور نہ نبی کریم ﷺ کی کسی صحیح حدیث میں راوی کے فقیہہ ہونے کو ضروری قرار دیا گیا ہے، بلکہ اس کے برعکس حدیث میں راویوں کے غیر فقیہہ ہونے کی بھی خبر دی گئی ہے اور یہ بھی ان کی مدح کے ضمن میں نہ کہ مذمت کے ضمن میں، چنانچہ عبدالرحمٰن بن مسعود اپنے والد عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہوئے بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

((نضر الله امرأً سمع مقالتي فوعاها، وحفظها، وبلغها، فرب حامل فقه إلى من هو أفقه منه.))

''اللہ اس آدمی کو خوش وخرم رکھے جس نے میری بات سنی، اس کو اپنے دل میں سمویا، اسے اپنے سینے میں محفوظ کیا اور اس کو دوسروں تک پہنچایا، کیونکہ بسا اوقات علم کو حاصل کرنے والا اس کو ایسے شخص تک پہنچاتا ہے جو اس سے زیادہ فقیہہ ہوتا ہے۔'' [1]

یہی حدیث زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے بھی روایت ہے جس کے آخر میں اس فقرہ کا اضافہ ہے: ''ورب حامل فقهٍ ليس بفقيه'' بہت سے فقہ کے حامل فقیہہ نہیں ہوتے۔'' [2]

[1] ترمذی: ۲۶۵-۲۶۵۸۔ [2] ابوداود: ۳۶۶-۳۶۶۰۔ ابن ماجہ: ۲۳۰-۳۵۰۶۔

Marfat.com

امام شافعی رحمہ اللہ اس حدیث سے استدلال کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

''یہ حدیث اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ علم اور فقہ کا روای غیر فقیہہ بھی ہوسکتا ہے جس کا حافظ ہونا تو اس کے لیے ضروری ہے، لیکن اس کا عالم اور فقیہہ ہونا اس کے لیے ضروری نہیں ہے۔'' [1]

اس حدیث میں جو چیز زیادہ قابل توجہ ہے وہ یہ کہ رسول اللہ ﷺ نے مخصوص طور پر اس شخص کو دعا دی ہے یا اس شخص کے لیے اللہ سے دعا کی ہے جو آپ کا ارشاد مبارک سنے، اس کو یاد رکھے اور دوسروں تک اسے پہنچائے، اس دعا میں آپ نے اس فقیہہ کو شامل نہیں فرمایا ہے جس کو حدیث ملے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ حدیث کے راوی ہی اس کی حفاظت کرنے والے اور دنیا میں اسے عام کرنے والے رہے ہیں۔ رہے فقہاء اور شارحین حدیث تو ان کا شمار خدام حدیث میں نہیں ہوتا اس لیے ان کا درجہ حدیث کے مطابق ثانوی ہے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ حدیث کا راوی فقیہہ اور عالم بھی ہوسکتا ہے اور نہیں بھی ہوسکتا مگر اس کا فقیہہ ہونا یا نہ ہونا حدیث کی صحت وعدم صحت پر اثر انداز نہیں ہوتا۔ ایسا بھی ہوسکتا ہے، بلکہ ہوتا ہے کہ ایک غیر فقیہہ راوی عدالت اور ضبط کی صفت میں اعلیٰ مقام پر فائز ہونے کے باعث اس صفت میں اپنے سے فروتر، مگر علم وفقہ میں اپنے سے برتر راوی سے زیادہ ثقہ اور قابل اعتماد ہو۔ بلکہ اگر میں یہ دعویٰ کروں کہ روایت حدیث میں تفقہ سے موصوف ہونا کسی بھی درجے میں مطلوب نہیں ہے تو میرا یہ دعویٰ مبنی برحقیقت ہوگا جس کی تائید نبی کریم فداہ ابی وامی ﷺ کے مذکورہ بالا ارشاد سے بھی ہوتی ہے جس میں آپ نے اپنی دعا کا مستحق اس خوش نصیب کو قرار دیا ہے جو آپ کی حدیث سن کر اسے اپنے دل میں بے کم وکاست سمولے، اور اسے اپنے سینے میں محفوظ کرے، پھر اسے دوسروں تک پہنچا دے۔ اگر راوی کے لیے فقہ کی کسی درجہ میں بھی ضرورت ہوتی تو آپ نے اسے بیان کر دیا ہوتا!!

یاد رہے کہ حدیث یا علوم الحدیث کی کتابوں میں، فقہ یا علم کے الفاظ سے روایتی یا اصطلاحی ''فقہ'' کو نہیں، بلکہ حدیث کو مراد لیا گیا ہے۔

نتیجہ بحث:

اوپر سورۂ حجرات کی آیت مبارکہ اور پھر نبی کریم ﷺ کے ارشاد مبارک کی روشنی میں جو کچھ عرض کیا گیا ہے اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اللہ ورسول کے نزدیک راویوں کی تعداد میں کثرت اور ان کا تفقہ مطلوب نہیں ہے۔ خود صحابہ کرام اور تابعین میں بھی ان دونوں میں سے کوئی بھی چیز موضوع بحث نہیں تھی سب سے پہلے معتزلہ نے خبر واحد اور خبر متواتر کی بحث چھیڑی اور یہ نعرہ لگایا کہ عقائد کے بارے میں خبر واحد ناقابل اعتبار ہے اس طرح تمام عقائد کا انکار کر دیا، پھر انہی کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اشعری اور ماتریدی متکلمین نے بھی عقائد کے باب میں خبر واحد سے استدلال کو غیر معتبر قرار

[1] الرسالہ ص: ۲۶۸

Marfat.com

دے دیا، پھر ایسی رو چل پڑی کہ فقہا بھی یہی راگ الاپنے لگے۔ اسی کے ساتھ انہوں نے راوی فقیہہ اور راوی غیر فقیہہ کی اصطلاح بھی گھڑ لی اور جس حدیث کو اپنے امام کی رائے اور قیاس کے خلاف پایا اس کو راوی غیر فقیہہ کی روایت کہہ کر ردّ کر دیا۔

معتزلہ اور فقہائے احناف اور متکلمین نے خبر واحد اور راوی غیر فقیہہ کی روایت کے انکار کا جو نعرہ لگایا تھا وہی نعرہ آج تک منکرین حدیث لگا رہے ہیں، جبکہ ان میں سے کسی ایک نے بھی نہ پہلے اور نہ آج اپنے اس دعویٰ کی دلیل میں قرآن پاک یا حدیث کی کسی عبارت کی مثال دینے کی زحمت کی۔ آگے میں خبر واحد کا انکار کرنے والوں یا اس کو مشروط شکل میں ماننے والوں کی جو مثالیں دوں گا ان سے یہ اندازہ ہو جائے گا کہ حدیث رسول کے دشمن صرف روایتی منکرین حدیث ہی نہیں ہیں۔ بلکہ ان کے علاوہ ایسے بھی بہت سے لوگ ہیں جن کے سروں پر بحث و تحقیق، حمایت سنت اور امامت کی پیشوائی کے مصنوعی تاج بھی ہیں بایں ہمہ ان کی زبان و قلم سے ''خبر واحد'' کے خلاف جو باتیں نکلی ہیں ویسی باتیں کہنے کی جرأت مستشرقین اور مبشرین نے بھی نہیں کی ہے۔

خبر متواتر کا ہوّا:

میں سطور بالا میں یہ عرض کر چکا ہوں کہ قرآن و حدیث میں حدیث واحد یا حدیث متواتر کی اصطلاح استعمال نہیں ہوئی ہے، اپنی گزشتہ بات پر استدراک کرتے ہوئے یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ جہاں تک حدیث واحد کی اصطلاح کا مسئلہ ہے تو اصطلاح کے طور پر نہ سہی مفہوم کے اعتبار سے قرآن و حدیث میں اس کا ذکر آیا ہے جس کی مثالیں میں اس وقت دوں گا جب حدیث واحد کے دلیل و حجت ہونے پر بحث کروں گا۔

رہی حدیث متواتر تو یہ سراسر من گھڑت اور خانہ ساز ہے اور یہ ہوّا اس لیے کھڑا کیا گیا ہے تاکہ حدیث کی شرعی حیثیت کا انکار کیا جا سکے۔ اور چونکہ حدیث متواتر حدیث واحد کی ضد ہے یا اس کی مقابلی قسم اس لیے جب بھی کسی نے حدیث کی اقسام بیان کیں تو حدیث واحد یا خبر واحد کے بالمقابل حدیث متواتر یا خبر متواتر کا بھی ذکر کیا اس طرح یہ اصطلاح عام ہوگئی اور اس کا ذکر ان علماء کی کتابوں میں بھی ہونے لگا جو ہر صحیح حدیث کو شرعی دلیل اور حجت مانتے ہیں، لیکن آج تک کسی بھی امام حدیث یا عالم یا مصنف نے حدیث متواتر کی کوئی مثال نہیں دی ہے اور دے بھی کیسے سکتا ہے۔ جبکہ اس حدیث کی تعریف اور اس کے راویوں کی تعداد پر دو ماہرین کا بھی اتفاق نہیں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ بلاشبہ متقدمین محدثین کے علوم کے جامع اور بجا طور پر امام الائمہ تھے، انہوں نے بھی حدیث متواتر کے منکرین کا جواب دیتے ہوئے یہ دعویٰ کرنے پر اکتفا کیا ہے کہ متواتر احادیث بہت ہیں، پھر مثال میں وہ حدیث ذکر کی ہے جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ گھڑنے کی وعید آئی ہے، مگر یہ واضح نہیں کیا ہے کہ یہ حدیث متواتر کیوں ہے؟ عجیب بات یہ ہے کہ جس شخص نے بھی حدیث متواتر کا ذکر چھیڑا ہے، مثال میں اسی حدیث کا ذکر کیا ہے، میں یہاں امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کا قول نقل کر

Marfat.com

دینا مناسب خیال کرتا ہوں جس میں تواتر سے متعلق بہت سی مفید باتیں آ گئی ہیں، فرماتے ہیں:

((والصحيح ما عليه الاكثرون: اَن العلم يحصل بكثرة المخبرين تارة، وقد يحصل بصفاتهم لدينهم وضبطهم، وقد يحصل بقرائن تحتف بالخبر، فيحصل العلم بمجموع ذلك، وقد يحصل العلم بطائفة دون اُخرى......اَما عدد ما يحصل به التواتر، فمن الناس من جعل له عددا محصوراً، فقيل: اكثر من اَربعة، وقيل: اثنا عشر، وقيل: أربعون، وقيل: ثلاثمائة وثلاثة عشر، وقيل: غير ذلك، وكل هذه الاَقاويل باطلة لتكا فئها فى الدعوى.))

''اور صحیح بات جس پر اکثریت کا اتفاق ہے یہ ہے کہ: علم کبھی تو خبر دینے والوں کی کثرت سے حاصل ہوتا ہے اور کبھی ان کی دینداری اور ضبط سے، اور کبھی ان قرائن اور علامتوں سے جو خبر کے ساتھ ہوتی ہیں، اور ان سب کے مجموعہ سے بھی علم حاصل ہوتا ہے اور بسا اوقات ایک جماعت کی خبر سے علم حاصل ہوتا ہے دوسری کی نہیں، رہی وہ تعداد جس سے تواتر کو وجود ملتا ہے، تو کچھ لوگوں نے اس کے لیے متعین تعداد مقرر کر دی ہے، چنانچہ کہا گیا ہے کہ یہ مقدار چار سے زیادہ ہونی چاہیے، اور کہا گیا ہے کہ بارہ ہونی چاہیے، اور کہا گیا ہے کہ: چالیس ہونی چاہیے، یہ بھی کہا گیا ہے کہ: تین سو تیرہ، اس کے علاوہ بھی اقوال ملتے ہیں، مگر اپنے دعووں میں برابر ہونے کی وجہ سے یہ سارے اقوال باطل ہیں۔'' [1]

امام ابن تیمیہ کے اس قول سے یہ بات عیاں ہوگئی کہ تواتر سے متعلق کوئی بھی قول قابل اخذ واعتبار نہیں ہے ایسی صورت میں کسی حدیث متواتر کے وجود کا دعویٰ باطل قرار پایا۔ اس وضاحت کے بعد ذرا ڈاکٹر برنی کے تیور ملاحظہ فرمایئے:

ہمارے عقیدے کی وضاحت اور تائید بلاشبہ خبر واحد سے مدد ملتی ہے، مگر عقیدہ کی مبادیات ہمیں قرآن حکیم اور حدیث متواتر سے حاصل ہوتی ہیں۔ ہماری معلومات کے مطابق عقیدے اور ایمان کا کوئی بھی بنیادی اصول ایسا نہیں ہے جو مجرد خبر واحد سے ہمیں ملا ہو اور جس کی بنیاد پر کسی شخص کے مسلمان یا کافر ہونے کا فیصلہ ہوتا ہو، اگر عابدی صاحب ایسی کسی خبر سے واقف ہیں تو ہمیں ضرورت آ گاہ فرمائیں۔ (روشنی: ۲۷، جمادی الاول ۱۴۳۰ھ)

میں آگے حدیث واحد کے حجت ودلیل ہونے کی مثالیں دینے والا ہوں، لیکن چونکہ ڈاکٹر برنی نے چیلنج کر دیا ہے اس لیے ان کا جواب اسی وقت دے دینا چاہتا ہوں تا کہ بات صاف ہو جائے اور ان کا مبلغ علم بھی سامنے آ جائے۔

---

[1] فتاویٰ ص: ۴۸ ج ۱۸.

Marfat.com

عقیدہ کے باب میں حدیث واحد کے دلیل ہونے کی مثال:

اسلام میں عقیدہ و عمل کی صحت اور عند اللہ مقبول ہونے کا جس چیز پر مدار ہے وہ نیت ہے اور نیت کی حدیث صرف خبر واحد ہی نہیں، بلکہ ایسی خبر واحد ہے جس کا اصطلاحی نام ''غریب'' ہے اور یہ حدیث چار طبقوں میں صرف ایک ایک راوی سے مروی ہے: نبی ﷺ سے اس کے راوی صرف عمر رضی اللہ عنہ ہیں۔ عمر سے اس کی روایت صرف علقمہ بن وقاص لیثی نے کی ہے اور لیثی سے اس کی روایت کرنے والے تنہا محمد بن ابراہیم ہیں اور محمد بن ابراہیم سے اس کی روایت میں یحییٰ بن سعید انصاری منفرد ہیں۔ [1]

اس کے باوجود یہ حدیث دین میں بنیاد اور اساس کا درجہ رکھتی ہے اور اس کے بموجب اگر کوئی شخص دل سے تنہا اللہ تعالیٰ کے معبود ہونے کا عقیدہ نہ رکھے اور زبان سے ایک لاکھ بار لا الٰہ الا اللہ کا اعلان کر دے تب بھی موحد مومن نہیں قرار پائے گا اس وضاحت کی روشنی میں ان لوگوں کے ایمان کی حقیقت کو سمجھا جا سکتا ہے جو ''الٰہ'' کے معنی مقصود یا موجود قرار دیتے ہیں ان کے نزدیک کلمہ توحید کے معنی ہوئے: سوائے اللہ کے کوئی مقصود نہیں، یا اللہ کے سوا کوئی موجود نہیں!!

اس طرح نیت کے بغیر دین کے کسی بھی عمل کا اعتبار نہیں ہے۔

اوپر میں بار بار یہ عرض کر چکا ہوں کہ قرآن وحدیث میں اصطلاح کے طور پر نہ حدیث واحد کا ذکر آیا ہے اور نہ حدیث متواتر کا، البتہ صفت اور معنی کی صورت میں حدیث واحد کا ذکر متعدد بار آیا ہے اور اوپر عبداللہ بن مسعود اور زید بن ثابت رضی اللہ عنہما کی جو حدیث نقل کی گئی ہے اس سے اس کا ثبوت ملتا ہے۔

''حدیث واحد'' سے ایسی حدیث مراد ہے جس کا راوی صرف ایک ہو، یعنی ایک شخص کی روایت کردہ حدیث، یہ ایک راوی سلسلہ رواۃ کے کسی ایک طبقہ میں بھی ہو سکتا ہے اور تمام ہی طبقات میں بھی۔

بعد میں حدیث واحد سے ہر وہ حدیث مراد لی جانے لگی جو متواتر نہ ہو اس طرح اس میں وسعت پیدا ہوگئی، اور چونکہ تواتر کی کسی تعداد پر محدثین کا اتفاق نہیں ہے اور نہ یہ نام ہی قرآن وحدیث میں آیا ہے اس لیے اگر کسی حدیث کے راویوں کی تعداد ہر طبقہ میں دس ۱۰ سے بھی زیادہ ہو جائے تب بھی اس کو حدیث متواتر کا نام دینا درست نہیں ہے اس لیے محدثین نے واحد اور متواتر کے درمیان ''مستفیض'' یا مشہور کی اصطلاح کا اضافہ کر دیا ہے: تاکہ اگر راویوں کی تعداد زیادہ ہو جائے تو اس کو مشہور کا نام دے دیا جائے۔

رہا بعض محدثین یا علماء کا یہ فرمانا کہ یہ حدیث متواتر ہے، یا فلاں شرعی مسئلہ متواتر احادیث سے ثابت ہے، یا اس طرح کی کوئی تعبیر، تو اس سے ایسا کہنے والوں کی مراد یہ ہو سکتی ہے کہ فلاں مسئلہ کثیر احادیث سے ثابت ہے، یا فلاں حدیث کثیر سندوں سے مروی اور منقول ہے۔

---

[1] بخاری نمبر ۱

Marfat.com

رہے منکرین حدیث تو ان کی کتابوں میں حدیث متواتر کی ''رٹ'' ان کی بڑ کے سوا کچھ نہیں وہ تو دوسروں کے خرمن کے خوشہ چین ہیں، ورنہ ان کو تو یہ بھی معلوم نہیں کہ ہاتھی کی دم کدھر ہوتی ہے۔

امام بخاری نے صحیح بخاری میں ایک کتاب اس عنوان سے قائم کی ہے کتاب اخبار الاحاد جس کے تحت جو باب باندھا ہے، اس کا عنوان ہے: ''باب ما جاء فی إجازة خبر الواحد الصدوق فی الاذان والصلاة والصوم والفرائض والأحكام''

اذان، نماز، روزہ اور فرائض واحکام کے باب میں بے حد سچے ایک راوی کی خبر پر عمل کرنے کے جواز کا باب۔

اس باب کے تحت احادیث نقل کرنے سے قبل انہوں نے پہلے سورۂ توبہ کی آیت نمبر ۱۲۲ نقل کی ہے اور اس میں وارد ''طائفہ'' کی تشریح میں یہ کہہ کر سورۂ حجرات کی آیت نمبر ۹ سے استدلال کیا ہے کہ ایک شخص کو طائفہ کا نام بھی دیا جاتا ہے، پھر انہوں نے سورۂ حجرات کی اسی آیت سے استدلال کیا ہے جس پر تفصیل سے بحث کی جا چکی ہے۔

اس باب کے تحت امام بخاری لگا تار ۱۴ حدیثیں لائے ہیں جن میں سے ہر حدیث کسی نہ کسی شکل میں خبر واحد کے شرعی حجت ہونے پر دلالت کرتی ہے جن میں سے بعض کا ذکر اپنے مقام پر آئے گا۔

حدیث کی تبلیغ کے لیے نبی ﷺ کا طریقہ تعلیم:

اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب عزیز میں ایک سے زیادہ بار یہ خبر دی ہے کہ اس کے رسول ﷺ کے فرائض منصبی میں کتاب اللہ اور حدیث کی تعلیم بھی داخل ہے: ''ويعلمهم الكتاب والحكمة'' اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ اس منصب کا یہ تقاضا تھا کہ اگر حدیث سے کسی حکم کے ثبوت کے لیے راویوں کی کثرت تعداد مطلوب ہوتی، یا راویوں کا تفقہ ضروری ہوتا یا کم از کم عقائد کے ثبوت کے لیے ایسی احادیث درکار ہوتیں جو متواتر ہوں آحاد نہ ہوں تو ایک ہی بار آپ نے اسے بیان کر دیا ہوتا جس طرح آپ نے بکثرت مواقع پر یہ واضح فرما دیا ہے کہ آپ کی طرف ایسی کوئی بات منسوب کرنا جو آپ نے نہ فرمائی ہو۔ قطع نظر اس کے کہ اس کا تعلق عقائد سے ہو یا اعمال سے، اور اس میں اسلام کے اصولی احکام بیان ہوئے ہیں۔ یا فروعی، دوزخ کا مستحق بنا دیتا ہے، لیکن جب آپ نے ایسی کوئی بات نہیں فرمائی ہے اور اللہ تعالیٰ نے بھی اپنی کتاب میں ایسا کرنے کا آپ کو کبھی کوئی حکم نہیں دیا ہے، تو اس سے یہ لازم آیا کہ حدیث کے حجت و دلیل ہونے کے لیے اس کے متواتر ہونے اور راویوں کے فقیہہ ہونے کی شرط لگانا اللہ و رسول پر استدراک ہے۔

میں نے ابھی جو کچھ عرض کیا ہے اگر ہم اس کو پھیلا دیں تو یوں کہہ سکتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی سیرت پاک کے دقیق اور تفصیلی مطالعہ سے آپ کا یہ معمول سامنے آتا ہے کہ جب آپ کسی صحابی سے کوئی بات فرماتے، اس کو کسی کام کا حکم دیتے یا اس کے کسی سوال کا جواب دیتے تو آپ کی وہ بات، وہ کام، اور وہ جواب صرف اس کے لیے نہیں، پوری امت کے لیے ہوتا، وقتی اور عارضی نہ ہوتا، قیامت تک کے لیے ہوتا تھا، اس کے باوجود نبی کریم ﷺ کسی صحابی

Marfat.com

سے کوئی حدیث بیان کرتے وقت کسی کام کا حکم دیتے وقت کسی کام سے منع کرتے وقت اور کسی صحابی کے کسی سوال کا جواب دیتے وقت، نہ صحابہ کرام میں سے خاص افراد کا انتخاب فرماتے، اور نہ یہ شرط لگاتے کہ آپ کا وہ ارشاد، وہ حکم اور وہ جواب ایک شخص نہیں۔ دو اشخاص نہیں، بلکہ تین اور ان سے زیادہ سنیں، تاکہ دوسروں کے نزدیک آپ کا وہ ارشاد، وہ حکم اور وہ جواب قابل تصدیق اور واجب التعمیل ہو، اور اگر آپ کا وہ ارشاد کسی عقیدے یا اصولی مسئلہ سے متعلق ہو تو اس کو سننے والے اور بیان کرنے والے جم غفیر ہوں جن کا اصطلاحی نام ''متواتر'' ہے، ورنہ آپ کا وہ ارشاد نا قابل عمل ہے۔

اسی طرح رسول اللہ ﷺ جب کسی صحابی کو کوئی حکم دے کر کسی جگہ یا کسی قبیلے میں روانہ فرماتے تو اس کے ساتھ اس کی توثیق اور تائید کے لیے مزید دو یا تین صحابیوں کو نہیں بھیجتے تھے، بلکہ جس صحابی کو اس کا مکلف بناتے اس کو تنہا بھیجتے، اس لیے کہ آپ کو یہ معلوم تھا کہ وہ صحابی نہ تو آپ کے حکم میں کوئی ردو بدل کر سکتا ہے اور نہ اس کا تنہا ہونا اور فرد واحد ہونا اس حکم کے حکم نبوی ہونے کو مشکوک بنا سکتا ہے، پھر وہ صحابی اپنے مشن پر تنہا ہی جاتا اور مرسل الیہ افراد یا قبیلے کو رسول اللہ ﷺ کا حکم پہنچاتا، اور لوگ اس خبر اور اس کے ذریعہ ملنے والے حکم کو یہ کہہ کر رد نہ کرتے کہ تم فرد واحد ہو، لہٰذا تمہاری بات کا کوئی اعتبار نہیں، بلکہ اس کی زبان سے رسول اکرم ﷺ کا جو ارشاد سنتے اور ان کو آپ کا جو حکم ملتا اس کو صحیح مان کر اس کو واجب العمل سمجھتے۔

اسی طرح جب نبی کریم ﷺ نے مختلف شہروں میں تبلیغ اسلام یا اسلامی احکام کی تنفیذ کے لیے اپنے ''عمال'' مقرر فرمائے تو ہر جگہ کے لیے صرف ایک ہی شخص کو ''عامل'' یا امیر اور گورنر بنا کر بھیجا جو اللہ تعالیٰ کی کتاب اور نبی ﷺ کی سنت کے حوالہ سے دین کے احکام سناتا اور لوگ انہیں اللہ اور رسول کے احکام سمجھ کر ہی ان پر عمل کرتے۔

معلوم ہوا کہ تنہا ایک شخص کی خبر اگر وہ ثقہ اور قابل اعتماد ہو، عدالت سے موصوف ہو فاسق نہ ہو، یقینی اور واجب العمل ہے، قطع نظر اس کے کہ اس خبر کا تعلق عقائد سے ہے یا اعمال سے، اصول سے ہے یا فروع سے۔

حکومت الٰہیہ کے نمایندے:

آگے ان شاء اللہ میں ''خبر واحد'' یا ''حدیث واحد'' کے دلیل وحجت ہونے کے جو دلائل دوں گا ان سے یہ دعوے ریت کا تودہ ثابت ہوں گے کہ جن اخبار آحاد کو حجت مانا گیا ہے وہ ایسے اخبار تھے جو نبی کریم ﷺ کے حکم سے صحابہ کرام نے لوگوں کو پہنچائے تھے، یعنی انہوں نے یہ فرائض نبی کریم ﷺ کے نمائندے کی حیثیت سے ادا کیے تھے۔

ڈاکٹر برنی فرماتے ہیں:

> ''محترم عابدی صاحب نے کچھ واقعات بھی دلیل کے طور پر پیش کیے ہیں۔ مثلاً نبی کریم ﷺ ایک شخص کو کوئی حکم دے کر کسی قبیلے کی طرف بھیجتے تھے۔ یا تبلیغ اسلام اور اسلامی احکام کی تنفیذ کے لیے ایک فرد کو روانہ کرتے یہ ساری مثالیں درست ہیں مگر نتیجہ حسب سابق غلط برآمد کیا جا رہا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ بھیجے

Marfat.com

جانے والے سارے افراد نبی کریم ﷺ کے نمائندے کی حیثیت سے جاتے یا انہیں اسلامی حکومت کے عامل کی عرفی حیثیت بھی حاصل ہوتی تھی وہ عام فرد نہیں ہوتے تھے، بلکہ ان کی ذات سے حکومت الٰہیہ کی اتھارٹی کا بھی اظہار ہوتا تھا، ان سے منسوب بیانات اور احکامات کو ایک عام راوی کی روایت کا درجہ نہیں دیا جاسکتا اور نہ ہی اس بنیاد پر یہ کلیہ تخلیق کیا جاسکتا ہے کہ ایک عادل اور ثقہ شخص کی دی ہوئی خبر دینی حجت ہوتی ہے۔'' (روشنی ۲۷/ جمادی الاولی ۱۴۳۰ھ)

''ڈاکٹر برنی کے امام ومقتدی نے بھی اپنے انداز میں انہی خیالات کا اظہار کیا ہے اور مذکورہ قسم کے واقعات کے ذکر اور ان سے امام شافعی رحمہ اللہ کے استدلال کو کمزور قرار دینے کے بعد اپنی بات اس فقرے پر ختم کی ہے: کسی حکومت کے امراء وعمال کی ایک حیثیت عرفی ہوتی ہے جس کو حکومت اور عوام دونوں جانتے ہیں، ان کی باتیں ان کی حیثیت عرفی کی روشنی میں جانچی جاتی ہیں، وہ ایک اتھارٹی کے مظہر ہوتے ہیں جس کا احترام ہر شخص کو ملحوظ رکھنا ہوتا ہے۔'' [1]

ان دونوں بزرگوں کی مذکورہ بالا عبارتوں سے جو نتائج برآمد ہوتے ہیں وہ مختصراً یہ ہیں:

۱۔ ہر عدل اور ثقہ راوی کی خبر واحد حجت نہیں ہے، چاہے وہ صحابی ہی کیوں نہ ہو، بلکہ صحابہ میں بھی عوام اور خواص کا وجود تھا اس تناظر میں صرف انہی صحابہ کی روایت کردہ اخبار آحاد قابل قبول اور حجت ہیں جو خواص سے تعلق رکھتے تھے اور عام صحابہ میں سے نہ تھے۔

۲۔ جن صحابہ نے نبی کریم ﷺ کے نمائندے کی حیثیت سے نبی ﷺ کا کوئی حکم بیان کیا ہے، خبر واحد ہونے کی صورت میں صرف وہی قبول کی جائے گی عام صحابیوں کی نہیں۔

۳۔ صحابہ کرام صرف اسی خبر واحد کو قبول کرتے تھے جس کی تصدیق وہ رسول اکرم ﷺ سے کر سکتے تھے۔

۴۔ صحابہ کرام کے بارے میں تمام علماء کا متفقہ فیصلہ ہے کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کے حوالہ سے کبھی جان بوجھ کر جھوٹ نہیں بولا۔

نتیجہ نمبر ۴، انہی الفاظ میں ڈاکٹر برنی کے اس مقالے میں موجود ہے جس کا حوالہ میں نے اوپر دیا ہے۔

ان چاروں دعووں پر میں مدلل تبصرہ بعد میں کروں گا اس وقت میں خبر واحد کے قابل اعتبار ہونے کو عمومی شکل میں ثابت کروں گا، پھر حدیث واحد کے دلیل وحجت ہونے کے دلائل دوں گا جن سے ان شاء اللہ تعالیٰ ان دونوں کے دعووں کے تار و پود بکھر جائیں گے۔

[1] مبادئ تدبر حدیث، ص: ۱۲۰.

Marfat.com

خبر واحد کے قابل اعتماد ہونے کی مثالیں

خبر کے عناصر ترکیبی:

(۱)...... خبر دینے کا عمل، نفس خبر

(۲)...... جس بات کی خبر دی جائے، مخبر

(۳)...... خبر دینے والا، مخبر

۱۔ پہلی مثال: تمام انبیاء علیہم السلام نے اپنی قوموں کو غیبات اور اللہ کے نازل کردہ احکام کی جو خبریں دیں ہیں وہ سب اخبار آحاد ہیں۔

۲۔ دوسری مثال: نبی کریم ﷺ پر نزول قرآن کی خبر خبر واحد ہے جو نبی ﷺ خود دیتے تھے، اس لیے کہ قرآن نازل کرنے والے جبریل علیہ السلام غیر مرئی ہیں اور جب صحابہ کرام کے درمیان بھی نبی ﷺ پر قرآن کا کوئی حصہ نازل ہوتا تھا اس وقت بھی صحابہ کرام میں سے کوئی بھی نہ خاص اور نہ عام وحی الٰہی اور وحی نازل کرنے والے جبریل علیہ السلام کا مشاہدہ نہیں کرتا تھا اور نہ کرسکتا تھا، بلکہ وحی کے نزول کے بعد نبی کریم ﷺ کے خبر دینے سے ان کو یہ معلوم ہوتا تھا کہ آپ پر کوئی سورت یا آیت نازل ہوئی ہے۔

۳۔ تیسری مثال: موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھوں انجانے میں قبطی کے قتل ہو جانے کے بعد جب فرعون اور اس کے اہل دربار کو یہ معلوم ہوا تو انہوں نے یہ منصوبہ بنایا کہ وہ قبطی کے بدلے موسیٰ علیہ السلام کو قتل کر دیں، اس کی خبر ایک شخص نے آپ کو دی اور اسے سنتے ہی آپ مصر سے نکل کھڑے ہوئے، اور خبر کی تحقیق نہیں کی۔

۴۔ چوتھی مثال: مصر سے نکلنے اور طویل مسافت طے کرنے کے بعد موسیٰ علیہ السلام مدین کے کنویں پر پہنچے جہاں چرواہے اپنے جانوروں کو پانی پلا رہے تھے، انہوں نے وہاں یہ بھی دیکھا کہ دو عورتیں اپنے جانوروں کو دوسروں کے جانوروں سے ہٹا رہی ہیں، انہوں نے ان کا ماجرا پوچھا جس کے جواب میں ان عورتوں نے کہا کہ جب تک چرواہے اپنے جانوروں کو پلا کر وہاں سے ہٹ نہ جائیں ہم پانی نہیں پلاتیں۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ ہمارے والد بہت بوڑھے ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام نے آگے بڑھ کر ان کے جانوروں کو پانی پلا دیا، پھر ایک درخت کے سایہ میں جا کر بیٹھ گئے، کچھ دیر بعد انہی لڑکیوں میں سے ایک واپس آئی اور ان سے کہا کہ میرے والد تمہیں بلا رہے ہیں تاکہ تمہیں ہمارے جانوروں کو پلانے کی اجرت دیں۔

موسیٰ علیہ السلام اس لڑکی کی بات سن کر اس کے ساتھ جانے پر تیار ہو گئے، بلکہ چل پڑے یہ نہیں سوچا کہ اجنبی بستی ہے، اس لڑکی کا باپ کون ہے کہیں یہ فرعون کا جال نہ ہو؟ مانا کہ لڑکی کی چال ڈھال اس کے شریف زادی ہونے کی ترجمان تھی، مگر پھر بھی فرعون کا ظلم و ستم اور اس کی وسیع و عریض سلطنت اور ہر چہار جانب اس کے پھیلے ہوئے کارندوں

Marfat.com

اور جاسوسوں کا یہ تقاضا تھا کہ ایک بظاہر صالح اور پاکباز، مگر اجنبی لڑکی کی خبر پر اس کے ساتھ چل پڑنے سے پہلے اس کی تحقیق کر لیتے۔

۵۔ پانچویں مثال: امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ تصنیف و تالیف کے آدمی نہیں تھے اس لیے انہوں نے اپنے پیچھے کوئی کتاب نہیں چھوڑی ہے اور فقہ حنفی کی کتابوں میں ان کے جو اقوال ملتے ہیں وہ سب ان کے شاگردوں نے ان سے روایت کیے ہیں اور سب اخبار آحاد ہیں اور ان کے راویوں کو وہ عدالت وثقاہت بھی حاصل نہیں ہوتی تھی جو احادیث کے راویوں کو حاصل تھی، پھر بھی احناف ان اقوال سے پورے وثوق اور یقین کے ساتھ استدلال کرتے ہیں اور ان سے متعارض احادیث کو اخبار آحاد کہہ کر رد کر دیتے ہیں، کوئی ان سے پوچھے کہ ان اقوال کے راوی کون تھے، ان کی عدالت وامانت کا کیا حال تھا اور رجال کی کن کتابوں میں ان کے احوال درج ہیں؟ اور کیا امام ابو حنیفہ کی طرف کوئی جھوٹا قول منسوب کرنے والا اسی طرح عند اللہ مبغوض اور مستحق دوزخ ہے جس طرح جھوٹی روایتیں گھڑنے والا، یا محض عام جھوٹا اور کذب بیانی کرنے والا؟

۶۔ چھٹی مثال: قدریہ فرقہ معتزلہ کے بطن سے پیدا ہوا ہے اور معتزلہ کی طرح اخبار آحاد کو حجت نہیں مانتا یہ فرقہ تقدیر کا منکر ہے اس کا عقیدہ ہے کہ بندہ اپنے ارادے اور قدرت میں مختار مطلق ہے اس کے افعال میں اللہ تعالیٰ کی مشیت اور تخلیق کا عمل دخل نہیں ہے، مگر عجیب بات یہ ہے کہ خبر واحد کا منکر یہ فرقہ اپنے اس باطل عقیدے کی صحت پر اخبار آحاد سے استدلال کرتا ہے جن میں سے پہلی حدیث، "کل مولود یولد علی الفطرۃ" ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔ (بخاری: ۱۳۵۸، مسلم: ۲۶۵۸) ہے اور دوسری حدیث "خلقت عبادی حنفاء، فاجتالتھم الشیاطین عن دینھم" میں نے اپنے بندوں کو موحد پیدا کیا تھا، پس شیاطین نے ان کو ان کے دین سے پھیر دیا۔ [1]

۷۔ ساتویں مثال: مرجئہ فرقہ کا عقیدہ ہے کہ ایمان کے ساتھ معصیت سے کوئی نقصان نہیں ہوتا جس طرح کفر کے ساتھ نیکی سے کوئی فائدہ نہیں اس فرقے کی بہت ساری شاخیں ہیں جن پر بحث میرے موضوع سے خارج ہے یہ گمراہ فرقہ بھی اپنے باطل عقیدے پر احادیث آحاد سے استدلال کرتا ہے جن میں سے ایک حدیث کے الفاظ ہیں: "من قال: لا إلہ اللہ دخل الجنۃ، قیل: وإن زنی وإن سرق، قال: وإن زنی وإن سرق" جس نے لا الہ الا اللہ کہا وہ جنت میں داخل ہوگا'' سوال کیا گیا: اگرچہ اس نے زنا کیا ہو اور چوری کی ہو؟ فرمایا: اگرچہ اس نے زنا کیا ہو اور چوری کی ہو۔ [2]

---

[1] مسلم: ۲۸۶۵.

[2] بخاری: ۱۲۳۷۔ مسلم، ۹۴۔ ۱۵۶.

Marfat.com

۸۔ آٹھویں مثال: روافض حد درجہ گمراہ فرقہ ہے جس کی اصل یہودیت ہے یہ شیعہ فرقے کی غلو پسند جماعت ہے یہ اہل سنت و جماعت کو مسلمان نہیں ''بدعتی'' سمجھتی ہے اور اپنے اس دعوے پر یہ بھی ایک حدیث واحد سے استدلال کرتی ہے جس کو امام بن القیم رحمہ اللہ نے ان الفاظ میں نقل کیا ہے: ''یُجاء بقوم من أصحابی، فیقال: لا تدری ما أحد ثوا بعدك إنهم لم یزالوا مرتدین علی أعقابهم'' میرے اصحاب میں سے کچھ لوگ لائے جائیں گے اور کہا جائے گا کہ تجھے نہیں معلوم کہ انہوں نے تیرے بعد کیا نئی چیزیں ایجاد کیں اور برابر اپنی ایڑیوں کے بل پر پھرتے رہے۔''

یہ حدیث بخاری یا مسلم میں ان الفاظ میں نہیں آئی ہے: البتہ مسلم میں متعدد حدیثیں اسی مضمون کی حامل آئی ہیں ❶ امام ابن القیم کے حالات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بیشتر حالات میں برجستہ لکھتے تھے اور زبانی احادیث سے استدلال بھی کرتے تھے اس وجہ سے بعض احادیث کے الفاظ میں تبدیلی ہو جاتی تھی۔ ❷

۹۔ نویں مثال: خوارج کا فرقہ مسلمانوں سے نسبت کا دعویٰ کرنے والا نہایت تشدد پسند فرقہ ہے اور حدیث کو حجت نہیں مانتا اس کا عقیدہ ہے کہ گناہ کبیرہ کا مرتکب کافر ہے اور اپنے اس عقیدے پر احادیث آحاد سے استدلال بھی کرتا ہے، جن میں سے ایک حدیث ہے: ''سباب المسلم فسوق وقتاله كفر'' مسلمان کو گالی دینا فسق اور اس سے جنگ کرنا کفر ہے۔ ❸ اور دوسری حدیث ہے: ''لا یزنی الزانی حین یزنی وهو مؤمن'' ایسا نہیں ہو سکتا کہ زانی زنا کرتے وقت مومن ہو۔ ❹

۱۰۔ دسویں مثال: شعر جاہلی کا پورا ذخیرہ جس کی مدد سے مفسرین قرآن پاک کی تفسیر کرتے ہیں، اور منکرین حدیث جس کی روشنی میں حدیث کے اسلوب بیان کی عربیت اور عدم عربیت کا حکم لگاتے ہیں اس کے راوی کون ہیں؛ امرؤ القیس، عمرو بن کلثوم، طرفہ بن عبد، زہیر بن ابی سلمی، لبید بن ربیعہ، حارث بن حلزہ اور عنترہ بن شداد اور دوسرے عرب شعراء کی زبانوں سے کن لوگوں نے ان کے اشعار سن کر لوگوں کو منتقل کیے ہیں، ان کی عدالت، امانت اور صدق گوئی کا کیا حال تھا، ان کی جرح و تعدیل کن کتابوں میں بیان ہوئی ہے، پھر کیا ان اشعار کے راویوں کے دلوں میں ان کی حفاظت اور ان کو ہر طرح کی تبدیلی اور تغیر سے محفوظ رکھنے کا وہی جذبہ کارفرما تھا جو جذبہ حدیث کے راویوں کے دلوں میں تھا؟ اور کیا ان کے اشعار میں تحریف کرنے والے، ردو بدل کرنے اور ان میں اپنی طرف سے کمی بیشی کرنے والے کا وہی انجام ہے جو احادیث میں جان بوجھ کر تبدیلی کرنے والے، اور اپنی طرف سے احادیث گھڑنے والے کا انجام ہے؟ پھر کیا وجہ ہے کہ ان اشعار کو جاہلی عرب شعراء کا کلام مانا جاتا

❶ نمبر ۲۲۹۵۔ ۲۲۹۷ ❷ ملاحظہ ہو مختصر الصواعق المرسلہ ص ۵۱۸ ❸ بخاری: ۴۸۔ مسلم ۶۴
❹ بخاری ۲۴۷۵، مسلم ۵۷

Marfat.com

ہے اور بسا اوقات ان کو حدیث کی صحت جانچنے اور پرکھنے کا معیار قرار دیا جاتا ہے؟ ﴿قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ﴾

۱۱۔ گیارھویں مثال: امین احسن اصلاحی قدیم آسمانی صحیفوں سے استدلال اور استشہاد کرنے کے بڑے خوگر تھے۔ وہ قرآنی مضامین کی تشریح وتاویل میں قدیم آسمانی صحیفوں سے صفحے کے صفحے نقل کر دیتے تھے اور قرآنی آیات کی اپنی تفسیر کی صحت پر انہوں نے ان کے طویل طویل اقتباسات نقل کر دیے ہیں، جبکہ قرآن کے کسی حکم اور مضمون کی تشریح وتوضیح میں شاذ و نادر ہی کسی حدیث سے استدلال کیا ہے، کیا میں یہ پوچھ سکتا ہوں کہ ان صحیفوں کی استنادی حیثیت کیا ہے؟ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ قرآن کے مطابق ان صحیفوں میں بڑی تحریفات ہوئی ہیں اور جن صحیفوں سے انہوں نے بکثرت استدلال کیا ہے وہ ترجموں کے ترجمے ہیں اس کے باوجود یہ صحیفے ان کے نزدیک اللہ کا کلام ہیں، مگر حدیث محفوظ نہیں رہی۔ حدیث کے راوی نا قابل اعتبار تھے، علمائے جرح وتعدیل نے راویوں کی جرح وتعدیل گھر بیٹھے کر ڈالی ہے، حدیث کی روایت بالمعنی ہوئی ہے اور خبر ہونے کے ناطے حدیث میں صدق وکذب دونوں کا احتمال ہے وغیرہ ”ألا ساء ما يحكمون“

میں نے اوپر خبر واحد کے قابل اعتبار ہونے کی جو مثالیں دی ہیں ان سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ خبر واحد اہل حق اور اہل باطل دونوں کے یہاں معتبر رہی ہے اور کسی بھی خبر کو خبر واحد ہونے کی وجہ سے رد نہیں کیا گیا ہے اور نہ کسی حکم کو قبول کرنے کے لیے خبر متواتر کی شرط لگائی گئی ہے۔

امام شافعی اور منکرین حدیث:

منکرین حدیث کے سرخیل خوارج اور معتزلہ امام شافعی رحمہ اللہ کی پیدائش۔ ۱۵۰ھ سے پہلے سے موجود تھے۔ خوارج تو علی بن ابی طالب اور معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہم کے درمیان ہونے والی جنگ صفین کے موقع پر ظاہر ہو گئے تھے، مگر اپنی شدت پسندی تکفیری ذہنیت اور خشک مذہبیت کے باعث ان کو قبول عام نہ حاصل ہو سکا۔

رہے معتزلہ تو یہ حسن بصری رحمہ اللہ متوفی ۱۱۰ھ کے زمانے میں ظاہر ہوئے اور وہ اس طرح کہ ان کا امام واصل بن عطاء متوفی ۱۳۱ھ بصرہ میں حسن بصری کی مجلسوں میں شریک ہوا کرتا تھا، پھر اس کے عقائد میں فتور پیدا ہو گیا اور گناہ کبیرہ کے مرتکب کو خارج از اسلام قرار دینے لگا اور یہ نعرہ لگایا کہ گناہ کبیرہ کا مرتکب نہ تو مسلمان ہے اور نہ کافر، بلکہ اسلام اور کفر کے درمیانی درجے پر ہے۔

معتزلہ نے کتاب وسنت سے ماخوذ اہل سنت وجماعت کے عقائد کے خلاف جو عقائد اپنائے وہ قرآن وحدیث میں منصوص عقائد سے متعارض ہونے لگے، قرآن سے انہوں نے یہ کہہ کر پیچھا چھڑایا کہ اس میں توحید اور اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات سے متعلق جو آیات ہیں وہ اپنے ظاہری اور حقیقی معنوں میں نہیں، بلکہ مجازی معنوں میں ہیں، رہیں

Marfat.com

احادیث تو ان کو دو قسموں میں تقسیم کر دیا: آحاد اور متواتر، متواتر احادیث کے بارے میں انہوں نے یہ دعویٰ کیا کہ یہ اگرچہ سند کے اعتبار سے قطعی الثبوت ہیں اور یقینی ہیں، لیکن ان کے لفظی مفہوم اور دلالت کے غیر قطعی ہونے کی وجہ سے ان سے یقینی علم حاصل نہیں ہوتا، اس طرح عقائد کے باب میں یہ بھی نا قابل استدلال ہیں' اور جہاں تک احادیث آحاد کا تعلق ہے تو ان سے علم حاصل نہیں ہوتا، بلکہ یہ اپنے مفہوم اور دلالت میں ظنی ہیں اور ظن سے عقائد ثابت نہیں ہوتے، اس طرح احادیث آحاد عقائد کے اثبات میں نا قابل استدلال ہیں۔ اس کے برعکس انہوں نے عقلی دلائل کو قطعی قرار دیتے ہوئے ان کو کتاب وسنت کے دلائل پر مقدم کر دیا۔

متکلمین کہنے کو تو اسلام کے حامی و مدافع اور معتزلہ کے معارض اور مخالف کے طور پر ظاہر ہوئے، لیکن معتزلہ ہی کے بطن سے نکلنے کی وجہ سے ان کے عقائد بھی اسلامی عقائد نہ بنے خصوصیت کے ساتھ احادیث آحاد کے بارے میں ان کا طرز عمل معتزلہ کے طرز عمل سے کچھ زیادہ مختلف نہ رہا۔

رہے فقہاء تو اشعری یا ماتریدی متکلمین سے نسبت رکھنے کی وجہ سے احادیث کے قبول ورد میں انہوں نے معتزلہ ہی کے اصولوں پر عمل کیا، بلکہ ان کے فقہی مباحث بھی تمام تر اعتزالی مکتبہ فکر وجدال کے ترجمان ہیں۔ شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ جو مستند حنفی عالم تھے، ''الانصاف فی بیان اسباب الاختلاف'' میں متاخرین فقہائے احناف کے طرز بحث وجدال کے بارے میں لکھتے ہیں:

((ووجدت بعضهم يزعم ان بناء المذهب على هذه المحاورات الجدلية المبسوطه فى مبسوط السرخسي والهداية والتبيين ونحو ذالك، ولا يعلم أن أول من أظهر ذلك فيهم المعتزله، وليس عليه بناء مذهبهم.))

''اور میں نے بعض لوگوں کو یہ بے حقیقت دعویٰ کرتے ہوئے پایا ہے کہ حنفی مسلک کی بنا انہی مجادلانہ بحثوں پر قائم ہے جو مبسوط سرخسی، ہدایہ اور تبیین وغیرہ کتابوں میں پھیلی ہوئی ہیں، اسے یہ نہیں معلوم کہ اس طرز بحث کو سب سے پہلے معتزلہ نے رواج دیا ہے، ان کے مسلک کی بنا اس پر نہیں ہے۔'' [1]

مذکورہ وضاحتوں سے یہ حقیقت عیاں ہوگئی ہوگی کہ احادیث آحاد کے انکار کا جو نعرہ معتزلہ نے لگایا تھا، اس کی صدائے بازگشت، متکلمین، فقہاء، روایتی منکرین حدیث ابوریہ، غزالی، سیّد سلیمان ندوی، امین احسن اصلاحی، جاوید غامدی اور افتخار برنی وغیرہ کے یہاں سنائی دے رہی ہے، میں جب ان بزرگوں کی عبارتوں کے اقتباسات پیش کروں گا، تو ان سے میرے اس دعوے کی مکمل تصدیق ہو جائے گی۔

امام شافعی رحمہ اللہ وہ پہلے عالم اور امام ہیں جو منکرین حدیث کے مدمقابل آ کھڑے ہوئے اللہ تعالیٰ نے امام موصوف

[1] ص: ۱۴۲

Marfat.com

کو بے مثال قوت بیان، نصوص کے غیر معمولی استحضار اور کتاب وسنت کی نصوص سے استنباط واستنتاج کی حیرت ناک صلاحیت سے نوازا تھا، وہ اپنے وقت کے مشاہیر فقہاء اور متکلمین کے پاس جاتے اور احادیث آحاد کے حجت ودلیل ہونے کے مسئلہ پر ان سے مناظرے کرتے، ان کی مشہور کتاب ''الام'' میں ان کے ان مناظروں کی تفصیلات موجود ہیں۔

"الأم" کی کتاب جماع العلم" میں انہوں نے اس وقت پائے جانے والے منکرین کو تین گروہوں میں تقسیم کیا ہے، لیکن یہ صراحت نہیں کی ہے کہ ان کا تعلق کس فرقہ سے ہے، چونکہ ان کے دور میں حدیث کے شرعی حجت ہونے کا برملا انکار کرنے والے معتزلہ ہی تھے یا ان کے افکار سے متاثر بعض متکلمین، اس لیے قرین قیاس یہی ہے کہ یہ تینوں گروہ معتزلہ ہی سے تعلق رکھتے تھے؛ براہ راست یا بالواسطہ، ویسے بھی معتزلہ ۲۲ سے زیادہ فرقوں میں بٹے ہوئے تھے جن کے عقائد ایک دوسرے سے مختلف تھے۔

۱۔ ان منکرین میں پہلا گروہ مطلق حدیث اور سنت کے شرعی حجت ہونے کا منکر تھا۔

۲۔ دوسرا گروہ قرآن کے ساتھ حدیث کے اضافے کا منکر تھا۔

۳۔ تیسرا گروہ احادیث آحاد کا منکر تھا۔

اگر کوئی منکرین حدیث کا تتبع کرے تو وہ اس نتیجے پر پہنچے گا کہ یہ تینوں گروہ اس وقت سے لے کر آج تک موجود ہیں؛ ان میں ایسے لوگ بھی ملیں گے جن کے ناموں کے ساتھ زبدۃ المحدثین اور فخر المحدثین کے القاب بھی لگے ہوتے ہیں، ایسے بھی ملیں گے جن کو قرآن پاک کی تفسیر کے حوالے سے شہرت حاصل ہے اور ان کے نام سے پہلے امام کا اضافہ بھی ملتا ہے، ایسے بھی ہیں جو امام الحرمین اور حجۃ الاسلام کہے جاتے ہیں، ایسے بھی ہیں جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کی سیرت پاک بھی لکھی ہے، مگر ان سب میں یہ قدر مشترک بھی ہے کہ کسی نہ کسی درجہ میں یہ سب حدیث کی شرعی حیثیت کے منکر ہیں۔

امام شافعی نے ان منکرین کے افکار کا ''الأم'' کے صفحہ ۱۵۶۷ سے ۱۵۸۱ تک میں جائزہ لیا ہے اور ان کے نمایندوں سے مناظرہ کر کے حدیث کے شرعی حجت ودلیل ہونے کو قرآن وحدیث کی نصوص سے ثابت کیا ہے۔

پھر اپنی کتاب الرسالہ کے صفحہ ۲۵۰۔ فقرہ نمبر ۹۹۸۔ سے صفحہ ۳۰۹۔ فقرہ نمبر ۱۳۰۸۔ تک میں دلائل وبراہین سے یہ ثابت کیا ہے کہ خبر واحد حجت ہے۔ انہوں نے قصداً ایسی بہت سی حدیثوں کی مثال دی ہے جو صرف ایک راوی سے مروی ہیں۔ میں جب ان شاء اللہ حدیث واحد کے شرعی دلیل ہونے کے دلائل دوں گا تو اس وقت مزید کچھ مثالوں کے ساتھ امام شافعی رحمہ اللہ کی کتاب الرسالہ میں مذکور مثالوں میں سے کچھ کا ذکر کروں گا اور ساتھ ہی ان کے دلائل بھی نقل کروں گا۔

حدیث واحد بعض قدیم وجدید منکرین کے نزدیک

ساری حدیثوں کا انکار کرنے والے، بعض حدیثوں کا انکار کرنے والے اور احادیث کو مشروط طور پر ماننے والے

Marfat.com

سب منکرین میں شمار ہوتے ہیں اور حدیث کا منکر قرآن کا منکر ہے جس کا حکم معلوم ہے۔

۱۔رازی کا نقطہ نظر:

تفسیر کبیر، اساس التقدیس اور بہت سی کتابوں کے مصنف فخر الدین رازی کو امام رازی کہا جاتا ہے، مگر ان کی کتابوں میں کفر والحاد زیادہ اور اسلام بہت کم ہے موصوف اپنی کتاب، ''اساس التقدیس'' میں اخبار آحاد کے بارے میں عمومی بات کے زیر عنوان تحریر فرماتے ہیں:

اللہ تعالیٰ کی معرفت کے باب میں خبر واحد کو دلیل بنانا متعدد وجوہ سے ناجائز ہے۔

۱۔ اخبار آحاد ظنی ہیں، لہٰذا اللہ تعالیٰ اور اس کی صفات کی معرفت میں ان پر اعتماد کرنا جائز نہیں ہے۔

۲۔ میں نے ان کو اس وجہ سے ظنی کہا ہے کہ اس بات پر ہمارا اجماع ہے کہ حدیث کے راوی معصوم نہیں تھے۔

۳۔ جب وہ غیر معصوم تھے، تو ان سے غلطی کا صدور ممکن، اس طرح ان کی صداقت معلوم ویقینی ہونے کے بجائے ظنی ہوگئی، لہٰذا خبر واحد ظنی قرار پائی اور یہ فرض قرار پایا کہ اس کو دلیل نہ بنایا جائے...... ❶

خبر واحد کے بارے میں جوینی کا بھی یہی نقطہ نظر تھا جن کا لقب امام الحرمین تھا، برعکس نام دہند زنگی را کافور: ان دونوں کا شمار اشعری متکلمین کے ائمہ میں ہوتا ہے۔

۲۔غزالی کا نظریہ حدیث:

ابو حامد غزالی کا نام محتاج تعارف نہیں۔ وہ اشعری متکلم اور فقیہ تھے، ان کے نام کے ساتھ امام اور حجۃ الاسلام لکھا جاتا ہے، انہوں نے پہلے فلسفہ اور منطق میں بڑا نام پیدا کیا، پھر ان کے اندر انقلاب آیا اور راہ سلوک اور تصوف اختیار کرلی، باطنیت سے بھی ان کا تعلق رہا، علم حدیث سے وہ تہی دامن تھے، اپنی مشہور کتاب ''إحیاء العلوم'' کو انہوں نے ضعیف اور جھوٹی روایتوں اور من گھڑت اولیاء اللہ کے کشف وکرامات کے خود ساختہ اور عقل وشرع سے متصادم واقعات سے بھر دیا ہے ان کی حدیث دانی کو معلوم کرنے کے لیے حافظ زین الدین ابو الفضل عراقی کی کتاب: "المغنی عن حمل الأسفار فی الأسفار فی تخریج مافی الإحیاء من الأخبار" پر ایک طائرانہ نظر ڈال لینا کافی ہے۔

بایں ہمہ حدیث کا نام ان کے طبع نازک پر بڑا گراں گزرتا تھا۔ حدیث کے بارے میں ذرا ان کا نقطہ نظر ملاحظہ ہو:

''ہر وہ خبر جس سے باری تعالیٰ کی صفت کا اشارہ ملتا ہو، اگر اس کے ظاہری الفاظ عقل کی میزان میں محال ہوں، تو غور وتدبر کر کے دیکھا جائے گا کہ آیا ان کی تاویل کی جاسکتی ہے یا نہیں؟ اگر قابل تاویل ہے تو اس کی تاویل کر کے اس کو مان لیا جائے گا اور اگر اس کی تاویل ممکن نہیں تو پھر راوی کی کذب بیانی پر محمول کر کے اس کو رد کر دیا جائے گا، اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ اصحاب عقول کے رہنما تھے آپ کے بارے میں

❶ اساس التقدیس ص ۱۶۸۔

Marfat.com

یہ سوچا بھی نہیں جا سکتا کہ آپ کوئی ایسی خبر دے سکتے تھے جو عقل کی بارگاہ میں محال ہو۔"

انہوں نے اللہ تعالیٰ کی صفات، مثلاً پاؤں، اور انگلیوں وغیرہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان سے متعلق مختصر بات یہ ہے کہ: "جس خبر کی تاویل ممکن نہیں وہ مردود ہے اور جو صحیح حدیث قابل تاویل ہے وہ بعد از تاویل قبول کر لی جائے گی۔" ❶

احیاء العلوم میں دوٹوک الفاظ میں فرماتے ہیں:

((فأما من يأخذ معرفة هذا الأمور من السمع فلا يستقرله فيها قدم ولا يتعين له موقف.)) ❷

"رہا وہ جو ان امور کی معرفت بذریعہ سمع (حدیث) حاصل کرنا چاہتا ہے تو نہ تو وہ ثابت قدم ہو سکتا ہے اور نہ اس کا نقطہ نظر ہی متعین ہو سکتا ہے۔"

۳۔ ڈاکٹر رمضان بوطی کی بڑ:

ڈاکٹر محمد سعید رمضان بوطی کا ذکر اوپر آ چکا ہے اور کتاب وسنت سے ثابت عقائد کے بارے میں ان کے بعض نقطہ ہائے نظر کے نمونے بھی پیش کیے جا چکے ہیں، موصوف اشعری و ماتریدی متکلم، غالی صوفی اور اسلاف کے دشمن ہیں۔ موحدین، محدثین اور اسلاف کے طریقے پر چلنے والوں کے کے خلاف ان کی زبان وقلم سے سب وشتم کے علاوہ کچھ نہیں نکلتا، وہ اہل حق کے خلاف اپنی زبان درازی کے ساتھ اپنے امام اور مرشد زاہد کوثری کی طرح بڑ مارنے اور دعوے کرنے میں بڑے ماہر ہیں۔ وہ اپنے جیسے کج بحثی کرنے والوں کا ذکر "جمہور" کے لفظ سے کرتے ہیں تاکہ قارئین کو یہ غلط تاثر دے سکیں کہ یہی "جمہور علماء" کا عقیدہ ہے۔ موصوف سنت کے بارے میں اپنا نقطہ نظر بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

اگر سلسلہ اسناد صحت کے عناصر کا حامل ہو اور خبر نقل کرنے والے صرف ایک ایک راوی سے عبارت ہوں تو عقل کے نزدیک ایسی خبر زیادہ سے زیادہ ظنی ہوگی، اور اگر ہر سلسلہ میں دو یا تین راوی ہوں، تو ایسی خبر بھی ظنی ہی رہے گی، البتہ ظن قوی ہوگی اور یقین کے قریب ہو جائے گی۔

اس کے بعد فرماتے ہیں:

"رہی خبر صحیح کی ظنی قسم، (خبر واحد) تو عقیدہ کے تعین کے مسئلہ میں اسلامی حکم کی روشنی میں اس کا کوئی اعتبار نہیں، اس لیے کہ اس سے صرف ظن کا فائدہ ہوتا ہے اور قرآن کریم نے عقیدہ کی بحث کے میدان میں ظن کی پیروی کرنے سے منع کیا ہے۔" ❸

بوطی کا یہ دعویٰ رازی کے کلام سے ماخوذ ہے، معتزلہ کے دور سے آج تک منکرین حدیث یہی راگ الاپتے آ رہے

❶ المنخول، ص ۲۸۶ ❷ ص: ۱۸۰، ج ۱ ❸ کبری الیقینیات ص ۱۰۰۔۱۰۷۔

Marfat.com

ہیں' قرآن پاک میں ظن کن معنوں میں استعمال ہوا ہے اس کو میں پوری تفصیل سے اور مثالوں کے ذریعہ واضح کر چکا ہوں، ملاحظہ فرمالیں، بوطی کا یہ دعویٰ بھی سراسر جھوٹ ہے کہ قرآن پاک نے عقیدہ کی بحث کے میدان میں ظن کی پیروی کرنے سے منع کیا ہے، حقیقت میں قرآن وحدیث میں دین کو عقیدہ وعمل یا اصول وفروع میں تقسیم ہی نہیں کیا گیا ہے۔
یہ تو معتزلہ، متکلمین، فقہا اور ان کے ہم مشربوں کی اپنی اپج ہے اس مسئلہ کی مزید وضاحت آگے آ رہی ہے۔

۴۔ سیّد سلیمان ندوی کی تحقیق:

مولانا سیّد سلیمان ندوی بحث وتحقیق کے میدان میں بہت بڑا نام ہیں ان کی تصنیفات میں سیرت النبی اور خطبات مدراس کافی گراں قدر ہیں: لیکن ان کی آخری زندگی میں فکر وعقیدہ اور سلوک کے اعتبار سے ان کی جو کایا پلٹ ہوئی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا قدیم رنگ پختہ نہیں تھا، ورنہ سیرت النبی اور خطبات مدراس جیسی کتابوں کا مصنف ایک صوفی کی خانقاہ کی چوکھٹ پر جبہ سائی کیوں کرتا اور علامہ سیّد سلیمان ندوی سے مولوی سلیمان کیوں بنتا؟!!

حدیث اور سنت میں فرق کے حوالہ سے مولانا ندوی کا ذکر آ چکا ہے، عقائد کے باب میں ''خبر واحد'' کے ناقابل استدلال ہونے کے موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''اسلام کے ایک چھوٹے سے فرقہ کے سوا، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ غالی ظاہریہ کے سوا کوئی اس کا قائل نہیں کہ عقائد کا ثبوت قرآن کے علاوہ کسی اور طور سے ہوسکتا ہے، کیونکہ عقیدہ نام ہے یقین کا اور یقین کا ذریعہ صرف ایک ہے اور وہ وحی اور اس وحی کا تواتر ہے، اس لیے عقائد کا مبنی صرف قرآن' پاک یا احادیث متواتر ہیں، ظاہر ہے کہ احادیث متواترہ کا مطلق وجود نہیں، ایک یا دو سے زیادہ نہیں، ایسی حالت میں عام احادیث عقائد کا مبنی نہیں قرار پا سکتی ہیں، عموماً احادیث روایت آحاد ہیں اور ان کا ایک حصہ مستفیض ''مشہور'' ہے۔ یعنی صحابہ کے بعد ان کے راویوں کی کثرت ہوئی، اس لیے یہ روایتیں صرف قرآن پاک کی آیات کی تائید میں کام آ سکتی ہیں، مستقلاً ان' سے عقائد کا ثبوت نہیں حاصل کیا جا سکتا۔'' ❶

دیکھیے کس ڈھٹائی سے یہ دعویٰ کر دیا کہ غالی ظاہریہ کے سوا کوئی اس کا قائل نہیں کہ عقائد کا ثبوت قرآن کے علاوہ کسی اور طور سے ہوسکتا ہے'' جبکہ یہ نظریہ معتزلہ، متکلمین اور جدید دور کے اہل قرآن کا ہے، صحابہ، تابعین، محدثین اور تمام ائمہ فقہ کے یہاں عقائد اور غیر عقائد، اور خبر واحد اور خبر متواتر کی کوئی بحث نہیں ملتی، علامہ نے یہ نہیں بتایا کہ ''عام احادیث'' کی تعریف کیا ہے اور خاص احادیث کسے کہتے ہیں؟ حدیث مستفیض یعنی مشہور کے بارے میں فرماتے ہیں کہ: ''صحابہ کے بعد ان کے راویوں کی کثرت ہوئی'' جبکہ ایسی بہت سی احادیث ہیں جن کے راوی صحابہ کرام کی تعداد دس ۱۰ یا اس سے زیادہ ہے، مثال کے طور پر نماز میں ''رفع یدین'' کی حدیث کے راویوں کی تعداد ۲۶ سے زیادہ ہے۔

❶ مقالات سلیمان ص ۱۴۰۔۱۴۱

Marfat.com

علامہ ندوی نے معتزلہ اور متکلمین کے نقش قدم کی پیروی کرتے ہوئے عقائد کے باب میں اخبار آحاد کے نا قابل استدلال ہونے کا دعویٰ تو کر دیا مگر یہ نہیں بتایا کہ ان لوگوں کے عقائد کو تو قرآن کی بھی تائید حاصل نہیں ہے اور ان کا عقیدہ توحید تک من گھڑت ہے اسی لیے میں نے پہلے معتزلہ اور متکلمین کے عقائد تفصیل سے بیان کر دیے ہیں، پھر عقائد کے باب میں خبر واحد کے نا قابل استدلال ہونے سے متعلق ان کے اکابر کے اقوال نقل کر دیے ہیں تا کہ یہ دکھا سکوں کہ اس مسئلہ میں جو کچھ کہا جا رہا ہے وہ انہی کے اقوال کا اعادہ ہے۔

۵۔ غامدی کی بڑ:

جاوید احمد غامدی اور ڈاکٹر افتخار برنی اپنے امام و مرشد مولانا اصلاحی کے خرمن کے خوشہ چین ہیں اور انہی کے افکار کی تبلیغ و ترویج ان کا مقصد زندگی ہے اصلاحی صاحب کو حدیث سے نفرت و بیزاری کے اظہار میں جو تحفظات تھے، غامدی کے یہاں وہ بھی نہیں ہیں، مزید یہ کہ ان کی باتوں میں بڑے تضادات ہیں جن کی نقاب کشائی اس وقت میرا موضوع نہیں ہے۔ خبر واحد کے بارے میں ان کا نقطہ نظر ان کے اپنے الفاظ میں یہ ہے:

> ''نبی ﷺ کے قول و فعل اور تقریر و تصویب کی روایتیں جو زیادہ تر ''اخبار آحاد'' کے طریقے پر نقل ہوئی ہیں اور جنہیں اصطلاح میں حدیث کہا جاتا ہے، ان کے بارے میں یہ بات تو بالکل واضح ہے کہ ان سے دین میں کسی عقیدہ و عمل کا کوئی اضافہ نہیں ہوتا...... یہ چیز حدیث کے دائرے ہی میں نہیں آتی کہ وہ دین میں کسی نئے حکم کا ماخذ بن سکے۔'' ❶

لیجئے مسئلہ ہی ختم ہو گیا، ''اخبار آحاد جب حدیث کے دائرے میں آتی ہی نہیں، تو پھر دین میں ان سے عقیدہ و عمل کا اضافہ چہ معنی وارد؟ غامدی صاحب نے نبی ﷺ کے قول، فعل اور تقریر کی روایتوں کو ''زیادہ تر'' اخبار آحاد قرار دیا ہے، جبکہ امر واقعہ یہ ہے کہ ان کی ضد ''اخبار متواترۃ'' کی تعریف اور تعداد پر محدثین اور غیر محدثین کے عدم اتفاق کی وجہ سے عالم واقعہ میں ان کا کوئی وجود ہی نہیں، پھر تو ساری احادیث ''آحاد'' قرار پائیں ایسی صورت میں ان احادیث سے جن عقائد و اعمال کا پتا چلتا ہے وہ سب مردود ہیں؟!!

اس کے بعد یہ نئے مجدد اسلام فرماتے ہیں کہ:

> ''لیکن اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ نبی ﷺ کی سیرت و سوانح، آپ کے اسوۂ حسنہ اور دین سے متعلق آپ کی تفہیم و تبیین کے جاننے کا سب سے بڑا اور اہم ترین ذریعہ حدیث ہی ہے۔'' ❷

جب بقول آپ کے ''اخبار آحاد'' حدیث کے دائرے میں آتی ہی نہیں، تو پھر نبی کریم ﷺ کی سیرت پاک، آپ کے اسوۂ حسنہ اور قرآن پاک کی تفہیم و تبیین کے جاننے کا سب سے بڑا اور اہم ترین ذریعہ حدیث کس طرح قرار پائی؟

❶ الاصول و مبادی ص ۷۷ ❷ ص: ۷۷

Marfat.com

پھر کیا سیرت پاک اور اسوۂ حسنہ کا علم، اور نبی کریم ﷺ نے قرآنی آیات کی جو تشریح وتفسیر فرمائی ہے اس کی جان کاری محض اپنی معلومات میں اضافہ کرنے کے لیے ہے یا اس کو مشعل راہ بنانے اور اس کی پیروی کرنے کے لیے؟ اگر پہلی بات ہے تو رسول اللہ ﷺ کو رسول ماننے کا فائدہ؟ اور اگر دوسری بات ہے تو آپ کی سیرت پاک، اسوۂ حسنہ اور قرآن کی تشریح وتفسیر قرآن پر اضافہ ہی تو ہے دراصل یہ نئے مجدد دین اپنے مبلغ علم سے قطع نظر، نیم بیداری اور نیم خواب میں لکھتے اور بولتے ہیں: "مالهم بذالك من علم إن هم إلا يخرصون"

دین کی عقیدہ وعمل میں تقسیم:

بلاشبہ دینی تعلیمات اور احکام اپنے درجہ اور اہمیت میں یکساں نہیں ہیں، بلکہ ان میں سے بعض کو اساس اور بنیاد کا درجہ حاصل ہے تو بعض اس اساس اور بنیاد کے تابع ہیں اس بات کو عقیدہ وعمل سے تعبیر کیا جاتا ہے یعنی جو باتیں اساسی اور بنیادی ہیں ان کا شمار عقائد میں ہوتا ہے اور جو اپنی تمام تر اہمیت کے باوجود اساسی اور بنیادی نہیں ہیں ان کو اعمال کہا جاتا ہے، مگر اس کے باوجود عقائد اور اصول کی کتابوں میں دین کی، عقائد واعمال یا اصول وفروع میں جو تقسیم کی گئی ہے اس کے حق میں کتاب وسنت سے کوئی دلیل نہیں ہے، ایسی صورت میں عقائد اور اصول کی کتابوں میں عقائد واعمال، یا اصول وفروع کی تعریف میں جو کچھ ملتا ہے وہ اللہ ورسول کے ارشادات پر مبنی نہیں، بلکہ لوگوں کی اپنی بنائی ہوئی باتیں ہیں اور غلط بھی۔

عقائد واعمال یا اصول وفروع میں صرف اتنی بات درست اور صحیح ہے کہ عقائد یا اصول کی درستگی اور صحت مقدم ہے اور اس پر اعمال یا فروع کی مقبولیت موقوف ہے، بایں معنی کہ اگر کسی کا عقیدہ درست نہ ہو تو اس کا کوئی بھی عمل قابل قبول نہیں ہے۔

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ اور ان کے شاگرد امام ابن القیم رحمہ اللہ نے دین کو اصول اور فروع میں تقسیم کرنے کا انکار کیا ہے اور اس تقسیم کو عصر صحابہ کے بعد کا عمل قرار دیا ہے جو دین میں اضافہ ہے اور بدعت ہے جو لوگ اس تقسیم کے قائل ہیں وہ نماز کو دین کے فروع میں شمار کرتے ہیں، جبکہ نماز ارکان اسلام میں سے ایک ہے، اسی طرح یہ لوگ عقائد کی ان باتوں کو فروع میں شمار کرتے ہیں جن میں اسلاف کا اختلاف منقول ہے، ان کا دعویٰ ہے کہ یہ مختلف فیہ امور عقیدہ سے تعلق نہیں رکھتے، بلکہ یہ عقیدہ کے فروعی مسائل میں شامل ہیں، مگر ہم کہتے ہیں کہ: اگر اصول سے تمہاری مراد عقیدہ ہے، پھر تو پورا دین اصول ہے، کیونکہ تمام مالی اور بدنی عبادتیں اسی وقت اللہ تعالیٰ کی عبادت قرار پا سکتی ہیں. جبکہ اس اعتقاد سے انجام دی جائیں کہ شریعت نے ان کا حکم دیا ہے، اس طرح یہ اعتقاد عمل سے پہلے ہے جس پر عمل کی صحت موقوف ہے، اگر تم ان کے شرع ہونے کا عقیدہ نہ رکھو تو ان کے ذریعہ تمہارا اللہ کی عبادت کرنا صحیح نہ ہوگا۔ صحیح بات یہ ہے کہ اصول ہوں یا فروع ان کے بارے میں اجتہاد کا دروازہ کھلا ہوا ہے، لیکن جو چیز اسلاف کے طرز عمل کے دائرہ سے خارج ہو وہ کسی بھی حال میں قابل قبول نہیں ہے۔'' [1]

[1] بحوالہ القول المفید علی کتاب التوحید ص ۴۹۲ ج ۲.

Marfat.com

دراصل دین کو عقیدہ وعمل یا اصول وفروع میں تقسیم کرنے والے متکلمین ہیں، شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ الانصاف فی بیان اسباب الاختلاف میں اہل رائے کی افراط وتفریط پر روشنی ڈالنے کے بعد آخر میں لکھتے ہیں کہ:

''پھر شیطان نے چپکے سے ان فقہاء کے دلوں میں ایک لطیف حیلہ ڈال دیا اور ان کو ایک کاری فریب میں لا پھنسایا، یعنی ان کو بتایا کہ یہ جو تمہارے پاس علم کا سرمایہ ہے وہ بہت معمولی اور حقیر ہے، جس سے تمہاری ضرورت پوری نہیں ہوسکتی اور نہ یہ تمہارے لیے کافی ہوسکتا ہے، اس لیے علم کلام سے اس کو تقویت دو اور اِدھر اُدھر کے کچھ کلامی مباحث کا اس میں پیوند لگاؤ اور متکلمین کے اصولوں کو اس کا پشت پناہ بناؤ، تاکہ تمہارے لیے غور وخوض کی راہ کھلے اور فکر ونظر کا میدان وسیع ہو، پس ان کے حق میں ابلیس نے اپنا خیال سچ پایا اور مسلمانوں کے ایک مختصر گروہ کے علاوہ سب نے اس کی اطاعت اور پیروی اختیار کر لی، تعجب ہے لوگوں پر اور ان کی عقلوں پر ان کو کہاں لے جایا جارہا ہے اور کس طرح شیطان ان کو دھوکا دے کر ان کو ان کے اصل مقصد اور مرکز رشد وہدایت سے دور کر رہا ہے، اللہ ہی ایسا ہے جس سے استعانت کی جائے۔'' [1]

علامہ ندوی کا دعویٰ اہل کلام کے دعویٰ کی صدائے بازگشت ہے:

عقائد کے باب میں حدیث واحد کے نا قابل استدلال ہونے کا جو دعویٰ مولانا سلیمان ندوی نے کیا ہے وہ من وعن اہل کلام کے دعویٰ کی صدائے بازگشت ہے اور انہوں نے جو یہ فرمایا ہے کہ: اسلام کے ایک چھوٹے سے فرقہ غالی ظاہریہ کے سوا کوئی اس کا قائل نہیں کہ عقائد کا ثبوت قرآن کے علاوہ کسی اور طور سے ہوسکتا ہے۔'' حد درجہ غلط بیانی ہے، اگر وہ یہ کہتے کہ معتزلہ اور متکلمین کے علاوہ تمام اہل حق اور اہل سنت وجماعت کا یہ مسلک ہے اور قیامت تک رہے گا کہ عقائد کا ثبوت جس طرح قرآن سے ہوتا ہے اسی طرح احادیث سے بھی ہوتا ہے، احادیث سے میری مراد ''احادیث آحاد'' ہیں۔تو ان کا دعویٰ سو فیصد درست ہوتا، اس لیے کہ اللہ ورسول نے عقائد اور غیر عقائد میں دلیل وحجت ہونے کے اعتبار سے قرآن وحدیث میں کوئی تفریق نہیں کی ہے، رہی احادیث آحاد اور احادیث متواتر کی اصطلاح تو یہ بھی ان لوگوں کی گھڑی ہوئی ہے جو کسی نہ کسی درجہ میں حدیث کی تشریعی حیثیت کے منکر ہیں۔

ندوی صاحب نے آگے جو یہ فرمایا ہے کہ: عقیدہ نام ہے یقین کا اور یقین کا ذریعہ صرف ایک ہے اور وہ وحی اور اس وحی کا تواتر ہے، تو یہ بھی حقیقت سے بہت دور اور محض ان کی ''بڑ'' ہے، جو مصنف سیرت ہونے کی ان کی شہرت کے شایان شان بھی نہیں ہے۔

موصوف کے اس ارشاد سے یہ لازم آتا ہے کہ اسلام میں عقائد کے علاوہ کوئی اور چیز یقینی نہیں ہے۔ یہ تمام عبادات، احکام، محاسن اخلاق اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پاک سے متعلق کوئی بھی چیز یقینی نہیں ہے، اوپر یہ بات

[1] ص ۸۴۔۸۵

Marfat.com

آ چکی ہے کہ قرآن وحدیث میں دین کو عقائد اور غیر عقائد میں تقسیم نہیں کیا گیا ہے۔

انہوں نے یہ دعویٰ کر کے کہ ''یقین کا ذریعہ صرف ایک ہے اور وہ وحی اور اس وحی کا تواتر ہے'' اپنے چہرے سے نقاب الٹ دیا ہے، اور وہی راگ الاپا ہے جو معتزلہ، متکلمین اور ان کے ہم نوا فقہاء الاپ رہے ہیں کہ ''احادیث آحاد'' یقینی ذریعہ علم نہیں ہیں، ہم ان سے کہتے ہیں کہ:

﴿نَبِّئُوْنِیْ بِعِلْمٍ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ﴾ (الانعام: ۱۴۳)

''اگر تم سچے ہو تو علم کے ساتھ مجھے خبر دو۔''

حدیث واحد کی ظنیت کا دعویٰ:

اس کتاب میں ''ظن'' کا مفہوم بڑی تفصیل سے واضح کر چکا ہوں، چونکہ حدیث واحد کے بارے میں یہ دعویٰ معتزلہ کے دور ہی سے دہرایا جا رہا ہے کہ حدیث واحد ظنی ہے۔ اس لیے معتزلہ اور متکلمین اور ان کے نقش قدم کی پیروی کرنے والوں کی حد تک یہ دعویٰ صحیح ہے، کیونکہ ان کو حدیث واحد سے ظن کے سوا کچھ اور حاصل ہی نہیں ہو سکتا، معتزلہ اور متکلمین تو توحید اور اللہ تعالیٰ کے اسماء اور صفات کے باب میں قرآن اور احادیث متواتر کو بھی، اگر عالم واقعہ میں ان احادیث کا کوئی وجود ہے قطعی الدلالۃ نہیں مانتے، جبکہ یہ دونوں ان کے نزدیک قطعی الثبوت ہیں، پھر وہ احادیث آحاد کو یقینی ذریعہ علم کیوں ماننے لگے، مگر رونا تو ان نئے محققین اور مجددین کا ہے، جن کے تیور تو یہ ہیں کہ ان سے بڑا حق پسند اور اسلام کا حامی کوئی نہیں، لیکن ہیں انہی معتزلہ اور متکلمین کے نرے مقلد اور انہی کی لکیر کے فقیر۔

ان محققین کی ستم ظریفی یہ ہے کہ یہ پہلے تو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ حدیث واحد ظنی ہے، پھر قرآن پاک کی ان آیتوں سے استدلال کرتے ہیں جن میں یہ آیا ہے کہ ''ظن'' حق کو دفع نہیں کر سکتا، ہٹا نہیں سکتا، دور نہیں کر سکتا وغیرہ اس سلسلے میں محمود ابوریہ نے جس کے افکار کی صدائے بازگشت سلیمان ندوی اور امین اصلاحی کے بیان میں سنائی دے رہی ہے، سورۂ یونس کی آیت نمبر ۳۶، اور سورۂ نجم کی آیت نمبر ۲۸ سے استدلال کیا ہے۔ وہ اپنی کتاب: اضواء علی السنۃ المحمدیۃ میں لکھتا ہے:

''جمہور کا قول ہے کہ اخبار آحاد سے علم نہیں حاصل ہوتا، اگرچہ یہ بخاری اور مسلم ہی میں مروی ہوں، اور امت کے ان کو قبول کرنے کی وجہ سے ان اخبار پر عمل کرنے کا جواز نکلتا ہے کیونکہ امت کو یہ حکم ہے کہ وہ ہر اس خبر پر عمل کرے جس کے سچ ہونے کا گمان غالب ہو۔'' [1]

اصلاحی بھی حدیث واحد کو ظنی کہتے ہوئے نہیں تھکتے، بلکہ جو لوگ بھی حدیث واحد کے شرعی حجت ہونے کے منکر ہیں وہ سب یہی نعرہ لگاتے ہیں، جبکہ عقل و منطق کا تقاضا تو یہ تھا کہ وہ پہلے یہ ثابت کرتے کہ حدیث واحد ظنی ہے، پھر

---

[1] ص ۲۴۰، بحوالہ الانوار الکاشفہ ص ۳۳۵.

Marfat.com

قرآن سے استدلال کرتے، میں ایک بار پھر مختصراً ظن اور یقین کے معانی بیان کر دینا چاہتا ہوں جس کے بعد یہ دکھاؤں گا کہ مذکورہ دونوں آیتوں میں ظن اور حق کن معنوں میں استعمال ہوئے ہیں۔ پھر یہ ثابت کروں گا کہ ''حدیث واحد'' ظن کا نہیں، بلکہ یقین کا معنی دیتی ہے۔

ظن اور یقین کا مفہوم:

ظن کے معنی ہیں: گمان، خیال، شک، اٹکل، اندازہ وغیرہ اگر اس کا تعلق کسی ایسی چیز سے ہو جو شرعا اور عقلا ثابت ہو تو پھر یہ یقین کا معنی دیتا ہے، جیسا کہ قرآن پاک میں ہے:

﴿الَّذِیۡنَ یَظُنُّوۡنَ اَنَّهُمۡ مُّلٰقُوۡا رَبِّهِمۡ وَ اَنَّهُمۡ اِلَیۡهِ رٰجِعُوۡنَ﴾ (البقرۃ: ٤٦)

''وہ جو یہ یقین رکھتے ہیں کہ درحقیقت وہ اپنے رب سے ملنے والے ہیں اور یقیناً وہ اس کی طرف لوٹنے والے ہیں۔''

ظن کے مترادفات ہیں: شک، تردد، حیرت، خیال، وہم وغیرہ اور ظن کی ضد ہیں: یقین، وثوق، تاکید، علم، اور حق وغیرہ۔

ظن کی کوئی علمی اور یقینی بنیاد نہیں ہوتی۔ منکرین حدیث، یا حدیث واحد کو شرعی دلیل نہ ماننے والے قرآن پاک کی جن دو آیتوں سے استدلال کرتے ہیں وہ محل استدلال نہیں ہیں۔ ان میں سے پہلی آیت سورۂ یونس کی ہے جس میں اللہ کے ساتھ دوسرا معبود بنانے والوں کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ بتوں کی عبادت کرنے والے ظن کی پیروی کر رہے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ان کا یہ شرک کسی علم یا کسی آسمانی کتاب یا کسی رسول کی تعلیم پر مبنی نہیں ہے۔ محض وہم وخیال اور باپ دادا کی تقلید ہے، جبکہ صرف اللہ تعالیٰ کو معبود بنانا حق اور تمام انبیاء اور رسولوں کی بعثت کا مقصد حقیقی ہے۔ آیت کا صحیح ترجمہ ہے:

﴿وَ مَا یَتَّبِعُ اَکۡثَرُهُمۡ اِلَّا ظَنًّا اِنَّ الظَّنَّ لَا یُغۡنِیۡ مِنَ الۡحَقِّ شَیۡـًٔا﴾ (یونس: ٣٦)

''ان کے بیشتر لوگ صرف ظن کی پیروی کرتے ہیں، درحقیقت ظن حق کو دفع نہیں کر سکتا۔''

آیت میں غیر اللہ یا بتوں کو معبود بنانے والوں کی اکثریت کو ظن کا متبع قرار دیا گیا ہے سب کو نہیں جس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ روسائے قریش نے تو بت پرستی اٹکل پچو سے اختیار کی ہے، رہے عوام تو وہ ان کی تقلید میں ایسا کر رہے ہیں۔

یاد رہے کہ اس آیت سے پہلے پانچ آیتیں ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے اپنی توحید ربوبیت بیان کی ہے اور آیت نمبر ۳۱ کا آغاز مشرکین سے اس سوال سے کیا ہے کہ: کون ہے جو تمہیں آسمان اور زمین سے رزق دیتا ہے، کون ہے جو کانوں اور آنکھوں کا مالک ہے اور کون زندہ کو مردہ سے اور مردے کو زندہ سے نکالتا ہے اور کون ہے جو ہر کام کی تدبیر کرتا ہے، وہ ضرور جواب دیں گے کہ اللہ!

معلوم ہوا کہ جب کفار یہ جانتے اور مانتے ہیں کہ رب کائنات تنہا اللہ تعالیٰ ہے تو پھر ان کو چاہیے تھا کہ وہ

Marfat.com

صرف اس کو معبود بھی مانتے، مگر ان کی مت ماری گئی کہ انہوں نے اس علم کے بجائے، وہم وخیال، اور اٹکل پچو کی پیروی شروع کر دی۔

دوسری آیت جس سے منکرین حدیث واحد کی ظنیت پر استدلال کرتے ہیں، اس کا تعلق بھی شرک وتوحید کے بیان سے ہے یہ سورۂ نجم کی اٹھائیسویں آیت ہے اور اس سے قبل کی آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمایا ہے کہ مشرکین نے جو مختلف بت بنا رکھے ہیں اور ان کو مختلف نام دے رکھے ہیں تو یہ اپنی اٹکل پچو اور خواہش نفس سے اس کے حق میں اللہ کی نازل کردہ کوئی دلیل نہیں ہے، پھر یہ بتایا ہے کہ آخرت میں فرشتے اپنی پرستش کرنے والوں کی کوئی شفاعت نہیں کریں گے۔ شفاعت تو صرف وہی کرے گا جس کو اللہ اس کی اجازت دے گا۔ آیت نمبر ۲۸ میں اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی ہے کہ جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے وہ فرشتوں کے نام عورتوں جیسے رکھتے ہیں۔ پھر اس سلسلہ آیات کی آخری کڑی کے طور پر فرمایا:

﴿وَمَا لَهُمْ بِهِ مِنْ عِلْمٍ إِنْ يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَإِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِي مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا﴾ (النجم: ۲۸)

"(وہ جو عقائد بھی رکھتے ہیں) ان کے متعلق ان کو کچھ بھی علم نہیں ہے۔ وہ تو محض گمان کی پیروی کر رہے ہیں اور بلاشبہ گمان حق کی کسی بات کو دفع نہیں کر سکتا۔"

تو اس آیت میں ظن کو علم، ہدایت اور حق کی ضد کے طور پر استعمال کیا گیا ہے تو کیا حدیث واحد علم، یقین اور حق کے بجائے گمان، وہم، خیال، اٹکل اور اندازہ کا فائدہ دیتی ہے؟ ﴿ألا ساء ما يحكمون﴾

روایت حدیث یقینی ذریعہ علم پر مبنی ہے:

حدیث کی روایت یقینی ذریعہ علم پر مبنی ہے اور یقینی ذریعہ علم سماع ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَ اللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْۢ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا ۙ وَّ جَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَ الْاَبْصَارَ وَ الْاَفْـِٕدَةَ ۙ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ﴾ (النحل: ۷۸)

"اور اللہ نے تمہیں تمہاری ماؤں کے پیٹوں سے اس حال میں نکالا کہ تم کچھ نہ جانتے تھے اور اس نے تمہارے لیے کان، اور آنکھیں اور دل بنا دیے تا کہ تم شکر کرو۔"

یہ آیت بتا رہی ہے کہ رحم مادر سے نکلنے والا بچہ ہر طرح کے علم سے کورا ہوتا ہے، اور اللہ تعالیٰ اس کے لیے کان، آنکھیں اور دل کی صورت میں جو اعضاء بنا کر اس کو رحم مادر سے نکالتا ہے وہی اس کے لیے ذرائع علم بنتے ہیں، یہ ایسی بدیہی حقیقت ہے جس کے بیان کی ضرورت نہیں تھی اس لیے یہ اعضاء دیے جانے پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کی تاکید پر بات ختم فرما دی۔

﴿لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا﴾ کے بالمقابل کان، آنکھیں اور دل کے ذکر سے یہ بات آپ سے آپ ثابت ہو جاتی

Marfat.com

ہے کہ یہ علم کے ذرائع ہیں جن کے سرفہرست آلہ سماع کان ہے۔ پورے قرآن پاک میں ان اعضاء کا ذکر اسی ترتیب سے آیا ہے۔

یقین کے درجات:

یقین کے تین درجات ہیں: علم الیقین، عین الیقین، اور حق الیقین۔

یقین کے درجات کی مثال سے وضاحت:

۱۔ ایک شخص جو میرے نزدیک سچا ہے مجھ سے کہتا ہے کہ اس کی جیب میں سیب ہے تو مجھے اس کے سچا ہونے کی وجہ سے اس کی جیب میں سیب کے ہونے کا علم الیقین ہو جاتا ہے۔

۲۔ اب وہ جیب سے سیب نکال کر مجھے دکھاتا ہے، اس وقت مجھے اس کے پاس سیب کے ہونے کا عین الیقین ہو جاتا ہے۔

۳۔ تیسرے مرحلے میں وہ مجھے سیب دیتا ہے اور میں اسے کھاتا ہوں۔ اس وقت مجھے اس کے وجود کا حق الیقین ہو جاتا ہے۔

ان تینوں حالتوں میں یقین کے درجات بدلے ہیں، ایسا نہیں ہوا ہے کہ کسی حالت میں یقین شک یا گمان رہا ہو۔

روایت حدیث میں یقین کے درجات:

۱۔ ایک صحابی رسول ﷺ، نبی کریم ﷺ کو کچھ فرماتے ہوئے اپنے کانوں سے سنتا ہے، اور اپنی آنکھوں سے آپ کو دیکھتا بھی ہے تو اس کو اس بات کا عین الیقین اور حق الیقین ہوتا ہے کہ اس نے جو کچھ سنا ہے نبی کریم ﷺ کی زبان مبارک سے سنا ہے کسی اور ان کی زبان سے نہیں۔

۲۔ وہی صحابی اپنی طرح کے کسی دوسرے صحابی یا تابعیؒ سے بیان کرتے ہوئے کہتا ہے: سمعت النبی ﷺ یقول: میں نے نبی ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے...... تو اس صحابی یا تابعی کو اس پہلے صحابی کی روایت کے حدیث رسول ہونے کا علم الیقین ہوتا ہے، اس لیے کہ اس کے نزدیک وہ سچا ہے اور اس کے سچا ہونے کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ اگر اس کو رسول اللہ ﷺ کا ارشاد یا اس کا کچھ حصہ یاد نہ رہ گیا ہوتا تو وہ اس کی روایت نہ کرتا یہ درست ہے کہ نبی کریم ﷺ کے سوا کوئی بھی اعتقاداً کذب بیانی سے معصوم نہیں تھا اور نہ ہوگا، مگر عملاً اور تجرباً کسی صحابی کا جھوٹ بولنا اور وہ بھی روایت حدیث میں اگر محال نہیں، تو ناممکن ضرور تھا، اس لیے کہ حدیث ماخذ شریعت ہے اور نبی کریم ﷺ کی طرف ایسی بات منسوب کر کے بیان کرنا جو آپ نے نہ فرمائی ہو شریعت سازی ہے جو حرام ہے جس کا صدور کسی ایسی جماعت کے کسی فرد سے ناممکن تھا جس کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَ عَزَّرُوْهُ وَ نَصَرُوْهُ وَ اتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾ (الاعراف: ۱۵۷)

"تو جو لوگ اس پر ایمان لائے اور اس کو قوت دی اور اس کی مدد کی اور اس نور کی پیروی کی جو اس کے ساتھ

Marfat.com

نازل کیا گیا ہے وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔''

اس وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ جس طرح نبی ﷺ کی زبان مبارک سے حدیث سننے والا کہتا ہے: نبی ﷺ نے فرمایا ہے: اسی طرح اس صحابی سے وہ حدیث سننے والا صحابی یا تابعی بھی کہتا ہے: نبی ﷺ نے فرمایا ہے جبکہ پہلے صحابی نے وہ حدیث نبی ﷺ کو بیان کرتے ہوئے براہ راست سنی ہے اور دوسرے صحابی یا تابعی نے وہ حدیث بالواسطہ سنی ہے۔

صحابہ کرام کے درمیان شدید سیاسی اختلاف بھی ہوئے، ان کے مابین جنگیں بھی ہوئیں اور بعض صحابہ گناہ کبیرہ کے مرتکب بھی ہوئے جن سے وہ تائب ہو گئے، لیکن روایت حدیث میں کذب بیانی سے ان کا دامن پاک تھا، حتیٰ کہ اپنے شدید مخالفین کے بارے میں بھی کسی صحابی نے کوئی جھوٹی روایت گھڑ کر روایت نہیں کی۔

یہ صحیح ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی حیات پاک میں بھی منافقین موجود تھے، اور آپ کی وفات کے بعد بھی موجود رہے، مگر روایت حدیث میں کبھی بھی ان کا کوئی حصہ نہیں رہا اس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کی طرح حدیث کی بھی کس طرح حفاظت کی؟

اسی طرح نبی کریم ﷺ کی نسبت سے اگر کوئی صحابی کسی صحابی سے کوئی حدیث سنتا تھا تو بلا ادنی تردد اسے قبول کر لیتا تھا، اس کے برعکس حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے اذن باریابی کے متعلق حدیث سننے کے بعد ان سے جو گواہ طلب کیا اور ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا نے میت کے اہل خانہ کے رونے سے میت کے مبتلائے عذاب ہونے کی حدیث کے بارے میں جس رویہ اور طرز عمل کا اظہار کیا تو یہ دونوں واقعات ان دونوں صحابیوں کے ذاتی نقطہ نظر کے ترجمان تھے اور انہوں نے ان حدیثوں کے راویوں کی تکذیب نہیں کی تھی، میں نے صحیح بخاری کی بعض حدیثوں پر اعتراضات کی حقیقت میں ان دونوں واقعات پر بڑی تفصیل سے تبصرہ کیا ہے اور دلائل و براہین سے یہ ثابت کیا ہے کہ عمر بن خطاب اور ام المومنین اپنے فضل و مرتبے کی عظمت کے باوجود اپنے طرز عمل میں حق بجانب نہیں تھے۔

دراصل صحابہ کی عدالت محل بحث نہیں تھی اور ہر صحابی کے ''عدل'' ہونے کا لازمی تقاضا یہ تھا کہ وہ نبی ﷺ کے حوالہ سے کوئی ایسی بات روایت نہ کرے جو اسے یاد نہ رہ گئی ہو اس طرح حدیث کے راوی صحابہ کرام کی عدالت کی طرح ان کا حفظ و ضبط بھی محل بحث نہیں رہا۔

عدالت صحابہ کے محل بحث نہ ہونے سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ جس حدیث کے بارے میں یہ یقین کامل ہو کہ اس کی روایت کسی صحابی نے رسول اللہ ﷺ سے کی ہے وہ لازماً حدیث رسول ہے۔ اور اس سے صحابۂ کرام کے اندر علم و معرفت اور ایثار و قربانی اور نبی کریم ﷺ سے کسب فیض کے اعتبار سے فرق مراتب کی نفی بھی نہیں ہوتی، کیونکہ دونوں مختلف چیزیں ہیں۔

دراصل عدالت صحابہ، رسولوں کے منصب رسالت کی طرح ہے اور جس طرح ہر رسول اپنے دعوئ رسالت میں سچا

Marfat.com

تھا اور اس صفت میں ان کے درمیان کوئی فرق نہیں تھا، "لا نفرق بین أحد من رسله" اسی طرح عدالت کے اعتبار سے صحابہ کرام میں بھی کوئی تفریق درست نہیں۔

اصلاحی کا مبلغ علم:

اصلاحی صاحب نے ''مبادئ تدبر حدیث'' لکھ کر نہ اپنے حق میں اچھا کیا ہے اور نہ اپنے ان شاگردوں کے حق میں جوان کو اپنی لاعلمی کی وجہ سے امام تفسیر کے ساتھ محدث بھی سمجھنے لگے تھے، اگر انہوں نے مبادئ تدبر حدیث'' کے بجائے اپنی کتاب کا عنوان، ''الکفایہ کا تعارف'' رکھا ہوتا تو اس سے وہ منفی اثرات مترتب نہ ہوتے جو ''مبادئ تدبر حدیث'' سے مترتب ہوئے۔

اصلاحی صاحب علم حدیث کی ''ابجد'' سے بھی واقف نہیں تھے، بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ حدیث کو سمجھتے بھی نہیں تھے، جس کی مثالیں گزر چکی ہیں اور ان شاء اللہ آئندہ بھی آئیں گی، انہوں نے ستم یہ کیا ہے کہ حافظ خطیب بغدادی کی کتاب الکفایہ کو ''علم الروایہ'' میں حرف آخر قرار دے ڈالا، بلکہ وحی الٰہی کا درجہ دے دیا، پھر اس کے مندرجات سے اپنے غلط اور فاسد افکار ونظریات پر آنکھیں بند کر کے استدلال کرنے لگے اور اس کتاب میں جو ضعیف اور موضوع روایتیں منقول ہیں یا علماء کے جو اقوال منقول ہیں ان کو بھی جوں کا توں نقل کرتے چلے گئے ہیں جس کا سبب یہ تھا کہ اولا تو ان کے اندر صحیح اور ضعیف روایتوں میں تمیز کرنے کی صلاحیت نہیں تھی، ثانیا اس کتاب کے بعض مباحث میں انہوں نے اپنے بیمار ذہن کا علاج پا لیا تھا اس طرح حق سے دور ہوتے چلے گئے، اور اس خود فریبی میں بھی مبتلا رہے کہ وہ حدیث کی خدمت کر رہے ہیں۔

انہوں نے ''صحابہ کی تعدیل حدیث میں'' کے باب کے تحت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی جو حدیث نقل کی ہے اسی طرح باب القول فی معنی وصف الصحابی ...... کے تحت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اور سعید بن مسیب رحمہ اللہ کے جو اقوال نقل کیے ہیں وہ سب جھوٹ اور نا قابل اعتبار ہیں، لہٰذا ان روایتوں سے انہوں نے جو نتائج اخذ کیے ہیں وہ بھی باطل قرار پائے، عجیب بات یہ ہے کہ بغدادی نے اپنی کتاب کے "باب ما جاء فی تعدیل الله ورسوله للصحابه" کے تحت جو صحیح احادیث نقل کی ہیں، اصلاحی نے ان میں سے کسی سے بھی تعرض نہیں کیا ہے، فاعتبروا یا أُولی الأبصار۔

عدالت صحابہ کی طرح عدالت تابعی محض تابعیت سے ثابت نہیں ہوتی، بلکہ تابعی کا تابعی ہونا بھی اس وقت ثابت ہوتا ہے جب وہ صحابہ کا نیکوکاری اور حسن عمل میں تابع اور پیرو رہا ہو، لہٰذا جن لوگوں نے دین میں نئی راہیں نکالیں، اور عقائد واعمال میں صحابہ کے نقش قدم پر نہیں چلے وہ حقیقی معنوں میں تابعی نہیں تھے، بلکہ صرف تابعین کے معاصر یا ہم عصر تھے، اسی وجہ سے روایت حدیث میں کسی تابعی کے ثقہ اور معتبر ہونے کے لیے عدالت اور ضبط سے اس کے موصوف

Marfat.com

ہونے کا ثبوت لازمی ہے اور یہ ثبوت صرف نقاد حدیث اور راویوں کے حالات سے واقف محدثین کی کتابوں ہی سے مل سکتا ہے، متکلمین اور فقہاء کی کتابوں سے نہیں۔

اس طرح جب ایک عدل اور حافظ تابعی کسی دوسرے تابعی یا تبع تابعی سے اپنی سند سے کوئی حدیث بیان کرتا تو صحابی کی طرح وہ بھی کہتا کہ: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: حالانکہ وہ حدیث اس نے رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے براہ راست نہیں سنی ہوتی، لیکن چونکہ اس نے وہ حدیث کسی صحابی یا عدالت اور حفظ سے موصوف تابعی سے سنی تھی اس لیے اس کے حدیث رسول ہونے کا اسے علم الیقین تھا۔

یہ سلسلہ یوں ہی تبع تبع تابعی تک چلتا رہا اور سلسلہ رواۃ کے عدل اور ثقہ راویوں پر مشتمل ہونے کی وجہ سے ہر ایک یہی کہتا رہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے اور ہر کوئی اپنی اس خبر یا روایت یا تعبیر میں ''صادق القول'' تھا۔

حدیث واحد کی ظنیت پر غلط استدلال:

میں نے اوپر یہ دکھایا ہے کہ حدیث خبر کی ہم معنی نہیں، بلکہ اس کی ایک صفت میں اشتراک کی وجہ سے خبر ہے، یعنی جس طرح خبر ایک شخص سے دوسرے کو منتقل کی جاتی ہے، دوسرے سے بیان کی جاتی ہے، اسی طرح حدیث بھی بیان ونقل کے مراحل سے گزری ہے، اس تناظر میں ہر حدیث تو خبر ہے، لیکن ہر خبر حدیث نہیں ہے، یعنی دونوں میں عموم وخصوص کا تعلق ہے، اس فرق کی رعایت نہ کرنے کی وجہ سے بعض لوگ صحیح نصوص سے غلط استدلال کر بیٹھتے ہیں، مثال کے طور پر ''إتحاف النبيل بأجوبة أسئلة المصطلح والجرح والتعديل'' کے مصنف شیخ ابو الحسن مصطفیٰ بن اسماعیل نے اپنے اس دعویٰ: خبر واحد سے یقین نہیں حاصل ہوتا، کی صحت پر دو صحیح حدیثوں سے استدلال کیا ہے اور غلط استدلال کیا ہے۔

(۱)...... ((عن أم سلمة، عن النبي ﷺ قال: إنما أنا بشر، وإنكم تختصمون إليّ، ولعل بعضكم أن يكون ألحن بحجته من بعض، وأقضي له على نحو ما أسمع، فمن قضيت له من حق أخيه شيئاً فلا يأخذه، فإنما أقطع له قطعة من النار.))

''ام سلمہ (ام المؤمنین) رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، وہ نبی ﷺ سے روایت کرتی ہیں کہ آپ نے فرمایا: میں تو محض ایک انسان ہوں اور تم لوگ میرے پاس اپنے معاملات خصومت لے کر آتے ہو اور شاید تم میں سے بعض اپنی دلیل بیان کرنے میں دوسرے سے زیادہ ماہر ہو اور میں جیسا کچھ اس سے سنوں اس کے مطابق اس کے حق میں فیصلہ کر دوں، تو جس کے لیے میں اس کے بھائی کے حق میں سے کسی چیز کا فیصلہ کر دوں وہ اسے نہ لے، کیونکہ اس طرح میں اس کے لیے آگ کا ایک ٹکڑا کاٹتا ہوں۔'' [1]

---

[1] بخاری: ۷۱۶۹، مسلم: ۱۷۱۳

Marfat.com

(۲)...... دوسری حدیث کا تعلق ''لعان'' سے ہے۔ شریعت میں لعان سے مراد یہ ہے کہ جو شخص اپنی بیوی پر زنا کا الزام لگائے وہ چار دفعہ یہ قسم کھائے کہ وہ اپنے اس الزام میں سچا ہے، اور پانچویں بار یہ قسم کھائے کہ اگر وہ اپنے اس الزام میں جھوٹا ہو تو اس پر اللہ کی لعنت ہو، پھر بیوی چار بار اپنے شوہر کے جھوٹے ہونے پر قسم کھائے اور پانچویں بار یہ قسم کھائے کہ اگر وہ اپنے الزام میں سچا ہو تو وہ (بیوی) اللہ کے غضب کی مستحق ہو۔

یہ شرعی مسئلہ دراصل سورۃ نور کی آیات نمبر ۶ تا ۹ سے ماخوذ ہے۔

قرآن پاک کی ان آیات سے ماخوذ اس شرعی مسئلہ کی عملی تشریح سے متعلق متعدد احادیث صحیحین اور سنن میں آئی ہیں اور نبی کریم ﷺ نے ایک دوسرے پر لعنت بھیجنے والے شوہر اور بیوی کو مخاطب کر کے فرمایا ہے: "اللّٰہ یعلم أن أحد کما لکاذبٌ" اللہ جانتا ہے کہ تم میں سے ایک یقیناً جھوٹا ہے، ایک حدیث کا متن اور ترجمہ درج ذیل ہے:

((عن سعید بن جُبیر قال: قلت لابن عمرَ: رجل قذف اِمرأته، فقال: فرق النبی ﷺ بین أخوی بنی عجلان، وقال: اللّٰہ یعلم أن أحدَ کما لکاذب فهل منکما تائب......))

''سعید بن جبیر سے روایت ہے کہتے ہیں: میں نے ابن عمر رضی اللہ عنہما سے عرض کیا: ایک مرد نے اپنی بیوی پر الزام لگایا، اس پر انہوں نے فرمایا: نبی ﷺ نے بنو عجلان کے دو افراد (مرد اور اس کی بیوی) کے مابین تفریق کرا دی تھی، اور فرمایا تھا کہ: اللہ جانتا ہے کہ تم میں سے ایک یقیناً جھوٹا ہے، تو کیا تم میں سے کوئی توبہ کرنے والا ہے؟......'' [1]

حدیث واحد کی ظنیت پر استدلال:

صاحب اتحاف نے ان دونوں حدیثوں سے خبر واحد کے ظنی یا غیر یقینی ہونے پر استدلال کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ: ''خبر واحد کے یقینی نہ ہونے کے دلائل میں سے ایک دلیل ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی حدیث ہے کہ نبی ﷺ نے دلائل و بیانات سن کر اپنا فیصلہ سنا دیا، مگر اس کے باوجود اپنے اس یقین وقطعیت کا اظہار نہیں فرمایا کہ آپ نے حقدار ہی کو اس کو حق دیا ہے، اس سے یہ دلیل ملتی ہے کہ دلیل وبینہ یا ''عدل'' کی دی ہوئی خبر پر عمل کرنا واجب ہے، لیکن مخبر کی صدق گوئی پر قطعیت کے ساتھ یقین کیے بغیر، بلکہ غلبہ ظن کے ساتھ، جیسا کہ ہم مفتی کے فتویٰ اور گواہ کی گواہی پر اس امکان کے ساتھ عمل کرتے ہیں کہ صورت واقعہ اس کے برعکس بھی ہو سکتی ہے اگرچہ یہ امکان مرجوح اور کمزور ہو۔''

رہی دوسری حدیث جس میں ایک دوسرے پر لعنت بھیجنے والے مرد اور بیوی کی خبر دی گئی ہے تو نبی کریم ﷺ نے خود فرمایا ہے کہ: ''اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ تم میں سے ایک یقیناً جھوٹا ہے تو کیا تم میں سے کوئی توبہ کرنے والا ہے۔''

[1] بخاری: ۵۳۱۱-۵۳۱۲، ۵۳۴۹، مسلم: ۱۴۹۳-۵-۶۔

Marfat.com

تبصرہ:

ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں کسی معاملہ میں مخاصمت اور نزاع کی حالت بیان کی گئی ہے، اور یہ بات معلوم ومعروف ہے کہ جب کسی مسئلہ یا معاملہ میں دو یا اس سے زیادہ لوگوں میں نزاع ہو جاتا ہے تو ہر شخص یا فریق اپنے آپ کو صاحب حق قرار دینے کی کوشش کرتا ہے اور حاکم، یا قاضی ہر ایک کے دلائل سن کر یہ فیصلہ کرتا ہے کہ سچا اور حقدار کون ہے؟ اس حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو تعلیم دینی چاہی ہے وہ اولا تو یہ ہے کہ آپ کو غیب کا علم حاصل نہیں تھا کہ لوگوں کے دعوے سن کر یہ سمجھ جائیں کہ کون اپنے دعوے میں سچا ہے اور کون جھوٹا؟ ثانیا آپ نے یہ تعلیم دی ہے کہ آپ جو فیصلہ بھی کرتے ہیں وہ فریقین کی دلائل کی روشنی میں اور بشر ہونے کی وجہ سے اگر آپ کسی فریق کی قوت بیان اور دلائل سے متاثر ہو کر اس کے حق میں فیصلہ دے دیں اور اس کو اس چیز کا حقدار قرار دے دیں جس کا حقیقت میں وہ حقدار نہیں ہے تو آپ کے اس فیصلہ سے وہ چیز اس کے لیے حلال نہیں ہو جائے گی جس کے لیے آپ نے "قطعة من النار" کی تعبیر اختیار فرمائی ہے جس سے اس کی سنگین بیان کرنی مقصود ہے۔

آخر اس واقعہ سے ''حدیث واحد'' کی ظنیت کس طرح ثابت ہوتی ہے؟ نزاع اور خصومت کے موقع پر ہر فریق پر ''مفاد'' کے حصول کا جذبہ غالب رہتا ہے اس لیے ہر ایک اپنے آپ کو صاحب حق ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے، کیا روایت حدیث کے موقع پر حدیث کے راویوں پر بھی اسی طرح کا کوئی جذبہ غالب ہوتا ہے، میری مراد 'عدل' اور حفظ وضبط سے موصوف راوی ہیں۔ ہر طرح کے راوی نہیں، مثال کے طور پر جب ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ یہ کہتے تھے کہ: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسا فرماتے ہوئے سنا ہے اور ان سے روایت کرتے ہوئے سعید بن مسیب کہتے تھے کہ: ''میں نے ابو ہریرہ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے، اور ان سے روایت کرتے ہوئے زہری کہتے تھے کہ: ''میں نے سعید بن مسیب کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے اور زہری سے روایت کرتے ہوئے مالک بن انس یہ کہتے تھے کہ: میں نے زہری کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے'' تو ان میں سے ہر ایک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی ارشاد یا کوئی عمل بیان کرتا تھا اور اس کی بنیاد سماع کو قرار دیتا تھا جو یقینی ذریعہ علم ہے اور حدیث دین ہے، تو کیا کسی بھی صورت سے یہ روایت واحد دو فریق مقدمہ کے دعویٰ حق کی طرح ہے، مزید یہ کہ راوی حدیث کا مقصد دین کی تبلیغ و ترویج کے سوا کچھ اور نہیں تھا اور وہ غایت درجہ عدالت و حفظ کی صفت سے بھی موصوف تھا، جبکہ کسی مقدمے کے فریقوں کے پیش نظر اپنے ذاتی مفادات ہوتے ہیں یا ان میں سے صرف ایک حقدار ہوتا ہے، رہا دوسرا تو وہ محض دعویدار۔

رہا مفتی کا فتویٰ تو وہ یا تو اس کے اجتہاد پر مبنی ہوتا ہے اور اجتہاد صواب اور خطا دونوں کا احتمال رکھتا ہے یا کسی ایسی دلیل پر مبنی ہوتا ہے جو صحیح نہیں ہوتی، پھر ہر مفتی کے فتویٰ پر عمل کرنا واجب بھی نہیں ہے اور یہ معلوم کرنا بہت آسان ہے کہ کس مفتی کا فتویٰ یقینی علم پر مبنی ہے۔

Marfat.com

رہی گواہ کی گواہی تو اللہ تعالیٰ نے اس گواہ کے جو اوصاف بیان کر دیے ہیں اگر وہ ان سے موصوف ہو تو اس کی گواہی پر عمل اللہ کے حکم سے فرض ہوا نہ کہ غلبہ ظن'' کی بنیاد پر'' لہٰذا حدیث واحد کو مفتی کے فتویٰ اور گواہ کی گواہی پر قیاس کرنا قیاس مع الفارق ہے۔ یاد رہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے دنیاوی اور مادی حقوق کی حفاظت کا کوئی وعدہ نہیں کیا ہے، لیکن اپنے دین کی حفاظت کا وعدہ کیا ہے اور وہ اس طرح کہ اس دین کے مکمل اور تمام ہونے کا اعلان فرما دیا ہے اور اس دین میں کسی طرح کی کمی یا نقص اس کے کامل ہونے کے منافی ہے اور یہ معلوم ہے کہ اللہ اور رسول کی اطاعت یکساں درجہ رکھتی ہے۔ اب اگر اعلان الٰہی کے مطابق قرآن تو محفوظ ہے، لیکن حدیث محفوظ نہیں ہے یا محفوظ تو ہے مگر قرآن کی طرح یقینی نہیں، بلکہ ظنی ہے تو پھر نہ تو یقین کے ساتھ اللہ کی اطاعت ہو رہی ہے اور نہ رسول کی، بلکہ اس طرح اطاعت ہو رہی ہے کہ اس میں ان کی معصیت اور نافرمانی کا بھی شائبہ ہے۔

اتحاف النبیل کے مصنف شیخ مصطفیٰ بن اسماعیل نے حدیث لعان میں نبی کریم ﷺ کے ارشاد: اللہ جانتا ہے کہ تم میں سے ایک یقیناً جھوٹا ہے، سے خبر واحد کی ظنیت پر استدلال کیا ہے، کیسے؟ اس کا علم اللہ تعالیٰ کو ہے یا ان کو، لعان کے مسئلہ میں اگر شوہر اپنے الزام میں سچا ہو تو بیوی اپنے انکار میں جھوٹی ہوگی اور اگر بیوی اپنے انکار میں سچی ہو تو شوہر اپنے الزام میں جھوٹا ہوگا، نہ دونوں بیک وقت سچے ہو سکتے ہیں اور نہ جھوٹے، تو کیا روایت حدیث پر لعان کی صفت صادق آتی ہے؟ اگر جواب اثبات میں ہے تو پھر کوئی بھی حدیث قابل تصدیق اور قابل عمل نہیں رہی اس لیے کہ حدیث متواتر کے عالم واقعہ میں غیر موجود ہونے کی وجہ سے صرف احادیث آحاد باقی بچیں اور ان دونوں واقعات سے ان کی حقیقت معلوم ہوگئی، لہٰذا پورا دین گورکھ دھندا بن کر رہ گیا۔ "یریدون أن یُطفئُوا نور اللہ بأفواھِھم ویأبی اللہ إلا أن یُتم نورہ ولو کرہ الکافرون."

روایت حدیث اور علم حدیث

حدیث واحد کی اس بحث میں میری مراد اس حدیث سے ہے جس کا راوی ایک طبقہ میں یا تمام طبقات میں ایک رہا ہو۔ اگرچہ علمائے حدیث اور معتزلہ، متکلمین، اور نئے دور کے محققین اور مجددین امت ہر اس حدیث کو خبر واحد سے تعبیر کرتے ہیں جو خبر متواتر نہیں ہے۔ اور حدیث کی اس قسم ''حدیث واحد'' کے بارے میں یہ تاثر دیتے ہیں کہ کسی حدیث کے ہر طبقہ، یا طبقہ صحابہ میں صرف ایک راوی یا چند راویوں سے روایت ہونے کے معنی یہ ہیں کہ خود صحابہ کرام کے دلوں میں بھی اس کی چنداں قدر و قیمت نہیں تھی۔ مناظر احسن گیلانی اور علامہ انور شاہ شاہ کشمیری کے نزدیک تو خود نبی کریم ﷺ بھی اخبار آحاد کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے اور یہ نہیں چاہتے تھے کہ یہ احادیث قرآن کے مساوی ہونے پائیں یہ محض دعویٰ نہیں حقیقت واقعہ ہے جس کو میں پوری تفصیل سے اور دلائل کے ساتھ بیان کر چکا ہوں۔

میں آئندہ سطور میں یہ دکھاؤں گا کہ روایت حدیث علم حدیث سے بالکل مختلف چیز ہے بایں معنی کہ جس حدیث کا

Marfat.com

راوی صحابہ کرام میں صرف ایک رہا ہو، بشرطیکہ اس حدیث کے خلاف کوئی دوسری حدیث نہ ملتی ہو اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ اس حدیث کا علم رکھنے والا اور اس پر عمل کرنے والا بھی صرف ایک یا چند افراد رہے ہوں گے، ایسا اس لیے ہے کہ روایت حدیث تو فرض کفایہ تھی، جبکہ اس کا علم رکھنا اور اس پر عمل کرنا فرض عین تھا، کیونکہ رسول اللہ ﷺ سب کے رسول تھے اور آپ کا ہر ارشاد سب کے لیے یکساں درجے میں مشعل راہ اور دستور حیات تھا، اور بظاہر اس کا راوی اگرچہ صرف ایک رہا ہو، مگر اس ایک راوی کے ذریعہ وہ حدیث جم غفیر میں پھیل چکی ہوگی جس کا ریکارڈ پر آنا ضروری نہیں تھا۔

ا۔ پہلی مثال:

میں نے ابھی جو کچھ عرض کیا ہے اس کی مثال نیت کی حدیث ہے، یہ حدیث دین کی بنیاد ہے جس پر پورے دین کی عمارت کھڑی ہے اور کوئی بھی شرعی عمل نیت کے بغیر قابل اعتبار نہیں بایں ہمہ اس اہم حدیث کے راوی صرف عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ ہیں۔ تو کیا اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ: اس حدیث کا علم رکھنے والے صرف عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ تھے، کیونکہ صرف وہی اس کے راوی ہیں؟ یا اس کا علم تو تقریباً تمام ہی صحابہ کرام کو رہا ہوگا، البتہ اس کی روایت کرنے والے صرف ایک صحابی تھے۔

معلوم ہوا کہ کسی حدیث کے راوی کے ایک ہونے یا چند کے ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس حدیث کا علم رکھنے والا بھی صرف ایک تھا یا معدودے چند تھے۔ عجیب بات یہ ہے کہ طبقہ تابعین کے تین گروہوں میں (بڑے، متوسط، چھوٹے) بھی اس حدیث کے راوی ایک ایک تھے۔

عمر رضی اللہ عنہ سے اس کی روایت صرف علقمہ بن وقاص لیثی متوفی ۸۰ھ نے کی ہے۔ جن کا شمار بڑے تابعین میں ہوتا ہے، اور ان سے اس کے راوی صرف محمد بن ابراہیم تیمی متوفی ۱۲۰ھ ہیں جو تابعین کے متوسط گروپ سے تعلق رکھتے تھے، اور محمد بن ابراہیم تیمی سے اس کی روایت کرنے والے صرف یحییٰ بن سعید انصاری متوفی ۱۴۳ھ ہیں جو طبقہ تابعین کے کم عمر گروپ میں شمار ہوتے ہیں۔

یاد رہے کہ روایان حدیث کے طبقات میں یہ گروپ بندی عمر کے اعتبار سے ہے۔ مقام و مرتبے کے لحاظ سے نہیں اور تابعین کا طبقہ ۱۲ھ سے ۱۵۰ھ تک کے درمیانی زمانے پر پھیلا ہوا ہے اور وفات پانے والے سب سے آخری صحابی ابو طفیل عامر بن واثلہ ہیں جن کی وفات ۱۱۰ھ میں ہوئی اس سے یہ واضح ہوا کہ تابعین کا طبقہ صحابہ کے طبقہ میں پیوست ہے، اور ان کی تعلیم و تربیت صحابہ ہی کے ہاتھوں اور انہی کے اندر ہوئی، یہی حال تبع تابعین اور تبع تبع تابعین کا بھی تھا، اور تبع تبع تابعین کا زمانہ ۱۵۱ھ سے ۳۰۰ھ تک پھیلا ہوا ہے اور ۳۰۰ھ تک حدیث کی مستند اور امہات الکتب تدوین پا کر عالم اسلام کے ہر شہر اور قصبے میں پھیل چکی تھیں۔ جب کہ انفرادی طور پر، صحابہ کرام، تابعین اور تبع تابعین اور ان کے بعد کے طبقوں میں بہت سے لوگ احادیث زبانی یاد رکھنے کے ساتھ ان کو قلم بند بھی کر لیا کرتے تھے۔ متفرق شکل ان میں ان لکھی ہوئی حدیثوں کو نبی ﷺ کی حیات پاک میں لکھے جانے والے قرآنی صحیفوں سے تشبیہ دی جا سکتی ہے۔

Marfat.com

۲۔ دوسری مثال:

۱۰ ہجری میں نبی کریم فداہ ابی وامی ﷺ نے اپنا حج کیا جو ہجرت کے بعد آپ کا پہلا حج بھی تھا۔ اسے ''حجۃ الوداع'' کہتے ہیں۔ اس سفر میں انبیاء علیہم الصلاۃ والسلام کے بعد اولاد آدم کی مقدس ترین جماعت، صحابہ کرام کے کوئی ایک لاکھ چوبیس ہزار جاں نثار آپ کے ہمراہ تھے جب نبی کریم ﷺ عرفات پہنچے تو وہاں وادی نمرہ میں آپ کے لیے قبہ تیار تھا جس میں آپ اترے، پھر جب سورج ڈھل گیا تو آپ کے حکم سے قصواء پر کجاوہ کسا گیا اور آپ بطن وادی میں تشریف لے گئے، جہاں آپ نے ایک نہایت جامع خطبہ ارشاد فرمایا یہ خطبہ دیتے ہوئے آپ اونٹنی پر سوار رہے اس خطبہ میں رسول اللہ ﷺ نے اسلام کے بنیادی احکام اور تعلیمات کا نچوڑ بیان فرمادیا، آپ نے فرمایا:

''تمہارے اس دن کی، تمہارے اس مہینے کی اور تمہارے اس شہر کی حرمت کی طرح تمہارا خون اور تمہارے اموال ایک دوسرے پر حرام ہیں۔ غور سے سن لو! جاہلیت کی ہر چیز میرے پیروں کے نیچے ہے اور اپنا اعتبار کھوچکی ہے، اور اپنے خونوں میں سے جس پہلے خون کو میں کالعدم کرتا ہوں وہ ربیعہ بن حارث کے بیٹے کا خون ہے، یہ بنوسعد میں دودھ پی رہا تھا کہ قبیلہ ہذیل نے اسے قتل کر دیا، اور جاہلیت کا سود ساقط ہے، اور اپنے سودی اموال میں سے جس پہلے سود کو میں ساقط اور کالعدم کرتا ہوں وہ عباس بن عبدالمطلب کا سود ہے، یہ سارا سود ساقط اور غیر معتبر ہے۔

تم لوگ عورتوں کے حق میں اللہ کے عذاب سے بچنے کی تدبیر کرو، تم نے انہیں اللہ کے امان سے اپنی عصمت میں لیا ہے اور ان کی شرمگاہوں کو اللہ کے کلمہ کے ذریعے اپنے لیے حلال بنایا ہے، اور تمہارا ان پر یہ حق ہے کہ وہ کسی ایسے شخص کو تمہارے بستروں پر نہ بیٹھنے دیں جسے تم ناپسند کرتے ہو، اگر وہ ایسا کریں تو تم ان کو مار سکتے ہو جو سخت نہ ہو اور ان کا تمہارے اوپر یہ حق ہے کہ تم ان کو بھلے طریقے سے اور رواج کے مطابق کھانے پینے کی اشیا اور پوشاک فراہم کرو۔

میں تمہارے اندر ایک ایسی چیز چھوڑے جارہا ہوں جس کو اگر تم نے مضبوطی سے تھامے رکھا تو ہرگز گمراہ نہ ہوگے اور وہ ہے اللہ کی کتاب۔''

تم سے میرے بارے میں پوچھا جائے گا تو تم کیا جواب دینے والے ہو؟ لوگوں نے عرض کیا: ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ نے تبلیغ کا حق ادا کر دیا، اپنا فرض منصبی پورا کر دیا اور حق خیر خواہی ادا کر دیا۔''

آپ نے اپنی انگشت شہادت آسمان کی طرف اٹھائی اور اس سے لوگوں کی طرف اشارہ کیا اور تین بار کہا:

اے اللہ تو گواہ رہیو۔'' [1]

---

[1] مسلم: ۱۲۱۸۔

Marfat.com

چشم فلک نے انسانی تاریخ میں اس سے قبل اہل حق کا اتنا بڑا اجتماع کبھی نہیں دیکھا تھا اور نہ اس شان کا کوئی اجتماع بعد میں دیکھا، اس مقدس اجتماع میں شریک ہر شخص کے دل میں رسول اللہ ﷺ کی محبت موجزن تھی اور اس کے رگ و ریشہ میں خون بن کر دوڑ رہی تھی، ہر شخص کے نزدیک آپ کی زبان سے نکلنے والا ہر لفظ متاع حیات اور مشعل راہ تھا، آپ جو کچھ فرما رہے تھے اسے صحابہ کرام سر کے کانوں سے زیادہ دل کے کانوں سے سن رہے تھے، ہر شخص کی نگاہ آپ کے رخ انور پر مرکوز تھی اور آپ کی زبان مبارک سے نکلنے والے کلمات اس کے کانوں میں رس گھول رہے تھے۔

نبی اکرم ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے فصاحت و بلاغت کی سب سے بلند چوٹی پر سرفراز کر رکھا تھا اور حسن بیان میں کوئی آپ کا ثانی نہیں تھا، بایں ہمہ آپ اپنی بات ٹھہر ٹھہر کر اور ایک ایک لفظ الگ کر کے فرماتے تھے اس طرح ہر شخص کے لوح قلب پر وہ نقش ہو جاتی تھی۔

اس پر مستزاد یہ کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو غیر معمولی اور بے نظیر جسمانی جمال سے نواز رکھا تھا، آپ کے چہرۂ انور سے روشنی کی کرنیں پھوٹتی رہتی تھیں، آپ کے رخ انور پر ایک بے مثال رعب کے ساتھ ایک ایسی دلربائی اور رعنائی تھی کہ ہر شخص کا دل اس کی طرف بے ساختہ کھنچا جاتا تھا۔

میدان عرفات میں پیارے نبی فداہ ابی و امی ﷺ کے ساتھ صحابہ کرام کا یہ اجتماع پہلا اور آخری تھا، کیونکہ بعض روایتوں کے مطابق خطبہ شروع کرنے سے قبل آپ نے یہ بھی فرما دیا تھا کہ:

"لوگو! اس سال کے بعد اس مقام پر میں تم سے شاید کبھی نہ مل سکوں۔" ❶

نبی ﷺ کے اس اعلان کی وجہ سے ہر شخص حد درجہ جذباتی اور دل گرفتہ بھی تھا اور آپ کا خطبہ نہایت توجہ سے سن رہا تھا۔

اس کے باوجود اس عظیم اور تاریخی خطبہ کی روایت کرنے والے صحابہ کرام کی تعداد کتنی ہے، میں نے اوپر خطبہ کے جس حصہ کا ترجمہ نقل کیا ہے وہ صحیح مسلم میں جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے مروی ہے جو پورا خطبہ نہیں، بلکہ اس کا ایک حصہ ہے، اور دوسرے جن صحابہ نے اس کی روایت کی ہے، ان میں سے بھی کسی نے پورے خطبہ کی روایت نہیں کی ہے، بلکہ کسی نے اس کا کوئی حصہ بیان کیا ہے اور کسی نے کوئی اور، اس خطبہ کے اجزاء کو الگ الگ روایت کرنے والے دوسرے صحابہ کرام کے نام ہیں: ابو بکر رضی اللہ عنہ، عمرو بن احوص رضی اللہ عنہ، ابو امامہ باہلی رضی اللہ عنہ، ابن عمر رضی اللہ عنہما، عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، جابر بن عبداللہ کو لے کر یہ کل سات صحابی ہیں جنہوں نے عرفات کے خطبہ کی روایت کی ہے۔

حجۃ الوداع اور خطبہ عرفہ کی روایتیں حدیث کی جن کتابوں میں نقل کی گئی ہیں ان میں بخاری: ۱۵۵۷، ۱۷۸۵، ۲۵۰۶، ۲۳۵، ۴۴۰۳، ۴۴۰۷، ۲۳۰۷، مسلم: ۱۲۱۲، ۱۲۱۴، ۱۲۱۵، ۱۲۱۶، ۱۲۱۸، ابو داود: ۱۹۰۵، نسائی: ۲۷۱۳، ابن ماجہ:

---

❶ ابن ہشام ص ۶۰۳ ج ۲ بحوالہ الرحیق المختوم ص ۶۱۶۔

Marfat.com

۳۰۷۲، مسند طیالسی ۹۹۱ وغیرہ۔

حجۃ الوداع جیسے اہم حج اور خطبہ عرفہ جیسے تاریخی خطبہ کی روایت ''خبر واحد'' میں شمار ہوتی ہے جو معتزلہ، متکلمین، منکرین حدیث اور عصر جدید کے محققین کے نزدیک ظنی ہے۔ جس سے قرآن پاک میں اضافہ اور اصول اسلام کے قبیل کا کوئی حکم ثابت نہیں ہوتا اس مسئلہ پر میری تفصیلی گفتگو تو ان شاء اللہ بعد میں ہوگی اس وقت میں جو کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ کیا ایک لاکھ چوبیس ہزار صحابہ میں سے صرف سات صحابیوں کا حجۃ الوادع اور خطبہ عرفات کی تفصیلات روایت کرنا یہ معنی رکھتا ہے کہ ان کا علم صرف انہی کو تھا؟ یا ان کا علم تو تقریباً سب کو تھا اور سب اس عمل حج میں شریک بھی تھے اور سب نے خطبہ عرفہ سنا بھی تھا، البتہ ان کی روایت صرف چند نے کی اس طرح یہ واقعات محفوظ بھی ہو گئے اور صحابہ سے تابعین کو منتقل بھی ہو گئے۔

نیت اور حجۃ الوداع کی احادیث کے ''آحاد'' ہونے سے اس دعویٰ کی جڑیں کٹ جاتی ہے کہ ''عموم البلوی'' کی احادیث کے راویوں کی تعداد متواتر ہونی چاہیے۔ کیا نیت اور حجۃ الوداع سے بڑا اور اہم واقعہ کوئی اور ہوسکتا ہے جس پر عموم البلوی کا اطلاق کیا جائے؟

دراصل ''خبر واحد'' اور ''خبر متواتر'' کا ہوّا کھڑا کر کے اور خبر واحد کی ظنیت کا نعرہ لگا کر منکرین نے احادیث کو نا قابل اعتبار ثابت کرنے کی جو مہم چلا رکھی ہے وہ ایک شیطانی چال ہے جو کبھی کامیاب نہیں ہوسکتی۔

روایت حدیث کے مسئلہ میں صحابہ کا طرز عمل ایک دوسرے سے مختلف تھا، اکثریت ایسے صحابہ کی تھی جو صرف ضرورت پڑنے، یا رسول اللہ ﷺ کے کسی قول یا فعل کے بارے میں سوال کیے جانے کے موقع پر حدیث بیان کرتے تھے، جبکہ ان کے بالمقابل ایسے صحابہ تھے جو روایت حدیث کو تبلیغ دین کے عمومی حکم میں شامل مان کر اس کی روایت کو ضروری خیال کرتے تھے اس طرح حدیث کی نشر واشاعت مطلوبہ شکل میں ہو رہی تھی اس عمل میں صحابہ کرام کے مقام ومرتبے کے اعتبار سے کوئی گروپ بندی بھی نہیں تھی، لیکن حدیث کے شرعی ماخذ ہونے کی وجہ سے اس پر دونوں قسم کے صحابہ کا عمل تھا۔

نتیجہ:

میں اوپر یہ عرض کر چکا ہوں کہ حدیث ظنی نہیں، یقینی ہے اور اس سے یقین کی ٹھنڈک حاصل ہوتی ہے، قطع نظر اس کے کہ اس کا راوی ایک ہے یا ایک سے زیادہ، ایسا اس لیے ہے کہ اس کی بنا یقینی ذریعہ علم، سماع پر ہے، نبی کریم ﷺ سے اس کی روایت کرنے والے کو تو عین الیقین اور حق الیقین حاصل ہوتا تھا، رہے اس صحابی سے اسے سننے والے تابعی، تبع تابعی اور تبع تبع تابعی تو ان کو اس کی صحت کا علم الیقین حاصل ہوتا تھا، کیونکہ صحابہ کے بعد کے یہ تینوں راوی عدالت اور حفظ سے کماحقہ موصوف ہوتے تھے اور عدل اور حافظ راوی کی خبر ظنی نہیں، یقینی ہوتی ہے۔

Marfat.com

حدیث واحد کی پہلی مثال میں نے جو دی ہے وہ صحابی کے بعد تین طبقات میں یعنی ۱۴۳ھ تک صرف ایک ایک راوی سے مروی ہونے کے باوجود یقینی ہے اور چند عقل پرستوں کے سوا تمام علمائے اسلام کے نزدیک "ظنیت" سے پاک ہے۔

اور دوسری حدیث اگرچہ سات صحابیوں سے مروی ہے، مگر ان میں سے کسی نے بھی اس کا مکمل متن نہیں بیان کیا ہے، بلکہ کسی نے اس کا کوئی فقرہ بیان کیا ہے اور کسی نے کوئی اور، اور اگر یہ ہر صحابی سے مکمل طور پر بھی بیان ہوتی تب بھی حدیث واحد ہی ہوتی، اس سے دو باتیں معلوم ہوئیں:

۱۔ اگر کوئی حدیث صرف ایک ہی راوی سے مروی ہو اور وہ راوی عدالت اور حفظ سے موصوف ہو اور اسی درجے کی کوئی اور روایت اس کے خلاف نہ ہو تو اس سے علم الیقین حاصل ہوتا ہے "ظن" نہیں، ویسے ایک ہی درجے کی دو صحیح حدیثیں ایک دوسرے کے خلاف نہیں ہوسکتیں جس طرح قرآن پاک کی دو یا دو سے زیادہ آیتیں آپس میں ایک دوسرے کے خلاف نہیں ہوسکتیں۔

۲۔ اگر کوئی حدیث ایک سے زیادہ راویوں سے مروی ہو تو اس سے حاصل ہونے والے یقین کے درجہ اور کیفیت میں تبدیل ہوگی نفس یقین میں نہیں اس درجہ اور کیفیت کو یوں سمجھئے کہ ہمارا ایمان خلفائے راشدین کے ایمان کی طرح نہیں ہے، بلکہ خود تمام صحابہ کرام کا ایمان مساوی نہیں تھا، لیکن ہر مومن صادق کا ایمان ایمان ہی ہے اور معتبر ہے، اور قرآن کے مطابق ایمان بڑھتا بھی ہے اور گھٹتا بھی، لیکن کفر میں تبدیل نہیں ہوتا۔

اسی طرح ایک ہی راوی سے مروی حدیث سے جو یقین حاصل ہوتا ہے وہ یقین اس یقین سے درجہ اور کیفیت میں کم ہوتا ہے جو کئی راویوں سے مروی حدیث سے حاصل ہوتا ہے، البتہ دونوں قسم کی حدیثوں سے حاصل ہونے والا یقین، یقین ہی رہتا ہے ظن، شک اور وہم وخیال نہیں بن جاتا، اس پہلو کی مزید وضاحت "حدیث واحد کے شرعی حجت ہونے کے دلائل" کی فصل میں آرہی ہے۔

خطبہ حجۃ الوداع کی حدیث سے ایک اور اہم حقیقت یہ عیاں ہوئی ہے کہ دین وشریعت سے متعلق رسول کریم ﷺ کی زبان مبارک سے نکلا ہوا کوئی ایک لفظ اور آپ کی سیرت پاک کا کوئی ایک واقعہ بھی ضائع نہیں ہوا ہے اور نہ قیامت تک ہوسکتا ہے، اس لیے کہ یہ دین ہے اور دین مکمل طور پر محفوظ ہے، لیکن اس کا ماخذ ومرجع احادیث کے مستند ذخائر ہیں، رازی، جوینی، غزالی، کشمیری، گیلانی، اصلاحی، غامدی اور ندوی وغیرہ کی کتابیں اور تحریریں نہیں۔

حدیث نبی کریم ﷺ کا اجتہاد ہے؟:

منکرین حدیث اور حدیث کو مشروط حجت ماننے والے قدیم زمانے سے اب تک اس کی شرعی حیثیت کو مشکوک بنانے میں لگے ہوئے ہیں اس مذموم غرض کو بروئے کار لانے کے لیے وہ جو حربے استعمال کر رہے ہیں ان میں سے ایک ان کا یہ دعویٰ ہے کہ حدیث وحی الٰہی نہیں، بلکہ نبی کریم ﷺ کا اجتہاد ہے، ہم تھوڑی دیر کے لیے ان کا یہ دعویٰ مان

Marfat.com

لیتے ہیں، مگر اس کے ساتھ ان سے یہ سوال کرتے ہیں کہ حدیث وحی ہے یا رسول کریم ﷺ کا اجتہاد اور قرآن سے آپ کا استنباط، اس سے امر واقعہ میں کیا فرق واقع ہوا، کیا قرآن کے مطابق اپ کی مطلق اور غیر مشروط اطاعت فرض نہیں ہے. اگر اس کا جواب اثبات میں ہے تو پھر حدیث کے وحی ہونے یا اجتہاد ہونے کی بحث عبث اور تضیع اوقات ہے، اور اگر جواب نفی میں ہے تو یہ حدیث سے پہلے قرآن کا انکار اور قرآن کو نازل کرنے والے کو چیلنج کرنا ہے، انجام سوچ لو۔

سلیمان ندوی کی بڑ:

حدیث اور سنت میں فرق، اور عقائد کے باب میں حدیث واحد کے نا قابل استدلال ہونے کی بحث کے ضمن میں مولانا سیّد سلیمان ندوی کا ذکر خیر بار بار آ چکا ہے ان کا ایک دعویٰ اور بڑ یہ ہے:

''بہت سے علمائے محققین کی طرح میرا بھی یہ اعتقاد ہے کہ احکام واخلاق کے متعلق صحیح احادیث میں جو کچھ ہے وہ تمام تر قرآن سے ماخوذ ومستنبط ہے۔''❶

بلاشبہ موصوف کا شمار علمائے محققین میں ہوتا ہے، اگر چہ آخری عمر میں وہ اس جماعت میں شامل ہو گئے تھے جس کے عقائد، اعمال اور ریاضتیں اسلام اور غیر اسلام کا مجموعہ ہیں۔ اپنے نام اور شہرت کی رعایت کرتے ہوئے ان کو اتنے بڑے دعوے کے دلائل قران وحدیث سے دینے چاہیے تھے۔ صرف محققین کی جماعت میں شامل ہو جانے اور ان کا عقیدہ اپنا لینے سے کوئی دعویٰ دلیل تو نہیں ہو جاتا۔

آگے انہوں نے اس اجتہاد واستنباط کا نام تبیین (کھولنا) اور إراءۃ (دکھانا) دیا ہے۔ اور تاکید الٰہی اور شرح ربانی کی وجہ سے بہ شرط ثبوت اس اجتہاد واستنباط کو یقینی اور واجب التعمیل قرار دیا ہے اور اس کے متواتر ہونے کی شرط نہیں لگائی ہے۔

احکام واخلاق سے ندوی صاحب نے کیا مراد لیا ہے اس کا علم ہمیں نہیں، البتہ ان کے مبنی بر ''وحی'' ہونے کی یہ فرما کر کلی نفی کر دی ہے کہ ''وہ تمام تر قرآن سے ماخوذ ومستنبط ہے۔''

نبی کریم ﷺ کے اجتہاد کے مسئلہ میں شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے بھی اظہار خیال کیا ہے اور ان کا بیان زیادہ دقیق اور اقرب الی الصواب ہے، سنت یا حدیث کے وحی الٰہی ہونے یا محض اجتہاد واستنباط ہونے کے مسئلہ کی وضاحت سے قبل میں شاہ ولی اللہ کی عبارت نقل کر دینا مناسب خیال کرتا ہوں، فرماتے ہیں:

نبی ﷺ کے بعض علوم وحی پر مبنی ہیں:

نبی ﷺ کے جو علوم معاد اور اقتدار الٰہی کے عجائبات سے تعلق رکھتے ہیں وہ سب وحی پر مبنی ہیں، انہیں میں سے شرائع اور عبادات اور باہمی معاملات کو مذکورہ طریقوں سے منضبط کرنا بھی ہے، جن میں سے کچھ تو وحی پر قائم ہیں اور کچھ اجتہاد کا نتیجہ ہیں۔ اور نبی ﷺ کا اجتہاد وحی کے درجہ میں تھا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس بات سے محفوظ کر دیا تھا کہ

❶ مقالات سلیمان، ص ۱۴۱

Marfat.com

آپ کی کوئی رائے غلطی پر برقرار رہے اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ آپ کا اجتہاد منصوص سے استنباط کے معنی میں ہو جیسا کہ خیال کیا جاتا ہے، بلکہ آپ کا بیشتر اجتہاد اس نوعیت کا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو مقاصد شریعت، شریعت سازی، معاملات میں نرمی پیدا کرنے اور احکام کا قانون سکھا دیا تھا، اس طرح بذریعہ وحی حاصل کرنے والے مقاصد کو آپ نے قانون کے ذریعہ بیان کر دیا۔'' ❶

شاہ ولی اللہ کی مذکورہ بالا عبارت سے جو بات معلوم ہوتی ہے وہ یہ کہ علوم نبوت کے بعض حصے اگرچہ اجتہاد کی طرف منسوب ہیں، لیکن اجتہاد و درائے میں غلطی سے محفوظ ہونے کی وجہ سے ان اجتہادی علوم کو بھی وحی الٰہی کا درجہ حاصل ہے۔

رہے علوم معاد یا غیبیات اور اقتدار الٰہی پر دلالت کرنے والے تخلیقی اور ایجادی علوم تو یہ سب وحی سے ماخوذ تھے، شاہ ولی اللہ نے شرعی احکام، اور عبادات اور باہمی معاملات کو ایک ہی ساتھ ذکر کرکے یہ جو فرمایا ہے کہ: ''ان میں سے بعض کو اجتہاد کے ذریعہ منضبط کیا گیا ہے اور بعض وحی پر مبنی ہیں'' تو اس سے حقیقت واقعہ کی ترجمانی نہیں ہوتی۔ اگر انہوں نے ایمانیات، ملکوت اللہ کے مظاہر اور عبادات، معاملات، اخلاق اور حدود وغیرہ کے احکام کو وحی الٰہی پر مبنی قرار دیا ہوتا اور ان کو بعض باہمی معاملات اور اخلاقی مسائل سے الگ کرکے بیان کیا ہوتا جن میں سے بعض وحی پر مبنی ہیں اور بعض اجتہاد پر تو ان کی یہ بات کتاب وسنت کے نصوص سے زیادہ ہم آہنگ ہوتی، البتہ ان کے اس بیان سے ندوی صاحب کے اس دعویٰ کی جڑ کٹ جاتی ہے کہ: احکام واخلاق کے متعلق صحیح احادیث میں جو کچھ ہے وہ تمام تر قرآن سے ماخوذ ومستنبط ہے۔''

مزید یہ کہ شاہ صاحب نے نبی کریم ﷺ کی زبانی بیان کیے جانے والے اجتہادی امور کے کتاب اللہ کے نصوص سے مستنبط ہونے کے نظریہ کی قطعی تردید کر دی ہے۔

دراصل ندوی صاحب کا یہ دعویٰ رسول اللہ ﷺ کی مستقل تشریعی حیثیت کی نفی کر دیتا ہے اور یہ دعویٰ ان کے ذہن کی اُپج نہیں ہے، بلکہ ان منکرین حدیث کے اس دعویٰ کی صدائے بازگشت ہے کہ قرآن سے باہر کی کوئی بھی چیز قابل قبول نہیں ہے، اصلاحی صاحب تو کسی صحیح ترین حدیث کے ناقابل قبول ہونے کی ایک دلیل یہ دیتے ہیں کہ اس میں جو مسئلہ بیان کیا گیا ہے ''اس کا ذکر قرآن میں نہیں آیا ہے'' جبکہ قرآن پاک کی ایک سے زیادہ آیات صریح لفظوں میں نبی ﷺ کو ''مستقل شارع'' قرار دیتی ہیں اور اس صفت میں بھی آپ کی مطلق اور غیر مشروط اطاعت کا حکم دیتی ہیں۔ اس مسئلہ کو میں ان شاء اللہ تعالیٰ ''حدیث اور فقہاء'' کی فصل کے تحت تفصیل سے بیان کروں گا۔

اب میں یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ حدیث وحی الٰہی ہے، اس بحث میں بھی میرے سارے استدلالات قرآنی آیات اور صحیح احادیث پر ہوں گے، لوگوں کے اقوال پر نہیں۔

❶ حجۃ اللہ البالغہ ص ۲۷۱-۲۷۲، ج ۱

Marfat.com

حدیث وحی ہے:

(۱)......حدیث کے وحی ہونے کی بنیادی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے:

﴿وَ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ عَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ﴾ (النساء: ۱۱۳)

''اور اللہ نے تم پر کتاب اور حکمت نازل فرمائی ہے اور تمہیں ان باتوں کی تعلیم دی ہے جو تم نہیں جانتے تھے۔''

میں سابقہ صفحات میں حکمت سے حدیث مراد لیے جانے کے مسئلہ کو نہایت وضاحت اور تفصیل سے بیان کر چکا ہوں جس کا اعادہ نہیں کرنا چاہتا، یہاں یہ عرض کرنے پر اکتفا کروں گا کہ اس آیت پاک میں بھی حکمت سے مراد حدیث ہی ہے، کیونکہ اس کتاب یعنی قرآن کو ماخذ رشد وہدایت قرار دیا گیا ہے لہٰذا کتاب پر اس چیز کا عطف آیت کے سیاق وسباق کا تقاضا ہے جو اس کی طرح ماخذ رشد وہدایت ہو۔

میں سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۱۲۹ میں مذکور ''الحکمۃ'' کے مفہوم کے بارے میں مولانا اصلاحی صاحب کی رائے نقل کر چکا ہوں، جنہوں نے حکمت سے حدیث مراد لینے والوں کے قول کو بہت وزنی قرار دیا ہے، بلاشبہ ان کی یہ بات بڑی وقیع ہے، کیونکہ سورۂ بقرہ اور اس زیر بحث آیت، نیز دوسری آیتوں میں کتاب کے ساتھ اس کا ذکر جس سلسلہ بیان میں آیا ہے اس کا تقاضا یہی ہے کہ ان تمام آیتوں میں حکمت سے مراد حدیث ہی لی جائے، تعجب ہے کہ اصلاحی صاحب نے اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے کتاب وحکمت کہنے پر اکتفا کیا ہے اور یہ نہیں لکھا ہے کہ حکمت سے کیا مراد؟

مفسرین میں بعض لوگوں نے حکمت کے معنی ''اسرار شریعت کی معرفت'' بیان کیے ہیں اور قرطبی نے حکمت کی تفسیر ''وحی کے ذریعہ فیصلہ کرنے'' سے کی ہے، ان میں سے پہلا مفہوم: اسرار شریعت کی معرفت، اگرچہ بظاہر بڑا جاذب نظر لگتا ہے، مگر نبی کریم ﷺ کی حدیث اور خود قرآن پاک میں کہیں شریعت کے اسرار نہیں بیان کیے گئے ہیں۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ قرین صواب ہے کہ شریعت کے اسرار بیان کرنے کی جانب سب سے پہلے صوفیا نے توجہ دی ہے اور یہ قرآن کے ''باطن'' کا ہم معنی ہے، عام طور پر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ قرآن کو یا شریعت کو ظاہر و باطن میں تقسیم کرنے والے ''شیعہ'' ہیں، جبکہ امر واقعہ یہ ہے کہ علم ظاہر و باطن کا نعرہ لگانے والے صوفیا ہیں، چنانچہ برصغیر کے صوفیا کے پیر مغاں اور قطب الارشاد حاجی امداد اللہ کی تحریروں میں غیر صوفیا کے لیے اہل ظاہر اور صوفیا کے لیے اہل باطن کی تعبیر کا بکثرت استعمال ملتا ہے۔

اسرار شریعت اور باطن شریعت یا باطن قرآن کے درمیان ربط وتعلق سے میرے اس دعویٰ کی تصدیق اس سے ہوتی ہے کہ ابو حامد غزالی نے اپنی کتاب ''احیاء العلوم'' میں شریعت کے اسرار کے بیان کی جانب خاص توجہ دی ہے اور یہ بتانا تحصیل حاصل ہے کہ موصوف بہت بڑے صوفی اور بہت بڑے متکلم تھے، اسی طرح شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کی کتاب ''حجۃ اللہ البالغۃ'' کا بنیادی موضوع ''اسرار شریعت'' کا بیان ہی ہے، ان کا شمار بھی صوفیا میں ہوتا ہے، البتہ شاہ ولی اللہ وسیع النظر

Marfat.com

محدث وفقیہہ ہونے کے ساتھ حد درجہ حق پسند تھے۔

اسرار شریعت کا سب سے بڑا منفی پہلو یہ ہے کہ اس کا کوئی ضابطہ نہیں ہے، بلکہ اس کا تعلق سراسر ذوق، سے ہے جو صوفیا کی خاص چیز ہے، اور ذوق و پسند کا کوئی ضابطہ ہوتا ہی نہیں اسی وجہ سے صوفیا کے افکار و خیالات میں کتاب وسنت کی تعلیمات سے دوری اور بعد میں اتفاق واتحاد کے باوجود بڑے تضادات ہیں۔

سورۂ نساء کی مذکورہ بالا آیت کریمہ میں ''حکمت'' سے حدیث مراد ہونے کی سب سے واضح دلیل آیت کا مضمون ہے، پوری آیت اور اس کا ترجمہ پڑھنے سے میری بات سمجھنے میں مدد ملے گی، ارشاد الٰہی ہے:

﴿وَ لَوْ لَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ وَ رَحْمَتُهٗ لَهَمَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ اَنْ يُّضِلُّوْكَ وَ مَا يُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَ مَا يَضُرُّوْنَكَ مِنْ شَيْءٍ وَ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ عَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ وَ كَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا﴾ (النساء: ۱۱۳)

''اور اگر تمہارے اوپر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی، تو یقیناً ان میں سے ایک گروہ تمہیں حق سے پھیر دینے کا پختہ ارادہ کر چکا تھا، حالانکہ وہ صرف اپنے آپ کو گمراہی میں ڈال رہے ہیں اور وہ تمہیں کچھ بھی نقصان نہیں پہنچا سکتے، اور اللہ نے تم پر کتاب اور حکمت نازل فرمائی ہے اور تمہیں ان باتوں کی تعلیم دی ہے جو تم نہیں جانتے تھے، اور تم پر اللہ کا فضل بہت بڑا ہے۔''

اس آیت مبارکہ کا تعلق چوری کے ایک مقدمہ سے ہے جس میں منافقین نے اصل چور ابن اُبیرق کو بری کرانے اور اس الزام کو ایک بے قصور یہودی کے سر تھوپنے کی غرض سے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں غلط بیانی سے کام لیا، لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ کے کوئی فیصلہ کرنے سے قبل آپ کو حقیقت حال سے بذریعہ وحی آگاہ فرما دیا تھا۔

مبنی برحق فیصلہ کرنے سے رسول اللہ ﷺ کو باز رکھنے کے لیے ''اضلال'' کی تعبیر اختیار کی گئی ہے، جو روایتی گمراہی کے معنی میں نہیں ہے۔

پوری آیت سامنے آجانے کے بعد کتاب وحکمت کے معنی واضح ہو جاتے ہیں اور یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ اس سلسلہ بیان میں حکمت سے مراد حدیث کے علاوہ کچھ نہیں ہے، کیونکہ یہی دونوں ماخذ شریعت ہیں۔

امام شافعی رحمہ اللہ کو فہم قرآن میں منفرد مقام حاصل تھا اور قرآنی مطالب پر ان کی نظر بڑی گہری تھی، اپنی کتاب الرسالہ اور احکام القرآن میں انہوں نے آیت میں مذکور ''الحکمہ'' سے سنت ہی مراد لی ہے اور فرمایا ہے کہ قرآن کا علم رکھنے والے جن اہل علم پر ان کو اعتماد ہے ان کا بھی یہی قول ہے (الرسالہ ص ۸۷، احکام القرآن ص ۲۸۔۲۹ ج ۱) میں ان کا پورا قول نقل کر چکا ہوں۔ لیکن یہاں میں سورۂ احزاب کی آیت نمبر ۳۴ سے ان کے استدلال کا ذکر کر دینا چاہتا ہوں جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ قرآن پاک میں جہاں بھی حکمت کا ذکر کتاب پر عطف کی صورت میں آیا ہے وہاں

Marfat.com

اس سے مراد حدیث یا سنت ہی ہے، یاد رہے کہ امام شافعی نے اپنی کتابوں میں نبی ﷺ کے قول و فعل کے لیے سنت کا لفظ استعمال کیا ہے۔

سورۂ احزاب میں اللہ تعالیٰ ازواج مطہرات کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتا ہے:

﴿وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلٰى فِيْ بُيُوْتِكُنَّ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ وَ الْحِكْمَةِ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ لَطِيْفًا خَبِيْرًا﴾ (الاحزاب: ٣٤)

''اور تمہارے گھروں میں اللہ کی جو آیات اور حکمت تلاوت کی جاتی ہے اس کو یاد رکھو درحقیقت اللہ بڑا باریک بیں اور ہر چیز سے باخبر ہے۔''

دراصل یہ آیت اس سلسلہ آیات کی آخری کڑی ہے جن میں اللہ تعالیٰ نے ازواج مطہرات کو نہایت اہم تعلیمات دی ہیں یہاں یہ بتانا تحصیل حاصل ہے کہ امہات المومنین کے گھروں میں صرف قرآن پاک ہی کی تلاوت نہیں ہوتی تھی اور نہ صرف قرآن ہی نازل ہوتا تھا، بلکہ نبی ﷺ پر حدیث بھی نازل ہوتی تھی اور آپ اپنے اعمال اور سیرت کے نمونے بھی پیش کرتے تھے اور ان سب میں آپ مطاع اور متبوع تھے۔

آیت میں ''اذکرن'' سے مراد صرف یہ نہیں ہے کہ قرآنی آیات کا ورد کرو، بلکہ یہ لفظ اس سے زیادہ وسیع معنی میں استعمال ہوا ہے، یعنی کتاب اللہ کی آیات اور سنت کی تعلیمات کو یاد رکھو، انہیں اپنے دلوں میں متحضر رکھو اور ان سے تمہارے دل کبھی غافل نہ ہوں۔ آیت میں ''آیات اللہ'' کی تعبیر بھی بڑی بلیغ ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ، اس کی اعلیٰ صفات، اس کی بے پایاں قدرتوں اور اس کی ہمہ گیر ربوبیت پر دلالت کرنے والی علامتیں اور اس طرح کی آیات قرآن کے علاوہ سنت میں بھی ہیں، کیونکہ دونوں کا سرچشمہ ایک ہی ہے۔

آیت میں ''مـا یتـلـی'' کے معنی صرف یہی نہیں ہیں کہ اصطلاحی معنے میں جس کی تلاوت کی جاتی ہے، بلکہ یہ مطلب ہے کہ جو آگے پیچھے نازل ہوتی ہیں، اور جن کی پیروی کی جاتی ہے۔ ❶

امام شافعی رحمہ اللہ نے ''الأم'' کی کتاب جماع العلم میں ایک سائل کے سوال کا ذکر کرنے کے بعد آیت میں مذکور تلاوت کی تشریح کی ہے، سائل کا سوال ہے: اللہ نے یہ خبر دی ہے کہ ازواج مطہرات کے گھروں میں دو چیزوں کی تلاوت کی جاتی ہے؛ قرآن کی تلاوت تو معلوم ہے، لیکن سنت کی تلاوت کس طرح کی جاتی تھی؟ فرمایا: تلاوت کے معنی قرآن و سنت کو زبان سے بولنے، ادا کرنے کے ہیں یعنی منطق کے معنی میں ہے اور یہ معلوم ہے کہ نبی ﷺ کے گھر میں جس طرح قرآن زبان سے بولا جاتا اور ادا کیا جاتا تھا اسی طرح سنت بھی بولی اور ادا کی جاتی تھی۔ ❷

الجامع لاحکام القرآن کے مصنف قرطبی کا قول ہے: تاویل کا علم رکھنے والوں کا قول ہے کہ آیات اللہ سے مراد

❶ المعجم الوسیط ص ٨٧ مادہ ت ل ی۔ ❷ ص: ١٥٦٨۔

Marfat.com

قرآن اور حکمت سے مراد سنت ہے۔ ❶

قرآن پاک کے جن اردو ترجموں میں حکمت کا ترجمہ دانائی کی باتوں، حکمت کی باتوں وغیرہ کیا گیا ہے یہ لغت دیکھ کر کیا گیا ہے، سوال یہ ہے کہ دانائی کی باتوں اور حکمت کی باتوں کی تعریف کیا ہے اور نبی ﷺ کی بیویوں کے گھروں، ان کے ماحول اور ان کے مطلوبہ طرز عمل سے ان کا کیا تعلق ہے؟ اور حافظ صلاح الدین کا ترجمہ ہے: اور یاد کرو تم جو پڑھی جاتی ہیں تمہارے گھروں میں اللہ کی آیات اور حکمت سے؟

مسک الختام:

اس سلسلہ بحث کا مسک الختام یہ ہے کہ سورۂ نساء کی آیت میں اللہ تعالیٰ نے کتاب وحکمت کے لیے انزل کی تعبیر اختیار فرمائی جو حقیقت واقعہ بھی ہے اور صورت واقعہ بھی۔

(۲) حدیث کے وحی ہونے کی دوسری مثال:......سورۂ نجم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى﴾ (النجم: ۳۔۴)

''اور وہ خواہش سے نہیں بولتا وہ تو صرف وحی ہے جو کی جاتی ہے۔''

یہ آیات حدیث کے وحی ہونے میں بالکل صریح ہیں جن میں غلط تاویل کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اور اگر کوئی یہ دعویٰ کرے کہ یہاں وحی سے مراد قرآن ہے، کیونکہ نبی ﷺ کو اس کی تعلیم دینے کی نسبت جبریل علیہ السلام کی طرف کی گئی ہے۔ تو ہم کہیں گے کہ تمہارے اس دعویٰ سے یہ لازم آتا ہے کہ قرآن کے ماسوا نبی ﷺ کی زبان مبارک سے نکلنے والی باتوں کے پیچھے خواہشات نفس کارفرما ہوتے تھے۔ دراصل اللہ علام الغیوب نے اس طرح کے بدطینتوں کی زبان یہ فرما کر پہلے ہی کاٹ دی ہے:

﴿مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى﴾ (النجم: ۲)

''تمہارا ساتھی نہ بدراہ ہوا ہے اور نہ بھٹکا ہے۔''

معلوم ہوا کہ دین وشریعت سے متعلق رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے نکلنے والی ہر بات وحی الٰہی تھی، ورنہ وہ خلاف حق اور گمراہی ہوتی، اس سے یہ قاعدہ بھی نکلا کہ دین کے بارے میں ہر وہ بات جس کو قرآن وحدیث کی سند نہ حاصل ہو وہ ضلالت اور گمراہی ہے۔

(۳) تیسری مثال:......حدیث کے وحی ہونے کی صراحت حدیث میں بھی ہے، اسماء بنت صدیق رضی اللہ عنہا سے مروی ایک طویل حدیث میں فتنہ قبر سے متعلق نبی ﷺ کا یہ ارشاد موجود ہے:

((وإنه قد أوحي إليَّ أنكم تُفتنون في القبور......))

❶ ص: ۱۳۴، ج ۱۴۔

Marfat.com

''درحقیقت مجھے یہ وحی کی گئی ہے کہ تم لوگ قبروں میں آزمائے جاؤ گے۔'' ❶

(۴) چوتھی مثال:......قرآن پاک کے نزول سے متعلق تو یہ امر مسلم ہے کہ وہ ہمیشہ رسول اللہ ﷺ پر حالت بیداری میں نازل ہوتا تھا، اور اس کو آپ کے قلب مبارک پر نازل کرنے والے صرف سیّد الملائکہ جبریل علیہ السلام تھے جن کے ساتھ کوئی اور فرشتہ شریک نہیں تھا قرآن پاک میں اس کی صراحت ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ نے جبریل علیہ السلام کی تعریف کے طور پر اس کا ذکر کیا ہے، سورۂ بقرہ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلٰى قَلْبِكَ بِإِذْنِ اللّٰهِ﴾ (البقرة: ۹۷)

''کہہ دو، جو کوئی جبریل کا دشمن ہو، تو درحقیقت اس نے اللہ کے حکم سے اسے تیرے قلب پر نازل کیا ہے۔''

اس آیت مبارکہ میں بلاغت کی یہ باریکی ہے کہ اس میں جبریل علیہ السلام کی ایک امتیازی اور منفرد فضیلت کو ان سے یہودیوں کی عداوت اور دشمنی کا سبب بتایا گیا ہے، جس کی تفصیل یہ ہے کہ:

آیت کا پہلا جملہ: ﴿مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ﴾ شرط ہے اور دوسرا جملہ: ﴿فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلٰى قَلْبِكَ﴾ جزاء، اور شرط اور جواب شرط میں معنوی ربط یہ ہے کہ اس سے جبریل علیہ السلام سے عداوت رکھنے والے یہودیوں کی مذمت کی تاکید مقصود ہے، گویا دوسرے لفظوں میں یوں ہے: کہ جبریل علیہ السلام سے عداوت اور دشمنی رکھنے کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ انہوں نے اللہ کی کتاب کو اس کے حکم سے محمد ﷺ کے قلب مبارک پر نازل کیا ہے۔

اس کے ساتھ آیت میں جبریل علیہ السلام کی یہ فضیلت بیان کی گئی ہے کہ وہی قرآن کو نبی ﷺ پر نازل کرتے تھے اور یہ ایک ایسی فضیلت ہے جس میں فرشتوں میں سے کوئی بھی ان کا شریک وسہیم نہیں تھا۔

اس طرح قرآن پاک کے معجزانہ اسلوب بیان سے تعریف اور مذمت کے الفاظ استعمال کیے بغیر جہاں یہ معلوم ہو گیا کہ جبریل علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے بے حد محبوب اور مقرب بندے ہیں، وہیں یہودیوں کی یہ مذموم اور بری صفت اور خصلت بھی معلوم ہوگئی کہ وہ ہر صاحب فضیلت وعظمت سے نفرت اور عداوت رکھتے ہیں۔

سورۂ بقرہ کی اس آیت میں جبریل علیہ السلام کے جس امتیازی مقام ومرتبے کو بیان کیا گیا ہے، وہ اس سے زیادہ تفصیل کے ساتھ سورۂ شعراء میں بیان کیا گیا ہے، ارشاد ربانی ہے:

﴿وَإِنَّهُ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْأَمِيْنُ ○ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ﴾

(الشعراء: ۱۹۲-۱۹۴)

''درحقیقت یہ رب العالمین کا نازل کردہ ہے جسے امانت دار روح نے تیرے دل پر نازل کیا ہے، تاکہ تو ڈرانے والوں میں شامل ہو جائے۔''

---

❶ بخاری: ۸۶، ۹۲۲، مسلم: ۹۰۵۔

Marfat.com

ایک اشکال اور اس کا جواب:

صحیح مسلم میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ایک حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سورۂ فاتحہ اور سورۂ بقرہ کی آخری آیت (۲۸۴۔۲۸۶) کو نازل کرنے والا ایک دوسرا فرشتہ ہے جو اس سے قبل آسمان سے زمین پر نازل نہیں ہوا تھا، اس طرح یہ حدیث قرآنی بیان سے ٹکراتی ہے۔

اس اشکال کے جواب میں عرض ہے کہ کوئی بھی صحیح حدیث قرآن کے کسی حکم یا بیان سے نہیں ٹکرا سکتی، یہ ناممکن اور محال ہے، اگر کسی جگہ ایسا نظر آتا ہے تو یہ کوتاہ نظری ہے۔ دراصل صحیح مسلم کی مذکورہ حدیث میں جو بات بیان ہوئی ہے وہ صرف یہ کہ زمین پر پہلی بار اترنے والے فرشتہ نے سورۂ فاتحہ اور سورۂ بقرہ کی آخری تین آیتوں کے فضائل بیان کیے تھے نہ کہ ان کو لے کر نازل ہوا تھا، کیونکہ یہ واقعہ مدینہ کا ہے، جبکہ یہ بات معروف اور معلوم ہے کہ نماز مکہ میں فرض ہوئی ہے اور فاتحہ سے خالی کسی نماز کا تصور نہیں ہے۔ اب میں صحیح مسلم کی حدیث کا متن نقل کر دیتا ہوں تاکہ صورت واقعہ مزید واضح ہو جائے۔

((عن ابن عباس قال: بينا جبريل قاعد عندالنبي ﷺ سمع نقيضاً من فوقه، فرفع رأسه، فقال: هذا باب من السماء فتح اليوم، لم يُفتح قط إلااليوم، فنزل منه ملك فقال: هذا ملك نزل إلى الأرض لم ينزل قط إلااليوم، فسلم وقال: أبشر بنورين أوتيتَهما لم يؤتهما بني قبلك، فاتحة الكتاب وخواتيم سورة البقرة، لن تقرأ بحرف منهما إلا أعطِيتَه.))

''عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہتے ہیں: ایک مرتبہ جبکہ جبریل نبی ﷺ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ انہوں نے آسمان سے شدید چرچراہٹ کی آواز سنی تو سر اوپر اٹھایا اور کہا: یہ آسمان کا ایک دروازہ ہے جو آج کھولا گیا ہے۔ اس سے پہلے کبھی نہیں کھولا گیا تھا، اس دروازے سے ایک فرشتہ اترا، جبریل نے کہا: یہ فرشتہ آج زمین پر اترا ہے، آج سے پہلے کبھی نہیں اترا تھا۔ اس نے سلام کیا اور عرض کیا: آپ کو ان دو روشنیوں کی خوش خبری جو صرف آپ کو دی گئی ہیں آپ سے پہلے کسی نبی کو نہیں دی گئی تھیں، سورۂ فاتحہ اور سورۂ بقرہ کی آخری آیتیں، آپ ان کا جو حصہ بھی پڑھیں گے اس میں مذکور چیز آپ کو عطا کی جائے گی۔'' [1]

میں عرض کر رہا تھا کہ قرآن ہمیشہ نبی ﷺ پر حالت بیداری میں نازل ہوتا تھا اور اس کو نازل کرنے والے صرف جبریل علیہ السلام تھے، رہا یہ سوال کہ کیا حدیث نازل کرنے والے بھی وہی تھے یا ان کے علاوہ کوئی دوسرا فرشتہ؟ اس سوال کے جواب میں لوگوں کا اختلاف ہے، لیکن ایک صحیح متصل حدیث اور ایک صحیح مرسل حدیث سے بصراحت یہ ثابت ہے کہ حدیث کے معانی نبی کریم ﷺ کے قلب مبارک پر نازل کرنے والے بھی جبریل علیہ السلام ہی تھے۔

[1] مسلم، نمبر ۸۰۶

Marfat.com

متصل حدیث کے الفاظ ہیں:

((...... وإن الروح الأمين قدألقى فى رُوعى أنه لن تموت نفس حتى تتوفى رزقها فأجملوا فى الطلب......))

''درحقیقت روح الامین نے میرے دل میں یہ بات ڈالی ہے کہ کوئی بھی جان دار اپنی پوری روزی حاصل کیے بغیر نہیں مرے گا، لہٰذا خوش اسلوبی سے روزی طلب کرو۔'' ❶

اور مرسل حدیث کے الفاظ ہیں:

((كان جبريل ينزل على النبى ﷺ بالسنة كما كان ينزل عليه بالقرآن .))

''جبریل اسی طرح نبی ﷺ پر سنت نازل کرتے تھے جس طرح آپ پر قرآن نازل کرتے تھے۔'' ❷

(۵) پانچویں مثال:...... نبی ﷺ پر حدیث کا نزول خواب کی صورت میں بھی ہوتا تھا اور انبیاء کے خواب وحی کا درجہ رکھتے تھے جس کی دلیل ابراہیم علیہ السلام کا وہ خواب ہے جس میں انہوں نے یہ دیکھا تھا کہ وہ اسماعیل علیہ السلام کو ذبح کر رہے ہیں اور جب انہوں نے ان سے اس کے بارے میں ان کی رائے دریافت کی تو انہوں نے برجستہ جواب دیا:

﴿يَاأَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ﴾ (الصافات : ۱۰۲)

''اے میرے ابا جان! آپ کو جو حکم دیا جا رہا ہے اسے کر ڈالیے۔''

غور کیجئے! اسماعیل علیہ السلام نے یہ نہیں کہا کہ میرے خیال یا میری رائے میں آپ کے خواب کی تعبیر یہ ہے، بلکہ بلا تردد اس کو اللہ کا حکم قرار دے دیا اور اس کی تنفیذ کی درخواست بھی کر دی، جبکہ ان کو یہ معلوم تھا کہ وہی مطلوب ہیں انہوں نے ایسا اس وجہ سے کہا کہ وہ ایک عظیم نبی کے ہونے والے نبی بیٹے تھے۔ خواب سنتے ہی اس کی تہہ تک پہنچ گئے، ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات!

میں نے اوپر جو کچھ عرض کیا ہے اس کی روشنی میں آپ جو خواب دیکھتے تھے وہ وحی الٰہی سے عبارت تھے، اور جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں کہ اس طرح کے خوابوں کا ذکر صحیح احادیث میں آیا ہے، اور عام طور پر نبی ﷺ فجر کی نماز کے بعد صحابہ کرام کو مخاطب کر کے فرماتے تھے: "هل رأى أحدُ منكم من رؤيا" کیا تم میں سے کسی نے کوئی خواب دیکھا ہے؟ اگر کسی نے کوئی خواب دیکھا ہوتا تو بیان کرتا اور آپ اس کی تعبیر بتاتے، اور اگر آپ نے کوئی خواب دیکھا ہوتا تو آپ بیان فرماتے، اس سے یہ مسئلہ بھی معلوم ہوا کہ نماز فجر کے بعد اور طلوع شمس سے پہلے خواب کی تعبیر بتانا مستحب ہے۔ ❸

❶ الاسماء والصفات حدیث: نمبر ۴۲۷، الرسالہ ص ۹۹ ۔
❷ اس حدیث کے راوی حسان بن عطیہ تابعی ہیں جن کا شمار شام کے ثقہ راویوں میں ہوتا ہے۔ (فتح الباری ص: ۳۳۲۹، ج ۳)
❸ بخاری: ۷۰۴۷، فتح الباری، ص: ۳۱۴۶، ج ۳

Marfat.com

احادیث میں آپ کے جو خواب منقول ہیں ان میں سے ایک خواب وہ ہے جس میں آپ نے یہ دیکھا تھا کہ آپ کو زمین کے خزانوں کی کنجیاں عطا کی گئی ہیں، حدیث کے الفاظ ہیں:

((وبينا أنا نائم رأيتني أتيت بمفاتيح خزائن الأرض فوُضِعت في يَدِي .))

''اور جس وقت کہ میں سو رہا تھا، میں نے اپنے آپ کو دیکھا کہ مجھے زمین کے خزانوں کی کنجیاں دی گئی ہیں جو میرے ہاتھ میں رکھ دی گئی ہیں۔'' ❶

یہ خواب دراصل ایک پیشین گوئی سے عبارت تھا جس کا حرف حرف پورا ہوا اور آپ کی وفات کے صرف چند سالوں بعد صحابہ کرام نے زمین کے خزانوں پر قبضہ کر لیا اور قیصر و کسری کے تخت و تاج ان کے ہاتھوں میں آ گئے۔

رسول کریم ﷺ کا ایک خواب وہ ہے جس میں آپ کو دو فرشتوں نے اس عالم آب و گل سے نکال کر عالم آخرت کے احوال کے مشاہدے کرائے، اور عالم بالا کی سیر کراتے ہوئے چند برے اعمال کی سزائیں دکھائیں جو آپ کے لیے ''ممثل'' کر دی گئی تھیں، ان فرشتوں نے اس خواب کے دوران ''جنت عدن'' میں آپ کا گھر بھی دکھایا جس میں داخل ہونے کی آپ نے ان سے اجازت چاہی تو انہوں نے عرض کیا: آپ اس میں داخل ہوں گے، مگر ابھی نہیں۔

یہ ایک طویل خواب ہے جس کے راوی سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ ہیں اور نبی ﷺ نے ایک دن نماز فجر کے بعد اسے بیان کیا تھا جسے سننے والوں میں سمرہ شامل تھے، اور انہی نے اس کی راویت کی ہے۔

اس خواب میں نبی ﷺ نے جنت کے ایک باغ میں ایک نہایت طویل القامت بزرگ کو دیکھا جن کے اردگرد کثیر تعداد میں بچے موجود تھے یہ بچے وہ تھے جو سن بلوغت میں داخل ہونے سے قبل وفات پا گئے تھے اور آئندہ وفات پائیں گے اور طویل القامت بزرگ ابراہیم علیہ السلام تھے۔ ❷

رسول اللہ ﷺ کے خوابوں کی فہرست خاصی طویل ہے جن سب کو بیان کرنا میرا موضوع بحث نہیں ہے۔ میرا مقصد تو صرف یہ دکھانا ہے کہ نبی ﷺ کے خواب بھی وحی الٰہی تھے اور یہ مقصد دو حدیثوں سے بھی پورا ہو گیا۔

یاد رہے کہ اولاد آدم میں انبیاء علیہم الصلاۃ والسلام کو یہ خصوصیت حاصل تھی کہ ان کے دل کبھی نہیں سوتے تھے، اور قرآن کے مطابق ''نزول وحی'' کا محل دل ہے۔ اس طرح بیداری اور خواب دونوں حالتوں میں ان کے دل وحی الٰہی وصول کرتے تھے شیطان کو ان میں دراندازی کی قدرت حاصل نہیں تھی۔ اپنے بارے میں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

((يا عائشة! إن عينَيَّ تنا مان ولا ينام قلبي .))

''اے عائشہ! درحقیقت میری آنکھیں سوتی ہیں، میرا دل نہیں سوتا۔'' ❸

---

❶ بخاری: ۷۲۷۳، مسلم: ۵۲۳۔۶۔ ❷ بخاری، ۷۰۴۷۔

❸ بخاری: ۱۱۴۷۔۲۰۱۳، مسلم: ۷۳۸۔

Marfat.com

(۶) چھٹی مثال: ...... رسول اللہ ﷺ نے حدیث کے لیے ''دیے جانے'' کی تعبیر اختیار فرمائی ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ یہ آپ کے اجتہاد یا استنباط سے عبارت نہیں، بلکہ وحی سے عبارت ہے، ایک صحیح حدیث کے الفاظ ہیں:

((ألا إني أوتيت القرآن ومثله معه ألا يوشك رجل شبعان على أريكته يقول: عليكم بهذا القرآن فما وجدتم فيه من حلال فأحلوه وما وجدتم فيه من حرام فحرموه ...... وفي لفظ: يوشك أن يقعد الرجل على أريكته ، فَحُدِّث بحديثي ، فيقول: بيني وبينكم كتاب الله ، فما وجد نافيه حلالاً استحللناه وما وجدنا فيه حراماً حرمناه ، وإن ما حرم رسول الله كما حرم الله .))

''غور سے سن لو! مجھے قرآن دیا گیا ہے اور اس کا ہم مثل غور سے سن لو! قریب ہے کہ ایک شکم سیر آدمی اپنی مسند پر بیٹھ کر یہ کہے کہ: تم لوگ اس قرآن کو لازم پکڑو، اور اس میں جو حلال پاؤ اس کو حلال مانو اور اس میں جو حرام پاؤ اس کو حرام سمجھو، دوسری روایت کے الفاظ ہیں: قریب ہے کہ ایک شخص اپنی مسند پر بیٹھے اور اس سے میری حدیث بیان کی جائے اس وقت وہ کہے: میرے اور تمہارے درمیان اللہ کی کتاب ہے، لہٰذا ہم نے قرآن میں جو حلال پایا اس کو حلال قرار دیا اور جو حرام پایا اس کو حرام مانا، درحقیقت اللہ کے رسول نے جو چیزیں حرام قرار دی ہیں وہ اللہ کی حرام کردہ چیزوں کی طرح ہیں۔'' ❶

اس حدیث میں ''اُوتیت'' کی تعبیر اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ قرآن کی طرح حدیث بھی نبی ﷺ پر نازل ہوتی تھی۔

''أوتيت يا أعطيت'' میں دیا گیا ہوں، یا مجھے عطا کیا گیا ہے۔ کی یہ تعبیر دوسری حدیثوں میں بھی آئی ہے جس کا مطلب واضح ہے، یعنی اللہ تعالیٰ دینے والا ہے۔ بطور مثال ایک حدیث کے الفاظ ہیں:

''أعطيت ، أوتيت ، جوامع الكلم'' میں پر معنی کلام دیا گیا ہوں یا مجھے پر معنی کلام دیا گیا ہے۔ ❷

''جوامع الکلم ...... جوامع جامعہ کی جمع ہے اور الکلم کلمہ کی، اور اس میں صفت کی اضافت موصوف کی طرف ہے۔ مطلب ہے ''الکلمات الجامعہ'' یعنی معانی سے پر اور جامع باتیں جن میں کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ معانی ادا کر دیے جائیں۔ ''جوامع الکلم'' کی اعلیٰ ترین مثال قرآن پاک ہے۔ جس کے بعد حدیث کا درجہ ہے۔ حدیث سے متعلق جو بات ہر عالم حدیث کو معلوم ہوگی وہ یہ ہے کہ اس کے معانی تو اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ ہیں، لیکن تعبیر نبی ﷺ کی اپنی ہے۔ جب کہ قرآن اپنے الفاظ اور معانی دونوں میں اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔

---

❶ ابو داؤد، ۴۶۰۴، ترمذی، ۲۶۶۴، ابن ماجہ ۱۲۔

❷ بخاری: ۲۹۷۷، ۶۹۹۸، ۷۰۱۳، ۷۲۷۳، مسلم: ۵۲۳۔۵۰۵۔

Marfat.com

(۷) ساتویں مثال:...... یعلی بن امیہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں آیا ہے کہ ایک جبہ پوش شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا اور عمرہ کے بارے میں سوال کیا۔ سوال سن کر آپ خاموش رہے۔ یہاں تک کہ آپ پر وحی نازل ہوئی، پھر آپ نے اس کو جواب دیا۔ ❶

علمائے حدیث میں اس امر میں اختلاف ہے کہ اس وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر جو وحی نازل ہوئی تھی وہ ''وحی متلو'' (قرآن) تھی یا وحی غیر متلو (حدیث) حافظ ابن حجر نے لکھا ہے کہ مجھے کوئی ایسی روایت نہیں معلوم ہے جس میں اس وحی کی تفصیل بیان کی گئی ہو، البتہ طبرانی کی المعجم الاوسط میں دوسری سند سے یہ حدیث مروی ہے کہ اس وقت نازل ہونے والی وحی اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد تھی: ﴿وَأَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلَّهِ﴾ اور اللہ کے لیے حج اور عمرہ پورا کرو۔'' ❷

لیکن صحیحین کی اس زیر بحث حدیث میں ہے کہ: "فلما سُرِّيَ عنه قال: أين السائل عن العمرة؟ إخلع عنك الجبةَ واغسل أثر الخلوق عنك، وأنق الصفرَة، واصنع في عمرتك كما تصنع في حجك." جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے نزول وحی کی کیفیت دور ہوگئی، تو آپ نے فرمایا: عمرہ کے بارے میں سوال کرنے والا کہاں ہے؟ تو اپنا جبہ اتار دو، خوشبو کے اثر کو اپنے آپ سے دھو دو، اور زردی کو زائل کر دو، اور اپنے عمرے میں وہی کچھ کرو جو اپنے حج میں کرتے ہو۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد مذکورہ بالا قرآنی آیت کے علاوہ ہے، لہٰذا اگر اس وقت نازل ہونے والی وحی مذکورہ آیت قرار دی جائے، جیسا کہ طبرانی کی روایت میں ہے، تب بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا جو آپ نے نزول وحی کے بعد ہی فرمایا تھا، اس سے یہ لازم آیا کہ قران کی طرح حدیث بھی وحی ہے، جو بعض اوقات قرآن کے ساتھ میں نازل ہوتی تھی۔

صحیحین کی اس حدیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دین و شریعت سے متعلق کوئی بات اجتہاد و قیاس سے نہیں فرماتے تھے، ورنہ سوال سن کر آپ کی خاموشی چہ معنی دارد؟

میں نے ابھی جو کچھ عرض کیا ہے اس کی تائید صحیح بخاری کی کتاب الاعتصام کے آٹھویں باب کے عنوان سے ہوتی ہے جو یہ ہے: جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی ایسی چیز کے بارے میں سوال کیا جاتا جس کے حق میں وحی نازل نہ ہوئی ہوتی، تو فرماتے: لا أدری مجھے معلوم نہیں، یا وحی نازل ہونے تک خاموش رہتے اور رائے اور قیاس سے جواب نہ دیتے۔

(۸) آٹھویں مثال:...... کسی شرعی مسئلہ میں وحی الٰہی کے نزول تک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خاموش رہنے اور بذریعہ اجتہاد اللہ کا حکم بیان نہ کرنے کی تائید ان صحابیہ کے واقعہ سے ہوتی ہے جن سے ان کے شوہر نے ''ظہار'' کر لیا تھا اور

---

❶ بخاری: ۱۷۸۹، مسلم: ۱۱۸۰

❷ سورۃ البقرہ: ۱۹۶، فتح الباری ۱۰۰۶، ج ۱

Marfat.com

جن کا ذکر سورۃ مجادلہ کی پہلی آیت میں آیا ہے، ارشاد ربانی ہے:

﴿قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّتِیْ تُجَادِلُكَ فِیْ زَوْجِهَا وَتَشْتَكِیْٓ اِلَی اللّٰهِ وَاللّٰهُ یَسْمَعُ تَحَاوُرَكُمَا اِنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌۢ بَصِیْرٌ﴾ (المجادلہ: ۱)

''یقیناً اللہ نے اس عورت کی بات سن لی، جو تم سے اپنے شوہر کے مسئلہ میں جھگڑ رہی ہے اور اللہ سے شکایت کر رہی ہے، اور اللہ تم دونوں کی بات چیت سن رہا ہے درحقیقت اللہ سب کچھ سننے والا اور سب کچھ دیکھنے والا ہے۔''

ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

((تبارك الذی وسِعَ سمعَه کل شئی، الحمدالله الذی وَسِعَ سمعَه الأصوات إنی لأسمع کلام خَولة بنت ثُعلبة، ویخفی علیَّ بعضُها، وهی تشتکی اِلی رسول الله ﷺ زوجها، وهی تقول: یا رسولَ الله! أکل شبابی، ونثرت له بطنی، حتی إذا کبرت سِنی، وانقطع ولدی، ظاهر منی، اللهم، إنی أشکو اِلیك. فما بَرِحت، حتی نزل جبرائیل بهٰؤلاء الآیات: قد سمع الله قولَ التی تجادلك فی زوجها وتشتکی اِلی الله.))

''بڑا با برکت ہے وہ جس کی سماعت ہر چیز کو محیط ہے، تعریف صرف اس اللہ کے لیے ہے، جس کی سماعت ہر آواز کو سن رہی ہے۔ [1] میں خولہ بنت ثعلبہ کی بات سن رہی تھی، اور اس کی بعض باتیں مجھ پر مخفی رہتیں، وہ رسول اللہ ﷺ سے اپنے شوہر کی شکایت کر رہی تھی اور کہہ رہی تھی: اے اللہ کے رسول! وہ میری جوانی کھا گیا، اور میں نے اس کے لیے بکثرت بچے جنے، یہاں تک کہ جب میں سن رسیدہ ہوگئی، اور بچے جننے کا سلسلہ منقطع ہوگیا تو اس نے مجھ سے ظہار کر لیا، اے اللہ! میں تیری طرف دست شکایت دراز کر رہی ہوں، ابھی اس کی شکایت جاری تھی کہ جبرئیل یہ آیتیں لے کے نازل ہوگئے: ﴿قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّتِیْ تُجَادِلُكَ فِیْ زَوْجِهَا وَتَشْتَكِیْٓ اِلَی اللّٰهِ﴾ [2]

نتیجہ بحث:

مذکورہ بالا بحث اور مثالوں سے دو باتیں معلوم ہوئیں:

۱۔ حدیث بھی وحی ہے۔

۲۔ نبی کریم ﷺ دین وشریعت کے باب میں کوئی بات اجتہاد ورائے سے نہیں فرماتے تھے۔

[1] نسائی: ۳۴۶۰، بخاری معلق

[2] ابن ماجہ: ۲۰۹۳، نسائی: ۳۴۶۰، ابوداود: ۲۲۱۴

Marfat.com

وحی متلو اور وحی غیر متلو:

گزشتہ صفحات میں وحی کی اقسام سے متعلق میں نے جو کچھ عرض کیا ہے اس کے بعد تو اس عنوان کے تحت کچھ عرض کرنے کی ضرورت نہیں رہ گئی تھی، لیکن چونکہ بعض لوگ وحی کی اس تقسیم کو تسلیم نہیں کرتے، اس لیے مستقل عنوان کے تحت اس پر گفتگو ضروری تھی۔

علی گڑھ، ہندوستان سے ایک ششماہی رسالہ ''علوم القرآن'' نکلتا ہے جس کا ذکر مولانا امین احسن اصلاحی کے نظریہ حدیث، امام زہری اور ان سے مروی صحیح بخاری کی بعض حدیثوں پر اعتراض کے جواب کے ضمن میں آچکا ہے۔ اس رسالہ کے شمارہ نمبر ا، جنوری، جون ۲۰۱۰ء میں پروفیسر الطاف احمد اعظمی کا ایک مضمون ''وحی کی حقیقت'' کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ اس کے شروع میں انہوں نے وحی کی اس تقسیم سے عدم اتفاق کا اظہار فرمایا ہے اس مضمون میں انہوں نے کچھ ایسی باتیں بھی فرمائی ہیں جن کی زد نبی کریم ﷺ کی تشریعی حیثیت پر بھی پڑتی ہے، دین وشریعت، تفسیر قرآن، اور حدیث کے شرعی مقام سے متعلق اصلاحی مکتبہ فکر سے وابستہ لوگوں کے خاص نظریات ہیں جن کا برصغیر کے ارباب فکرو دانش پر بڑا اثر ہے، اس لیے میں موصوف کے اس مضمون کے بعض مندرجات پر تبصرہ کرنا چاہتا ہوں۔

وحی متلو:

''وحی متلو'' قرآن پاک ہے جو وحی متلو اس لیے ہے کہ اس کا ذریعہ نزول بھی ''وحی'' ہے۔ لیکن یہ نماز میں پڑھا جاتا ہے اور تلاوت کیا جاتا ہے اور نماز سے باہر بھی اس کی تلاوت عبادت ہے قرآن وحدیث میں قرآن کی اس تلاوت کا بڑا ذکر آیا ہے جس سے اس کے ''وحی متلو'' ہونے کی حقیقت سمجھی جاسکتی ہے۔

درحقیقت قرآن اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔ الفاظ، حروف اور معانی کے مجموعے کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور کلام اللہ تعالیٰ کی صفت ہے یہ بات اہل سنت وجماعت کے عقائد میں داخل ہے، نبی کریم ﷺ پر نازل ہونے سے اس کے کلام اللہ ہونے کی حقیقت نہیں بدلی ہے، کیونکہ اس صورت میں بھی اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنا کلام فرمایا ہے:

﴿وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ﴾ (التوبة: ٦)

''اور اگر مشرکوں میں سے کوئی تم سے پناہ کا طالب ہو تو اسے پناہ دے دو، تاکہ وہ اللہ کا کلام سنے۔''

لیکن سنت یا حدیث وحی ہونے کے باوجود اللہ تعالیٰ کا کلام نہیں ہے وہ قرآن کے مانند اور اس کے بالکل مساوی مأخذ شریعت تو ہے، مگر انسانی کلام ہے اس کے معانی اور مضامین تو بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کے قلب مبارک پر نازل فرمائے ہیں، مگر حروف والفاظ اور تعبیر رسول اللہ ﷺ کی اپنی ہے اور نماز میں تلاوت نہ کیے جانے کی وجہ سے ''وحی غیر متلو'' کہی جاتی ہے۔

اعظمی صاحب نے حدیث یا سنت کو ''محض لغوی وحی'' قرار دینے یا ثابت کرنے کے لیے قرآن پاک کی ان آیتوں

Marfat.com

سے استدلال کیا ہے جن میں شیطانوں کا ایک دوسرے کو وحی کرنے، ام موسیٰ علیہا الصلاۃ والسلام کو کی جانے والی وحی اور شہد کی مکھیوں کو کی جانے والی وحی کا ذکر آیا ہے اور تان اس دعوے پر توڑی ہے:

''شرع میں جب وحی کا لفظ بولا جاتا ہے تو اس سے مراد وہ مخصوص خدائی ہدایت ہوتی ہے جو پیغمبر کے توسط سے اہل ایمان کو ملی ہے اور اسی حکم وہدایت کا نام قرآن ہے، قرآن اور وحی باعتبار حقیقت مترادف الفاظ ہیں، جیسا کہ درج ذیل آیت میں فرمایا گیا ہے:

﴿وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّقْضٰٓى اِلَيْكَ وَحْيُهٗ﴾ (طٰہٰ: ۱۱۴)

''اور اپنی طرف اس کی وحی تمام ہونے سے پہلے قرآن کو پڑھنے میں جلدی نہ کرو۔''

موصوف نے اس کے بعد صحیح بخاری کی جو حدیث نقل کی ہے اور جس سے وحی کے بدون واسطہ اور بالواسطہ نزول پر غلط استدلال کیا ہے، اگر وہ اس کے فوراً بعد والی حدیث بھی پڑھ لیتے تو ان کو یہ معلوم ہو جاتا کہ ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نیک خواب کو بھی وحی قرار دیا ہے۔ (نمبر۳) یقینی سی بات ہے کہ ام المومنین نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خواب کو لغوی معنی میں وحی نہیں قرار دیا ہوگا، کیونکہ اس وقت اس کا کوئی موقع محل نہیں تھا، یاد رہے کہ یہ واقعہ ام المومنین کی پیدائش سے پہلے کا ہے، یعنی وہ اس کی عینی شاہد نہیں تھیں اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے براہ راست سن کر یہ واقعہ اپنے منفرد اور خوبصورت اسلوب میں بیان کیا ہے۔

اس حدیث کی بہت سی خوبیوں میں سے ایک خوبی یہ ہے کہ اس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم، ام المومنین خدیجہ رضی اللہ عنہا، اور حدیث کی راوی عائشہ رضی اللہ عنہا تینوں کے اسالیب بیان موجود ہیں، جس سے ام المومنین کی دقت بیانی اور امانت داری کا ثبوت ملتا ہے۔

آپ کو عربی بھی نہیں آتی:

الطاف اعظمی کو عربی زبان بھی نہیں آتی، جس کی دلیل یہ ہے کہ اسی فقرے میں انہوں نے یہ فرمایا ہے کہ: قرآن اور وحی باعتبار حقیقت مترادف الفاظ ہیں'' اور اس دعویٰ پر سورہ طہٰ کی اس آیت سے استدلال کیا ہے:

﴿وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّقْضٰٓى اِلَيْكَ وَحْيُهٗ﴾ (طٰہٰ: ۱۱۴)

''اور اپنی طرف اس کی وحی تمام ہونے سے پہلے قرآن کو پڑھنے میں جلدی نہ کرو۔''

اس آیت مبارکہ میں ''وَحيُه'' فعل مجہول ''يُقضى'' کا نائب فاعل اور مصدر ہے بمعنی ''وحی کیا جانا'' اور مضاف الیہ ضمیر ''ہ'' سے قرآن مراد ہے، مطلب یہ ہے کہ: قرآن کے وحی کیے جانے کے عمل کے تمام ہونے سے پہلے وحی شدہ قرآن کو مت پڑھو، بلکہ اس کے مکمل ہونے تک اسے بغور سنتے رہو۔ مذکورہ آیت میں صرف یہی فرمایا گیا ہے، دراصل نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی تین طریقوں سے نازل ہوتی تھی: (۱) جبریل علیہ السلام، اللہ کے حکم سے اس کا کلام، حروف، الفاظ اور معانی

Marfat.com

کے ساتھ نبی ﷺ پر نازل فرماتے تھے۔ قرآن اور دوسری آسمانی کتابیں اسی طریقے سے نازل ہوتی ہیں۔ (۲) جبریل علیہ السلام بصورتِ انسان آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر آپ کو اللہ کا حکم پہنچاتے تھے۔ (۳) اللہ تعالیٰ کے حکم سے جبریل علیہ السلام آپ کے دل میں کوئی بات ڈال دیتے تھے۔

پہلی صورت اور طریقہ قرآن اور دوسری آسمانی کتابوں کے نزول کے لیے خاص تھا اور دوسرے دونوں طریقوں سے جو احکام اور ہدایات آپ کو دی گئی ہیں ان کا نام حدیث یا سنت ہے۔ ان تینوں طریقوں پر وحی کا اطلاق ہوتا ہے اور یہ تینوں بالواسطہ ہی انجام دی جاتی تھیں۔

معلوم ہوا کہ وحی قرآن کے نزول کی ایک شکل ہے ذات قرآن نہیں کہ وحی اور قرآن کو آپس میں مترادف مانا جائے۔ آیت میں یہی فرمایا گیا ہے کہ جب قرآن بذریعہ وحی نازل کیا جا رہا ہو تو اس کی تکمیل تک اسے خاموشی سے سنتے رہو اور درمیان میں اسے پڑھنے کی کوشش نہ کرو۔ آپ کے اس ارشاد سے یہ لازم آتا ہے کہ ''تنزیل'' بھی قرآن کا مترادف ہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿وَاِنَّهٗ لَتَنْزِیْلُ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾ ''درحقیقت یہ رب العالمین کا نازل کردہ ہے۔'' (شعراء: ۱۹۲) یاد رہے کہ یہاں مصدر ''تنزیل'' اسم مفعول ''منزل'' کے معنی میں ہے۔

اعظمی صاحب نے یہ سارا تکلف دانستہ یا نادانستہ اس لیے کیا ہے تاکہ یہ ثابت کر سکیں کہ وحی کا اطلاق صرف قرآن پاک پر ہوتا ہے ان کا دعویٰ ہے کہ: قرآن کے علاوہ کسی دوسری چیز پر حقیقی معنی میں وحی کا اطلاق نہیں ہوتا۔ ❶ اور قران وحدیث دونوں کو وحی قرار دینا بہت بڑا فتنہ ہے: ہمارے بہت سے علماء کی غلطی یہ ہے کہ دونوں طرح کی وحی پر ایک ہی حکم لگا دیا، نتیجہ کے طور پر وہ خود بھی فتنہ میں پڑے اور مسلمانوں کی ایک کثیر تعداد کو بھی مبتلائے فتنہ کیا'' ❷ ''آلا ساء ما یذرون''

اعظمی صاحب سے ایک سوال:

میں نے گزشتہ صفحات میں حدیث یا سنت کے ''وحی الٰہی'' ہونے کی دلیل کے طور پر قرآن اور صحیح احادیث سے جو مثالیں دی ہیں ان کے بعد تو ''حدیث'' کو محض لغوی وحی قرار دینا ''ہٹ دھرمی'' ہے، پھر بھی میں موصوف سے یہ سوال کرنا چاہتا ہوں کہ ''اگر آپ کے نزدیک حدیث اور سنت کی شکل میں نبی ﷺ پر نازل ہونے والی وحی اپنی متعدد صورتوں میں اسی طرح کی وحی تھی جس طرح کی وحی ام موسیٰ علیہا الصلاۃ والسلام کو کی گئی تھی یا جو وحی شہد کی مکھیوں کی جاتی ہے، تو کیا اس سے ہم یہ سمجھ سکتے ہیں کہ ہماری نمازیں، ہمارے سجدے اور ہماری تسبیحات وغیرہ بھی چرند و پرند، اور نباتات و جمادات کی نمازوں، سجدوں اور تسبیحات کی طرح ہیں، اور اگر کوئی یہ دعویٰ کرے کہ اگر ہم احادیث میں بیان کردہ نمازوں کے بجائے، چیونٹیوں کی طرح کی نمازیں پڑھیں، پہاڑوں کی طرح اللہ کا سجدہ کریں اور درختوں کی طرح اس کی تسبیح اور پاکی بیان کریں تو یہ عبادتیں درست ہوں گی اور عند اللہ مقبول بھی ہوں گی، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس طرح

❶ ص: ۳۰۔ ❷ ص: ۳۳

Marfat.com

کی عبادتوں کو ان سے بھی منسوب کیا ہے، ارشاد الٰہی ہے:

﴿اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُسَبِّحُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالطَّيْرُ صٰٓفّٰتٍ كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسْبِيْحَهٗ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَفْعَلُوْنَ﴾ (النور: ٤١)

''کیا تم نے نہیں دیکھا کہ درحقیقت آسمانوں اور زمین میں جو بھی ہیں اور پر پھیلائے جو پرندے اڑ رہے ہیں وہ اللہ کی تسبیح کر رہے ہیں اور ہر ایک کو اپنی نماز اور تسبیح معلوم ہے اور اللہ خوب جانتا ہے جو یہ کرتے ہیں۔''

اور سورۂ نحل میں ہے:

﴿وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ مِنْ دَآبَّةٍ وَّالْمَلٰٓئِكَةُ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ﴾

(النحل: ٤٩)

''اور اللہ ہی کا سجدہ کرتے ہیں آسمانوں اور زمین میں جو جاندار ہیں اور فرشتے اور وہ بڑائی نہیں جتاتے۔''

قرآن وحدیث سے استدلال کا اصول:

کسی بھی مسئلہ میں اثباتاً یا نفیاً قرآن وحدیث سے استدلال کا اصول اور قاعدہ یہ ہے کہ اس مسئلہ سے متعلقہ آیتوں اور حدیثوں پر ایک نظر ڈال لی جائے، پھر ان کے مجموعہ سے حاصل ہونے والے نتائج کی روشنی میں اس مسئلہ پر کوئی حکم لگایا جائے، یہ صحیح ہے کہ نہ قرآنی آیات ایک دوسری کے متعارض ہیں، اور نہ صحیح احادیث میں کوئی اختلاف ہے، اس طرح نہ قرآن حدیث کے خلاف ہے اور نہ حدیث قرآن کے، لیکن ان میں اجمال وتفصیل کا اور تعبیرات کا ظاہری اختلاف ہے جس کو نظر انداز کر دینے سے صحیح حکم معلوم کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

اور صحیح بخاری کی اس حدیث کا ذکر آ چکا ہے جس سے غلط استدلال کرتے ہوئے اعظمی صاحب یہ دعویٰ کر بیٹھے ہیں کہ ''اس روایت میں بدون واسطہ اور بالواسطہ دونوں طرح کی وحی کا ذکر ہوا ہے۔'' [1] جبکہ امر واقعہ یہ ہے کہ اس میں وحی کی جو دو قسمیں بیان ہوئی وہ دونوں بالواسطہ ہی ہیں، لیکن ان کی سطح بین نگاہ ''یأتینی'' کی تعبیر کی تہہ تک نہ پہنچ سکی یا وہ اس تعبیر کا صحیح مفہوم سمجھ تو گئے، مگر پہلے سے بدون واسطہ اور بالواسطہ وحیوں کا جو نظریہ ذہن میں جاگزیں تھا، ''یأتینی'' کی تعبیر کو اس سے بظاہر ہم آہنگ پا کر یہ دعویٰ کر بیٹھے اس دوسری بات کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ اسی صحیح بخاری میں کتاب بداء الخلق کے باب ذکر الملائکہ کے تحت امام بخاری جو ۲۱ حدیثیں لائے ہیں ان میں ایک حدیث نزول وحی ہی سے متعلق ہے جس میں نبی ﷺ نے یہ تصریح کی ہے کہ ہر وحی فرشتہ ہی لاتا ہے اور اس میں ''یأتینی'' کا فاعل الملک (فرشتہ) ہے حدیث کے الفاظ ہیں:

((عن عائشة رضي الله عنها، أن الحارث بن هشام، سأل النبي ﷺ: كيف يأتيك الوحي؟ قال: كل ذاك، يأتيني الملك أحيانا في مثل صلصلة الجرس، فيفصم عني وقد

[1] ص: ۲۱

Marfat.com

وَعَيت ما قال: وهو أشده عليَّ، ويتمثل لي أحيانا رجلاً فيكلمني فأعي ما يقول.))

''عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہتی ہیں: حارث بن ہشام نے نبی ﷺ سے پوچھا: آپ کے پاس وحی کس طرح آتی ہے؟ فرمایا: یہ سب، کبھی فرشتہ میرے پاس گھنٹی بجنے کی صورت میں آتا ہے اور وہ مجھ سے اس حال میں جدا ہوتا ہے کہ اس نے جو کہا ہوتا ہے اسے میں ذہن میں محفوظ کر چکا ہوتا ہوں، وحی کی یہ آمد میرے اوپر سب سے سخت ہوتی ہے اور کبھی فرشتہ میرے لیے ایک مرد کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور مجھ سے بات کرتا ہے، تو وہ جو کہتا ہے اسے میں محفوظ کر لیتا ہوں۔'' ❶

اس دوسری حدیث نے پہلی حدیث (نمبر۲) میں ''یأتینی'' کی تفسیر کر دی اس سے یہ واضح ہو گیا کہ وحی کی یہ دونوں قسمیں بالواسطہ ہی ہوتی تھیں، البتہ پہلی قسم میں وحی لانے والا فرشتہ بصورت فرشتہ ہی آتا تھا اور دوسری میں بصورت انسان۔

حدیث کی تشریعی حیثیت کے یہ منکرین اپنے مطلب کی باتیں تلاش کر لیتے ہیں، لیکن قرآن کی جو آیت یا جو حدیث ان کے مطلب کی نہیں ہوتی اس کا ذکر نہیں کرتے، قرآن پاک میں ایسی آیتیں ہیں جن کے ظاہری الفاظ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نبی ﷺ پر کسی واسطہ کے بغیر براہ راست قرآن پاک نازل کرتا تھا۔

مثال کے طور پر سورۂ آل عمران میں اللہ تعالیٰ نے آیت نمبر ۳۳ سے آیت نمبر ۵۷ تک آل عمران کے واقعات بیان فرمائے ہیں اور آیت نمبر ۵۸ میں ان واقعات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے:

﴿ذٰلِكَ نَتْلُوْهُ عَلَيْكَ مِنَ الْاٰيٰتِ وَ الذِّكْرِ الْحَكِيْمِ﴾ (آل عمران: ۵۸)

''یہ جو ہم تمہیں آگے پیچھے لگا تار سنا رہے ہیں آیتیں ہیں اور حکمت بھرا ذکر۔''

''فعل غائب'' کے مقابلے میں ''فعل متکلم'' کا فاعل زیادہ متعین اور زیادہ یقینی ہوتا ہے اور یہاں تو فعل تعظیمی: ''نتلو'' نے اس امر کی مزید تاکید کر دی ہے کہ یہ ''آیات'' اور ''ذکر حکیم'' سنانے والا اور بیان کرنے والا اللہ عزوجل ہے، تو کیا ہم ان تمام تاکیدات سے یہ سمجھیں کہ مذکورہ آیتیں یا قرآن پاک کی دوسری آیات اللہ تعالیٰ نبی کریم ﷺ کو بدون واسطہ، یا ''براہ راست'' سناتا تھا؟ یا قرآن ہی کی دوسری آیتوں کی روشنی میں یہ سمجھیں کہ اللہ تعالیٰ جبریل علیہ السلام کے واسطہ سے انہیں نبی ﷺ کو سناتا تھا، مثلاً اس کا ارشاد ہے:

﴿وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ۝ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ﴾

(الشعراء: ۱۹۲۔۱۹۴)

''اور درحقیقت یہ رب العالمین کا نازل کردہ ہے جسے امانت دار روح نے تیرے دل پر نازل کیا ہے تاکہ تو ڈرانے والوں میں سے ایک ہو جائے۔''

---

❶ بخاری، نمبر ۳۲۱۵

Marfat.com

غور فرمایئے! یہ بھی فرمایا: ﴿وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ ''اور درحقیقت یہ رب العالمین کا نازل کردہ ہے۔''
پھر اس کے بعد ہی یہ بھی فرمادیا کہ: ﴿نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ﴾ ''اسے امانت دار روح نے نازل کیا ہے۔''

اگر آپ نے صحیح بخاری کی دوسری حدیث بھی دیکھ لی ہوتی اور اس کے ساتھ قرآن پاک کی کسی ایک ہی ایسی آیت پر نظر ڈال لیتے جس میں قرآن پاک نازل کرنے کے فعل کو جبریل علیہ السلام کی طرف منسوب کیا گیا ہے، مثلاً:

﴿قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾ (البقرة: ۹۷)

''کہہ دو! جو کوئی جبریل کا دشمن ہو تو اسی نے اللہ کے حکم سے اسے تیرے دل پر نازل کیا ہے۔''

تو آپ کو معلوم ہو جاتا کہ ہر وحی بالواسطہ ہی نازل ہوتی تھی، دراصل سورۂ شعراء کی آیت نے اللہ تعالیٰ کے قرآن نازل کرنے اور جبریل علیہ السلام کے نازل کرنے کی حقیقت بھی بیان کر دی: اللہ کے پاس سے اور اس کے حکم سے نازل کیے جانے کی وجہ سے وہ اللہ کا نازل کردہ اور ''منزل من اللہ'' ہے اور نبی ﷺ کے قلب مبارک پر جبریل علیہ السلام کے ذریعہ نازل کیے جانے کی وجہ سے اس کی نسبت جبریل علیہ السلام کی طرف بھی کی گئی ہے، بلکہ سورۂ حاقہ (۴۰۔۴۱) اور سورۂ تکویر (۱۹۔۲۱) میں تو اس کو ان کا قول تک کہا گیا ہے، کیونکہ انہیں نے اسے اپنی زبان سے ادا کیا ہے، سنایا ہے اور پہنچایا ہے۔

توسط یا واسطہ:

توسط یا واسطہ کے معنی ذریعہ یا وسیلہ کے ہیں قرآن پاک کے مطابق اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کے علاوہ اپنے کسی نبی یا رسول سے براہ راست یا بلا واسطہ کلام نہیں کیا ہے صرف موسیٰ علیہ السلام کی ذات ایسی ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے کسی واسطہ کے بغیر اپنے کلام سے نوازا ہے اسی وجہ سے فرمایا:

﴿قَالَ يٰمُوْسٰٓى اِنِّى اصْطَفَيْتُكَ عَلَى النَّاسِ بِرِسٰلٰتِيْ وَبِكَلَامِيْ﴾ (الاعراف: ۱۴۴)

''فرمایا اے موسیٰ! درحقیقت میں نے تجھے لوگوں پر اپنے پیغاموں اور کلام کے ساتھ فضیلت بخشی ہے۔''

جہاں تک رسالت کا مسئلہ ہے تو یہ تمام رسولوں میں قدر مشترک تھی، البتہ ہر رسول اپنی قوم میں تنہا اس صفت سے موصوف ہوتا تھا اس تناظر میں ''الناس'' سے مراد وہ لوگ ہیں جن کی طرف موسیٰ علیہ السلام رسول بنا کر بھیجے گئے تھے۔

لیکن جہاں تک ان سے اللہ تعالیٰ کے براہ راست اور بلا واسطہ کلام کرنے کا تعلق ہے تو اس فضیلت میں ان کے ساتھ کوئی اور نبی اور رسول شریک نہیں تھا، اسی وجہ سے پورے قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے صرف انہیں سے کلام کا ذکر فرمایا ہے اور مختلف انداز میں ذکر فرمایا ہے۔

موسیٰ علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ کا کلام ''وحی'' سے عبارت نہیں تھا، کیونکہ لغت میں ''وحی'' کے معنی ہیں: ''الإعلام بسرعة وخفاء'' تیزی سے اور خفیہ طریقے پر کوئی بات کہنا، یا خبر دینا، جبکہ موسیٰ علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ نے بلند آواز میں کلام کیا تھا، جس کے لیے قرآن پاک میں متعدد مقامات پر ''ندا'' کی تعبیر استعمال کی گئی ہے اور ''ندا'' اس آواز کو کہتے

Marfat.com

ہیں جو دور سے دی جائے، یا دور سے آئے اور بلند ہو۔

یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ موسیٰ ؑ سے اللہ تعالیٰ نے براہ راست اور بلا واسطہ بات صرف ایک بار کی تھی، اس ایک بار کے علاوہ ان کو اللہ تعالیٰ کے احکام جبریل علیہ السلام کے واسطہ ہی سے وحی کی صورت میں ملتے رہے یہی حال تمام دوسرے نبیوں اور رسولوں کا بھی رہا جس سے ہمارے نبی اور رسول ﷺ بھی مستثنیٰ نہیں تھے۔

نبی کریم ﷺ کی خدمت میں جبریل امین علیہ السلام وحی لے کر عام طور پر اس طرح حاضر ہوتے تھے کہ وہ غیر مرئی اور غیر مشاہد ہوتے تھے اور نبی ﷺ صرف ان کی آواز سنتے تھے، ان کا مشاہدہ نہیں کرتے تھے، قرآن پاک اسی صورت میں نازل ہوتا تھا۔

اور کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ جبریل علیہ السلام انسانی صورت اختیار کر کے آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور آپ کو اللہ کا پیغام پہنچاتے تھے جس کی واضح ترین مثال ''حدیث جبریل'' ہے۔ ❶

صحیح بخاری کی حدیث نمبر ۲ میں نزول وحی کی یہی دونوں صورتیں بیان ہوئی ہیں جن احادیث میں نبی کریم ﷺ کے دل میں کوئی بات ڈال دینے کی خبر دی گئی ہے تو یہ بھی وحی ہی کی قسم تھی اور یہ وحی بھی جبریل علیہ السلام لاتے تھے یعنی یہ بھی بالواسطہ ہی ہوتی تھی، اس وحی کے دلائل بھی اوپر گزر چکے ہیں۔

مذکورہ بالا وضاحتوں سے اس دعویٰ کی نکارت کو سمجھنا آسان ہو جائے گا جو اعظمی صاحب نے کیا ہے موصوف فرماتے ہیں:

قرآن سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وحی یعنی حکم وہدایت کبھی تو براہ راست ہوتی ہے اور کبھی بالواسطہ، خواہ یہ واسطہ کوئی مادی ذریعہ ہو، جیسے اللہ نے موسیٰ علیہ السلام سے درخت کے توسط سے کلام کیا تھا (سورۂ قصص: ۳۰) یا غیر مادی، ان تینوں ذریعوں کا ذکر ایک ساتھ ہوا ہے، فرمایا گیا ہے:

﴿وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ﴾ (الشوریٰ: ۵۱)

''اور کسی بشر کی یہ شان نہیں کہ اللہ اس سے کلام کرے مگر (کسی وسیلہ سے، مثلاً) وحی والہام سے، پردے کے پیچھے سے، یا کوئی رسول بھیجے، پھر وہ اس کے حکم سے جو اس کو منظور ہو پہنچا دے۔''

یہ ترجمہ الطاف احمد اعظمی صاحب کا ہے، انہوں نے اوپر جو یہ دعویٰ کیا ہے کہ: اللہ نے موسیٰ علیہ السلام سے درخت کے توسط سے کلام کیا تھا'' اس کو درست ماننے کی صورت میں مذکورہ بالا آیت کریمہ سے وحی کے تین ذریعے ثابت نہیں ہوتے، بلکہ صرف ایک ہی ذریعہ ثابت ہوتا ہے اور یہ اس طرح کہ پہلی صورت جس کا ذکر ''وحیاً'' کہہ کر کیا گیا ہے اور

❶ صحیح مسلم، حدیث نمبر ۸

Marfat.com

جو اصل میں "إلا أن یوحی وحیا" ہے اور جس سے عام طور پر مفسرین نے وہ وحی یا الہام مرادلیا ہے جو نبی کریم ﷺ کے دل میں اور آپ سے پہلے کے انبیاء اور رسولوں کے دلوں میں ڈال دیا جاتا تھا، تو یہ وحی بھی فرشتہ کے واسطہ سے ہوتی تھی اور دوسری صورت کے لیے "من وراء حجاب" کی تعبیر اختیار کی گئی ہے اعظمی صاحب نے اس کو بھی درخت کے توسط سے کی جانے والی وحی قرار دیا ہے اور تیسری صورت: ﴿أَوْ يُرْسِلَ رَسُولًا فَيُوحِيَ بِإِذْنِهِ مَا يَشَاءُ﴾ کا بالواسطہ ہونا تو خود واضح ہے، اس طرح یہ ساری وحیاں بالواسطہ ہی قرار پائیں، فتدبر وافهم.

دراصل اس آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے انسانوں سے اپنے ہم کلام ہونے یا بات کرنے کی صورتیں بیان فرمائی ہیں اور پہلی صورت بیان کرنے سے پہلے پوری قطعیت کے ساتھ اس امکان کی نفی کر دی ہے کہ اس دنیا میں وہ کسی بھی انسان سے رودررو بات کرے، اس کے فوراً بعد حرف "استثنا" "إلا" کے ذریعہ انسانوں سے اپنے بات کرنے کی صورتیں بیان فرمائی ہیں، جن میں سے پہلی صورت "وحی" کی صورت میں وقوع پذیر ہوتی رہی ہے یہی وہ وحی ہے جس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے اپنے تمام نبیوں اور رسولوں پر اپنی کتابیں نازل فرمائیں اور ان کو شرعی احکام دیے اور یہ وحی بھی جبریل علیہ السلام کے واسطہ سے ہی ان کو کی جاتی تھی، واضح رہے کہ اس زمین میں اللہ تعالیٰ نے جتنے بھی رسول بھیجے سب کے ساتھ کتابیں بھی بھیجیں۔ (سورۂ حدید: ۲۵)

وحی کی یہ سب سے اعلیٰ، سب سے واضح اور سب سے زیادہ یقینی قسم تھی جس سے صرف اللہ کے نبی اور رسول سرفراز کیے جاتے تھے مولانا تھانوی نے آیت میں "وحیا" کا ترجمہ "الہام" کیا ہے جو کسی بھی تاویل سے درست نہیں ہے، کیونکہ الہام مأخذ شرع نہیں ہے، بلکہ دل میں پیدا ہونے والے مبہم اور غیر یقینی جذبہ خیر یا شر سے عبارت ہے اس وحی میں وہ وحی بھی داخل ہے جس کے لیے "دل میں ڈال دینے" کی تعبیر اختیار کی گئی ہے اور یہ وحی بھی جبریل علیہ السلام کے ذریعہ اور واسطہ سے کی جاتی تھی۔ ❶

آیت میں کسی انسان سے اللہ تعالیٰ کے ہم کلام ہونے یا بات کرنے کی جو دوسری صورت بیان ہوئی ہے وہ کسی واسطہ کے بغیر براہ راست بات کرنے کی صورت ہے، لیکن پردے کے پیچھے سے اس طرح کہ موسیٰ آیت نے اللہ تعالیٰ کا کلام تو سنا، مگر اس کو دیکھا نہیں۔

الطاف احمد اعظمی صاحب نے دعویٰ کیا ہے کہ: اللہ نے موسیٰ علیہ السلام سے درخت کے توسط سے کلام کیا تھا، انہوں نے اپنے اس دعویٰ کی دلیل میں سورۂ قصص کی آیت نمبر ۳۰ کا حوالہ دینے پر اکتفا کیا ہے، آیت اور اس کا ترجمہ نہیں نقل کیا ہے، اگر وہ آیت اور اس کا ترجمہ بھی نقل کر دیتے تو ان کے اس دعوے کی قلعی کھل جاتی، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿فَلَمَّا أَتَاهَا نُودِيَ مِن شَاطِئِ الْوَادِ الْأَيْمَنِ فِي الْبُقْعَةِ الْمُبَارَكَةِ مِنَ الشَّجَرَةِ أَن يَا مُوسَىٰ إِنِّي

❶ الأسماء والصفات حدیث نمبر ۴۲۷، الرسالہ ص ۹۹، فقرہ نمبر ۳۰۶

Marfat.com

اَنَا اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ (القصص: ۳۰)

''تو جب وہ اس کے پاس آیا تو مبارک قطعہ میں وادی کے دائیں کنارے کے درخت سے پکارا گیا کہ اے موسیٰ! درحقیقت میں ہی اللہ ہوں، سارے جہانوں کا رب۔''

اس آیت مبارکہ میں "مِنَ الشجرة" کا فقرہ یہ بتا رہا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو جو''ندا'' آئی تھی وہ درخت کی طرف سے آ رہی تھی جو وادی کے دائیں کنارے پر اُگا ہوا تھا، وادی کا دایاں کنارا وسیع تھا جس میں سے ایک جگہ مذکورہ درخت اُگا ہوا تھا اور اسی درخت کی سمت اور جہت سے موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی ندا سنی تھی، سورۂ مریم میں ہے:

﴿وَ نَادَيْنٰهُ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ الْاَيْمَنِ﴾ (مریم: ۵۲)

''اور ہم نے اسے طور کی دائیں جانب سے پکارا۔''

معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے جو کلام کیا تھا وہ درخت کے توسط سے نہیں، بلکہ براہ راست کیا تھا اور انہوں نے یہ کلام طور پہاڑ کی وادی کے دائیں کنارے پر اگے ہوئے ایک درخت کی جانب سے سنی تھی، نہ کہ درخت کے توسط سے، اس لیے کہ درخت کے توسط یا واسطہ سے اللہ تعالیٰ کے کلام کرنے کا مطلب یہ ہے کہ درخت اللہ تعالیٰ سے اس کا کلام وصول کر کے اپنی زبان میں یا اپنی آواز میں اسے موسیٰ علیہ السلام کو پہنچا رہا تھا، جس طرح جبریل علیہ السلام قرآن کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچاتے تھے، قرآن کے الفاظ سے یہ مفہوم نہیں نکلتا، بلکہ یہ مفہوم نکلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ بذات خود موسیٰ علیہ السلام سے ہم کلام ہوا تھا اور انہوں نے آواز، اور حروف ومعانی کے ساتھ اس کا کلام سنا تھا۔

میں نے ابھی جو کچھ عرض کیا ہے اس کی تائید ان آیتوں سے بصراحت ہوتی ہے جن میں موسیٰ علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ کی ہم کلامی کا ذکر آیا ہے سورۂ نساء کی آیت نمبر ۱۶۴ کا آخری فقرہ ہے:

﴿وَ كَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا﴾ (النساء: ۱۶٤)

''اور اللہ ہی نے موسیٰ سے کلام کیا۔''

اس آیت مبارکہ میں "تکلیما" فعل "کلم" کا مصدر ہے جس کا اصطلاحی نام ''مفعول مطلق'' ہے، اسی وجہ سے منصوب ہے، اس طرز تعبیر سے فاعل کی طرف فعل کی نسبت کو یقینی اور مؤکد بنانا ہوتا ہے اس تناظر میں آیت کا مطلب ہے کہ اور اللہ ہی نے موسیٰ سے کلام کیا تھا'' یا اللہ نے موسیٰ سے حقیقۃً کلام کیا تھا، جن اردو مترجمین نے آیت کا ترجمہ یہ کیا ہے: اور موسیٰ سے اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر کلام فرمایا'' (تھانوی) یا ''اور اللہ نے موسیٰ سے کلام کیا، خود کلام کرنا'' (حافظ عبدالسلام) یا ''اور کلام کیا اللہ نے موسیٰ سے (خاص طور پر) کلام (حافظ صلاح الدین) تو یہ تمام ترجمے جہاں ''دقیق'' نہیں ہیں، وہیں ان میں "تـکـلـیـمـا" کا الگ سے اعتبار کیا گیا ہے، جبکہ یہ ایک طرز تعبیر ہے جس کے تمام اجزا باہم مل کر ایک خاص اور حقیقی مفہوم دیتے ہیں، اور واسطہ اور توسط کے تمام احتمالات کا خاتمہ کر دیتے ہیں، اور قرطبی نے

Marfat.com

بالکل سچ فرمایا ہے کہ:

((وأجمع النحو يون على أنك إذا أكدت الفعل بالمصدر لم يكن مجازاً.))

''علمائے نحو کا اس بات پر اجماع ہے کہ جب تم فعل کی مصدر سے تاکید کر دو تو وہ مجازی معنی میں نہیں رہ جاتا۔'' ❶

مذکورہ بالا وضاحتوں کی روشنی میں اس دعوے سے کہ: اللہ نے موسیٰ علیہ السلام سے درخت کے توسط سے کلام کیا تھا'' یہ آیت اور وہ تمام آیتیں بے معنی ہو جاتی ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی یہ خصوصی فضیلت بیان فرمائی ہے کہ اس نے ان سے براہ راست اور بلا واسطہ بات کی تھی۔

اس بات کا بڑا امکان ہے کہ الطاف احمد اعظمی نے یہ نظریہ ''سرسیّد خاں'' کی تفسیر سے لیا ہو جو معتزلی تھے اور انہوں نے اپنی تفسیر میں ''تاویل'' کے نام سے بڑی ''تحریفات'' کی ہیں اور مولانا حمید الدین فراہی رحمہ اللہ نے بجا طور پر اس کو ''کار معصیت'' قرار دے دیا تھا۔

دراصل معتزلہ اور متکلمین کا یہ دعویٰ ہے کہ ''اللہ تعالیٰ نے درخت میں اپنے کلام کو وجود بخشا جس سے موسیٰ علیہ السلام نے اسے سنا'' ❷

مگر قرطبی اشعری متکلم ہوتے ہوئے بھی اس آیت کی تفسیر میں حق بات فرما گئے، فرماتے ہیں:

((''تكليما'' مصدر معناه التأكيد؛ يدل على بطلان من يقول: خلق لنفسه كلاماً في شجرة، فسمعه موسى، بل هوا الكلام الحقيقي الذي يكون به المتكلم متكلما.))

''(تکلیما) مصدر ہے جس کے معنی تاکید کے ہیں، یہ اس شخص کے دعوے کے باطل ہونے پر دلالت کرتا ہے جو یہ کہتا ہے کہ اللہ نے ایک درخت میں کلام کی تخلیق فرمائی اور موسیٰ نے اسے سنا، بلکہ یہ ایسا حقیقی کلام ہے جس کا بولنے والا ہی متکلم قرار پاتا ہے۔'' ❸

انسانوں سے اللہ تعالیٰ کے کلام کرنے کی تیسری صورت آیت میں یہ بیان کی گئی ہے کہ: ''اللہ اپنا کوئی رسول فرشتہ بھیجے جو اس کے حکم سے اس بات کی وحی کرے جو وہ چاہے۔''

یہ تیسری صورت وہی ہے جس کا ذکر صحیح بخاری کی حدیث نمبر ۲ میں آیا ہے کہ:

((وأحيانا يتمثل لي الملك رجلا فأعي ما يقول.))

''اور کبھی فرشتہ میرے لیے ایک مرد کی شکل اختیار کر لیتا ہے تو وہ جو کہتا ہے اسے میں سمجھ کر سینے میں محفوظ کر لیتا ہوں۔''

---

❶ الجامع الأحکام القرآن ص ۳۰۲، ج ۳ ❷ شرح العقیدۃ الطحاویۃ ص: ۲۸۰ ج ۱

❸ ص ۳۰۲، ج ۳

Marfat.com

انسانوں سے اللہ کے کلام کرنے، یا ان میں سے کسی کے پاس بذریعہ وحی اس کے اپنا پیغام بھیجنے کی یہ صورت رسولوں کے لیے خاص نہیں تھی، بلکہ اس طرح اس نے غیر انبیاء کو بھی وحی کی ہے اور جبریل علیہ السلام نے اس کے حکم سے انسانی شکل اختیار کر کے ان کو اس کا پیغام پہنچایا ہے، ان غیر انبیاء میں ام عیسیٰ، مریم علیہا الصلوٰۃ والسلام کے حق میں تو قرآن یہ تصریح کرتا ہے کہ جبریل علیہ السلام ان کے پاس ایک مکمل انسان کی شکل میں تشریف لائے تھے۔ (سورۂ مریم: ۱۷)

دوسری شخصیت ام موسیٰ علیہا الصلوٰۃ والسلام کی ہے جن کے حق میں قرآن یہ تصریح تو نہیں کرتا کہ جبریل علیہ السلام ان کے پاس بھی انسانی شکل میں تشریف لائے تھے، البتہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد:

﴿وَ اَوْحَیْنَآ اِلٰٓی اُمِّ مُوْسٰٓی﴾ (القصص: ۷) ''اور ہم نے موسیٰ کی ماں کی طرف وحی کی''

سورۂ شوریٰ کی زیر بحث آیت کی روشنی میں اس کے علاوہ یہ کوئی اور مفہوم نہیں رکھتا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو بھی جبریل علیہ السلام کے ذریعہ ہی وحی کی ہوگی، کیونکہ وہ نبی یا رسول نہیں تھیں کہ ان کے پاس جبریل علیہ السلام بصورت فرشتہ آتے، یا اللہ تعالیٰ نے ان سے اس طرح براہ راست پردہ کے پیچھے سے بات کی ہو جس طرح موسیٰ علیہ السلام سے کی تھی، اس لیے کہ قرآن کی صراحتوں کے مطابق یہ فضیلت موسیٰ علیہ السلام کے لیے خاص تھی، اس طرح ان سے اللہ کے کلام کرنے یا ان کو وحی بھیجنے کی یہی تیسری صورت رہ جاتی ہے۔

جن مفسرین نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ام موسیٰ رحمہا اللہ کو ''الہام'' کیا تھا ❶ تو ان کا یہ دعویٰ قرآن وحدیث سے کوئی دلیل نہ رکھنے کے ساتھ صوفیانہ ذوق کی پیداوار ہے: اولاً تو اللہ تعالیٰ نے ''أوحینا'' کی تعبیر اختیار فرمائی ہے اور ''وحی'' الہام سے بالکل مختلف چیز ہے؛ الہام محض ایک خیال، ایک رجحان اور ایک جذبہ ہے جو کسی انسان کے دل میں ابھرتا ہے اور پیدا ہوتا ہے، اگر یہ نیکی اور خیر سے متعلق ہو تو اللہ کی طرف سے ہے۔ پھر بھی مبہم اشارہ سے زیادہ کچھ نہیں اور محض اس کی بنیاد پر کوئی عملی اقدام جائز نہیں ہے اور اگر یہ شر اور برائی سے متعلق ہو تو شیطانی خیال ہے، چونکہ صوفیا کے تمام عقائد اور اعمال ان کے ذوق کی پیداوار ہیں، اور ان کو درست ثابت کرنے کے لیے وہ الہام کا بہت سہارا لیتے ہیں اسی لیے تصوف کی کتابوں میں الہام پر بہت زور دیا گیا ہے۔

علمائے اسلام کا اس امر پر اتفاق ہے کہ الہام ماخذ شرع نہیں ہے، قرآن پاک میں اس کا ذکر صرف ایک بار آیا ہے اور انسانوں کی سرشت اور فطرت میں ودیعت اللہ کے غضب سے بچنے اور اس کی نافرمانی کرنے کے اس مبہم میلان اور جذبے کے طور پر جو واضح شرعی احکام کا محتاج ہے۔

اس کے بالمقابل وحی ایک یقینی ذریعہ علم ہے، یہی تمام شریعتوں کا ماخذ رہی ہے اور اسی ذریعہ سے تمام رسولوں پر اللہ کی کتابیں نازل ہوتی رہی ہیں اور اسی ذریعہ سے اللہ تعالیٰ اپنے نبیوں اور رسولوں کو اپنی کتابوں کی تشریح اور تبیین کے

❶ تھانوی، بیان القرآن، ص ۷۵۸

Marfat.com

طریقے سکھاتا رہا ہے۔

ثانیاً اللہ تعالیٰ نے ام موسیٰ علیہما الصلاۃ والسلام کو جو گراں بار احکام دیے تھے اور ان کو جس دل ہلا دینے والی آزمائش میں ڈالا تھا اس کے لیے نہایت واضح، نہایت یقینی اور نہایت اطمینان بخش طریقے کی ضرورت تھی اور یہ طریقہ صرف وحی کا طریقہ تھا، ورنہ وہ اپنے لخت جگر کو خود اپنے ہاتھوں دریا میں نہیں ڈال سکتی تھیں۔

مزید یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو جہاں یہ حکم دیا تھا کہ وہ اپنے بچے کے حق میں کوئی خوف واندیشہ نہ کریں وہیں ان سے یہ وعدہ بھی کیا تھا کہ وہ ان کے بچے کو ان کی گود میں واپس لائے گا، اور اس کو رسول بھی بنائے گا، تو اتنے واضح احکام اور اتنے یقینی وعدوں کی گنجائش الہام میں کہاں ہے؟

قرآن کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو حدیث کی شکل میں جو احکام دیے ہیں وہ بھی بذریعہ الہام نہیں، بلکہ بذریعہ وحی ہی تھے جس کے لیے رسول اللہ ﷺ نے دل میں ڈال دینے کی تعبیر اختیار فرمائی ہے وہ بھی شرعی وحی تھی اور اعظمی صاحب کا یہ دعویٰ ایک ''بڑ'' کے سوا کچھ نہیں کہ: ''وہ معروف معنی میں وحی نہیں تھی، بلکہ خاص لغوی معنی میں وحی تھی۔'' ❶

انہوں نے اپنے اس دعوے کی تائید میں سورۂ تحریم کی آیت: ﴿نَبَّأَنِيَ الْعَلِيمُ الْخَبِيرُ﴾ ''مجھے اس نے خبر دی ہے جو سب کچھ جاننے والا ہر چیز سے باخبر ہے۔'' (۳) اور سورۂ شعراء کی آیت: ﴿فَأَوْحَيْنَا إِلَىٰ مُوسَىٰ أَنِ اضْرِب بِّعَصَاكَ الْبَحْرَ﴾ ''تو ہم نے موسیٰ کی طرف وحی کی کہ اپنی لاٹھی سمندر پر مارو۔'' (۶۳) سے استدلال کرتے ہوئے جو یہ فرمایا ہے کہ: کھلی بات ہے کہ یہ وحی الفاظ کے ساتھ نہیں آئی ہوگی، بلکہ اس ناگہانی صورت حال سے نمٹنے کی یہ ایک تدبیر تھی جو موسیٰ علیہ السلام کے دل میں القا کی گئی تھی۔ ❷

تو انہوں نے ان دونوں آیتوں سے یہ استدلال دراصل اپنے اس دعویٰ کو درست ثابت کرنے کی غرض سے کیا ہے کہ: ''شرع میں جب وحی کا لفظ بولا جاتا ہے تو اس سے مراد وہ مخصوص ربانی ہدایت ہے جو پیغمبر ﷺ کے توسط سے اہل ایمان کو ملی ہے اور اس حکم وہدایت کا نام قرآن ہے۔'' ❸

میں موصوف سے چند سوالات کرنا چاہتا ہوں:

۱۔ آپ نے جس وحی کی یہ تعریف فرمائی ہے اور جس کا مصداق صرف قرآن کو بتایا ہے وہ کس شرع میں آئی ہے، شرع اسلامی میں تو نہیں آئی ہے، لہٰذا ازراہ کرم بتا دیں کہ یہ بات آپ کی شرع میں آئی ہے، اصلاحی شرع میں یا علوم القرآن نکالنے والوں کی شرع میں؟

۲۔ نبی کریم ﷺ کی جس زوجہ محترمہ کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو خبر دی تھی اس کو معروف معنی میں وحی نہ ماننے اور موسیٰ آیت کو دیے جانے والے حکم کو دل میں ڈال دی جانے والی تدبیر قرار دینے اور اس کے ''لفظی

❶ ص ۳۰ ❷ ص ۳۱ ❸ ص ۲۰

Marfat.com

وحی'' نہ ہونے کے آپ کے دعوے کی دلیل کیا ہے؟

پھر اس سوال سے مزید دو سوال اور پیدا ہوتے ہیں:

(ا)...... بلاشبہ قران پاک لفظ و معنی دونوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور سورۂ قیامہ کی آیات کے مطابق نزول قرآن کے وقت رسول اللہ ﷺ بلاشبہ اپنی زبان کو اس لیے حرکت دیتے تھے تا کہ آپ قرآن کے الفاظ کو نزول وحی کی تکمیل سے پہلے ہی یاد کرلیں، مگر اس سے یہ کہاں لازم آیا کہ ہر وحی اسی طرح قرآن کے مانند ہو جس طرح قرآن ہے کہ وہ حروف و معانی کے ساتھ اللہ کا کلام ہے؟

(ب)...... پانی پر لاٹھی مارنا کہ وہ خشک ہو جائے اور اس میں راستہ بن جائے، ایک انتہائی محیر العقول معجزہ تھا جس کا تصور موسیٰ علیہ السلام جیسے اولوالعزم رسول کا ذہن بھی نہیں کرسکتا تھا، اتنے بڑے معجزے کی وحی کو الفاظ سے عاری محض دل میں القا کی جانے والی تدبیر قرار دینے کی دلیل کیا ہے؟ بلکہ آپ کا یہ ارشاد خود آپ کے اس دعوے کے خلاف ہے کہ قرآن کے علاوہ ہر وحی معروف معنی میں وحی نہیں تھی، بلکہ لغوی معنی میں وحی تھی۔

قرآن کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ جبریل نے اسے نبی ﷺ کے دل پر نازل کیا ہے: (سورۂ بقرہ: ۹۷) اور حدیث کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: ((إن الروح الأمین قد ألقی فی روعی......)) درحقیقت روح الامین نے میرے دل میں ڈال دیا ہے۔'' ❶ اور ''الا إنی أوتیت القرآن ومثله معه'' غور سے سن لو! مجھے قرآن دیا گیا ہے اور اس کا ہم مثل...... ❷ اللہ و رسول کے کلام میں اس معنوی مطابقت کے باوجود کس طرح قرآن معروف معنی میں ''وحی'' قرار پایا اور حدیث لغوی معنی میں؟

ایک حدیث کے الفاظ ہیں:

((أتانی جبریل علیه السلام ، فقال: مر أصحابك فلیر فعوا أصواتهم بالإهلال .))

''میرے پاس جبریل علیہ السلام آئے اور کہا: اپنے اصحاب کو حکم دیجیے کہ وہ بلند آواز سے تلبیہ کہیں۔'' ❸

سوال یہ ہے کہ جبریل علیہ السلام نے یہ بات نبی ﷺ سے اپنی طرف سے کہی تھی یا اللہ کے حکم سے کہی تھی؟ اور کیا یہ لغوی وحی تھی؟ اور کیا انہوں نے یہ بات آپ کے دل میں ڈالی تھی یا آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر اللہ کا پیغام پہنچایا تھا؟

اس مثال سے آپ کے اس دعوے کی جڑ بھی کٹ جاتی ہے کہ: ''وحی کا اطلاق صرف قرآن پر ہوتا ہے جو لفظاً اور معناً دونوں طرح محفوظ ہے۔'' ❹ کیونکہ اس سے وحی کی وہ قسم (حدیث) بھی ثابت ہوتی ہے جو حکماً اور معناً تو من جانب اللہ ہے، لیکن الفاظ رسول اللہ ﷺ کے اپنے ہیں۔

---

❶ الاسماء والصفات: ۴۲۷، الرسالہ ص ۹۹

❷ ابو داود: ۴۶۰۴، ترمذی: ۲۶۶۴، ابن ماجہ ۱۲

❸ مسند امام احمد: ۱۶۶۷۲، ۱۶۶۸۳، ۱۶۶۸۴، ۱۶۶۸۵

❹ ص ۳۳

Marfat.com

اعظمی کا اصلی چہرہ:

الطاف احمد اعظمی نے وحی کی حقیقت کے بیان میں اب تک جو کچھ فرمایا تھا اپنے چہرے پر مصنوعی نقاب ڈال کر فرمایا تھا اور جب انہوں نے یہ محسوس کر لیا کہ ''علوم القرآن'' کے ذمہ دار اور قاری ان کے مسموم افکار کو ہضم کر لینے کی استعداد پیدا کر چکے ہوں گے تو انہوں نے اپنے چہرے سے نقاب الٹ دیا اور اصل چہرے کے ساتھ سامنے آگئے فرماتے ہیں:

''......وحی ہر دور کے لیے ہے اور حالات اور زمانے کی تبدیلی کے باوجود نا قابل تغیر ہے، لیکن کلام رسول جو وحی کی عملی تبیین وتشریح ہے، قرآن کی طرح نا قابل تغیر نہیں ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ان تشریحات رسول کا بڑا حصہ عربی عہد کے تہذیبی حالات اور عربوں میں عادات ورسوم کے مطابق ہے، یہی وجہ ہے کہ عہد خلافت بالخصوص خلیفہ دوم کے عہد میں رسول اللہ ﷺ کے بہت سے فیصلوں کے برعکس فیصلے کیے گئے اور کسی صحابی نے اعتراض نہیں کیا۔'' ❶

((كبرت كلمة تخرج من أفواههم إن يقولون إلا كذباً.))

اعظمی کی غلط بیانی:

الطاف احمد اعظمی کا یہ ارشاد ہے: وحی ہر دور کے لیے ہے اور حالات اور زمانے کی تبدیلی کے باوجود نا قابل تغیر ہے، لیکن کلام رسول جو وحی کی عملی تبیین وتشریح ہے، قرآن کی طرح نا قابل تغیر نہیں ہے'' حدیث سے متعلق جہاں ان کے بیمار ذہن کی پیداوار ہے، وہیں غلط بیانی بھی ہے، یہ اس طرح کہ اس ارشاد سے یہ لازم آتا ہے کہ اسلامی شریعت تغیر پذیر ہے یا قابل تغیر ہے، کیونکہ اس بات پر امت کا اتفاق ہے کہ اسلامی شریعت قرآن کی اصولی تعلیمات واحکام اور بصورت حدیث یا سنت رسول اللہ ﷺ کے اقوال، افعال اور تقاریر پر مبنی ہے، اب اگر بقول آپ کے اس شریعت کا قرآنی ماخذ تو نا قابل تغیر ہے، مگر اس کے جو احکام حدیث یا سنت سے ماخوذ ہیں، وہ حدیث یا سنت کے قابل تغیر ہونے کی وجہ سے تغیر پذیر ہیں، بلکہ عملی طور پر تبدیل ہو بھی چکے ہوں گے، لہٰذا رسول اللہ ﷺ کی رحلت پر چودہ صدیوں سے زیادہ مدت گزر جانے کے بعد اب یہ شریعت اس شکل میں باقی نہیں رہی جس شکل میں نبی کریم ﷺ نے اسے چھوڑا تھا، یا کم از کم اس شریعت کا وہ حصہ جو احادیث پر مبنی ہے، حدیث کے قابل تغیر ہونے کی وجہ قابل عمل نہیں رہا اور اس کی وجہ سے ان احادیث سے ماخوذ ومستنبط تمام فقہی احکام بھی دریا برد کر دیے جانے کے مستحق قرار پائے، کیونکہ یقینی طور پر یہ نہ معلوم ہونے کی وجہ سے کہ کون سا کلام رسول بدلا ہے اور کون سا محفوظ ہے پوری شریعت اور اس شریعت پر مبنی پورا فقہی ذخیرہ مشکوک ہو چکا ہے؟!!

پھر آپ کے اس باطل دعوے کی سب سے بڑی زد قرآن کے اس اعلان پر پڑتی ہے کہ:

﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَ رَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا﴾

(المائدة: ٣)

---

❶ ص ٣٠

Marfat.com

''آج میں نے تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمہارے لیے دین کی حیثیت سے اسلام کو پسند کر لیا۔''

اس لیے کہ آپ کے اس دعوے سے یہ لازم آتا ہے کہ ''تکمیل دین'' کا یہ اعلان الٰہی عارضی تھا اور اس کے ایک بنیادی ماخذ ''حدیث'' کے قابل تغیر ہونے کی وجہ سے اب اس کے مکمل ہونے کا دعویٰ کرنا درست نہیں ہے، بلکہ اس کا یہ تقاضا ہے کہ کوئی اور نبی اور رسول مبعوث ہو اور اس ناقص دین میں اپنی ''بصیرت'' سے نیا رنگ بھرے، مگر مشکل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم محمد بن عبداللہ ﷺ کو اپنا آخری نبی اور رسول بنا کر قیامت تک کے لیے سلسلہ نبوت ورسالت پر مہر لگا دی ہے۔ (سورۂ احزاب: ۴۰) ایسی صورت میں اس کے علاوہ کوئی اور چارہ کار نہیں رہ گیا ہے کہ قرآن پاک کی تشریح وتبیین کے لیے الطاف احمد اعظمی، ڈاکٹر افتخار برنی اور جاوید احمد غامدی اینڈ کمپنی کو موقع دیا جائے!!!

الطاف احمد اعظمی نے اپنی اس ''ہرزہ سرائی'' کا جو سبب بیان فرمایا ہے وہ اس سے بھی زیادہ تباہ کن ہے، فرماتے ہیں: ''اس کی وجہ یہ ہے کہ ان تشریحات رسول کا بڑا حصہ عربی عہد کے تہذیبی حالات اور عربوں کے عادات ورسوم کے مطابق ہے۔''

موصوف نے اپنے اس دعوے کو شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کی طرف منسوب کیا ہے، اولاً تو شاہ ولی اللہ نے ایسی کوئی بات نہیں فرمائی ہے، ثانیاً اگر انہوں نے ایسا کوئی دعویٰ کیا بھی تھا تو اعظمی صاحب کو اس پر تبصرہ کر کے اس کی غلطی واضح کرنی تھی، یا کم از کم رسول اللہ ﷺ کی تشریحات قرآنی سے مثال دے کر اس کو واضح کرنا تھا، یہ اس لیے کہ اس کی زد جہاں رسول اللہ ﷺ کے منصب رسالت پر پڑتی ہے، وہیں خود قرآن پر بھی پڑتی ہے، تفصیلات درج ذیل ہیں:

۱۔ کسی عبارت کی تشریح وتبیین اس عبارت کے مجمل بیان کے خلاف نہیں ہوتی، بلکہ صرف اس کے اجمال کو کھول دیتی ہے اور بیان کر دیتی ہے۔ اب اگر نبی ﷺ کی تشریحات قرآنی کا ''بڑا حصہ عربی عہد کے تہذیبی حالات اور عربوں کے عادات ورسوم کے مطابق تھا۔'' تو اس سے دو باتیں لازم آتی ہیں:

(ا)...... خود قرآن پاک کا بڑا حصہ اجمالاً عربی عہد کے تہذیبی حالات اور عربوں کے عادات ورسوم کے مطابق ہے۔

(ب)...... نبی کریم ﷺ نے نعوذ باللہ اپنے فرض منصبی سے تجاوز کر کے قرآنی آیات کی ایسی تشریحات کی ہیں جن کی ان کے الفاظ میں گنجائش نہیں ہے۔

اگر پہلی صورت صحیح ہے تو اس کی زد قرآن پر پڑتی ہے، حدیث پر نہیں، اور اس سے یہ لازم آتا ہے کہ نزول قرآن کا مقصد یا بڑا مقصد عربوں کی اصلاح نہیں ان کی ہمنوائی کرنا تھا، قرآن کے بارے میں ایسا عقیدہ کفر ہے۔

اور اگر دوسری صورت صحیح ہے تو ایسا دعویٰ کرنے والا رسول اللہ ﷺ پر یہ الزام لگاتا ہے کہ آپ قرآنی آیات کی

Marfat.com

تشریح وتبیین کرتے وقت اپنے فرض منصبی کو ادا کرتے ہوئے نعوذ باللہ خیانت کرتے تھے اور اپنی قوم کی ہمنوائی کرتے تھے، ایسا شخص مسلمان نہیں ہے۔

شاہ ولی اللہ نے لکھا ہے:

اعظمی صاحب نے شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کی کتاب حجۃ اللہ البالغہ کے جس باب کے حوالہ سے یہ لکھا ہے کہ ''تشریحات رسول کا بڑا حصہ عربی عہد کے تہذیبی حالات اور عربوں کے عادات ورسوم کے مطابق ہے۔'' اس کا عنوان ہے: ''باب أسباب نزول الشرائع الخاصه بعصر دون عصر وقوم دون قوم'' بعض زمانے اور قوم سے متعلق خصوصی شریعتوں کے نزول کے اسباب۔

جیسا کہ عنوان کے الفاظ بانگ دہل یہ اعلان کر رہے ہیں کہ اس کے تحت جو موضوع زیر بحث آنے والا ہے اس کا تعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریحات قرآنی سے نہیں ہے، بلکہ بعض زمانوں اور قوموں سے متعلق خصوصی شریعتوں کے نزول سے ہے، چنانچہ اس باب کے تحت انہوں نے الگ الگ دو ذیلی عنوانات قائم کیے ہیں؛ (۱) پہلا عنوان ہے: ''نزول شریعة فی عصر وقوم مخصوصین'' مخصوص زمانے اور قوم میں کسی شریعت کا نزول، پھر اس شریعت کی اصل اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کو قرار دیا ہے:

﴿كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِلَّا مَا حَرَّمَ اِسْرَآءِيْلُ عَلٰى نَفْسِهٖ مِنْ قَبْلِ اَنْ تُنَزَّلَ التَّوْرٰىةُ قُلْ فَاْتُوْا بِالتَّوْرٰىةِ فَاتْلُوْهَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ﴾ (آل عمران: ۹۳)

''کھانے کی ہر چیز بنو اسرائیل کے لیے حلال تھی بجز اس کے جو اسرائیل نے تورات نازل کی جانے سے پہلے اپنے اوپر حرام کر لی تھی، کہہ دو! تو لاؤ تورات اور پڑھو اسے اگر تم سچے ہو۔''

شاہ صاحب نے دوسرا عنوان یہ قائم کیا ہے: ''سبب تحریم لحم الإبل علی بن اسرائیل'' ''بنو اسرائیل پر اونٹ کا گوشت حرام کیے جانے کا سبب۔'' ❶

یاد رہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس چیز کا تعین نہیں کیا ہے جو یعقوب علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے اوپر حرام کر لی تھی، اور کسی صحیح حدیث میں بھی اس کا ذکر نہیں آیا ہے، اور شاہ صاحب نے جو یہ تحریر فرمایا ہے کہ ''یعقوب علیہ السلام سخت بیمار پڑ گئے تھے اور انہوں نے یہ نذر مانی تھی کہ اگر اللہ نے ان کو صحت وعافیت دی تو وہ اپنے محبوب ترین کھانے اور پینے کو اپنے اوپر حرام قرار دے لیں گے، لہٰذا جب وہ صحت یاب ہو گئے تو انہوں نے اپنے اوپر اونٹ کا گوشت اور دودھ حرام قرار دے لیا۔'' ❷ تو یہ بات اسرائیلیات سے ماخوذ ہے جس کی ہم نہ تصدیق کرتے ہیں اور نہ تکذیب۔

اس کے بعد شاہ ولی اللہ نے یہ عنوان قائم کیا ہے: ''خشیة النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان تتحول السنة إلی فرض''

❶ ص ۲۵۹، ج ۱ ❷ ص ۲۵۹

Marfat.com

''نبی ﷺ کا یہ اندیشہ کہ کہیں سنت فرض نہ ہو جائے۔''

اس کے تحت وہ چار حدیثیں لائے ہیں:

۱۔ پہلی حدیث نبی کریم ﷺ کے نماز تراویح با جماعت جاری نہ رکھنے سے متعلق ہے کہ اس طرح وہ فرض نہ ہو جائے۔ ❶

۲۔ دوسری حدیث مسلمانوں کو بے جا اور لایعنی سوالوں سے باز رکھنے سے متعلق ہے جس کی تعبیر نبی ﷺ نے اس طرح کی ہے کہ مسلمانوں میں سب سے بڑا گنہگار وہ ہے جو کسی چیز کے بارے میں سوال کرے اور اس کے اس سوال کی وجہ سے وہ حرام ہو جائے۔ ❷

۳۔ تیسری حدیث میں نبی کریم ﷺ نے یہ فرمایا ہے کہ جس طرح ابراہیم ؑ نے مکہ کو حرام قرار دیا ہے اور اس کے لیے دعا کی ہے اسی طرح میں نے مدینہ کو حرام قرار دیا ہے اور اس کے مُد اور صاع میں برکت کی دعا کی ہے۔ ❸

۴۔ چوتھی حدیث وہ ہے جس میں حج کی فرضیت کی آیت نازل ہونے کے بعد ایک صحابی کے اس سوال کا ذکر ہے کہ: ''کیا یہ ہر سال فرض ہے؟'' اور نبی ﷺ نے یہ فرمایا ہے کہ: ''اگر میں اس سوال کے جواب میں ''ہاں'' کہہ دیتا تو یہ فرض ہو جاتا'' یہ حدیث ترمذی میں علی رضی اللہ عنہ سے ضعیف سند کے ساتھ مروی ہے۔ ❹

شاہ ولی اللہ نے صفحہ ۲۶۱ پر دو عنوانات قائم کیے ہیں؛ (۱) "اختلفت شرائع الأنبياء لأسباب و مصالح" انبیاء کی شریعتیں اسباب و مصالح کے پیش نظر مختلف رہیں۔ (۲) "من عرف اصل الدين واسباب الاختلاف لم يجد تغيير اولا تبديلا" جس شخص کو دین کی اصل اور اختلاف کے اسباب معلوم ہوں اس کو دین میں کوئی تبدیلی نہیں ملے گی۔

صفحہ ۲۶۲ پر انہوں نے یہ عنوان قائم کیا ہے: "اسباب نزول المناهج فی صور خاصة" خاص شکلوں میں طریقہ ہائے کار کے نزول کے اسباب۔

اس عنوان کے تحت انہوں نے یہ بیان کیا ہے کہ انسانوں کو جن احکام کا پابند بنایا گیا ہے۔ ان کے مزاج اور موروثی حالات کو سامنے رکھ کر بنایا گیا ہے۔ انہوں نے اس بات کو جسمانی صلاحیتوں، زبان اور کریہہ المنظر جانوروں کی مثالیں دے کر سمجھایا ہے۔

صفحہ ۲۶۳ پر شاہ صاحب نے یہ عنوان قائم کیا ہے: "الطيب والخبيث في الإسلام كان مفوضا إلى عادات العرب" اسلام میں پاک و ناپاک، حلال و حرام اور عمدہ اور بری چیزیں عربوں کی عادات کے پیش نظر ہیں۔

اس عنوان کے تحت انہوں نے جو مثالیں دی ہیں ان میں پہلی مثال اونٹ کے گوشت اور دوودھ کی ہے جو بنو اسرائیل کے لیے حرام تھا اور بنو اسماعیل کے لیے حلال، اور دوسری مثال بھانجی کی دی ہے جس سے نکاح کرنا

❶ بخاری، ۲۹۰،۷ مسلم: ۷۸۱ ❷ مسلم: ۲۳۵۸ ❸ بخاری: ۲۱۲۹، مسلم: ۱۳۶۰

❹ ترمذی، نمبر ۸۱۴، ۳۰۵۵۔ مسند، نمبر ۴، ۲۳۰، ۲۶۴۲، ۴، جں ۲۶۰۔

Marfat.com

مسلمانوں میں حرام ہے، یہودیوں میں نہیں۔

الطاف اعظمی نے حجۃ اللہ البالغہ کے جس باب کے حوالہ سے دعویٰ کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی تشریحات قرآنی کا ''بڑا حصہ'' عربی عہد کے تہذیبی حالات اور عربوں کی عادات ورسوم کے مطابق ہے'' اس باب کے بیشتر عنوانات کا میں نے تعارف کرا دیا ہے ان میں سے صرف اسی آخری عنوان کا تعلق عربوں کی عادات سے ہے اس عنوان کے تحت شاہ ولی اللہ نے مسلمانوں میں اونٹ کے گوشت اور دودھ کی حلت اور بھانجی سے نکاح کی حرمت کو عربوں کی عادات کا نتیجہ قرار دیا ہے، جہاں تک اونٹ کے گوشت اور دودھ کا مسئلہ ہے تو یہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے حلال ہے رسول اللہ ﷺ کے حکم سے نہیں اس طرح بھانجی سے نکاح بھی اللہ تعالیٰ کے صریح حکم سے حرام ہے، تشریحات رسول سے نہیں۔

کیا جس شخص کا ضمیر زندہ ہوگا، اور جس کے دل میں رسول اللہ ﷺ کا معمولی سا بھی احترام ہوگا وہ یہ کہنے کی جسارت کر سکتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی تشریحات کا بڑا حصہ عربوں کی عادات ورسوم کے مطابق ہے'' اور اس کو ایسے شخص کا قول قرار دے گا جس نے ایسی کوئی بات نہیں کہی ہے۔

دراصل یہ اہل قرآن اور منکرین حدیث، رسول اللہ ﷺ کی حدیث اور آپ کی سیرت پاک سے لوگوں کو متنفر کرنے کے لیے، علمی خیانتیں کرتے ہیں، غلط بیانیاں کرتے ہیں اور کتابوں کے غلط حوالے دیتے ہیں اور اس خود فریبی میں جی رہے ہیں کہ اس طرح وہ اپنے مذموم مقاصد میں کامیاب ہو جائیں گے۔

اعظمی صاحب نے مذکورہ پیراگراف اس فقرے پر ختم کیا ہے:

''یہی وجہ ہے کہ عہد خلافت بالخصوص خلیفہ دوم کے عہد میں رسول اللہ ﷺ کے بہت سے فیصلوں کے برعکس فیصلے کیے گئے اور کسی صحابی نے اعتراض نہیں کیا۔''

غور فرمایئے کہ دعویٰ اتنا بڑا کہ آسمان وزمین ہل جائیں اور دلیل کوئی نہیں؛ دراصل ان لوگوں کی ایک شناخت اور پہچان یہ بھی ہے کہ یہ اپنے نہایت گمراہ کن اور جھوٹے دعووں کے دلائل نہیں دیتے اور چونکہ ان کی تحریریں پڑھنے والے عام طور پر ان کے ہم خیال وہم نوا ہوتے ہیں اور خود حقائق کا سراغ لگانے کی صلاحیت نہیں رکھتے، اس لیے ان کے دعووں پر آمنا وصدقنا کہہ کر ان کو پھیلانا شروع کر دیتے ہیں۔

اب جہاں تک نبی کریم ﷺ کے کسی فیصلے کی خلاف ورزی کرنے اور اس کے برعکس کوئی فیصلہ کرنے کی بات ہے تو یہ تو بہت بڑی ہے، قرآن کے مطابق تو نبی کریم ﷺ کے کسی فیصلے پر دل تنگ ہونا بھی منافی ایمان ہے۔ (سورۂ نساء: ۶۵) اس تناظر میں کوئی مسلمان بصحت ایمان اس طرح کی جرأت کس طرح کر سکتا ہے؟ عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں تو اس کا تصور بھی کفر ہے، چونکہ اعظمی صاحب نے اپنے اس دعوے کی کوئی دلیل نہیں دی ہے، لہٰذا میں بھی اسی پر بس کرتا ہوں۔

Marfat.com

اعظمی کا خلط مبحث:

الطاف احمد اعظمی نے حدیث سے وحی کی صفت کی نفی یا حدیث کے وحی نہ ہونے کو ثابت کرنے کے لیے بڑے پاپڑ بیلے ہیں، انہوں نے کبھی تو قرآن سے غلط استدلال کیا ہے، قرآنی تعبیرات کی غلط ترجمانی کی ہے اور ایسی آیتوں کا تو ذکر کیا ہے جن سے بظاہر ان کے خیال کا اشارہ ملتا ہے، لیکن ایسی ہر آیت سے گریز کیا ہے جس سے ان کو ردتی تھی، پھر اپنے دعوے کی تائید کے لیے تفسیر اور اصول کی ان کتابوں کا سہارا لیا ہے جن کے مصنفین جہاں کسی حد تک انہی خیالات کے ہم نوا تھے وہیں آزاد خیال بھی تھے، جبکہ اس طرح کے مسائل میں قرآن وحدیث کی نصوص سے رجوع کیا جاتا ہے، نہ کہ زید وعمر کے اقوال سے۔

ایحاء، توصیۃ اور اِنزال میں حقیقت کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں:

اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں کی طرف عموماً اور اپنے آخری نبی اور رسول محمد بن عبداللہ صلوات اللہ وسلامہ علیہم کی طرف خصوصاً اپنے احکام بھیجنے کے لیے "أوحینا، وصینا اور أنزلنا" کی جو تعبیریں استعمال کی ہیں وہ حقیقت نفس الأمری میں ایک ہیں، صرف صفات میں مختلف ہیں، مثلاً تمام رسولوں پر نازل ہونے والی کتابیں اپنی صفت نزول میں وحی تھیں، اپنے احکام وہدایات کی فرضیت میں وصیت یا توصیہ تھیں اور اپنے مقام ومرتبے کے اعتبار سے منزل تھیں یعنی اوپر سے نازل ہوئی تھیں۔

سورۂ شوریٰ کی نمبر ۱۳ میں نبی ﷺ کے لیے "أوحینا" کی تعبیر، نوح اور دوسرے رسولوں کے لیے "وصینا" کی تعبیر کی ضد نہیں ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت مبارکہ میں اپنے رسولوں کو 'اقامت دین' کا جو حکم دیا تھا وہ بذریعہ وحی ہی دیا تھا اور نبی ﷺ کو جو وحی کی تھی اس میں بھی یہی حکم تھا میں نے ابھی جو کچھ عرض کیا ہے اس کی دلیل سورۂ نساء کی آیت نمبر ۱۶۳ ہے۔ جس میں صرف "أوحینا" کی تعبیر آئی ہے، ارشاد ربانی ہے:

﴿إِنَّآ أَوْحَيْنَآ إِلَيْكَ كَمَآ أَوْحَيْنَآ إِلَىٰ نُوحٍ وَّٱلنَّبِيِّـۧنَ مِنۢ بَعْدِهِۦ ۚ وَأَوْحَيْنَآ إِلَىٰٓ إِبْرَٰهِيمَ وَإِسْمَٰعِيلَ وَإِسْحَٰقَ وَيَعْقُوبَ وَٱلْأَسْبَاطِ وَعِيسَىٰ وَأَيُّوبَ وَيُونُسَ وَهَٰرُونَ وَسُلَيْمَٰنَ ۚ وَءَاتَيْنَا دَاوُۥدَ زَبُورًا﴾ (النساء: ۱۶۳)

"درحقیقت ہم نے تمہاری طرف اسی طرح وحی کی ہے، جس طرح ہم نے نوح اور اس کے بعد کے نبیوں کی طرف وحی کی تھی اور ہم نے ابراہیم اور اسماعیل، اور اسحاق اور یعقوب اور اس کی اولاد اور عیسیٰ اور ایوب اور یونس اور ہارون اور سلیمان کی طرف وحی کی اور داود کو زبور دی۔"

سورۂ شوریٰ میں بذریعہ وحی مقرر کیے جانے والے دین اور اس کی اقامت کا ذکر تھا، اس لیے "ما موصول" لایا گیا ہے اور سورۂ نساء کی آیت میں نبی ﷺ کی طرف کی جانے والی وحی کو آپ سے پہلے کے انبیاء اور رسولوں کی طرف کی جانے والی وحی سے تشبیہ دی گئی ہے جس سے یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ تمام رسولوں کو کی جانے والی وحی اپنی قسم اور جنس

Marfat.com

میں تو ایک ہی تھی، لیکن ''موحی بہ'' یعنی جن باتوں کی وحی کی گئی تھی، وہ متفق علیہ بھی تھیں اور مختلف فیہ بھی؛ توحید کے مسئلہ میں تمام رسولوں کو جو احکام دیے گئے تھے ان میں کوئی اختلاف نہیں تھا:

﴿وَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِیْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ﴾ (الانبياء: ۲۵)

''اور ہم نے تم سے پہلے کوئی بھی رسول نہیں بھیجا مگر اس کی طرف یہی وحی کرتے رہے کہ در حقیقت میرے سوا کوئی معبود نہیں، سو میری ہی عبادت کرو۔''

رہیں سابقہ شریعتیں اور طریقہ ہائے کار تو وہ ایک دوسرے سے مختلف تھے اور ہر امت کے حسب حال ان کو شرعی احکام دیے گئے تھے:

﴿لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّ مِنْهَاجًا وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّ لٰكِنْ لِّيَبْلُوَكُمْ فِیْ مَآ اٰتٰىكُمْ﴾ (المائدة: ۴۸)

''ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لیے ایک ہی راستہ اور طریقہ مقرر کیا ہے اور اگر اللہ چاہتا تو تمہیں ایک امت بنا دیتا، لیکن (اس نے ایسا نہیں کیا) تاکہ تمہیں جو کچھ دیا ہے اس میں تمہیں آزمائے۔''

سورۂ شوریٰ کی آیت میں نبی کریم ﷺ کے لیے ''أوحینا'' اور آپ سے پہلے اور بعد کے رسولوں کے لیے ''وصینا'' کی تعبیر، آپ کی رسالت کی تصریح کی غرض سے اختیار کی گئی ہے۔ ❶

سورۂ حدید کی آیت نمبر ۲۵ کے مطابق تمام رسولوں کو کتابیں دی گئی تھیں اور اللہ نے اپنی کتاب عزیز میں یہ واضح فرما دیا ہے کہ اس نے ان سب رسولوں کی طرف وحی کی ہے، اور اعظمی صاحب کا دعویٰ ہے کہ: ''وحی سے مراد وہ مخصوص خدائی ہدایت ہے جو پیغمبر کے توسط سے اہل ایمان کو ملی اور اسی حکم وہدایت کا نام قرآن ہے اور قرآن اور وحی باعتبار حقیقت مترادف الفاظ ہیں۔''

اس سے قبل انہوں نے انبیاء اور غیر انبیاء کی طرف کی جانے والی وحی سے متعلقہ آیتوں کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا ہے:

''یہ تو وحی اور ایحاء کے لغوی معنی ہوئے، لیکن قرآن میں جہاں خدا کی طرف سے اس کے رسولوں کی طرف وحی کرنے کا ذکر ہوا ہے اس سے مراد کوئی ہدایت یا پیغام بھیجنا ہے۔'' ❷

کیا میں موصوف کے اس ارشاد سے یہ نتائج اخذ کر سکتا ہوں:

۱۔ قرآن کے سوا نبی ﷺ پر نازل کی جانے والی کوئی بھی چیز وحی نہیں تھی، اس لیے ہدایت بھی نہیں تھی؟

۲۔ سابق انبیاء اور رسولوں کو کی جانے والی ''وحی سے کوئی ہدایت یا پیغام'' میں کوئی ہدایت یا پیغام سے کیا مراد ہے: ان پر نازل ہونے والی کتابیں یا کچھ اور؟

---

❶ شوکانی ص ۶۵۵، ج ۴ ❷ ص: ۲۰

Marfat.com

اور سابق رسولوں پر نازل ہونے والی کتابیں بھی وحی تھیں تو پھر صرف قرآن کے وحی ہونے کی بات غلط ہوئی۔
اگر ان پر نازل ہونے والی کتابیں وحی نہیں تھیں، بلکہ "کوئی اور ہدایت یا پیغام مراد تھا، تو اس کی شرعی حیثیت کیا تھی، اور اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ کی طرف وحی کو دوسرے رسولوں کی طرف وحی سے تشبیہ کیوں دی ہے؟

۳۔ اگر دوسرے رسولوں کو دی جانے والی کتابیں تو وحی تھیں جو مجموعہ ہدایات واحکام تھیں تو کیا ان کتابوں پر ان رسولوں کی تشریح وبیان کے بغیر عمل ممکن تھا؟ اگر جواب اثبات میں ہے، تو پھر ان رسولوں کے فرائض منصبی کیا تھے؟ کیا ان کتابوں کو لکھ لکھ کر اپنی اپنی امت کے ہر ہر فرد کو پہنچانا اور ان کے حوالہ کرنا؟ اگر اس کا جواب اثبات میں ہے تو یہ مکابرہ اور ہٹ دھرمی ہے، کیونکہ اس کے لیے انبیاء اور رسولوں کی بعثت ضروری نہیں تھی اس کے بغیر بھی ہر ایک پر کتابیں نازل کی جا سکتی تھیں، اور اگر رسولوں پر اللہ کی کتابوں کی تلاوت اور ان کی تبلیغ کے ساتھ ان میں مندرج احکام وہدایات کی تشریح وتفسیر بھی کرنی تھی اور جو فرض و واجب تو نہیں ہوسکتی تھی، کیونکہ یہ ان کی من مانی تھی کسی وحی پر مبنی نہیں تھی اور اس کو تدبیر اور بصیرت کا نام دینے سے اس کی حقیقت نہیں بدل سکتی تھی اور جو چیز وحی نہ ہو وہ آپ کے نزدیک مخصوص ربانی ہدایت بھی نہیں ہوسکتی۔

نبوت ورسالت کی حقیقت:

شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے حجۃ اللہ البالغہ میں ایک باب باندھا ہے جس کا عنوان ہے: "حقیقة النبوة وخواصها" نبوت کی حقیقت اور اس کے مخصوص اوصاف۔ ❶

اگر وہ اس باب کا عنوان صرف یہ قائم کرتے خواص النبوۃ، تو بہتر رہتا، کیونکہ نبوت کی حقیقت کا ادراک ہم نہیں کر سکتے، البتہ ہم نبوت کے خواص اور انبیاء علیہم الصلاۃ والسلام کی صفات کا ادراک کر سکتے ہیں، مگر ان میں سے صرف انہی صفات کو ماننا چاہیے جو قرآن وحدیث سے ثابت ہوں، قصص الانبیاء نامی کتابوں میں رسولوں کے جو واقعات بیان ہوئے ہیں ان میں سے بیشتر من گھڑت اور جھوٹے ہیں۔

شاہ ولی اللہ نے اس باب کے تحت جو ذیلی عنوان قائم کیا ہے وہ یہ ہے: "المُفهَمُون هُم أعلى طبقات الناس" مفہمون لوگوں میں سب سے اعلیٰ طبقہ کے لوگ ہیں، اس کی تفصیل بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

جان لو کہ اعلیٰ درجہ کے لوگ مُفہَمُون ہیں یہ اصطلاحی لوگ ہیں، ان کی صفت ملکیت بڑی بلند ہوتی ہے، اس کا امکان رہتا ہے کہ یہ لوگ حقیقی محرک اور داعیہ سے مطلوب نظام قائم کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوں، جن پر ملأ اعلیٰ سے علوم واحوال الٰہی کے چھینٹے پڑتے ہیں۔ ❷

مذکورہ بالا عبارت خالص صوفیانہ ہے احادیث میں بلند اخلاق وکردار کے مالک افراد کا ذکر "مفهمون" کے نام

---

❶ ص ۲۴۶ ج ا ❷ ایضاً

Marfat.com

سے نہیں آیا ہے اس کے بجائے "مُحدَّثُون" کی تعبیر آئی ہے۔ ام المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتی ہیں: آپ فرمایا کرتے تھے:

((قد كان يكون في الأمم قبلكم مُحدَّثُون، فإن يكن في أُمتي منهم أحد (فعمر) فإن عمر! بن الخطاب منهم.))

"تم سے پہلے کی امتوں میں صحیح گمان والے لوگ ہوا کرتے تھے، اور اگر میری امت میں ان میں سے کوئی ہے تو وہ عمر ہیں، یقیناً عمر بن خطاب انہیں میں سے ہیں۔" ❶

"مُحدَّث" حدَّث يُحدِّث کا اسم مفعول ہے جس کے معنی ہیں ایسا شخص جس سے کوئی بات کرے، مطلب ہے کہ جس کے دل میں حق بات ڈالی دی جاتی ہے، یا جس کا خیال اور گمان درست ہوتا ہے۔ یہ "ملهم" کے معنی میں ہے۔

شاہ ولی اللہ کی عبارت میں "الْمفهَمُون" "الْمُفهَم" کی جمع ہے اور "مفهم، أفهَمَ يُفهِمُ" کا اسم مفعول ہے جس کے معنی ہیں ایسا شخص جس کو سمجھا دیا گیا ہے، انہوں نے "مـفـهـمـون" کو اصطلاحی لوگ قرار دیا ہے جو صوفیا کے نزدیک تو اصطلاحی ہو سکتے ہیں لیکن حدیث میں یہ تعبیر نہیں آئی ہے۔

الطاف اعظمی نے شاہ صاحب کی اس عبارت کا حوالہ دیا ہے اور اس کا ناقص ترجمہ بھی کیا ہے ان کی عبارت یا ترجمہ میں جو چیز قابل التفات ہے وہ یہ کہ انہوں نے مُفهَمُون کا املا مفہومون اور مفہومین کیا ہے؟!!

اس کے بعد اعظمی صاحب نے سرسیّد کی ایک عبارت کا اقتباس نقل کیا ہے۔ ان کے بیان سے اتنا تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ نبوت کو "وہبی" مانتے ہیں، اکتسابی نہیں، لیکن انہوں نے اس بحث کو جن الفاظ پر ختم کیا ہے ان سے یہ تاثیر ملتا ہے کہ منصب نبوت سے سرفراز کیے جانے سے پہلے ہی سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غار حرا میں عبادت وریاضت شروع کر دی تھی اس کا مقصد یہ تھا کہ اس سے آپ کے اندر اللہ کے پیغام کو وصول کرنے کی استعداد پیدا ہو جائے فرماتے ہیں:

"معلوم ہے کہ آغاز نبوت سے بہت پہلے آپ غار حرا میں مہینوں اعتکاف فرماتے اور وہاں عبادت وریاضت میں مشغول رہتے تھے، اس عبادت وریاضت سے مقصود نفس کا تزکیہ تھا تاکہ روحانی استعداد جو آپ میں فطرتاً موجود تھی، مزید ترقی کر کے اس مقام تک پہنچ جائے جہاں آئندہ خدا کے پیغام کو وصول کرنا آپ کے لیے آسان ہو جائے، چنانچہ جب آئینہ قلب پوری طرح صیقل ہو گیا تو پہلی وحی اسی غار کے اندر آپ پر نازل ہوئی۔" ❷

یہ پوری عبارت محض افسانہ ہے، کیونکہ منصب نبوت پر سرفراز کیے جانے، یا سورۂ علق کی ابتدائی پانچ آیتوں کے نزول سے چند لمحے قبل تک نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذہن مبارک میں نبوت ورسالت اور اللہ کے پیغام کو وصول کرنے کا کوئی

❶ مسلم: ۲۳۹۸ ❷ ص ۲۵

Marfat.com

معمولی اور دھندلا سا تصور بھی نہیں تھا اور آپ یہ نہیں جانتے تھے کہ ایمان کیا ہے اور کتاب کسے کہتے ہیں، یہ صحیح ہے کہ نبی کریم ﷺ بعثت سے قبل کی پوری زندگی میں اخلاق و کردار اور شرافت و بزرگی کے اعتبار سے نہایت اعلیٰ اور منفرد مقام پر فائز تھے۔ آپ فطری توحید کی صفت سے بھی موصوف تھے بایں طور کہ شرک جلی اور خفی اور شرک اکبر اور اصغر سے آپ کی زندگی پاک تھی، مگر یہ ساری چیزیں فطری تھیں، جبلی تھیں شعوری نہ تھیں اور جس ماحول میں آپ کی چالیس سالہ زندگی گزری تھی اس میں کسی کی زبان پر بھی دین حنیف یا دین ابراہیمی کا ذکر نہ آتا تھا۔ زید بن نفیل جیسے پاکیزہ صفت انسانوں کے دلوں میں بت پرستی سے نفرت پیدا ہوگئی تھی تو وہ ان کی پاکیزہ فطرت کا تقاضا تھی، ورنہ ان کو توحید و شرک کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہ تھا۔

میں نے ابھی جو کچھ عرض کیا ہے، اللہ تعالیٰ نے اسے اپنے معجزانہ اسلوب میں بیان کر دیا ہے، ارشاد ربانی ہے:

﴿وَمَا كُنتَ تَتْلُوا مِن قَبْلِهِ مِن كِتَٰبٍ وَلَا تَخُطُّهُۥ بِيَمِينِكَ إِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُونَ﴾ (العنکبوت: ٤٨)

''اور تو اس سے پہلے نہ کوئی کتاب پڑھتا تھا اور نہ اسے اپنے داہنے ہاتھ سے لکھتا تھا، اگر ایسا ہوتا تو یقیناً باطل پرست شک میں پڑ جاتے۔''

﴿وَكَذَٰلِكَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ رُوحًا مِّنْ أَمْرِنَا مَا كُنتَ تَدْرِي مَا الْكِتَٰبُ وَلَا الْإِيمَانُ﴾ (الشوریٰ: ٥٢)

''اور اسی طرح ہم نے تیری طرف اپنے حکم سے ایک روح کی وحی کی تو نہ یہ جانتا تھا کہ کتاب کیا ہے اور نہ یہ کہ ایمان کیا ہے۔''

﴿وَإِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ﴾ (القلم: ٤)

''اور درحقیقت تم عظیم اخلاق پر فائز ہو۔''

دراصل نبی کریم ﷺ کا ذہن مبارک نبوت و رسالت اور کتاب و ایمان کے تصور سے اس حد تک خالی تھا کہ غار حرا میں جبریل علیہ السلام کی آمد اور سورۂ علق کی ابتدائی پانچ آیتوں کے نزول کے بعد بھی آپ اس عظیم واقعہ کی کوئی توجیہ نہ کر سکے اور اس غیر متوقعہ اور ناگہانی صورتحال سے حد درجہ خوف زدہ ہو گئے اور آپ کو اپنی زندگی سے متعلق اندیشہ ہونے لگا۔ اس صورتحال کو دیکھ کر ام المومنین خدیجہ رضی اللہ عنہا نے آپ کو ڈھارس اور اطمینان دلانے کے لیے آپ کے حق میں جو کلمات کہے وہ ایک غیر معمولی اور عظیم انسان کے اوصاف سے تو عبارت تھے، مگر ان میں بھی نبوت و رسالت کی جانب ادنیٰ سا اشارہ بھی نہیں ہے، اس لیے کہ ام المومنین کا ذہن بھی اس سے خالی تھا۔

ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا نے بعد میں نبی کریم ﷺ کی زبان مبارک سے سن کر یا آپ سے پوچھ کر آغاز وحی کے واقعہ کی جو تفصیلات بیان کی ہیں ان میں بھی صرف اتنا ہے کہ نبی ﷺ پر نزول وحی کا آغاز سچے خوابوں سے ہوا اور آپ جو خواب بھی دیکھتے وہ صبح کی روشنی کی طرح ہوتا جس کے بعد آپ کو خلوت گزینی محبوب ہوگئی اور آپ نے غار حرا میں

Marfat.com

خلوت نشینی شروع کر دی جہاں آپ ''تحنث'' کرتے۔ ❶

ام المومنین نے "یتحنث" کی تعبیر استعمال کی ہے، جس کی تفسیر ان سے حدیث روایت کرنے والے عروہ بن زبیر نے، یا عروہ سے اس کی روایت کرنے والے امام زہری نے ''تعبد'' سے کی ہے، دراصل یہ فعل "حِنث" سے بنا ہے جس کے معنی گناہ اور شرک کے ہیں، قرآن پاک میں ہے:

﴿وَكَانُوا يُصِرُّونَ عَلَى الْحِنثِ الْعَظِيمِ﴾ (الواقعه: ٤٦)

''اور وہ بہت بڑے گناہ پر اڑے رہتے تھے۔''

لیکن باب تفعل سے اس کے معنی گناہ سے بچنے کے ہو جاتے ہیں، اسی وجہ سے عروہ یا زہری نے اس کی تفسیر ''عبادت کرنے'' سے کر دی ہے یہ کون سی عبادت تھی اس کا ذکر کسی بھی حدیث میں نہیں آیا ہے، جن لوگوں نے اس کی تفسیر تحنف سے کی ہے، یعنی نبی ﷺ ''دین حنفی'' کے مطابق عادت کرتے تھے۔ ❷ ان کے اس قول کی لغت اور سیرت سے کوئی دلیل نہیں ہے، آخر نبی ﷺ کو دین ابراہیم کے مطابق عبادت کا طریقہ کیسے معلوم ہوا؟

ام المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا کی اس روایت کے علاوہ کسی بھی صحیح حدیث میں غار حرا میں آپ کی اس خلوت نشینی کی کوئی تفصیل نہیں بیان ہوئی ہے اور سیرت کی بعض کتابوں میں اور صوفیا کے حلقوں میں غار حرا میں نبی ﷺ کی عبادت وریاضت کے بارے میں جو کچھ بیان کیا جاتا ہے سب من گھڑت اور خیالی ہے۔ اور اعظمی صاحب نے بھی آپ کی عبادت وریاضت، تزکیہ نفس اور روحانی استعداد وغیرہ کی باتیں اپنے ذہن سے گھڑ لی ہیں جو بے بنیاد ہونے کے ساتھ قرآنی تصریحات کے خلاف بھی ہیں۔

امر واقعہ یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے قلب مبارک میں مکہ کی مشرکانہ فضا سے جو فطری نفرت اور بیزاری تھی وہ بصورت خواب وحی کے آغاز سے فزوں تر ہو گئی تھی اور غار حرا میں گوشہ نشینی سے آپ کے قلب مبارک کو راحت ملتی تھی، رہا یہ دعویٰ کہ آپ خدائی پیغام وصول کرنے کے لیے روحانی استعداد پیدا کر رہے تھے اور جب آپ کا آئینہ قلب پوری طرح صیقل ہو گیا تو پہلی وحی نازل ہوئی، شاعرانہ بڑ کے سوا کچھ نہیں، جس کی تردید کے لیے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد کافی ہے:

﴿وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى﴾ (ضحی: ٧)

''اور اس نے تمہیں ناواقف راہ پایا پس راہ دکھائی۔''

بصیرت نبوی:

اعظمی صاحب حدیث کے بارے میں اپنا نقطہ نظر بیان کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

جہاں تک ان اقوال واعمال کا معاملہ ہے جو حدیث کی کتابوں میں نبی ﷺ کی طرف منسوب کیے گئے ہیں تو ان

❶ بخاری: ۳، مسلم: ۱۶۰ ❷ فتح الباری ص ۲۶۲، ج ۱

Marfat.com

کو حقیقی معنوں میں وحی کہنا صحیح نہیں ہے، یہ اقوال واعمال دراصل قرآن کے اصولی احکام کی عملی تبیین ہیں، یا عام ہدایات کی ان سے مزید تفصیل ہوتی ہے، یہ کام نبی ﷺ نے بصیرت نبوی کے مطابق انجام دیا تھا۔ ❶

نبی ﷺ کے اعمال قرآن کے اصولی احکام کی عملی تبیین ہو سکتے ہیں، مگر اقوال عملی تبیین کس طرح ہو سکتے ہیں؟

یہ دعویٰ چونکہ بہت بڑا تھا اور بہت گمراہ کن بھی اس لیے سورۂ نساء کی آیت نمبر ۱۰۵ کا حوالہ دے دیا اور بس، نہ پوری آیت کا ترجمہ کیا اور نہ اس کے موضوع پر روشنی ڈالی۔

انہوں نے حدیث کے یا بقول اپنے نبی ﷺ کی طرف منسوب اقوال اور اعمال کے وحی نہ ہونے پر سورۂ نساء کی جس آیت مبارکہ سے استدلال کیا ہے یا جس کا حوالہ دیا ہے اس میں چوری کا ایک واقعہ بیان ہوا ہے، چوری کی سزا قرآن پاک میں منصوص ہے، لیکن چور غیر معروف تھا اور نبی ﷺ عالم الغیب نہیں تھے کہ آپ کو خود معلوم ہو جاتا کہ وہ کون ہے اور اس کو سزا دیتے۔

قرآن سے اشارۃً اور حدیث سے صراحتاً یہ معلوم ہوتا ہے کہ چور کا تعلق منافقین مدینہ سے تھا۔ یاد رہے کہ منافقین کا شمار مسلمانوں ہی میں ہوتا تھا، کیونکہ وہ بظاہر مسلمان تھے، جمعہ جماعت میں شریک ہوتے تھے اور قول وعمل سے علانیہ اسلام مخالف کوئی حرکت نہیں کرتے تھے، اسلام کے خلاف ان کی ساری ریشہ دوانیاں در پردہ تھیں، جب کسی ذریعہ سے اصل چور کا انکشاف ہو گیا تو اس نے اور اس کے اہل خانہ اور اہل قبیلہ نے چوری کا مال (زرہ) ایک یہودی کے ہاں رکھ دیا اور اس پر چوری کا الزام لگا دیا اور جب اس سے پوچھ گچھ کی گئی تو اس نے اپنی براءت کا اظہار کیا، لیکن اصل چور کے بھائی بندوں نے اس کی پُر زور حمایت اور وکالت شروع کر دی اور یہودیوں کی حق دشمن کا سہارا لے کر اسی کو چور ثابت کرنے پر بضد رہے، اور قریب تھا کہ رسول اللہ ﷺ منافقین کی چرب زبانیوں سے متاثر ہو کر بے قصور یہودی کے خلاف فیصلہ صادر کر دیں، مگر عین اسی موقع پر اللہ تعالیٰ نے سورۂ نساء کی چند آیتیں نازل فرما کر معاملہ کی اصل حقیقت بیان فرما دی ان آیتوں میں پہلی آیت وہی ہے جس سے اعظمی صاحب نے ''بصیرت نبوی'' کی اصطلاح گھڑی ہے پوری آیت اور اس کا ترجمہ درج ذیل ہے:

﴿إِنَّآ أَنزَلْنَآ إِلَيْكَ ٱلْكِتَٰبَ بِٱلْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ ٱلنَّاسِ بِمَآ أَرَىٰكَ ٱللَّهُ ۚ وَلَا تَكُن لِّلْخَآئِنِينَ خَصِيمًا﴾ (النساء: ۱۰۵)

''ہم نے یہ کتاب تم پر حق کے ساتھ اتاری ہے تاکہ تم لوگوں کے درمیان اس کے مطابق فیصلہ کرو جو اللہ نے تمہیں دکھایا ہے اور تم بدعہدوں کے حمایتی نہ بنو۔''

یہ ترجمہ مولانا امین احسن اصلاحی کا ہے، اصلاحی مکتبہ فکر یا اصلاحی نظریہ حدیث کی نسبت انہی کی طرف ہے اور ''علوم القرآن'' میں حدیث کے موضوع پر شائع ہونے والے مضامین میں عام طور پر احادیث کے متعلق انہی کے یا ان کے

---

❶ سورۂ نساء: ۱۰۵، ص ۳۱، ۳۲۔

Marfat.com

متبعین کے افکار کی ترجمانی ہوتی ہے۔

فہم قرآن میں اعظمی صاحب کو اصلاحی صاحب کا مقام نہیں حاصل ہے یہ دوسروں کے خوشہ چین ہیں اور ان کے یہاں اصالت اور پختگی تھی اگرچہ کسی کی تفسیر بھی حرف آخر نہیں ہوتی، آیئے یہ دیکھیں کہ انہوں نے اس آیت کی تفسیر میں کیا فرمایا ہے؟:

''اراءت کا لفظ قرآن میں اس وحی کے لیے بھی آیا ہے جو انبیاء علیہم السلام کو رویا میں ہوتی ہے جیسا کہ انفال آیت ۴۳ میں ہے اور اس رہنمائی کے لیے بھی آیا ہے جو ''وحی متلو'' کے ذریعہ سے ہوتی ہے جیسا کہ اس آیت میں ہے، اس لفظ کے معنی چونکہ دکھا دینے کے ہیں اس وجہ سے اس حقیقت کی طرف اشارہ ہوتا ہے کہ پیغمبر کو وحی کے ذریعہ سے جو رہنمائی ملتی ہے وہ گویا چشم سر سے حقائق کا مشاہدہ ہوتا ہے۔'' ❶

اصلاحی صاحب نے "بما اراك الله" سے وحی قرآنی ہی مراد لی ہے، مگر انہوں نے ''رویا'' کو بھی وحی قرار دیا ہے:

''قرطبی نے "بما اراك الله" کی تفسیر "إما بوحی ونصوص، أوبنظرٍ جارٍ علی سنن الوحی" سے کی ہے، یعنی اللہ نے تمہیں جو دکھایا ہے، سے مراد یا تو وحی یا نص ہے اور وحی کے طریقے پر جاری غور و تدبر۔'' ❷

مذکورہ وضاحتوں کی روشنی میں ''بصیرت نبوی'' کی اصطلاح میں کوئی مضائقہ نہیں ہے، لیکن یہ بصیرت محمد بن عبداللہ کی نہیں ہے، بلکہ محمد رسول اللہ، کی ہے، یعنی یہ بھی وحی ہے یا وحی ہی پر مبنی ہے۔

اعظمی صاحب نے "بما أراك الله" سے پورے ذخیرۂ حدیث کے وحی نہ ہونے پر جو استدلال کیا ہے تو یہ ان کی کوتاہ نظری ہے، کیونکہ اس فقرے میں ''اراءت'' کی نسبت اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف کی ہے اس طرح یہ فقرہ ان کی من گھڑت اصطلاح ''بصیرت نبوی'' پر ایک کاری ضرب ہے۔

میں آگے ان شاء اللہ خود قرآن سے دکھاؤں گا کہ حدیث بھی وحی ہے، لیکن صرف معناً، البتہ قرآن لفظ و معنی میں وحی اور اللہ کا کلام ہے۔

اعظمی صاحب نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و اعمال کے وحی نہ ہونے پر قرآن کے اس حکم "أقیموا الصلاۃ" کی حدیث میں تبیین سے اور آیت ﴿إِنَّ الصَّلَاةَ تَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنكَرِ﴾ کی تمثیل نبوی سے استدلال کیا ہے، فرماتے ہیں:

''اس تبیین کو میں ایک مثال سے واضح کرتا ہوں، قرآن کا ایک اصولی حکم ہے کہ: ﴿أَقِيمُوا الصَّلَاةَ﴾

❶ تدبر قرآن ص ۱۴۹-۱۵۰، ج ۲

❷ الجامع لأحکام القرآن ص ۲۵۸، ج ۳

Marfat.com

''نماز قائم کرو'' نبی ﷺ نے اس اصولی حکم کی عملی تبیین فرمائی اور نماز پڑھنے کا طریقہ مقرر فرمایا اس پر قرآن کے دوسرے اصولی حکام کی تبیین کو قیاس کر لیں۔ قرآن میں ایک جگہ فرمایا گیا ہے کہ: ﴿إِنَّ الصَّلَاةَ تَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنكَرِ﴾ ''بے شک نماز بے حیائی اور بری باتوں سے روکتی ہے۔'' (سورۃ العنکبوت: ۴۵) اس آیت کی مزید تفصیل اس روایت سے ہوتی ہے جس میں نبی ﷺ نے صحابہ سے ارشاد فرمایا کہ تمہارا کیا خیال ہے، اگر کسی کے گھر کے سامنے دریا بہہ رہا ہو اور وہ اس میں دن میں پانچ بار غسل کرے تو کیا اس کے بدن پر کچھ میل کچیل باقی رہ جائے گا؟ صحابہ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول کوئی میل کچیل باقی نہیں رہے گا، آپ نے فرمایا: یہی معاملہ پانچ وقت کی نمازوں کا ہے، اللہ ان کے ذریعہ گناہوں کو مٹا دیتا ہے۔''

اعظمی صاحب سے سوال:

۱۔ آپ نے بار بار ''عملی تبیین'' کی تعبیر کیوں اختیار فرمائی ہے، احادیث میں اللہ تعالیٰ کے حکم ﴿أَقِيمُوا الصَّلَاةَ﴾ کی قولی تفسیریں عملی تفسیروں سے زیادہ بیان ہوئی ہیں؟

۲۔ آپ نے کہاں سے یہ سمجھ لیا کہ ﴿أَقِيمُوا الصَّلَاةَ﴾ کی جو تبیین نبی ﷺ نے فرمائی ہے وہ بصیرت نبوی سے یعنی یہ تبیین وحی پر مبنی نہیں ہے؟

۳۔ نمازوں کے ذریعہ گناہوں سے پاک وصاف ہو جانے کی مثال میں نبی ﷺ نے ہر روز پانچ بار غسل کرنے کی جو مثال دی ہے، کیا آپ کے پاس قرآن سے کوئی ایسی مثال ہے کہ یہ بات نبی ﷺ نے وحی کی روشنی میں نہیں، بلکہ محض اپنی رائے یا بصیرت سے فرمائی تھی؟ اگر نہیں ہے اور ہرگز نہیں ہوگی، تو کیا ایسی بات بلا دلیل منہ سے نکالنا درست ہے؟

حدیث بصیرت نہیں وحی ہے:

"البصیرۃ" کے عربی مترادفات: قوة الإدراك، الفطنة، العلم، الحجة، العقيدة، الرأي، سمجھ بوجھ کی طاقت، فہم وفراست، علم، دلیل، عقیدہ وخیال وغیرہ۔

البصیرۃ کے اَضداد: الغباء، البلادة، البلاهة، الحماقة، السذاجة، کند ذہنی، بے وقوفی، نادانی، حماقت، اور سادگی وغیرہ۔

ہر نبی اپنے وقت کا سب سے بڑا ذکی اور فہیم ہوتا تھا، اس کا علم اور اس کے دل کی روشنی سب سے زیادہ ہوتی تھی، بات کی تہہ تک پہنچ جانے کی اپنی صفت اور صلاحیت میں اپنا کوئی نظیر نہیں رکھتا تھا۔ اور اپنے عقیدہ وخیال کی درستگی میں سب پر فوقیت رکھتا تھا۔

Marfat.com

مذکورہ بالا یہ صفات جبلی اور فطری ہیں، لیکن تمام انبیاء عموماً اور نبی ﷺ خصوصاً ان صفات میں بے مثل اور بے نظیر ہونے کے باوجود دین وشریعت سے متعلق کوئی بات اپنی اس جبلی اور فطری صلاحیت اور اہلیت کے بموجب نہیں، بلکہ اللہ کے حکم سے کہتے تھے، اور نبی ﷺ قرآن پاک کی تفسیر وبیان کے حوالہ سے بھی جوابات فرماتے وہ بھی اس بصیرت، اور اس فہم وفراست اور نور قلب کی روشنی میں نہیں، بلکہ وحی الٰہی کی روشنی میں فرماتے تھے۔

بصیرت کی صفت میں نبی اور پیروان نبی دونوں شریک ہیں، اگرچہ کسی صفت میں دو یا دو سے زیادہ افراد کا اشتراک یہ معنی نہیں رکھتا کہ وہ سب مساوی درجہ میں اس سے موصوف ہوں۔

قرآن پاک میں بصیرت کا لفظ دو جگہ آیا ہے؛ سورۂ یوسف آیت نمبر ۱۰۸ اور سورۂ قیامہ آیت نمبر ۱۴، سورۂ یوسف میں یہ یقینی اور حقیقی علم کے معنی میں ہے، ارشاد ربانی ہے:

﴿قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَ مَنِ اتَّبَعَنِيْ﴾ (یوسف: ۱۰۸)

''کہہ دو یہ ہے میرا راستہ میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں، میں اور جو میرے پیرو ہیں علم یقین پر ہیں۔''

مطلب یہ ہے کہ ہمیں شریعت کا علم یقین حاصل ہے اور جہاں ہم ان لوگوں کے حالات کا علم رکھتے ہیں جن کو دعوت دینا ہے وہیں اس راستے سے بھی واقف ہیں جو مقصود تک پہنچاتا ہے۔ سورۂ فاتحہ اور انعام وغیرہ میں اس ''سبیل'' کو ''صراط'' سے بھی تعبیر کیا گیا ہے، ارشاد الٰہی ہے:

﴿وَ اَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَ لَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ﴾ (الانعام: ۱۵۳)

''اور درحقیقت یہ ہے میرا راستہ جو سیدھا ہے، لہٰذا اس کی پیروی کرو اور دوسرے راستوں کی پیروی مت کرو، ورنہ اس کے راستے سے تمہیں الگ کر دیں گے۔''

سورۂ قیامہ میں یہ لفظ ''شاہد'' کے معنی میں آیا ہے اور شہادت بھی ''علم'' میں پر مبنی ہے، ارشاد الٰہی ہے:

﴿بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰى نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ﴾ (القیامة: ۱۴)

''بلکہ انسان اپنے آپ پر مکمل گواہ ہے۔''

دراصل نبی اکرم ﷺ قرآنی آیات کی جو تشریح وتبیین فرماتے تھے اس کا درجہ شرعی احکام کا ہے جن کی پیروی فرض ہے اور اللہ کے فرض کرنے سے فرض ہے، اس لیے یہ بصیرت کا نتیجہ نہیں ہوسکتی؛ بصیرت شرعی ماخذ نہیں ہے، اہل قرآن یا حدیث کے شرعی مقام کے منکرین اس بات کی سعی مذموم کرنے سے نہیں تھکتے کہ حدیث کو نبی اکرم ﷺ کی رائے، اجتہاد اور فہم وفراست کا نتیجہ قرار دے کر اس کی قدر وقیمت کو گھٹائیں اس طرح حدیث کے شرعی ماخذ ہونے کا انکار کریں۔

سورۂ نساء کی آیت نمبر ۱۰۵ کے فقرہ: ﴿بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ﴾ سے قطعاً یہ نہیں ظاہر ہوتا کہ رسول اللہ ﷺ اپنی بصیرت، رائے اور صوابدید سے لوگوں کے مابین فیصلے کرتے تھے، اللہ تعالیٰ نے اپنے جس بندے اور رسول کی یہ صفت

Marfat.com

بیان فرمائی ہے کہ: ﴿وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى﴾ وہ محض اپنی بصیرت سے اللہ تعالیٰ کی کتاب کی تفسیر وتبیین کس طرح کر سکتا تھا کیونکہ بصیرت بھی "ھوی" ہی ہے، اگرچہ ہوائے نفس اور ہوائے مذموم نہ ہو، مگر ماخذ رشد وہدایت بہرحال نہیں ہے۔

جب قرآن پاک کی کسی آیت سے غلط نتیجہ اخذ کرنے یا غلط مفہوم لینے کی کوئی گنجائش نظر آتی ہے تو حق "پسند" لوگ اس کو ان آیتوں کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں جو اپنے مفہوم میں صریح اور دوٹوک ہوتی ہیں، اگر آپ کو ﴿بِمَا أَرَاكَ اللّٰهُ﴾ میں صرف "بصیرت نبوی" نظر آ رہی تھی تو آپ سورہ قیامہ کی وہ آیت دیکھ لیتے جو اس آیت مبارکہ کے بعد آتی ہے جس سے آپ نے قرآن کے لفظ ومعنی دونوں میں اللہ کا کلام ہونے پر استدلال کیا ہے، اس وقت آپ کو یہ علم الیقین حاصل ہو جاتا کہ اللہ تعالیٰ نے خود اپنی کتاب کی تفسیر وتبیین فرما دی ہے کیا یہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد مبارک نہیں ہے:

﴿ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ﴾ (القيامة: ۱۹)

"پھر یقیناً اسے بیان کر دینا ہمارے ذمہ ہے۔"

کیا یہ ارشاد الٰہی نہایت واضح اور دوٹوک طریقہ سے یہ خبر نہیں دے رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب میں جتنے حدود، حلال وحرام کے احکام اور وعدو وعید اور پند ونصائح وغیرہ کا اجمالاً ذکر ہے اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی اپنے رسول کو ان کی تفصیلات بتا دی ہیں۔ اس طرح نبی کریم ﷺ نے کتاب کی جو تشریح وتبیین فرمائی ہے وہ سب من جانب اللہ ہے اور وحی ہے۔ یہاں یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ اللہ تعالیٰ نے ﴿بِمَا أَرَاكَ اللّٰهُ﴾ فرمایا ہے: "بِمَا رَأَيْتَ" نہیں فرمایا ہے اور اُری کے معنی "أعلم" کے بھی آتے ہیں [1] یعنی اللہ نے تمہیں جو علم بخشا ہے اس کے مطابق فیصلہ کرو۔ اس سے "بصیرت نبوی" کے نظریہ پر مزید زد پڑتی ہے، اور حدیث کے وحی ہونے کے عقیدے کی مزید تائید ہوتی ہے۔

ایک دوسرا واقعہ جو منکرین حدیث کے اس دعویٰ کی جڑ کاٹ دیتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ پر قرآن کے سوا کوئی اور وحی نہیں نازل ہوتی تھی، مسجد اقصیٰ کو قبلہ بنانے سے متعلق ہے، کیا امر واقعہ یہ نہیں ہے کہ مکہ کے پورے عہد میں اور ہجرت کے بعد مزید دو برس تک نبی ﷺ اور صحابہ کرام بیت المقدس کی مسجد اقصیٰ کی طرف منہ کر کے نمازیں پڑھتے تھے، اور قرآن پاک مسجد اقصیٰ کو قبلہ بنانے کے حکم سے بالکل خالی ہے، اس میں اشارۃً بھی اس کا ذکر نہیں آیا ہے۔ قرآن نے تو اس کا ذکر اس وقت کیا جب اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی اور مسلمانوں کو یہ حکم دیا کہ وہ وہ اپنے چہرے بیت المقدس کے بجائے مکہ کی مسجد حرام کی طرف کر لیں، اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ بھی بتایا کہ بیت المقدس کو قبلہ اسی نے بنایا تھا اور اس کے لیے "فعل تعظیمی" کا صیغہ "جعلنا" استعمال فرمایا۔ (سورۂ بقرہ: ۱۴۳)

کیا اس واقعہ سے یہ لازم نہیں آتا کہ نبی ﷺ کا ہر شرعی حکم وحی پر مبنی تھا کیونکہ اگر آپ نے یہ قبلہ اپنی بصیرت سے مقرر کیا ہوتا تو آپ مسجد حرام کے قبلہ بنائے جانے کی تمنا اور خواہش کیوں کرتے جس پر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد مبارک

[1] القاموس القویم، ص ۲۵۰، ج ۱

Marfat.com

دلالت کرتا ہے:

﴿قَدْ نَرٰی تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِی السَّمَآءِ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰهَا﴾ (البقرة: ۱٤٤)

''یقیناً ہم تمہارے چہرہ کا بار بار آسمان کی طرف پھرنا دیکھ رہے ہیں، تو ہم تمہیں اسی قبلہ کی طرف پھیرے دیتے ہیں جسے تم پسند کرتے ہو۔''

نبی صلی اللہ علیہ وسلم صرف مفسر قرآن تھے؟

جو لوگ بصراحت حدیث کا انکار نہیں کرتے اور بعض حدیثوں پر، جو ان کے معیار تحقیق کے مطابق صحیح ہیں عمل کو ضروری یا جائز سمجھتے ہیں، وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو صرف مفسر قرآن یا شارح قرآن مانتے ہیں، اوپر علامہ سیّد سلیمان ندوی صاحب سیرت النبی کی رائے اور اس پر تبصرہ گزر چکا ہے۔ الطاف اعظمی اس میدان میں دو قدم آگے ہیں، یہ حدیث کو سرے سے ''وحی'' ہی نہیں مانتے؟ ان کا دعویٰ ہے کہ ''نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال واعمال دراصل قران کے اصولی احکام کی عملی تبیین ہیں اور یہ کام نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بصیرت نبوی کے مطابق انجام دیا تھا۔ ❶ ان کے اس دعوی کا تفصیلی جائزہ لے کر اس کا باطل ہونا دکھا چکا ہوں۔

اپنے اس مضمون کے آخری فقرے سے پہلے کے فقرے میں ایک مستند محقق کے لب ولہجہ میں ارشاد فرماتے ہیں:

''حقیقت یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ ارشاد فرمایا ہے وہ سب قرآن ہی سے ماخوذ ہے، اگر کوئی قول یا فعل جو آپ کی طرف منسوب کیا گیا ہے قران کی کسی نص کے خلاف ہو تو لاریب وہ رسول کا قول اور فعل نہیں ہو سکتا۔'' ❷

وہی پرانی راگنی جو خوارج، معتزلہ، متکلمین اور دور جدید کے منکرین حدیث سُر بدل بدل کر الاپ رہے ہیں۔

یہ فقرہ لکھنے کے بعد فرماتے ہیں: علامہ شاطبی نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ: اور اس کے بعد شاطبی کی کتاب ''الموافقات'' کا ایک اقتباس اور اس کا ترجمہ نقل کیا ہے۔

میں پہلے الموافقات کی عربی عبارت نقل کر دینا چاہتا ہوں، پھر اس کا ترجمہ جس کے بعد اس عبارت کی نکارت کو سمجھنا آسان رہے گا۔

((السنة راجعة فی معناها إلی الکتاب؛ فهی تفصیل مجمله وبیان مشکله، وبسط مختصره، وذلك لأنها بیان له، وهو الذی دل علیه قوله تعالی: ﴿وأنزلنا إلیك الذکر لتبین لناس ما نزل إلیهم﴾

فلا تجد فی السنة أمرا إلا والقرآن قد دل علی معناه دلالة إجمالیة أو تفصیلیة و

❶ ص: ۳۲،۳۱ ❷ ص ۳۲

Marfat.com

أيضا: فكل ما دل على أن القرآن هو كلية الشريعة وينبوع لها، فهو دليل على ذلك لأن الله قال: ﴿وإنك لعلى خُلُق عظيم﴾ وفسرت عائشة ذلك "بأن خُلُقه القرآن واقتصرت في خلقه على ذلك، فدل على أن قوله وفعله وإقراره راجع إلى القرآن، لأن الخلق محصور في هذه الآشياء، ولآن الله جعل القرآن تبيانا لكل شئي؛ فيلزم من ذلك أن تكون السنة حاصلة فيه في الجملة لأن الأمر والنهى أول ما في الكتاب، ومثله قوله: ما فرطنا في الكتاب من شيء، وقوله: ﴿اليوم أكملت لكم دينكم﴾ وهو يريد بإنزال القرآن؛ فالسنة إذاً في محصول الأمر بيان لمافيه، وذلك معنى كونها راجعة إليه.))

''سنت اپنے معنی میں کتاب کی طرف لوٹتی اور رجوع کرتی ہے، کیونکہ وہ اس کے مجمل حکم کی تفصیل، بمشکل سمجھ میں آنے والے معاملہ کا بیان اور مختصر مسئلہ کی وضاحت ہے۔ ایسا اس لیے ہے کہ سنت قرآن کا بیان ہے جس پر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد دلیل ہے: اور ہم نے تمہاری طرف ذکر کو نازل کیا ہے تاکہ تم لوگوں سے وہ بیان کرو جوان کی طرف اتارا گیا ہے۔ (سورۂ نحل: ۴۴)

''لہٰذا تم سنت میں ایسا کوئی معاملہ نہیں پاؤ گے جس کے مفہوم پر قرآن اجمالی یا تفصیلی طور پر دلالت نہ کرتا ہو، اور یہ بھی کہ ہر وہ چیز جو اس امر پر دلالت کرتی ہو کہ قرآن ہی شریعت کا قاعدہ عامہ اور اس کا سرچشمہ ہے تو وہ اس پر دلیل ہے، کیونکہ اللہ کا ارشاد ہے: ''اور در حقیقت تم نہایت اعلیٰ اخلاق پر ہو'' (سورۂ قلم: ۴) عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس کی تفسیر یہ کی ہے کہ آپ کا خلق قرآن ہے اور آپ کے اخلاق کے بیان میں اسی قول پر اکتفا کیا ہے جس سے اس امر پر دلالت ہوتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا قول، فعل اور تقریر قرآن کی طرف رجوع کرنے والی ہے، اس لیے کہ خلق انہیں امور کے دائرہ میں گھرا ہوتا ہے، اور چونکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کو ہر چیز کا نہایت واضح بیان بنایا ہے اس سے یہ لازم آتا ہے کہ اجمالی طور پر سنت قرآن میں موجود ہو، یہ اس لیے بھی کہ قرآن میں امر و نہی سرفہرست ہیں جس کی مثال اللہ کا یہ قول ہے: ہم نے کتاب میں کسی چیز کی کمی نہیں چھوڑی ہے۔ (سورۂ انعام: ۳۸) اسی طرح اس کا یہ ارشاد: آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لیے مکمل کر دیا۔ (سورۂ مائدہ: ۳) اس سے اس کی مراد قرآن نازل کرنا ہے، لہٰذا نتیجہ بحث یہ نکلا کہ سنت قرآن کا بیان ہے، اور یہی سنت کے اس کی طرف رجوع کرنے اور لوٹنے کے معنی ہیں۔'' [1]

اعظمی صاحب نے شاطبی کی عبارت کا جو ترجمہ کیا تھا اس کو سلیس اور رواں رکھنے کے لیے بعض الفاظ کا ترجمہ نہیں

[1] ص ۳۱۴-۳۱۹، ج ۴

Marfat.com

کیا تھا، میں نے ہر ہر لفظ کا ترجمہ کر دیا ہے۔

اعظمی صاحب نے یہ عبارت نقل کرنے سے قبل جو یہ دعویٰ کیا ہے کہ علامہ شاطبی نے بالکل صحیح لکھا ہے" اس پر میرا پہلا تبصرہ یہ ہے کہ شاطبی نے اس پوری عبارت میں جو دعویٰ کیا ہے وہ بھی غلط اور امر واقعہ کے خلاف ہے اور اس دعویٰ کی صحت پر قرآن کی جن آیتوں سے استدلال کیا ہے وہ استدلال بھی ان کے اس دعویٰ کے خلاف ہے اور اعظمی صاحب نے اس عبارت کی صحت کا جو حکم لگایا ہے وہ بھی ان کے حق میں نہیں ہے، اس لیے کہ امام شاطبی حدیث واحد کو حجت بھی مانتے ہیں اور وحی بھی؟!!

حدیث یا سنت کے قرآن کی تفسیر، شرح اور بیان ہونے کے کوئی بھی صحیح العقیدہ مسلمان خلاف نہیں ہے وہ جس چیز کے سخت خلاف ہے وہ یہ کہ حدیث یا سنت صرف قرآن کی تفسیر و بیان ہے، اس سے زیادہ کچھ نہیں، اور رسول اللہ ﷺ قرآن کے مفسر اور شارح ہونے کے علاوہ کچھ نہیں تھے، اور ایک صحیح العقیدہ اور اللہ تعالیٰ ہی کو معبود حقیقی اور محمد بن عبداللہ ﷺ کو اللہ کا رسول ماننے والا مسلمان مذکورہ دعویٰ کے خلاف اس لیے ہے کہ یہ قرآنی صراحتوں سے متعارض ہے؛ قرآن جہاں رسول اللہ ﷺ کو آمر وناہی قرار دیتا ہے وہیں وہ بصراحت تحلیل وتحریم کو بھی آپ کی طرف منسوب کرتا ہے، مختصر طور پر یہ کہ نبی ﷺ قرآن کے شارح ہونے کے ساتھ ساتھ شارع، حاکم اور قاضی بھی تھے اور ہیں؛ اپنی حیات پاک میں اپنی ان تمام حیثیوں میں آپ مطاع تھے اور اس دنیا سے رحلت کر جانے کے بعد آپ کی محفوظ حدیث اور سنت اسی طرح شرعی ماخذ ہے جس طرح قرآن شرعی ماخذ ہے اور قران کو محفوظ ماننے کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ نبی ﷺ کے قول، فعل اور تقریر کی صورت میں جس چیز کا نام حدیث یا سنت ہے وہ بھی محفوظ ہو میری اس بات سے منکرین حدیث یا حدیث کو مشروط حجت ماننے والوں یا حدیث کو صرف قرآن کی شرح وتفسیر اور بیان قرار دینے والوں کے نیچے زمین ہل جائے یا نہ ہلے، اگر کسی کے پاس قران سے اس کے خلاف کچھ ہے تو وہ پیش کرے، ان شاء اللہ میں "حدیث واحد سے قرآن پر اضافہ" کے تحت اس مسئلہ کو واضح کروں گا۔

اعظمی صاحب نے جو یہ فرمایا ہے کہ "اگر کوئی قول یا فعل جو آپ کی طرف منسوب کیا گیا ہے قرآن کی کسی نص کے خلاف ہو تو وہ لاریب رسول کا قول اور فعل نہیں ہو سکتا" تو یہ ان کی بدحواسی کا غماز ہے، ورنہ قرآن وحدیث میں اختلاف اور تعارض کا ذکر بے وقت کی راگنی ہے، کیونکہ دونوں میں اختلاف ہو ہی نہیں سکتا، محال ہے۔

شاطبی کی لغزش:

شاطبی نے اس عبارت میں دو نہایت بڑی غلطیاں اور لغزشیں کی ہیں؛ انہوں نے پہلی غلطی یہ کی ہے کہ حدیث یا سنت کو قرآن پاک کے مجمل کی تفصیل، اس کی مشکل کے بیان اور اس کے مختصر کی وضاحت کے دائرے میں بند کر دیا ہے اور دوسری غلطی یہ کی ہے کہ اپنے اس دعوے کی تائید میں جن قرآنی آیتوں اور جس حدیث سے استدلال کیا ہے ان

Marfat.com

سے ان کے اس دعوے کی تائید نہیں ہوتی اور اعظمی صاحب نے ان کو سمجھے بغیر یہ محسوس کر لیا کہ یہ قول تو ان کی ہرزہ سرائیوں کے حق میں ہے، اور بغلیں بجانے لگے۔

جہاں تک شاطبی کی پہلی غلطی ہے تو جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں یہ ہے کہ انہوں نے حدیث کو قرآن کی شرح و بیان تک محدود کر دیا دوسرے لفظوں میں نبی کریم ﷺ کا فرض منصبی صرف یہ تھا کہ آپ کتاب اللہ کی تفسیر و توضیح کرتے جائیں اس کے آگے آپ کچھ اور نہیں تھے، حالانکہ اپنے اس قول پر خود آگے انہوں نے جو اشکالات پیش کیے ہیں ان میں ان کے اس قول یا دعوے سے زیادہ وزن ہے اور ان سے بصراحت یہ معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کو شرح قرآن اور بیانِ قرآن کے ساتھ ساتھ مستقل تشریعی حیثیت بھی حاصل تھی۔

سورۂ اعراف میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿يَأْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهٰهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلٰلَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ﴾ (الاعراف: ۱۵۷)

''وہ ان کو نیکی کا حکم دیتا ہے اور انہیں برائی سے روکتا ہے اور ان کے لیے پاکیزہ چیزیں حلال کرتا ہے اور ان پر ناپاک چیزوں کو حرام قرار دیتا ہے اور ان سے ان کا وہ بوجھ اور وہ طوق اتارتا ہے جو ان پر پڑے تھے۔''

غور کیجیے! اللہ تعالیٰ نے کتنے واضح اور دوٹوک طریقے سے نبی ﷺ کے تشریعی مناصب بیان فرمائے ہیں اور یہ صراحت کر دی ہے کہ امر و نہی اور تحلیل و تحریم صرف وہی نہیں ہے جو قرآن میں بیان ہوئی ہے، بلکہ جو کچھ نبی ﷺ نے حرام یا حلال قرار دیا ہے اور جن چیزوں کا حکم دیا ہے اور جن چیزوں سے منع فرمایا ہے وہ بھی قرآن کے حرام یا حلال اور قرآن کے امر و نہی کی طرح ہے، مختصر لفظوں میں آپ کتاب اللہ کے شارح ہونے کے ساتھ مستقل بالذات شارع بھی تھے۔

میرے خیال میں صرف یہی ایک آیت ایسے تمام دعوؤں اور نظریات کی جڑ کاٹ دیتی ہے کہ ''رسول اللہ ﷺ نے جو کچھ ارشاد فرمایا وہ سب قرآن ہی سے ماخوذ ہے'' یا یہ کہ حدیث یا سنت صرف قرآن کی شرح و بیان سے عبارت ہے۔''

یہ آیت مبارکہ یہ بھی اعلان کر رہی ہے کہ رسول اللہ ﷺ اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ یہ فرائض رسالت محض ''بصیرت نبوی'' یا ''ملکۂ نبوت'' سے انجام نہیں دیتے تھے، بلکہ ''وحی'' کی بنیاد پر انجام دیتے تھے اس طرح آپ کی شرح و تبیین قرآن بھی مبنی بر وحی تھی اور قرآن کے علاوہ آپ کی مستقل اور علیحدہ تشریح بھی مبنی بر وحی تھی، البتہ ان دونوں میں سے کوئی بھی چیز قرآن کے خلاف نہیں تھی: ﴿وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحٰى﴾ اسی وجہ سے آپ کی اطاعت بھی غیر مشروط تھی اور اتباع بھی۔

شاطبی نے یہ دعویٰ کرنے کے بعد حدیث یا سنت کے قرآن کی تفصیل، بیان اور توضیح کے دائرے میں بند ہونے پر جن آیتوں سے استدلال کیا ہے، آیئے یہ دیکھیں کہ کیا یہ واقعتاً ان کے مدعا کی تائید کر رہی ہیں؟:

Marfat.com

۱۔ انہوں نے پہلی جس آیت سے یہ استدلال کیا ہے کہ سنت تمام کی تمام قرآن کا بیان ہے وہ سورۂ نحل کی یہ آیت ہے:

﴿وَ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ﴾ (النحل: ٤٤)

''اور ہم نے تمہاری طرف ذکر کو نازل کیا ہے تاکہ تم لوگوں سے وہ بیان کردہ جو ان کی طرف نازل کیا گیا ہے۔''

یہ آیت اور اس کا صحیح ترجمہ آپ کے سامنے ہے اور اس میں جو بات فرمائی گئی ہے وہ صرف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کو رسول اللہ ﷺ پر اس لیے نازل کیا ہے کہ آپ اس کے احکام کو اور اس میں موجود وعد وعید کو اپنے قول وفعل سے لوگوں کے سامنے واضح کر دیں اور بیان کر دیں۔ اس حکم قرآنی سے یہ لازمی نتیجہ بھی نکلا کہ اللہ کی کتاب میں جو احکام مجمل اور غیر مفصل ہیں ان کی تفصیلات بیان کرنے کا مجاز صرف رسول اللہ ﷺ ہیں۔

لیکن اس آیت میں اس امر کی جانب کوئی اشارہ تک نہیں کیا گیا ہے کہ نبی ﷺ کے تمام اقوال اور افعال کتاب اللہ کی شرح وبیان کے دائرہ میں محصور اور بند تھے، یا دوسرے لفظوں میں رسول اللہ ﷺ کا فرض منصبی صرف یہ تھا کہ آپ اس کی نازل کردہ کتاب کے الفاظ ومعانی کی توضیح وتشریح کریں اس تناظر میں حدیث صرف قرآن کا بیان اور تفسیر ہے، میں نے جو کچھ عرض کیا ہے شاطبی نے آگے اس کی تصریح کردی ہے، فرماتے ہیں: ((فلا تجد فی السنة أمراً إلا والقرآن قد دل علی معناه دلالة إجماليه اَو تفصيلية .)) ''تم سنت میں ایسا کوئی معاملہ نہیں پاؤ گے جس کے مفہوم پر قرآن اجمالی یا تفصیلی طور پر دلالت نہ کرتا ہو'' تو یہ دعویٰ ایسا ہے جس کی تائید نہ تو زیر بحث آیت سے ہوتی ہے اور نہ ذخیرۂ حدیث سے۔

جہاں تک آیت زیر استدلال کا تعلق ہے تو اس سے یہ مفہوم نہیں نکلتا کہ رسول اللہ ﷺ کا فرض منصبی صرف یہ تھا کہ آپ قرآن کے اجمال کو کھول کر بیان کر دیں' اگر یہ بیان کرنا مقصود ہوتا تو یوں فرمایا جاتا: ہم نے تم کو اس لیے بھیجا ہے کہ تم لوگوں کو وہ احکام کھول کر بیان کر دو جو تمہارے واسطہ سے ان کے لیے نازل کیے گئے ہیں' اور جب ایسا نہیں فرمایا گیا، تو حدیث کو صرف قرآن کے بیان کے دائرہ میں بند کرنے کی بات من گھڑت قرار پائی اور ایسی آیت سے اس پر استدلال بے محل ٹھہرا جس میں ایسی کوئی بات نہیں فرمائی گئی ہے۔

۲۔ صحیح احادیث کا جو ذخیرہ موجود ہے اس میں بھی جہاں ایسی حدیثیں ہیں جن میں قرآنی احکام کی تفصیل بیان کی گئی ہے جیسے نماز کے اعمال کہ نماز کا حکم تو قرآن میں منصوص ہے، مگر اس کے اعمال نبی ﷺ نے بیان کیے ہیں، لیکن اسی کے ساتھ ایسی بے شمار حدیثیں بھی ہیں جن میں ایسے احکام بیان کیے گئے ہیں جن کا قرآن میں کوئی ذکر نہیں آیا ہے، مثال کے طور پر قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے ایک شخص کے نکاح میں دو بہنوں کو جمع کرنا حرام قرار دیا ہے، ﴿وَ اَنْ تَجْمَعُوْا بَيْنَ الْاُخْتَيْنِ﴾ ''یعنی (تم پر یہ حرام کر دیا گیا ہے کہ تم دو بہنوں کو جمع کرو۔'' (النساء: ٢٣) قرآن پاک میں بہنوں کے علاوہ کسی اور قسم کی دو عورتوں کو بیک وقت ایک شخص کے نکاح میں جمع

Marfat.com

کرنے کا حکم دُور یا قریب سے نہیں بیان کیا گیا ہے، لیکن حدیث میں نبی ﷺ نے بھتیجی اور پھوپھی اور بھانجی اور خالہ کو بھی ایک ساتھ جمع کرنے کو حرام قرار دیا ہے۔'' ❶

ان دونوں مثالوں سے بصراحت یہ معلوم ہوا کہ سنت جہاں قرآن میں موجود اجمال حکم کی تفصیل ہے، وہیں وہ مستقل اور قرآن کے علاوہ تشریعی ماخذ بھی ہے جس کی نہایت واضح اور نا قابل تاویل دلیل سورۂ اعراف کی مذکورہ بالا آیت کریمہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے صریح لفظوں میں امر و نہی اور تحلیل و تحریم کو رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کیا ہے، اگر رسول اللہ ﷺ کی یہ مستقل تشریعی حیثیت تسلیم نہ کی جائے تو اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد مبارک نعوذ باللہ بے معنی ہو جائے گا: ﴿مَنْ يُطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ﴾ ''جس نے رسول کی اطاعت کی درحقیقت اس نے اللہ کی اطاعت کی۔'' (سورۂ نساء: ۸۰) کیونکہ اللہ کے دیے ہوئے اوامر و نواہی میں رسول کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے رسول کی اطاعت نہیں، لہٰذا رسول کی اطاعت اسی وقت ہوگی جب ان احکام میں اس کی اطاعت کی جائے جو قرآن کے علاوہ ہیں۔

اس سے یہ ثابت ہوا کہ نہ تو نبی ﷺ کے سارے اقوال و افعال کتاب اللہ کی شرح و بیان میں محصور ہیں، اور نہ ساری سنت صرف قرآن کے مجمل کی تفصیل، اس کی مشکل کے بیان اور اس کے مختصر کی وضاحت سے عبارت ہے، بلکہ یہ بھی ہے اور مستقل تشریع بھی، البتہ شرعی ماخذ ہونے کے اعتبار سے دونوں کا درجہ ایک ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی اور اپنے نبی کی اطاعت کا حکم یکساں اور مساوی درجہ میں دیا ہے، فقہاء نے قرآن و حدیث سے حاصل ہونے والے احکام میں جو فرق اور درجہ بندی کی ہے وہ ان کی خانہ ساز ہے قرآن میں اس کی کوئی دلیل نہیں ہے۔

۳۔ شاطبی نے سنت کے صرف قرآن کی تفسیر اور بیان ہونے پر جن دوسری دو آیتوں سے استدلال کیا ہے ایک اعتبار سے تو وہ دونوں سنت یا حدیث کے قرآن کی تفسیر اور بیان کی نفی کرتی ہیں اور دوسرے اعتبار سے قرآن کی ان آیتوں کے مطابق ہیں جن میں یہ خبر دی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ پر قرآن اس لیے نازل کیا تھا کہ آپ اس کے احکام کو لوگوں سے تفصیلاً بیان کر دیں، لیکن ان سے مجموعی طور پر، یا کسی آیت سے انفرادی طور پر قطعاً یہ مفہوم نہیں نکلتا کہ سنت یا حدیث صرف قرآن کی تفسیر ہے اس کے سوا کچھ نہیں، یہ مفہوم زبردستی نکالنے کی کوشش کی گئی ہے آیتوں کے الفاظ یا طرز بیان میں اس مفہوم کی کوئی گنجائش نہیں ہے، تفصیلات درج ذیل ہیں:

شاطبی نے ''قرآن کو ہر چیز کا نہایت واضح بیان قرار دے کر'' جو آیت مراد لی ہے وہ سورۂ نحل کی آیت نمبر ۸۹ ہے جس کے الفاظ ہیں:

﴿وَ يَوْمَ نَبْعَثُ فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيْدًا عَلَيْهِمْ مِّنْ اَنْفُسِهِمْ وَ جِئْنَا بِكَ شَهِيْدًا عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ وَ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّ هُدًى وَّ رَحْمَةً وَّ بُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ﴾ (النحل: ۸۹)

❶ بخاری: ۵۱۰۸، ۵۱۰۹، ۵۱۱۰، مسلم: ۱۴۰۸

Marfat.com

''اور جس دن ہم ہر امت میں ان پر انہی میں سے ایک گواہ کھڑا کریں گے اور تم کو ان پر گواہ بنا کر لائیں گے، اور ہم نے تم پر کتاب نازل کی ہے جو ہر چیز کا نہایت واضح بیان ہے اور مسلمانوں کے لیے ہدایت ورحمت اور خوش خبری ہے۔''

اس آیت مبارکہ میں ﴿تِبۡيَانًا لِّكُلِّ شَيۡءٍ﴾ سے مراد امر و نہی، حلال وحرام اور اور حدود واحکام کا بیان ہے جن کو جاننے کا ایک انسان محتاج ہے اور قیامت کے دن ہر انسان سے جن کے بارے میں سوال ہوگا، اور ہر امت سے ایک شخص کو گواہ بنا کر کھڑا کیا جائے گا جو یہ گواہی دے گا کہ ہر امت میں بھیجے جانے والے رسول نے اس کو اللہ کا پیغام بے کم وکاست پہنچا دیا ہے، اور پھر آخر میں اللہ تعالیٰ ہمارے نبی ﷺ کو ان تمام امتوں پر گواہ بنا کر کھڑے کریں گے۔

آیت میں ﴿تِبۡيَانًا لِّكُلِّ شَيۡءٍ﴾ سے مراد وہ بیان نہیں ہے جس کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو سونپی تھی، کیونکہ یہ مراد لینے کی صورت میں اس آیت اور اسی سورت کی سابقہ آیت: ﴿وَ اَنۡزَلۡنَاۤ اِلَيۡكَ الذِّكۡرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيۡهِمۡ﴾ میں تعارض ہو جائے گا جس سے اللہ تعالیٰ کا کلام اور نبی ﷺ کی حدیث پاک ہے۔

دراصل قرآن کا بیان واضح ہونے کے باوجود مجمل ہے، جبکہ حدیث کا بیان مفصل ہے۔

قرآن کے اس مجمل بیان کی دو قسمیں ہیں:

۱۔ نماز، زکواۃ، حج اور روزہ کا حکم، عدل وانصاف، نیکو کاری، اور رشتہ داروں کو ان کے حقوق ادا کرنے کا حکم، برے کاموں سے منع کرنا ناپاک چیزوں اور لوگوں کے اموال پر ناجائز قبضہ کی حرمت وغیرہ۔

۲۔ قرآن کے مجمل بیان کی دوسری قسم رسول اللہ ﷺ کی اطاعت وپیروی، اور آپ کے ذریعہ ملنے والے تمام اوامر کی تعمیل اور جن چیزوں سے آپ نے منع فرمایا ہے ان سے باز رہنا وغیرہ۔

قرآن میں کل شیء کی تعبیر کا مفہوم:

قرآن پاک میں ﴿كُلِّ شَيۡءٍ﴾ ''ہر چیز'' کی تعبیر اگرچہ عام ہے، لیکن سلسلہ کلام کی روشنی میں یہ خاص کے مفہوم میں ہوتی ہے: مثال کے طور پر ''ذی القرنین'' کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿اِنَّا مَكَّنَّا لَهٗ فِي الۡاَرۡضِ وَ اٰتَيۡنٰهُ مِنۡ كُلِّ شَيۡءٍ سَبَبًا﴾ (الکھف: ۸۴)

''درحقیقت ہم نے اسے زمین میں اقتدار بخشا اور اسے ہر چیز میں سے ایک ذریعہ عطا کیا تھا۔''

تو آیت میں مذکورہ ﴿مِنۡ كُلِّ شَيۡءٍ﴾ سے مراد ہر وہ چیز ہے جس کی شہروں کو فتح کرنے اور دشمنوں کو زیر کرنے میں ضرورت پڑتی ہے۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ ذی القرنین کو دنیا کی تمام چیزیں عطا کر دی گئی تھیں۔

اس طرح ملکہ سبا کے بارے میں ہے:

﴿اِنِّيۡ وَجَدْتُّ امۡرَاَةً تَمۡلِكُهُمۡ وَ اُوۡتِيَتۡ مِنۡ كُلِّ شَيۡءٍ﴾ (النمل: ۲۳)

Marfat.com

''میں نے در حقیقت ایک عورت کو پایا جو ان پر حکومت کر رہی ہے اور اسے ہر چیز میں سے حصہ دیا گیا ہے۔''

یہ ہدہد پرندہ کا اپنا تاثر ہے اور اس نے ﴿مِنْ كُلِّ شَيْءٍ﴾ سے اسباب حکمرانی، یا ذرائع حکمرانی مراد لیے ہیں، نہ کہ دنیا کی ہر شے، ورنہ یہ بات معلوم ہے کہ سلیمان علیہ السلام کو ملکۂ سبا سے زیادہ طاقت حاصل تھی اور وہ اس سے کہیں زیادہ اسباب حکمرانی کے مالک تھے۔

دوسری آیت سورۂ انعام کی ہے جس کے فقرہ: ﴿مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ﴾ سے شاطبی نے حدیث کے صرف قرآن پاک کی تفسیر اور بیان ہونے پر استدلال کیا ہے جو غلط ہے، اس لیے کہ اس میں حدیث یا سنت کے تفسیر قرآن ہونے یا بیان قرآن ہونے کا کوئی ذکر نہیں ہے اور سلسلہ بیان اور نظم کلام کی روشنی میں اس کا کوئی موقع بھی نہیں ہے۔

اس فقرہ میں ''الکتاب'' سے اگر ''لوح محفوظ'' کو مراد لیا جائے تو ﴿مِنْ شَيْءٍ﴾ کا مطلب اور ہوگا اور قرآن مراد لینے سے کچھ اور سلسلہ کلام کی روشنی میں الکتاب سے لوح محفوظ اور قرآن دونوں مراد لینے کی گنجائش ہے، البتہ دونوں صورتوں میں ﴿مِنْ شَيْءٍ﴾ کا مدلول اور معنی مختلف ہوگا۔

الکتاب سے ''لوح محفوظ'' مراد لینے کی صورت میں ﴿مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ﴾ ہم نے ''کتاب'' میں کسی طرح کی کوئی کوتاہی نہیں کی ہے، یعنی زمین، اور فضائی مخلوقات اور چوپایوں، اور وحشی درندوں اور پرندوں کی کوئی بھی قسم ایسی نہیں ہے جو تمہاری طرح کی امت نہ ہو، ان سب کی پیدائش، ان کے رزق اور ان کی پرورش وحفاظت کا کوئی مسئلہ ایسا نہیں ہے جو ہماری قدرت ومشیت کے مطابق نافذ نہ ہو رہا ہو، کوئی چھوٹی سی چھوٹی چیز اور اس سے متعلقہ کوئی بات بھی لوح محفوظ میں درج ہونے سے نہیں رہی ہے۔

اور اگر الکتاب سے قرآن پاک مراد ہے تو اس فقرے کے معنی ہوں گے کہ رسول اللہ ﷺ سے حسی آیت (معجزہ) طلب کرنے والوں کے دل کی آنکھیں اگر کھلی ہوئی ہیں تو اللہ تعالیٰ کی الوہیت اور ربوبیت اور یوم آخرت کے وقوع پذیر ہونے کی کوئی یا شرعی آیت اور نشانی ایسی نہیں ہے جو قرآن میں بیان ہونے سے رہ گئی ہو۔ (آیت ۳۷ اور ۳۸)

اب اگر کوئی بدراہ اور منکر حدیث ان دونوں آیتوں سے یہ استدلال کرے کہ قرآن پاک میں تمام تفاصیل موجود ہیں اور رسول اللہ ﷺ کے فرائض منصبی میں نہ قرآن کی تفسیر وتبیین داخل ہے نہ مستقل تشریع، جیسا کہ موجودہ دور کے اہل قرآن اور منکرین حدیث کا طرز عمل ہے تو ان آیتوں کے دائرے میں تو اس کا دعویٰ درست ہوگا، مگر وہ ان آیتوں کا منکر قرار پائے گا جن میں نبی ﷺ کو مبین قرآن بھی قرار دیا گیا اور مستقل شارع بھی اس طرح ایسا شخص بنو اسرائیل کے ان لوگوں کے مانند ہوگا جن کا ذکر اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں کیا ہے:

﴿اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَ تَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ وَ مَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ﴾ (البقرۃ: ۸۵)

Marfat.com

''کیا تم لوگ کتاب کے بعض حصے پر ایمان رکھتے ہو اور بعض کا انکار کرتے ہو تو تم میں سے جو یہ ارتکاب کرے دنیا کی زندگی میں اس کی جزا رسوائی کے سوا کیا ہے اور قیامت کے دن یہ لوگ سخت ترین عذاب کی طرف لوٹائے جائیں گے اور اللہ اس سے غافل نہیں ہے جو تم کرتے ہو۔''

شاطبی نے سورۂ مائدہ کی اس آیت سے بھی اس دعویٰ پر استدلال کیا ہے کہ سنت صرف قرآن کے اجمال کا بیان ہے، جس میں تکمیل دین کا اعلان فرما دیا گیا ہے، یعنی: ﴿اَلْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ﴾ ''آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لیے مکمل کر دیا'' (۳) شاطبی فرماتے ہیں:

''اللہ نے تکمیل دین سے مراد قرآن کو نازل کرنا لیا ہے، لہٰذا حاصل کلام یہ نکلا کہ سنت قرآن کے مندرجات کا بیان ہے، یہی معنی ہیں اس کے قرآن کی طرف لوٹنے کے۔''

یہ معلوم ہے کہ یہ آیت مبارکہ حجۃ الوداع کے موقع پر عرفات میں نبی ﷺ پر اس وقت نازل ہوئی جب آپ حج کا رکن اعظم ''وقوف'' ادا فرما رہے تھے۔ ❶ اس کے بعد نبی ﷺ ۸۰ دن زندہ رہے، تو کیا آپ کے یہ ۸۰ دن قولی اور فعلی سنت سے خالی تھے کہ تکمیل دین کو صرف قرآن سے تعبیر کیا جائے؟ اور کیا قرآن پاک میں کہیں یہ فرمایا گیا ہے کہ دین صرف قرآنی احکام کا مجموعہ ہے؟

شاطبی نے ارشاد الٰہی: ﴿وَإِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ﴾ ''اور یقیناً تم نہایت اعلیٰ اخلاق پر ہو'' (سورۂ قلم: ٤) کی اس تفسیر سے بھی استدلال کیا ہے جو ام المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس آیت کی کی ہے اور فرمایا ہے: آپ کا اخلاق قرآن ہے۔ ❷

یہ ام المؤمنین کا قول ہے مرفوع حدیث نہیں ہے کہ اللہ و رسول کے قول کی طرح دلیل و حجت ہو، البتہ اپنے معنی اور مفہوم میں بالکل صحیح ہے اور ام المؤمنین نے اس مختصر سے قول میں رسول اللہ ﷺ کی پوری سیرت پاک بیان فرما دی ہے، بایں ہمہ اس میں شاطبی اور نبی ﷺ کی مستقل تشریعی حیثیت اور صفت کے دوسرے منکرین کے اس دعویٰ کی کوئی معمولی سی بھی دلیل نہیں کہ نبی ﷺ کا قول و فعل یا حدیث اور سنت صرف قرآن کی تفسیر و تبیین ہے اس کے علاوہ کچھ نہیں ہے، بلکہ اس کے برعکس ام المؤمنین کا یہ ارشاد منکرین حدیث کے سارے دعووں اور تمام نظریات پر ایک کاری ضرب ہے اس لیے کہ:

عربی میں ''خُـلُـق'' اس صفت کو کہتے ہیں جس سے اس کے افعال کو وجود ملتا ہے اور افعال میں اقوال بھی شامل ہیں اور ام المؤمنین کی طرح ہمارا بھی اس بات پر گہرا اور غیر متزلزل ایمان ہے کہ ہمارے پیارے نبی و رسول فداہ ابی و امی ﷺ کے اقوال و افعال یا دوسرے لفظوں میں پوری سیرت پاک قرآنی تعلیمات کی ترجمان تھی اور قرآنی تعلیمات میں جو چیزیں داخل ہیں ان میں سے بعض یہ ہیں:

❶ بخاری: ۴۵، ۴۴۰۷، ۴۶۰۶، مسلم: ۳۰۱۷ ❷ مسلم: ۷۴۶

Marfat.com

قرآنی تعلیمات رسول کے لیے:

۱۔ رسول اللہ ﷺ وحی ربانی کے پابند تھے:

﴿وَّاتَّبِعْ مَا يُوْحٰى اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا﴾ (الاحزاب: ۲)

''اور تم اس کی پیروی کرو جو تمہارے رب کی جانب سے تمہاری طرف وحی کی جاتی ہے یقیناً اللہ جو کچھ تم کرتے ہو اس سے اچھی طرح باخبر ہے۔''

﴿اِتَّبِعْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَ اَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ﴾ (الانعام: ۱۰۶)

''اس کی پیروی کرو جو تمہاری طرف تمہارے رب کی جانب سے وحی کی گئی ہے نہیں ہے کوئی معبود مگر وہ اور مشرکین سے کنارہ کش رہو۔''

۲۔ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کے لیے جو شریعت بنا دی تھی آپ اس پر چلنے کے پابند تھے۔

﴿ثُمَّ جَعَلْنٰكَ عَلٰى شَرِيْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ﴾ (الجاثیہ: ۱۸)

''پھر ہم نے تمہیں دین کے جس طریقے پر لگا دیا ہے اس پر چلتے رہو اور ان لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہ کرو جو علم نہیں رکھتے۔''

۳۔ رسول اللہ ﷺ اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ احکام کی تبلیغ کے پابند تھے۔

﴿يٰۤاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ وَ اِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ وَ اللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ﴾ (المائدۃ: ۶۷)

''اے رسول! جو کچھ تمہارے رب کی جانب سے تمہاری طرف نازل کیا گیا ہے اسے پہنچا دو، اور اگر تم نے یہ نہ کیا تو تم نے اس کا پیغام نہیں پہنچایا اور اللہ تمہیں لوگوں سے بچائے گا۔''

۴۔ نبی کریم ﷺ بشیر و نذیر اور مبشر و نذیر بھی تھے، اور آپ لوگوں کو جہاں اچھے اعمال پر حسن جزا کی خوش خبری دیتے تھے وہیں بُرے اعمال کے نتائج بد ڈراتے بھی تھے اور آپ اپنے یہ دونوں فرائض منصبی بذریعہ وحی متلو۔ قرآن۔ بھی انجام دیتے تھے اور بذریعہ وحی غیر متلو۔ حدیث۔ بھی جس کی دلیل سورۂ مدثر کی دوسری آیت '' قم فأنذر '' ...... ''اٹھو اور ڈراؤ'' ہے، یاد رہے کہ اس آیت کے نزول تک قرآن پاک کی صرف وہ پانچ آیتیں نازل ہوئی تھیں جو سورۂ علق کے شروع میں ہیں اور بصورتِ قرآن بشارت اور نذارت کا کوئی حکم آپ کو نہیں دیا گیا تھا، لہٰذا آپ نے ''قُم فأنذر'' کی تنفیذ وحی غیر متلو کے بموجب کی۔

یہ آیتیں یہ بتا رہی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ بذریعہ وحی اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ احکام اور تعلیمات کی پابندی کرنے اور ان کو لوگوں تک پہنچانے اور عام کرنے کے مکلف تھے۔ اور ام المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا کے بقول چونکہ ''قرآن ہی آپ

Marfat.com

کا خلق" ہے لہٰذا آپ نے لازماً قرآن میں بیان کردہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی حرف بحرف تعمیل کی، ورنہ آپ نعوذ باللہ ادائے رسالت میں کوتاہی کے مرتکب ہوتے!!!

رسول اللہ ﷺ کے فرائض منصبی قرآن کی روشنی میں:

۱۔ رسول اللہ ﷺ اللہ کی نازل کردہ کتاب، قران کی آیتیں لوگوں کو پڑھ کر سناتے تھے، اور انہیں کتاب کے مضامین اور معانی کی بھی تعلیم دیتے تھے اور حدیث کی بھی، اور ان کو اپنے قول وفعل سے پاک بھی کرتے تھے اور بناتے اور سنوارتے بھی تھے۔

﴿هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ﴾ (الجمعة : ۲)

"وہی ہے جس نے اَن پڑھوں میں انہیں میں سے ایک رسول بھیجا جو ان کو اس کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے، اور ان کو پاک کرتا ہے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے، جبکہ درحقیقت اس سے پہلے وہ کھلی گمراہی میں تھے۔"

۲۔ نبی ﷺ کا فرض منصبی یہ بھی تھا کہ آپ قرآن کی تفسیر وتبیین کریں:

﴿وَاَنْزَلْنَآ اِلَیْكَ الذِّكْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْهِمْ﴾ (النحل : ۴۴)

"اور ہم نے تمہاری طرف ذکر کو نازل کیا ہے تاکہ تم لوگوں سے وہ بیان کردو جو ان کی طرف نازل کیا گیا ہے۔"

نبی ﷺ قرآن کی یہ تفسیر وتبیین اپنی صوابدید اور بصیرت سے نہیں کرتے تھے، بلکہ وحی الٰہی کی روشنی میں اور اس کے بیان کے مطابق کرتے تھے:

﴿وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ○ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰى﴾ (النجم : ۳-۴)

"وہ خواہش سے نہیں بولتا وہ تو صرف وحی ہے جو اس کو کی جاتی ہے۔"

﴿ثُمَّ اِنَّ عَلَیْنَا بَیَانَهٗ﴾ (القیامه : ۱۹)

"پھر درحقیقت اسے بیان کردینا ہمارے ذمہ ہے۔"

﴿اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَیْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَیْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ﴾ (النساء : ۱۰۵)

"درحقیقت یہ کتاب ہم نے تمہاری طرف حق کے ساتھ نازل کی ہے تاکہ تم لوگوں کے درمیان اس کے مطابق فیصلہ کرو جو اللہ نے تمہیں دکھایا ہے۔"

﴿بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ﴾ "أی بما علمك الله و أعلمك" یعنی جو اللہ نے تمہیں تعلیم دی ہے یا جو حکم بتایا ہے اس کے مطابق، نہ کہ اپنی ذاتی رائے اور علم کے مطابق۔

Marfat.com

۳۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری نبی اور رسول کی جو صفات تورات اور انجیل میں بیان کر دی تھیں اور وہ تھیں:

﴿يَأْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوفِ وَ يَنْهٰهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ يُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَ يُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَ يَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَ الْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ﴾ (الاعراف: ۱۵۷)

''وہ ان کو نیکی کا حکم دیتا ہے اور انہیں برائی سے روکتا ہے اور ان کے لیے پاکیزہ چیزیں حلال کرتا ہے اور ان پر ناپاک چیزوں کو حرام دیتا ہے اور ان سے وہ بوجھ اور وہ طوق اتارتا ہے جو ان پر پڑے ہوئے تھے۔''

یہ آیت یہ بتا رہی ہے کہ نبی ﷺ قرآن کے مفسر و مبین ہونے کے علاوہ مستقل شارع بھی تھے۔

ام المؤمنین کے مطابق نبی ﷺ کے یہ فرائض اور صفات بھی آپ کے ''خلق'' میں داخل تھیں، ہیں اور قیامت تک داخل رہیں گی، کیونکہ یہ سب قرآنی فرائض اور صفات ہیں۔

معلوم ہوا کہ ام المؤمنین کے قول: "كان خلقه القرآن" سے اس بات پر استدلال کہ سنت صرف قران کی تفسیر و تبیین ہے مستقل تشریع یا شرعی ماخذ نہیں ہے، خود قرآن کے خلاف ہے۔

اہل ایمان سے قرآن کا مطالبہ:

اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں ایک سے زیادہ جگہوں پر اپنے رسول ﷺ کی مطلق اور غیر مشروط اطاعت اور اتباع کا حکم دیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ حدیث یا سنت اسی طرح ماخذ شریعت ہے جس طرح قرآن اور اس کو قرآن کے مساوی شرعی ماخذ نہ ماننے والے یا اس کو قرآن کی تفسیر و تبیین ماننے والے، لیکن مستقل تشریع نہ ماننے والے دونوں خود قرآن کے منکر ہیں اور قرآن پر ان کے ایمان کا دعویٰ محض مجبوری ہے، ورنہ وہ خود اپنے پیروکاروں کے نزدیک مسلمان نہیں رہ جائیں گے۔

۱۔ رسول اللہ ﷺ کی اطاعت مستقل بالذات ہے اللہ کی اطاعت کے ساتھ مقید نہیں ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ﴾ (النساء: ۵۹)

''اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی۔''

اس ارشاد الٰہی کی اہمیت کو سمجھنے کے لیے اسلوب بیان کو سمجھ لینا ضروری ہے۔

۱۔ اگر کسی حکم کو بیان کرنے سے پہلے حرف ندا لایا جائے یا کلام کا آغاز حرف ندا سے کیا جائے تو اس حکم میں تاکید مقصود ہوتی ہے۔

۲۔ منادی کو ایمان سے موصوف قرار دینے کا مقصد یہ بتانا ہوتا ہے کہ جو حکم بیان کیا جانے والا ہے اس کی تعمیل ایمان کا تقاضا ہے اس تناظر میں اس حکم کو نہ ماننے سے ایمان سلب ہو جاتا ہے۔

۳۔ ﴿أطيعوا﴾ "أطاع يُطيع إطاعة" سے فعل امر جمع مذکر مخاطب کا صیغہ ہے جس میں اللہ و رسول پر ایمان لانے

Marfat.com

والے تمام مرد اور عورتیں داخل ہیں۔

اور اطاعت اور طاعت کے معنی ہیں، پست ہو کر اور جھک کر کسی حکم کو ماننا اور جس کام سے روکا گیا ہے اس سے باز رہنا۔

۴۔ فعل امر ﴿أطیعوا﴾ اللہ سے پہلے لایا گیا تھا، اگر بذریعہ 'واؤ' اس پر ''الرسول'' کو عطف کر دیا جاتا تب بھی مطلب ادا ہو جاتا اور اللہ کے ساتھ رسول کی اطاعت فرض ہوتی، لیکن اس سے یہ مفہوم بھی نکل سکتا تھا کہ رسول کی اطاعت مستقل نہیں، بلکہ اللہ کی اطاعت کے تابع ہے، لہٰذا فعل امر اطیعوا کا رسول سے پہلے اعادہ کر کے اس وہم وخیال کا ازالہ کر دیا ہے اور یہ تصریح کر دی کہ رسول کی اطاعت مستقل ہے، اللہ کی اطاعت کے تابع نہیں ہے اس سے منکرین حدیث کے اس قول کی نکارت واضح ہوگئی کہ کسی حدیث کو قبول کرنے سے پہلے اس کو قرآن پر پیش کیا جائے گا؛ اگر وہ قرآن کے مطابق ہوگی تو قبول کر لی جائے گی ورنہ رد کر دی جائے گی۔

فعل امر ﴿أطیعوا﴾ کی تکرار سے یہ ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی طرح رسول اللہ ﷺ بھی آمر وناہی ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے اوامر ونواہی میں رسول اللہ ﷺ کی اطاعت اللہ ہی کی طاعت ہے، رسول کی نہیں، لہٰذا اطیعوا کی اس تکرار نے یہ مبرہن کر دیا کہ رسول کی مستقل اطاعت بھی فرض ہے اور یہ مستقل اطاعت اس صورت میں وقوع پذیر ہوگی جب یہ تسلیم کیا جائے کہ نبی ﷺ کی ایک حیثیت تو شارح قرآن اور مبین قرآن کی تھی اور دوسری حیثیت شارع کی بھی تھی اور یہ دونوں حیثیتیں کتاب اللہ سے ثابت ہیں، جن کا انکار خود قرآن کا انکار ہے۔

۲۔ جس طرح اور جس درجہ قرآن کی اتباع ضروری ہے اس طرح اور اسی درجہ میں حدیث اور سنت کی بھی اتباع ضروری ہے:

﴿قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ﴾ (آل عمران: ۳۱)

''کہہ دو! اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو اللہ تم سے محبت کرے گا۔''

تمام محبتوں کی بنیاد اور اساس اللہ سے محبت ہے اور اس محبت کی صحت اور صداقت کو جانچنے کی شرط اور معیار اتباع رسول ہے، اگر کوئی متبع رسول نہیں ہے تو وہ اللہ سے اپنی محبت کے دعوے میں جھوٹا ہے، اور رسول اللہ ﷺ کی پیروی اور اتباع کے معنی ہیں اس شریعت اور طریقے پر چلنا جس پر آپ تھے اور عقیدہ، قول، فعل اور ترک فعل میں آپ کی پیروی کرنا۔

عقیدے میں رسول اللہ ﷺ کی پیروی کا مطلب ہے کہ اللہ سے محبت کا دم بھرنے والے کا وہی عقیدہ ہو جو رسول اللہ ﷺ اور آپ کے اصحاب کا عقیدہ تھا۔

قول میں آپ کی پیروی کے معنی ہیں کہ اس کی باتیں شریعت کے مطابق اور اس کے دائرہ میں ہوں۔

فعل میں نبی ﷺ کی پیروی یہ ہے کہ دینی اور شرعی اعمال بے کم وکاست شرع کے مطابق ہوں؛ نہ کم نہ زیادہ۔

ترک فعل میں رسول اللہ ﷺ کی اتباع کے معنی ہیں کہ جس عمل کو بھی آپ نے بطور عبادت نہیں کیا ہے اس کو عبادت نہ بنایا جائے۔

Marfat.com

سورۂ اعراف میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا الَّذِي لَهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ يُحْيِي وَيُمِيتُ فَآمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ النَّبِيِّ الْأُمِّيِّ الَّذِي يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَكَلِمَاتِهِ وَاتَّبِعُوهُ﴾ (الاعراف: ۱۵۸)

''کہہ دو اے لوگو! درحقیقت میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں آسمانوں اور زمین کی بادشاہی جس کی ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں وہ زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے، لہٰذا تم اللہ پر اور اس کے رسول، نبی امی پر ایمان لاؤ، جو اللہ اور اس کی باتوں پر ایمان رکھتا ہے اور اس کی پیروی کرو۔''

ان دونوں آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کی مطلق اتباع اور پیروی کا حکم دیا ہے، یہ نہیں فرمایا ہے کہ رسول کی پیروی ان باتوں میں کرو جن کی اصل کتاب اللہ میں موجود ہو اور یہ معلوم ہے کہ سنت کی پیروی رسول ہی کی پیروی ہے۔

۳۔ نبی کریم ﷺ کے حکم کی خلاف ورزی کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ نے یہ وعید سنائی ہے کہ اس کی پاداش میں وہ ان کو مبتلائے فتنہ اور مبتلائے عذاب کرے گا:

﴿فَلْيَحْذَرِ الَّذِينَ يُخَالِفُونَ عَنْ أَمْرِهِ أَنْ تُصِيبَهُمْ فِتْنَةٌ أَوْ يُصِيبَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ﴾ (النور: ۶۳)

''تو جو لوگ اس کی حکم عدولی کرتے ہیں اس سے بچیں کہ ان کو کوئی فتنہ اپنی لپیٹ میں لے لے یا ان کو کوئی دردناک عذاب آلے۔''

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ''امر'' کی اضافت اور نسبت رسول اللہ ﷺ کی طرف کی ہے جس سے جہاں یہ ثابت ہوتا ہے کہ قرآن کی رو سے آپ کا آمر وناہی ہونا ثابت ہے، وہیں یہ بھی ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے اوامر ونواہی اپنے حکم میں اللہ تعالیٰ ہی کے اوامر ونواہی کی طرح ہیں۔

۴۔ نبی کریم ﷺ کو اپنے معاملات میں حاکم، قاضی اور فیصلہ کرنے والا نہ ماننے والا مومن نہیں ہے، حتیٰ کہ جو شخص آپ کے کسی حکم اور فیصلہ پر دل میں کوئی تنگی اور انقباض بھی محسوس کرے تو یہ دل ایمان سے خالی ہے:

﴿فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا﴾ (النساء: ۶۵)

''پس نہیں، تمہارے رب کی قسم وہ مومن نہیں ہو سکتے یہاں تک کہ تمہیں اپنے جھگڑوں میں اپنا حکم بنالیں، پھر تم جو فیصلہ کرو اس سے اپنے دلوں میں کوئی تنگی محسوس نہ کریں اور مکمل طور پر اسے تسلیم کرلیں۔''

غور فرمائیے، یہ حکم بیان کرنے سے پہلے رب رسول کی قسم اور ''لا'' کے ذریعے اس کی تاکید فرمادی گئی ہے، تاکہ حکم کی اہمیت کا پہلے ہی سے احساس رہے۔

Marfat.com

اس آیت کا مفہوم اور مدلول سمجھنے کے لیے اسی سورت کی آیت نمبر ۵۹ پیش نظر رہنی چاہیے جس میں پہلے تو اللہ اور رسول کی الگ الگ اطاعتوں کا حکم دیا گیا ہے، پھر کسی معاملے میں نزاع اور جھگڑا ہو جانے کی صورت میں متنازع مسئلہ کو اللہ ورسول کی طرف لوٹانے اور پھیرنے کا حکم دیا گیا ہے: ﴿فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُولِ﴾ اور یہ فرما کر: ﴿إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ﴾ اس کو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان کا تقاضا قرار دیا گیا ہے۔

یہاں یہ بتانا تحصیل حاصل ہے کہ اللہ تعالیٰ کے پاس کوئی مسئلہ لے جانا نہ پہلے ممکن تھا اور نہ آج ممکن ہے، لہٰذا اس سے مراد ''قرآن کی عدالت'' ہے، البتہ رسول اللہ ﷺ کی حیات پاک میں آپ سے رجوع کرنا ممکن تھا اور صحابہ کرام اپنے نزاعی مسائل آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر پیش بھی کرتے تھے، لیکن آپ کی وفات کے بعد ذاتی طور پر آپ سے رجوع کرنا ممکن نہیں رہا، جبکہ یہ شرعی حکم قائم ہے اور قیامت تک قائم وباقی رہے گا۔ لہٰذا اس حکم کی تعمیل صرف آپ کی سنت یا حدیث کی طرف رجوع کر کے ہی کی جا سکتی ہے اور سابقہ آیت میں اللہ تعالیٰ نے آپ کی مستقل اطاعت کا حکم دے بھی دیا ہے۔ اس حکم ربانی سے یہ بھی معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کی سنت یا حدیث محفوظ ہے، ورنہ یہ حکم ربانی ناقابل تعلیم ہوگا!!!

۵۔ ۴ ہجری میں رسول اللہ ﷺ نے مدینہ منورہ میں سکونت پذیر یہودی قبیلہ بنونضیر کی شر انگیزیوں کے نتیجے میں اس کا محاصرہ کر لیا اور صرف چند روز کے محاصرے کے بعد یہ قبیلہ اس شرط پر مدینہ چھوڑ دینے پر راضی ہو گیا کہ وہ اسلحوں کے سوا جو کچھ بھی اپنے اونٹوں پر لاد کر لے جا سکے گا لے جائے گا، بقیہ سازوں مان چھوڑ دے گا اس طرح کسی لڑائی کے بغیر اس قبیلہ کے اموال نبی کریم ﷺ کے قبضہ میں آ گئے، کسی دشمن سے لڑائی کے بغیر جو مال قبضہ میں آئے اس کو ''فَـىْ'' کہتے ہیں، اس ''فـَىْ'' کے مال کو نبی ﷺ نے مسلمانوں میں تقسیم کر دیا جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب عزیز میں ایک واقعہ کے بجائے ایک شرعی قاعدہ اور ضابطہ کی صورت میں کیا ہے، ارشاد ربانی ہے:

﴿وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا﴾ (الحشر: ۷)

''اور رسول تمہیں جو دے تو وہ لے لو اور جس سے تمہیں روکے باز رہو۔''

قرآن کا یہ اصولی بیان رسول اللہ ﷺ کے حکم اور فیصلہ سے متعلق ایک شرعی ضابطہ کی حیثیت رکھتا ہے جس کی دلیل یہ ہے کہ: ﴿مَا آتٰكُمْ﴾ کو اگر واقعہ کے تناظر میں دیکھا جائے اور لیا جائے تو اس کا مقابل ﴿مَا مَنَعَكُمْ﴾ ہونا چاہیے، جبکہ اس کے بالمقابل ﴿مَا نَهَاكُمْ عَنْهُ﴾ کی تعبیر اختیار فرمائی گئی ہے جس سے یہ حکم دینا مقصود ہے کہ نبی کریم ﷺ کے امر و نہی کی اطاعت کرو، یعنی اگرچہ یہ آیت ایک خاص واقعہ سے متعلق ہے، مگر رسول اللہ ﷺ کے احکام کی بجا آوری سے متعلق ایک شرعی قاعدہ کلیہ ہے۔

میں نے ابھی جو کچھ عرض کیا ہے اس کو مثال سے سمجھئے۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے میراث کا مسئلہ بیان کرنے کے بعد فرمایا ہے:

Marfat.com

﴿تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ وَ مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ○ وَ مَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ يَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيْهَا وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ﴾ (النساء: ۱۳۔ ۱٤)

''یہ اللہ کی حدیں ہیں اور جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے گا وہ اس کو ایسی جنتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور یہی بہت بڑی کامیابی ہے اور جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا اور اس کی حدوں سے تجاوز کرے گا وہ اسے آگ میں داخل کرے گا جس میں وہ ہمیشہ رہے گا اور اس کے لیے رسوا کرنے والا عذاب ہے۔''

دراصل اطاعت اللہ اور اطاعت رسول ایک مومن کے لیے لازم وملزوم کا درجہ رکھتی ہیں اور جہاں کہیں اللہ تعالیٰ نے صرف رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کا حکم دیا ہے تو اس حکم میں اس کی اطاعت داخل ہوتی ہے اس لیے کہ آپ نے جو شرعی حکم بھی دیا ہے۔ اللہ کے حکم ہی سے دیا ہے اور ایسا اس وقت ہے جب آپ نے کوئی ایسا حکم دیا ہو جو قرآنی حکم کے علاوہ ہو۔

مذکورہ بالا وضاحت سے معلوم ہوا کہ سورۂ حشر میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کے جس امر و نہی کا ذکر فرمایا ہے وہ قرآنی امر و نہی کے علاوہ ہے جس کو رسول اللہ ﷺ نے اپنے ایک ارشاد سے بھی بیان فرما دیا ہے:

((إذا أمرتكم بأمر فأتوا منه ما استطعتم، وإذا نهيتكم عن شيء فاجتنبوه.))

''جب میں تمہیں کسی بات کا حکم دوں تو اپنے مقدور بھر اس کو بجا لاؤ اور جس چیز سے روک دوں اس سے اجتناب کرو۔'' ❶

نتیجہ بحث:

اوپر قرآن پاک کی آیتوں کی روشنی میں جو کچھ عرض کیا گیا ہے اس سے درج ذیل باتیں ثابت ہوتی ہیں:

۱۔ نبی ﷺ مبلغ قرآن تھے۔

۲۔ نبی ﷺ قرآنی آیات کے شارح اور مبین تھے۔

۳۔ نبی ﷺ اپنے قول وفعل میں متبع وحی تھے، اور وحی صرف قرآن نہیں ہے، بلکہ سنت بھی وحی ہے۔

۴۔ نبی ﷺ قرآن کے شارح اور مبین ہونے کے ساتھ مستقل بالذات شارع بھی تھے، اب یہ مقام حدیث کو حاصل ہے۔

۵۔ نبی ﷺ حاکم اور لوگوں کے معاملات اور نزاعات کا فیصلہ کرنے والے بھی تھے، اب یہ منصب حدیث کو حاصل ہے جس کو ماننا صحت ایمان کی شرط ہے۔

❶ بخاری: ۷۲۸۸ و مسلم: ۱۳۳۷

Marfat.com

۶۔ سنت صرف قرآن کی تشریح وتبیین ہی نہیں، بلکہ مستقل تشریعی ماخذ بھی ہے۔

۷۔ نبی ﷺ پر بصورت وحی صرف قرآن نہیں نازل ہوتا تھا، بلکہ سنت بھی نازل ہوتی تھی۔

۸۔ مذکورہ بالا تمام حیثیتوں میں آپ مطاع تھے، ہیں اور قیامت تک رہیں گے اور سنت کی شکل میں آپ کی اتباع اور پیروی فرض تھی، ہے اور قیامت تک رہے گی۔

۹۔ قرآن کی طرح سنت اور حدیث بھی محفوظ ہے، ورنہ آپ کی اطاعت واتباع کا قرآنی حکم ناقابل عمل اور عبث قرار پائے گا۔

۱۰۔ ایک غیر مسلم اللہ ورسول پر ایمان لانے اور ایمان نہ لانے میں آزاد ہے، اس کو ایمان کی دعوت تو دی جائے گی، مگر مجبور نہیں کیا جائے گا، کیونکہ مجبوری کے ایمان کا کوئی اعتبار نہیں ہے، لیکن جس کا دعویٰ ہے کہ وہ مومن اور مسلمان ہے اپنے اس دعویٰ کی رو سے وہ قرآن کے ساتھ حدیث اور سنت کو بھی اس کے بالکل مساوی درجہ میں ماخذ شرع ماننے کا پابند ہے اور قرآن نبی ﷺ کی اطاعت کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی طرح فرض قرار دیتا ہے اور یہ دونوں اطاعتیں قرآن وسنت دونوں کے احکام کی پابندی کر کے ہی وجود پا سکتی ہیں، لہٰذا کسی بھی درجہ میں سنت یا حدیث کا انکار قرآن کا بھی انکار ہے۔

۱۱۔ شاطبی کا یہ دعویٰ کہ سنت اپنے مفہوم ومدعا میں قرآن کی طرف لوٹتی ہے، اس لیے کہ وہ قرآن کی تشریع اور بیان کے سوا کچھ نہیں ہے، خود قرآن کی رو سے باطل ہے۔

سنت اور امام شافعی رحمہ اللہ:

الطاف احمد اعظمی صاحب نے سنت کے صرف قرآن کی تفسیر وتشریع اور بیان ہونے پر بطور دلیل ایک قول امام شافعی رحمہ اللہ کی طرف منسوب بھی نقل کیا ہے پہلے میں یہ قول اور اس کا ترجمہ نقل کر دینا چاہتا ہوں، پھر اس پر تبصرہ کروں گا۔

((كل ما حكم به رسول الله ﷺ فهو لما فهمه من القرآن .))

''رسول اللہ ﷺ نے جو حکم بھی دیا ہے وہ قرآن ہی سے ماخوذ ہے۔''

اس قول پر کوئی تبصرہ کرنے سے پہلے یہ عرض کر دوں کہ: ''حکم دیا ہے'' ''حکم بہ'' کا ترجمہ نہیں ہے، بلکہ ''امر بہ'' کا ترجمہ ہے ''حکم بہ'' کا ترجمہ ہے: فیصلہ کیا ہے، اردو میں ہم جس چیز کو ''حکم'' کہتے ہیں، عربی میں اس کے لیے ''امر'' کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔

اس قول کی نسبت امام شافعی رحمہ اللہ کی طرف صحیح نہیں ہے، اگرچہ شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی کتاب: ''مقدمہ فی تفسیر القرآن'' میں اس کا حوالہ دیا گیا ہے۔ ❶ اور یہ ان کا قول ہو بھی نہیں ہو سکتا، کیونکہ انہوں نے ''الرسالہ'' اور ''الأم'' میں سنت کی شرعی حیثیت کے بارے میں جو کچھ بیان کیا ہے یہ قول اس سے ٹکراتا ہے۔

❶ ص ۱۲۷

Marfat.com

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی کتابیں بحر ناپیدا کنار کا درجہ رکھتی ہیں، جہاں وہ اپنی کتابیں اپنے قلم سے تحریر فرماتے تھے وہیں ان کو املا بھی کراتے تھے، جہاں تک شرعی نصوص کا معاملہ ہے تو بلاشبہ وہ ان کے لوح قلب پر نقش تھیں، پھر بھی بعض حدیثیں دوسرے الفاظ میں بھی نقل ہوگئی ہیں جس کا اصطلاحی نام ''روایت بالمعنی'' ہے۔

رہے ائمہ سے منسوب اقوال تو ان میں تبدیلی ایک قدرتی امر ہے، مزید یہ کہ مسودات کے ناقلین (ناسخین) کے سہو کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

اگر مذکورہ قول امام شافعی کا ہوتا بھی تب بھی وہ ہمارے لیے حرف آخر یا علمی دلیل اور حجت نہیں تھا، ام المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا کے قول: ((کـان خُلُقُه القرآن)) کے بارے میں یہ عرض کر چکا ہوں کہ یہ مرفوع حدیث نہ ہونے کی وجہ سے شرعی حجت نہیں ہے۔ اور اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ ان کو سورۂ فاتحہ سے لے کر سورۂ ناس تک قرآن پاک کے تمام معانی اور مطالب کا استحضار تھا، ہم کسی کے بارے میں بھی یہ عقیدہ نہیں رکھتے، دراصل ام المؤمنین رضی اللہ عنہا نے اس مختصر قول میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں اپنا عقیدہ بیان فرمایا ہے، جو دوسرے لفظوں میں یہ تھا کہ آپ کا خلق قرآن کے مطابق تھا اس کے خلاف نہیں تھا۔ "خُـلُـق" کے بارے میں عرض کر چکا ہوں کہ عربی میں ''خلق'' اس صفت کو کہتے ہیں جس سے اقوال وافعال وجود پاتے ہیں، اور چونکہ قرآن کی رو سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مبلغ قرآن بھی تھے، شارح قرآن بھی تھے۔ مستقل حاکم وشارع بھی تھے، آمر وناہی بھی تھے۔ اور محلل ومحرم بھی تھے، اس لیے ان تمام حیثیتوں میں آپ کا خلق قرآن تھا اس طرح خود ام المؤمنین کے قول کی رو سے قرآن کے ساتھ سنت بھی شرعی حجت ودلیل ہے، اس لیے کہ قرآن میں سنت داخل ہے اور آپ کا خلق قرآن تھا۔

امام شافعی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ''الرسالہ'' میں پوری تفصیل سے یہ بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کتاب اللہ کے ساتھ بھی شرعی طریقہ مقرر کیا ہے اور ان امور کے بارے میں بھی طریقہ مقرر فرمایا ہے جن کے حق میں بالذات کوئی قرآنی نص نہیں ہے۔'' ❶

''اور وہ طریقہ جو آپ نے مقرر فرمایا ہے اللہ نے اس کی پیروی ہمارے اوپر لازمی کر دی ہے، اور آپ کی اتباع اور پیروی میں اپنی اطاعت رکھ دی ہے اور آپ کی سنت کی خلاف ورزی کو اپنی نافرمانی اور معصیت قرار دے دی ہے جس میں کسی کو بھی معذور نہیں گردانا ہے۔'' ❷

آگے اس کی مزید تفصیل بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

کتاب اللہ کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سنن کی دو صورتیں ہیں:

۱۔ اللہ کی کتاب کی نص موجود ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی اس طرح پیروی کی ہے جس طرح اللہ نے اس کو

---

❶ فقرہ: ۲۹۳ ❷ فقرہ: ۲۹۴، ص ۹۵-۹۶

Marfat.com

نازل فرمایا ہے۔

۲۔ کتاب اللہ میں اجمالی حکم بیان ہوا ہے اور رسول اللہ ﷺ نے اس اجمالی مفہوم کو اللہ کی مراد کے مطابق بیان کر دیا ہے اور یہ واضح فرمایا دیا ہے کہ اس حکم کی فرضیت عام ہے یا خاص، اور اللہ تعالیٰ کی مراد کے مطابق بندوں کو یہ حکم کس طرح بجالانا ہے۔

اس کے بعد امام شافعی نے لکھا ہے کہ سنت کی ان دونوں صورتوں کے بارے میں اہل علم کا کوئی اختلاف نہیں ہے۔

لیکن ایک تیسری صورت سنت کی وہ ہے جس کے بارے میں کتاب اللہ میں کوئی نص نہیں ہے تو اس سے متعلق علماء کے کئی گروہ ہیں:

۱۔ ایک گروہ کا قول ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس چیز میں رسول اللہ ﷺ کی اطاعت فرض کی ہے اس کو اپنے ازلی علم میں یہ معلوم تھا کہ آپ کو اس کی رضا کے لیے یہ توفیق ملے گی کہ آپ ان امور میں شرعی طریقہ مقرر فرمائیں گے جن کے حق میں کتاب اللہ میں کوئی نص نہیں ہوگی۔

۲۔ دوسری جماعت کا دعویٰ ہے کہ آپ نے جو طریقہ بھی مقرر فرمایا ہے اس کی اصل کتاب اللہ میں موجود ہے، جیسا کہ آپ نے نمازوں کی تعداد اور ان کو ادا کرنے کا طریقہ بیان فرمایا ہے، جبکہ نماز کی فرضیت کی اصل اجمالی شکل میں قرآن میں موجود ہے، اس طرح بیع وشراء کے احکام بھی ہیں۔

۳۔ تیسرے گروہ کا خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس منصب رسالت پر آپ کو فائز کیا ہے اس میں یہ بات داخل ہے اس طرح اللہ کے فرض کرنے سے یہ سنت فرض ہوئی ہے۔

۴۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جو شرعی طریقہ بھی مقرر فرمایا ہے وہ سب آپ کے دل میں ڈال دیا گیا ہے اور آپ کی سنت وہ حکمت ہے جو اللہ کی طرف سے آپ کے دل میں ڈالی گئی ہے، لہٰذا جو چیز آپ کے دل میں ڈالی گئی ہے وہی آپ کی سنت ہے۔ [1]

اور کتاب ''الأم'' میں امام شافعی نے ایک سائل کا یہ سوال نقل کیا ہے۔

کیا رسول اللہ ﷺ کی سنت بھی ''وحی'' ہے؟

اس سوال کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

''رسول اللہ ﷺ نے کوئی بھی چیز وحی کے بغیر فرض نہیں کی ہے، وحی کی ایک قسم وہ ہے جس کی تلاوت کی جاتی ہے اور ایک وحی رسول اللہ ﷺ کی طرف ایسی کی جاتی تھی جس کے ذریعہ آپ شرعی طریقہ مقرر فرماتے تھے۔'' [2]

---

[1] فقرہ نمبر ۲۹۸۔۳۰۵، ص ۹۷۔۹۹
[2] ص: ۱۵۸۷۔۱۵۸۸

Marfat.com

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''سنت بھی قرآن کی طرح بذریعہ وحی نازل ہوتی تھی، لیکن قرآن کی طرح اس کی تلاوت نہیں کی جاتی تھی، یا اس کی تلاوت نہیں کی جاتی۔'' ❶

الرسالہ اور الأم کی عبارتوں سے جہاں یہ بات واضح ہوگئی کہ سنت صرف قرآن کی تشریح و بیان نہیں، بلکہ مستقل تشریع ہے وہیں یہ بھی معلوم ہو گیا کہ قرآن کی طرح سنت بھی وحی ہے۔

فتنہ کیا ہے؟

اعظمی صاحب کی جسارت ملاحظہ ہو:

''اس گفتگو سے واضح ہو گیا کہ حقیقی معنی میں وحی کا اطلاق صرف قرآن پر ہوگا جو لفظاً اور معناً دونوں طرح محفوظ ہے، ہمارے بہت سے علماء کی غلطی یہ ہے کہ انہوں نے دونوں طرح کی وحی پر ایک ہی حکم لگا دیا، نتیجہ کے طور پر وہ خود بھی فتنہ میں پڑے اور مسلمانوں کی ایک کثیر تعداد کو بھی مبتلائے فتنہ کیا۔'' ❷

میں یہ واضح کرنے سے قبل کہ فتنہ کیا ہے اس اصل مقصد کی طرف اشارہ کر دینا چاہتا ہوں جس کی خاطر اعظمی صاحب نے یہ ساری ہرزہ سرائیاں کی ہیں۔

اعظمی کی ہرزہ سرائیاں:

اعظمی صاحب نے اپنے اس مضمون ''وحی کی حقیقت'' سے جو ثابت کرنے کی سعی لا حاصل کی ہے وہ صرف یہ ہے کہ سنت یا حدیث کو ''وحی'' کی صفت نہیں حاصل تھی، بلکہ یہ صفت صرف قرآن کو حاصل ہے۔ موصوف اور ان کے ہمنوا دوسرے ''مجددین'' ایسا قرآن کی محبت میں نہیں کرتے، بلکہ سنت کی تشریعی حیثیت کے انکار میں کرتے ہیں، لیکن تاثر یہ دیتے ہیں کہ وہ ایسا قرآن کی محبت اور احترام میں کرتے ہیں، جبکہ امر واقعہ یہ ہے کہ قرآن کی یہ محبت اور احترام محض ایک فریب ہے جو یہ لوگوں کو دینا چاہتے ہیں، ورنہ اگر ان کو قرآن سے حقیقی محبت ہوتی اور ان کے دل میں قرآن کا معمولی سا بھی احترام ہوتا تو یہ قرآن کی طرح سنت کو بھی وحی مانتے اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ کے تمام مناصب رسالت قرآن ہی میں بیان کیے گئے ہیں جن میں قرآن میں غیر منصوص شرعی احکام کا بیان بھی داخل ہے، اس طرح سنت چاہے وہ نص قرآن کی پابندی سے عبارت ہو، یا اس کے اجمال کی تفصیل و تبیین سے یا قرآن میں غیر منصوص شرعی احکام سے، سب میں وہ قرآن ہی کی طرح واجب العمل ہے اور اللہ تعالیٰ کے حکم سے واجب العمل ہے، لہٰذا یہ لازم قرار پایا کہ نبی کریم ﷺ کا ہر شرعی قول و فعل مبنی بر وحی ہو۔

کلام اور وحی:

اعظمی صاحب نے یہ مغالطہ دینے کی کوشش کی ہے یا ان کو معلوم نہیں کہ ہر وحی کا اللہ کا کلام ہونا ضروری نہیں ہے، اسی وجہ

❶ مجموع الفتاوی، ص: ۳۶۳۔۳۶۴، ج ۱۳ ❷ ص ۳۳

Marfat.com

سے انہوں نے کبھی تو قرآن اور وحی کو مترادف قرار دیا ہے، کبھی قرآن کو حقیقی وحی سے تعبیر سے کیا ہے اور بقیہ وحیوں کو ''لغوی وحی'' بتایا ہے۔ اور کبھی سنت کو ''وحی'' کی دائرہ سے نکال کر اس کو بصیرت نبوی کہا ہے، یہ ساری بکواس انہوں نے اس وجہ سے کی ہے کہ انہوں نے کلام اور وحی کو ایک سمجھ لیا اگر ان کو یہ معلوم ہوتا کہ کسی چیز کے وحی ہونے سے اس کے اللہ کا کلام ہونا لازم نہیں آتا، اس لیے کہ کلام اللہ تعالیٰ کی صفت ہے اور قرآن پاک حقیقی معنی میں یا حقیقت میں اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔ حروف، الفاظ اور معانی سب میں اللہ تعالیٰ کا کلام ہے جس کے مشابہ اور ہم مثل کلام بنانا، اور گھڑنا جن وانس کی استطاعت سے باہر ہے۔

قرآن کے اللہ کا کلام ہونے کا سبب اس کا وحی ہونا نہیں ہے۔

قرآن اس وجہ سے اللہ کا کلام نہیں ہے کہ وہ وحی ہے، بلکہ ''وحی'' ایک فعل ہے جس کے ذریعہ وہ رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوا ہے۔ جب ہم قرآن کی تعبیر وحی سے کرتے ہیں تو ''وحی'' سے مراد ''موحیٰ'' اسم مفعول ہوتا ہے یعنی جو وحی کیا گیا ہے، وحی کے ذریعہ نبی ﷺ کے قلب پر جبریل علیہ السلام کے واسطہ سے نازل کیا گیا ہے، اسی طرح جب قرآن پر تنزیل کا اطلاق کیا جاتا ہے تو مراد ''منزل'' اسم مفعول ہوتا ہے۔

قرآن کے لیے ''وحی'' کے مقابلے میں ''انزال اور تنزیل'' کی تعبیرات زیادہ استعمال ہوتی ہیں جس سے اللہ تعالیٰ کی صفت ''علو'' کا اظہار مقصود ہے جس سے اس کا صفاتی نام ''العلی'' بنا ہے مطلب یہ ہے کہ قرآن اوپر سے نازل ہوا ہے، اللہ تعالیٰ کی صفت علو یا سب پر بلند ہونے کی اہمیت کا اندازہ اس آیت سے لگایا جا سکتا ہے جس میں علوی مخلوق ''فرشتوں'' کی صفت بیان ہوئی ہے ارشاد ربانی ہے:

﴿يَخَافُونَ رَبَّهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ﴾ (النحل: ۵۰)

''وہ اپنے اس رب سے ڈرتے ہیں جو ان کے اوپر ہے اور انہیں جو حکم دیا جاتا ہے وہ بجالاتے ہیں۔''

ہر وحی حقیقی تھی:

قرآن پاک میں جتنی وحیوں کا ذکر آیا ہے سب حقیقی وحیاں ہیں، حتیٰ کہ شہد کی مکھی کو کی جانے والی وحی بھی حقیقی ہے، البتہ ''وحی جبلی تکوینی'' ہے جس پر عمل کرنے پر وہ مجبور ہے جن انبیائے کرام صلوٰۃ اللہ وسلام علیہم کو وحی کیے جانے کا ذکر قرآن پاک میں آیا ہے وہ سب حقیقی وحیاں ہیں، لغوی وحیاں یا بصیرت نبوی یا تدبیر نبوی سے عبارت نہیں ہیں۔

یوسف آیت کو جب ان کے بھائیوں نے کنویں میں ڈالنا چاہا تو اس لمحہ اللہ نے ان کو وحی کی:

﴿فَلَمَّا ذَهَبُوا بِهِ وَأَجْمَعُوا أَنْ يَجْعَلُوهُ فِي غَيَابَتِ الْجُبِّ وَأَوْحَيْنَا إِلَيْهِ لَتُنَبِّئَنَّهُمْ بِأَمْرِهِمْ هَذَا وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ﴾ (یوسف: ۱۵)

''پس جب وہ اسے لے گئے اور اسے اندھے کنویں میں ڈالنے کا حتمی فیصلہ کر لیا، عین اسی لمحہ میں ہم نے اس کی طرف وحی کی کہ تو یقیناً ان کو ان کے اس کرتوت کی خبر دے گا، جبکہ وہ اس کا احساس تک نہ رکھتے ہوں گے۔''

Marfat.com

کیا یہ حقیقی وحی نہیں تھی، بلکہ لغوی وحی تھی؟ کیا لغوی وحی سے کوئی یہ جان سکتا ہے کہ چند لمحے بعد اس کے کیا حالات ہوں گے؟ یہاں تو چالیس سال بعد رونما ہونے والے حالات کی ان کو اطلاع دی گئی ہے۔

نوح آیت کے بارے میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

﴿فَاَوْحَيْنَا اِلَيْهِ اَنِ اصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا﴾ (المومنون: ۲۷)

''پس ہم نے اس کی طرف وحی کی کہ ہماری آنکھوں کے سامنے اور ہماری وحی کے مطابق کشتی بنا۔''

کیا یہ لغوی وحی تھی، حقیقی وحی نہیں تھی یا تدبیر نبوی تھی؟ کیا کوئی شخص وہ رسول ہی کیوں نہ ہو لغوی وحی کے ذریعہ یہ جان سکتا ہے کہ زمین میں تباہ کن طوفان آنے والا ہے اور اہل ایمان کو اس سے بچانے کے لیے ایک خاص قسم کی کشتی درکار ہے؟ پھر یہ لغوی وحی ہوتی کیا ہے؟!!

سورۂ قیامہ میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو یہ حکم دینے کے بعد کہ: ''جب ہم اسے پڑھیں تو تم اس کے پڑھنے کی پیروی کرو۔'' (۱۸) آپ سے جو یہ وعدہ فرمایا تھا: ﴿ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ﴾ ''پھر درحقیقت اسے بیان کر دینا ہمارے ذمہ ہے۔'' (۱۹) تو قرآن کی تفسیر و بیان سے اس نے آپ کو کس ذریعہ سے آگاہ فرمایا تھا یا کس ذریعہ سے اس کی آپ کو تعلیم دی تھی؟ براہ راست تو نہیں، کیونکہ وہ اپنی کتاب میں یہ اعلان فرما چکا ہے کہ وہ کسی انسان سے براہ راست بات نہیں کرتا، اگر ہم آپ کی یہ بات مان لیں کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کے بیان کو نبی ﷺ کے دل میں ڈال دیا تھا تب بھی حقیقت نفس الامری نہیں بدلتی، کیونکہ یہاں جو مسئلہ ہے وہ قرآن کے بیان کا مسئلہ ہے جس کا ذمہ اللہ نے لیا ہے، یہ بیان قرآن میں تو نہیں ہے، اگر ہے تو کوئی یہ بتائے کہ قرآن کا کون حصہ ''متن'' کا ہے اور کون شرح و بیان کا، لہٰذا یہ ماننا پڑے گا کہ رسول اللہ ﷺ قرآن کی جو تفسیر، توضیح اور تبیین فرماتے تھے وہ بہر حال آپ کی اپنی اپج، صوابدید اور بصیرت نہیں تھی، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کی نسبت اپنی طرف کی ہے: ﴿ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ﴾

آپ تھوڑی دیر کے لیے چھوڑیے وحی متلو اور وحی غیر متلو کی بحث اور اس کی عقلی توجیہ، صرف یہ بتا دیجئے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنا وعدہ پورا کیا یا نہیں؟ ہمارا تو اس بات پر ایمان ہے کہ اس نے اپنا وعدہ پورا کیا، اس لیے کہ وہ اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا: ﴿وَعْدَ اللّٰهِ لَا يُخْلِفُ اللّٰهُ الْمِيْعَادَ﴾ ''اللہ کا وعدہ ہے اور درحقیقت اللہ اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا۔'' (سورۂ الزمر: ۲۰) اور یقیناً اس نے اپنا وعدہ پورا کیا اور بذریعہ وحی رسول اللہ ﷺ کو قرآن کا بیان سکھایا۔

میں نے ابھی جو کچھ عرض کیا اس کی دلیل یہ ہے کہ نبی ﷺ وحی کے پابند تھے:

﴿وَّاتَّبِعْ مَا يُوْحٰٓى اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا﴾ (الاحزاب: ۲)

''اور تم اس چیز کی پیروی کرو جو تمہاری طرف تمہارے رب کی طرف سے وحی کی جاتی ہے درحقیقت اللہ جو

Marfat.com

کچھ تم کرتے ہو اس سے پوری طرح باخبر ہے۔"

﴿اِتَّبِعْ مَآ اُوْحِیَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَ اَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِیْنَ﴾ (الانعام: ١٠٦)

"اس کی پیروی کرو جو تمہاری طرف تمہارے رب کی جانب سے وحی کی گئی ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور مشرکین سے اعراض برتو۔"

یہ آیتیں یہ بتا رہی ہیں کہ نبی ﷺ وحی کے متبع اور پابند تھے اور وحی صرف قرآن نہیں ہے، بلکہ بحیثیت رسول آپ کو قرآن کے علاوہ اور اس کے باہر سے جو ہدایات بھی ملتی تھیں وہ بھی وحی کے ذریعہ ملتی تھیں، میرے اس دعویٰ کی دلیل تمام انبیاء اور رسولوں کو کی جانے والی وہ وحیاں ہیں جو ان پر نازل ہونے والی کتابوں کے علاوہ تھیں جن میں سے یوسف ونوح علیہما السلام کو کی جانے والی وحیوں کی مثالیں اوپر گزر چکی ہیں۔ غیر قرآن کے وحی کے ہونے کی سب سے مضبوط اور قوی دلیل وہ وحی ہے جو موسیٰ علیہ السلام کی ماں کو کی گئی تھی یہ حقیقی اور یقینی وحی تھی، آپ کی من گھڑت لغوی وحی بھی نہیں تھی اور صوفیا کا الہام بھی نہیں تھی، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو بصراحت وحی کرنے کے جس فعل کو اپنی طرف منسوب فرمایا ہے اور اس میں ان سے جن باتوں کا وعدہ فرمایا ہے ان کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو تھا اور وہی ان کو پورا بھی کر سکتا تھا اور اس نے ان کو حرف بحرف پورا بھی کیا۔ یہ وحی یقیناً کتاب اللہ، تورات بھی نہیں تھی، اس لیے کہ موسیٰ علیہ السلام کی ماں نبی بھی نہیں تھیں اور تورات نازل بھی نہیں ہوئی تھی!!

میں نے اوپر قرآن وسنت دونوں کے وحی ہونے کے جو دلائل قرآن پاک سے دیے ہیں۔ قارئین سے درخواست ہے کہ وہ ان کے اور اعظمی صاحب کی ذاتی رائے اور سر سیّد کے اقوال کے درمیان موازنہ کر کے یہ فیصلہ کریں کہ وحی کا اطلاق قرآن وحدیث دونوں پر کرنا درست اور کتاب اللہ کے مطابق ہے یا صرف قرآن کو وحی قرار دینا اور حدیث کو بصیرت نبوی کہنا صحیح ہے؟

فتنہ وہ نہیں یہ ہے:

اعظمی صاحب نے بڑے طمطراق اور ڈھٹائی سے قرآن اور سنت دونوں کو وحی قرار دینا بہت سے علماء کی غلطی بتایا ہے اور اس کو بہت بڑا فتنہ قرار دیا ہے، علماء سے ان کی مراد محدثین ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا قرآن وحدیث کی نصوص پر اعتماد کر کے کوئی بات کہنا فتنہ ہے یا دین کے اتنے اہم اور بنیادی موضوع پر اپنے ذاتی ذوق وپسند سے لب کشائی کرنا فتنہ ہے؟

﴿وَ مَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰىهُ بِغَیْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ﴾ (القصص: ٥٠)

"اور اس سے بڑھ کر گمراہ کون ہے جو اللہ کی طرف سے کسی ہدایت کے بغیر اپنی خواہش کی پیروی کرے درحقیقت اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔"

فتنہ کتاب وسنت کی واضح ہدایات کی پیروی نہیں، بلکہ اللہ ورسول کی مخالفت کرنا ہے۔

Marfat.com

باب ششم:

حدیث واحد کے حجت ہونے کے دلائل

حدیث واحد، جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اس حدیث کو کہتے ہیں جس کا راوی تمام طبقوں میں، یا پہلے طبقہ میں ایک رہا ہو، یعنی رسول اللہ ﷺ سے جس کی روایت صرف ایک صحابی نے کی ہو اور کسی دوسرے صحابی نے اس سے متعارض کوئی حدیث روایت نہ کی ہو، بعد میں ہر اس حدیث کو حدیث واحد کہا جانے لگا جس کے راویوں کی تعداد حد تواتر سے کم ہو، حدیث واحد کی تعریف میں یہ توسع خوارج اور معتزلہ اور ان کے بطن سے نکلنے والے فرقوں کے اس دعوے کے نتیجے میں پیدا ہو گئی کہ ''خبر واحد'' شرعی حجت اور دلیل نہیں ہے، جبکہ امر واقعہ یہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین کے دور میں کسی حدیث کی صحت و عدم صحت کا حکم اس کے راویوں کی قلت و کثرت کے پیش نظر نہیں لگایا جاتا تھا، بلکہ راوی کی عدالت اور فسق کی بنیاد پر لگایا جاتا تھا: اگر حدیث کا راوی ''عادل'' ہے تو حدیث صحیح اور مقبول ہے اور اگر ''فاسق'' ہے تو اس کی روایت کردہ حدیث صرف تحقیق طلب ہے، قابل رد نہیں، اور یہ حکم ربانی ہے۔ (سورۂ حجرات: ۶)

صحابہ تو سب ''عدول'' تھے اور یکساں درجہ میں ثقہ تھے، لیکن تابعین اور ان کے بعد کے ''راویان حدیث'' میں صرف وہ عدول تھے جو ''ائمہ نقد رجال'' کی تحقیق کے مطابق عدالت سے موصوف تھے۔

اس کتاب میں میں بار بار یہ واضح کرتا آ رہا ہوں کہ ''تواتر'' کی تعریف پر دو ماہرین حدیث کا بھی اتفاق نہیں ہے اور معتزلہ کے دور سے آج تک تواتر کا راگ الاپنے والے ایسی کسی حدیث کی مثال نہیں پیش کر سکے ہیں اور نہ قیامت تک پیش کر سکتے ہیں جس کو دلیل سے ''حدیث متواتر'' قرار دیا جا سکے۔ دراصل یہ نعرہ لگایا ہی اس لیے گیا تھا اور آج تک لگایا جا رہا ہے کہ حدیث سے ''پیچھا چھوٹ سکے'' لہٰذا حدیث کو ''واحد'' اور ''متواتر'' میں تقسیم کرنے کی کوئی کوشش بھی اللہ و رسول کے کسی حکم کی تعمیل نہیں، بلکہ ہوائے نفس کی تعمیل ہے جس کی دلیل یہ ہے کہ معتزلہ کے دور سے آج تک منظر عام پر آنے والے منکرین حدیث کی کتابوں کا مطالعہ کیجیے تو ان میں آپ کو غلط بیانیوں، علمی خیانتوں، کتاب و سنت کی نصوص میں کتر و بیونت اور ان سے غلط استدلالات، ائمہ حدیث پر جھوٹے الزامات اور قرآن و حدیث میں تعارض کی ناکام کوششوں کے سوا کچھ نہ ملے گا۔

امام شافعی رحمہ اللہ کی خدمات حدیث

اس فصل کے تحت میں حدیث واحد کے حجت ہونے کے دلائل پیش کرنے سے قبل اس مرد میدان کا ذکر خیر کر دینا مناسب خیال کرتا ہوں جس کو امام اہل السنۃ احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے مجدد اسلام اور ناصر السنۃ کا لقب دیا۔ [1]

---

[1] سیر اعلام النبلاء، ص: ۳۹۹ ج ۸

Marfat.com

امام شافعی بجا طور پر ناصر السنۃ اور مجدد اسلام تھے۔ معتزلہ اور ان کے بطن سے نکلنے والے فرقے اور متکلمین حدیث کے شرعی مقام و مرتبے کو گھٹانے میں لگے ہوئے تھے۔ قرآن کو تو وہ قطعی الثبوت مانتے تھے، مگر اس کے ''صریح الدلالۃ'' ہونے کے منکر تھے اور صفات باری تعالیٰ سے متعلق آیتوں کی من مانی تاویلیں کر رہے تھے اور حدیث کے سب سے بڑے ذخیرے ''آحاد'' کو ظنی الثبوت کہہ کر نا قابل استدلال قرار دے چکے تھے۔ عام ائمہ حدیث ان کا رد کرنے کے قابل نہیں تھے ایسے وقت میں اللہ تعالیٰ نے اس ''شیر دل'' امام کو میدان میں لا کھڑا کر دیا جس کا نام محمد بن ادریس شافعی ہے۔

امام شافعی کو اللہ تعالیٰ نے غیر معمولی قوت بیان، نصوص کے استحضار اور نصوص سے استدلال کی بے مثال صلاحیتوں سے نواز دیا تھا۔ انہوں نے اپنا بچپن قبیلہ ہذیل میں گزارا تھا اور وہیں اپنی جوانی تک پلے بڑھے اور قبیلہ ہذیل کے لب ولہجہ میں اس قدر رنگ گئے کہ امام لغت وادب اصمعی نے اپنے محفوظ ہذلی اشعار امام شافعی کو سنا کر درست کیے۔ [1]

قبیلہ ہذیل فصاحت و بلاغت میں قریش کے بعد دوسرے درجہ پر تھا، لیکن بیرون قبیلہ کے لوگوں سے عدم اختلاط کے باعث قریش کے برعکس اس کی زبان زیادہ عرصہ تک محفوظ رہی۔

امام شافعی نے اپنی مشہور کتاب ''الام'' کی ''جماع العلم'' (ص: ۱۵۷۲۔۱۵۸۱) اور اختلاف الحدیث (ص ۱۷۱۴۔۱۷۹۶) میں حدیث کے حجت ہونے کے مسئلہ پر تفصیل سے اور مدلل بحث کی ہے اور اپنی شاہکار تصنیف الرسالہ میں دلائل و براہین کی زبان میں ''حدیث واحد'' کو شرعی حجت ثابت کیا ہے اور مثالوں پر مثالیں دے کر اس مسئلہ کو واضح فرمایا ہے۔

امام شافعی رحمہ اللہ نے منکرین حدیث کو دو گروہوں میں تقسیم کیا ہے: ۱۔ پہلا گروہ وہ ہے جو سرے سے حدیث کو شرعی حجت مانتا ہی نہیں۔ ۲۔ دوسرا گروہ وہ ہے جو اخبار آحاد کا منکر ہے۔ وہ خبر واحد یا حدیث واحد کو ''روایہ الخاصۃ عن الخاصۃ'' سے تعبیر کرتے ہیں۔ الرسالہ میں انہوں نے حدیث واحد کے حجت ہونے کی جو مثالیں دی ہیں ان میں سے ہر حدیث کا ایک ہی راوی ہے۔ چاہے کسی ایک طبقہ میں یا متعدد طبقوں میں۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے بھی صحیح بخاری میں ایسی حدیثیں روایت کی ہیں جو احادیث آحاد ہیں اور شرعی حجت ہیں، میں حدیث واحد کے حجت ہونے کے دلائل کے ضمن میں جو مثالیں دینے جا رہا ہوں وہ ان دونوں کے علاوہ حدیث کی دوسری کتابوں سے بھی لوں گا اور ساتھ ہی ساتھ ان لوگوں کے دعوؤں کا رد بھی کرتا جاؤں گا جنہوں نے بعض احادیث آحاد کے حجت ہونے کا سبب یہ بتایا ہے کہ ان کے راوی صحابہ ''حکومت الٰہیہ'' کے نمائندے تھے، یا ان کو ''عرفی'' حیثیت حاصل تھی۔

---

[1] ابو زہرہ، الشافعی، ص: ۱۸

Marfat.com

۱۔ پہلی دلیل، حدیث جساسۃ:

تمیم داری رضی اللہ عنہ مشرف بہ اسلام ہونے سے پہلے عیسائی تھے وہ صدق دل سے ایمان لائے اور نہایت مخلص مسلمان ثابت ہوئے، انہوں نے قبل از اسلام اپنے ایک سمندری سفر کا واقعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کیا جس میں ان کی اور ان کے رفقائے سفر کی ملاقات ایک عجیب الخلقت عورت اور جزیرے کی ایک خانقاہ میں ایک ایسے شخص سے ہوئی جس نے اپنے آپ کو مسیح دجال بتایا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی زبان سے یہ واقعہ سن کر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو مسجد نبوی میں جمع کیا اور ان کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

((إن تميما الداری کان رجلاً نصرانیا، فجاء فبایع وأسلم، وحدثنی حدیثا وافق الذی کنت أحدثکم عن مسیح الدجال.))

''تمیم داری جو پہلے ایک نصرانی تھے اور میرے پاس آ کر بیعت کی اور مسلمان ہو گئے، انہوں نے مجھے ایک ایسی بات بتائی ہے جو میری اس بات کے مطابق ہے جو میں تم سے مسیح دجال کے بارے میں بتاتا رہتا تھا۔'' ❶

یہ ایک طویل حدیث ہے جس کا محل استدلال پہلو یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمیم داری رضی اللہ عنہ کی زبان سے ان کے سمندری سفر اور مسیح دجال ہونے کے مدعی شخص سے ان کی ملاقات کے واقعہ کو سنا اور ان میں سے کسی بھی چیز کی تکذیب نہیں کی، البتہ آپ نے حاضرین کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

((ألا هل کنت حدثتکم ذلك؟ فقال الناس: نعم، فإنه أعجبنی حدیث تمیم، إنه وافق الذی کنت أحدثکم عنه، وعن المدینة ومکة، ألا! إنه بحرالشام، أوبحراليمن، لابل من قِبَلِ المشرق، ماهو من قبل المشرق، ماهو من قبل المشرق ماهو" وأو مَأبیده إلی المشرق.))

''کیا میں نے تم سے یہی بیان کیا ہے؟ لوگوں نے عرض کیا: ہاں، آپ نے فرمایا: مجھے تمیم کی بات پسند آتی ہے؛ یہ میری اس بات کے مطابق ہے جو میں تم لوگوں سے دجال، مدینہ، اور مکہ کے بارے میں بیان کرتا آ رہا ہوں، غور سے سن لو! وہ بحر شام یا بحر یمن میں ہے، نہیں، بلکہ مشرق کی طرف سے ظاہر ہوگا، وہ مشرق کی طرف سے ظاہر ہوگا، وہ مشرق کی طرف سے ظاہر ہوگا، وہ'' آپ نے اپنے ہاتھ سے مشرق کی جانب اشارہ کیا۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمیم داری سے سنا ہوا یہ واقعہ مسجد نبوی میں منبر سے صحابہ کرام کو سنایا، جس کی راوی صرف جلیل القدر صحابیہ فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا ہیں۔

❶ صحیح مسلم: ۲۹۴۲

Marfat.com

اس حدیث کے آخر میں نبی ﷺ نے بحر شام اور بحر یمن میں دجال کے ہونے کے بارے میں اپنے جس تردد کا اظہار فرمایا ہے اور پھر مشرق سے اس کے ظہور کی جو تائید کی ہے تو اس وقت تک اللہ تعالیٰ نے آپ کو دجال کے بارے میں صرف اتنا ہی بتایا تھا جس میں مشرق سے اس کے ظہور کا پہلو زیادہ غالب تھا اس لیے بحر شام اور بحر یمن کے بارے میں آپ نے اپنے شک کا اظہار کرنے کے بعد مشرق سے اس کے ظہور پر زور دیا ہے۔

حدیث جساسہ پر ایک نظر:

اس حدیث سے وجہ استدلال صرف یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے ایک نومسلم صحابی اپنے ایک سمندری سفر کے واقعات بیان کرتے ہوئے آپ کو نہایت سنسنی خیز انکشافات کی خبر دیتا ہے اور رسول اللہ ﷺ نہ صرف کہ اس کی باتیں غور سے سنتے ہیں۔ بلکہ صحابہ کرام کو مسجد میں جمع کر کے ان کے سامنے اور منبر سے ان کی باتوں کی تائید کرتے ہیں اور اللہ کے حوالے سے نہیں، اس صحابی کے حوالہ سے ان باتوں کو دجال سے متعلق اپنے ارشادات کے مطابق قرار دیتے ہیں اور اس پورے مجمع میں صرف ایک صحابیہ فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا ایسی ہیں جو رسول اللہ ﷺ کے طویل ارشاد کو حرف بحرف اپنے لوح قلب پر نقش کر لیتی ہیں اور اس واقعہ پر تیس برس سے زیادہ مدت گزر جانے کے بعد مشہور تابعی عامر بن شراحیل شعبی کی درخواست پر ان کو لفظ بلفظ سنا دیتی ہیں اس واقعہ سے جہاں یہ درس ملتا ہے کہ صحابہ کا حافظہ نہایت حیرتناک تھا وہیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ روایانِ حدیث کی قلت اس امر پر دلالت نہیں کرتی کہ اس حدیث کا علم رکھنے والے بھی قلیل تھے۔ دراصل احادیث رسول کا علم تو صحابہ کی اکثریت رکھتی تھی، کیونکہ اس کے بغیر شرعی احکام پر عمل ممکن نہیں تھا، لیکن حدیثوں کی روایت کرنے والے بہت کم ہوتے تھے، اس لیے کہ روایت حدیث فرض کفایہ تھی اور چند افراد کے انجام دینے سے دوسروں سے اس کی فرضیت ساقط ہو جاتی تھی۔

زیر بحث حدیث میں نبی ﷺ کے زمانے میں دجال کے وجود پر جو اشکالات وارد ہوتے ہیں سر فہرست یہ اشکال ہے کہ متعدد احادیث میں یہ خبر دی گئی ہے کہ اس کا ظہور قرب قیامت کے زمانے میں ہوگا۔ پھر تمیم داری رضی اللہ عنہ نے کسی جزیرے میں اس کو کیسے دیکھا؟ کیا یہ ممکن ہے کہ وہ نبی ﷺ کے زمانے میں پیدا ہو گیا ہو اور اپنے ظہور کا وقت آنے تک اسی جزیرے کی خانقاہ میں بند رہے؟

مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری مرحوم نے منۃ المنعم فی شرح صحیح مسلم میں لکھا ہے کہ سراغرسانوں نے دنیا کا چپہ چپہ چھان مارا ہے۔ پھر وہ کس جزیرے یا خانقاہ میں موجود ہے جہاں تک ان کی رسائی نہیں ہو سکی؟

اس سوال کے جواب میں عرض ہے کہ ایک شخص کے لیے دجال کا سراغ لگانے سے آسان تو ایک پوری قوم، یاجوج ماجوج اور اس کی آبادی کا سراغ لگا لینا ہے جس کا ذکر خود قرآن پاک میں آیا ہے، مگر دسیوں مفسرین اور مؤرخین نے یاجوج ماجوج کے بارے میں اب تک جو کچھ لکھا ہے کیا اس سے اس قوم کی حقیقت اور اس کے محل وجود کا یقینی علم

Marfat.com

حاصل ہوتا ہے اور کیا دنیا کا کوئی سراغ رساں یا دنیا کے کسی ملک کی فوج ان کے محل وجود تک پہنچ سکی ہے، جبکہ دنیا کے جس حصے میں یہ قوم موجود ہے اس کی ایک بالشت بھر زمین بھی ایسی نہیں ہے جس کا علم بڑی طاقتوں کو نہ ہو۔

مولانا نے بعد میں شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کی کتاب حجۃ اللہ البالغہ کی بنیاد پر یہ دعویٰ کیا ہے کہ ان تمام اشکالات سے جان چھڑانے کی صورت یہی رہ جاتی ہے کہ دجال کی اس موجودگی کو اس عالم مادی کے علاوہ کسی اور عالم میں تسلیم کی جائے اور یہ فرض کیا جائے کہ تمیم داری اور ان کے ساتھیوں کے لیے یہ دونوں عالم جمع کر دیے گئے تھے۔ ❶

بلاشبہ شاہ ولی اللہ نے اپنی مذکورہ کتاب کے باب ذکر عالم المثال، میں یہ لکھا ہے کہ: ''بہت سی احادیث اس امر پر دلالت کرتی ہیں کہ اس عالم وجود میں ایک غیر مادی عالم بھی ہے جس میں معانی اپنے ہم صفت اجسام کی شکل اختیار کر لیتے ہیں اور بہت سی چیزیں زمین میں موجود پانے سے پہلے ہی کسی نہ کسی درجہ میں موجود ہوتی ہیں، پھر جب ان کو وجود ملتا ہے تو یہ وہی اجسام اور وہی معانی ہوتے ہیں، اور بہت سی ایسی چیزیں جن کا عوام کی نظر میں کوئی جسم نہیں ہوتا وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتی ہیں اور اوپر سے زمین پر اترتی ہیں۔ ❷

شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے اپنے اس قول کی دلیل میں جن احادیث کی مثالیں دی ہیں ان سے ان کے قول کی تائید نہیں ہوتی، مثلاً جب اللہ نے مخلوق کی تخلیق فرمالی اس وقت رشتہ وقرابت داری گویا ہوئی:

((هذا مقام العائذ بك من القطيعة .))

''یہ قطع رحمی سے تیری پناہ میں آنے والے کا مقام ہے۔'' ❸

اسی طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

((إن البقرة وآل عمران تأتيان يوم القيامة غمامتان او غيايتان او كانهما فرقان طير صواف تحاجان عن أهلهما .))

''سورۂ بقرہ اور سورۂ آل عمران قیامت کے دن اس طرح آئیں گی گویا وہ بادل کے دو ٹکڑے یا دو سائبان ہوں، یا پر پھیلائے ہوئے پرندوں کی دو جماعتیں ہوں اور اپنے پڑھنے والوں کی طرف سے جھگڑیں گی۔'' ❹

شاہ صاحب نے نماز، صدقہ اور روزہ اور معروف ومنکر کی بھی مثالیں دی ہیں جو قیامت کے دن مادی شکلیں اختیار کر لیں گی۔

دراصل شاہ صاحب نے جو کچھ فرمایا ہے وہ صوفیانہ خیال آرائی کے سوا کچھ نہیں، تعجب ہے کہ مولانا صفی الرحمن مرحوم نے قیامت کے دن کے احوال کو دنیا کے احوال کے مطابق کیسے کر لیا اور اسی دنیا میں عالم مادی اور عالم معنوی کو ایک ساتھ

---

❶ ص: ۳۸۳، ج ۴۔ ❷ ص: ۵۱، ج ۱۔
❸ بخاری: ۵۹۸۷، مسلم: ۲۵۵۴۔ ❹ مسلم: ۸۰۴۔

Marfat.com

جمع کیسے کرلیا۔ اگر ایسا کوئی غیر مرئی عالم ہے اور دجال اس عالم میں موجود تھا اور شاہ صاحب کے بقول جب اس کو مادی وجود ملے گا تو اس کا یہ وجود اس معنوی وجود کے بالکل مطابق ہوگا، ایسا اللہ تعالیٰ کے علم ازلی میں ضرور ہے، مگر سوال یہ ہے کہ اس عالم مادی کے انسان نے اس عالم معنوی یا غیر مادی دنیا کے انسان کو دیکھا کیسے جس کو ابھی وجود ہی نہیں ملا ہے؟

اس واقعہ کی قرین فہم وہ توجیہ معلوم ہوتی ہے جو علامہ عبدالرحمٰن یحییٰ معلمی یمانی رحمہ اللہ نے بدنام زمانہ منکر حدیث محمود ابوریہ کے اعتراض کا جواب دیتے ہوئے اس واقعہ کی ہے۔ ابوریہ نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم غیب کا علم نہیں رکھتے تھے اور منافقین اور کفار کی تصدیق کردیا کرتے تھے۔ "نعوذ باللہ من ذلك"

فرماتے ہیں:

''دجال کے مسئلہ میں ثابت احادیث کثیر تعداد میں موجود ہیں جن میں سے متعدد حدیثوں میں خلاف عادت امور کا بیان ہے اور قرآن سے یہ ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اذن سے فرشتے انسانی شکل اختیار کرلیا کرتے تھے۔ خود قرآن سے یہ ثابت ہے کہ فرشتے ابراہیم، اور لوط اور مریم علیہم الصلاۃ والسلام کے پاس انسانی شکل میں آتے تھے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ اپنی خاص حکمت سے شیطانوں کو بھی یہ قدرت دے سکتا ہے کہ وہ انسانی شکل اختیار کرلیں رہی جساسہ (خبر رساں عورت) تو وہ شیطان تھی، اور دجال بھی شیطان ہوسکتا ہے۔ تمیم داری اور ان کے ساتھیوں نے ان دونوں سے باتیں کیں اور ان کے چلے جانے کے بعد یہ دونوں اپنی غیر مرئی حالتوں میں واپس چلے گئے اس طرح کوئی اشکال نہیں رہ جاتا۔''

اس وقعہ میں حکمت یہ ہوسکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمیم داری رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں کے لیے ایسے امور، کا انکشاف کردیا جو دجال سے متعلق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئیوں کے مطابق تھے تاکہ اس طرح آپ کی ان پیشین گوئیوں پر مسلمانوں کا یقین بڑھ جائے۔ [1]

چنانچہ اس نے کہا: مجھے بیسان کے نخلستان کے بارے میں بتاؤ، ہم نے کہا کہ تم ان نخلستانوں کے بارے میں کیا جاننا چاہتے ہو؟ اس نے کہا: میں ان کے کھجور کے درختوں کے بارے میں تم سے پوچھتا ہوں کہ کیا وہ پھل دیتے ہیں؟ ہم نے جواب دیا: ہاں دیتے ہیں۔ اس نے کہا: قریب ہے کہ یہ پھل نہ دیں۔ اس نے کہا: میں تم لوگوں سے بحیرۂ طبریہ کے بارے میں پوچھتا ہوں۔ ہم نے کہا: تم اس کے بارے میں کیا جاننا چاہتے ہو؟ اس نے کہا: کیا اس میں پانی ہے؟ ان لوگوں نے جواب دیا: اس میں بہت پانی ہے۔ اس نے کہا: قریب ہے کہ اس کا پانی ختم ہو جائے۔ اس نے پوچھا: مجھے زُغر کے چشمہ کے بارے میں بتاؤ۔ انہوں نے کہا: تم اس کے بارے میں کیا جاننا چاہتے ہو؟ اس نے پوچھا: کیا چشمہ میں پانی ہے اور اس چشمہ والے

[1] الانوار الکاشفہ ص: ۱۳۴.

Marfat.com

اس کے پانی سے کھیتی باڑی کرتے ہیں؟ ہم نے اس کو جواب دیا: اس میں بہت پانی ہے اور چشمہ والے اس کے پانی سے کھیتی باڑی کرتے ہیں۔"

"اس نے پوچھا: مجھے بتاؤ کہ امیوں کے نبی کا کیا ماجرا ہے؟ انہوں نے جواب دیا: وہ مکہ سے نکل کر یثرب میں قیام پذیر ہو گئے ہیں۔ اس نے پوچھا: کیا عربوں نے ان سے جنگ کی؟ ہم نے کہا: ہاں۔ اس نے پوچھا: انہوں نے عربوں کے ساتھ کیا کیا؟ ہم نے اسے بتایا: وہ اپنے قریبی عربوں پر غالب آ گئے اور ان لوگوں نے ان کی اطاعت کر لی۔ اس نے کہا: کیا ایسا ہی ہوا؟ ہم نے کہا: ہاں۔

اس نے کہا: ان کے لیے بہتری اسی میں تھی کہ وہ ان کے مطیع فرمان ہو جائیں میں تمہیں اپنے بارے میں بتاتا ہوں کہ میں مسیح دجال ہوں۔ اور قریب ہے کہ مجھے خروج کی اجازت مل جائے، میں نکل کر سیر کروں گا اور چالیس دنوں تک ایسی کوئی بستی نہیں چھوڑوں گا کہ اس میں نہ اتروں، سوائے مکہ اور طیبہ کے جو میرے اوپر حرام کر دیے گئے ہیں۔ جب بھی میں ان میں سے کسی میں داخل ہونا چاہوں گا، ایک فرشتہ ننگی تلوار لیے ہوئے میرے سامنے آ جائے گا اور داخل ہونے سے مجھے باز رکھے گا، اور ان شہروں میں داخلے کے ہر راستے میں فرشتے ان کی حفاظت پر مامور ہوں گے۔"

دجال نے اس ملاقات میں جو باتیں بتائیں وہ صحیح احادیث میں مذکور باتوں کے مطابق ہیں، اور اس سے یہ باتیں سن کر انہیں نقل کرنے والے اس وقت مسلمان بھی نہیں تھے کہ ان پر یہ الزام لگایا جائے کہ انہوں نے اپنے نبی کی تائید کے لیے یہ سارا ڈرامہ خود رچ لیا ہے۔ تمیم داری رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں نے بھی اس عجیب الخلقت عورت "جساسۃ" کو دیکھ کر اور اس کی باتیں سن کر اس کے بارے میں پہلا تاثر یہی لیا تھا کہ "وہ شیطان" ہے اور اس نے ان لوگوں سے یہ کہا تھا کہ وہ خانقاہ میں موجود شخص سے ملیں۔ ان تفصیلات سے جساسہ اور مدعی دجال کے شیطان ہونے کی تائید ہوتی ہے نہ کہ اس بات کی کہ دجال غیر مادی عالم میں تھا اور تمیم داری رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں کے لیے دونوں عالم، مادی اور غیر مادی جمع کر دیے گئے تھے اس طرح انہوں نے دجال کو اس کے وجود پانے سے پہلے عالم غیر مادی میں دیکھ لیا تھا اور اس سے باتیں کی تھیں، کیونکہ جو چیزیں اللہ تعالیٰ کے علم ازلی میں ہیں اور مادی وجود نہیں رکھتیں اس دنیوی زندگی میں کوئی انسان ان کو نہیں دیکھ سکتا۔ اس طرح کے دعوے صرف صوفیا کرتے ہیں، وہ تو مراقبے میں اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کا بھی دعویٰ کرتے ہیں؟!!

۲۔ دوسری دلیل، آغاز وحی کی حدیث:

عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے اور وہ اپنی خالہ ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا:

((أَوَّلُ مَا بُدِءَ بِهِ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنَ الْوَحْيِ الرُّؤْيَا الصَّالِحَةُ فِي

Marfat.com

النَّوْمِ فَكَانَ لا يَرَى رُؤْيَا إِلَّا جَائَتْ مِثْلَ فَلَقِ الصُّبْحِ ثُمَّ حُبِّبَ إِلَيْهِ الْخَلَاءُ وَكَانَ يَخْلُو بِغَارِ حِرَاءٍ فَيَتَحَنَّثُ فِيهِ وَهُوَ التَّعَبُّدُ اللَّيَالِي ذَوَاتِ الْعَدَدِ قَبْلَ أَنْ يَنْزِعَ إِلَى أَهْلِهِ وَيَتَزَوَّدُ لِذَلِكَ ثُمَّ يَرْجِعُ إِلَى خَدِيجَةَ فَيَتَزَوَّدُ لِمِثْلِهَا حَتَّى جَاءَهُ الْحَقُّ وَهُوَ فِي غَارِ حِرَاءٍ فَجَاءَهُ الْمَلَكُ فَقَالَ اقْرَأْ قَالَ مَا أَنَا بِقَارِئٍ قَالَ فَأَخَذَنِي فَغَطَّنِي حَتَّى بَلَغَ مِنِّي الْجَهْدَ ثُمَّ أَرْسَلَنِي فَقَالَ اقْرَأْ قُلْتُ مَا أَنَا بِقَارِئٍ فَأَخَذَنِي فَغَطَّنِي الثَّانِيَةَ حَتَّى بَلَغَ مِنِّي الْجَهْدَ ثُمَّ أَرْسَلَنِي فَقَالَ اقْرَأْ فَقُلْتُ مَا أَنَا بِقَارِئٍ فَأَخَذَنِي فَغَطَّنِي الثَّالِثَةَ ثُمَّ أَرْسَلَنِي فَقَالَ ﴿اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ اقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ﴾))

''پہلے پہل رسول اللہ ﷺ پر وحی کا آغاز نیند میں عمدہ خواب سے ہوا اور آپ جو خواب بھی دیکھتے وہ صبح کے اجالے کی طرح ہوتا، پھر آپ کے لیے خلوت نشینی محبوب بنا دی گئی اور آپ غار حرا میں کئی کئی راتیں تحنث یعنی عبادت، کرتے، قبل اس کے کہ اپنی بیوی کے پاس واپس ہوں، اس غرض کے لیے آپ توشہ لے جاتے، پھر خدیجہ کے پاس واپس جاتے اور اسی طرح توشہ ساتھ لے جاتے۔ یہاں تک کہ غار حرا میں آپ کی موجودگی ہی میں حق آپ کے پاس آ گیا اور فرشتہ آپ کے پاس حاضر ہو گیا اور کہا: پڑھو، آپ نے فرمایا: میں پڑھنا نہیں جانتا۔ اس نے مجھے پکڑ کر اس طرح مجھے بھینچا کہ میری قوت برداشت اپنی آخری حد کو پہنچ گئی، پھر اس نے مجھے چھوڑ دیا اور کہا: پڑھو، آپ نے فرمایا: میں پڑھنا نہیں جانتا۔ اس نے دوسری بار مجھے پکڑ کر اس قدر بھینچا کہ میری قوت برداشت اپنی آخری حد کو پہنچ گئی، پھر اس نے مجھے چھوڑ دیا اور کہا: پڑھو، آپ نے فرمایا: میں پڑھنا نہیں جانتا۔ اس نے تیسری بار مجھے پکڑ کر بھینچا، پھر مجھے چھوڑ دیا اور کہا: پڑھو اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا جس نے انسان کو جمے ہوئے خون سے پیدا کیا پڑھو اور تمہارا رب ہی سب سے بڑا صاحب بخشش وعطا ہے۔'' ❶

حدیث پر ایک نظر:

یہ حدیث امام بخاری رحمہ اللہ اپنی کتاب میں مختلف ابواب کے تحت لائے ہیں، جن میں سے تین ابواب کے تحت اس کا مکمل متن بعض معمولی لفظی اختلاف کے ساتھ نقل کیا ہے اس سلسلے کی یہ پہلی حدیث ہے اور صحیح بخاری کی تیسری۔

جس باب کے تحت امام بخاری نے یہ حدیث اپنی کتاب میں درج کی ہے اس کا عنوان ہے: "كيف كان بدء الوحي إلى رسول الله" رسول اللہ ﷺ کی طرف وحی کا آغاز کس طرح ہوا؟ اس ضمن میں یہ تیسری حدیث ہے۔

دوسرے جن دو ابواب کے تحت انہوں نے یہ حدیث روایت کی ہے ان میں سے پہلے باب کا کوئی عنوان نہیں قائم

❶ بخاری: ۳/۳۳۹۲، ۴۹۵۳، ۴۹۵۵، ۴۹۵۷، ۶۹۸۲، مسلم: ۱۶۰

Marfat.com

کیا ہے، بلکہ کتاب التفسیر میں جن سورتوں سے متعلق احادیث سے تفسیریں بیان کی ہیں ان میں ''سورۃ العلق'' کی ترتیب ۹۶ ہے اور یہ حدیث اس سورت کی تفسیر کے ضمن میں پہلے باب کے تحت درج کی ہے۔ (حدیث نمبر: ۴۹۵۳)

دوسرے جس باب کے تحت وہ یہ حدیث لائے ہیں وہ کتاب التعبیر کا پہلا باب ہے جس کا عنوان ہے: ''أول ما بُدی به رسول الله ﷺ من الوحی الرؤیا الصالحة'' پہلے پہل رسول اللہ پر وحی کا آغاز عمدہ خواب سے ہوا (نمبر ۶۹۸۲)

مذکورہ مقامات پر امام بخاری رحمہ اللہ نے یہ حدیث پانچ سندوں سے روایت کی ہے، اور پہلی جس سند سے اس کی روایت کی ہے دوسرے دونوں ابواب میں پہلے ''ابن شہاب زہری'' تک اس سند کا اعادہ کیا ہے، پھر دوسری سندوں سے اس کی روایت کی ہے وہ سند یہ ہے: ہم سے یحییٰ بن بکیر نے بیان کیا، کہا: ہم سے لیث نے عقیل سے، انہوں نے ابن شہاب سے، انہوں نے عروہ بن زبیر سے اور انہوں نے ام المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا۔ بخاری کے ایسا کرنے سے صاف عیاں ہے کہ ان کے نزدیک یہ سند سب سے زیادہ قوی تھی۔

سند کے راویوں کا مختصر تعارف:

۱۔ امام بخاری رحمہ اللہ سید المحدثین اور امیر المؤمنین فی الحدیث تھے، آپ کی امامت فی الحدیث والرجال، تفقہ، قوتِ استنباط اور بعد نظر کی شاہد خود صحیح بخاری ہے۔

۲۔ امام ومحدث یحییٰ بن عبداللہ بن بکیر رحمہ اللہ امام بخاری کے شیخ اور استاذ تھے جن کا شمار امام مالک رحمہ اللہ کے اہم شاگردوں میں ہوتا ہے۔ انہوں نے امام مالک کی زبان سے مؤطا کئی بار سنی تھی اس طرح امام بخاری: ۱۹۴۔۲۵۶، کا رشتہ وتعلق امام مالک: ۹۳ھ، ۱۷۹ھ سے قائم ہو جاتا ہے۔ امام بخاری نے یہ حدیث انہیں یحییٰ بن بکیر سے سنی تھی۔ یہ مؤطا کے مشہور راوی یحییٰ اللیثی کے علاوہ ہیں۔

۳۔ یحییٰ بن بکیر نے یہ حدیث لیث بن سعد رحمہ اللہ سے سنی تھی جو امام مالک کے معاصر تھے اور جن کا شمار مصر کے اساطینِ علم حدیث اور فقہاء میں ہوتا ہے، امام شافعی رحمہ اللہ لیث کو امام مالک سے بڑا فقیہ مانتے تھے۔

۴۔ لیث بن سعد کے شیخ اور استاذ جن سے انہوں نے یہ حدیث سنی تھی عقیل بن خالد بن عقیل رحمہ اللہ ہیں جو امام زہری رحمہ اللہ کی حدیثوں کے سب سے بڑے راوی شمار ہوتے ہیں۔

۵۔ عقیل نے یہ حدیث اپنے شیخ اور استاذ حدیث امام وحافظ حدیث، کتاب وسنت کے علوم کے جامع اور سیرتِ مصطفیٰ ﷺ کے منفرد عالم محمد بن مسلم بن شہاب زہری رحمہ اللہ سے سنی تھی۔

۶۔ زہری کے شیخ اور استاذ جن سے انہوں نے یہ حدیث سنی تھی عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ ہیں، عروہ کا شمار مدینہ کے فقہائے سبعہ میں ہوتا ہے ان کے والد ماجد زبیر بن عوام اور والدہ ماجدہ اسماء بنت ابی بکر ذات النطاقین رضی اللہ عنہم تھیں۔

Marfat.com

۷۔ عروہ نے یہ حدیث ام المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا سے سنی تھی جو ان کی خالہ تھیں اور جن کی گود میں اور زیر تربیت رہ کر وہ کندن بنے تھے۔

آغاز وحی کی حدیث کی سند کے راویوں کے مختصر تعارف کی روشنی میں یہ سند "سلسلۃ الذہب" کا درجہ رکھتی ہے۔

یہ حدیث ام المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا نے اپنے الفاظ میں روایت کی ہے۔ اس طرح یہ روایت بالمعنی ہے۔

یہ حدیث ام المؤمنین کی عظمت کی دلیل ہے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان المبارک سے ام المؤمنین اور سیدہ نساء العلمین خدیجہ رضی اللہ عنہا کے مسلسل ذکر خیر کی وجہ سے ان کے دل میں خدیجہ کے حوالہ سے غیرت ورشک کے جو فطری جذبات تھے، یہ جذبات اس حدیث میں ان کی عطر بیز سیرت وکردار کے بیان میں مانع نہیں ہوئے۔ ام المؤمنین خدیجہ رضی اللہ عنہا کو تو انہوں نے دیکھا تک نہیں تھا اور جب عروہ بن زبیر سے انہوں نے یہ حدیث بیان کی ہے اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس دنیا میں نہیں تھے ایسی صورت میں اگر وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خلوت گزینی اور پھر جبریل علیہ السلام کی آمد اور سورۂ اقرأ کی ابتدائی پانچ آیتوں کے نزول کے ذکر پر اکتفا کرتیں تو وہ قابل ملامت ہرگز نہ ہوتیں، مگر ان کی عظمت، امانت داری اور بلندی کردار نے یہ گوارا نہ کیا کہ وہ اس عظیم خاتون اور منفرد ہستی کا ذکر نہ کریں جو رحمۃ اللعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح معنوں میں رفیقۂ حیات تھیں اور جن کا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک میں منفرد مقام ومرتبہ تھا اور ان کی جدائی کے بعد اپنی زندگی کے آخری لمحات تک ان کی یاد آپ کے قلب مبارک سے محو نہ ہوئی۔ [1]

یہ حدیث ام المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا کے حسین طرز بیان کی سچی تصویر پیش کرتی ہے۔ تصنع اور تکلف اور مصنوعی انشا پردازی سے پاک اس طرز بیان کو "ترسل" کہتے ہیں، انہوں نے سارے واقعات کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے سن کر ان کو اپنی فطری، سادہ اور بلیغ زبان میں بیان کر دیا ہے اور دقت بیان ایسی کہ واقعہ کی کوئی کڑی غائب نہیں ہوئی ہے۔ اور شروع سے لے کر آخر تک ام المؤمنین خدیجہ رضی اللہ عنہا کی تابناک شخصیت نمایاں ہے۔ اور پہلی وحی کے نزول کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جو اضطرابی کیفیت طاری ہوگئی اور آپ نے اپنی جان کے جس خطرے اور اندیشے کا اظہار فرمایا اس کے ازالہ کے لیے خدیجہ نے جو کلمات کہے وہ انگوٹھی میں نگینہ کا درجہ رکھتے ہیں۔ یہ کلمات عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس حدیث میں جوں کے توں نقل کر دیے ہیں:

((كلا أبشر، فوالله لايخزيك الله أبداً، إنك لتصل الرَحم، وتصدق الحديث وتحمل الكل وتقرى الضيف وتعين على نوائب الحق .))

ہرگز نہیں، خوش ہو جائیے، اللہ کی قسم، اللہ آپ کو کبھی رسوا نہیں کرے گا، آپ صلہ رحمی کرتے ہیں، سچ بولتے ہیں، بے سہارا لوگوں کا بار اٹھاتے ہیں، مہمان نوازی کرتے ہیں اور حق کے مصائب کو برداشت کرنے میں

---

[1] بخاری: ۳۸۱۵، ۳۸۱۶، ۳۸۱۷، ۳۸۲۱، مسلم: ۲۴۳۵۔ ۷۵، ۷۶، ۲۴۳۶، ۲۴۳۷

Marfat.com

مدد دیتے ہیں۔"

حدیث سے وجہ استدلال:

اس حدیث سے وجہ استدلال یہ ہے کہ اس کی راوی تنہا ام المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا ہیں اور اس میں جو واقعات بیان ہوئے ہیں وہ نبی کریم ﷺ کی زبان مبارک سے سن کر انہوں نے اپنے الفاظ میں بیان کیے ہیں، کیونکہ ان واقعات کے ظہور پذیر ہونے کے وقت وہ پیدا بھی نہیں ہوئی تھیں، بایں ہمہ یہ حجت ہے اور تمام محدثین، تمام سیرت نگار، تمام مؤرخین اور تمام فقہاء پہلی وحی کے نزول اور نبی ﷺ کے منصب نبوت پر سرفراز کیے جانے پر اسی حدیث سے استدلال کرتے ہیں۔

۳۔ تیسری دلیل، نیت کی حدیث:

علقمہ بن وقاص لیثی کہتے ہیں: میں نے عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو برسر منبر یہ فرماتے ہوئے سنا ہے:

((سمعت رسول الله ﷺ يقول: إنما الأعمال بالنيات، وإنما لكل امرئ مانوى، فمن كانت هجرته إلى دنيا يُصيبها أو إلى امرأة يَنكِحُها فهجرته إلى ماهاجر إليه.))

"درحقیقت اعمال کا اعتبار نیتوں پر ہے اور ہر انسان کو وہی ملے گا جس کی اس نے نیت کی ہوگی، لہٰذا جس کی ہجرت حصول دنیا یا کسی عورت سے نکاح کرنے کی طرف ہوگی تو اس کی ہجرت اس کی طرف مانی جائے گی جس کی طرف اس نے ہجرت کی ہوگی۔" ❶

آغاز وحی کی حدیث کی طرح اس حدیث کے راوی بھی صرف ایک صحابی عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ ہیں. اور ان سے روایت کرنے والے علقمہ بن وقاص لیثی ہیں، اور علقمہ سے اس کی روایت محمد بن ابراہیم تیمی نے کی ہے اور محمد سے اس کے راوی یحییٰ بن سعید انصاری ہیں۔

صرف ایک صحابی اور تابعین کے تین طبقات میں۔ بڑے، متوسط اور چھوٹے۔ اس کے ایک ایک راوی ہیں اس کے باوجود یہ حدیث تمام شرعی اعمال کی صحت اور اعتبار کی بنیاد ہے۔

۴۔ چوتھی دلیل، تحویل قبلہ کی حدیث:

((عن عبدالله بن عمر رضي الله عنهما قال: بينا الناس بقباء في صلاة الصبح، إذجاء هم آتٍ، فقال: ان رسول الله ﷺ قد أُنزل عليه الليلة قرآن وقد أُمِرَ أن يستقبل الكعبة فاستقبلوها، وكانت وجوهُهم إلى الشام، فاستداروا إلى الكعبة.))

"عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، کہتے ہیں: جس وقت لوگ قبا میں فجر کی نماز پڑھ رہے تھے کہ ان کے

❶ بخاری: ۱، مسلم: ۱۹۰۷

Marfat.com

پاس ایک آنے والا آیا اور کہا: رسول اللہ ﷺ پر رات قرآن نازل کیا گیا ہے اور آپ کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ آپ کعبہ کی طرف رخ کرلیں اور لوگوں نے اس کو سامنے کرلیا، پہلے ان کے چہرے شام کی طرف تھے پھر وہ کعبہ کی طرف گھوم گئے۔'' [1]

حدیث پر ایک نظر:

یہ حدیث عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے اور امام بخاری رحمہ اللہ صحیح بخاری میں مختلف ابواب کے تحت لائے ہیں اوپر دیے گئے نمبرات سے یہ مقامات معلوم کیے جاسکتے ہیں، امام مسلم رحمہ اللہ نے بھی یہ حدیث اپنی صحیح میں نقل کی ہے۔

امام شافعی رحمہ اللہ نے اپنی مشہور کتاب الرسالہ میں حدیث واحد کے شرعی حجت و دلیل ہونے پر جن حدیثوں سے استدلال کیا ہے ان میں یہ پہلی حدیث ہے۔ (ص: ۱۱۲۔۱۱۳، ۲۷۰) یاد رہے کہ امام شافعی وہ پہلے امام ہیں جنہوں نے حدیث واحد کے شرعی حجت ہونے سے باقاعدہ اور مدلل بحث کی ہے۔

یہ حدیث براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے جسے امام بخاری مختلف ابواب کے تحت لائے ہیں: ۴۰، ۳۹۹، ۴۴۸۶، ۴۴۹۲، ۷۲۵۲، ان میں سے حدیث نمبر ۴۰ کا متن درج ذیل ہے:

((أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ ﷺ كَانَ أَوَّلَ مَا قَدِمَ الْمَدِينَةَ نَزَلَ عَلَى أَجْدَادِهِ أَوْ قَالَ أَخْوَالِهِ مِنَ الْأَنْصَارِ وَأَنَّهُ صَلَّى قِبَلَ بَيْتِ الْمَقْدِسِ سِتَّةَ عَشَرَ شَهْرًا أَوْ سَبْعَةَ عَشَرَ شَهْرًا وَكَانَ يُعْجِبُهُ أَنْ تَكُونَ قِبْلَتُهُ قِبَلَ الْبَيْتِ، وَأَنَّهُ صَلَّى أَوَّلَ صَلَاةٍ صَلَّاهَا صَلَاةَ الْعَصْرِ، وَصَلَّى مَعَهُ قَوْمٌ، فَخَرَجَ رَجُلٌ مِمَّنْ صَلَّى مَعَهُ، فَمَرَّ عَلَى أَهْلِ مَسْجِدٍ وَهُمْ رَاكِعُونَ، فَقَالَ: أَشْهَدُ بِاللّٰهِ لَقَدْ صَلَّيْتُ مَعَ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ قِبَلَ مَكَّةَ، فَدَارُوا كَمَا هُمْ قِبَلَ الْبَيْتِ، وَكَانَتِ الْيَهُودُ قَدْ أَعْجَبَهُمْ إِذْ كَانَ يُصَلِّي قِبَلَ بَيْتِ الْمَقْدِسِ وَأَهْلُ الْكِتَابِ، فَلَمَّا وَلَّى وَجْهَهُ قِبَلَ الْبَيْتِ أَنْكَرُوا ذٰلِكَ.))

''نبی ﷺ پہلے پہل جب مدینہ تشریف لائے تو انصار کے اپنے ددھیال یا ننھیال میں اترے، اور آپ نے ۱۶ ماہ یا ۱۷ ماہ بیت المقدس کی طرف رخ کرکے نمازیں پڑھیں، آپ کو یہی پسند تھا کہ آپ کا قبلہ بیت اللہ کی طرف ہو اور آپ نے جو پہلی پوری نماز، بیت اللہ کی طرف رخ کرکے پڑھی وہ عصر کی نماز تھی، آپ کے ساتھ اور لوگوں نے بھی بیت اللہ کی طرف رخ کرکے یہ نماز پڑھی، جن لوگوں نے آپ کے ساتھ نماز پڑھی تھی ان میں سے ایک صاحب نکلے اور ان کا گزر ایک مسجد کے نمازیوں کے پاس سے ہوا جو رکوع کی حالت میں تھے، انہوں نے کہا: میں اللہ کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مکہ کی

---

[1] بخاری: ۴۰۳، ۴۴۸۸، ۴۴۹۰، ۴۴۹۱، ۴۴۹۴، ۷۲۵۱، مسلم: ۵۲۶

Marfat.com

طرف رخ کر کے نماز پڑھی ہے۔ یہ سن کر وہ جس حال میں تھے اسی حال میں بیت اللہ کی سمت میں گھوم گئے۔ یہودیوں کا حال یہ تھا کہ جب نبی ﷺ بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے تھے تو یہ ان کو پسند آتا تھا اور اہل کتاب کو بھی پسند آتا تھا، لیکن جب آپ نے اپنا چہرہ بیت اللہ کی طرف پھیر لیا تو انہوں نے اس کو ناپسند کر دیا۔''

حدیث کی تشریح:

۱۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث میں ہے کہ قباء میں نماز فجر ادا کرنے والوں کو تحویل قبلہ کی خبر دینے والے نے کہا تھا کہ: ((أن رسول اللہ ﷺ قد أنزل علیه اللیلة قرآن .)) ''رسول اللہ ﷺ پر رات کو قرآن نازل کیا گیا ہے۔'' جبکہ طبقات ابن سعد (ص: ۲۴۲، ج: ۱) کے مطابق تحویل قبلہ کی آیتیں بنوسلمہ کی ایک مسجد میں نماز ظہر ادا کرتے ہوئے نازل ہوئی تھیں تو اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ ''اللیلة'' کا اطلاق گزشتہ دن کے بعض حصہ پر کیا جاتا ہے اور اس کے بعد آنے والی رات پر بھی (فتح الباری، ص: ۴۷۷، ج: ۱) اسی وجہ سے صبح کی نماز ادا کرنے والے مسلمانوں کو خبر دینے والے نے رات کی تعبیر اختیار کی تھی۔

۲۔ عبداللہ بن عمر کی حدیث کے مطابق مسجد قباء میں تحویل قبلہ کی خبر اس وقت پہنچی جب لوگ نماز فجر ادا کر رہے تھے اور ایک رکعت ادا کر چکے تھے۔ جبکہ براء بن عازب کی حدیث کے مطابق انصار کے محلے کی مسجد میں یہ خبر اس وقت پہنچی جب لوگ عصر کی نماز بنوسلمہ کی مسجد میں میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نماز ظہر ادا کرنے والے ایک صحابی عباد بن بشر بن قیظی نے انصار کی مسجد کے پاس سے گزرتے ہوئے جب لوگوں کو دیکھا کہ وہ بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز عصر ادا کر رہے ہیں تو انہوں نے ان کو بتایا کہ وہ نبی ﷺ کے ساتھ نماز ظہر بیت اللہ کی طرف رخ کر کے ادا کر کے آ رہے ہیں اس طرح لوگوں نے نماز ہی میں اپنا رخ کعبہ کی طرف کر لیا۔ اور یہی خبر قباء میں لوگوں کو نماز فجر ادا کرتے ہوئے ملی اور انہوں نے اسی حالت میں بیت اللہ کو قبلہ بنا لیا اس طرح دونوں میں کوئی تعارض نہیں رہ جاتا۔

۳۔ براء بن عازب رضی اللہ عنہ کی حدیث میں نبی ﷺ کے بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنے کی مدت ۱۶ ماہ ۱۷ ماہ، شک کے ساتھ بیان کی گئی ہے تو یہ شک سند کے بعض راویوں، مثلاً زہیر، ابونعیم اور سفیان ثوری کی راویتوں میں ہے، لیکن اسی حدیث کی دوسری سندوں میں ۱۶ ماہ کی مدت بیان کی گئی ہے، تو یہ بھی کوئی اختلاف بیان نہیں ہے، کیونکہ جن راویوں نے ۱۶ ماہ کی مدت بیان کی ہے انہوں نے ربیع الاول کے مہینے کے ان دنوں کو جس میں نبی ﷺ مدینہ پہنچے تھے، اسی طرح ماہ رجب کے ان دنوں کو جس میں تحویل قبلہ کا حکم نازل ہوا تھا، شمار نہیں کیا ہے اس طرح ۱۶ ماہ ہوتے ہیں اور جن لوگوں نے ۱۷ ماہ کی مدت بتائی ہے انہوں نے ماہ ربیع الاول اور ماہ رجب کے

Marfat.com

دنوں کو شمار کر لیا ہے۔ حافظ ابن حجر کے مطابق تحویل قبلہ کا حکم رجب کی ۱۵ تاریخ کو نازل ہوا تھا، شعبان کی ۱۵ تاریخ کو نہیں۔ (فتح الباری، ص: ۲۹۶، ج ۱)

۴۔ براء بن عازب کی حدیث میں جو یہ آیا ہے کہ: ((وأنه ﷺ أول صلاة صلاها، صلاة العصر.)) ''نبی ﷺ نے جو پہلی نماز ادا فرمائی وہ عصر کی نماز تھی۔'' تو اس سے ان کی مراد ((أول صلاة صلاها متوجها إلى الكعبة صلاة العصر.)) ''وہ پہلی نماز جو نبی ﷺ نے کعبہ کی طرف رخ کر کے پڑھی نماز عصر ہے۔'' چونکہ سلسلہ بیان سے یہ بات واضح تھی اس لیے اختصار سے کام لیا۔ ❶

۵۔ حدیث میں "أهل الكتاب" "اليهود" پر عطف ہے یعنی عطفِ عام خاص پر۔

وجہ استدلال:

امام شافعی رحمہ اللہ اس حدیث سے ''حدیث واحد'' کے حجت ہونے پر استدلال کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

اہل قباء انصار کے ان لوگوں میں سے تھے جن کو ''سبقت الی الاسلام'' اور علم میں ایک خاص مقام حاصل تھا اور جس قبلہ کی طرف منہ کر کے وہ نماز پڑھ رہے تھے وہ اللہ نے ان پر فرض کیا تھا۔ ایسی صورت میں ان کے لیے اللہ کے فرض کردہ قبلہ کو ترک کرنا صرف اسی ذریعہ علم سے جائز تھا جو ان کے لیے حجت ہو، ورنہ وہ نہ تو رسول اللہ ﷺ سے ملے تھے اور نہ انہوں نے وہ آیت ہی سنی تھی جو رسول اللہ ﷺ پر تحویل قبلہ سے متعلق نازل ہوئی تھی کہ اس طرح وہ اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت کو بذات خود سن کر، یا متعدد افراد کے خبر دینے کے بموجب نئے قبلہ کی طرف رخ پھیرنے والے قرار پاتے، بلکہ انہوں نے محض ایک شخص کے یہ خبر دینے کی بنیاد پر کہ رسول اللہ ﷺ پر تحویل قبلہ کا حکم نازل ہو گیا ہے اس قبلہ سے رخ پھیر کر کعبہ کی طرف اپنا چہرہ کر لیا جو ان پر فرض تھا۔ انہوں نے ایسا اس لیے کیا کہ ان کو یہ معلوم تھا کہ اگر خبر دینے والا سچا ہو تو اس کی خبر حجت ہے جس پر عمل کرنا فرض ہے۔ کیونکہ اگر خبر واحد حجت نہ ہوتی تو رسول اللہ ﷺ نے ان سے فرمایا ہوتا کہ: تم جس قبلہ پر تھے اس سے رخ پھیرنا تمہارے لیے اس وقت تک جائز نہ تھا جب تک تم پر، براہ راست مجھ سے سن کر، یا جم غفیر، یا ایک سے زیادہ افراد کے میری نسبت سے خبر دینے سے حجت نہ قائم ہو جاتی۔ ❷

تحویل قبلہ اور تحریف قرآن:

قرآن کی لفظی تحریف کرنے کی جرأت تو کوئی احمق ہی کر سکتا ہے، البتہ قرآن کی معنوی تحریف تو معتزلہ کے دور سے جاری ہے اور جس چیز کا نام انہوں نے ''تاویل'' دیا ہے اور پھر انہی کی پیروی میں متکلمین، صوفیا اور برصغیر کے اہل قرآن الفاظ اور تعبیرات کی تاویل کر کے ان کو اپنے باطل افکار ونظریات سے ہم آہنگ بنانے کی کوشش کرتے آ رہے

❶ فتح الباری، ص: ۲۹۶، ج ۱ ❷ الرسالۃ، ص: ۱۷۰-۱۷۱

Marfat.com

ہیں۔تو یہ دراصل تاویل کے نام سے تحریف ہے۔

منکرین حدیث میں جن لوگوں کو کچھ علم ہے ان کو یہ معلوم ہے کہ قرآن اور حدیث میں نہ کوئی تعارض ہے اور نہ ہو سکتا ہے اس لیے وہ پہلے تفسیر اور تاویل کے نام سے قرآن میں تحریف کرتے ہیں، پھر اس آیت اور اس کی تفسیر و بیان سے متعلق حدیث میں تعارض کا دعویٰ کر کے حدیث کا انکار کرتے ہیں اس طرح ان کا جرم یہود کے جرم سے بھی بڑھ گیا ہے، یعنی حدیث دشمنی میں قرآن میں تحریف۔

''مفتاح القرآن'' کے نام سے ایک نا تمام تفسیر شبیر احمد ازہر میرٹھی نے لکھی ہے یہ تفسیر تو میرے سامنے نہیں ہے، مگر اس کا ایک طویل تعارف، تفسیر مفتاح القرآن کا ایک مطالعہ'' کے عنوان سے اس وقت میرے سامنے ہے جو ڈاکٹر غطریف شہباز ندوی کا تحریر کردہ ہے، تعارف نگار نے شبیر احمد کو علامہ اور ان کی تفسیر کو بیسویں صدی کا ایک عظیم قرآنی کارنامہ قرار دیا ہے۔

حسن اتفاق یہ کہ میں تحویل قبلہ کے موضوع پر لکھ رہا تھا کہ ڈاکٹر شہباز ندوی کا مذکورہ تعارفی مقالہ اپنے ایک کرم فرما کے ذریعہ مجھے مل گیا جس میں تحویل قبلہ کے بارے میں مفتاح القرآن کے مصنف کی ہرزہ سرائی یا تحریف ''تحقیق علمی'' کے نام سے موجود ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ اصل کتاب میرے سامنے نہیں ہے۔لیکن چونکہ ندوی صاحب ان کے بے حد عقیدت مند لگتے ہیں اور انہوں نے ان کی رائے کا خلاصہ نقل کر دیا ہے اس لیے ان کا دعویٰ یا تحریف صحیح صورت میں بیان ہوگئی ہے۔ اگرچہ الفاظ ندوی صاحب کے ہیں ''علامہ'' شبیر احمد کے نہیں۔

''ندوی تحویل قبلہ کی بحث'' کے تحت لکھتے ہیں:

''مسلمانوں میں عام پھیلی ہوئی بات یہ ہے کہ بیت المقدس قبلہ اول رہا ہے اور تحویل قبلہ کے بعد کعبہ کو مستقل قبلہ بنایا گیا، مگر صاحب مفتاح القرآن کے نزدیک تحویل قبلہ والی روایات کمزور ہیں اور تحویل قبلہ ہوا نہیں، کعبۃ اللہ ہی ہمیشہ قبلہ رہا ہے ان کے دلائل کا خلاصہ یہ ہے:

۱۔ تحویل قبلہ کی روایات حضرت براء بن عازب سے مروی ہیں جو سب روایت و درایت کے اعتبار سے کمزور ہیں۔

۲۔ نبی کریم ﷺ نے مکہ یا مدینہ دونوں جگہ ہمیشہ بیت اللہ کی طرف رخ کر کے ہی نماز پڑھی ہے بعض انصاری صحابہ نے البتہ بیت المقدس کی طرف رخ کر کے ضرور نماز پڑھی ہے اور اسی وجہ سے یہ تحویل قبلہ والی بات مشہور ہوگئی ہے۔

۳۔ بیت المقدس تو خود کعبہ رخ ہے، اسی طرح قدیم مسجدیں، مسجد صخرہ، اور مسجد نوح اور مسجد صالح سب قبلہ رخ ہیں، پھر بیت المقدس کو قبلہ اول کہنا کیسے درست ہوسکتا ہے۔

۴۔ ﴿فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰهَا﴾ (البقرة: ١٤٤) کا عام ترجمہ کہ: ''ہم تمہارا رخ تمہارے پسندیدہ قبلہ کی طرف پھیر دیں گے۔'' غلط ہے، کیونکہ ''ولیّ'' کا معنی والی بنانا ہوتا ہے، پھیرنے کے معنی میں اس کا استعمال ''إلی'' کے

Marfat.com

صلہ کے ساتھ کرتے ہیں، اس لیے صحیح ترجمہ ہوگا: ''ہم تم کو تمہارے پسندیدہ قبلہ کا والی بنا دیں گے'' اسی طرح ﴿قَدْ نَرٰی تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ﴾ (البقرة: ١٤٤) کا ترجمہ یہ کرنا کہ: ''ہم آپ کا بار بار آسمان کی طرف رخ کرنا دیکھ رہے ہیں۔'' اس لیے صحیح نہیں کہ یہ: ﴿تَقَلُّبَ وَجْهِكَ إِلَى السَّمَآءِ﴾ کا ترجمہ ہے: ''ہم آسمان میں آپ کی بے چینی کا مشاہدہ کر رہے ہیں۔'' یعنی تقلب وجہ کنایہ ہے بے چینی واضطراب سے۔''

۵۔ قدیم مفسرین وعلماء میں ابو مسلم اصفہانی اور امام ابو العالیہ ریاحی بھی اس کے قائل تھے کہ قبلہ ہمیشہ کعبۃ اللہ رہا ہے۔

۶۔ تحویل قبلہ ہوا ہوتا تو اس کے بعد مسجد نبوی اور مسجد قبا میں تعمیری تغیرات کیے جاتے جو ضرور منقول ہوتے، کیونکہ مسجد نبوی کے تمام تعمیری تغیرات تواتر سے منقول ہوتے آ رہے ہیں۔ ❶

شبیر احمد میرٹھی کی ہرزہ سرائیوں کا جواب:

غطریف شہباز ندوی نے میرٹھی کے مذکورہ بالا اقوال کو دلائل کا نام دیا ہے۔ جو دلائل نہیں ہرزہ سرائیاں ہیں اور ان پر یہ عربی مثل صادق آتی ہے: ((خالف تُشهر)) ''مخالفت کرو شہرت پاؤ گے۔'' لیکن چونکہ ندوی صاحب ان کی تفسیر قرآن کی، جو دراصل تحریف قرآن ہے بذریعہ انٹرنیٹ کافی ترویج کر رہے ہیں۔ اس لیے ان کا رد کرنا بھی ضروری ہے، تاکہ کم پڑھے لکھے لوگ خاص طور پر جو قرآن وحدیث سے براہ راست استفادہ کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ یا جو طبقہ انکار حدیث کے نعرہ سے متاثر ہے یہ سب یہ سمجھ سکیں کہ ''علمی تحقیق'' کے پردہ میں کہی جانے والی بیشتر باتیں نہ علمی ہیں اور نہ تحقیق۔

ندوی نے تحویل قبلہ کے انکار سے متعلق میرٹھی کے دعووں کا خلاصہ نقل کرنے سے پہلے جو یہ فرمایا ہے کہ: ''مسلمانوں میں عام پھیلی ہوئی بات یہ ہے کہ بیت المقدس قبلہ اول رہا ہے اور تحویل قبلہ کے بعد کعبہ کو مستقل قبلہ بنایا گیا۔'' تو یہ مسلمانوں میں عام پھیلی ہوئی بات'' نہیں، بلکہ ایسا قرآنی بیان ہے جس کا انکار، یا جس کی تاویل یا جس کی تحریف بھی کسی کے بس میں نہیں؛

ارشاد الٰہی ہے:

﴿سَيَقُولُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِي كَانُوْا عَلَيْهَا﴾ (البقرة: ١٤٢)

''لوگوں میں سے نادان افراد عنقریب ضرور یہ کہیں گے کہ ان لوگوں کو ان کے اس قبلہ سے کس چیز نے پھیر دیا جس پر یہ تھے۔''

﴿وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنْتَ عَلَيْهَآ إِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيْهِ﴾ (البقرة: ١٤٣)

''اور ہم نے وہ قبلہ جس پر تو تھا، مقرر نہیں کیا تھا، مگر اس لیے کہ ہم جان لیں کہ کون اس شخص سے الگ ہو کر

---

❶ ص ۱۹-۲۰

Marfat.com

رسول کی پیروی کرتا ہے جو اپنی دونوں ایڑیوں کے بل پھر جاتا ہے۔''

یہ دونوں آیتیں پوری صراحت سے اور بہانگ دہل یہ اعلان کر رہی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین پہلے جس قبلہ پر عمل پیرا تھے اس کو ترک کر کے انہوں نے اپنا کوئی اور قبلہ بنا لیا ہے اور ان کا سابقہ قبلہ اللہ تعالیٰ ہی کا مقرر کردہ تھا۔ ﴿کَانُوْا عَلَیْهَا﴾ اور ﴿کُنْتَ عَلَیْهَا﴾ کے فقرے یہ صراحت کر رہے ہیں کہ نبی ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کسی اور قبلہ پر تھے اور ﴿مَا وَلّٰهُمْ﴾ اس امر پر دلالت کر رہا ہے کہ اس قبلہ سے انہوں نے اپنا رخ پھیر لیا ہے، اس طرح اللہ تعالیٰ کے ارشاد سے دو قبلوں کا وجود ثابت ہو رہا ہے اور بصراحت ثابت ہو رہا ہے۔

اور آیت نمبر ۱۴۳ کے فقرہ: ﴿مَنْ یَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ﴾ سے یہ ثابت ہو رہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی پیروی اللہ کے حکم کی اطاعت ہے، اس لیے کہ کعبہ سے پہلے جس قبلہ کی طرف رخ کر کے مسلمان نماز پڑھ رہے تھے وہ بھی اللہ تعالیٰ کا مقرر کردہ تھا: ﴿وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِیْ کُنْتَ عَلَیْهَا﴾ اس پر دلالت کر رہا ہے۔ دوسرے لفظوں میں قرآن وسنت شرعی حکم میں مساوی ہیں۔

ایک قابل غور نکتہ:

آیت نمبر ۱۴۲: ﴿سَیَقُوْلُ السُّفَهَآءُ﴾.... تحویل قبلہ پر عمل سے پہلے نازل ہوگئی تھی جس پر اسلوب کلام دلیل ہے۔ یہ دراصل تحویل قبلہ کی تمہید ہے، یہودیوں کے لیے یہ سنہری موقع تھا کہ وہ تحویل قبلہ پر خاموش رہ کر اس کی تکذیب کر دیں، مگر یہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ تھا جس کا ٹالنا ان کے لیے ممکن نہیں تھا!!!

۱۔ شبیر میرٹھی کا دعویٰ ہے کہ تحویل قبلہ کی روایات حضرت براء بن عازب سے مروی ہیں جو سب روایت ودرایت کے اعتبار سے کمزور ہیں۔

تحویل قبلہ کی روایات کی استنادی حیثیت:

روایت کے ساتھ ''درایت'' کے لفظ کا استعمال ایک فیشن بن چکا ہے، میرٹھی قرآنی تعبیرات کو بھی نہیں سمجھتے تھے جیسا کہ آگے آ رہا ہے تو صحیحین کی حدیثوں کو روایت ودرایت کے اعتبار سے کمزور کہہ کر رد کر دینے کی کیا علمی اہمیت ہو سکتی ہے چونکہ ندوی نے ان حدیثوں کی تضعیف سے متعلق ان کے دلائل نقل نہیں کیے ہیں، لہٰذا میں صرف یہ عرض کرنے پر اکتفا کرتا ہوں کہ تحویل قبلہ کی حدیثیں صحیحین میں براء بن عازب، عبداللہ بن عمر اور انس بن مالک رضی اللہ عنہم سے نہایت قوی اور بے غبار سندوں سے مروی ہیں۔ [1]

۲۔ نبی کریم ﷺ نے مکہ یا مدینہ دونوں جگہ ہمیشہ بیت اللہ کی طرف رخ کر کے ہی نماز پڑھی ہے، بعض انصاری صحابہ نے البتہ بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز ضرور پڑھی ہے اسی وجہ سے یہ تحویل قبلہ والی بات مشہور ہوگئی۔''

---

[1] بخاری: ۴۰، ۳۹۹، ۳۰۹۹، ۴۰۳، ۴۴۸۶، ۴۴۸۸، ۴۴۹۰، ۴۴۹۲، مسلم: ۵۲۵، ۵۲۶، ۵۲۷

Marfat.com

رسول اللہ ﷺ امر الٰہی کے پابند تھے:

جب قرآن سے یہ ثابت ہے کہ کعبہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنے کا حکم آنے سے قبل جس قبلہ کی طرف رخ کر کے رسول اللہ ﷺ نماز پڑھتے تھے وہ اللہ کا مقرر کردہ تھا اور کعبہ یعنی بیت اللہ کے علاوہ تھا تو پھر اس غلط بیانی کی کیا ضرورت تھی، کیا اس سے بیت اللہ کی عظمت میں کوئی اضافہ ہوگیا؟ پھر اگر آپ کے دعویٰ کے مطابق نبی ﷺ نے ہمیشہ بیت اللہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی ہے تو کیا یہ بات تصور میں بھی آ سکتی ہے کہ بعض انصاری صحابہ نے بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھی ہے، چونکہ میرٹھی نے اپنے اس دعوے کی کوئی دلیل نہیں دی ہے اور نہ کسی کتاب کا حوالہ دیا ہے اس لیے اس دعویٰ کے رد میں مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔

۳۔ میرٹھی کا دعویٰ ہے کہ بیت المقدس تو خود کعبہ رخ ہے، اس طرح قدیم مسجدیں، مسجد صخرہ اور مسجد نوح اور مسجد صالح قبلہ رخ ہیں، پھر بیت المقدس کو قبلہ اول کہنا کیسے درست ہوسکتا ہے؟

آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟

بیت اللہ کے ہمیشہ قبلہ رُخ رہنے اور تحویل قبلہ کے محض عام بات ہونے پر علامہ میرٹھی کا مذکورہ دعویٰ دل بہلانے کے لیے ایک لطیفہ تو قرار دیا جا سکتا ہے، دلیل کے طور پر اس کا بیان تو کوئی سر پھرا شخص ہی کرے گا۔ یہ بیت المقدس اور دوسری قدیم مسجدوں کے قبلہ رخ ہونے سے ان کی کیا مراد ہے، اگر ان سے ان کی مراد یہ ہے کہ بیت المقدس کو یہودیوں نے قبلہ رخ بنایا تھا اور اس سے وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ یہودیوں کے نزدیک بھی بیت اللہ ہی قبلہ عالم ہے تو یہ قرآن کی تکذیب ہے دراصل دنیا میں جتنی تاریخی مسجدیں ہیں وہ عہد اسلامی کی تعمیر کردہ ہیں، ظاہری بات ہے کہ یہ سب قبلہ رخ ہوں گی خود مسجد اقصی سلیمان علیہ السلام کی تعمیر کردہ نہیں ہے، اسلامی عہد میں عبدالملک بن مروان (متوفی ۷۶ھ) نے مسجد اقصیٰ کی تعمیر کا کام شروع کیا جس کی تکمیل اس کے بیٹے ولید نے (متوفی ۹۶ھ) کی، البتہ مسجد صخرہ کو عبدالملک ہی نے تعمیر کرایا۔ رسولوں کے نام سے جو مسجدیں ہیں جیسے مسجد نوح اور مسجد صالح وغیرہ تو یہ بھی مسلمانوں کی تعمیر کردہ ہیں، بطور انتساب یہ ان کے ساتھ نوح اور صالح علیہما السلام کا نام ہے۔ میرٹھی یہ مغالطہ دے رہے ہیں کہ یہ ان رسولوں کی تعمیر کردہ ہیں، اور ان کا رُخ بیت اللہ کی طرف ہے: ﴿فَاعْتَبِرُوْا يٰٓاُولِي الْاَبْصَارِ﴾

۴۔ وَلّٰی یُوَلِّیْ تَولیۃ کی لغوی تحقیق:

''علامہ'' میرٹھی نے تحویل قبلہ کے انکار میں جو خامہ فرسائی کی ہے اس میں بیت القصید سورۂ بقرہ کی آیت نمبر ۱۴۴ کے دو فقروں: ﴿فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰهَا﴾ اور ﴿قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ﴾ کی تفسیر ہے۔ پہلے فقرہ کا ترجمہ کرنے سے قبل فرماتے ہیں:

﴿فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰهَا﴾ کا عام ترجمہ کہ ''ہم تمہارا رخ تمہارے پسندیدہ قبلہ کی طرف پھیر دیں گے'' غلط

Marfat.com

ہے، کیونکہ ولّیٰ کا معنی والی بنانا ہوتا ہے، پھیرنے کے معنی میں اس کا استعمال "إلی" کے صلہ کے ساتھ کرتے ہیں، اس لیے صحیح ترجمہ ہوگا: ہم تم کو تمہارے پسندیدہ قبلہ کا والی بنا دیں گے۔

ایک عام اردو دان جس کو عربی نہیں آتی اور جو قرآنی تعبیرات پر بھی نظر نہیں رکھتا ان کے اس دعویٰ کو درست مان لے گا اور ان کو "علامہ" کہنے لگے گا جیسا کہ ڈاکٹر غطریف ندوی نے کیا ہے آیئے میں موصوف کی غلط بیانی کا پول کھولتا ہوں۔

ولّٰی یُولّی تولیة:

یہ ایک کثیر المعنی اور کثیر الاستعمال فعل ہے یہ باب "تفعیل" سے ہے جس کا ایک مصدر "تفعلة" کے وزن پر بھی آتا ہے جیسے: زکّی یُزکّی تزکیة، جزّأ یُجزیٔ تجزئة، هنّأ یُهنّیءُ تهنئة وغیرہ۔

ولّی یُولّی لازم بھی آتا ہے اور متعدی بھی۔

لازم کی مثال:

﴿وَلّٰی مُدْبِرًا﴾ (النمل: ١٠)

"پیٹھ پھیر کر بھاگا۔"

اگر صرف واپس ہونے اور لوٹنے کے معنی میں ہو تو اس کے بعد صلہ "إلی" آتا ہے۔ سورۂ احقاف میں جن کے نبی ﷺ سے قرآن سننے کا واقعہ بیان کرنے کے بعد فرمایا گیا ہے:

﴿فَلَمَّا قُضِیَ وَلَّوْا اِلٰی قَوْمِهِمْ مُّنْذِرِیْنَ﴾ (الاحقاف: ٢٩)

"اور جب وہ پڑھا جا چکا تو وہ اپنی قوم کی طرف ڈرانے والے بن کر لوٹے۔"

متعدی کی مثال:

﴿وَاِنْ یُّقَاتِلُوْكُمْ یُوَلُّوْكُمُ الْاَدْبَارَ﴾ (آل عمران: ١١١)

"اور اگر یہ تم سے لڑیں گے تو تم کو پیٹھ دے دیں گے۔"

عربی میں اس کو یوں کہہ سکتے ہیں:

((یجعلون الأدبار تلیکم.))

"یعنی اپنی پیٹھ یا اپنا پیچھا تم سے قریب کر دیں گے۔"

متعدی ہونے کی صورت مین اس کے دو مفعول آتے ہیں، جیسا کہ آیت میں ہے۔

ولی یولی کے دوسرے معنی:

ولی یولی کے دوسرے معنی کسی چیز کی طرف رخ کرنے اور متوجہ ہونے کے ہیں یہ فعل لازم ہے، اسی طرح اس کے

Marfat.com

معنی کسی کو کسی چیز کی طرف پھیرنے اور کسی چیز کے حوالے اور سپرد کر دینے کے بھی ہیں۔

فعل لازم کی مثال:

﴿فَأَيْنَمَا تُوَلُّوا فَثَمَّ وَجْهُ اللَّهِ﴾ (البقرة: ۱۱۵)

''تو تم جس طرف متوجہ ہو وہیں اللہ کا چہرہ ہے۔''

دوسرا ترجمہ ہے: ''تم جس طرف رخ کرو وہی اللہ کا قبلہ ہے۔''

پہلے ترجمہ کی رو سے ارشاد الٰہی کا مطلب ہوگا کہ نماز میں تم جس سمت کی طرف بھی رخ کرو، شمال کی جانب کرو، جنوب کی جانب کرو، مشرق کی طرف کرو، مغرب کی طرف کرو تم کعبہ ہی کی طرف متوجہ ہوگے اس طرح ہر چہار جانب سے ہر شخص کا رخ اللہ ہی کی طرف ہوگا، اور فعلا دنیا کے ہر حصے میں بسنے والے مسلمانوں میں سے کوئی مشرق کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتا ہے تو کوئی مغرب کی طرف اور کوئی شمال کی طرف چہرہ کر کے نماز پڑھتا ہے تو کوئی جنوب کی طرف، مگر سب کعبہ اور بیت اللہ ہی کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

دوسرے ترجمہ کی رو سے ''وجہ اللہ'' کے معنی "جهة الله" کے ہیں۔ یہ بھی صحیح ہے، کیونکہ مشرق و مغرب اور شمال و جنوب ہر جگہ نماز پڑھنے والے کعبہ کی طرف ہی متوجہ ہوتے ہیں جو ''قبلۃ اللہ'' ہے جس طرح کعبہ بیت اللہ ہے۔

فعل متعدی کی مثال:

﴿فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ﴾ (البقرة: ۱۴۴)

''سو تم اپنا چہرہ مسجد حرام کی طرف پھیر دو اور تم لوگ جہاں بھی ہو سو اپنے چہرے اس کی طرف پھیر دو۔''

جہاں یہ فعل پیٹھ پھیرنے اور راہ فرار اختیار کرنے کے معنی میں آیا ہے وہاں اس کے دو مفعول آئے ہیں اسی طرح اس دوسرے معنی میں بھی اس کے دو مفعول آتے ہیں۔

ولی یولی کے تیسرے معنی:

اس فعل کے ایک اور معنی والی اور ذمہ دار بنانے کے بھی ہیں جس کی مثال ہے:

"ولی فلان فلانا الأمر" فلاں نے فلاں کو کسی کام کا ذمہ دار، نگراں یا والی بنا دیا۔

ولی یولی کے چوتھے معنی:

ولی یولی کے چوتھے معنی یہ ہیں کہ جس نے جو راہ اور جو روش اختیار کی ہے اس کو اس کی طرف پھیر دیا جائے، اس کے حوالہ اور سپرد کر دیا جائے، ارشاد ربانی ہے:

﴿وَمَنْ يُشَاقِقِ الرَّسُولَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدَى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ نُوَلِّهِ مَا تَوَلَّى﴾ (النساء: ۱۱۵)

Marfat.com

''اور جو اپنے لیے ہدایت کے خوب واضح ہو جانے کے بعد رسول کی مخالفت کرے اور مومنین کے راستے کے سوا کسی اور راستے کی پیروی کرے ہم اسے اس راہ کے حوالہ کر دیں گے جو اس نے اپنائی ہے۔''

ولی یولی کے یہ چار معنی اس کے استعمال کے قاعدے، اور قرآن سے اس کی مثالیں اس جامعیت اور اختصار کے ساتھ آپ کو کہیں نہیں ملیں گی ان مثالوں سے میں نے جہاں ''ولی یولی'' کے استعمال کا قاعدہ واضح کرنا چاہا ہے وہیں میرا مقصد یہ بھی بیان کرنا تھا کہ کسی بھی استعمال میں اس فعل کا کوئی صلہ نہیں آتا سوائے ایک صورت کے جب کسی چیز سے یا کسی عمل سے کسی کو پھیر دیا جائے، تو جس چیز سے کسی کو روک دیا جائے، پھیر دیا جائے تو اس پر "عن" صلہ آتا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد میں ہے:

﴿سَيَقُولُ السُّفَهَاءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِي كَانُوا عَلَيْهَا....﴾ (البقرة: ۱۴۲)

''لوگوں میں نادان افراد عنقریب ضرور یہ کہیں گے کہ ان لوگوں کو ان کے اس قبلہ سے کس چیز نے پھیر دیا جس پر یہ تھے۔''

میں نے اتنی تفصیل سے اس مسئلہ پر اس لیے روشنی ڈالی ہے تاکہ ''علامہ'' میرٹھی کی تحریفات قرآنی سب کے سامنے واضح ہو سکیں اور انہوں نے یہ سب کچھ تحویل قبلہ کی احادیث کا انکار کرنے کے لیے کیا ہے۔ اب آیئے ان کی ہرزہ سرائیوں پر ایک بار پھر نظر ڈالتے ہیں۔

فرماتے ہیں:

﴿فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰهَا﴾ کا عام ترجمہ کہ: ''ہم تمہارا رخ تمہارے پسندیدہ قبلہ کی طرف پھیر دیں گے۔'' غلط ہے، کیونکہ ولی کا معنی ''والی'' بنانا ہوتا ہے، پھیرنے کے معنی میں اس کا استعمال "إلی" کے صلہ کے ساتھ کرتے ہیں، اس لیے صحیح ترجمہ ہوگا: ''ہم تم کو تمہارے پسندیدہ قبلہ کا والی بنا دیں گے۔''

غور فرمایئے کس ڈھٹائی سے صحیح ترجمہ کو غلط ترجمہ قرار دے ڈالا! میں نے اوپر ''ولی'' کے استعمال کی قرآن سے جو مثالیں دی ہیں ان میں نہ تو اس کا صلہ "إلی" آیا ہے اور نہ ہی کسی جگہ "ولیّ" بنانے کے آئے ہیں اور یہ معلوم ہے کہ قرآن قرآن کی تفسیر کرتا ہے۔

اگر ﴿فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰهَا﴾ کا صحیح ترجمہ یہ ہے کہ: ''ہم تم کو تمہارے پسندیدہ قبلہ کا والی بنا دیں گے۔'' تو اس کے معاً بعد ﴿فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ﴾ کا مطلب کیا ہوگا۔ کیا جس شخص کو کسی چیز کا والی بنایا جاتا ہے اس کے فرائض میں سرفہرست یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنا چہرہ اس چیز کی طرف کر لے؟ یہ کون سے ولایت ہوئی؟ پھر قبلہ کا والی کیا ہوتا ہے؟!!

مزید یہ کہ کیا اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد: ﴿قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰهَا فَوَلِّ

Marfat.com

﴿وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ﴾ پکار پکار کر یہ اعلان نہیں کر رہا ہے کہ اس ارشاد الٰہی کے نزول کے وقت تک نبی کریم ﷺ مسجد حرام کے علاوہ کسی اور قبلہ پر تھے، ورنہ یہ سب کچھ فرمانے کی کیا ضرورت تھی، اگر آپ کے دعویٰ کے بموجب نبی کریم ﷺ نے ہمیشہ بیت اللہ کی طرف رُخ کر کے ہی نماز پڑھی ہے تو ﴿قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ﴾ ہم آسمان کی طرف تمہارے چہرے کا بار بار پھرنا یقیناً دیکھ رہے ہیں۔ اور ﴿فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰهَا﴾ تو ہم تم کو اس قبلہ کی طرف ضرور پھیر دیں گے جسے تم پسند کرتے ہو اور ﴿فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ﴾ ''سو تم اپنا چہرہ مسجد حرام کی سمت کر لو'' بے معنی اور خلاف واقع نہیں ہو جائے گا؟

اسی سورۂ بقرہ میں تحویل قبلہ سے متعلق سلسلہ وار ۹ آیتیں آئی ہیں اور اگر آیت نمبر ۱۱۵ کو بھی ان میں شامل کر لیں جو دراصل اس اہم مسئلہ کی تمہید ہے تو کل ۱۰ آیتیں ہو جائیں گی۔ جن میں اللہ تعالیٰ نے ''تحویل قبلہ'' کو مختلف انداز اور اسلوب میں بیان کیا ہے۔ اگر بقول آپ کے ''تحویل قبلہ'' ہوا ہی نہیں تو اس کو اتنی اہمیت کیوں دی گئی، یاد رہے کہ آیت نمبر ۱۴۴ سے آیت نمبر ۱۵۰ تک نبی کریم ﷺ کو دو بار، اور مسلمانوں کو دو بار، مکمل چار بار مسجد حرام کو قبلہ بنانے کا حکم دیا گیا ہے۔ آپ کے دعویٰ کی رو سے کیا یہ سب کچھ تحصیل حاصل نہیں ہے، کیا اللہ کی کتاب کے بارے میں آپ یہی عقیدہ رکھتے ہیں کہ اس میں نعوذ باللہ ایسے واقعات بیان کیے گئے جن کا کوئی وجود نہیں ہے۔

شبیر احمد میرٹھی نے ﴿قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ﴾ کا جو ترجمہ کیا ہے وہ دراصل ایک لطیفہ ہے جس کو لطف لینے کے لیے یا عبرت حاصل کرنے کے لیے پڑھا جا سکتا ہے، فرماتے ہیں:

﴿قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ﴾ کا ترجمہ یہ کرنا کہ: ''ہم آپ کا بار بار آسمان کی طرف رخ کرنا دیکھ رہے ہیں۔'' اس لیے صحیح نہیں ہے کہ یہ ''تقلب وجهك إلى السماء'' کا ترجمہ ہے'' اس کا صحیح ترجمہ یہ ہے کہ: ہم آسمان میں آپ کی بے چینی کا مشاہدہ کر رہے ہیں۔ یعنی ''تقلب وجہ'' کنایہ ہے بے چینی واضطراب سے۔''

میں آپ کے اس ترجمہ پر تبصرہ کرنے سے قبل یہ بتا دوں کہ آیت میں ''فی'' ''اِلیٰ'' ہی کے معنی میں ہے۔ قرآن میں دوسرے ایسے افعال کے صلہ کے طور پر بھی صلہ ''فی'' استعمال کیا گیا جن کا صلہ اِلیٰ آتا ہے۔ مثال کے طور پر ''رد یرد ردا'' کا صلہ ''اِلیٰ'' آتا ہے۔ لیکن قرآن میں ہے: ﴿جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَرَدُّوْٓا اَيْدِيَهُمْ فِيْٓ اَفْوَاهِهِمْ﴾ (ابراھیم: ۹) تو آیت میں فی الی کے معنی میں ہے۔

اسی طرح بعث یبعث کا صلہ بھی الی آتا ہے، لیکن قرآن میں فی آیا ہے اور معنی ''اِلیٰ'' کا ہے: ﴿وَلَوْ شِئْنَا لَبَعَثْنَا فِيْ كُلِّ قَرْيَةٍ نَّذِيْرًا﴾ اور اگر ہم چاہتے تو ضرور ہر بستی کی طرف ڈرانے والا بھیج دیتے۔'' (الفرقان: ۵۱)

قرآن عربی قواعد کی اصل ہے:

قرآن عربی قواعد کی اصل ہے، لہٰذا عام عربی تعبیرات کی صحت کی کسوٹی قرآن ہے نہ کہ ''وضعی قواعد''

Marfat.com

آپ کا یہ دعویٰ ''تقلب وجہ'' کنایہ ہے بے چینی واضطراب سے، دلیل سے عاری ہونے کی وجہ سے مردود ہے۔ قران کے نظم کلام کی روشنی میں نبی کریم ﷺ کے تقلب وجہ کے معنی ہیں کہ تحویل قبلہ کی وحی کے انتظار میں آپ کی نگاہیں بار بار آسمان کی طرف اٹھا کرتی تھیں، کیونکہ جبریل علیہ السلام وحی لے کر آسمان ہی سے نازل ہوتے آپ کے اس فعل میں اضطراب اور بے چینی کے بجائے شوق وانتظار کا عنصر کارفرما تھا۔

اصل قبلہ کعبہ ہی ہے:

مسلمانوں کے لیے صرف کعبہ کے قبلہ ہونے کا مسئلہ تو مسلم ہے، لیکن سورۃ آل عمران کی آیت نمبر ۹۶: ﴿اِنَّ اَوَّلَ بَیۡتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیۡ بِبَکَّۃَ مُبٰرَکًا....﴾ ''درحقیقت پہلا گھر جو لوگوں کے لیے مقرر کیا گیا وہی ہے جو مکہ میں ہے بہت برکت والا'' سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہی سابقہ قوموں کا بھی قبلہ تھا۔ شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے نزدیک ''مسجد حرام'' تمام انبیاء کا قبلہ رہی ہے۔ لیکن یہود و نصاریٰ نے اس کو بدل ڈالا۔ [1]

کعبہ عمارت کا نام نہیں، بلکہ اس جگہ کا نام ہے جہاں اس کی تعمیر ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام کے ہاتھوں ہوئی اس تعمیر یا عمارت سے پہلے بھی اس جگہ پر بیت اللہ کا اطلاق ہوتا تھا؟ ابراہیم علیہ السلام کی دعا ہے:

((ربنا إلى اسكنت من ذريتي بواد غير ذى ذرع عند بيتك المحرم .)) ''اے ہمارے رب! درحقیقت میں نے اپنی بعض اولاد کو بے کھیتی والی وادی میں تیرے محترم گھر کے پاس لا بسایا ہے۔'' ابراہیم علیہ السلام نے یہ دُعا اس وقت کی تھی جب کعبہ کی تعمیر نہیں ہوئی تھی۔

مذکورہ بالا حقائق کے باوجود عارضی طور پر بیت المقدس مسلمانوں کا قبلہ بنایا گیا، یعنی اللہ کے صریح حکم سے۔

ہجرت کے بعد ۱۶ یا ۱۷ ماہ تک تو اس کا قبلہ رہنا ہر شک وشبہ سے پاک ہے، رہی یہ بات کہ کیا عہد مکی میں بھی بیت المقدس مسلمانوں کا قبلہ رہا تو اگرچہ قرآن وحدیث میں اس کا کوئی ذکر نہیں ہے، لیکن ہجرت کے وقت سے لے کر تحویل قبلہ کا حکم آنے اور اس کے قبلہ رہنے سے یہ اشارہ ضرور ملتا ہے کہ عہد مکی میں بھی بیت المقدس قبلہ تھا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

جہاں تک بیت المقدس کو قبلہ بنانے کی حکمت ہے تو اللہ تعالیٰ نے جب خود اس کو بیان کر دیا ہے تو پھر اس کا انکار قرآن کا انکار ہے اور مفتاح القرآن کے مصنف نے تحویل قبلہ کا انکار کر کے جو یہ فرمایا ہے: ''فتنہ انکارِ قرآن کب اور کیسے؟ تو اس کی زد قرآن وحدیث دونوں پر پڑتی ہے۔''

قدیم مسجدیں محراب سے خالی ہوتی تھیں:

شبیر احمد میرٹھی فرماتے ہیں:

---

[1] شیخ عثیمن رحمہ اللہ، تفسیر سورۃ بقرہ ص: ۱۳۷، ج: ۲

Marfat.com

تحویل قبلہ ہوا ہوتا تو اس کے بعد مسجد نبوی اور مسجد قبا میں تعمیری تغیرات کیے جاتے جو ضرور منقول ہوتے، کیونکہ مسجد نبوی کے تمام تعمیری تغیرات تواتر سے منقول ہوتے آ رہے۔

علامہ صاحب! تحویل قبلہ ہجرت پر دو برس بھی مکمل ہونے سے قبل ہو گیا تھا، اس وقت مسجد قبا اور مسجد نبوی معمولی سی کچی عمارتوں سے عبارت تھیں کچی اینٹیں اور کھجور کے پتوں کی چھت، اس وقت محراب وغیرہ بنانے کا فیشن نہ شروع ہوا تھا اور نہ اس تکلف کی ضرورت تھی بیت المقدس کے قبلہ ہونے کی صورت میں ان کے چہرے شمال کی طرف رہے ہوں گے اور کعبہ کو قبلہ بنانے کے وقت انہوں نے اپنا رخ جنوب کی طرف کر لیا ہوگا اور بس اور بعد میں دروازہ نیا بنا لیا ہوگا۔

مسجد نبوی کی جو تعمیرات ہوئی ہیں اور جن کے تذکرے کتابوں میں ہیں وہ توسیعی تعمیرات ہیں ان کے ذکر کے ضمن میں تحویل قبلہ کا ذکر کیوں کیا جاتا، خلیفۂ دوم عمر بن خطاب اور خلیفۂ سوم عثمان بن عفان رضی اللہ عنہما کے زمانوں میں جب مسجد نبوی میں توسیع ہوئی تو تحویل قبلہ کے حکم کے نزول پر ایک عرصہ گزر چکا تھا لہٰذا نئی تعمیر کے ضمن میں کسی بھی وجہ سے اس کے ذکر کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ تو ایک حکم تھا جب نازل ہوا تو اس پر عمل شروع ہو گیا البتہ بنو سلمہ کی جس مسجد میں نماز ظہر ادا کرتے ہوئے تحویل قبلہ کا حکم نازل ہوا تھا، چونکہ اس اہم واقعہ کا اس سے تعلق تھا اس لیے تاریخ میں "مسجد القبلتین" کے نام سے مشہور ہو گئی اور اس وقت سے آج تک اس کا مسلسل وجود اور پھر اس کا نام تحویل قبلہ کی ناقابل انکار دلیل بن گیا۔

میرٹھی جنون العظمۃ کے مریض تھے:

شبیر احمد میرٹھی دراصل جنون العظمۃ بڑے بننے کے خبط میں مبتلا تھے جس کو انگریزی میں MEGOLOMANIA کہتے ہیں۔ وہ تفسیر و حدیث کی صورت میں جو کچھ پڑھتے تھے اس سے ہٹ کر کوئی نئی بات کہنے کا خبط ان کے ذہن پر سوار تھا وہ اپنے ذہن میں پہلے سے جو رائے یا خیال قائم کر لیتے تھے، اگر قرآن اس سے ٹکراتا تھا تو اس کی تحریف کرنے میں بھی ان کو کوئی تردد نہیں تھا اور اگر کوئی حدیث ٹکرائی تھی تو یہ کہہ کر اس کا انکار کر دیتے تھے کہ یہ روایت و درایت کے اعتبار سے کمزور ہے۔ قرآنی آیات کی تفسیر لغت کی مدد سے کرتے تھے جس کا طریقہ کار انہوں نے یہ بنا رکھا تھا کہ کسی لفظ کے معانی اور استعمال کے طریقوں کو لغت کی کتابوں، خاص طور پر لسان العرب میں دیکھ کر جمع کر لیتے، پھر سیاق و سباق سے آزاد ہو کر جو معنی اور استعمال اپنے خیال کے مطابق پاتے اس کے مطابق آیت کی تفسیر کرتے میرے اس دعویٰ کی تائید تحویل قبلہ کے مسائل میں ان کی تحریفات سے ہوتی ہے اس طرح کی مثالوں سے مفتاح القرآن بھری پڑی ہے میں نے تحویل قبلہ کے مسئلہ میں ان کے افکار کا جس تفصیل سے جائزہ لیا ہے اس سے ان کے طرز تفکیر اور مسلمہ قرآنی مسائل کے معارض ان کے نقطہ ہائے نظر کو سمجھا جا سکتا ہے۔

۵۔ پانچویں دلیل، تحریم خمر کی حدیث:

((عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ كُنْتُ أَسْقِي أَبَا طَلْحَةَ وَأَبَا عُبَيْدَةَ بْنَ الْجَرَّاحِ وَأُبَيَّ بْنَ

Marfat.com

كَعْبٍ شَرَابًا مِنْ فَضِيخٍ ، وَهُوَ تَمْرٌ ، فَجَاءَهُمْ آتٍ ، فَقَالَ: إِنَّ الْخَمْرَ قَدْ حُرِمَتْ فَقَالَ أَبُو طَلْحَةَ: يَا أَنَسُ! قُمْ إِلَى هَذِهِ الْجِرَارِ ، فَاكْسِرْهَا ، قَالَ أَنَسٌ: فَقُمْتُ إِلَى مِهْرَاسٍ لَنَا ، فَضَرَبْتُهَا بِأَسْفَلِهَا حَتَّى انْكَسَرَتْ .))

''انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، کہتے ہیں: میں ابوطلحہ، ابوعبیدہ بن جراح اور ابی بن کعب کو کچی کھجور کی شراب پلایا کرتا تھا، اور وہ کھجور ہے، پس ان کے پاس ایک آنے والا آیا اور کہا: درحقیقت شراب حرام قرار دے دی گئی ہے، ابوطلحہ نے کہا: انس! اٹھو اور ان گھڑوں کو توڑ دو، انس کہتے ہیں: میں اٹھا اور اپنی موسلی لیکر ان گھڑوں کے پیندوں پر مارا اور وہ ٹوٹ گئے۔'' [1]

وجہ استدلال:

امام شافعی اس حدیث سے استدلال کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''ابوطلحہ، ابوعبیدہ بن جراح اور ابی بن کعب رضی اللہ عنہم کو علم وفضل، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قرب اور آپ کی قدیم رفاقت کا جو شرف حاصل تھا، اس کا منکر کوئی بھی صاحب علم نہیں ہوگا، پھر شراب ان کے نزدیک حلال تھی جسے وہ پیتے اور پلاتے تھے، مگر جوں ہی ایک شخص نے آکر انہیں اس کی حرمت کی خبر دی تو ابوطلحہ نے شراب کے گھڑوں کو توڑ دینے اور ان میں موجود شراب کو بہا دینے کا حکم دیا۔ انہوں نے یا ان میں سے کسی اور نے یہ نہیں کہا: ہم تو شراب کو حلال سمجھتے ہیں، محض ایک شخص کے یہ خبر دے دینے سے کہ شراب حرام قرار دے دی گئی ہے، اس کو حرام نہیں قرار دے سکتے، الا یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر خود آپ سے اس خبر کی صحت کی تاکید نہ کرلیں، کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہم سے کچھ دور نہیں قریب ہی ہیں، یا شراب کی اس حرمت کی یہ خبر ہمیں کچھ اور لوگوں سے بھی مل جائے، مزید یہ کہ انہوں نے اپنے نزدیک ایک حلال چیز کو بہایا اور ضائع کیا تھا جو اسراف میں آتا ہے اور وہ لوگ ''مسرفین'' میں سے نہ تھے۔''

''اس سے یہ معلوم ہوا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے نزدیک خبر واحد حجت تھی۔''

٦۔ چھٹی دلیل، ہاتھ اور پاؤں کی انگلیوں کی دیت کی حدیث:

ابوبکر بن محمد بن عمرو بن حزم سے روایت ہے، وہ اپنے باپ محمد سے اور وہ ان کے دادا، عمرو بن حزم سے روایت کرتے ہیں:

((أن رسول الله ﷺ كتب إلى اهل اليمن بكتاب فيه الفرائض والسنن والديات فيه...... وفي كل إصبع من الأصابع من اليد والرجل عشرٌ من الإبل .))

[1] بخاری: ۷۲۵۳، مسلم: ۱۹۸۱، موطأ: باب تحریم الخمر، نمبر ۱۳، الرسالہ ص: ۲۷۱، فقرہ: ۱۱۲۰

Marfat.com

''رسول اللہ ﷺ نے اہل یمن کے لیے ایک کتاب لکھ کر بھیجی جس میں فرائض، سنن اور دیت، خون بہا۔ کے احکام بیان کیے گئے ہیں اس میں آیا ہے...... ہاتھ اور پاؤں کی انگلیوں میں سے ہر انگلی کی دیت دس ۱۰ اونٹ ہے۔'' ❶

حدیث کی اسنادی حیثیت:

یہ ایک طویل حدیث ہے جو اپنی سند کے راوی سلیمان بن داود کی وجہ سے ضعیف ہے اور سلیمان بن داود دراصل سلیمان بن ارقم ہے امام ابو داود نے اپنی کتاب ''المراسیل'' میں یہ تصریح کی ہے کہ اس حدیث کی سند کے راوی سلیمان کو جس نے بن داود کہا ہے یہ اس کا وہم وخیال ہے، اصل نام سلیمان بن ارقم ہے۔ ❷

اور سلیمان بن ارقم کے ضعیف ہونے پر ائمہ حدیث کا اتفاق ہے، بلکہ بعض ائمہ نے اس کو متروک قرار دیا ہے، لیکن امام شافعی نے اس حدیث کے جس فقرے سے استدلال کیا ہے، اور جو اوپر نقل کیا گیا ہے اس کے صحیح شواہد دوسری صحیح حدیثوں میں موجود ہیں، مثال کے طور پر ابو داؤد نمبر ۴۵۶۲، نسائی نمبر: ۴۸۵۸-۴۸۶۶، اور ابن ماجہ: ۲۶۵۳۔

عمر رضی اللہ عنہ کی مقرر کردہ دیت:

سعید بن مسیب سے روایت ہے کہ:

((أن عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ قضى في الإبهام بخمس عشرة وفي التي تليها بعشر، وفي الوسطى بعشر، وفي التي على الخنصر بتسع، وفي الخنصر بستٍ.))

''عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے انگوٹھے کی دیت پندرہ اونٹ، انگشت شہادت کی دیت دس اونٹ، درمیانی انگلی کی دس اونٹ، درمیانی انگلی کے بعد کی انگلی جو اس سے ملی ہوتی ہے اس کی نو اونٹ اور آخری اور چھوٹی انگلی کی چھ اونٹ دیت مقرر کر رکھی تھی۔'' ❸

انگلیوں کی دیت میں فرق کی بنیاد:

امام شافعی فرماتے ہیں: چونکہ عمر کے نزدیک مشہور یہی تھا۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ نبی ﷺ نے ہاتھ کی دیت ۵۰ اونٹ مقرر کی ہے اور ہر ہاتھ میں پانچ انگلیاں ہوتی ہیں جو خوبصورتی اور فائدے کے اعتبار سے مختلف درجات رکھتی ہیں اس لیے انہوں نے ان کے یہ درجات برقرار رکھتے ہوئے ہر ہاتھ کی انگلی کی دیت اس کے بقدر ہی مقرر کی تھی ایسا انہوں نے خبر پر قیاس کرتے ہوئے کیا تھا۔ ❹

---

❶ صحیح ابن حبان: ۶۵۵۹　❷ ص: ۲۱۳

❸ سبل السلام ص ۴۴۰ ج ۳، تحفۃ الاحوذی ص: ۱۳۲۴، الرسالہ ص: ۲۷۷، فقرہ: ۱۱۶۰، ۱۱۶۱۔

❹ نیل الاوطار ص: ۱۵۱۱ ج ۲، الرسالہ ص: ۲۷۷۔

Marfat.com

وجہ استدلال:

۱۔ انگلیوں کی دیت کے مسئلہ میں عمر رضی اللہ عنہ کے فیصلے پر عمل جاری تھا، یہاں تک کہ جب آل عمرو بن حزم کی کتاب لوگوں کو مل گئی تو انہوں نے اسے ترک کر کے اس پر عمل شروع کر دیا۔'' (مراد ابو بکر بن محمد بن عمرو بن حزم کی حدیث ہے جس میں اہل یمن کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض احکام لکھوا کر بھیجے تھے)۔

۲۔ لوگوں نے آل عمرو بن حزم کی کتاب کو اس وقت تک قبول نہیں کیا جب تک ان کے نزدیک یہ ثابت نہیں ہو گیا کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کتاب ہے۔

''ابو بکر بن محمد بن عمرو بن حزم کی اس حدیث میں دو باتوں پر دلالت ہوتی ہے۔''

۱۔ خبر واحد مان لی جائے۔

۲۔ خبر اس وقت مانی اور قبول کی جائے جب وہ ثابت ہو، اگرچہ لوگوں کی قبول کردہ خبر پر کسی امام نے عمل نہ کیا ہو۔

ساتویں دلیل، شوہر کی دیت میں بیوی کے حصے کی حدیث:

سعید بن مسیب سے روایت ہے کہ:

((أن عمر بن الخطاب كان يقول: الدية للعاقلة ولا ترث المرأة من دية زوجها شيئاً، حتىٰ أخبره الضحاك بن سُفيان أن رسول الله ﷺ كتب إليه: أن يورث إمرأة أشيَمَ الضبابى من ديته، فرجع إليه عمر .))

''عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ دیت صرف باپ کی طرف کے قرابت داروں کے لیے ہے اور کوئی عورت اپنے شوہر کی دیت سے بطور وراثت کچھ پانے کی حقدار نہیں ہے، یہاں تک کہ ضحاک بن سفیان نے ان کو یہ خبر دی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو تحریری حکم نامہ بھیجا تھا کہ وہ اُشیم ضبابی کی بیوی کو ان کی دیت سے بطور وارث حصہ دیں، یہ سن کر عمر نے اس حدیث کی طرف رجوع کر لیا۔'' [1]

حدیث میں بیان کردہ واقعہ کی تفصیل:

ضحاک بن سفیان رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی قوم میں صدقات جمع کرنے پر مامور کر رکھا تھا اور اشیم ضبابی رضی اللہ عنہ بھی صحابی تھے جو غلطی سے قتل ہو گئے تھے۔

حدیث سے وجہ استدلال:

اس حدیث سے بھی دو باتوں پر دلالت ہوتی ہے:

۱۔ اگر ائمہ اسلام میں سے کسی کا کسی بات پر عمل ہو رہا ہو، پھر اس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی ایسی حدیث مل جائے جو اس

[1] الرسالہ ص: ۲۷۹، فقرہ: ۱۱۷۲، ابوداود: ۲۹۲۷، ترمذی: ۱۴۱۵، السنن الکبری للنسائی: ۶۳۶۳، ابن ماجہ: ۲۶۴۲

Marfat.com

کے عمل کے خلاف ہو تو اس پر فرض ہے کہ وہ اپنے عمل کو ترک کر کے اس حدیث پر عمل شروع کر دے۔

۲۔ رسول اللہ ﷺ کی حدیث بذات خود حجت ہے، کسی کے اس پر عمل کرنے سے نہیں۔

اس بات کو مزید واضح کرتے ہوئے امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: جب سنت مل جائے تو ذاتی عمل کو ترک کر دینا فرض ہے اور لوگوں پر بھی یہ فرض ہے کہ اگر سنت ان کے عمل کے خلاف ہے تو وہ اپنے عمل سے کنارہ کشی ہو کر سنت پر عمل کریں۔ اس حدیث سے یہ دعویٰ بھی باطل قرار پاتا ہے کہ سنت پر اس وقت عمل کیا جائے گا جب نبی ﷺ کے بعد کسی نے اس پر عمل کیا ہو۔

اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر کوئی چیز اس سنت کے خلاف ہو تو وہ اس کے حکم کو کمزور نہیں کر سکتی۔ ❶

امام شافعی کا قول مبنی برحق ہے:

مقتول شوہر کی دیت میں اس کی بیوی کی وراثت کے مسئلہ میں محدث مبارکپوری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

مقتول شوہر کی دیت میں بیوی کی وراثت کے جو علماء قائل ہیں انہی کا مسلک برحق ہے۔ کیونکہ وہ اس حدیث اور اس طرح کی دوسری حدیثوں پر مبنی ہے۔" ❷ اور حدیث کے بذات خود حجت ہونے کے مسئلہ پر شمس الائمہ محمد بن احمد سرخسی رحمہ اللہ اپنے اصول میں تحریر فرماتے ہیں:

"اگر کسی صحابی کا عمل کسی حدیث کے خلاف ہے تو اس کا سبب یہ ہو سکتا ہے کہ وہ حدیث ان کو معلوم نہ رہی ہو، لہٰذا اس کے خلاف ان کا عمل اس حدیث کے حجت ہونے پر اثر انداز نہیں ہو سکتا اور حدیث حجت رہے گی" اس کی علت بیان کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں: اس لیے کہ اگر کسی حدیث کی نسبت رسول اللہ ﷺ سے صحیح ہو تو وہ قابل عمل ہے اور اس پر عمل اس وجہ سے ترک نہیں کیا جائے گا کہ اس کے خلاف ایک ایسے شخص کا عمل ہے جو آپ سے فروتر ہے اور اس کے عمل یا فتویٰ کی جو بہتر توجیہ کی جائے گی، وہ یہ کہ اس نے نص کے مخفی رہنے کی وجہ سے اپنی رائے سے فتویٰ دے دیا تھا، اگر وہ اس کو معلوم ہو گئی ہوتی تو اس کی طرف رجوع کر لیتا، لہٰذا جس شخص کو کوئی حدیث صحیح سند سے مروی مل جائے اس کے لیے اس پر عمل فرض ہے۔" ❸

آٹھویں دلیل، رحم مادر کے بچہ کی دیت کی حدیث:

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ:

((أن عمر سأل عن قضية النبي ﷺ في ذلك، فقام حَمَل بن مالك بن النابغة، فقال: كنت بين إمرأتين، فضربت إحداهما الأخرى بمسطح فقتلتها وجنينها فقضى رسول الله ﷺ في جنينها بغرة وأن تُقتلَ.))

---

❶ ص: ۲۷۹۔۲۸ ❷ التحفہ: ص ۱۳۳۵ ج ۱ ❸ ص: ۸ ج ۲

Marfat.com

''عمر رضی اللہ عنہ نے جنین کی دیت کے مسئلہ میں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی فیصلہ کے بارے میں سوال کیا تو حمل بن مالک بن نابغہ رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور کہا: میں دو عورتوں کے درمیان موجود تھا جن میں سے ایک نے دوسری کو پنڈال کی چوب سے مارا اور اس کو اور اس کے پیٹ میں بچہ کو قتل کر دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنین کے بارے میں ایک غلام کا فیصلہ کیا اور عورت کو قتل کرنے کا حکم دیا۔'' [1]

امام شافعی رحمہ اللہ نے الرسالہ میں یہ حدیث جس سند سے روایت کی ہے اس میں طاوس نے اس کی روایت عمر رضی اللہ عنہ سے براہ راست کی ہے اور طاوس کے عمر سے حدیث نہ سننے کی وجہ سے یہ سند منقطع ہے، لیکن ابوداود، نسائی اور ابن ماجہ کی سند میں طاوس نے یہ حدیث ابن عباس سے روایت کی ہے اور انہوں نے عمر سے اس طرح یہ سند متصل ہے۔

ضحاک اور حمل کی حدیثوں سے امام شافعی کا استدلال:

امام شافعی رحمہ اللہ نے ضحاک بن سفیان اور حمل بن مالک بن نابغہ کی حدیثوں سے خبر واحد کے شرعی حجت ہونے پر الرسالہ میں مختصراً اور الأم میں تفصیلاً استدلال کیا ہے وہ الأم کی کتاب اختلاف الحدیث میں ان دونوں واقعات کا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

ان دونوں میں اس امر کی دلیل مضمر ہے کہ اگر کوئی ایک شخص اس شخص کے نزدیک سچا ہے جس کو اس نے خبر دی ہے تو اس کی خبر قبول کی جائے گی، اور اگر کسی کے لیے ایسی خبر کو کسی بھی حال میں مسترد کر دینا روا ہوتا تو عمر بن خطاب کے لیے یہ جائز ہوتا کہ وہ ضحاک سے کہتے کہ تم اہل نجد کے ایک آدمی ہو اور حمل سے یہ کہتے کہ تم اہل تہامہ کے ایک آدمی ہو اور تم دونوں نے ایک قلیل مدت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے اور آپ کی رفاقت کا شرف حاصل کیا ہے، جبکہ میں اور مہاجرین وانصار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ طویل عرصہ سے رہ رہے ہیں، پھر تم دونوں کو کس طرح وہ بات معلوم ہوگئی جو ہم سب پر مخفی رہی، پھر تم دونوں اپنی اپنی خبر میں فرد واحد ہو اور تمہارے حق میں یہ امکان موجود ہے کہ خبر دینے میں تم سے غلطی ہوگئی ہو یا تم نے اسے بھلا دیا ہو؟ بلکہ انہوں نے حق اس خبر کی پیروی میں دیکھا اور بیوی کو اس کے شوہر کی دیت میں وارث نہ بنانے کی اپنی رائے سے رجوع کر لیا اور جنین کی دیت کے مسئلہ میں اس شخص کی خبر کے مطابق یہ کہہ کر فیصلہ کیا جو وہاں موجود تھا اور جس نے ان کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کی خبر دی تھی: اگر انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی کوئی حدیث نہ سنی ہوتی، تو اس مسئلہ میں حدیث سے مختلف فیصلہ کرتے، مثلاً ان کی رائے یہ ہوتی کہ اگر جنین زندہ ہو تو اس کی دیت سو (۱۰۰) اونٹ ہے اور اگر وہ مردہ ہو تو اس کی کوئی دیت نہیں ہے، لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ خلق سے اپنی جو عبادت چاہتا ہے وہ اسی طریقے سے کی جا سکتی ہے جو اس کے نبی نے بیان کر دی ہے، لہٰذا کسی کے لیے بھی یہ جائز نہیں ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت سے ملنے والی کسی خبر پر ''کیوں'' اور ''کیسے'' کا اضافہ کرے یا اپنی رائے کو اس کا

[1] ابوداود: ۴۵۷۲، نسائی: ۴۷۳۹، ابن ماجہ: ۲۶۴۱

Marfat.com

معارض قرار دے، یا جس شخص کو وہ سچا جانتا ہے اس کی دی ہوئی خبر کو مسترد کرے۔ ❶

نویں دلیل، طاعون زدہ بستی میں نہ جانے کی حدیث:

خلیفہ دوم، عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ شام کے سفر میں جب ''سرغ'' کے مقام پر پہنچے تو ان کو خبر ملی کہ: ''شام میں طاعون پھیلا ہوا ہے'' اس موقع پر انہوں نے مہاجرین اور انصار سے مشورہ کیا، مگر ان میں سے کسی نے ان کو تشفی بخش مشورہ نہیں دیا یہ ساری تفصیلات صحیح بخاری کی حدیث نمبر ۵۷۲۹ میں مذکور ہیں۔ اتنے میں مشہور صحابی عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ جو اس صلاح و مشورہ کے موقع پر موجود نہیں تھے۔ آ گئے اور کہا میرے پاس اس مسئلہ میں علم (حدیث) ہے، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے:

((إذا سمعتم به بأرض فلا تقدموا عليه، وإذا وقع بأرض وأنتم بها فلا تخرجوا فراراً منه.)) ❷

''اگر تم کسی زمین میں طاعون کی موجودگی کے بارے میں سنو تو وہاں مت جاؤ اور اگر وہ کسی ایسی جگہ پھوٹ پڑے جہاں تم ہو تو وہاں سے مت بھاگو۔''

دسویں دلیل، مجوسیوں سے جزیہ لینے کی حدیث:

عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ مجوسیوں سے جزیہ نہیں لیتے تھے، یہاں تک کہ عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے یہ گواہی دی کہ:

((أن رسول الله ﷺ أخذها من مجوس هجر.)) ❸

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجر کے مجوسیوں سے جزیہ لیا ہے۔''

امام شافعی کا استدلال:

امام شافعی رحمہ اللہ نے الرسالۃ اور الأم کی کتاب اختلاف الحدیث میں ان دونوں حدیثوں سے خبر واحد کے حجت ہونے پر استدلال کیا ہے، طاعون کی حدیث سے استدلال کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''عمر نے طاعون کے مسئلہ میں عبدالرحمٰن کی خبر قبول کر لی اور اس خبر کی وجہ سے لوگوں کو لے کر واپس ہو گئے۔ اس لیے کہ ان کو یہ معلوم تھا کہ عبدالرحمٰن سچے ہیں اور ان کے نزدیک اور ہمارے نزدیک یہ جائز نہیں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالہ سے خبر دینے والے کسی صدق گو کی خبر کی خلاف ورزی کریں۔''

اور مجوسیوں سے جزیہ لینے کی حدیث سے استدلال کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

---

❶ ص: ۱۷۱۶۔۱۷۱۷

❷ بخاری: ۵۷۲۸۔۵۷۲۹، ۵۷۳۰، مسلم: ۷۷۱۹

❸ بخاری: ۳۱۵۶۔۵۷، ابوداؤد: ۳۰۴۳، ترمذی: ۱۵۸۶۔۱۵۸۷، سنن دارمی: ۲۵۰۱

Marfat.com

عمر بن خطاب نے مجوسیوں سے جزیہ لینے کے مسئلہ میں عبدالرحمٰن بن عوف کی دی ہوئی خبر قبول کر لی اور یہ نہیں کہا: اگر یہ اہل کتاب ہوتے تو ہمارے لیے یہ جائز ہوتا کہ ہم ان کا ذبیحہ کھائیں اور ان کی عورتوں سے نکاح کریں اور اگر یہ اہل کتاب نہیں ہیں تو ہمارے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ ہم ان سے جزیہ لیں۔" ❶

ایک اعتراض اور اس کا جواب:

اوپر حدیث واحد کے شرعی حجت ہونے سے متعلق جن صحیح حدیثوں سے استدلال کیا گیا ہے اس پر یہ اعتراض کیا جاسکتا ہے اور کیا بھی گیا ہے جیسا کہ امام شافعی نے الرسالہ میں ذکر کیا ہے کہ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے بعض مواقع پر کسی صحابی سے کوئی حدیث سننے کے بعد اسے اس وقت تک قبول نہیں کیا جب تک اس نے ایسا کوئی شاہد نہیں پیش کر دیا جس نے ان کے سامنے یہ گواہی دی کہ اس نے بھی یہ حدیث نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہے، اس سلسلے میں صحیحین میں منقول درج ذیل واقعہ کی مثال دی جاتی ہے۔

ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ وہ انصار کی ایک مجلس میں موجود تھے کہ ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ خوف زدہ حالت میں وہاں آئے اور کہا:

((استأذنت على عمر ثلاثاً فلم يؤذن لى، فرجعتُ، فقال: ما منعك؟ قلت: استأذنت ثلاثاً فلم يؤذن لى، فرجعت، وقال رسول الله ﷺ: إذا استأذن احدكم ثلاثا فلم يؤذن له، فليرجع...... فقال: والله لَتقيمنَّ عليه بينة .)) ❷

"میں نے عمر سے اندر آنے کی تین بار اجازت چاہی اور جب مجھے اجازت نہیں دی گئی تو میں واپس چلا گیا، اور جب عمر نے ان سے انتظار نہ کرنے کا سبب دریافت کیا تو انہوں نے جواب دیا: میں نے تین بار اجازت طلب کی تھی، مگر مجھے اجازت نہیں دی گئی، اس لیے واپس چلا گیا، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: جب تم میں سے کوئی تین بار اذن طلب کرے اور اسے اذن نہ دیا جائے تو وہ واپس چلا جائے، اس پر عمر نے کہا: تم اس کی کوئی واضح دلیل پیش کرو، اور مسلم میں ہے: ورنہ تمہیں لوگوں کے لیے درس عبرت بنا دوں گا۔"

قول مزید:

امام شافعی نے جو کچھ فرمایا ہے وہ کافی اور شافی ہے، مگر موجودہ دور کے منکرین حدیث کی ذہنیتوں کو سامنے رکھ کر اس گراں قدر قول میں کچھ اضافہ کرنا مناسب خیال کرتا ہوں:

۱۔ یہ واقعہ منکرین حدیث کے حق میں نہیں ہے، کیونکہ وہ خبر واحد کو شرعی حجت و دلیل نہیں مانتے اور ان کے نزدیک

❶ ص: ۱۷۱۔ ❷ بخاری: ۲۰۶۲-۶۲۴۵، مسلم: ۲۱۵۳-۳۳، ۳۵۔

Marfat.com

جب تک خبر متواتر نہ ہو شرعی حجت اور دلیل نہیں ہے اور اصطلاح حدیث میں ایک سے زیادہ یعنی دو یا تین یا چار راویوں کی روایت کردہ حدیث بھی خبر واحد ہی رہتی ہے۔

۲۔ جیسا کہ امام شافعی نے فرمایا ہے، رسول اللہ ﷺ کی نسبت سے ثابت اور صحیح حدیث کو رد کر دینے اور اس کی روایت کرنے والے سے دلیل اور گواہی طلب کرنے کا مجاز کوئی نہیں ہے، نہ عمر اور نہ غیر عمر۔

۳۔ صحابہ کرام کے درمیان علم وفضل، صلاح وتقویٰ، سبقت إلی الاسلام اور اسلام کی راہ میں ایثار وقربانی اور فہم دین کے اعتبار سے فرق مراتب ضرور تھا۔ لیکن رسول اللہ ﷺ سے روایت حدیث میں سب قابل اعتماد اور قابل بھروسہ تھے اور کسی کو کسی پر فوقیت اور امتیاز نہیں حاصل تھا۔

۴۔ بعض مواقع پر عمر رضی اللہ عنہ سے اس طرح کے طرز عمل کو ان کے مزاج کی سختی پر محمول کرنا زیادہ قرین صواب ہے، بعض علماء نے اس شدت کا جو یہ سبب بتایا ہے کہ وہ یہ چاہتے تھے کہ لوگ روایت حدیث میں احتیاط سے کام لیں تو اس کے جواب میں عرض ہے کہ عمر یا غیر عمر کسی بھی صحابی کے لیے روایت حدیث کا کوئی قاعدہ یا ضابطہ بنانے کے مجاز ہر گز نہیں تھے کیونکہ اللہ ورسول نے ان کو یہ حق نہیں دیا تھا۔

۵۔ ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی حدیث سن کر عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے جو دلیل طلب کی تھی وہ ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی گواہی کی شکل میں ان کو پیش کر دی گئی، مگر صحابہ نے ان کے اس طرز عمل کا استحسان نہیں کیا، چنانچہ جلیل القدر صحابی ابی بن کعب رضی اللہ عنہ اس واقعہ کے معاً بعد عمر رضی اللہ عنہ کے پاس گئے اور ان سے جو کچھ فرمایا وہ حق گوئی کی تاریخ میں بے مثال ہے۔ فرمایا:

((فلا تكن يا ابن الخطاب عذاباً على أصحاب رسول الله ﷺ.)) [1]

"خطاب کے بیٹے! رسول اللہ ﷺ کے اصحاب پر سختی کر کے عذاب مت بنو۔"

یاد رہے کہ عمر اس وقت امیر المؤمنین تھے!!

گیارہویں دلیل، مدرسہ رسالت سے تحصیل علم کی حدیث:

مدرسۂ رسول اللہ ﷺ کے طلباء صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تھے جن میں مہاجرین اور انصار دونوں شامل تھے، مہاجرین اپنا وطن چھوڑ کر مدینہ رسول اللہ ﷺ میں سکونت پذیر تھے، اور انصار مدینہ کے اصل باشندے تھے جو زراعت پیشہ تھے مادی اعتبار سے دونوں کے حالات ناگفتہ بہ تھے، مہاجرین اپنی ساری جائداد اور گھربار چھوڑ کر محض اللہ کی رضا کی خاطر یہ غربت کی زندگی گزار رہے تھے اور فقر وفاقہ کا سامنا کر رہے تھے اور انصار کا بھی سارا انحصار زراعت پر تھا، اور مدینہ میں نبی کریم ﷺ کے رونق افروز ہونے سے قبل ان کے دونوں قبیلے اوس وخزرج یہودیوں کی شہ پر لڑ لڑ کر اپنی ساری مادی

[1] مسلم: ۲۱۵۴

Marfat.com

اور معنوی طاقت پارہ پارہ کر چکے تھے اور نہایت مفلوک الحال تھے، لیکن اس حال میں بھی دونوں اللہ کے رسول ﷺ سے کسب فیض بھی کرتے تھے اور تلاش معاش کے لیے تگ ودو بھی جاری رکھے ہوئے تھے جس کا مطلب یہ ہے کہ سارے صحابہ ہر وقت نبی ﷺ کی خدمت میں نہ تو روز حاضری دیتے تھے اور نہ ایسا ان کے لیے ممکن تھا اور نہ ہی اللہ ورسول کو یہ مطلوب تھا بایں ہمہ وہ مجلس رسول ﷺ کے انوار وبرکات سے محروم رہنے کے متحمل بھی نہیں ہو سکتے تھے اس کے لیے انہوں نے یہ طریقہ کار بنا رکھا تھا کہ جو لوگ رسول اللہ ﷺ کی مجلس میں حاضر ہوں وہ ان لوگوں کو جو کاروبار حیات میں مصروف ہونے کے باعث اس سے دور رہیں مجلس کی تمام باتوں سے آگاہ کریں امام بخاری نے ایک باب اس عنوان سے قائم کیا ہے: باب التناوب فی العلم ...... باری باری تحصیل علم کا باب، جس کے تحت انہوں نے عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ اور ایک انصاری کے معمولات کا ذکر کیا ہے، چنانچہ عبداللہ بن عباس عمر رضی اللہ عنہم سے روایت کرتے ہوئے بیان کرتے ہیں:

((كنت أنا وجارلي من الأنصار فى بني أمية بن زيد وهي من عوالي المدينة، وكنا نتناوب النزول على الرسول ﷺ. ينزل يوماً وأنزل يوماً، فاذا نزلت جئته بخبر ذلك اليوم من الوحي وغيره، وإذا نزل فعل مثل ذلك.)) ❶

''میں اور میرے ایک انصاری پڑوسی جو بالائی مدینہ کی بنوامیہ بن زید نامی بستی میں رہائش پذیر تھے۔ باری باری رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضری دیا کرتے تھے، ایک دن وہ جاتے اور ایک دن میں، اور جب میں جاتا تو اس دن کی وحی یا غیر وحی کی خبر ان کو پہنچاتا اور جس دن وہ جاتے وہ بھی اس طرح کرتے۔''

وجہ استدلال:

یہ حدیث اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ صحابہ کرام ایک شخص کی دی ہوئی خبر کو حجت مانتے تھے اور ان کے نزدیک کسی حدیث کے صحیح اور قابل اعتماد وقابل عمل ہونے کی یہ شرط نہیں تھی کہ اس کے راوی ایک سے زیادہ ہوں، متواتر ہونا تو دور کی بات ہے۔

بارہویں دلیل، بٹائی پر کھیتی کرنے کی حدیث:

((عن ابن عمر رضی اللہ عنہما، قال: كنا نخابر ولا نرى بذلك بأساً حتى زعم رافع أن رسول الله ﷺ نهى عنها، فتركنا ها من أجل ذلك.)) ❷

''ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہتے ہیں: ہم لوگ بٹائی پر کھیتی کیا کرتے تھے اور اس میں کوئی حرج نہیں محسوس کرتے تھے، یہاں تک کہ رافع نے یہ خبر دی کہ رسول اللہ ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے، تو اس خبر کی وجہ

---

❶ بخاری: ۸۹-۷۲۵۶، مسلم: ۱۴۷۹

❷ الرسالہ: ۲۸۹، مسلم: ۱۵۴۷، ابوداود: ۳۳۸۹، ۳۳۹۴

Marfat.com

سے ہم نے یہ کام چھوڑ دیا۔''

وجہ استدلال:

امام شافعی رحمہ اللہ اس حدیث سے استدلال کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''ابن عمر ''مخابرہ......'' بٹائی پر کھیتی باڑی کرنا، سے استفادہ کرتے تھے اور اس کو حلال سمجھتے تھے، اور جس وقت ایک ایسے شخص نے جس کو وہ رسول اللہ ﷺ سے روایت حدیث میں متہم نہیں سمجھتے تھے، یہ خبر دی کہ رسول اللہ ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے تو اس خبر کے بعد ''مخابرت'' کا سلسلہ مزید جاری نہ رکھا، اور رسول اللہ ﷺ کی نسبت سے ملنے والی خبر کے ساتھ اپنی رائے استعمال کرتے ہوئے یہ نہیں کہا: اب تک ہم ایسا کرتے آرہے ہیں اور آج تک کسی نے اس مسئلہ میں ہم پر قدغن نہیں لگائی ہے۔''

بٹائی پر کھیتی کرنے کا حکم:

بٹائی پر زرعی زمین کھیتی باڑی کے لیے دینے اور لینے کی متعدد صورتیں ہیں جن میں سے بعض جائز ہیں اور بعض جائز نہیں ہیں۔

۱۔ زرعی زمین بٹائی پر کھیتی باڑی کے لیے دینے کی جائز صورت یہ ہے کہ زمین کا مالک کسی مزارع اور کاشت کار کو اپنی زمین اس بنیاد پر دے کہ وہ زمین کی پیداوار کا آدھا، یا ایک تہائی، یا ایک چوتھائی خود لے گا اور بقیہ کاشت کار لے گا، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے خیبر کے یہودیوں سے یہ معاملہ کیا تھا کہ وہ وہاں کی زمین میں کاشت کاری کریں گے اور آدھی پیداوار دیں گے۔ ❶

۲۔ بٹائی پر زمین دینے کی ناجائز صورتوں میں سے ایک صورت یہ ہے کہ زمین کا مالک کسی شخص کو اپنی زمین اس شرط پر کاشت کے لیے دے کہ زمین کے کسی حصے کی پیداوار اس کی ہوگی اور کسی حصہ کی پیداوار کاشت کار کی، جیسا کہ رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ: اہل مدینہ میں ہم سب سے زیادہ زرعی زمینوں کے مالک تھے اور ہم میں سے کوئی جب بٹائی پر اپنی زمین دیتا تھا تو لینے والے سے کہتا تھا کہ یہ ٹکڑا میرا ہے اور وہ ٹکڑا تمہارا، اور بسا اوقات ایسا ہوتا کہ اس ٹکڑے نے پیداوار دی اور اس ٹکڑے نے نہیں دی، لہٰذا نبی ﷺ نے اس سے منع فرما دیا۔ ❷

۳۔ مذکورہ بالا صورت کا جو حکم ہے وہی اس صورت کا بھی حکم ہے کہ کوئی شخص اپنی زمین اس شرط پر کسی کو کاشت کے لیے دے کہ کھیت کی نالیوں کے پاس کی زمین کی پیداوار اس کی ہوگی اور بقیہ حصوں کی پیداوار کاشت کار کی، ایسا بھی ہوتا تھا کہ لوگ مخصوص مقدار کی کھجور یا جو کے مقابلے میں اپنی زمینیں کاشت کے لیے دیتے تھے، چونکہ اس میں بھی

---

❶ صحیح بخاری: ۲۳۳۸-۳۱۵۲، صحیح مسلم: ۱۵۵۱

❷ بخاری: ۲۳۳۲، مسلم: ۱۵۴۷-۱۱۷

Marfat.com

یک طرفہ نقصان کا پہلو غالب ہے اس لیے نبی ﷺ نے اس طریقہ سے بھی منع فرما دیا۔ ❶

تیرہویں دلیل، متوفی عنہا زوجہا کے اپنے شوہر کے گھر میں عدت گزارنے کی حدیث:

مشہور صحابی ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی بہن فریعہ بنت مالک بن سنان رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض گزار ہوئیں کہ ان کے شوہر فرار ہو جانے والے اپنے غلاموں کی تلاش میں نکلے اور قدوم کے مقام پر ان کو جا لیا، لیکن انہوں نے ان کو قتل کر دیا، میں نے رسول اللہ ﷺ سے درخواست کی کہ میں اپنے اہل خانہ میں واپس چلی جاؤں، کیونکہ میرے شوہر نے ایسا کوئی رہائشی مکان نہیں چھوڑا ہے جس کے وہ مالک رہے ہوں اور نہ مصارف ہی چھوڑے ہیں، تو رسول اللہ ﷺ نے مجھے اجازت دے دی اور میں آپ کے پاس سے چلی گئی، اور جبکہ میں ابھی حجرۂ شریفہ ہی میں تھی یا مسجد میں کہ آپ نے مجھے بلایا۔ یا میں حکم دے کر بلائی گئی، اور آپ نے پوچھا کہ تم نے اپنا کیا ماجرا بیان کیا تھا؟ میں نے اپنا واقعہ دہرا دیا، کہتی ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((أُمكثي في بيتك حتى يبلغ الكتابُ أجله .))

''اپنے گھر میں رہو یہاں تک کہ لکھا ہوا حکم اپنی آخری مدت کو پہنچ جائے۔''

فریعہ فرماتی ہیں: میں نے اس گھر میں چار ماہ دس ۱۰ دن کی عدت گزاری اور عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد خلافت میں مجھ سے رسول اللہ ﷺ کی حدیث کے بارے میں پوچھا تو میں نے ان کو خبر دی جس پر انہوں نے عمل کیا اور اس کے مطابق فیصلہ کیا۔ ❷

وجہ استدلال:

امام شافعی فرماتے ہیں: عثمان نے اپنی امامت اور اپنے علم کے باوجود انصار و مہاجرین کے درمیان ایک عورت کی خبر کی بنیاد پر فیصلہ کیا۔

حدیث واحد سے متعلق ائمہ اسلام کا طرز عمل:

امام شافعی فرماتے ہیں:

''مدینہ کے ایک شخص نے جس کو میں ملزم نہیں گردانتا، ابن ابی ذئب سے روایت کرتے ہوئے مجھے خبر دی، کہا: سعد بن ابراہیم نے ایک مسئلہ میں ربیعہ بن ابی عبدالرحمٰن کی رائے کے مطابق فیصلہ کیا، تو میں نے ان کو نبی ﷺ کی ایک ایسی حدیث کی خبر دی جو ان کے فیصلے کے خلاف تھی، اس پر سعد نے ربیعہ سے کہا: یہ ابن ابی ذئب ہیں جو میرے نزدیک ثقہ ہیں، یہ مجھے نبی ﷺ کی ایک ایسی حدیث کی خبر دے رہے ہیں جو میرے فیصلہ کے خلاف ہے۔ ربیعہ نے ان سے

---

❶ بخاری: ۲۲۴۶۔۲۲۴۷

❷ ابو داود: ۲۳۰۰، ترمذی: ۱۲۰۴، نسائی: ۳۵۲۹، ابن ماجہ: ۲۰۳۱، الموطا، کتاب الطلاق: ۸۷، الدارمی: ۲۲۸۷، الرسالۃ ص: ۲۸۶، فقرہ: ۱۲۱۴

Marfat.com

کہا: آپ نے اجتہاد کیا اور آپ کا فیصلہ نافذ ہو چکا، سعد نے جواب دیتے ہوئے کہا: کس قدر تعجب کی بات ہے، کیا میں ام سعد کے بیٹے سعد کا فیصلہ نافذ کر دوں اور رسول اللہ ﷺ کا فیصلہ رد کر دوں؟ نہیں، بلکہ میں ام سعد کے بیٹے سعد کے فیصلہ کو مسترد کرتا ہوں اور رسول اللہ ﷺ کے فیصلے کو نافذ کرنے جا رہا ہوں۔ پھر سعد نے لکھا ہوا فیصلہ منگوایا اور اسے پھاڑ دیا۔ ❶

ایک ضروری وضاحت:

سعد بن ابراہیم، مشہور صحابی عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کے پوتے تھے اور مدینہ میں منصب قضا پر فائز تھے وہ حدیث اور فقہ میں امام اور حجت تھے ۱۲۵ھ میں وفات پائی، ملاحظہ ہو:

> ''جب کوئی اپنی یا غیر کی تحقیر کرتا ہے تو وہ اس کو اس کی ماں کا بیٹا'' کہتا ہے، سعد نے اپنے آپ کو ام سعد کا بیٹا رسول اللہ ﷺ کے فیصلے کے مقابلے میں اپنے فیصلہ کی تنفیذ کا مشورہ سن کر از راہ تحقیر کہا تھا اور حقیقت بھی یہ ہے کہ جو شخص رسول اللہ ﷺ کی کوئی حدیث سننے اور معلوم ہونے کے بعد اپنی سابقہ رائے پر قائم رہے اور حدیث پر عمل نہ کرے یا اپنی یا کسی اور کی رائے پر عمل کو درست ثابت کرنے کے لیے حدیث میں عیب اور کیڑے نکالے اس سے بڑا کوئی حقیر نہیں۔'' ❷

امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: مجھے ابوحنیفہ بن سماک بن فضل شہابی (امام شافعی کے استاذ) نے خبر دی، کہا: مجھ سے ابن ابی ذئب نے، مقبری سے، اور انہوں نے ابوشریح کعبی رضی اللہ عنہ سے بیان کیا کہ ''عام الفتح'' کے موقع پر نبی ﷺ نے فرمایا:

> ((من قتل له قتيل فهو بخير النظرين: إن أحب أخذ العقل ، وإن أحب فله القود.)) ❸
>
> ''جس کا کوئی آدمی قتل کر دیا جائے تو اس کو دو امور میں سے ایک کا اختیار ہے، چاہے تو خون بہا (دیت) لے لے اور اگر چاہے تو اس کو قصاص لینے کا حق ہے۔''

ابوحنیفہ، امام شافعی کے شیخ ابوحنیفہ بن سماک شہابی مراد ہیں، کا بیان ہے کہ میں نے ابن ابی ذئب سے کہا: ابو الحارث! کیا آپ اس کو مانتے ہیں؟ یہ سن کر انہوں نے میرے سینے پر مارا، مجھے ڈانٹ پلائی اور مجھے سخت سست کہا اور کہا: میں تم سے رسول اللہ ﷺ کی حدیث بیان کر رہا ہوں اور تم کہتے ہو: کیا تم اس کو مانتے ہو؟ جی ہاں میں اس کو مانتا

---

❶ الرسالہ ص: ۲۹۱-۲۹۲، سیر أعلام النبلاء، ص: ۲۲۳، ج ٦

❷ سیر أعلام النبلاء ص: ۲۲۳-۲۲۴، ج: ٦

❸ الرسالہ ص: ۲۹۲، فقرہ: ۱۲۳۴، ابوداود: ۴۵۰۴، ترمذی: ۱۴۰٦

Marfat.com

ہوں یہ میرے اوپر اور جو اسے سنے اس پر فرض ہے، اللہ نے لوگوں میں سے محمد کو چنا، اور آپ کے ذریعہ اور آپ کے ہاتھوں ان کو ہدایت بخشی اور ان کے لیے وہی پسند فرمایا جو آپ کے لیے پسند فرمایا اور آپ کی زبان سے پسند فرمایا، لہٰذا خلق پر یہ فرض قرار پایا کہ وہ بطیب خاطر یا ذلیل وخوار ہو کر آپ کی پیروی کریں، کسی بھی مسلمان کے لیے اس سے مفر نہیں'' وہ خاموش نہیں ہوئے یہاں تک کہ میں خواہش کرنے لگا کہ خاموش ہو جائیں۔ ❶

امام شافعی فرماتے ہیں:

حدیث سے متعلق یہی ہمارے اسلاف اور ان کے بعد آنے والوں کا طرز عمل رہا ہے اور دوسرے شہروں کے اہل علم کے حوالہ سے ہمیں جو خبریں ملی ہیں وہ بھی ان کے اسی طرز عمل کی خبر دے رہی ہیں۔

ہم نے مدینہ میں سعید بن مسیب کو یہ فرماتے ہوئے پایا کہ: ''مجھے ابو سعید خدری نے سونے اور چاندی کے لین دین کے مسئلہ میں نبی ﷺ کی نسبت سے یہ خبر دی'' اور ان کی اس حدیث کو بطور سنت ثبت کر دیا، اور فرمایا: مجھ سے ابو ہریرہ نے نبی ﷺ کی حدیث بیان کی اور ان کی اس حدیث کو بطور سنت ثبت کر دیا، ان دونوں کے سوا کسی اور کے حوالے سے بھی حدیث روایت کرنے کے بعد یہی کیا کہ اس کو سنت قرار دے دیا۔

یہی حال عروہ کا بھی تھا کہ وہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے نبی ﷺ کی حدیثیں سنتے تو ان کو سنت اور تحلیل وتحریم کا ماخذ قرار دے دیتے، اور انہوں نے ان سے کثیر تعداد میں حدیثیں روایت کی ہیں۔

اس طرح ہم نے انہیں یہ بھی فرماتے ہوئے پایا ہے کہ: ''مجھ سے اسامہ نے نبی ﷺ کی حدیث بیان کی، اور مجھ سے عبداللہ بن عمر نے حدیث بیان کی اور ان کے سوا دوسروں نے حدیثیں بیان کیں، اور ہر ایک کی حدیث کو انفرادی شکل میں سنت قرار دے دیا۔

ان کو ہم نے یہ بھی فرماتے ہوئے پایا ہے کہ: مجھ سے عبدالرحمٰن بن عبد قاری نے عمر سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا، اور مجھ سے یحییٰ بن عبدالرحمٰن بن حاطب نے، اپنے باپ سے اور انہوں نے عمر سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا اور ان میں سے عمر کے حوالہ سے ہر ایک خبر کو ثبت کر دیا۔

اس کے بعد امام شافعی نے طبقہ تابعین کے بیسیوں محدثین اور فقہاء کا نام لے کر یہ بیان کیا ہے کہ یہ تمام اپنے اوپر کے اور نیچے کے راویوں کی احادیث آحاد کو سنتے ہیں قبول کر لیتے ہیں پھر فرمایا ہے:

اگر کسی کے لیے علم الخاصہ (حدیث واحد) کے بارے میں یہ کہنا جائز ہے کہ قدیم زمانے میں اور موجودہ زمانے کے مسلمانوں کا اس امر پر اجماع رہا ہے کہ وہ خبر واحد کو ثابت مانتے تھے اور اس کو اپنا منتہائے مقصود قرار دیتے تھے، کیونکہ فقہائے مسلمین میں کوئی ایک بھی ایسا شخص نہیں معلوم جس نے خبر واحد کو ثابت نہ قرار دیا ہو، تو میرے لیے بھی ایسا کہنا جائز ہے۔

❶ الرسالہ ص: ۲۹۲، سیر أعلام النبلاء ص: ۱۰۴، ج: ۷

Marfat.com

جملہ معترضہ:

یہاں جملہ معترضہ کے طور پر یہ واضح کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ عصر صحابہ یا بعد کے ادوار میں کسی مسئلہ پر مسلمانوں کے اجماع کا دعویٰ درست نہیں ہے، کیونکہ اجماع کے معنی ہیں کہ اس مسئلہ میں سب لوگ بلا استثناء متفق الخیال رہے ہوں اور یہ معلوم کرنا انسانی قدرت سے باہر ہے، اسی وجہ سے امام احمد کا یہ قول ہے کہ اجماع کا دعویٰ کرنے والا جھوٹا ہے، البتہ کسی مسئلہ پر اجماع اس معنی میں بولنا درست ہے کہ: ''مجھے لوگوں میں اس کا کوئی مخالف نہیں معلوم'' کیونکہ ''مجمع علیہ'' مسئلہ میں کسی بھی طبقہ کے اجماع کرنے والوں کا ''استقصاء'' ناممکن ہے لیکن اس کے مخالفین کو معلوم کرنا ممکن ہے، اس لیے کہ اگر وہ ہوں گے تو بہت کم تعداد میں ہوں گے، اسی وجہ سے امام شافعی نے ''خبر واحد'' کو قبول کرنے اور اس کی حجت تسلیم کرنے پر ''اجماع'' کے بعد یہ تصریح کر دی ہے کہ فقہاء مسلمین میں ایسا کوئی نہیں معلوم جس نے ''خبر واحد'' کو ثابت نہ مانا ہو''

حدیث واحد کے شرعی حجت ہونے کے مسئلہ میں استثنائی حالت:

امام شافعی نے یہ صراحت کرنے کے بعد کہ مجھے فقہاء مسلمین میں ایسے لوگ یاد نہیں جنہوں نے خبر واحد کو صحیح اور ثابت ماننے میں اختلاف کیا ہو، تحریر فرمایا ہے:

> ''میرے نزدیک کسی بھی عالم کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ بہت ساری حدیثوں کو ثابت وصحیح مانے اور ان کی بنیاد پر تحلیل وتحریم کے احکام جاری کرے، پھر اسی طرح کی دوسری حدیثوں کو مسترد کرے، سوائے اس صورت کے کہ اس کے علم میں اس حدیث کی مخالف کوئی حدیث ہو، یا اس نے جس شخص سے حدیث سنی ہو اس کا راوی اس حدیث کے راوی سے زیادہ ثقہ ہو، یا جس حدیث کو اس نے رد کیا ہے اس کی روایت کرنے والا حافظ نہ ہو، یا اس کے نزدیک وہ غلط بیانی کا ملزم ہو، یا اس کے اوپر کا راوی غلط بیانی کا ملزم ہو، یا حدیث دو معنوں کا احتمال رکھتی ہو اور وہ تاویل کر کے ایک کو لے لے اور دوسری کو نہ لے۔''

اب اگر کوئی وہم زدہ اس وہم اور خیال خام میں مبتلا ہو کہ ایک صاحب عقل فقیہ خبر واحد کے ذریعہ ایک بار نہیں متعدد بار کسی عمل کو سنت اور شرعی طریقہ قرار دے چکا ہو، پھر اسی طرح کی یا اس سے زیادہ قابل اعتماد حدیث کو مذکورہ بالا وجوہ اور اسباب میں سے کسی وجہ اور سبب کے بغیر مسترد کر سکتا ہے تو ان شاء اللہ ایسا جائز نہیں ہے۔ [1]

راویان حدیث کی حیثیت عرفی:

میں نے اوپر حدیث واحد کے شرعی دلیل وحجت ہونے کی جو مثالیں دی ہیں وہ ان لوگوں کے لیے کافی ہیں جو اہل حق ہیں یا حق جاننا چاہتے ہیں، رہے وہ لوگ جن کے دلوں میں حدیث کے حوالے سے فتور ہے اور جو حدیث کا مطالعہ

[1] الرسالہ ص: ۲۹۱-۲۹۸

Marfat.com

کرتے ہی اس نظر سے ہیں کہ اس میں ان کو اپنے بیمار دل کی غذامل جائے ان کے لیے تو سینکڑوں نہیں ہزاروں مثالیں بھی اطمینان قلب فراہم نہیں کرسکتیں:

﴿إِنَّ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ لَا يَهْدِيهِمُ اللَّهُ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ٥ إِنَّمَا يَفْتَرِي الْكَذِبَ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَاذِبُونَ﴾ (النحل: ١٠٤ـ١٠٥)

''درحقیقت جو لوگ اللہ کی آیات پر ایمان نہیں رکھتے اللہ انہیں ہدایت نہیں دیتا جھوٹ تو وہی لوگ گھڑتے ہیں جو اللہ کی آیتوں پر ایمان نہیں رکھتے اور وہی لوگ جھوٹے ہیں۔''

اور اللہ کی آیتوں میں احادیث رسول بھی داخل ہیں، کیونکہ ان کی شرعی حیثیت اللہ تعالیٰ ہی کی متعین کردہ ہے۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے کتاب اخبار الآحاد کے تحت ایک باب باندھا ہے جس کا عنوان ہے: ((ما کان یبعث النبی ﷺ من الأمراء، والرسل واحدا بعد واحد)) ''نبی ﷺ یکے بعد دیگرے جو امراء اور سفراء بھیجا کرتے تھے اس کا باب۔''

اس باب اور اس کے تحت درج حدیثوں سے امام بخاری نے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ ایک شخص کی خبر حجت ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو نبی ﷺ کسی جگہ ایک سے زیادہ امراء اور سفراء روانہ کرتے۔

امام بخاری سے قبل امام شافعی رحمہ اللہ نے الام اور الرسالہ میں اس مسئلہ کو بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ: رسول اللہ ﷺ نے اپنے فوجی دستے بھیجے اور ہر دستہ پر ایک امیر مقرر کیا، اور متعدد بادشاہوں کے پاس اپنے سفراء بھیجے اور وہ اس طرح کہ ہر بادشاہ کے پاس صرف ایک سفیر بھیجا، اسی طرح آپ کے تعینات کردہ والیوں کے نام آپ کے فرامین ایک ایک شخص کے ساتھ بھیجے جاتے رہے اور آپ کے والیوں میں سے کوئی بھی آپ کے احکام کی تنفیذ سے پہلو تہی نہیں کرتا، یہی حال آپ کے بعد آپ کے خلفائے اربعہ کا بھی تھا۔ ❶

امین احسن اصلاحی نے ''مبادی تدبر حدیث'' میں امام شافعی کے استدلالات پر تنقید کی ہے اور میں نے الرسالہ سے جو مثالیں اوپر دی ہیں ان میں سے کسی سے تعرض نہیں کیا ہے، اس لیے کہ ان سے ان کی کور دبتی تھی، الرسالہ سے انہوں نے ۹ ھ میں ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے امیر حج اور علی رضی اللہ عنہ کے سفیر بنائے جانے کے واقعہ کو بنیاد بنا کر امام شافعی کو نشانہ بنایا ہے میں پہلے امام شافعی کا بیان نقل کر دیتا ہوں، پھر اصلاحی کے دعوے پر تبصرہ کروں گا تاکہ تصویر کے دونوں رخ سامنے رہیں، امام شافعی فرماتے ہیں:

١۔ ''رسول اللہ ﷺ نے ۹ ھ میں ابوبکر رضی اللہ عنہ کو امیر حج بنا کر بھیجا جس میں مختلف شہروں اور قبیلوں کے لوگ شریک ہوئے اور ابوبکر نے ان کو حج کے مناسک ادا کرائے نیز انہوں نے حج میں حصہ لینے والوں کو رسول اللہ ﷺ کے

❶ فتح الباری، ص: ۳۲۴۸، ج: ۳، الرسالہ، ص: ۲۷۲ـ۲۷۶

Marfat.com

حوالہ سے ان باتوں کی خبر دی جو ان کے لیے نفع بخش ہیں یا ضرر رساں۔ [1]

۲۔ اسی سال رسول اللہ ﷺ نے علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو بھی سفیر بنا کر بھیجا اور ان کو یہ ذمہ داری سونپی کہ وہ حجاج کو سورۂ توبہ کی ابتدائی آیتیں پڑھ کر سنا دیں اور رسول اللہ ﷺ نے ان کو مشرکین سے کیے گئے جن معاہدوں کو ختم کرنے کا حکم دیا تھا ان کے ختم کر دینے کا اعلان کر دیں اور کچھ لوگوں کو متعینہ مدت تک ان معاہدوں پر عمل کرنے کی مہلت دے دیں۔"

اس کے بعد امام شافعی نے لکھا کہ:

"ابو بکر اور علی اہل مکہ کے نزدیک فضل، دیانتداری اور صدق گوئی میں معروف تھے اور جو لوگ ان دونوں کو یا ان میں سے کسی ایک کو نہیں جانتے تھے ان کو حجاج میں ایسا شخص مل سکتا تھا جو ان دونوں کی صدق گوئی اور فضل کے بارے میں ان کو خبر دے سکتا تھا۔"

"اور رسول اللہ ﷺ کسی ایسے ہی ایک شخص کو اپنی خبر دے کر روانہ کر سکتے تھے جس کی دی ہوئی خبر ان لوگوں کے نزدیک دلیل وحجت ہوتی جن کے پاس آپ نے اس کو بھیجا تھا۔"

اصلاحی کا دعویٰ:

تدبر قرآن کے مصنف امین احسن نے خبر واحد کے حجت ہونے پر امام شافعی کے مذکورہ بالا استدلال پر تنقید کرتے ہوئے فرمایا ہے:

"ہمارے نزدیک امام صاحب کی یہ بات کچھ کمزور ہے، یہ اکابر اس موقع پر نہ راوی کی حیثیت سے آئے تھے، نہ ان کے اعلان کی حیثیت "اخبار آحاد" کی تھی اور نہ ان کے قول وفعل کو مسلمانوں نے خبر واحد کی حیثیت سے سنا اور مانا، بلکہ ان کو ہر شخص نے رسول اللہ ﷺ کے نائب اور سفیر کی حیثیت سے دیکھا اور اسی حیثیت سے ان کے احکام وہدایات کی تعمیل کی...... یہ تو مسلمانوں کے چوٹی کے لیڈروں میں سے تھے، اگر کوئی تیسرے درجہ کا آدمی بھی نبی ﷺ کے نمایندے یا سفیر کی حیثیت سے آتا تو اس کی پوزیشن بھی بالکل انہی کی ہوتی، اس کے قول وفعل کو بھی اس حیثیت سے نہ دیکھا جاتا کہ وہ خبر واحد کا حامل ہے، بلکہ اس حیثیت سے دیکھا جاتا کہ وہ آنحضرت ﷺ کا نمایندہ ہے۔"

"کسی حکومت کے امراء وعمال کی ایک "حیثیت عرفی" ہوتی ہے جس کو حکومت اور عوام دونوں جانتے ہیں، ان کی باتیں ان کی حیثیت عرفی کی روشنی میں جانچی جاتی ہیں وہ ایک اتھارٹی کے مظہر ہوتے ہیں جس کا احترام ہر شخص کو ملحوظ رکھنا ہوتا ہے اس موقع پر حضرت ابو بکر اور حضرت علی نے جو کچھ کہا اور کیا اس کو ایک راوی کی روایت کا درجہ دینا اور اس

[1] الرسالۃ، ص: ۲۷۳

Marfat.com

سے خبر واحد کے حجت ہونے کی دلیل نکالنا بالکل بے محل ہے۔ ❶

راوی کی روایت اور سرکاری اہل کار کی خبر میں فرق:

اصلاحی صاحب نے جو کچھ فرمایا ہے اور جو بڑ ماری ہے اس کی نکارت بیان کرنے سے قبل میں اس موقع کے بالکل مناسب اللہ تعالیٰ کا ایک ارشاد نقل کر دیتا ہوں، پھر کچھ عرض کروں گا:

﴿قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ﴾ (البقرۃ: ۱۱۱)

''اگر تم سچے ہو تو لاؤ اپنی دلیل۔''

یہ دراصل اس آیت کا آخری فقرہ ہے جس میں یہود و نصاریٰ کے یہ دعوے نقل کیے گئے ہیں کہ جنت میں صرف یہودی اور نصاریٰ جائیں گے، یعنی یہودیوں کا یہ دعویٰ ہے کہ جنت میں صرف یہودی جائیں گے اور نصاریٰ کا بھی یہ دعویٰ ہے کہ جنت میں صرف نصاریٰ جائیں گے۔

اصلاحی صاحب محرف قدیم آسمانی صحیفے یا یہود و نصاریٰ کی محرف کتابیں بہت پڑھتے تھے جس کی دلیل یہ ہے کہ ان کی تفسیر تدبر قرآن میں حدیث سے تو شاذ و نادر ہی استدلال کیا گیا ہے، لیکن قدیم آسمانی صحیفوں سے استدلال کی بھرمار ہے، اور اگر میں یہ کہوں کہ حدیث پر ان کے اعتراضات میں وہی رنگ ہے جو قرآن اور صاحب قرآن ﷺ پر یہودیوں کے اعتراضات میں ہے، بلکہ منکرین حدیث کے اقوال بڑی حد تک یہودی مستشرقین کے اقوال سے مشابہ ہیں، تو مبالغہ نہ ہوگا۔

امام شافعی رحمہ اللہ نے الرسالہ میں خبر واحد کے حجت ہونے کی بہت سی مثالیں دی ہیں جن میں سے کسی ایک کی بھی تردید نہیں کی جا سکتی، انہی کے ضمن میں انہوں نے ابوبکر و علی رضی اللہ عنہما کے واقعات کا بھی ذکر کیا ہے، یہودی صحیفوں کے دلدادہ اصلاحی صاحب نے ان تمام مثالوں میں سے صرف ابوبکر و علی سے متعلق مثالیں منتخب کر لیں، جن کو انہوں نے بظاہر اپنے حق میں پایا، اس طرح ان کو ''عام راوی کی روایت'' اور حکومت کے سفیر، نمایندے اور سرکاری اتھارٹی کے مظہر کے احکام و ہدایات میں تفریق کرنے کا موقع مل گیا۔

اگر اصلاحی صاحب حق پسند اور حق کے جویا ہوتے تو ان ناقابل تردید دلائل کو پڑھ کر خاموش ہو جاتے، اور اگر ان کے اندر اخلاقی بہادری اور جرأت ہوتی تو وہ امام شافعی کے دوسرے دلائل میں سے کم از کم دو ایک کا بھی ذکر کر کے ان کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے، لیکن چونکہ ان ''اخبار آحاد'' سے ان کے سارے دعوے باطل ہو جاتے ہیں اس لیے انہوں نے ان سے صرف نظر کر لینے ہی میں عافیت سمجھی۔

امام شافعی نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ صحابہ و تابعین اور ان کے بعد کے ائمہ ہدایت و رشد کا اس امر پر اتفاق تھا کہ خبر واحد شرعی حجت ہے، اگر اصلاحی صاحب کے اندر دم ہوتا تو وہ ایک یا دو مثالوں سے اس دعوے کو غلط ثابت کرتے، مگر

❶ ص: ۱۲۰

Marfat.com

ہیہات! اس لیے وہ عام راوی کی روایت اور مسلمانوں کے چوٹی کے لیڈروں کے احکام وہدایات کی راگ الاپنے لگے۔
آخر کب مسلمانوں نے نبی کریم ﷺ کے حوالہ سے دی جانے والی یا ملنے والی خبروں میں صحت وکذب جانچنے کے لیے خبر دینے والوں میں یہ گروہ بندی کی ہے؟ اور ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کی خبروں کو تو قبول کر لیا ہے اور ابو ذر و ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما کی خبروں کو رد کر دیا ہے، علمی مباحث میں ہمیشہ دلائل کی زبان میں بات کی جاتی ہے۔

''میں نے مشتے از خروارے'' کے طور پر حدیث واحد کے شرعی حجت ہونے کے جو دلائل دیے ہیں ان کی روایت کرنے والے ''مسلمانوں کے چوٹی لیڈر'' یا اسلامی حکومت کے نمایندے'' تو نہیں تھے، بلکہ رسول اللہ ﷺ کے صحابی تھے جن کی تعریف اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں کی ہے:

﴿فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَ عَزَّرُوْهُ وَ نَصَرُوْهُ وَ اتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْۤ اُنْزِلَ مَعَهٗۤ﴾ (الاعراف: ۱۵۷)

''جو لوگ اس پر ایمان لائے اور اسے قوت دی اور اس کی مدد کی اور اس نور کی پیروی کی جو اس کے ساتھ نازل کیا گیا ہے۔''

کیا ان اعلیٰ صفات سے موصوف اور یہ عطر بیز سیرت و کردار رکھنے والے صحابیوں میں اس اعتبار سے کوئی درجہ بندی تھی کہ ان میں سے کچھ کی روایت کردہ حدیثوں کو لوگ سر آنکھوں پر رکھتے تھے اور ان کے آگے سر تسلیم خم کر دیتے تھے اور بعض کی روایتوں کو عام راوی'' کی روایت کہہ کہ ٹھکرا دیتے تھے، اگر ان منکرین میں سے کسی کے پاس اس کے اس دعویٰ کی دلیل ہے تو پیش کرے۔

برنی دو قدم آگے:

ڈاکٹر افتخار برنی کا ذکر خیر اس کتاب میں بار بار آچکا ہے موصوف سعودی عرب میں منکرین حدیث کے نمایندے اور اصلاحی صاحب کے ''خلیفہ'' ہیں اور ''تقیہ'' کر کے سچے ''موحد'' کی شناخت بنائے ہوئے ہیں، ''خبر واحد'' کے حجت ہونے کے موقع پر میرے ایک مضمون پر تبصرہ کرتے ہوئے موصوف نے یہ فرمایا تھا۔

''قبا کے مسلمانوں نے ایک صحابی کی بات کو درست تسلیم کر کے اس پر عمل کیا اور ایسا کرنے میں وہ حق بجانب تھے یہ چیز ذہن میں رہنی چاہیے کہ اس بات کو درست ماننے سے کوئی فتنہ پھیلنے کا اندیشہ بھی نہیں تھا، نبی کریم ﷺ تھوڑے فاصلے پر مدینہ کی بستی میں موجود تھے اور کسی بھی وقت اس خبر کی تصدیق آپ سے کی جا سکتی تھی۔''

برنی سے ایک سوال:

تاریکی میں نماز فجر ادا کرنے والے مسلمانوں کو پیچھے سے ایک آدمی، جس کو وہ جانتے پہچانتے نہیں، خبر دیتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ پر ''تحویل قبلہ'' کا حکم نازل ہو گیا ہے'' یہ سنتے ہی وہ لوگ بیت المقدس سے منہ پھیر کر کعبۃ اللہ کی طرف

Marfat.com

رخ کر لیتے ہیں'' آپ فرماتے ہیں:

''ایسا کرنے میں وہ حق بجانب تھے اور اس بات کو درست ماننے سے کوئی فتنہ پھیلنے کا اندیشہ بھی نہیں تھا۔''

ڈاکٹر صاحب! ذرا از راہ کرم یہ بتا دیجئے کہ اگر اس خبر میں جس کا دینے والا غیر معروف ہو، کوئی فتنہ پھیلنے کا اندیشہ مضمر نہیں تھا، تو کیا ان ''اخبار آحاد'' کے قبول میں فتنہ پھیلنے کا اندیشہ ہو سکتا ہے جن کے دینے والے معروف ہوں، سامنے ہوں، اور خبر سننے والوں کے نزدیک سچے، اور امانت دار اور قابل اعتبار حافظہ کے مالک ہوں۔

پھر اگر خبر دینے والے کی شخصیت نظروں سے اوجھل ہے، ایسی صورت میں خبر سننے والوں نے کس طرح یہ معلوم کر لیا کہ خبر سچی ہے اور اس کا مقصد فتنہ پھیلانا نہیں ہے۔

مزید یہ کہ کیا یہ بات قرین عقل نہ تھی کہ وہ اس نماز کو، جس کی ایک رکعت وہ پڑھ چکے تھے اور ایک رکعت باقی تھی، بیت المقدس ہی کی طرف رخ کر کے پوری کر لیتے اور نماز کے بعد خبر دینے والے کی شخصیت اور اسکی خبر کی تحقیق کر لینے کے بعد اگلی نماز کعبہ مشرفہ کی طرف منہ کر کے پڑھتے''

مگر نہیں، وہ سب صحابی رسول تھے اور اللہ و رسول کے حوالہ سے کوئی حکم سننے پر اس کی تعمیل میں ایک لمحہ کی بھی تاخیر کرنے کے روادار نہ تھے، نیز ان کو رسول اللہ ﷺ کے حوالہ سے کوئی جھوٹی خبر سننے کا تجربہ نہیں تھا اس لیے ادھر ان کو خبر ملی اُدھر انہوں نے اس پر عمل شروع کر دیا۔

آپ نے جو یہ فرمایا ہے:

''نبی کریم ﷺ تھوڑے سے فاصلے پر مدینہ کی بستی میں موجود تھے اور کسی بھی وقت اس خبر کی تصدیق آپ سے کی جا سکتی تھی۔''

ڈاکٹر صاحب! کیا میں آپ سے یہ سوال کرنے کی جرأت کر سکتا ہوں کہ آپ نے یہ بات نیم بیداری اور نیم خواب میں فرمائی ہے، یا مکمل بیداری میں مگر عقل کو کنارے رکھ کر؟ معاف کیجئے، میں یہ طرز بیان اختیار کرنے پر اس لیے مجبور ہوں کہ خبر کی تصدیق اس پر عمل کرنے سے پہلے کی جاتی ہے اور جس ذات مقدس کے حوالہ سے خبر ملی ہے، اگر وہ قریب ہی موجود ہو تو عمل سے پہلے تصدیق و تحقیق کی اہمیت مزید بڑھ جاتی ہے؟!! ویسے میں قارئین کرام کے علم میں یہ بات لانا چاہتا ہوں کہ رسول اللہ ﷺ کی حدیث کی روایت کے حوالہ سے ایسا کبھی نہیں ہوا ہے کہ کسی نے کسی سے کوئی حدیث سننے کے بعد رسول اللہ ﷺ سے اس کی تصدیق کی ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ نے روایت حدیث کی نعمت و فضیلت سے ہمیشہ منافقین کو محروم رکھا ہے اور عہد صحابہ میں کبھی بھی ایسا نہیں ہوا ہے کہ کسی منافق نے کوئی حدیث روایت یا بیان کی ہو، ایسی صورت میں خبر کی تصدیق کی ضرورت تھی ہی نہیں۔

امین احسن اصلاحی نے ''اخبار آحاد کی حجیت'' کے باب کا خلاصہ بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے:

Marfat.com

اخبار آحاد پیغمبر ﷺ کے علم کے منتقل ہونے کا بہت بڑا ذریعہ ہیں، لیکن یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ ہر خبر واحد حجت قائم کرنے کے لیے کافی ہے، اخبار آحاد محض آحاد ہونے کی بنا پر نا قابل اعتبار نہیں قرار دی جائیں گی، بلکہ ان پر اعتماد کیا جائے گا ان میں ضعف کے جو مختلف پہلو ہیں ان کی تلافی کی مختلف صورتوں پر ہمیشہ نگاہ رکھی جائے گی اور شبہ کو دور کرنے کے لیے جو وسائل و ذرائع بھی استعمال ہو سکتے ہیں وہ استعمال میں لائے جائیں گے۔ ❶

تبصرہ:

اصلاحی صاحب کے افکار و اقوال میں تضادات کی بھرمار ہے، ان کی تفسیر از ترجمہ تا تشریح و بیان تضادات کی شاہکار ہے۔ ایک منفرد اور بے مثال مفسر بننے کی خواہش نے انہیں کہیں کا نہیں رکھا، پھر ان کے اندر جدید طرز کا محدث بننے کی خواہش ابھری، اور حدیث میں مؤطا امام مالک اور سنن ترمذی اور علم الحدیث میں الکفایہ فی معرفۃ اصول علم الروایہ'' کا مطالعہ کر کے وہ اس خود فریبی میں مبتلا ہو گئے کہ وہ حدیث کی تشریح و بیان اور احادیث کی صحت و سقم کے علم میں اس مقام پر پہنچ گئے ہیں کہ احادیث کی صحت و سقم کو جانچنے اور راویوں کی ثقاہت کی پرکھ کے کچھ اصول دے سکتے ہیں، جبکہ بقول خود علم حدیث میں ان کا سارا مدار الکفایہ پر رہا ہے۔

اصلاحی صاحب نے جب امام شافعی رحمہ اللہ کی کتاب ''الرسالہ'' میں ایسی بیسوں حدیثیں دیکھیں جن میں سے ہر ایک کا راوی ایک صحابی ہے، تو اس سے ''خبر واحد کی عدم حجیت'' کا ان کا دعویٰ یا نظریہ ٹکرا کر پاش پاش ہو گیا، لیکن چونکہ ان کے ذہن میں یہ بات نقش ہو چکی تھی کہ خبر واحد شرعی حجت نہیں ہے، لہٰذا الرسالہ میں درج ان حدیثوں کی قبولیت اور صحابہ کرام کے اندر ان کی حجیت کے ایسے اسباب تلاش کرنا شروع کر دیے جو ان کی نظر میں ان ''احادیث آحاد'' کو حجت بنانے کے پیچھے کار فرما تھے اور جب ان کو راویوں کی فہرست میں ابوبکر و علی رضی اللہ عنہما کے نام مل گئے، تو انہوں نے دوسری حدیثوں کو تو نظر انداز کر دیا اور دو بڑے ناموں کی بنیاد پر بعض راویوں کی حیثیت ''عرفی'' یا حکومت الٰہیہ کی نمائندگی کا افسانہ گھڑ لیا۔ اور امام شافعی کے استدلال پر تنقید کرتے ہوئے یہ دعویٰ کر دیا کہ: اس موقع پر حضرت ابوبکر اور حضرت علی نے جو کچھ کہا اور کیا اس کو ایک راوی کی روایت کا درجہ دینا اور اس سے خبر واحد کے حجت ہونے کی دلیل نکالنا بالکل بے محل ہے۔'' ❷

اصلاحی صاحب نے خبر واحد کے قبول و عدم قبول کے ''بزعم خویش'' جو اصول بنائے ہیں وہ تمام تر الکفایہ سے ماخوذ ہیں، الکفایہ کے مصنف بغدادی نے اس کتاب میں ہر باب کے تحت مختلف علمائے حدیث کے اقوال نقل کیے ہیں اور جس مسئلہ سے متعلق قرآن و حدیث میں ہدایات ملی ہیں ان میں سے بھی بعض کا ذکر کیا ہے، جہاں تک قرآنی آیات کا تعلق ہے تو ان میں صحیح و ضعیف کا کوئی سوال ہی نہیں ہے اس لیے اصلاحی صاحب کوئی آیت غلط تو نہیں نقل کر سکتے تھے، لیکن ان آیتوں سے غلط استدلال کر سکتے تھے اور کیا ہے، رہیں احادیث اور لوگوں کے اقوال تو چونکہ امین احسن اصلاحی

---

❶ ص: ۱۴۴ ❷ ص: ۱۲۰

Marfat.com

صاحب احادیث واقوال میں غث وسمین اور ثابت وغیر ثابت میں تمیز کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے اس لیے انہوں نے الکفایہ میں جو کچھ پایا اس کو جوں کا توں، اور حرف آخر سمجھ کر نقل کر دیا، آئندہ صفحات میں ان شاء اللہ میں ''تدبر حدیث'' کے بعض ابواب میں مدون اصلاحی صاحب کے بعض افکار اور نظریات کا خلاصہ نقل کر کے ان کا جائزہ لوں گا اور یہ دکھاؤں گا کہ انہوں نے دانستہ یا نادانستہ کہاں کہاں ٹھوکر کھائی ہے۔

صحابہ اور صحابیت اصلاحی کی نظر میں:

میں امین صاحب کے استدلالات کا ذکر کرنے سے پہلے یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ صحابہ کرام میں فرق مراتب تھا جس طرح اللہ کے رسولوں میں فرق مراتب ہے اور خود قرآن پاک سے ثابت ہے، لیکن جس طرح اللہ کا ہر رسول اپنی رسالت میں سچا تھا اور اس معاملہ میں ان کے درمیان تفریق حرام ہے، اسی طرح نبی کریم ﷺ سے روایت حدیث کے مسئلہ میں تمام صحابہ سچے تھے اور اس مسئلہ میں ان کے درمیان تفریق ان کے قرآنی اوصاف کے منافی ہے میں نے یہ بات پہلے ہی اس لیے صاف کر دی ہے کہ اصلاحی صاحب کے مغالطوں کو سمجھنا آسان رہے۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ''الاصابہ'' میں صحابی رسول کی جو تعریف کی ہے وہ ان کے وسیع مطالعہ اور متقدمین ائمہ حدیث کے اقوال کا نچوڑ ہے، فرماتے ہیں:

> ''جہاں تک میری واقفیت ہے، صحابی کی صحیح تعریف یہ ہے کہ صحابی وہ خوش نصیب شخص ہے جس کو حالتِ ایمان میں رسول اللہ ﷺ سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا اور حالتِ اسلام ہی میں اس کی وفات ہوئی اس تعریف کی رو سے صحابہ کی جماعت میں ہر وہ شخص داخل ہے جس کی بحالت ایمان آپ سے ملاقات ہوئی ہو، قطع نظر اس کے کہ اس کو آپ کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے کا زیادہ موقع ملا یا کم، اس نے آپ سے کوئی حدیث روایت کی یا نہیں، اور وہ آپ کے ساتھ کسی غزوہ میں شریک ہوا یا نہیں؟
>
> ''اس تعریف کی رو سے وہ خوش نصیب بھی صحابی ہے جو نبی ﷺ سے ملا تو، مگر بینائی سے محروم ہونے کی وجہ سے آپ کے رخ انور کو نہیں دیکھ سکا، یا آپ کو دیکھا اور فوراً چلا گیا اور دوبارہ ملاقات کا موقع نہ پا سکا، یا جس نے آپ کو نہایت کمسنی میں شعور سے پہلے دیکھا، تو وہ نبی ﷺ کو اپنے دیکھنے کی وجہ سے صحابی نہیں ہے، لیکن اس اعتبار سے وہ صحابی ہے کہ اس کے چہرے پر رسول اللہ ﷺ کی نگاہیں پڑ چکی ہیں، البتہ روایت حدیث میں وہ تابعی شمار ہوگا۔'' ❶

اصلاحی صاحب نے اس بات کے تحت قرآن پاک کی جن آیات سے صحابہ کرام کے درمیان مراتب اور درجات کے جس فرق پر استدلال کیا ہے وہ ان آیتوں سے مستفاد نہیں ہوتا اور بعد میں چل کر انہوں نے ''خبر واحد'' کے شرعی

❶ ص ۷، ج: ۱

Marfat.com

حجت نہ ہونے کی دلیل میں صحابہ کی جو درجہ بندی کی ہے وہ اس غلط استدلال پر مبنی ہونے کی وجہ سے ناقابل تسلیم ہے، انہوں نے سورۃ بقرہ آیت: ۱۴۳، سورۃ فتح آیت: ۱۸، اور سورۂ حشر کی آیات ۸ اور ۹ سے استدلال کرتے ہوئے جو یہ فرمایا ہے کہ:

''قرآن کے پیش نظر وہی لوگ صحابی ہیں، جنہوں نے دین کے اختیار کرنے میں پیش قدمی کی ہے، عسر و یسر میں پیغمبر ﷺ کے ساتھ رہے ہیں، اللہ کی راہ میں اپنا مال خرچ کیا ہے، غزوات میں سرفروشیاں کی ہیں، وہ لوگ پیش نظر نہیں ہیں جنہون نے آنحضرت ﷺ کو کبھی کبھار دیکھ لیا ہے، اعراب کے منافقین کی تو قرآن نے اصل خرابی ہی یہی بتائی ہے کہ انہوں نے نبی ﷺ کی صحبت نہیں اٹھائی، اگرچہ انہوں نے آنحضرت ﷺ کو دیکھا بھی اور اسلام کے بھی بڑی بلند آہنگی سے مدعی تھے۔'' [1]

اصلاحی کی بدحواسی:

امین اصلاحی جب اپنے غلط خیالات ونظریات کا اظہار کرتے تھے تو لگتا ہے کہ وہ ہوش وحواس میں نہیں ہوتے تھے یا اپنے قارئین کو عقل وفہم سے عاری تصور کر لیتے تھے، صحابہ کی تعریف میں دین کے اختیار میں پیش قدمی، عسر و یسر میں نبی ﷺ کی رفاقت، اللہ کی راہ میں انفاق اور غزوات میں سرفروشی وغیرہ جو گنائی ہے، تو یہ دراصل صحابہ کے بعض اوصاف حمیدہ تھے، صحت صحابیت کی شرائط نہیں اور جوں ہی کوئی خوش نصیب آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر ایمان لاتا اور آپ کی زبان مبارک سے اسلامی احکام سنتا تو اسی لحہ نور ایمان سے اس کا دل روشن ہو جاتا اور اللہ اور اس کے رسول کے ہر حکم کی تعمیل کا جذبۂ صادق اس کے دل میں پیدا ہو جاتا، لہٰذا اسی لحہ وہ صحابہ کی جماعت میں داخل ہو جاتا اگرچہ اپنے صدق ایمانی کا عملی نمونہ پیش کرنے کا اس کو موقع نہ ملا ہو۔ قران وحدیث میں کہیں بھی رسول اللہ ﷺ کی صحابیت کا شرف حاصل کرنے اور صحابہ کی پاکباز جماعت میں شامل ہونے کے لیے آپ کے بیان کردہ اوصاف میں سے کسی بھی وصف کو شرط نہیں قرار دیا گیا ہے، آپ سبقت الی الاسلام کی رٹ جو بار بار لگاتے ہیں تو یہ بعض صحابہ کی فضیلت تھی، شرفِ صحابیت کے حصول کی شرط نہیں۔

اصلاحی صاحب کی بدحواسی دیکھیے کہ انہوں نے نبی ﷺ کی بحالت ایمان کبھی کبھار دیکھ لینے کی اہمیت گھٹانے اور ایسے خوش نصیب کو زمرۂ صحابہ سے نکالنے کے لیے منافقین کا ذکر کر دیا اور ان کی اصل خرابی یہ قرار دے دی کہ ''انہوں نے نبی ﷺ کی صحبت نہیں اٹھائی'' جس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر ان کو نبی ﷺ کی طویل صحبت حاصل ہوتی تو وہ منافق نہیں صحابی ہوتے، جس شخص نے نصف صدی سے زیادہ عرصہ قرآن کے زیر سایہ گزارا ہو کیا اس کے قلم سے اس طرح کی بات افسوسناک نہیں ہے؟

پھر قرآن میں کہاں یہ آیا ہے کہ اعراب کے منافقین کی اصل خرابی ہی یہی تھی کہ انہوں نے نبی ﷺ کی صحبت

[1] ص: ۸۱-۸۳

Marfat.com

نہیں اٹھائی تھی، کیا رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی کو نبی ﷺ کے زیر سایہ رہنے اور آپ کی مجلسوں میں بلا روک ٹوک طویل عرصہ تک شریک ہونے کے مواقع نہیں ملے تھے؟ آپ کی اس ٹیڑھی منطق کی رو سے تو اسے صحابہ کی صف اول میں شامل ہونا چاہیے تھا۔

اصلاحی صاحب کو اس بات کا بڑا ملکہ حاصل تھا کہ وہ اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے حقائق میں مفید مطلب تبدیلی کر لیا کرتے تھے، صحابی کی تعریف میں ''بحالت ایمان رسول اللہ ﷺ کو دیکھنا اور آپ سے شرف ملاقات حاصل کرنا'' بنیادی عنصر کا درجہ رکھتا ہے اور امین صاحب ''بحالت ایمان'' کو گول کر کے مجرد رسول اللہ ﷺ کو دیکھنے کا ذکر کرتے ہیں جس کا قائل کوئی نہیں ہے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ کی زیارت کو بہت بڑا شرف قرار دینے اور صحابہ کرام کے بعض اوصاف حمیدہ کا ذکر کرنے کے بعد پھر وہی راگ الاپا ہے، فرماتے ہیں:

''اگر مجرد رسول اللہ کو دیکھنا کوئی شرف ہوتا تو اس اعتبار سے مخلفین احزاب وتبوک، منافقین مدینہ، واہل بدو اور بانیان مسجد ضرار کچھ کم اس شرف کے حق دار نہ تھے۔'' ❶

یہ الفاظ اس شخص کے ہیں جو لوگوں میں مفسر قرآن، اسلامی داعی اور آخری عمر میں محدث کے القاب سے ملقب رہا ہے، لیکن اپنے غلط اور باطل نظریہ کو صحیح ثابت کرنے کے لیے یہ سارے مغالطے دے رہا ہے اور صدق دل سے ایمان لانے والے کو منافقین سے تشبیہ دے رہا ہے، الاساء مایزرون.

اصلاحی صاحب علم حدیث کی ابجد سے بھی واقف نہیں تھے، انہیں اپنے بلند بانگ دعادی کے باوجود صحیح حدیثوں اور نا قابل اعتبار روایتوں کو جانچنے اور پرکھنے کا کوئی علم نہیں تھا۔ ''مبادی تدبر حدیث'' میں انہوں نے یہ کیا ہے کہ غور وفکر کر کے ایک باب باندھا، پھر الکفایہ کھولی اور اس میں اسی باب کو تلاش کیا اور اس میں جو جو باتیں مفید مطلب ملیں اور جو روایتیں اچھی لگیں ان کو نقل کر دیا، اور کتاب تیار ہو گئی۔

حافظ خطیب بغدادی نے "باب ما جاء فی تعدیل اللہ ورسولہ للصحابہ وأنہ لایحتاج للسوال" اللہ ورسول کا صحابہ کو عدل اور معتبر قرار دینا اور یہ کہ ان کی عدالت محتاج سوال نہیں۔ کا آغاز بعض قرآنی آیات اور صحیح احادیث سے کیا ہے، پھر کچھ ایسی حدیثیں لائے ہیں جو بے حد ضعیف، بلکہ موضوع ہیں، امین صاحب نے یہ کیا ہے کہ صحیح حدیثوں کو تو نظر انداز کر دیا ہے اور صحابہ کی عدالت کے بارے میں پہلی جس حدیث سے استدلال کیا ہے اور اس کی تائید میں دوسری جو حدیث لائے ہیں یہ دونوں حد درجہ نا قابل اعتبار ہیں میں ان دونوں حدیثوں کا ''پوسٹ مارٹم'' کرنے سے پہلے اس باب کے تحت حافظ بغدادی کی تمہیدی عبارت کا ترجمہ کر دینا چاہتا ہوں تا کہ قارئین کرام صحابہ کی مرویات کے بارے میں صاحب الکفایہ کی رائے سے واقف رہیں:

❶ ص:٨٦

Marfat.com

ہر حدیث میں جس کی سند کی کڑیاں اس کے راویوں اور نبی ﷺ کے درمیان متصل اور ملی ہوئی ہوں، اس پر اس کے راویوں کی عدالت ثابت ہونے کے بعد عمل فرض ہے۔

سوائے اس صحابی کے جس نے اس کو رسول اللہ ﷺ سے منسوب کیا ہے، اس لیے کہ صحابہ کی عدالت، قرآن میں اللہ کے ان کو عدل قرار دینے، ان کی پاکیزگی کی خبر دینے اور ان کو پسندیدہ کہنے کی وجہ سے ثابت اور معلوم ہے۔ [1]

بغدادی کی اس عبارت کا مطلب یہ ہے کہ ''صحابی راوی'' کی عدالت محل بحث نہیں ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کے ان کو ''عدل'' قرار دینے کی وجہ سے ان کی عدالت ثابت ہے۔

پہلی حدیث:

((عن ابن عباس رضی اللہ عنہما، قال: قال رسول اللہ ﷺ وسلم: مهما أوتيتم من كتاب الله، فالعمل به لا عذر لأحدكم فى تركه، فان لم يكن فى كتاب الله فسنة منى ماضية، فان لم تكن سنة منى ماضية، فما قال أصحابى، إن أصحابى بمنزلة النجوم فى السماء، فأيهما أخذتم اهتديتم، واختلاف أصحابى لكم رحمة))

''ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: تمہیں کتاب اللہ میں سے جو حکم بھی ملا ہے اس پر عمل کرنے میں تم میں سے کوئی معذور نہیں ہے، اور اگر کتاب اللہ میں کوئی حکم نہ ہو تو میری جو سنت جاری ہے وہ اور اگر میری سنت جاریہ نہ ہو تو جو میرے اصحاب نے کہا، یہ اس لیے کہ میرے اصحاب آسمان میں موجود ستاروں کے مانند ہیں۔ ان میں سے تم جس کو بھی مشعل راہ بناؤ گے ہدایت پاؤ گے اور میرے اصحاب کا اختلاف تمہارے لیے رحمت ہے۔''

حدیث کی سند:

اس حدیث کی سند بے حد ضعیف اور نا قابل اعتبار ہے، اس کا ایک راوی، جس نے یہ حدیث ضحاک بن مزاحم بلخی سے روایت کی ہے اور اس نے ابن عباس سے ان دونوں میں پہلا یعنی جو یبر ''متروک'' ہے، یحییٰ بن معین کا قول ہے: وہ دو کوڑیوں کے برابر بھی نہیں۔ جوزجانی کہتے ہیں: اس سے وابستگی جائز نہیں، اور نسائی اور دارقطنی نے اس کو ''متروک'' قرار دیا ہے۔ [1]

۲۔ رہا جو یبر کا شیخ ضحاک بن مزاحم بلخی تو اس کی ثقاہت مختلف فیہ ہے، البتہ اس بات پر محدثین کا اتفاق ہے کہ اس کو عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ملاقات کا شرف حاصل نہیں تھا۔ امام عبداللہ بن عدی نے الکامل میں اس کا جو طویل

---

[1] ص ۱۸۰ ج: ۱

[2] میزان الاعتدال ص: ۱۶۰۔۱۶۱ ج: ۲، ترجمہ: ۲۵۲۹، تہذیب الکمال (ص: ۱۳۸ ج: ۱، تہذیب التہذیب (ص: ۱۲۳، ج: ۲) تقریب التہذیب ص: ۸۲

Marfat.com

ترجمہ لکھا ہے اس کا اختتام ان الفاظ پر کیا ہے: ضحاک بن مزاحم کو تفسیر کے حوالہ سے شہرت حاصل ہے، رہیں ابن عباس، ابو ہریرہ اور دوسرے تمام لوگوں سے اس کی مرویات تو وہ سب محل نظر ہیں۔'' ❶

حدیث کا متن:

اس حدیث کا متن رسول اللہ ﷺ کے نام پر جھوٹ ہے جس کے دلائل حسب ذیل ہیں:

۱۔ اس میں قرآن وحدیث پر عمل کی جو ترتیب بیان کی گئی ہے وہ متاخرین فقہائے احناف کی گھڑی ہوئی ہے اللہ ورسول نے ان میں یہ ترتیب نہیں قائم کی ہے۔

۲۔ قرآن میں کسی حکم کے نہ ملنے کی صورت میں حدیث سے رجوع کا دعویٰ باطل ہے، کیونکہ قرآن کے بیشتر احکام پر حدیث کے بغیر عمل کرنا ممکن ہی نہیں ہے۔

۳۔ حدیث میں ''سنة ماضية'' کی تعبیر حدیث کی شرعی حیثیت کے منافی ہے، حدیث اور سنت اپنی ذاتی قوت سے حجت ہے، لوگوں کے اس پر عمل کرنے سے نہیں. جبکہ یہ جھوٹی روایت یہ بتا رہی ہے کہ جو سنت جاری ہو اور جس پر عمل ہو رہا ہو اس کو طریق عمل بنایا جائے۔

۴۔ متبوع اور مقتدی صرف رسول اللہ ﷺ ہیں، کوئی بھی صحابی یا تابعی یا امام ومرشد متبوع ومقتدی نہیں، البتہ صحابہ کرام اور اصحاب رشد وہدایت کا طریقہ قابل اتباع ہے، کیونکہ یہ طریقہ کتاب وسنت کی پیروی سے عبارت ہے۔

۵۔ اقوال صحابہ ماخذ شریعت نہیں۔

۶۔ حدیث کا آخری فقرہ ہے ''واختلاف أصحابي لكم رحمة'' اور میرے اصحاب کا اختلاف تمہارے لیے رحمت ہے۔ اصلاحی صاحب نے یہ فقرہ حذف کر دیا ہے۔

حدیث کا مذکورہ بالا فقرہ جھوٹ ہے حدیث نہیں ہے، قرآن پاک اختلاف کی مذمت سے بھرا ہوا ہے۔ یہ یہودیوں کی نمایاں صفت ہے، اسلام میں جو گمراہ فرقے پیدا ہوئے، کثرت اختلاف ان کی شناخت ہے، سب سے زیادہ اتفاق واتحاد محدثین کے یہاں رہا ہے، عقائد کے مسئلہ میں تو صحابہ کرام اور محدثین میں کبھی کوئی اختلاف ہوا ہی نہیں، دراصل اختلافات اس وقت پیدا ہوتے ہیں جب ذوق اور رائے کو شرعی حیثیت دے دی جاتی ہے، نصوص کی پابندی اتفاق واتحاد کو مستحکم رکھتی ہے۔

دوسری حدیث:

امین صاحب نے دوسری جو حدیث نقل کی وہ ''موقوف'' ہے یعنی عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا قول ہے جس کے الفاظ ہیں:

((رأيت أهل العلم يقولون: كل من رأى رسول الله ﷺ، وقد أدرك الحلم

❶ ص: ۱۵۲، ج: ۵

Marfat.com

فأسلم، وعقل أمر الدين ورضيه، فهو عند نا ممن صحب النبى ﷺ ولو ساعة من نهار، ولكن أصحابه على طبقاتهم وتقدمهم فى الإسلام.))

''میں نے اہل علم کو کہتے ہوئے دیکھا ہے: ہر وہ شخص جس نے نبی ﷺ کو بلوغت میں دیکھا اور اسلام لایا اور دین کو سمجھا اور اس سے راضی رہا تو ہمارے نزدیک اس کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جن کو نبی ﷺ کی صحابیت کا شرف حاصل تھا۔ اگرچہ اس نے دن کی ایک گھڑی ہی کے لیے آپ کو دیکھا ہے، لیکن ان کے درجات بھی ہیں اور اسلام لانے میں پیش قدمی کی فضیلت بھی بعض کو حاصل ہے۔'' ❶

یہ موقوف روایت سند کے اعتبار سے بے حد ضعیف ہے، لیکن اس کا متن صحیح ہے، اس موقوف روایت کا راوی، محمد بن عمر واقدی متروک ہے۔ ❷

اور اس کا شیخ طلحہ بن محمد بن سعید بن میسب مجہول اور غیر معروف ہے؛ امام ابو محمد عبدالرحمٰن بن ابی حاتم فرماتے ہیں: اس نے اپنے دادا سے حدیث راویت کی ہے اور اس سے عبدالملک بن قریب اصمعی نے، میں نے اپنے والد کو فرماتے ہوئے سنا ہے: میں طلحہ بن محمد بن سعید بن میسّب کو نہیں جانتا۔'' ❸

سعید بن میسّب سے منسوب قول بھی ضعیف ہے:

امین احسن اصلاحی نے سیّد التابعین سعید بن میسّب سے جو قول منسوب کیا ہے، یا ان سے منسوب جو قول نقل کیا ہے اس کی نسبت ان سے صحیح نہیں ہے؛ اس کی سند میں وہی دونوں راوی شامل ہیں جو عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے منسوب قول کی سند میں شامل ہیں۔

اصلاحی کی سعئ مذموم:

امین احسن اصلاحی صاحب نے صحابہ اور صحابیت کے باب کے تحت جو کچھ فرمایا ہے اس سے ان کا مقصد یہ ثابت کرنا ہے کہ نبی ﷺ سے روایت حدیث میں سب کا درجہ یکساں نہیں تھا، یا دوسرے لفظوں میں ہر صحابی کی حدیث دینی حجت نہیں تھی، کیونکہ ان کے نزدیک شرف صحابیت کے حصول کے لیے رسول اللہ ﷺ کی طویل صحبت درکار تھی۔ اس بات کو انہوں نے مختلف انداز میں بار بار دہرایا ہے اور اپنے دعوے کی تائید میں قرآن پاک کی چند آیتوں سے استدلال بھی کیا ہے، لیکن جس طرح تدبر قرآن میں ان کے بیشتر قرآنی استدلال بے محل ہیں اسی طرح یہاں بھی ان کی ذکر کردہ آیتوں سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ کسی شخص کے صحابی رسول ہونے کی یہ شرط ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت تربیت میں ایک عرصہ رہا ہو، آپ سے دروس لیے ہوں۔ آپ کی نصرت وحمایت کی ہو وغیرہ، ان آیتوں میں یا تو عام صحابہ کے

❶ الکفایہ، ص: ۱۹۰۔۱۹۱، ج: ۱ ❷ التقریب، ص: ۴۳۳ ترجمہ: ۶۱۷۵

❸ الجرح والتعدیل ص: ۴۷۹، ج ۴، ترجمہ: ۲۱۲۷

Marfat.com

بعض اوصاف بیان ہوئے ہیں یا صحابہ کے بعض طبقوں کے درجات بیان ہوئے ہیں۔ لہٰذا ان آیتوں کی روشنی میں ایک ایسے شخص کو شرف صحابیت سے عاری قرار دینا جو نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا دل کی پوری آمدگی کے ساتھ آپ پر ایمان لایا اور آپ کی تعلیمات لے کر چلا گیا۔ قرآن سے غلط استدلال کرنا اور صحابہ کے مقام و مرتبہ کو گھٹانا ہے۔

اصلاحی صاحب نے اپنے دعویٰ میں وزن پیدا کرنے کے لیے نبی ﷺ کو تھوڑی دیر کے لیے دیکھنے والے خوش نصیب، یا آپ سے شرف ملاقات حاصل کرنے والے سعادت مند کے ذکر کے ساتھ ''ایمان'' کا بھول کر بھی ذکر نہیں کیا ہے، بلکہ مختصر مدت کے لیے آپ کی خدمت میں حاضری دینے والے کو ''منافقین'' سے تشبیہ دینے سے بھی احتراز نہیں کیا ہے، جس سے صحابہ کے حق میں ان کی ''بدنیتی'' عیاں ہوتی ہے اور یہ ساری سعی مذموم انہوں نے صرف اس لیے کی ہے کہ بعض مخصوص صحابہ، یا حیثیت عرفی کے مالک صحابہ، یا ''حکومت الٰہیہ'' کے نمایندے صحابہ کے علاوہ دوسرے صحابہ کی ''حدیث واحد'' یا ''خبر واحد'' کو نا قابل اعتبار قرار دے سکیں۔

انہوں نے اس بات کے تحت جو مختلف اقوال نقل کیے ہیں ان میں ایک قول عاصم احول رحمہ اللہ کا بھی شامل ہے جو عبداللہ سرجس رضی اللہ عنہ سے صحابیت کی نفی کا حامل ہے، عاصم احول کے الفاظ ہیں:

((قدرأى عبدالله بن سرجس رسول الله ﷺ، غير أنه لم يكن له صحبة.))

''عبداللہ بن سرجس نے رسول اللہ ﷺ کو یقیناً دیکھا، لیکن ان کو صحبت نہیں حاصل تھی۔'' ❶

اس قول میں ''قدرأى......'' تو خبر ہے جو ثابت ہے اور مسند امام احمد اور صحیح مسلم میں عبداللہ بن سرجس رضی اللہ عنہ کی یہ صراحت ہے کہ وہ نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، آپ کے ساتھ روٹی اور گوشت کھایا اور آپ کے دونوں کندھوں کے درمیان موجود ''مہر نبوت'' بھی دیکھی۔ ❷

لیکن عاصم احول کا یہ دعویٰ: ''لم يكن له صحبة'' محض ان کی رائے ہے جس کی انہوں نے کوئی دلیل نہیں دی ہے، لہٰذا نا قابل قبول ہے۔

اصلاحی سے ایک مطالبہ:

جمہور محدثین اور اہل اصول کا مسلک یہ ہے کہ جس مسلمان نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا، اگرچہ ایک گھڑی ہی کے لیے سہی تو وہ صحابی ہے، یہی امام احمد، امام بخاری اور علی بن مدینی وغیرہ کا بھی قول ہے۔ آپ نے عاصم احول کے قول کو حقیقت پسندانہ قول قرار دیا ہے ❸ کیا میں آپ سے اور آپ کے ہمنوا دوسرے لوگوں سے یہ مطالبہ کر سکتا ہوں کہ آپ یا وہ اپنی اس تائید کا سبب، بلکہ دلیل بتائیں۔

---

❶ مسند امام احمد نمبر: ۲۱۰۵۵، الکفایۃ ص: ۱۸۹ ج: ۱، العلل و معرفۃ الرجال نمبر: ۱۷۷۰۔

❷ صحیح مسلم: ۲۳۴۶ ❸ ص: ۸۵

Marfat.com

آپ نے بار بار ایک گھڑی کے لیے نبی ﷺ کے دیکھنے کا ذکر کیا ہے اور انداز بیان سے اس ''دیکھنے'' کا استخفاف کیا ہے اور اس کی اہمیت کو گھٹانے کی سعی مذموم کی ہے، کیا آپ کے ایسا کرنے کی کوئی نا قابل تردید دلیل ہے یا محض بڑ ہے جیسا کہ بڑ مارنے کی آپ کو عادت ہے۔

کسی شخص کے لیے صحابی رسول ہونے کی یہ شرط تھی کہ وہ آپ پر صدق دل سے ایمان لایا، اس پر قائم رہا اور قرآن وحدیث کے احکام پر عمل کیا، آپ کا دعویٰ ہے کہ صحابی ہونے کے لیے نبی ﷺ کی خدمت میں ایک عرصہ رہنا ضروری تھا، آپ سے سوال ہے کہ اس مطلوبہ عرصہ کی ''لمبائی چوڑائی'' کتنی تھی، ایک گز، دو گز، دس گز، ایک دن، دس دن، ایک ماہ، دس ماہ، ایک سال، دو سال یا؟

پھر کیا قرآن وحدیث، سیرت پاک اور سیر صحابہ میں کوئی ایسا صحیح واقعہ ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہو کہ جو شخص نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، ایمان لایا اور چلا گیا، پھر اسے دوبارہ آپ سے ملنے کا موقع نہیں ملا وہ صحابی نہیں تھا؟

ایک صحیح حدیث کے مطابق رسول اللہ ﷺ نے ایک بار صحابہ کو مخاطب بناتے ہوئے فرمایا:

((انتم أصحابی وإخواننا الذین لم یأتوا بعد.))

''تم میرے اصحاب ہو اور ہمارے بھائی وہ ہیں جو ابھی نہیں آئے۔'' [1]

کیا آپ نے شرف صحابیت کے حصول کی جو شرائط بیان فرمائی ہیں وہ ان تمام لوگوں میں موجود تھیں جن کو آپ نے اپنے اصحاب کا لقب دیا ہے اور کیا آپ کے پاس کوئی ایسی دلیل ہے جس سے یہ معلوم کیا جا سکے کہ ''نبی ﷺ'' نے جن خوش نصیبوں کو ''میرے اصحاب'' فرمایا ہے ان سب نے نبی ﷺ کی طویل صحبت اٹھائی تھی، یا وہ صدق ایمانی کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کی رؤیت سے تو مشرف تھے، لیکن بقیہ صفات میں ان کے درمیان درجات تھے؟

کیا قرآن وحدیث میں رسول اللہ ﷺ کے دست مبارک پر بیعت کرنے والوں کے لیے کوئی ''تربیتی کورس'' یا وہ ''آزمائشی مدت'' متعین تھی جس میں کامیابی کے بعد ہی کسی کو صحابی کا لقب ملتا تھا، یا وہ شہادتین کا اقرار کرتے ہی صحابہ کی مقدس جماعت میں شامل ہو جاتا تھا؟ یہ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ ''صلح حدیبیہ'' کے بعد ہجرت کر کے مدینہ آنے والی اہل ایمان خواتین (مہاجرات) کا امتحان لینے کا حکم دیا گیا ہے (ممتحنہ: ۱۰) یہ حکم خاص مقصد اور خاص حالات کے لیے دیا گیا تھا۔ اگر شرف صحابیت کے حصول کے لیے بھی ایسی کوئی آزمائش ضروری ہوتی تو اللہ و رسول نے ایمان لانے والے ہر شخص کے حق میں اس کا حکم دیا ہوتا۔

کیا حدیث اور سیرت کی کتابوں میں کوئی ایک بھی ایسا واقعہ بیان ہوا ہے کہ کسی صحابی کی حدیث یا خبر کو محض اس وجہ سے مسترد کر دیا گیا ہو کہ اس نے خدمت نبوی میں کوئی خاص عرصہ نہیں گزارا تھا؟

[1] مسلم: ۲۲۹

Marfat.com

کیا حدیث، علم حدیث اور رجال کی کتابوں میں کسی راوی کی روایت قبول کرنے کے لیے عدالت اور حافظہ کی متانت کے سوا کوئی اور شرط مطلوب قرار دی گئی ہے اور کیا کسی صحابی کی روایت قبول کرنے کے لیے کبھی یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ اس کا تعلق کن صحابہ سے ہے، یا وہ حکومت الٰہیہ کا نمایندہ ہے؟

دراصل امت کے یہ نئے مجددین اور حدیث کی شرعی حیثیت کے منکرین اسلام کے دوسرے شرعی ماخذ، حدیث کی اہمیت گھٹانے اور اس کو ناقابل اعتبار ثابت کرنے کے لیے دلائل اور ''سہارے'' تلاش کرنے میں بڑے طاق ہوتے ہیں اور حدیث اور متعلقات حدیث کا وہ نہایت دقت نظر سے مطالعہ کرتے ہیں، اس لیے نہیں کہ اس سے ان کے ایمان ویقین میں قوت وگہرائی پیدا ہو، قرآنی احکام کی تفصیلات معلوم ہوں اور اپنے رسول کی سیرت وکردار، اور آپ کے اقوال وافعال کو معلوم کر کے ان کے سانچے میں اپنی زندگیاں ڈھالیں، بلکہ، حدیث اور کتب حدیث کا مطالعہ اس لیے کرتے ہیں کہ اس سے ان کو اپنے بیمار دلوں کی غذا مل سکے۔ حدیث کے ناقابل اعتبار ہونے کے دلائل مل سکیں اور پھر وہ قرآن کی من مانی تاویلیں کرنے میں آزاد ہوں۔

حدیث کی سند میں جھول:

امین احسن اصلاحی نے پاکستان میں نصف صدی کے لگ بھگ قرآن میں غور وتدبر اور اس کی تفسیر وتشریح میں گزاری اور آٹھ ضخیم جلدوں میں ''تدبر قرآن'' کے نام سے تفسیر شائع کی۔ قرآن پاک کے ترجمہ سے لے کر اس کی تفسیر تک اس ضخیم تفسیر کو جو علمی مقام ومرتبہ حاصل ہے اس کا کچھ اندازہ مولانا جلیل احسن ندوی رحمہ اللہ کی مختصر کتاب ''تدبر قرآن پر ایک نظر'' پر عبوری نظر ڈالی کر لگایا جا سکتا ہے۔ مولانا ندوی رحمہ اللہ سے ۱۹۶۲ء میں، میں نے مدرسۃ الاصلاح سرائمیر میں پڑھا تھا اور ۱۹۶۴ء کے آغاز میں قاہرہ روانہ ہونے سے کچھ پہلے ان سے ربط وتعلق نہیں رہ گیا تھا، لیکن قاہرہ پہنچنے کے بعد استاد وشاگرد کا یہ تعلق بحال ہو گیا تھا اور قاہرہ کے دس ۱۰ سالہ قیام تک قائم رہا تھا۔

سعودی عرب کی آمد کے بعد مولانا ندوی کی خیریت اور ان کی علمی سرگرمیوں کا علم تو ہوتا رہا لیکن ان سے خط وکتابت کا سلسلہ نہیں تھا۔

مولانا جلیل احسن ندوی جسمانی طو پر مفلوج تھے، لیکن ان کا دل اور دماغ دونوں محفوظ تھا، بلکہ جسم کی ساری توانائیاں انہیں دونوں میں سمٹ آئی تھیں۔

مولانا ندوی کو فہم قرآن اور عربی زبان وادب میں نہایت اعلیٰ مقام حاصل تھا، بایں ہمہ وہ حد درجہ منکسر المزاج اور خلیق تھے اور قرآن میں غور وتدبر کے حوالہ سے ہمیشہ طالب علمانہ زندگی گزاری، اثناء درس بھی نہ وہ خود کسی آیت کی تفسیر کرتے اور نہ کسی مفسر کے کسی تفسیری قول پر تنقید کرتے، لیکن صاحب تدبر قرآن کی بھیانک غلطیوں نے ان کو ضعف وپیری کے مرحلے میں قلم اٹھانے پر مجبور کر دیا۔

''تدبر قرآن پر ایک نظر'' پوری نہیں ہو سکی، اور ان کا انتقال ہو گیا رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ ''سورۂ اعراف کی نمبر

Marfat.com

۱۲۹ تک تدبر قرآن کے ترجمہ وتفسیر پر ان کا استدراک ہے، اور یہ بھی معدودے چند آیتوں کے ترجمہ وتفسیر پر۔

میں نے اس واقعہ کا تذکرہ محض اس غرض سے کیا ہے کہ ''جدید طبقہ'' میں حدیث بیزاری کا جذبہ پیدا کرنیوالے امین احسن اصلاحی کے تفسیری کارنامے سے بھی قارئین واقف رہیں جو تفسیر ان کی حاصل زندگی تھی، حدیث کے میدان میں تو وہ ایک معترض کے بھیس میں اترے تھے۔ پھر حدیث اور متعلقات حدیث کا جو مطالعہ کیا وہ حدیث کے خلاف دلائل کی تلاش میں۔ میں نے اوپر ''تدبر حدیث'' کے دائرہ میں ان کے جن افکار ونظریات کا جائزہ لیا ہے، اور صحیح بخاری کی بعض حدیثوں پر ان کے اعتراضات کا جو جواب دیا ہے اس سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ''مطالعہ حدیث'' میں وہ مخلص نہیں تھے اتنے بھی نہیں جتنے محرف تورات وانجیل کے مطالعہ میں، بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ وہ ایک مسلمان مفسر قرآن اور داعی کے بھیس میں ''مستشرق تھے۔''

اصلاحی صاحب نے حدیث کی سند کی راہ سے بھی محدثین کو نشانہ بنایا ہے اور ''سند کی عظمت اور اس کے بعض کمزور پہلو کے تحت انہوں نے حدیث کی سند میں ''چار خلا'' دکھائے ہیں میں سند حدیث پر ان کے اعتراضات کا جائزہ ''سند میں جھول'' کے عنوان کے تحت لوں گا، وہ سند کی عظمت واہمیت اجاگر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

''سند کی اہمیت سے انکار کی کسی کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے، لیکن حدیث کے بعض غالی حامیوں کا یہ خیال ہے کہ کسی حدیث کی صحت کے ثبوت کے لیے مجرد اس کی سند کا علم اصول کے معیار پر پورا ہونا کافی ہے، یعنی ان کے نزدیک صحت حدیث کے لیے صرف سند کی صحت اور اس کا قابل اعتبار ہونا فیصلہ کن امر ہے، ہمارے نزدیک ان کا خیال صحیح نہیں ہے، یہ غلو پر مبنی اور محض حسن ظن ہے۔''

سند کے تمام محاسن، لطائف، عظمت، اہمیت اور اس کے مطابق معیار ہونے کے باوجود اس میں بعض ایسے فطری ''خلا'' رہ جاتے ہیں جن کی تلافی کے لیے ضروری ہے کہ حدیث کی صحت کو جانچنے کے لیے سند کے سوا بعض دوسرے طریقے بھی اختیار کیے جائیں مجرد سند پر اعتبار کر کے کسی روایت کی صحت اور حسن وقبح کے متعلق پوری طرح سے اطمینان نہیں کیا جاسکتا۔'' ❶

محدثین کی نظر صرف سند پر نہیں تھی:

بلاشبہ کسی خبر کی صحت وسقم کو معلوم کرنے کے لیے سند سے واقفیت بنیاد کا درجہ رکھتی ہے، اس کے بعد دوسری چیزیں آتی ہیں، سند سے مراد خبر دینے والے یا اس کی روایت کرنے والے ہیں، قرآن کی سورۂ حجرات کی آیت نمبر ۶ میں علیم وحکیم اللہ نے خبر کی صحت جانچنے کے لیے صرف خبر دینے والے کی صفت عدالت یا اس کی ضد ''فسق'' معلوم کرنے کا حکم دیا ہے، لیکن حدیث کی عظمت واہمیت کے پیش نظر محدثین نے خبر کے متن (مخبر) کی صحت کو جانچنے پر بھی بہت زور دیا

❶ ص: ۹۲

Marfat.com

ہے، کیونکہ اولاً تو ''خبر'' میں اس کا متن بھی داخل ہے ثانیاً طبقہ صحابہ کے بعد تابعین اور تبع تابعین اور تبع تبع تابعین میں سب لوگ ''عدل'' نہیں تھے، لہٰذا راویان حدیث کے حالات وکوائف کو معلوم کر کے جہاں ایسے لوگوں کو الگ کیا گیا جو عدالت سے موصوف تھے وہیں ان کی دی ہوئی خبروں کے ''متن'' پر غور کر کے یہ معلوم کیا گیا کہ یہ زبان نبوت سے نکلی ہیں۔ چونکہ صحابہ میں کوئی فاسق نہیں تھا اس لیے یہ یقین حاصل کر لینے کے بعد کہ اس خبر کا راوی صحابی ہے اس کو قبول کر لیا گیا، اگر اس صحابی نے خبر رسول اللہ ﷺ کے حوالہ سے دی ہے تو اس کو ''مرفوع حدیث'' قرار دے کر شرعی حجت مان لیا گیا اور اگر صحابی نے اس کو نبی ﷺ کی طرف منسوب نہیں کیا ہے تو اس کو قول صحابی یا موقوف کا نام دے دیا گیا، الا یہ کہ اس نے نبی ﷺ کی سیرت پاک کا کوئی واقعہ بیان کیا ہو یا آپ کے کسی عمل کی خبر دی ہو یا یہ کہا ہو کہ: ''ہم رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں ایسا اور ایسا کرتے تھے'' وغیرہ تو یہ بھی مرفوع حدیث ہے۔

سند حدیث کے ساتھ متن حدیث کی تحقیق کرنے کا ذکر 'نقاد رجال' نے کیا ہے، امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((ولا يُستدل على أكثر صدق الحديث وكذبه إلا بصدق المُخبِر وكذبه، إلا في الخاص القليل من الحديث، وذلك أن يستدل على الصدق والكذب فيه بأن يحدث المحدث مالا يجوز أن يكون مثله، أوما يخالفه ماهو أثبت وأكثر دلالاتٍ بالصدق منه.))

''حدیث کے صدق وکذب کی کثرت پر صرف مخبر (خبر دینے والے) کے صدق وکذب سے استدلال کیا جاتا ہے۔ سوائے نہایت قلیل اور خاص حدیثوں کے کہ ان میں صدق وکذب پر اس طرح استدلال کیا جاتا ہے کہ حدیث بیان کرنے والے نے ایسی حدیث بیان کی جس کے مانند ہونا ممکن نہیں، یا اس سے زیادہ ثابت یا اس سے زیادہ صدق کی دلالتیں رکھنے والی حدیث اس کے خلاف ہے۔'' ❶

علم جرح وتعدیل کے امام ابو محمد عبدالرحمٰن ابن ابی حاتم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((ويقاس صحة الحديث بعدالة ناقليه وأن يكون كلاماً يصلح أن يكون من النبوة.))

''حدیث کی صحت کا اندازہ اس کے نقل کرنے والوں کی عدالت سے کیا جاتا ہے اور اس بات سے کہ یہ کلام نبوت ہونے کے قابل ہے۔'' ❷

درحقیقت، جیسا کہ امام شافعی نے فرمایا ہے ایسی حدیثیں بہت کم ہیں جن کی سند بالکل صحیح ہو اور متن صحیح نہ ہو، اگر ایسا بعض حدیثوں میں ہے تو یا تو اس کی سند میں کوئی مخفی علت ہوگی یا حدیث کا مضمون ایسا ہوگا جو گہرے غور و تدبر کا متقاضی ہوگا۔ یا اس میں کوئی پیشین گوئی ہوگی یا اس میں کوئی ایسا حکم بیان ہوا ہوگا جو قرآن میں نہیں آیا ہے اور خود قرآن

❶ الرسالہ: ۲۶۵۔۲۶۶ ❷ مقدمہ الجرح والتعدیل ص: ۳۵۱.

Marfat.com

سے یہ ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو مستقل تشریعی حیثیت بھی حاصل تھی، اور قرآن میں ہر حکم کے ہونے کی بات تو منکرین کہتے ہیں یا وہ لوگ جو رسول اللہ ﷺ کو صرف کتاب اللہ کا شارح مانتے ہیں اور حدیث کی مشروط تشریعی حیثیت کے قائل۔

حقیقت یہ ہے کہ جن حدیثوں کی سند بے حد ضعیف، منکر یا موضوع ہے یا جن کی کوئی سند ہی نہیں ان کا متن اور مضمون بھی نا قابل اعتبار ہے، صحیح حدیثوں کی طرح ضعیف، منکر اور موضوع حدیثیں بھی ریکارڈ میں ہیں۔

جو لوگ حدیث کے متن کی صحت جانچنے کا نعرہ لگاتے ہیں ان کی اکثریت منکر حدیث ہے اور قرآن وحدیث میں تعارض اور بعض حدیثوں کے مخالف عقل ہونے کا دعویٰ یہی لوگ زیادہ کرتے ہیں سابقہ صفحات میں اس مسئلہ پر تفصیلی بحث کر چکا ہوں، یہاں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ یہ لوگ تو قرآن وحدیث کی نصوص سمجھتے بھی نہیں ہیں تو پھر دونوں میں تعارض کو کس طرح سمجھ سکتے ہیں اور حدیث کے متن میں غلطی کا ادراک کس طرح کر سکتے ہیں اصلاحی صاحب تو مفسر قرآن ہونے کے باوجود قرآنی تعبیرات کے لذت آشنا نہیں تھے حدیث کا مطالعہ تو انہوں نے ایک ناقد، بلکہ معترض کے طور پر کیا تھا۔

سند کا پہلا خلا:

اصلاحی صاحب فرماتے ہیں:

سند کی تحقیق میں جو خلا باقی رہ جاتے ہیں وہ معمولی غور وتدبر سے سمجھ میں آ جاتے ہیں، مثلاً: پہلا خلا اس میں یہ ہے کہ اپنے تعلق اور علاقے سے بعید، ہزاروں، بلکہ لاکھوں آدمیوں کے عقیدہ وکردار، ان کے علم وعمل اور ان کے تعلقات ومعاملات کی ایسی تحقیق کہ ان کے متعلق یہ طے کیا جا سکے کہ علم رسول کے حمل ونقل کے باب میں ان پر اطمینان کیا جا سکتا ہے یا نہیں کوئی آسان کام نہیں ہے۔ بے شک محدثین نے اس میدان میں بڑی جاں فشانیاں کی ہیں، لیکن یہ کام ہے بہت مشکل، اس نوعیت کی تحقیق اگر ہم اپنے گاؤں، یا قصبہ، یا شہر کے لوگوں کے بارے میں کرنا چاہیں تو چنداں آسان نہیں چہ جائے کہ ہزاروں میل دور کے لوگوں کے بارے میں جو مختلف ادوار میں پھیلے ہوئے ہوں اس قسم کی تحقیق کے بارے میں محتاط رائے یہ ہو سکتی ہے کہ فی الجملہ ہمیں ان لوگوں کے کوائف معلوم ہیں اور اب ان کی شخصیات مجہول نہیں رہیں، ان کے بارے میں کسی رائے کو حتمی یا قطعی کہنا مشکل اور غالباً اپنی معلومات پر ضرورت سے زیادہ اعتماد ہے۔" [1]

اصلاحی کی غلط بیانیاں:

جب کوئی شخص کسی کے بارے میں یا کسی چیز کے بارے میں "بدنیت" ہوتا ہے تو دوسروں کو اس سے متنفر کرنے کے لیے اس کی ایسی تصویر کشی کرتا ہے جو صداقت سے عاری ہوتی ہے، پھر وہ اپنی اس من گھڑت، خود ساختہ اور جھوٹی تصویر کو دکھا کر لوگوں سے کہتا ہے کہ کیا ایسا انسان بھی پایا جا سکتا ہے اور ایسی چیز بھی اپنا وجود رکھتی ہے۔

[1] ص: ۹۳

Marfat.com

عجیب بات یہ ہے کہ اصلاحی صاحب نے حدیث کی سند کے بارے میں اپنے جن خیالات کا اظہار کیا ہے انہی خیالات کا اظہار بدنام زمانہ منکر حدیث، بلکہ منکر اسلام محمود ابوریہ اپنی کتاب: "أضواء على السنة المحمدية" میں کر چکا ہے دونوں میں اگر کوئی فرق ہے تو یہ کہ ابوریہ اصلاحی صاحب کے مقابلے میں زیادہ جری ہے اور بعض صحابہ تک کو گالی دینے سے احتراز نہیں کرتا، لیکن اصلاحی صاحب کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ ایک مفسر قرآن اور داعی کی حیثیت سے ان کا ''بھرم'' بھی قائم رہے اور وہ حدیث کے بارے میں لوگوں کے ذہنوں کو مسموم بھی کر جائیں۔

اس زہر آلود عبارت کی غلط باتوں کو آشکارا کرنے سے پہلے اپنے قارئین کی توجہ اس امر کی جانب مبذول کر دینا چاہتا ہوں کہ موصوف محدثین کی محنتوں اور جاں فشانیوں کا ذکر تو خوب کرتے ہیں، لیکن ان کے علم وفضل اور حفاظت حدیث کی راہ میں ان کے اخلاص وایثار کا بھول کر بھی ذکر نہیں کرتے۔

صحیح اور ضعیف حدیثوں کے مجموعی راویوں کی تعداد جو ریکارڈ میں ہے وہ بمشکل تیس ۳۰ ہزار ہوگی، صحابہ کرام کے علاوہ ایسی صورت میں ان کو ''لاکھوں'' کی تعداد میں دکھانا محض یہ ثابت کرنے کے لیے ہے کہ محدثین نے اتنی بڑی تعداد میں راویان حدیث کے بارے میں اطمینان بخش تحقیق نہیں کی ہے، بلکہ گھر بیٹھے ان کو ثقہ اور ضعیف قرار دے ڈالا ہے۔

پھر انہوں نے دوسری مبالغہ آرائی یہ کی ہے کہ راویان حدیث کو ''نقاد حدیث'' سے ہزاروں میل کی دوری پر دکھایا ہے، تاکہ یہ ثابت کرسکیں کہ نقاد حدیث کے لیے اتنی لمبی مسافتوں کا طے کرنا ناممکن تھا، لہٰذا انہوں نے راویوں کی ثقاہت وعدم ثقاہت کے بارے میں جو کچھ کہا ہے وہ تجربہ اور مشاہدہ پر مبنی نہیں تھا، خیالی تھا۔

میں عرض گزار ہوں کہ عصر تابعین اور تبع تابعین میں حدیث کے مراکز درج ذیل شہر تھے:

(۱) مدینہ منورہ (۲) مکہ مکرمہ (۳) کوفہ (۴) بصرہ (۵) شام (۶) مصر (۷) یمن (۸) جرجان (۹) قزوین (۱۰) خراسان (۱۱) مراکش اور اندلس۔

مذکورہ مقامات، مغرب عربی، مراکش اور تیونس اور اندلس کو چھوڑ کر ایک دوسرے سے ہزاروں میل دور نہیں تھے۔ پھر جو محدثین ان مراکز کا سفر حدیث کا علم حاصل کرنے کے لیے اور نقاد راویوں کے حالات معلوم کرنے کے لیے کرتے تھے وہ دسیوں سالوں پر پھیلا ہوا تھا۔ صحابہ کی عدالت تو محل بحث نہیں تھی، لیکن طبقۂ تابعین اور ان کے بعد کے طبقوں کے راویان حدیث کی عدالت محل بحث تھی، اور عصر صحابہ کے بعد ہی حدیث کی سند معلوم کرنے کا عمل شروع ہوگیا تھا اور سب سے پہلے جن محدثین نے حدیث کی سند کے بارے میں سوال کرنا شروع کیا وہ عامر بن شراحیل بن عبد بن ذی کبار شعبی (۱۹۔۱۰۴ھ) اور محمد بن سیرین (۳۳۔۱۱۰) ہیں، راویوں کے نقد وتحقیق کے سلسلے میں جن دوسرے محدثین کے ناموں کا ذکر ملتا ہے وہ حسن بصری (۲۱۔۱۱۰ھ) سعید بن جبیر (۲۶۔۹۵ھ) اور ابراہیم نخعی (۴۷۔۹۶ھ) ہیں، گویا دوسرے لفظوں میں روایت حدیث کے ساتھ نقد رجال کا سلسلہ بھی چلتا رہا۔

Marfat.com

امین اصلاحی نے مذکورہ بالا عبارت میں سند میں جس خلا کا دعوی کیا ہے، وہ کوئی علمی انکشاف نہیں، بلکہ ''لطیفہ'' ہے اور صرف الکفایہ کو سامنے رکھ کر مبادی تدبر حدیث لکھنے والا لطیفہ گوئی کے سوا کر بھی کیا سکتا ہے، ورنہ اگر وہ اپنی بحث میں مخلص ہوتے اور ''رجال'' کے موضوع پر مستند کتابوں کا بھی انہوں نے مطالعہ کیا ہوتا تو ان کو یہ معلوم ہوتا کہ جس طرح حدیث کی تحصیل کے لیے محدثین آغاز امر ہی سے مسلسل سفر میں رہتے تھے وہیں ان کے پیش نظر حدیث کے راویوں کے حالات کی بحث و تحقیق بھی ہوتی تھی اور اس غرض کے لیے حدیث کے مراکز کی حیثیت رکھنے والے شہروں کے درمیان ان کا سفر جاری رہتا تھا اور صرف ایک حدیث یا چند حدیثیں بذات خود معلوم کرنے کے لیے علمائے حدیث کا ایک مقام سے دوسرے مقام کا سفر ان کے معمولات میں داخل تھا۔

راویوں کی جرح و تعدیل تجرباتی ہے:

نقاد حدیث نے تابعین، تبع تابعین اور تبع تبع تابعین (۱۴ھ۔۳۰۰ھ) کے جن راویوں کی جرح و تعدیل کی ہے اور ان کی ثقاہت و عدم ثقاہت کے جو احکام جاری کیے ہیں وہ ایک ایک کر کے ان کے ذاتی تجربات اور مشاہدات پر مبنی تھے۔ اپنے ذوق و پسند سے وہ کسی کو ثقہ یا ضعیف، یا عدل اور مجروح نہیں قرار دیتے تھے، یہ اور بات ہے کہ بعض راویوں کی جرح میں بعض نقاد نے نہایت سخت الفاظ استعمال کیے ہیں تو بعض نے نرم اور ہلکے تو یہ ان کے مزاج اور افتاد طبع کا نتیجہ ہے۔ جس کا نمونہ ہمیں انبیاء علیہم السلام کی سیرتوں میں بھی ملتا ہے۔ قرآن پاک میں نوح، ابراہیم، موسیٰ، یوسف اور عیسیٰ علیہم السلام کے جو اقوال اور مجرمین کے حق میں اللہ تعالیٰ سے ان کی جو دعائیں منقول ہیں ان میں ان کے مزاج کی سختی اور نرمی کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اور چونکہ خاتم الانبیاء والمرسلین محمد بن عبداللہ ﷺ کی حدیث بیان کرنے اور نقل کرنے میں غیر ذمہ داری اور لا پروائی کا مظاہرہ، اور کذب بیانی اور دروغ گوئی، اور آپ کی طرف جھوٹی روایتیں منسوب کر کے بیان کرنا بہت بڑا جرم ہے اس لیے پاسبان حدیث نبوی نے اگر ایسے راویوں کے حق میں کچھ سخت الفاظ استعمال کیے ہیں، تو ایسا کرنا ان کی غیرت دینی کا تقاضا تھا۔

ذیل میں بعض نقاد حدیث کی، ان کی تاریخ پیدائش اور تاریخ وفات کے ساتھ فہرست دی جا رہی ہے جس سے راویوں کے نقد و احتساب کے بارے میں محدثین کی عظیم اور مسلسل خدمات کا کچھ اندازہ لگایا جا سکتا ہے:

نام	تاریخ پیدائش	تاریخ وفات
۱۔ عامر بن شراحیل شعبی	۱۹ھ	۱۰۴ھ
۲۔ سعید بن جبیر	۲۶ھ	۹۵ھ
۳۔ حسن بصری	۲۱ھ	۱۱۰ھ

Marfat.com

۴۔ محمد بن سیرین	۳۳ھ	۱۱۰ھ
۵۔ ابو بسطام شعبہ بن حجاج	۸۲ھ	۱۶۰ھ
۶۔ محمد بن مسلم زہری	۵۶ھ	۱۲۴ھ
۷۔ عمر بن عبدالعزیز	۶۱ھ	۱۰۱ھ
۸۔ عبدالرحمٰن بن عمرو اوزاعی	۸۸ھ	۱۵۷ھ
۹۔ مالک بن انس	۹۳ھ	۱۷۹ھ
۱۰۔ سفیان بن سعید ثوری	۹۷ھ	۱۶۱ھ
۱۱۔ سفیان بن ابی عمران عیینہ	۱۰۷ھ	۱۹۸ھ
۱۲۔ عبداللہ بن مبارک	۱۱۸ھ	۱۸۱ھ
۱۳۔ یحییٰ بن سعید قطان	۱۲۰ھ	۱۹۸ھ
۱۴۔ عبدالرحمٰن بن مہدی	۱۳۵ھ	۱۹۸ھ
۱۵۔ یحییٰ بن معین	۱۵۸ھ	۲۳۳ھ
۱۶۔ علی بن مدینی	۱۶۱ھ	۲۳۴ھ
۱۷۔ احمد بن حنبل	۱۶۴ھ	۲۴۱ھ
۱۸۔ عمرو بن علی فلاس	۱۶۰ھ	۲۴۹ھ
۱۹۔ محمد بن اسماعیل بخاری	۱۹۴ھ	۲۵۶ھ
۲۰۔ مسلم بن حجاج	۲۰۴ھ	۲۶۱ھ
۲۱۔ ابو داؤد سلیمان بن اشعث	۲۰۲ھ	۲۷۵ھ
۲۲۔ محمد بن عیسیٰ ترمذی	۲۰۹ھ	۲۷۹ھ
۲۳۔ احمد بن شعیب نسائی	۲۱۵ھ	۳۰۳ھ
۲۴۔ ابو حاتم محمد بن ادریس	۱۹۵ھ	۲۷۷ھ
۲۵۔ عبدالرحمٰن بن ابی حاتم	۲۴۰ھ	۳۲۷ھ
۲۶۔ ابو زرعہ عبیداللہ بن عبدالکریم	۲۰۰ھ	۲۶۴ھ

یہ ہیں فن نقد رجال و علل حدیث کے بعض ائمہ ان میں بیشتر ہر وقت پا بہ رکاب رہتے تھے اور حدیث کی تحصیل اور راویوں کے احوال سے واقفیت حاصل کرنا ان کا نصب العین تھا، کیا اس کے بعد بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ حدیث کے

Marfat.com

راویوں کے کوائف حتمی اور قطعی نہیں ہیں۔

اگر اصلاحی صاحب نے انہی حافظ خطیب بغدادی کی کتاب: "الرحلة فی طلب الحدیث" کا بھی مطالعہ کر لیا ہوتا تو ان کے قلم سے مذکورہ بالا باتیں نہ نکلتیں۔

امام ابن ابی حاتم کی کتاب الجرح والتعدیل، امام عبداللہ بن عدی کی الکامل، امام ذہبی کی میزان الاعتدال، اور حافظ ابن حجر کی لسان المیزان میں راویان حدیث کی جو جرح وتعدیل ہے وہ سابق ائمہ فن کے اقوال پر مبنی ہے جس طرح ابن منظور نے لسان العرب میں اور فیروز آبادی نے القاموس المحیط میں الفاظ کے جو معانی لکھے ہیں، جو محاورے، امثال اور اشعار نقل کیے ہیں وہ قدیم کتابوں سے ماخوذ ہیں ان کے اپنے گھڑے ہوئے نہیں ہیں۔

سند کا دوسرا خلا:

اس عنوان کے تحت میں امین صاحب کی عبارت نقل کرنے سے پہلے دو اہم باتیں واضح کر دینا چاہتا ہوں:

۱۔ ایک ہی عصر اور زمانے میں پائے جانے والے اہل فن کے درمیان معاصرانہ چشمک کا پایا جانا باعث تعجب نہیں ہے، بعض "نقاد رجال" نے اپنے معاصر بعض راویان حدیث کی جو جرح کی ہے۔ دوسرے محدثین اس سے غافل نہیں رہے ہیں، بلکہ انہوں نے دوسرے ناقدین فن کے اقوال کا بھی مجروح راوی کے حق میں مطالعہ کیا ہے اور انہوں نے تمام اقوال کے درمیان غیر جانبدارانہ موازنہ کر کے یہ معلوم کر لیا ہے کہ کسی شخص کے بارے میں کس کی جرح حقیقی ہے اور کس کی معاصرانہ چشمک ہے؟

۲۔ انسان بلاشبہ فرشتہ نہیں ہے اور اس کی رائے اور حکم میں اس کے ذوق اور پسند کا غلبہ اور تاثیر ہو سکتی ہے اور بشری کمزوری کی وجہ سے وہ کسی کو ثقہ اور کسی کو ضعیف قرار دے سکتا ہے، لیکن ایک ہی وقت میں تمام ناقدین کا اس بشری کمزوری اور اس غلبہ ذوق و پسند سے موصوف ہونا ناممکن ہے، ورنہ پھر حق کا بول بالا نہیں رہ جائے گا اور شیطان کا راج قائم ہو جائے گا، پھر انسان کے فرشتہ نہ ہونے کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ پوری جنس بشری شیطان صفت بن گئی ہے یہ حکم تو عام انسانوں پر لگانا صحیح نہیں تو پھر ان انسانوں پر لگانا کس طرح صحیح ہو سکتا ہے جن کے ہاتھوں اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کے دوسرے بنیادی شرعی ماخذ کی حفاظت فرمائی، اور اپنے آخری اور محبوب نبی و رسول کی سیرت پاک کی ایک ایک جزئیہ کی حفاظت فرمائی، ۱۴ سے زیادہ صدیاں گزر جانے کے باوجود پیارے نبی ﷺ کی سیرت پاک اپنی تمام تر تفصیلات کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے فضل، پھر انہی نفوس قدسیہ کی محنتوں، شب بیداریوں اور صحیح کو نا قابل اعتبار سے الگ کرتے رہنے اور چھانٹتے رہنے سے محفوظ ہے۔

محدثین اور ناقدین حدیث دونوں بلاشبہ بشر تھے اور بالقوۃ بشری کمزوریوں سے موصوف تھے، لیکن بالفعل وہ ہر دور میں امت محمد ﷺ کے سب سے زیادہ پاکباز، سب سے زیادہ معصیت سے دور، نقل معلومات اور خبر میں سب سے

Marfat.com

زیادہ امین اور دقت پسند تھے، اگر راویوں کی جرح وتعدیل مین ان میں سے معدودے چند افراد سے فرد گزاشتیں ہو گئی ہیں تو تین صدیوں میں پائے جانے والے ناقدین کو مطعون قرار دینا حقائق کا انکار ہے۔

صحابہ کے بعد تابعین، تبع تابعین، اور تبع تبع تابعین کے محدثین اور ناقدین حدیث اپنے عقیدہ وعمل میں رسول اللہ ﷺ کے سچے پیرو تھے متقدمین فقہاء بھی انہی کے مانند تھے، لیکن تیسری صدی کے بعد فقہاء کا عقیدہ وعمل رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام کا عقیدہ وعمل نہیں رہا، بلکہ اس میں معتزلہ، متکلمین، خوارج اور صوفیا کے عقائد بھی داخل ہو گئے، لیکن محدثین ہمیشہ قرآن وحدیث سے ماخوذ عقائد پر قائم رہے اس طرح اس دین اور اس کی خالص اور بے آمیز تعلیمات اور دین کے دوسرے بنیادی شرعی ماخذ، حدیث کے محافظ، پاسبان اور خادم یہی محدثین رہے ہیں اور رہیں گے۔

امین احسن اصلاحی نے سند کے دوسرے خلا کو ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

''سند کی تحقیق میں دوسرا خلا جرح وتعدیل کے کام کی نزاکت سے پیدا ہوتا ہے، پھر ہر محقق یہ نہیں جانتا کہ جرح کس چیز پر ہونی چاہیے اور تعدیل کس چیز کی ہونی چاہیے، یعنی یہ جاننا کہ کیا باتیں جرح کے حکم میں داخل ہیں اور کیا باتیں تعدیل کے متقضیات میں سے ہیں ہر شخص کا کام نہیں ہے، کردار کی اساسات کیا ہیں، بدکرداری کی بنیادیں کیا ہیں، یہ چیزیں اتنی آسان نہیں کہ ہر خاص وعام اس کا کماحقہ ادراک کر سکے اس بے خبری کی مثالیں ماضی میں رہی ہیں اور خود مشائخ نے ان کا تذکرہ کیا ہے، موجودہ دور کے غلوئے عقیدت ونفرت سے اس مشکل کا ایک سرسری اندازہ کیا جا سکتا ہے۔'' [1]

بس کی گانٹھ:

یہ عبارت سند میں دوسرے خلا یا میرے الفاظ میں دوسرے جھول کی تمہید ہے جو درحقیقت بس کی گانٹھ ہے جس میں اصلاحی صاحب نے اپنے مقدور بھر نہایت چالاکی اور عیاری کے ساتھ محدثین کے علم جرح وتعدیل کے خلاف اپنے مسموم افکار کو سمیٹ کر بند کر دیا ہے اور اس علم کی ایسی تصویر کشی کی ہے کہ وہ ناممکن الوقوع نظر آئے اور انسانی بس میں نہ ہونے، یا انسانی بس سے باہر ہونے کی وجہ سے راویوں کی جرح وتعدیل سے متعلق علمائے رجال کے تحقیقی عمل کو مسترد کر دینے یا ناقابل اعتبار قرار دینے کی راہ ہموار ہو جائے۔

جرح وتعدیل مشکل ہے ناممکن نہیں:

میں اوپر یہ عرض کر چکا ہوں کہ روایت حدیث کے ساتھ ہی نقد حدیث کا عمل بھی شروع ہو گیا تھا، اور اس میدان لق ودق میں اللہ کے جو صالح بندے اترے تھے وہ اپنے عقیدہ وعمل کی سلامتی کے ساتھ اس منصب کے مکمل اہل تھے وہ حدیث رسول کی روایت کرنے والوں کی جرح وتعدیل کے لیے اس لیے نہیں اٹھ کھڑے ہوئے تھے کہ اس سے ان کی

[1] ص: ۹۴

Marfat.com

کوئی ذاتی غرض وابستہ تھی، بلکہ اس مقدس، مگر مشکل اور حد درجہ محنت طلب عمل کا صرف ایک ہی محرک اور داعیہ تھا اور وہ یہ کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی سیرت پاک اور اقوال وافعال اور آپ کی ذات مقدس سے متعلق تمام چیزوں کو ہر آمیزش سے پاک کر کے پیش کریں، اور جن بدنصیبوں نے حدیث یا سنت میں کوئی ملاوٹ کرنے کی کوشش کی ہے یا روایت میں غلط بیانی کے مرتکب ہوئے ہیں یا اپنی من گھڑت اور خود ساختہ عبارتوں کو حدیث کا نام دے کر رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کیا ہے ان کو منظر عام پر لائیں۔

اللہ تعالیٰ اپنے اس آخری دین کا محافظ ہے، مگر اس کی حفاظت کا کام اپنے بندوں سے لیتا ہے۔ یہ دنیا عالم الاسباب ہے، اور اللہ نے اپنے آخری ہدایت نامہ قرآن کی حفاظت کا ذمہ خود لے رکھا ہے۔ پھر بھی اول روز سے، بلکہ نزول قرآن کے شروع ہونے سے پہلے ہی سے ایسے انتظامات فرما دیے کہ اس کی آخری کتاب میں کوئی ملاوٹ نہ ہونے پائے اس کے لیے اس نے ایسا نہیں کیا کہ اس نے انسانوں کو ایسا نہ کرنے پر فطری اور جبلی طور پر مجبور کر دیا، نہیں، بلکہ اس نے اہل شر کو پوری آزادی بخش دی کہ اس قرآن کو بدلنے اور اس میں حذف واضافہ کرنے کے لیے جو کچھ چاہیں کریں، دوسری طرف اپنے صالح اور اہل خیر پسند بندوں کو ایمان وعمل کی دولت سے مالا مال کرنے کے علاوہ بے پناہ علمی اور جسمانی صلاحیتوں سے نواز دیا۔

سورۂ جن میں اللہ تعالیٰ نے جنوں کے ان احساسات کو بیان فرمایا ہے جو پہلی بار قرآن کو سن کر ان کے دلوں میں پیدا ہوئے تھے، پھر اسی سورت کی آیات ۸ اور ۹ میں اللہ تعالیٰ نے ان کا یہ اعتراف نقل کیا ہے کہ وہ پہلے فضائے آسمان میں کچھ سن گن لینے کے لیے پرواز کیا کرتے تھے، پھر ان کی اس پرواز کو روکنے کے لیے سخت پہرے دار مقرر کر دیے گئے، ارشاد الٰہی ہے:

﴿وَأَنَّا لَمَسْنَا السَّمَآءَ فَوَجَدْنَاهَا مُلِئَتْ حَرَسًا شَدِيدًا وَّشُهُبًا ۝ وَأَنَّا كُنَّا نَقْعُدُ مِنْهَا مَقَاعِدَ لِلسَّمْعِ فَمَنْ يَّسْتَمِعِ الْآنَ يَجِدْ لَهُ شِهَابًا رَّصَدًا﴾ (الجن: ۸۔۹)

''اور حقیقت یہ ہے کہ ہم نے آسمان کو ٹٹولا تو ہم نے اسے سخت پہرے داروں اور شعلوں سے بھرا ہوا پایا اور حقیقت یہ ہے کہ ہم پہلے آسمانوں میں کئی جگہوں پر بیٹھا کرتے تھے، تو جو اب سننے کا ارادہ کرتا ہے وہ اپنی گھات میں ایک چمکدار شعلہ پاتا ہے۔''

سورۂ شعراء کی آیت نمبر ۱۹۳ میں اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی ہے کہ قرآن کو نازل کرنے والے ''روح الامین'' ہیں۔ پھر آیت ۲۱۰۔۲۱۲ تک میں یہ بیان فرمایا ہے کہ نہ تو قرآن کے نزول میں شیطان کا کوئی حصہ ہی ہے اور نہ ہی یہ ان کی قدرت ہی میں تھا، ارشاد ربانی ہے:

﴿وَمَا تَنَزَّلَتْ بِهِ الشَّيَاطِينُ ۝ وَمَا يَنْبَغِي لَهُمْ وَمَا يَسْتَطِيعُونَ ۝ إِنَّهُمْ عَنِ السَّمْعِ

Marfat.com

لَمَعۡزُولُونَ﴾ (الشعراء: ۲۱۰۔۲۱۲)

''اسے لے کر شیطان نہیں اترے ہیں اور نہ ایسا کرنا ان کے لیے مناسب ہی ہے اور نہ وہ یہ کر سکتے ہیں، حقیقت تو یہ ہے کہ وہ اس کے سننے سے الگ تھلگ ہیں۔''

محدثین اپنی خلقت کے اعتبار سے فرشتے نہیں، بشر تھے، ان کا مادہ تخلیق ''نور'' نہیں، ''مٹی'' تھا، لیکن اپنے اخلاق وکردار، اللہ ورسول سے بے پناہ محبت، کتاب وسنت کی تعلیمات کی پیروی، امانت داری اور اخلاص اور علم وفضل اور بیدار مغزی میں اپنی مثال آپ تھے، ان میں سے بعض کی بعض تسامحات اور بعض بشری کمزوریوں کو بنیاد بنا کر سب پر ''بے خبری'' کا حکم لگانا اور موجودہ دور کے غالی اور متنفر لوگوں سے ان کو تشبیہ دینا بیمار ذہنیت کی پیداوار ہے۔

جرح وتعدیل کا کام بلاشبہ مشکل تھا، مگر ناممکن نہیں تھا اور جن نفوس قدسیہ نے اپنے غیر معمولی حافظہ اور بے مثال بیدار مغزی کے ساتھ اس کام کے لیے اپنے آپ کو وقف کر رکھا تھا اور مسلسل سفر میں رہتے تھے، اور جن کی للہیت اور اخلاص کی مثال بیان کی جاتی تھی ان کے لیے اپنے ہی دور کے راویان حدیث کے شہروں اور قصبوں میں جا جا کر ان کے حالات معلوم کرنا محنت طلب تو تھا، لیکن ان کی استطاعت میں تھا اور انہوں نے اس کام کو جس حسن وخوبی سے انجام دیا اس حسن وخوبی سے اسے انجام دینا تو درکنار اس کا تصور بھی ان سے پہلے ذہن بشری میں نہیں تھا۔

امین اصلاحی کو تو ایک مفسر قرآن اور داعی الی اللہ کی حیثیت سے جانا جاتا ہے اس کے باوجود انہوں نے اس بات کی پوری مذموم کوشش کی ہے کہ وہ محدثین کو علم وتفقہ، بصیرت اور تجربے اور معقولیت سے عاری کر کے دکھائیں۔

بیت القصید:

اصلاحی صاحب نے اس تمہیدی عبارت کے بعد جو کچھ تحریر فرمایا ہے وہ ہے ''بیت القصید'' فرماتے ہیں:

''جرح وتعدیل کا کام علم، فقاہت، بصیرت، تجربے اور معقولیت کا متقاضی ہے، انسان ہمیشہ انسان ہی رہے ہیں، فرشتے نہیں رہے ہیں، فن اسماء الرجال کے ماہرین کا معیار اخلاق، بصیرت وبصارت بے شک ہم سے اونچا رہا ہے، لیکن وہ بہر حال آدمی ہی تھے۔ رواۃ حدیث کے متعلق ان کی فراہم کردہ معلومات اور ان پر مبنی آراء عام انسانی جبلت میں موجود تعصب کے شائبہ سے پاک نہیں ہو سکتیں جو حق یا مخالف دونوں صورتوں میں پایا جاتا ہے۔'' ❶

انسان فرشتہ نہیں ہے تو شیطان بھی نہیں ہے:

اصلاحی صاحب نے جرح وتعدیل کے کام کے لیے جن اوصاف کو ضروری قرار دیا ہے، کیا ائمہ نقد رجال ان سے موصوف نہیں تھے، ان کے انداز بیان سے یہی جھلکتا ہے۔ یہاں انہوں نے کسی امام کی کوئی مثال نہیں دی ہے، میں نے

❶ ص: ۹۴

Marfat.com

اوپر محدثین کے تینوں طبقات کے جن چند ناقدین رجال کی فہرست دی ہے ان میں سے ہر ایک علی فرق مراتب علم و تفقہ، بصیرت و بصارت، تجربہ اور بیدار مغزی اور خلاق و کردار کی نہایت اعلیٰ چوٹی پر فائز تھا، ان میں سے ہر ایک کا تذکرہ متعدد ایسی کتابوں میں آیا ہے جن کے مصنفین نے مسلک و مذہب اور ذوق و پسند سے بہت بلند ہو کر ہر ایک کے حالات وکوائف بیان کیے ہیں، اگر انہوں نے صرف اپنے پسندیدہ مصنف حافظ خطیب بغدادی کی شاہکار کتاب تاریخ بغداد ہی کا مطالعہ کر لیا ہوتا تو اس میں ان کو سیکڑوں راویان حدیث کے حالات وکوائف تفصیل سے مل جاتے اور ان کی جرح یا تعدیل کے مسئلہ میں کافی اطمینان بخش معلومات حاصل ہو جاتیں، مگر برا ہو ذہنیتوں کے فتور کا کہ ایسا انسان اپنے نظریہ کے خلاف ہر بات کو خلاف حق سمجھتا ہے۔

محدثین اور راویان حدیث عام آدمی نہیں تھے:

اگر محدثین اور ائمہ نقد علم و تفقہ اور اخلاق و کردار میں اصلاحی صاحب کے معیار کے نہ بھی رہے ہوں، پھر بھی وہ عام انسان نہیں تھے، بلکہ ہر آبادی اور شہر میں اپنی خاص پہچان رکھتے تھے۔ اسی طرح حدیث کی روایت کرنے والے بھی عام آدمی نہیں تھے۔ چاہے وہ صحیح احادیث کے راوی رہے ہوں یا ضعیف، منکر اور موضوع احادیث کے اور ائمہ نقد کے لیے ہر راوی کے پاس پہنچنا ناممکن نہیں تھا خاص طور جبکہ ان محدثین اور ماہرین اسماء الرجال نے اپنے زندگیاں اس مقدس فریضے کے لیے وقف کر رکھی ہوں، محدثین حدیث کی تحصیل اور رجال حدیث کے بارے میں ضروری معلومات کے حصول دونوں کے لیے سفر کرتے تھے۔ دسیوں کتابوں میں اس کے تذکرے موجود ہیں۔

جرح و تعدیل کے موضوع معلوم ہیں:

علوم الحدیث کا ایک معمولی طالب علم بھی یہ جانتا ہے کہ راوی کی کون سی صفات موضوع جرح بنتی ہیں اور کن کی تعدیل مطلوب ہے یہ صحیح ہے کہ بعض ائمہ رجال نے بعض ایسے راویوں کی مرویات مسترد کر دی ہیں جو ان کی نگاہ میں، نہ کہ حقیقت میں عدالت کی منافی حرکتوں کے مرتکب ہوتے تھے لیکن چونکہ لوگوں کو وہ اوصاف معلوم تھے جن سے عدل راوی کو موصوف ہونا ضروری ہے اسی طرح وہ ان خصلتوں سے بھی واقف تھے جن سے موصوف ہونے کی صورت میں ایک راوی مجروح ہو جاتا ہے لہٰذا جمہور نقاد کسی کے بارے میں کسی ''شاذ'' رائے یا قول کو قبول نہیں کرتے تھے۔

اصلاحی کا یہ دعویٰ کہ: ''ہر محقق یہ نہیں جانتا کہ جرح کسی چیز پر ہونی چاہیے اور تعدیل کسی چیز کی ہونی چاہیے، یعنی یہ جاننا کہ کیا باتیں جرح کے حکم میں داخل ہیں اور کیا باتیں تعدیل کے مقتضیات میں سے ہیں ہر شخص کا کام نہیں ہے''

یہ دعویٰ ببانگ دہل یہ اعلان کر رہا ہے کہ اصلاحی صاحب نے الکفایہ کا مطالعہ بھی سمجھ کر نہیں کیا تھا ورنہ وہ اس امت کے ائمہ رشد و ہدایت کے بارے میں ایسا دعویٰ نہ کرتے، البتہ خود ان کے حق میں یہ دعویٰ بالکل درست ہے میں اوپر عرض کر چکا ہوں کہ حدیث کے ایک معمولی طالب علم کو بھی یہ بات معلوم ہے کہ کون سا راوی عدل ہے اور کون غیر

Marfat.com

عدل، چونکہ اصلاحی صاحب ''اصلاحی مکتبہ فکر'' کے امام مانے جاتے ہیں۔ لہٰذا ان کے پیروؤں اور اصلاحی مکتبہ فکر کے وابستگان کی بھی یہی رائے ہوگی جو اس علم سے اپنے امام سے بھی کم وابستگی رکھتے ہیں مگر ''تیور'' اپنے امام ہی کے رکھتے ہیں اور حوالے بھی بڑی بڑی کتابوں کے دیتے ہیں جن کا ایک جملہ بھی سمجھنے سے قاصر ہیں اس لیے میں جرح وتعدیل کی جامع ومانع تعریف کر دینا چاہتا ہوں تا کہ حجت تمام ہو جائے۔

جرح وتعدیل کی تعریف:

''جرح'' ''جرح یجرح'' کا مصدر ہے جس کے معنی ہیں: زخمی کرنا، توہین کرنا، اور عیب بیان کرنا، اس کا ہم معنی اور مترادف فعل، "طعن یطعن طعناً" ہے۔

علوم الحدیث کی اصطلاح میں ''راوی کی جرح'' کے معنی ہیں حدیث کے راوی کے ایسے واقعی عیوب اور نقائص بیان کرنا جو اس کی روایت کردہ حدیث کو نا قابل قبول، ساقط اور نا قابل استدلال بنا دیں ایسا راوی مجروح کہلاتا ہے۔

''تعدیل'' عدَّل یُعدِّل کا مصدر ہے جس کے معنی ہیں: درست کرنا، سیدھا کرنا، ٹھیک کرنا اور برابر کرنا۔

علوم الحدیث کی اصطلاح میں ''تعدیل الراوی'' کے معنی ہیں: حدیث کے راوی کے ایسے واقعی خصائل اور اوصاف بیان کرنا جو روایت حدیث میں اس کو قابل اعتماد قرار دیتے ہوں اور اس کی روایت کردہ حدیث کو قابل قبول، قابل استدلال اور حجت بنا دیتے ہوں۔

ایسا ثقہ اور قابل اعتماد راوی اصطلاح میں ''عدل'' کہلاتا ہے دال پر سکون کے ساتھ جو "عَدُل یعدُلُ" کا مصدر بمعنی ''عادل'' ہے یعنی عدالت کی صفت سے موصوف یہ "عَدَل یعدِل" سے آنے والے اسم فاعل ''عادل'' کے علاوہ ہے کیونکہ یہ عادل ''منصف'' کے معنی میں ہے۔

محدثین کے نزدیک راوی کی عدالت سے مراد اس کی ایسی لازمی اور گہری صفت یا اس کی ایسی پاکیزہ نفسیانی خصلت اور بلند اخلاقی ہے جو اس کو تقویٰ کا پابند بنائے رکھتی ہو اور سیرت وکردار میں اس کو انسانیت اور شرافت سے گری ہوئی حرکتوں کے ارتکاب سے باز رکھتی ہو، "عَدْل" کی ضد ''فاسق'' ہے جس کی دی ہوئی خبر کی تحقیق کا حکم دیا گیا ہے۔

مذکورہ بالا وضاحتوں کا خلاصہ:

ثقہ راوی کی لازمی صفات دو ہیں:

۱۔ عدالت

۲۔ ضبط، ضبط میں سینہ اور ضبط سفینہ دونوں داخل ہیں۔

ضبط سینہ سے مراد یہ ہے کہ راوی غیر معمولی، قوی، اور قابل اعتماد حافظہ کا مالک ہو اور ضبط سفینہ یہ ہے کہ راوی حدیث نے اپنے شیخ سے جو کچھ سنا ہو اسے نہایت احتیاط وتوجہ سے ضبط تحریر میں لاتا رہا ہو اور اپنے تحریری صحیفوں کی دل وجان سے

Marfat.com

عزیز تر سمجھ کر حفاظت کرتا رہا ہو۔

ثقہ اور عدل راوی کی تعریف:

ثقہ اور عدل راوی وہ عاقل بالغ مسلمان ہے جو صدق گو ہو، فسق و فجور سے پاک اور تقویٰ شعار رہا ہو، انسانیت اور شرافت سے گری ہوئی حرکتوں کا مرتکب نہ ہوتا رہا ہو، اگر اپنے حافظہ سے حدیث کی روایت کرتا رہا تو زبردست اور قابل اعتماد حافظہ کا مالک رہا ہو اور اگر اپنی کتاب سے روایت کرتا رہا تو اس کو مکمل احتیاط اور توجہ سے ضبط تحریر میں لایا ہو اور کسی غلط ہاتھ میں پڑنے سے اس کی حفاظت کرتا رہا ہو۔

مجروح اور غیر ثقہ راوی کی تعریف:

اوپر مذکور عدالت اور ضبط کی دونوں صفتیں یا ان میں سے کوئی ایک اگر کسی راوی کے اندر نہ پائی جائیں۔ تو ایسا راوی مجروح، یا مطعون یا غیر ثقہ ہے۔

کسی راوی کے عدالت سے موصوف نہ ہونے یا غیر ''عدل'' ہونے کی ۵ شکلیں محدثین نے متعین کی ہیں:

(۱) جھوٹا ہو (۲) کذب بیانی کا ملزم ہو۔ (۳) فاسق ہو۔ (۴) بدعات کا مرتکب ہو۔ (۵) غیر معروف اور مجہول ہو، یعنی نہ کوئی اس کی ذات سے واقفیت رکھنے والا ہو اور نہ اس کے حالات سے۔

اسی طرح جو راوی حفظ و ضبط سینہ یا ضبط سفینہ کی صفت سے موصوف نہ رہا ہو اس کی بھی ۵ شکلیں ہیں:

۱۔ روایت حدیث میں بے تحاشا غلطیوں کا مرتکب پایا جائے۔

۲۔ بے خبری اور حاضر دماغی کے فقدان میں مبتلا رہا ہو۔

۳۔ کثرت وہم و خیال کا شکار رہا ہو۔

۴۔ حافظہ برا اور کمزور رہا ہو۔

۵۔ اس کی مرویات ثقہ راویوں کی مرویات کے خلاف پائی جاتی رہی ہوں۔

یہاں یہ بتانا تحصیل حاصل ہے کہ جس طرح حسن و خوبی میں درجات ہوتے ہیں وہیں بری خصلتوں اور برے اعمال میں بھی درجات ہوتے ہیں۔ خود قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کے نبیوں اور رسولوں میں فرق مراتب کا ذکر آیا ہے۔ البتہ ''صدق رسالت'' میں ان کے درمیان کوئی فرق نہیں تھا۔ یہ تو خیر اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندے تھے، صحابہ کرام میں بھی درجات تھے، بلکہ خود مشرکین بھی نبی ﷺ اور صحابہ کرام سے نفرت و عداوت، اسلام اور مسلمان دشمنی اور اخلاقی برائیوں میں یکساں نہیں تھے۔ (ممتحنہ: ۸)

انہی حقائق کی روشنی میں محدثین نے جہاں عدل اور ثقہ راویوں کے درجات بیان کر دیے ہیں وہیں مجروح اور غیر ثقہ راویوں کے درجات بھی بیان کر دیے ہیں:

Marfat.com

عدل راوی کے درجات:

۱۔ ثقہ، متقن، ثبت، حجت (قابل بھروسہ، روایت و درایت کا ماہر، بے حد قابل اعتماد، سراپا دلیل و حجت)

۲۔ صدوق، محلہ الصدق، لاباس بہ (بہت سچا، صدق گوئی کے مقام پر فائز، اس میں کوئی حرج نہیں)

۳۔ شیخ یہ عدالت کا تیسرا درجہ ہے جو دوسرے سے کمتر ہے، جس راوی کا ذکر رجال کی کتابوں میں ''شیخ'' کے لقب سے کیا گیا ہے تو دوسرے راوی کی روایت کردہ حدیثوں کی طرح اس کی روایات لکھی جائیں گی اور ان کی صحت جانچنے کے لیے ان پر بھی غور کیا جائے گا۔

۴۔ صالح الحدیث، اس کے معنی ہیں: روایت حدیث کے لیے مناسب اور ٹھیک ہے، اگر علم رجال کا ماہر کسی راوی حدیث کے بارے میں کہے: ''صالح الحدیث'' تو ایسے شخص کی حدیث اعتبار کی غرض سے لکھی جائے گی، جس کا مطلب ہے کہ تتبع کر کے دیکھا جائے گا کہ یہ اپنی روایت میں اکیلا اور منفرد ہے۔ یا اس میں اس کا کوئی شریک بھی ہے؛ پہلی صورت میں رد کر دی جائے گی اور دوسری صورت میں قبول کر لی جائے گی۔

یہ عدالت کا چوتھا اور سب سے پست درجہ ہے۔

یاد رہے کہ نقاد حدیث راویوں کی تعدیل کے لیے جو الفاظ استعمال کرتے رہے ہیں وہ مختلف رہے ہیں، لیکن اپنے مفہوم اور معنی میں ایک دوسرے کے مترادف ہیں۔

ضعیف اور غیر ثقہ کے درجات:

۱۔ لین الحدیث، فیه مقال، متكلم فيه، فيه ضعف، يُعرف وينكر، ليس بالمرضى.

(روایت حدیث میں کمزور اور نرم خو، اس کی ثقاہت موضوع بحث ہے۔ ہدف تنقید رہا ہے۔ اس میں ضعف اور کمزوری ہے۔ معروف اور منکر روایتیں بیان کرتا رہا ہے۔ پسندیدہ نہیں ہے)۔

نقاد حدیث نے جس راوی کے بارے میں مذکورہ بالا الفاظ یا ان سے ملتے جلتے الفاظ استعمال کیے ہیں وہ ان کے نزدیک معمولی درجہ کا مجروح یا غیر ثقہ راوی ہے اس طرح کے راوی کی مرویات بالکل تو رد نہیں کی جائیں گی، بلکہ ''اعتبار'' کی کسوٹی پر رکھ کر ان کو پرکھا اور جانچا جائے گا''

۲۔ ضعيف الحديث، لا يُحتج به، له مناكير، مجهول، مضطرب الحديث. (روایت حدیث میں ضعیف اور کمزور ہے۔ دلیل و حجت بنائے جانے کے قابل نہیں، اس کی مرویات میں منکر روایتیں ہیں، غیر معروف ہے، روایت حدیث میں عدم استحکام اور تضاد بیانی سے موصوف ہے)

مذکورہ اوصاف کے حامل راوی پہلے گروہ سے زیادہ نا قابل اعتبار ہیں، ان کی روایت کردہ حدیثوں سے استدلال تو نہیں کیا جائے گا، البتہ اعتبار کی غرض سے ان کو لکھا جائے گا۔ ان غیر ثقہ راویوں کے علاوہ نا قابل اعتبار راویوں کی چار

Marfat.com

قسمیں اور ہیں جن کی مرویات نا قابل قبول، اور نا قابل استدلال ہیں اور اعتبار کی غرض سے بھی ان کو ضبط تحریر میں لانا جائز نہیں ہے۔ علمائے رجال نے ان راویوں کے حق میں بجا طور پر جو الفاظ استعمال کیے ہیں وہ بڑے دقیق ہیں جن کو اگر پھیلایا جائے تو ایک دفتر تیار ہو سکتا ہے۔

۱۔ متروك الحديث، ذاهب الحديث، لايكتب حديثه، لا تحل الرواية عنه، ضعيف جداً. (اس سے حدیث کی روایت ترک کر دی گئی ہے، روایت حدیث کے بالکل نا قابل، اس کی روایت کردہ حدیث لکھی نہ جائے، اس سے حدیث کی روایت جائز نہیں، وہ بے حد کمزور ہے وغیرہ۔

۲۔ "متهم بالكذب، متهم بالوضع، يسرق الحديث، ساقط، متروك، ليس بثقة" (کذب بیانی کا ملزم، حدیث گھڑنے کا ملزم، دوسروں کی مرویات اپنے نام سے روایت کرنے والا، گرا ہوا بے اعتبار، نظر انداز، ثقہ نہیں)

۳۔ كذاب، دجال، وضاع، يكذب يضع (انتہائی جھوٹا، فریبی، حدیث گھڑنے والا، کذب بیانی کا مرتکب، حدیث گھڑنے کا مرتکب، یا کذب بیانی کرتا ہے، حدیث گھڑتا ہے)۔

۴۔ اكذب الناس، إليه المنتهى في الكذب (سب سے بڑا جھوٹا، کذب بیانی اس پر ختم ہے)۔ [1]

علمائے رجال نے جرح و تعدیل کے لیے جو الفاظ استعمال کیے ہیں، وہ ان کی وقت نظر، راویوں کے حالات کے گہرے مطالعہ، حقیقت بیانی اور تجربات و مشاہدات کے ترجمان ہیں، فطری طور پر بعض نقاد حدیث راویوں کی جرح کے لیے نرم اور ہلکے الفاظ استعمال کرتے تھے، جیسے امام احمد اور امام بخاری تو ایسے محدثین کی معمولی جرح بھی قابل غور اور قابل اعتبار ہے، لیکن جو نقاد جرح میں سخت الفاظ استعمال کرنے میں شہرت رکھتے تھے، جیسے امام ابو حاتم، امام علی بن مدینی اور امام یحییٰ بن معین، تو اگر انہوں نے کسی راوی کی معمولی جرح کی ہو تو اس کی وجہ سے وہ ساقط الاعتبار نہ ہوگا الا یہ کہ اسی طرح کے یا اس سے ملتے جلتے الفاظ کسی ایسے محدث نے بھی استعمال کیے ہوں۔ جو جرح میں شدت پسندی سے دور تھا، البتہ جرح میں شدت پسندی سے کام لینے والے کسی محدث نے اگر کسی راوی کی توثیق کر دی ہو تو اس کی یہ تعدیل اور توثیق بڑی اہمیت رکھتی ہے۔

نقاد رجال مردم شماری کے اہل کار نہیں تھے:

حدیث کے راویوں کی تحقیق کرنے والے اور ان کے بارے میں ایسی معلومات جمع کرنے والے جن کی بنیاد پر ان کو روایت حدیث کا اہل اور نا اہل قرار دیا جانے والا تھا کسی حکومت کے محکمہ اعداد و شمار یا مردم شماری کے اہل کار نہیں تھے جن کو لوگوں کی تعداد شمار کرنی ہو، بلکہ یہ ایسے خوش بخت انسان تھے جو پوری انسانی تاریخ میں ایک ایسا عظیم اور مقدس کام کرنے نکلے تھے جو ان سے پہلے کسی نے نہیں انجام دیا تھا، یعنی اولاد آدم کے سردار، سیّد البشر، افضل الرسل اور خاتم

[1] دیکھئے: مقدمہ ابن صلاح ص: ۸۱-۸۳، الجرح والتعدیل ص: ۵۴-۵۵، ۵۶-۵۷ ج: ۱، دراسات فی الجرح والتعدیل ص: ۲۲۶، ۲۳۰ میزان الاعتدال، مقدمہ ص: ۱۱۴۔

Marfat.com

الانبیاء والمرسلین محمد بن عبداللہ ﷺ کی حدیث اور سنت کی روایت کرنے والوں کے حالات جمع کرنے اور اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل کرنے کے لیے:

﴿يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓا۟ إِن جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَإٍ فَتَبَيَّنُوٓا۟ أَن تُصِيبُوا۟ قَوْمًۢا بِجَهَـٰلَةٍ فَتُصْبِحُوا۟ عَلَىٰ مَا فَعَلْتُمْ نَـٰدِمِينَ﴾ (الحجرات: ٦)

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اگر تمہارے پاس کوئی فاسق کوئی خبر لائے تو خوب اچھی طرح تحقیق کر لو ایسا نہ ہو کہ تم کسی قوم کو لاعلمی کی وجہ سے نقصان پہنچا دو پھر اپنے کیے پر پشیمان ہو۔''

رسول اللہ ﷺ کے ارشادات اور آپ کی سیرت پاک ماخذ شریعت ہے۔ اس تناظر میں اسماء الرجال کی تحقیق کرنے والے اپنے وقت کا عظیم ترین اور مقدس ترین کام انجام دے رہے تھے، کیونکہ وہ ایسے لوگوں کے حالات اور ایسے لوگوں کی ثقاہت وعدم ثقاہت کے بارے میں صحیح ترین معلومات جمع کر رہے تھے اور ان کو ضبط تحریر میں لا رہے تھے جو رسول اللہ ﷺ کے اقوال وافعال کی روایت کرتے تھے، بیان کرتے تھے اور تبلیغ کر رہے تھے اور اس عظیم فریضے کی مکمل اہلیت واستعداد کے ساتھ اس کا عشق رکھتے تھے، اور اس کو بحسن وخوبی انجام دینے کا ایک ''دھن'' ان پر سوار تھا، اس راہ میں وہ جو لذت پاتے تھے اس کو محسوس تو کیا جا سکتا ہے بیان نہیں کیا جا سکتا۔

نقاد رجال اپنے علم وفضل، صلاح وتقویٰ، امانت داری اور خدا ترسی اور اخلاص وللہیت میں اپنی مثال آپ تھے، میں نے ان میں سے جن ناموں کی فہرست دی ہے فضائل ومناقب اور سیر وتراجم کی کتابوں میں ان کا سرسری مطالعہ کر کے دیکھیے تو آپ کو ایسا لگے گا کہ فرشتے آسمانوں میں نہیں زمین پر بستے ہیں، عقیدہ وعمل میں نبی ﷺ اور آپ کے صحابہ کے طریقہ پر چلنے والے یہ عظیم انسان آسمان صلاح وتقویٰ اور صدق گوئی اور امانت داری کے سورج، چاند اور ستارے تو تھے ہی اپنی ذہانت، ثقاہت، ایثار وقربانی اور محنت وجاں فشانی میں بھی اپنی کوئی مثال نہیں رکھتے تھے، انہوں نے راویان حدیث کے حالات معلوم کرنے اور ان کے کوائف جمع کرنے کے لیے ان قصبوں اور شہروں کا سفر کیا جہاں وہ مقیم تھے، ہر ایک سے ملے، اس کی مرویات کی سند پر اس سے بحث کی، اس کے دوسرے متعلقین سے اس کے شب وروز اور اخلاق ومعاملات کی تفصیلات معلوم کیں، خود ایسے لوگوں کے ساتھ نشست وبرخاست کر کے ان کے عقائد، اور مسلکی رجحانات سے واقفیت حاصل کی، واضح رہے کہ راویان حدیث چاہے وہ صحیح حدیث کے راوی ہوں یا ضعیف ومنکر اور موضوع کے عام افراد نہیں تھے؛ اگر وہ اہل سنت وجماعت سے تعلق رکھنے والے تھے تو اور اگر نئے عقائد، نظریات رکھنے والے تھے، یا معتزلہ، متکلمین یا صوفیہ میں شمار ہوتے تھے تو معروف ومشہور تھے۔

اصلاحی صاحب نے یہ فرما کر کہ: ''یہ جاننا کہ کیا باتیں جرح کے حکم میں داخل ہیں اور کیا باتیں تعدیل کے مقتضیات میں سے ہیں ہر شخص کا کام نہیں ہے، کردار کی اساسات کیا ہیں، بدکرداری کی بنیادیں کیا ہیں یہ چیزیں اتنی

Marfat.com

آسان نہیں کہ ہر خاص و عام کا کما حقہ ادراک کر سکے۔'' ❶ دراصل اپنے چہرے سے نقاب الٹا ہے۔

محدثین عام آدمی نہیں تھے:

نہ محدثین کا شمار عوام میں ہوتا ہے اور نہ راویان حدیث کا قطع نظر اس کے کہ یہ راوی سچے مسلمان تھے یا ان کا تعلق معتزلہ، متکلمین اور صوفیا سے یا کسی اور فرقے سے تھا۔ پھر جن کا خاص میدان ہی جرح و تعدیل رہا ہو، اگر ان کو یہ نہیں معلوم تھا کہ ''کیا باتیں جرح کے حکم میں داخل ہیں اور کیا باتیں تعدیل کے مقتضیات میں سے ہیں'' تو پھر کس کو معلوم ہوگا؟ ابوریہ، امین اصلاحی، برنی اور غامدی کو؟

میں نے اوپر عرض کیا ہے کہ اصلاحی صاحب نے یہ فرما کر دراصل اپنے چہرے سے نقاب الٹا ہے۔ ورنہ ایک عام صحیح العقیدۃ مسلمان کو بھی یہ بات تفصیل سے نہ سہی اجمالی طور پر معلوم ہے کہ کردار کی اساسات کیا ہیں اور بدکرداری کی بنیادیں کیا ہیں؟

میں نے اوپر جرح و تعدیل کے مسئلہ میں مختصراً جو کچھ عرض کیا ہے وہ علوم الحدیث کی متعدد کتابوں کا نچوڑ ہے، میں اس علم کا ادنی سا طالب ہوں، کیا کوئی شخص ہوش و حواس میں رہ کر یہ کہہ سکتا ہے کہ شعبی، ابن سیرین، شعبہ، بخاری، ابن معین اور ابن مدینی وغیرہ کو یہ نہیں معلوم تھا کہ کیا باتیں جرح کے حکم میں داخل ہیں اور کیا باتیں تعدیل کے مقتضیات میں سے ہیں'' اور ان کو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ حسن کردار اور بدکرداری کیا ہے؟

اصلاحی صاحب نے اگر علوم الحدیث کی کوئی جامع اور مستند کتاب نہیں پڑھی تو صرف ''رجال'' کی کوئی کتاب پڑھ لیتے، دراصل انہوں نے پہلے ہی سے یہ طے کر رکھا تھا کہ ان کو حدیث کو نا قابل اعتبار ٹھہرانا ہے، محدثین کو نا قابل اعتماد قرار دینا ہے اور علم الاسانید اور اسماء الرجال کی قدر و قیمت گھٹانی ہے، ایسی صورت میں ان کے قلم سے جو غیر ذمہ دارانہ اور مضحکہ خیز باتیں نکلی ہیں خلاف توقع نہیں ہیں۔

جمہور علمائے رجال تعصب سے پاک تھے:

مولانا امین احسن اصلاحی کا دعویٰ ہے:

''وہ بہر حال آدمی ہی تھے رواۃ حدیث کے متعلق ان کی فراہم کردہ معلومات اور ان پر مبنی آراء عام انسانی جبلت میں موجود تعصب کے شائبہ سے پاک نہیں ہوسکتیں جو حق یا مخالف دونوں صورتوں میں پایا جاتا ہے۔'' ❷

اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں جن صالح انسانوں کے اوصاف بیان کیے ہیں، کیا وہ آدمی ہی تھے یا کوئی اور مخلوق؟ اگر آدمی تھے اور تعصب جبلی سے پاک نہیں تھے تو پھر صالح، اللہ کے مقرب و محبوب بندے اور راہ حق پر گامزن کس طرح تھے؟

اگر عام اور جمہور محدثین کے اندر تعصب کا کوئی شائبہ فطری طور پر رہا بھی ہوگا تو یہ کسی بھی راوی حدیث کی بیجا

---

❶ ص: ۹۴ ❷ ص: ۹۴

Marfat.com

تعدیل اور ناحق جرح پر آمادہ نہیں کر سکتا تھا اگر ایسا ہوا ہوتا تو پھر راویان حدیث کی جرح وتعدیل کا سارا ریکارڈ نا قابل اعتماد ہو جاتا، صرف یہی نہیں، بلکہ فقہی کتابوں میں امام ابو حنیفہ اور دوسرے ائمہ سے منسوب اقوال کا بھی کوئی اعتبار نہیں رہ جاتا، خاص طور پر امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے جو اقوال فقہائے احناف کی کتابوں میں ملتے ہیں وہ سب قابل رد ہو جاتے، کیونکہ امام موصوف کے تمام اقوال بذریعہ روایت منقول ہوئے ہیں اور ان کے راوی عدالت کے اس مقام پر بھی نہیں تھے جس مقام پر صحیح حدیثوں کے راوی تھے اور ان کی طرف کوئی جھوٹی بات منسوب کرنے والا اتنا بڑا مجرم نہیں ہے، جتنا بڑا مجرم نبی ﷺ کی طرف کوئی قول منسوب کرنے والا ہے۔

جس جرح وتعدیل سے راویان حدیث گزرے ہیں اس سے ان کی جرح وتعدیل کرنے والے بھی گزرے ہیں، اور محدثین نے جس طرح جرح وتعدیل کے اسباب اور اوصاف دونوں بیان کر دیے ہیں انہوں نے جرح وتعدیل کرنے والوں کے لیے بھی چند نہایت سخت شرطیں متعین کر دی ہیں اور ان کو بے لگام نہیں چھوڑ دیا ہے، وہ شرطیں درج ذیل ہیں:

۱۔ جرح کرنے والا بیدار مغز ہو اور اس کو راوی کے حالات کا استحضار ہو۔

۲۔ راوی کے بارے میں اہل علم کے اقوال اس کے علم میں ہوں۔

۳۔ راوی کے بارے میں اپنی رائے ضبط تحریر میں لے آئے تاکہ بعد میں تضاد بیانی سے محفوظ رہے۔

۴۔ ناقد جرح وتعدیل کے اسباب کا علم رکھتا ہو۔

۵۔ کلام عرب کی تعبیرات پر اس کی نظر ہو اور راوی کے حق میں دوسرے ناقدین کے اقوال نہ بدلے تاکہ اس کا حکم پہلے ناقد کے قول کے خلاف نہ ہو۔

۶۔ جرح وتعدیل کرنے والا مذہبی متعصب نہ ہو۔

۷۔ راوی سے ذاتی دشمنی ناقد کو اس کے حق میں غلط بیانی پر آمادہ نہ کرے۔

۸۔ ناقد صبر وتحمل سے موصوف ہو اور اپنے حق میں دوسروں کی رائے سے غضبناک ہو کر ان پر ایسا الزام نہ لگائے جس کے وہ اہل نہ ہوں۔

۹۔ راوی سے قرابت داری ناقد کو اس کے حق میں صحیح بات کہنے سے باز نہ رکھے۔ [1]

غور فرمایئے محدثین نے جرح وتعدیل کرنے والوں کو بے لگام نہیں چھوڑ دیا ہے، بلکہ نہایت سخت شرائط اور قیود کا پابند بنا دیا ہے اور اسماء الرجال کی کتابوں کا سنجیدہ مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ اس مقدس علم سے تعلق رکھنے والوں نے ان شرائط وقیود کی مکمل رعایت کی ہے اور اگر کوئی کسی معمولی انحراف کا بھی مرتکب ہوا ہے تو اس کو کھول دیا گیا ہے اور بیان کر دیا گیا ہے۔

راویان حدیث کی جرح وتعدیل میں محدثین کی حق پسندی اور صدق گوئی کے واقعات تراجم وسیر کی کتابوں میں

---

[1] دراسات فی الجرح والتعدیل: ۵۴۔۵۵۔

Marfat.com

بکثرت بیان ہوئے ہیں مثال کے طور پر حسین بن ابی سری (حسین بن متوکل بن عبدالرحمٰن) جو تبع تابعین کے متوسط طبقہ کا راوی ہے اور ضعیف ہے۔ اس کے راوی محمد بن ابی سری ثقہ راوی ہیں وہ اپنے اس بھائی کے بارے میں لوگوں سے کہا کرتے تھے: میرے بھائی سے حدیث ضبط تحریر میں مت لاؤ، کیونکہ وہ بہت بڑا جھوٹا ہے اور ابو عروبہ حرانی اس کے بارے میں کہا کرتے تھے: وہ میری ماں کا ماموں ہے اور جھوٹا ہے'' ❶

علم الرجال کے مسلم امام اور عظیم المرتبت محدث علی بن مدینی (علی بن عبداللہ بن جعفر) یہ تصریح کیا کرتے تھے کہ: میرا باپ ضعیف ہے'' ❷

یہ صحیح ہے کہ ہم عصر علماء کی ایک دوسرے کی جرح کے واقعات بھی کتابوں میں مدون ہیں، جو اگرچہ بہت کم ہیں، پھر بھی محدثین نے اس طرح کی جرح کو قبول نہیں کیا ہے اور ایسے لوگوں کی صرف وہ جرح قبول کی ہے جس کا سبب بیان کر دیا گیا ہو۔

امام ذہبی فرماتے ہیں:

''ہم پلہ اور ہم عصر لوگوں کی ایک دوسرے کی عیب جوئی اور تنقید نا قابل التفات ہے، خاص طور پر جب یہ ظاہر ہو رہا ہو کہ یہ تنقید یا تنقیص کسی دشمنی کی پیداوار ہے، یا مسلک کے تعصب میں ہے یا اس کا محرک حسد ہے تو ایسی تنقیص اور جرح سے وہی محفوظ رہ سکتا ہے جس کو اللہ بچائے اور محفوظ رکھے، اور میرے علم میں کوئی ایسا زمانہ نہیں گزرا ہے کہ جس میں انبیاء اور راست بازوں کے سوا کوئی اور کلی طور پر اس سے محفوظ رہا ہو، تمہاری خواہش پر میں ایسے واقعات بکثرت بیان کر سکتا ہوں: ((اللّٰھم لا تجعل فی قلوبنا غلا للذین أمنوا ربنا إنك رؤوف رحیم .)) '' ❸

مذکورہ بالا شاذ اور نا پسندیدہ طرز عمل کے برعکس تراجم وسیر کی کتابوں میں اکثریت ان محدثین کی ہے جنہوں نے اپنے ہم عصر محدثین کے حق میں ہمیشہ درست رائے دی ہے اور جن راویان حدیث کی جرح یا تعدیل کی ہے ذاتی پسند اور نا پسند، مسلکی انتساب، حسد یا کسی اور مذموم جذبے سے بہت بلند ہو کر کی ہے اور ہر شخصیت کی، جیسی وہ تھی تصویر پیش کی ہے اور اس کے بارے میں متقدمین اور ہم عصر ناقدین کے جو اقوال نقل کیے ہیں وہ پوری امانت داری اور دیانت داری کے ساتھ نقل کیے ہیں، یہی وجہ ہے کہ راویان حدیث کے تراجم وسیر کی کتابیں کسی انسان کے بارے میں منصفانہ آراء اور صحیح معلومات کا ایسا قابل اعتماد ذریعہ ہیں جس پر مسلمان بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں، اور غیر مسلم مصنفین میں ایسے انصاف پسند گزرے ہیں جنہوں نے یہ اعتراف کیا ہے کہ محدثین کا ایجاد کردہ علم الاسناد اخبار و روایات کی تصحیح کا صحیح ترین طریقہ ہے۔'' ❹

---

❶ میزان الاعتدال ص: ۷۹۰، ج: ۷.

❷ میزان الاعتدال ص: ۷۴، ج: ۴، ترجمہ: ۴۲۵۲.

❸ دراسات فی الجرح والتعدیل ص: ۸۴.

❹ السنۃ ومکانتہا فی التشریع الاسلامی ص: ۱۴۷.

Marfat.com

ان تفصیلات کے بعد یہ کہنا انکار حق اور ہٹ دھرمی ہے کہ ''رواۃ حدیث کے متعلق ان کی فراہم کردہ معلومات اور ان پر مبنی آراء عام انسانی جبلت میں موجود تعصب کے شائبہ سے پاک نہیں ہو سکتیں جو حق یا مخالف دونوں صورتوں میں پایا جاتا ہے۔''

اگر مولانا کی یہ بات درست ہے اور یہ محدثین اور نقاد رجال جبلی تعصبات میں مبتلا تھے اور انہوں نے ہزاروں انسان کے بارے میں ہزاروں صفحات پر پھیلی جو معلومات دی ہیں وہ اتنی ہی بے قیمت اور نا قابل اعتماد ہیں تو پھر مولانا کا ''نسب نامہ'' بھی صحیح نہیں ہے۔

علامہ کشمیری کی رائے:

علامہ انور شاہ کشمیری برصغیر کے حنفی علمائے حدیث میں بہت بڑا نام ہیں، نبی ﷺ کی حیات پاک میں اور عصر صحابہ میں حدیث کی عدم تدوین کی انہوں نے جو توجیہ کی ہے اس سے حدیث کی شرعی حیثیت کے بارے میں احناف کے نظریہ کا اظہار ہوتا ہے۔ ان کی اس توجیہ پر مفصل اور مدلل تبصرہ کر چکا ہوں موصوف راویان حدیث کی جرح وتعدیل کے بارے میں جو نقطہ نظر رکھتے تھے اس کا ذکر فیض الباری کے مقدمہ میں مختصراً آیا ہے۔ فیض الباری کے جامع اور حاشیہ نگار مولانا بدر عالم مرٹھی فرماتے ہیں:

> ''علامہ کشمیری جرح وتعدیل کے مسئلہ میں طول کلامی نہیں کرتے تھے اور فرمایا کرتے تھے: ''اگر میں راویوں کے بارے میں نقاد رجال کے اقوال کو بکثرت نقل کروں اور اس میں جو قیل وقال کیا گیا ہے اس کا ذکر کروں (تو کر سکتا ہوں لیکن نہیں کرتا) اس لیے کہ میرے نزدیک یہ ان کی اعتدال پسندی کے وزن کو معلوم کرنے کی کوئی بڑی میزان نہیں ہے، ان میں سے بعض تو اتفاق کے موقع پر خاموش رہتے ہیں اور اختلاف کے موقع پر جرح کرتے ہیں اور یہ ایسا عمل ہے جو نہ تو شافی ہے اور نہ کافی، بلکہ یہ تو محض کٹ حجتی ہے۔'' ❶

میں نے علامہ کی عبارت کے ترجمہ میں ''بریکٹ'' کے اندر جو عبارت لکھ دی ہے اس کی ضرورت اس لیے پڑی کہ انہوں نے اپنی بات کا آغاز ''لو'' سے کیا ہے اور بات ختم کر دی، مگر لو کا جواب نہیں لائے۔

اس مختصر سی عبارت میں علامہ کشمیری نے رواۃ حدیث کی جرح وتعدیل کے بارے میں اپنا نقطہ نظر بیان کر دیا ہے جس کو اگر توضیحی زبان میں بیان کیا جائے تو یوں کہہ سکتے ہیں:

۱۔ وہ راویان حدیث کی جرح وتعدیل سے متعلق ائمہ رجال کے احکام کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے اس لیے کہ اس میں اعتدال پسندی نہیں ہے۔

۲۔ ائمہ رجال جس راوی کے مسلک ونظریہ سے متفق ہوتے اس کی جرح نہیں کرتے تھے اور جس کے خلاف ہوتے

❶ ص: ۲۰-۲۱

Marfat.com

اس کی جرح کرتے تھے۔

۳۔ راویوں کی جرح و تعدیل میں ائمہ رجال کے اقوال محض کٹ حجتی سے عبارت ہیں وہ راوی کی ثقاہت و عدم ثقاہت بیان کرنے کے لیے نہ اطمینان بخش ہیں اور نہ کافی۔

۴۔ مذکورہ بالا عبارت کے بعد فرمایا ہے: ہاں میں نے علمائے رجال کی جانب سے راویوں کی تحدید اور ان کی ذات کی معرفت کو درخور اعتنا سمجھا ہے تو صاحب نظر بار بار نظر ڈال کر اور مطالعہ کر کے اپنی رائے قائم کر سکتا ہے، جلد بازی سے نہیں۔

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ علامہ کشمیری کے نزدیک راویوں کی جرح و تعدیل کے مسئلہ میں ائمہ نقد کے اقوال محض قیل و قال اور کٹ حجتی سے عبارت ہیں اور ان میں اعتدال پسندی اور میانہ روی کا فقدان ہے۔ ان کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ یہ علمائے رجال اپنے ہم مسلک اور ہم خیال لوگوں کی جرح سے تو خاموش رہتے اور جو ان کے مسلک اور نظریہ کا مخالف ہوتا تو اس کی جرح کرتے۔ اس دعویٰ کا مطلب ایک جملہ میں یہ ہوا کہ علمائے رجال ''نا قابل اعتماد لوگ'' تھے۔

علامہ کشمیری سے سوال:

آپ نے فرمایا ہے کہ بعض علمائے رجال اتفاق کے موقع پر خاموش رہتے اور اختلاف کی صورت میں جرح کرتے، آپ سے مؤدبانہ سوال ہے کہ یہ بتا دیں کہ:

۱۔ ایسے لوگوں کا جمہور نقاد میں تناسب کیا تھا؛ ایک فیصد، دو فیصد، دس ۱۰ فیصد اگر ان کی تعداد دس ۱۰ فیصد بھی مان لیں جو اگرچہ مبالغہ آمیز ہے تو نوے ۹۰ فیصد غیر جانبدار اور انصاف پسند نکلتے ہیں'' کیا جرح و تعدیل کے مسئلہ میں اتنی بڑی تعداد کے احکام نا قابل اعتبار ہیں؟

۲۔ آپ کو امام ذہبی کا یہ قول معلوم رہا ہوگا کہ کسی ایک طبقہ میں ایسا نہیں ہوا ہے کہ دو علمائے رجال کسی ایک ضعیف راوی کو ثقہ قرار دینے اور کسی ثقہ راوی کو ضعیف قرار دینے پر متفق ہوئے ہوں۔ [1]

امام ذہبی کی حق پسندی، امانت داری اور مسلک و نظریہ سے بلند ہو کر بات کرنے پر اکثر اہل علم کا اتفاق ہے اس کا مطلب یا تو یہ ہے کہ ائمہ رجال نے اپنے طبقہ کے راویوں کی ثقاہت و عدم ثقاہت کے بارے میں جو احکام جاری کیے ہیں وہ بڑے تجربات، مشاہدات اور مطالعہ کے بعد جاری کیے ہیں اور ذاتی پسند نا پسند سے بہت بلند ہو کر حقائق کی روشنی میں جاری کیے ہیں اسی وجہ سے ان کی جرح و تعدیل میں یہ ہم آہنگی اور اتفاق رائے پایا گیا، یا ایک طبقہ کے تمام ائمہ رجال نے کسی ایک جگہ بیٹھ کر اور گٹھ جوڑ کر کے اس طبقہ کے راویوں کو عدل اور مجروح، یا ثقہ اور ضعیف کے عنوانوں کے تحت جمع کر دیا ایسا کرنا چونکہ اس دور میں ممکن نہیں تھا، کیونکہ کسی ایک طبقہ کے راوی، طبقہ کی مدت کے پیش نظر کوئی ۸۵

[1] الإعلان بالتوبیخ ص: ۱۶۷۔۱۶۸، بحوالہ درسات فی الجرح والتعدیل، ص: ۷۲۔

Marfat.com

برسوں میں پھیلے ہوتے تھے، لہٰذا پہلی ہی بات درست ہے کہ راویوں کی جرح وتعدیل، تجربات، مشاہدات، بار بار ملاقاتوں، اور راوی کے متعلقین، اساتذہ اور شاگردوں کی آراء پر مبنی ہوتی تھی، اور حدیثوں کے درس ومطالعہ کی طرح راویوں کے حالات بھی ہمیشہ زیر بحث رہتے تھے، ائمہ رجال اپنے وقت کے سب سے صالح، خدا ترس، امانت دار اور غیر معمولی حافظہ کے مالک لوگ تھے ان کی اکثریت سے یہی متوقع ہے کہ انہوں نے راویان حدیث کی جرح وتعدیل کے مسئلہ میں امانت داری کے ساتھ حق گوئی اور صدق گوئی سے کام لیا ہو، اگر چند لوگ تعصب مذہبی میں مبتلا تھے یا ان پر معاصرت کا جذبہ غالب تھا یا ذاتی پسند و ناپسند سے مغلوب تھے تو اس کی کثرت کے مقابلے میں ان کی شاذ آراء نا قابل اعتبار تھیں۔

میں بار بار یہ دعویٰ کرتا آرہا ہوں کہ حدیث یا سنت قرآن کی طرح اور اس کے بالکل مساوی ماخذ شریعت ہے اور اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہے، محدثین کے دعویٰ سے نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ ہی نے اپنی اطاعت کی طرح اپنے رسول کی اطاعت بھی فرض کی ہے اور تمام مسلمانوں کے لیے بلا استثنا آپ کو متبوع قرار دیا ہے، اگر میرا یہ دعویٰ خلاف حق ہے تو قرآن سے اس کو ثابت کیا جائے اور یہ بات محتاج بیان نہیں ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی اطاعت اور اتباع آپ کے اوامر اور نواہی کی تعمیل کا نام ہے اور آپ کے اوامر نواہی کو معلوم کرنے کا ذریعہ صرف اور صرف حدیث یا سنت ہے، جبکہ قرآن کے احکام ونواہی کی تعمیل اللہ کی اطاعت ہے رسول کی نہیں، اس مسلمہ حقیقت کی روشنی میں محدثین اس مقدس جماعت کا نام ہے جس کا اس دنیا میں اول وآخر نصب العین حدیث کی حفاظت اور اس کو بیرونی آمیزشوں سے پاک کرنا تھا اور راویان حدیث کی جرح وتعدیل اور ان کی ثقاہت وعدم ثقاہت حفاظت حدیث ہی کا ایک حصہ تھی، ایسی صورت میں اگر وہ بقول امین اصلاحی راویوں کی جرح وتعدیل میں ''جبلی تعصب'' سے پاک نہیں تھے اور بقول آپ کے راویوں کی جرح وتعدیل کے مسئلہ میں نقاد حدیث کے اقوال محض قیل وقال اور کٹ حجتی اور بحث وجدال سے عبارت تھے تو یہ محدثین حدیث رسول کے محافظ، حامی اور خادم نہیں، بلکہ نعوذ باللہ دشمن اور معادی تھے، اس طرح وہ دین کے بھی دشمن تھے، اور وہ اس طرح کہ اگر وہ ایک ثقہ راوی کو تعصب سے مغلوب ہو کر، یا مسلک اور نظریہ میں اپنا مخالف پا کر ضعیف قرار دے دیتے تھے تو دوسرے لفظوں میں وہ ایک صحیح حدیث کے انکار کی فضا تیار کر رہے تھے تا کہ اس کو قبول کرنے اور مشعل راہ بنانے سے احتراز کیا جائے اس لیے کہ صحیح حدیث وہی ہے جس کی روایت ثقہ راوی نے کی ہو۔

اس کے برعکس اگر علمائے رجال کسی ضعیف راوی کو ثقہ قرار دینے میں اس کے اپنا ہم مسلک اور ہم نظریہ ہونے کو دیکھتے تھے تو اس صورت میں وہ خود اپنے نزدیک ایک ضعیف اور نا قابل اعتبار روایت کو ماخذ شریعت قرار دینے کی مہم انجام دے رہے تھے؟!!

۳۔ آپ کا ارشاد ہے کہ راویوں کی جرح وتعدیل کے مسئلہ میں آپ علمائے رجال کی باتوں کا ذکر زیادہ نہیں کرتے تھے، اس لیے کہ وہ قیل وقال اور کٹ حجتی کے قبیل سے ہیں، سوال یہ ہے کہ راویوں کو ثقہ یا ضعیف قرار دینے کے

Marfat.com

لیے کتب رجال کے علاوہ آپ کے پاس کون سے دوسرے ذرائع تھے، کشف وکرامت یا خواب؟ یا......؟

۴۔ اہل تصوف میں شمار ہونے کی وجہ سے آپ صوفیا کی ان کتابوں کو تو ضرور مانتے رہے ہوں گے جن میں من گھڑت صلحاء اور اولیاء اللہ کی سیرتیں، مناقب اور کشف وکرامت کے واقعات بیان ہوتے ہیں، یہ کتابیں تو جھوٹ کا ''پلندا'' ہیں، ایک محدث ہونے کے ناطے ان کتابوں اور ان میں درج مضامین کی صحت جانچنے کا آپ کے پاس کونسا دوسرا ذریعہ تھا؟

۵۔ کتب رجال میں تو راویوں کی جرح وتعدیل محض قیل وقال اور کٹ حجتی ہے تو آپ نے اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا کی وہ حدیث کسی طرح صحیح مان لی جو سنداً اور متناً باطل ہے، اور شیعوں کی گھڑی ہوئی ہے، فیض الباری میں آپ نے اس جھوٹی روایت کو صحیح ثابت کرنے کے لیے بڑا زور لگایا ہے، جبکہ آپ کے پاس اس کی صحت کی صرف ایک دلیل ہے اور وہ یہ کہ امام طحاوی رحمہ اللہ نے اس کو ''مشکل الآثار'' میں نقل کیا ہے اور اس کو صحیح قرار دیا ہے، ظاہر سی بات ہے کہ انہوں نے پہلے سند کے راویوں کو ثقہ مانا ہوگا، پھر اس کو صحیح قرار دیا ہوگا، جبکہ امر واقعہ یہ ہے کہ امام طحاوی نے بصراحت اس کی تصحیح نہیں کی ہے، بلکہ انہوں نے اس کی سند کے صرف ایک راوی محمد بن موسیٰ مدنی کے بارے میں فرمایا ہے کہ وہ ''محمود'' ہے، علمائے جرح وتعدیل کی کتابوں میں کسی راوی کی تعدیل کے لیے ''محمود'' کی تعبیر نہیں اختیار کی گئی ہے۔ لہٰذا وہ مقبول یا مامون کے معنی میں ہوگا جو تعدیل کا سب سے کمتر درجہ ہے۔ رہے اس سند کے دوسرے راوی، عون بن محمد بن ابی طالب اور ان کی والدہ: ام جعفر بنت محمد بن جعفر بن ابی طالب تو امام طحاوی نے ان کی جرح التعدیل سے سکوت فرمایا ہے، یعنی یہ دونوں ان کے نزدیک مجہول تھے۔

مذکورہ جھوٹی روایت کی یہ سب سے عمدہ سند ہے:

رہا اس روایت کا متن تو یہ باطل ہے اور اسلامی احکام سے معمولی واقفیت رکھنے والا بھی یہ جانتا ہے کہ کسی نماز کا وقت نکل جانے پر وہ قضا ہو جاتی ہے ادا نہیں ہوتی اور اللہ تعالیٰ نے محض علی رضی اللہ عنہ کی کرامت دکھانے کے لیے ڈوبے ہوئے سورج کو دوبارہ طلوع کر دیا تا کہ وہ عصر کی نماز اس کے وقت میں ادا کر سکیں، جبکہ غزوہ خندق میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی اور ان صحابہ کی نماز عصر کو اس کے وقت میں ادا کرانے کے لیے ڈوبے ہوئے سورج کو دوبارہ طلوع نہیں کیا جن میں علی رضی اللہ عنہ بھی تھے۔

اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا کا روایت کردہ یہ واقعہ غزوہ خیبر سے واپسی کے موقع پر مدینہ اور خیبر کے درمیان واقع ''صہباء'' کے مقام پر پیش آیا تھا، اور اسی سفر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب نے ایک جگہ رات میں ''پڑاؤ'' ڈالا اور سو گئے اور سوتے رہے یہاں تک سورج طلوع ہو گیا اور نماز فجر ''قضاء'' ہو گئی، اور آپ نے اپنے اصحاب کو فجر کی نماز باجماعت قضا ہی پڑھائی، اصحاب میں علی رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ [2]

[1] ص ۳۰۷ [2] مسلم: ۱۵۸۰، ابوداود: ۴۳۵، نسائی: ۶۱۸.

Marfat.com

اس روایت کے باطل ہونے کی ایک اور نا قابل تردید دلیل یہ ہے کہ نبی ﷺ کے ہمراہ ۱۴۰۰ صحابیوں کی جمعیت تھی، اور مذکورہ روایت کی رو سے یہ واقعہ ایک غیر آباد علاقہ صہباء میں پیش آیا، سورج غروب ہو گیا اور تاریکی ہو گئی، پھر طلوع ہوا اور روشنی ہو گئی علی رضی اللہ عنہ اٹھے، وضو کیا اور اعتدال کے ساتھ نماز عصر ادا کی، لیکن اتنے بڑے معجزہ کا مشاہدہ حضرت اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا کے سوا کسی نے نہیں کیا، کیونکہ اس معجزے کا ذکر کسی نے نہیں کیا ہے اور حدیث کی کسی بھی مستند کتاب میں منقول نہیں ہوا ہے، صرف امام طحاوی نے اس کو اپنی کتاب ''مشکل الآثار'' میں نقل کیا ہے اور اس کی سب سے عمدہ سند میں دو راوی ''مجہول'' ہیں۔

اس بات کو میں نے نا قابل تردید دلیل اس لیے کہا ہے کہ: ''معجزہ شق القمر'' صرف ایک لمحہ کے لیے ہوا تھا، یعنی قمری مہینے کی چودھویں رات تھی، چاند ابھی طلوع ہوا تھا کہ معجزے سے اس کے دو ٹکڑے ہو گئے اور اس کا ایک ٹکڑا سامنے کی پہاڑی پر اور دوسرا حصہ دوسری پہاڑی پر نظر آیا اور تھوڑی دیر کے بعد دونوں ٹکڑے آپس میں مل گئے، اور معجزے کے ظہور سے پہلے، اس کے اثنا اور اس کے بعد چاند کی روشنی جوں کو توں رہی، نبی ﷺ اس وقت ''منیٰ'' میں تھے اور آپ نے لوگوں سے فرمایا: دیکھو اور گواہ رہو'' یہ واقعہ حدیث کی مستند ترین کتابوں میں متعدد صحابہ کرام، علی، عبداللہ بن مسعود، عبداللہ بن عمر، حذیفہ، انس اور جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہم کی روایت سے منقول ہے۔ ❶

اس کے بالمقابل ''سورج کا ڈوب جانے کے بعد دوبارہ طلوع ہو جانا'' کہیں بڑا اور سنسنی پھیلا دینے والا واقعہ تھا، جزیرہ عرب کے پڑوسی ملکوں میں اور مسلمانوں اور غیر مسلموں دونوں کے لیے ایک نہایت ہی حیرتناک اور سنسنی خیز تھا، مگر اس کا ذکر ایک صحابی خاتون کے سوا کسی زبان سے نہیں سنا گیا اور جن کتابوں میں یہ منقول ہوا ہے ان سب کی اساس ''مشکل الآثار'' ہے جس کی سند کا ایک راوی ''محمود'' یعنی مقبول ہے اور دو ''مجہول''

اگر اس روایت کی تصحیح مولانا زکریا یا مولانا تھانوی جیسے صوفیا نے کی ہوتی تو ہم کہتے کہ ان کو تو ایسے من گھڑت ''خارق عادت'' واقعات کی تلاش رہتی تھی، لیکن جس شخص کا لقب محدث کبیر اور محدث عصر ہو اس کی زبان سے محض اس وجہ سے اس کی تائید کہ اس کو ایک حنفی عالم نے اپنی کتاب میں نقل کیا ہے، زیب نہیں دیتا، پھر اس کی زبان سے یہ دعویٰ کہ ائمہ رجال اپنے موافق کی جرح سے تو خاموش رہتے اور اپنے مخالف کی جرح کرتے تھے'' عجیب ہے۔

تا فہمی بھی علم:

اس کتاب کے متعدد صفحات ڈاکٹر افتخار برنی کے ذکر خیر سے مزین ہیں موصوف طبیب ہیں، مگر دینی امور سے بھی کافی دلچسپی رکھتے ہیں وہ حدیث یا علم حدیث کی کوئی ایک چھوٹی سی عبارت صحیح پڑھنے سے قاصر ہیں، مگر حوالے موطا، بخاری، مسلم اور الکفایہ کا دیتے ہیں، البتہ وہ منکرین کے افکار و آراء سے واقفیت رکھتے ہیں اور حدیث کی شرعی حیثیت پر

❶ بخاری: ۳۶۳۶۔۳۸۶۵، ۳۸۶۶، ۳۸۶۸، ۴۸۶۸، مسلم: ۲۸۰۰۔

Marfat.com

ان کے اعتراضات کو پڑھ کر ہضم کر چکے ہیں، انہوں نے اپنے قسط وار مضمون:

حدیث پاک کی حیثیت دو انتہاؤں کے درمیان'' میں اپنے نظریہ حدیث کو تفصیل سے بیان کیا ہے، سعودی عرب میں مقیم ہونے کی وجہ سے وہ حدیث سے اپنے بغض ونفرت کا برملا اظہار نہیں کرتے، مولانا اصلاحی کی کتاب ''مبادئ تدبر حدیث'' ان کی نظر میں ہے، بلکہ یہ اس مقالے میں ان کا ماخذ ہے، برنی صاحب نے بھی اپنے امام کے نقش قدم پر چلتے ہوئے حدیث کی سند میں جھول اور خلا دکھائے ہیں اور بعض جگہوں پر الفاظ بدل دیے ہیں تا کہ یہ تاثر دے سکیں کہ انہوں نے جو کچھ فرمایا ہے وہ ان کا اپنا حاصل مطالعہ ہے، انہوں نے سند کی کمزوری پر اپنے اس دعوی سے استدلال کیا ہے کہ:

''اسلامی تاریخ کے تین عظیم ترین محدثین، امام مالک، بخاری اور مسلم کئی معاملات میں ایک دوسرے سے مختلف آراء رکھتے ہیں، بطور خاص راویوں کی ثقاہت کے باب میں ان کے یہاں اختلاف پایا جاتا ہے۔ مثلاً امام بخاری حدیث کے راوی کے لیے یہ لازمی قرار دیتے ہیں کہ وہ اپنے شیخ کا معاصر ہو اور اس سے اس کا سماع بھی ثابت ہو، امام مسلم سماع کا ثبوت نہیں مانگتے وہ صرف معاصرت کو کافی سمجھتے ہیں۔'' (روشنی، ۲۹ مئی ۲۰۰۹ء)

میں ڈاکٹر برنی کی اس عبارت پر مفصل تبصرہ کرنے سے قبل دو باتیں عرض کر دینا چاہتا ہوں: (۱) وہ بخاری اور مسلم کا اختلاف سمجھے ہی نہیں۔ (۲) راوی اور مروی عنہ کے درمیان ملاقات کے مسئلہ میں شیخین کا اختلاف، اختلاف اضداد نہیں، خوب سے خوب تر کا اختلاف تھا۔

حدیث کے ثبوت کے مسئلہ میں بخاری اور مسلم کے اختلاف کی حقیقت:

ڈاکٹر افتخار برنی نے یہ دعویٰ تو بڑے طمطراق سے کر دیا کہ امام مالک، امام بخاری اور امام مسلم کئی معاملات میں ایک دوسرے سے مختلف آراء رکھتے ہیں، بطور خاص، راویوں کی ثقاہت کے باب میں ان کے یہاں اختلاف پایا جاتا ہے۔

یہاں تک تو دعویٰ ''مجمل'' بلکہ محض دعویٰ تھا، لہٰذا اجمالی طور پر تین جلیل القدر محدثین کے ایک مسئلہ میں مختلف الرائ'' ہونے کا دعویٰ کر کے قارئ کو یہ تاثر دینے کی سعی لا حاصل کی ہے کہ جب اتنے بڑے محدثین بھی راویوں کی ثقاہت جیسے اہم مسئلہ میں اتفاق نہیں رکھتے تھے، تو پھر فن روایت کی کسوٹی پر پرکھی ہوئی حدیث کی صحت قابل اعتماد کس طرح ہو سکتی ہے؟

دعویٰ تو یہ کیا تھا کہ تینوں اکابر محدثین کئی معاملات میں اختلاف رکھتے ہیں، اور جب تفصیل بیان کرنے پر آئے تو جہاں امام مالک کا نام اڑا دیا وہیں صرف ایک معاملہ میں اختلاف دکھانے کی کوشش کی، کئی معاملات میں نہیں، اور اس ایک معاملہ کے تعین میں بھی غلطی کا ارتکاب کر بیٹھے، اس سے موجودہ دور کے منکرین کے مبلغ علم، دیانت داری اور نصوص کے فہم کی صلاحیتوں کو سمجھا جا سکتا ہے۔

دراصل امام بخاری اور مسلم کے درمیان جس مسئلہ میں اختلاف منقول ہے وہ راویوں کی ثقاہت کا مسئلہ نہیں،

Marfat.com

حدیث ''معنعن'' کے ثبوت کا مسئلہ ہے اور یہ بھی خوب سے خوب تر کا اختلاف ہے، جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں، ''راویوں کی ثقاہت'' کے مسئلہ میں محدثین میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

حدیث صحیح کی تعریف:

جب ہم حدیث یا سنت کا لفظ بولتے ہیں تو حتمی اور یقینی طور پر ہم وہ حدیث یا سنت مراد لیتے ہیں جس کی نسبت رسول اللہ ﷺ سے صحیح اور ثابت ہے، اس کے ساتھ ''صحیح'' کا اضافہ تاکید مزید کے لیے کرتے ہیں اس سے یہ معلوم ہوا کہ جس حدیث یا سنت کی نسبت رسول کریم ﷺ سے صحیح اور ثابت نہ ہو، وہ سرے سے حدیث ہی نہیں، اور جمہور محدثین کے نزدیک صحیح حدیث کی تعریف ہے:

علوم الحدیث کے امام الائمہ حافظ ابو عمر و عثمان بن عبدالرحمٰن شہرزوری معروف با بن صالح فرماتے ہیں:

((أما الحديث الصحيح: فهو الحديث المُسنَد الذى يتصل إسناده بنقل العدل الصابط عن العدل الضابط إلى منتهاه ولا يكون شاذا ولا معللاً.))

''صحیح حدیث، سند کے ساتھ روایت کردہ وہ حدیث ہے جس کی سند کی تمام کڑیاں آپس میں جڑی ہوئی ہوں اور نیچے سے اوپر تک تمام راوی عدالت اور حفظ وضبط سے موصوف ہوں، اور اس کے راویوں، یا کسی راوی سے قوی تر اور ثقہ تر راوی کی روایت کردہ کوئی حدیث اس کے خلاف نہ ہو، اور وہ اپنے متن یا سند میں ایسے کسی مخفی عیب سے پاک ہو جس سے اس کی صحت متاثر ہوتی ہو۔'' [1]

حافظ ابن صلاح نے اس کے بعد لکھا ہے:

((فهذا هو الحديث الذى يُحكم له بالصحة بلا خلاف بين أهل الحديث: وقد يختلفون فى صحة بعض الآحاديث لاختلافهم فى وجوه هذه الأوصاف فيه.))

''یہ ہے وہ حدیث جس کو اہل حدیثوں کے کسی اختلاف کے بغیر صحیح کہا جاتا ہے اور علمائے حدیث، حدیث میں ان اوصاف کے وجود کے مسئلہ میں اپنے اختلاف کی وجہ سے بعض حدیثوں کی صحت میں مختلف الرای ہو سکتے ہیں۔''

حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں:

''صحیح کی اس تعریف کا یہ حاصل ہے کہ صحیح حدیث وہ ہے جس کی سند کی کڑیاں متصل ہوں اور اس کو نقل کرنے والے سب عدل ہوں اور حفظ وضبط سے موصوف ہوں اور اس کا سلسلہ نیچے سے اوپر تک، رسول اللہ ﷺ تک، یا آپ کے کسی صحابی تک یا اس سے کمتر درجہ رکھنے والے تک پہنچتا ہو، اور وہ نہ شاذ ہو، نہ

---

[1] علوم الحدیث ص: ۲۱، اختصار علوم الحدیث ص: ۳۲.

Marfat.com

مردود اور نہ اس میں اس کی صحت کو داغدار بنانے والا کوئی بڑا عیب ہی ہو۔''

واضح رہے کہ کسی صحابی کا صحیح قول یا فعل موقوف یا اثر اور اس سے نیچے کے راوی کا قول یا فعل مقطوع کہلاتا ہے۔

حدیث معنعن:

اگر کوئی کسی کے حوالے سے حدیث روایت کرتے ہوئے روایتی تعبیریں، ((حدثني و حدثنا وأخبرني وأخبرنا.)) اس نے مجھ سے حدیث بیان کی، یا اس نے ہم سے حدیث بیان کی، یا اس نے مجھے خبر دی، یا اس نے ہمیں خبر دی استعمال کرنے کے بجائے "عن فلان" فلاں سے روایت ہے، کی تعبیر اختیار کرے تو علوم الحدیث کی اصطلاح میں اس فعل کو "عنعنة" اور اس طریقے سے روایت کی جانے والی حدیث کو "معنعن" کہتے ہیں، یعنی بذریعہ "عن" روایت کی جانے والی حدیث۔

بذریعہ "عن" روایت کی جانے والی حدیث اپنے ثبوت میں روایتی تعبیروں کے ذریعہ روایت کی جانے والی حدیثوں سے قدرے مختلف ہے جس کی تفصیل یوں ہے:

۱۔ اگر راوی ثقہ ہے اور اس کے اور مروی عنہ کے درمیان ''معاصرت'' کے علاوہ ملاقات بھی ثابت ہے، چاہے ایک ہی بار سہی تو بذریعہ ''عنعنہ'' روایت کی جانے والی حدیثیں ''متصل الاسناد'' ہی باور کی جائیں گی۔

حافظ ابن صلاح نے ''حدیث معنعن'' کے بعض علمائے حدیث کے نزدیک مرسل یا منقطع قرار دیے جانے کا ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے:

''صحیح بات جس پر عمل ہے یہ ہے کہ یہ حدیث اس حدیث کی مانند ہے جس کی سند متصل ہو یہی تمام محدثین اور غیر محدثین کا مسلک ہے اور صحیح حدیث کی شرائط وضع کرنے والوں نے اپنی تصنیفات میں اس حدیث کو ''متصل الإسناد'' ہی کی حیثیت سے درج کیا ہے اور اس کو قبول کیا ہے، بلکہ حافظ ابو عمر بن عبدالبر نے اس پر ائمہ حدیث کے اجماع کا دعویٰ کیا ہے، اور حافظ ابو عمرو دانی مقری کا بھی یہ دعویٰ ہے کہ ''اہل نقل'' کا اس پر اجماع ہے، بشرطیکہ جن راویوں کی طرف "عنعنه" کی نسبت کی گئی ہے وہ آپس میں ایک دوسرے سے مل چکے ہوں اور ''تدلیس'' کے عیب سے پاک رہے ہوں۔''[1]

تدلیس کی تعریف:

علوم الحدیث کی اصطلاح میں ''تدلیس'' سے مراد سند کے عیب کو چھپا کر اس کو مستحسن اور قابل قبول بنا دینا ہے۔ یہ لفظ دراصل سامان تجارت میں موجود عیب کو چھپانے کے لیے بنایا گیا ہے، پھر ہر طرح کے عیوب کو چھپانے اور دھوکہ دہی کے لیے استعمال کیا جانے لگا۔

---

[1] ص: ۴۶-۴۷

Marfat.com

حدیث کی سند میں تدلیس یہ ہے کہ حدیث کی روایت کرنے والا اپنے معاصر سے ایسی حدیث روایت کرے جو اس سے نہ سنی ہو، لیکن طرز تعبیر ایسا اختیار کرے جو بصراحت نہ سننے پر دلالت نہ کرتا ہو، جیسے: "عن فلان" فلاں سے روایت ہے، "یا قال فلان" فلاں نے کہا؛ تو یہ دونوں تعبیریں ''مروی عنہ'' سے حدیث کے عدم سماع پر بصراحت دلالت نہیں کرتیں اور نہ بصراحت اس سماع ہی پر دلالت کرتی ہیں۔

حدیث معنعن کے قبول کے لیے بخاری کی شرط:

ڈاکٹر برنی نے بخاری اور مسلم کے مابین اختلاف کو اس رنگ میں پیش کیا ہے گویا وہ راویوں کی عمومی ثقاہت کے مسئلہ میں مختلف الرای تھے، جبکہ راوی اور اس کی ثقاہت کے مسئلہ میں تمام ائمہ کا اتفاق ہے اور اگر راوی کی تعدیل کے لیے ان کی تعبیروں میں کوئی اختلاف ہے بھی تو یہ اختلاف تضاد نہیں، بلکہ تنوع اور توسع کا اختلاف ہے۔

انہوں نے دوسری غلطی یہ کی ہے کہ شیخین کے اس اختلاف کو تمام روایتوں تک پھیلا دیا ہے، جبکہ حقیقت میں یہ اختلاف صرف "مُعنعن" روایت تک محدود ہے، جس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

امام مسلم رحمہ اللہ کے نزدیک حدیث "مُعنعن" کے قبول کی شرط:

اوپر ان غیر مدلس راویوں کی معنعن روایتوں کے قبول کے مسئلہ میں جمہور محدثین کے مسلک کو حافظ ابن صلاح رحمہ اللہ کے حوالہ سے بیان کیا جا چکا ہے جن کے درمیان کم از کم ایک بار ملاقات ثابت ہو، میں علوم الحدیث کے کسی موضوع سے متعلق حافظ ابن صلاح کا زیادہ حوالہ اس وجہ سے دیتا ہوں کہ ان کے مقدمہ کو اس موضوع میں ''قانون'' کی حیثیت حاصل ہے جس میں انہوں نے متقدمین کے اقوال کو پڑھ کر ان کے مالہ وماعلیہ کو سمجھ کر اور ان کو ہضم کر کے ان کا خلاصہ نہایت دقت کے ساتھ قانون کی زبان میں بیان کر دیا ہے جس کی وجہ سے ان کے بعد سے آج تک یہ مقدمہ ''علم حدیث'' سے کسی طرح کا بھی تعلق رکھنے والوں کے لیے بنیادی ماخذ کا درجہ رکھتا ہے ابن صلاح نے متوسط سائز کے ۲۴۳ صفحات پر مشتمل اس مختصر سے مقدمہ میں نہایت خوبصورتی سے علوم حدیث بیان کر دیے ہیں جن کی شرحیں بعض لوگوں نے کئی ضخیم جلدوں میں لکھی ہیں:

حدیث معنعن کے قبول کی جو شرط امام مسلم رحمہ اللہ کی طرف منسوب ہے عام طور پر محققین اس کا خلاصہ اپنی زبان مین بیان کرتے ہیں، موضوع کی نزاکت کے پیش نظر میں صحیح مسلم کے مقدمہ کے اس فقرے کا مکمل ترجمہ درج کر دینا چاہتا ہوں جس میں انہوں نے اپنا نقطہ نظر بیان کیا ہے، حدیث معنعن کو قبول کرنے کے لیے راوی اور مروی عنہ میں معاصرت کے ساتھ ملاقات کی شرط لگانے والوں کا مسلک بیان کرنے کے بعد انہوں نے اپنا نقطہ نظر ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

> ''اللہ تم پر رحم فرمائے سند میں حرف گیری کی یہ بات نئی ہے ایسی بات کہنے والے سے پہلے اہل علم میں سے کسی نے بھی ایسی بات نہیں کہی ہے، بلکہ اخبار اور روایت کا علم رکھنے والے پہلے کے لوگوں اور موجودہ

Marfat.com

لوگوں میں یہ بات عام اور متفق علیہ ہی ہے کہ اگر کوئی ثقہ آدمی اپنی ہی طرح کے ایسے ثقہ آدمی سے کوئی حدیث روایت کرے جس سے اس کی ملاقات اور سماع ممکن ہو، کیونکہ دونوں ایک ہی زمانے میں تھے، اگر چہ ایسی کوئی خبر منقول نہ ہو کہ وہ ایک دوسرے سے ملے ہیں اور دو بدو بات کی ہے، تو یہ روایت ثابت ہے اور اس کو دلیل وحجت ماننا لازمی ہے، سوائے اس کے کہ ایسی کوئی واضح دلیل موجود ہو کہ راوی مروی عنہ سے نہ ملا ہے اور نہ اس سے کچھ سنا ہے، مگر جب صورت واقعہ غیر واضح ہے اور ہمارے بیان کے مطابق ملاقات کا امکان رہا ہے تو اس کی یہ روایت ہمیشہ سماع پر مبنی قرار دی جائے گی یہاں تک کہ اس کے برعکس کوئی خبر ثابت ہو جائے۔'' [1]

امام مسلم کے قول کی وضاحت:

امام مسلم کے مذکورہ بالا قول کی مختصر وضاحت ضروری ہے تا کہ اس کا مدعا سامنے رہے، اور آخر میں اس مسئلہ پر جو تبصرہ کروں گا اس کو سمجھنا آسان رہے:

۱۔ حدیث معنعن کو حجت ماننے کے لیے راوی اور مروی عنہ کا ایک زمانہ میں پایا جانا امام مسلم رحمہ اللہ کے نزدیک بھی لازمی شرط ہے جس میں وہ جمہور محدثین کے ساتھ ہیں۔

۲۔ راوی اور مروی عنہ کے مابین وہ ملاقات کی اہمیت کے منکر نہیں ہیں، البتہ راوی کے ثقہ ہونے کی وجہ سے ملاقات کے امکان کو فعلی ملاقات کا درجہ دیتے ہیں ''ایسا وہ ثقہ راوی سے متعلق اپنے حسن ظن کے جذبے سے کرتے ہیں۔'' [2]

۳۔ وہ راوی اور مروی عنہ کے درمیان عدم ملاقات ثابت ہونے کی صورت میں ''معنعن'' روایت کو مسترد کرنے میں جمہور محدثین کے ساتھ ہیں۔

امام بخاری کی شرط:

''معنعن حدیث'' کو قبول کرنے اور حجت ماننے کے لیے امام بخاری رحمہ اللہ کی جو شرط ہے وہی دوسرے محدثین کی بھی شرط ہے، یعنی:

اگر راوی اور مروی عنہ ایک ہی زمانے میں تھے اور راوی نے مروی عنہ سے حدیث بذریعہ ''عن'' روایت کی ہے، تو اگر ان دونوں میں ملاقات ثابت ہے، اگر چہ ایک ہی بار ہوئی ہو تو یہ ''عنعنہ'' اتصال اور سماع پر محمول کیا جائے گا اور روایت قابل قبول ہوگی، اس کے برعکس اگر ان میں ایک بار بھی ملاقات ثابت نہ ہو تو محض دونوں کے ایک ہی زمانے

---

[1] مقدمہ صحیح مسلم، ص: ۲۰، المنہاج ص: ۷۰، منۃ المنعم ص: ۵۱.

[2] فتح المغیث ص: ۲۸۹، ج: ۱.

Marfat.com

میں ہونے اور دونوں میں ملاقات ہونے کے مجرد امکان سے اس عنعنہ کو اتصال نہیں قرار دیا جائے گا اور ایسی روایت کو قبول کرنے میں توقف کیا جائے گا۔

امام محی الدین نووی رحمہ اللہ "المنهاج فی شرح صحیح مسلم" میں فرماتے ہیں:

''یہی پسندیدہ مسلک ہے جس کو امام بخاری اور ان کے شیخ امام علی بن مدینی اور ان کے ہم خیال دوسرے ائمہ نے اختیار کیا ہے، جس کی دلیل یہ ہے کہ راوی اور مروی عنہ میں ملاقات کے ثبوت کی صورت میں ''معنعن'' حدیث متصل الاسناد سمجھی جائے گی، اس لیے کہ جو راوی ''مدلس'' نہ ہو ''عن'' کی تعبیر ''سماع'' کے لیے ہی استعمال کرتا ہے اور اس مسئلہ میں تتبع سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ راویان حدیث میں جو مدلس نہ رہے ہوں ان کا معمول یہی تھا کہ وہ عن کی تعبیر انہی حدیثوں کی روایت کے وقت استعمال کرتے تھے جو انہوں نے اپنے شیوخ سے سنی ہوں، جبکہ مدلس کا طرز عمل اس سے مختلف تھا؛ وہ ایسی حدیث روایت کرتے وقت ''عن'' استعمال کرتا تھا جو اس نے اپنے شیخ سے نہ سنی ہو اس وجہ سے ہم نے ''مدلس'' کی معنعن روایت مسترد کر دی اور جب دونوں میں ملاقات کا ثبوت مل گیا تو بذریعہ عن روایت کی جانے والی حدیث کو ''غلبہ ظن'' کی بنیاد پر متصل الاسناد قرار دے دیا، لیکن اگر دونوں میں صرف ملاقات کا امکان رہا ہو اور عملاً ملاقات ثابت نہ ہو تو سند میں اتصال کا غالب گمان نہیں ہوگا لہٰذا اس حدیث کو متصل الاسناد قرار دینا جائز بھی نہ ہوگا، کیونکہ اس صورت میں ''مروی عنہ'' ''مجہول'' کی طرح ہوگا اور اس کی روایت مردود ہوگی، ایسا اس کے جھوٹا ہونے یا ضعیف ہونے کے یقین میں نہیں کیا جائے گا، بلکہ اس کی حالت میں شک ہونے کی وجہ سے کیا جائے گا۔'' [1]

نتیجہ:

حدیث معنعن کے قبول یا رد سے متعلق امام بخاری اور امام مسلم رحمہما اللہ کے نقطہ ہائے نظر صحیح شکل میں پیش کر دینے کے بعد عرض گزار ہوں کہ دونوں فریقوں میں سے کسی کو دوسرے سے علی الاطلاق افضل قرار دینا نہ ممکن ہے اور نہ قرین صواب، بلکہ اس کے لیے بہتر اور مناسب تعبیر یہ ہے کہ امام بخاری اور امام ابن مدینی کا نقطہ نظر زیادہ محتاط اور حفظ حدیث کے مزاج اور تقاضوں سے زیادہ ہم آہنگ ہے، جبکہ امام مسلم کے نقطہ نظر میں زیادہ وسعت ہے اور ثقہ راوی کے ساتھ حسن ظن کا پہلو اس میں غالب ہے جو اس طرح کے معاملات میں بسا اوقات زیادہ سودمند نہیں رہ جاتا مثال کے طور پر:

۱۔ شیخین کے زمانے اور ان سے پہلے کے زمانے میں جبکہ ایک ایک شہر اور قصبہ میں ائمہ حدیث اور ان سے کسب فیض کرنے والوں کی کثرت ہوتی تھی ایسی صورت میں اگر کوئی شیخ کسی دوسرے شخص سے حدیث روایت کرتے

---

[1] ص: ۱۷

Marfat.com

ہوئے حدثنا یا أخبرنا کہنے کے بجائے "عن فلان" فلاں سے روایت ہے'' کی تعبیر اختیار کرتا تھا، درانحالیکہ وہ ثقہ ہوتا تھا، مدلس'' نہیں، تو دونوں میں ملاقات اور سماع کا صرف امکان نہیں، بلکہ غالب گمان تھا جو یقین کے قریب ہے، ایسی صورت میں امام بخاری کی طرح امام مسلم کا نقطہ نظر بھی قرین صواب ہے، اور راوی کے ثقہ ہونے کا تقاضا بھی یہ ہے کہ اس کے ''عنعنہ'' کو بھی وہی درجہ دیا جائے جو حدثنا یا أخبرنا کو حاصل ہے۔

۲۔ لیکن ایک ہی زمانے میں پائے جانے والے راویوں میں سے اگر کوئی مصر سے تعلق رکھتا رہا ہو اور وہ خراسان میں سکونت پذیر کسی سے بذریعہ "عن" حدیث روایت کرے اور یہ معلوم ہو کہ اس نے خراسان کا کبھی سفر نہیں کیا ہے، ایسی صورت میں راوی اور مروی عنہ کے ایک ہی زمانے میں ہونے سے بھی ان میں ملاقات کا امکان تقریبا مفقود ہو جاتا ہے اس حالت میں بلاشبہ امام بخاری کا نقطہ نظر راجح ہو جاتا ہے، کیونکہ اس دوسری صورت میں ''غلبہ ظن'' یہی ہوتا ہے کہ راوی نے مروی عنہ سے وہ حدیث نہیں سنی ہے۔

قارئین کرام سے درخواست ہے کہ وہ ڈاکٹر برنی کے دعوے اور میرے بیان کردہ حقائق میں موازنہ کر کے یہ دیکھیں کہ یہ منکرین، حدیث سے لوگوں کو متنفر کرنے کی غرض سے کتنی غلط بیانیاں کرتے ہیں یہ صحیح ہے کہ اردو داں طبقہ میں بہت کم ایسے لوگ ہوں گے جو باطل افکار وخیالات رکھنے والوں کے دعووں کی حقیقت طشت ازبام کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں اس طرح باطل کے پھولنے پھلنے کے مواقع میسر آتے رہتے ہیں اور سطحی علم رکھنے والے ان فریب کاروں کے جال میں پھنستے جاتے ہیں اور ان کے دعووں کو سچ سمجھ کر ان کے ہمنوا اور آلہ کار بن جاتے ہیں، لیکن ایک وقت آتا ہے کہ غلط بیانیوں اور فریب کاریوں کا پردہ چاک ہو جاتا ہے اور حق کا سورج طلوع ہو کر تاریکیوں میں چھپے ہوئے باطل پرستوں کو عیاں کر دیتا ہے۔

برنی کا دوسرا جھوٹ:

ڈاکٹر برنی فرماتے ہیں:

''دوسری طرف امام مسلم نے ہر طبقہ میں دو معتبر راویوں کی موجودگی کا التزام کیا ہے، جبکہ امام بخاری اس شرط کو ضروری قرار نہیں دیتے۔''

اس دعوئ میں کسی بھی اعتبار سے کوئی صداقت نہیں ہے اور اس قول کا ماخذ بھی کوئی حدیث کی مستند کتاب اور علم الحدیث کی کوئی مستند کتاب نہیں ہے اور نہ ہو سکتی ہے، کیونکہ موصوف اس مقدس علم کے ساتھ عربی زبان بھی اتنی نہیں جانتے کہ کسی صاحب فن کی کوئی عبارت سمجھ سکیں۔ وہ اپنے مضامین میں حافظ ابن عبدالبر اور حافظ بغدادی کے نام تو ضرور لیتے ہیں، جبکہ ان کا مبلغ علم اپنے امام اصلاحی صاحب کے ''مبادی تدبر حدیث'' تک محدود ہے، ان کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دوسرے منکرین حدیث کی کتابیں اور مضامین بھی پڑھتے ہیں جو اردو میں ہیں، اور عربی کتابوں

Marfat.com

کے حوالے اپنے قارئین کو مرعوب کرنے کے لیے دیتے ہیں۔

ان کا یہ دعویٰ کہ: ''امام مسلم نے ہر طبقہ میں دو معتبر راویوں کی موجودگی کا التزام کیا ہے، جبکہ امام بخاری اس شرط کو ضروری قرار نہیں دیتے'' سراسر جھوٹ اور بے بنیاد ہے، جس کی تفصیلات حسب ذیل ہیں:

۱۔ جس بات کا ائمہ حدیث کی کتابوں میں ذکر آیا ہے وہ برنی کی بات کے بالکل برعکس ہے؛ یعنی امام بخاری نے اپنی صحیح کے لیے یہ شرط رکھی ہے کہ ہر صحابی سے دو تابعین نے اور ان میں سے ہر تابعی سے دو دو ثقہ راویوں نے حدیث روایت کی ہو، اور ان کی اس شرط کا ذکر سب سے پہلے امام عبداللہ محمد بن عبداللہ محمد حاکم (۳۲۱ھ۔ ۴۰۵ھ) نے اپنی دو کتابوں، (المستدرك ص: ۲۳ ج: ۱، اور المدخل الی کتاب الاکلیل ص: ۳۶) میں کیا ہے۔ ❶

۲۔ خود شیخین میں سے کسی نے اس شرط کا دعویٰ نہیں کیا ہے، اس لیے اس کی صحیح تعبیر یہ ہے کہ پہلے درجہ میں امام بخاری نے یہ کوشش کی ہے کہ وہ صحیح بخاری میں جو حدیث درج کریں اس کی روایت کرنے والے صحابی سے دو یا اس سے زیادہ تابعی اس کی روایت کریں، بعد میں امام مسلم نے بھی اپنے مقدور بھر یہ کوشش جاری رکھی ہے، لیکن متعدد احادیث میں وہ ایسا کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔

مثالیں:

(۱)...... پہلی مثال:

پہلی مثال جس میں حدیث کے راوی صحابی سے صرف ایک ہی تابعی نے حدیث روایت کی ہے، نیت کی حدیث ہے۔ اس حدیث کے راوی صحابہ میں صرف عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ ہیں اور ان سے روایت کرنے والے صرف علقمہ بن وقاص لیثی ہیں۔ ❷

(۲)...... دوسری مثال:

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ابو طالب کے ایمان نہ لانے کا جو واقعہ بخاری اور مسلم نے اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے اس کے راوی میب بن حزن رضی اللہ عنہما ہیں دونوں، یعنی باپ ''حزن'' اور بیٹے ''میب'' صحابی تھے، اور میب سے اس حدیث کی روایت صرف ان کے تابعی بیٹے ''سعید'' نے کی ہے۔ ❸

(۳)...... تیسری مثال:

امام بخاری رحمہ اللہ نے عمرو بن تغلب رضی اللہ عنہ کی جو حدیث نقل کی ہے اور جس کے الفاظ ہیں:

((أما بعد، فوالله إني لأعطي الرجل وأدع الرجل، والذي أدع أحب إلي من

❶ مقدمہ ابن صلاح ص: ۱۹۷، فتح المغیث (ص: ۱۸۳، ج: ۴)۔ ❷ بخاری: ۱، مسلم: ۱۹۰۷۔
❸ بخاری: ۳۸۸۴، مسلم: ۲۴

Marfat.com

الذی أعطی .))

''اما بعد، اللہ کی قسم میں کسی کو دیتا ہوں اور کسی کو نہیں دیتا اور جس کو نظر انداز کر دیتا ہوں وہ مجھے اس سے زیادہ محبوب ہوتا ہے جسے دیتا ہوں۔'' ❶

عمرو بن تغلب سے اس کی روایت حسن بصری تابعی نے کی ہے، یہ حدیث مسلم میں نہیں آئی ہے۔

(٤)...... چوتھی مثال:

امام مسلم کتاب الایمان میں طارق بن اشیم اشجعی رضی اللہ عنہ کی جو حدیث لائے ہیں اس کی روایت ان سے صرف ان کے بیٹے ابو مالک سعد نے کی ہے جو تابعی تھے۔ ❷

(٥)...... پانچویں مثال:

امام بخاری نے مرداس اسلمی رضی اللہ عنہ سے جو حدیث روایت کی ہے اور جس کے الفاظ ہیں:

((یذهب الصالحون الأول فالأول ویبقی حفالة کحفالة الشعیر أوالتمر لایبالیهم الله بالة .))

''صالح لوگ ایک ایک کر کے چلے جائیں گے اور جو کی بھوسی اور ناکارہ کھجور کی طرح صرف ناقدرے لوگ باقی رہ جائیں گے جن کو اللہ کوئی وزن نہیں دے گا۔'' ❸

مرداس اسلمی صحابی سے اس کی روایت صرف قیس بن ابی حازم تابعی نے کی ہے۔

صحیحین سے میں نے صحابی سے صرف ایک تابعی کی روایت کردہ حدیثوں کی جو مثالیں دی ہیں، ان میں سے پہلی اور دوسری حدیث بخاری اور مسلم کے درمیان متفق علیہ ہے اور تیسری اور پانچویں حدیث صرف بخاری میں آئی ہے اور چوتھی حدیث صرف امام مسلم نے نقل کی ہے۔

ان مثالوں سے برنی کا یہ دعویٰ کہ: ''امام مسلم نے ہر طبقہ میں دو معتبر راویوں کی موجودگی کا التزام کیا ہے، جبکہ امام بخاری اس شرط کو ضروری قرار نہیں دیتے'' ریت کی دیوار ثابت ہوگیا۔

دراصل شیخین میں سے کسی نے بھی نہ اس طرح کی کوئی شرط بنائی ہے اور نہ ایسا کرنے کا اپنے آپ کو پابند بنایا ہے، البتہ صحت حدیث دونوں کے نزدیک پہلے درجہ پر تھی، امام بخاری نے اس شرط پر زیادہ اہتمام برتا ہے اور امام مسلم نے ان سے کم اور تعدد رواۃ کا تعلق صحت حدیث سے نہیں ہے، اس سے صرف صحت کے درجہ پر اثر پڑتا ہے، اگر ہر طبقہ میں یا کسی ایک طبقہ میں کسی حدیث کا راوی صرف ایک ہو اور عدل وضابطہ ہو، سند نبی صلی اللہ علیہ وسلم تک متصل ہو اور شذوذ وعلت سے پاک ہو تو ایسی حدیث صحیح ہے جس کی میں نے اتنی مثالیں دی ہیں جتنی مثالیں حدیث کی کسی بھی کتاب میں

❶ بخاری: ۹۲۳ ❷ ۲۳ ❸ بخاری: ۶۴۳۴

Marfat.com

یکجا نہیں مل سکتیں اور میں نے پوری کتاب میں اس بات کی پابندی کی ہے کہ صحت کی اعلیٰ ترین صفات سے موصوف احادیث سے استدلال کروں، جن کو ائمہ فن نے صحیح قرار دیا ہے، محمود ابوریہ، غزالی، سلیمان ندوی، اصلاحی، غامدی اور برنی نے نہیں، ان کی تصحیح وتضعیف تو دو کوڑی کے برابر بھی نہیں ہے کہ اس کو درخور اعتنا سمجھا جائے۔

وہی اپنے امام کی راگنی:

مشاہیر عرب شعراء اپنے اشعار اور قصائد کے خاص راوی اور ناقل رکھتے تھے جو ان کے قصائد کو پھیلاتے تھے، ان کو ''داعیۃ'' کے وزن پر ''راویہ'' کہا جاتا تھا، غامدی اور برنی اپنے امام اصلاحی کے لیے اس ''راویہ'' کا کردار ادا کرتے ہیں، لیکن عرب شعراء کے راویوں کی طرح امین، نہیں خائن ''راویہ'' ہیں یہ اپنے حدیث مخالف افکار ونظریات لیتے تو مبادی تدبر حدیث ہی سے ہیں، لیکن یہ دکھانے کے لیے کہ یہ ان کے اپنے افکار ونظریات ہیں ان میں کچھ تبدیلیاں کر دیتے تھے۔

ڈاکٹر افتخار برنی نے بھی حدیث کی سند میں جھول اور خلا دکھانے کی سعی مذموم کی ہے، افکار تو اسی ''مبادی'' ہی سے لیے ہیں، مگر بعض الفاظ بدل دیے ہیں تاکہ یہ تاثر دے سکیں کہ یہ ان کے اپنے افکار ہیں۔

اصلاحی صاحب نے سند میں خلا دکھانے کے لیے راویان حدیث کو ایک دوسرے سے ہزاروں میل دور بتایا ہے، برنی نے بھی یہی بات دہرائی ہے، مگر ''ہزاروں'' کو ''سیکڑوں میل'' میں بدل دیا ہے، فرماتے ہیں:

> ''سند کی تیسری کمزوری زمان ومکان کے فاصلوں سے عبارت ہے، سیکڑوں میل کی دوری پر موجود ایک شخص کے بارے میں ۱۰۰ فیصد یقین کے ساتھ رائے نہیں دی جا سکتی مذکورہ شخص اگر کسی اور عہد سے تعلق رکھتا ہو تو رائے دینا اور مشکل ہو جاتا ہے۔''

اصلاحی صاحب کے اشکالات کا میں مفصل اور مدلل جواب دے چکا ہوں، یہاں برنی صاحب کے دعوے کے جواب میں اپنی سابقہ باتیں دہراؤں گا نہیں، بلکہ چند دوسرے زاویوں سے اس دعویٰ کی غلطی دکھاؤں گا:

۱۔ نقاد رجال نے گھر بیٹھے راویوں کی جرح وتعدیل کر لی تھی۔

۲۔ ہر ناقد رجال نے جس راوی کی جرح وتعدیل کی ہے قریب سے اس کے حالات کا مطالعہ کرنے کے بعد نہیں کی ہے۔

۳۔ نقاد رجال جرح وتعدیل میں امین نہیں تھے۔

اب میں ان عنوانات میں سے ہر عنوان کے تحت حقیقت حال بیان کروں گا:

(۱)...... نقاد رجال نے گھر بیٹھے راویوں کی جرح وتعدیل کر لی تھی:

اوپر یہ بات بڑی تفصیل سے بیان کی جا چکی ہے کہ حدیث کے راویوں کی جرح وتعدیل کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ حدیث یا سنت کے نام سے صرف وہی قول، فعل، تقریر اور سیرت پاک کا واقعہ معتبر قرار دیا جائے جس کی نسبت رسول اللہ ﷺ سے صحیح ہو، کیونکہ جس قول، فعل، تقریر، اور سیرت پاک کی نسبت رسول اللہ ﷺ سے صحیح نہ ہو، وہ حدیث یا

Marfat.com

سنت نہیں ہے اور چونکہ قرآن کی رو سے حدیث، قرآن کی طرح اور اس کے بالکل مساوی ماخذ شریعت ہے اس لیے یہ جاننا فرض تھا اور فرض ہے کہ کون سی حدیث صحیح ہے اور کس کا صرف نام حدیث ہے یا جو حدیث ہونے کی شہرت رکھتی ہے، حقیقت میں رسول اللہ ﷺ سے کوئی نسبت نہیں رکھتی اور یہ سب کچھ معلوم کرنے کا بنیادی ذریعہ یہ ہے کہ حدیث روایت کرنے والوں اور نقل کرنے والوں کے مفصل حالات معلوم ہوں، یعنی یہ معلوم ہو کہ ان میں کون اس روایت اور نقل میں امین اور معتمد علیہ تھا اور کون نہیں، اس تناظر میں گھر بیٹھ کر کسی راوی کو ثقہ قرار دے دینا اور کسی کو ضعیف کہہ دینا جہاں نہ راوی کے ہم عصر ہونے اور مکانی طور پر اس کے قریب ہونے کا متقاضی ہے اور نہ اس توثیق اور تضعیف کا عند اللہ اور عند الناس کوئی اعتبار ہے، اگرچہ یہ توثیق اور تضعیف اتفاقی طور پر امر واقعہ کے مطابق ہو جائے، اور ایسا حکم لگانے والا اللہ ورسول کا دشمن ہے اس مقدس علم (حدیث) کا پاسبان اور محافظ نہیں اور ایسا شخص فرمان الٰہی کے بموجب اللہ تعالیٰ کے ہاں اپنے اس عمل کے بارے میں جواب دہ ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولَٰئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُولًا﴾ (بنی اسرائیل: ۳۶)

''اور اس چیز کی ٹوہ میں نہ رہو جس کا تمہیں کوئی علم نہ ہو درحقیقت کان اور آنکھ اور دل ہر ایک سے متعلق سوال کیا جائے گا۔''

(۲)..... ہر ناقد رجال نے راویوں کی توثیق وتضعیف اپنی ذاتی معلومات کی بنیاد پر کی ہے:

میں اس سے قبل یہ عرض کر چکا ہوں کہ روایت حدیث کے ساتھ ہی نقد رجال کا عمل شروع ہو گیا تھا، میری مراد طبقہ تابعین سے ہے، کیونکہ روایت حدیث میں صحابہ کی ثقاہت عقلاً اور نقلاً محل بحث نہیں تھی، اور حدیث کی سند کے بارے میں تدقیق کا عمل علی اور معاویہ رضی اللہ عنہما کے باہمی اختلافات اور ان کے نتیجے میں ہونے والے معرکہ جمل وصفین کے بعد شروع ہوا، امام مسلم صحیح مسلم کے مقدمے میں تحریر فرماتے ہیں:

((عن ابن سيرين قال: لم يكونوا يسألون عن الإسناد، فلما وقعت الفتنة قالوا: سموا لنا رجالكم، فينظر إلى أهل السنة فيؤخذ حديثهم، وينظر إلى أهل البدعة فلا يؤخذ حديثهم.))

''ابن سیرین سے روایت ہے کہتے ہیں: اہل الحدیث سند سے متعلق نہیں پوچھتے تھے، لیکن جب فتنہ پھوٹ پڑا، تو کہنے لگے: اپنے راویوں کے نام بتاؤ، اور اہل سنت کو دیکھتے تو ان کی حدیث لے لیتے اور اہل بدعت کو دیکھتے تو ان کی حدیث نہیں لیتے۔'' [1]

[1] ص: ۳۵، نمبر: ۲۷

Marfat.com

ابن سیرین سے مراد محمد بن سیرین ہیں جو ۳۳ھ میں پیدا ہوئے جب بکثرت صحابہ موجود تھے اور ۱۱۰ھ میں وفات پائی جو سب سے آخر میں وفات پانے والے صحابی ابوطفیل عامر بن واثلہ رضی اللہ عنہ کی سال وفات ہے، انہوں نے جس فتنہ کے بعد حدیث کے بارے میں پوچھ گچھ کی خبر دی ہے وہ رافضیت اور خروج کا فتنہ ہے، جنگ صفین کے بعد یہ فتنہ پیدا ہوا اور بہت جلد شدت اختیار کیا گیا اور رافضی جو اپنے آپ کو شیعان علی کہتے تھے اور علی رضی اللہ عنہ کے سیاسی مخالف خوارج دونوں بہت جلد عقائد میں اہل سنت و جماعت کے عقائد کے خلاف ہو گئے، اپنے عقائد کی تائید میں خوارج نے تو حدیثیں وضع نہیں کیں، لیکن روافض اس میدان میں بہت آگے نکل گئے، اور اپنے عقائد کی تائید اور علی رضی اللہ عنہ کے مناقب اور صحابہ کرام کی مذمت میں حدیثیں وضع کر کے پھیلانے لگے۔

ابن سیرین کے قول میں ''اہل البدعۃ'' سے یہی دونوں فرقے مراد ہیں:

ناقدین رجال کے طبقہ اول کے متعدد ائمہ حدیث نے سند کی اہمیت اس کے اسباب کے ساتھ بیان کی ہے، میں نے ناقدین رجال کی جو مختصر فہرست اوپر دی ہے اس کی روشنی میں یہ پاسبان حدیث پہلی صدی ہجری کے نصف اول میں پیدا ہو گئے تھے، جبکہ بکثرت صحابہ زندہ تھے اور ان کے زیر تربیت رہ کر یہ مقدس جماعت ''کندن'' بنی تھی اور پہلی صدی ہجری کے اختتام اور دوسری صدی ہجری کے اوائل تک ان ناقدین کی کثرت ہو گئی تھی۔ اس بے لوث، خدا ترس اور صالح جماعت کا ایک ایک فرد اپنے آپ کو حدیث رسول کا خادم سمجھتا تھا، اور دل و جان سے یہ خدمت ادا بھی کر رہا تھا۔ محدثین جب کسی حدیث کے جاننے والے کے بارے میں سنتے تو اس شہر کا بذات خود سفر کرتے اور اس کی زبان سے وہ حدیث سنتے، سید التابعین سعید بن مسیب (۱۵-۹۴ھ) سے روایت ہے، فرماتے ہیں:

''میں صرف ایک حدیث کی خاطر دو دنوں اور راتوں کی مسافت طے کر کے سفر کیا کرتا تھا۔'' ❶

رجال کی کتابوں، اور بعض حدیث کی کتابوں کے مقدموں میں حصول حدیث کے لیے تابعین، تبع تابعین اور تبع تبع تابعین کے سفر کے مفصل حالات درج ہیں۔ اصلاحی اور برنی نے اگر اپنے پسندیدہ مصنف خطیب بغدادی کی کتاب "الرحلہ فی طلب الحدیث" کا مطالعہ کر لیا ہوتا تو ان کے قلم سے وہ باتیں نہ نکلتیں جو مستشرقین کے قلم سے بھی نہیں نکلی ہیں، اگر یہ کہا جائے کہ محدثین ہمیشہ حالت سفر میں رہتے تھے خاص طور پر پہلی صدی ہجری کے نصف آخر سے تو یہ عین حقیقت کا بیان ہوگا، یہ سفر جہاں حدیث کی تحصیل کے لیے ہوتا وہیں راویوں کے حالات معلوم کرنے کے لیے بھی اور تبع تابعین کے طبقہ میں تو اس آخر الذکر مقصد کی اہمیت روایت حدیث سے کسی طرح کم نہیں تھی، اور چونکہ تابعین کے مروی عنہ بڑی تعداد میں صحابہ تھے اور تابعین کے متوسط اور جوان طبقہ سے وابستہ لوگوں نے زیادہ تر بڑے تابعین سے

❶ الرحلہ فی طلب الحدیث ص: ۲۰۸۔

Marfat.com

احادیث روایت کی ہیں اور تابعین کی ثقاہت محل بحث تھی اس لیے پہلی صدی ہجری کے نصف ثانی میں محدثین مختلف شہروں کے سفر زیادہ کرنے لگے تھے، اور تبع تابعین کے دور میں حصول علم حدیث اور رواۃ حدیث کے حالات کی کھوج کرید کی غرض سے سفر کی سرگرمیاں اور ایک شہر سے دوسرے کے درمیان آمدورفت میں پہلے سے کہیں زیادہ اضافہ ہو چکا تھا اور تبع تابعین اور ان کے بعد کے محدثین کو تابعین سے کہیں زیادہ حدیثیں معلوم ہوگئیں، شاہ ولی اللہ تحریر فرماتے ہیں:

"بعض صحیح حدیثیں تابعین کے ان علماء کو نہیں معلوم تھیں جو افتاء کے منصب پر فائز تھے، اس لیے وہ اپنی آراء سے اجتہاد کرتے، یا عمومی احکام کی پیروی کرتے، یا صحابہ میں سے کسی کی اقتدا کرتے، اور اسی کے مطابق فتوے دیا کرتے، پھر اس کے بعد تیسرے طبقہ میں جب کچھ حدیثیں ظاہر ہوئیں تو انہوں نے اس خیال سے ان پر عمل نہیں کیا کہ یہ ان کے اہل شہر یا اس طریقے کے خلاف ہیں جس میں ان کا کوئی اختلاف نہیں ہے، یہ ان کے نزدیک صحت حدیث میں قادح اور اس کے ناقابل اعتبار ہونے کی علت قرار پائی، یا یہ حدیثیں اس کے بعد اس وقت ظاہر ہوئیں جب اہل الحدیث نے حدیث کے طرق کو زیادہ دقت نظر سے جمع کیا، اس کے لیے زمین کے مختلف علاقوں کے سفر کیے، اور حاملین حدیث کو تلاش کیا، تو کثیر تعداد میں ان کو ایسی حدیثیں معلوم ہوئیں جن کے راوی صحابہ میں ایک یا دو تھے اور ان سے روایت کرنے والے بھی ایک یا دو تھے، اس طرح اہل فقہ پر مخفی رہیں۔

طرق حدیث کے جامع حفاظ کے زمانے میں ایسی بہت سی حدیثیں منظر عام پر آئیں جن کے راوی اہل بصرہ تھے اور دوسرے مقامات کے لوگ ان سے غفلت میں تھے ان حالات میں شافعی نے یہ واضح کیا کہ صحابہ اور تابعین میں اہل علم کا یہ وتیرہ تھا کہ وہ کسی مسئلہ سے متعلق احادیث معلوم کرتے اور جب نہیں پاتے تو کسی اور دلیل پر عمل کرتے، پھر جب ان کو حدیث معلوم ہو جاتی تو اپنے اجتہاد کو ترک کر کے حدیث پر عمل کرتے، ایسی صورت میں اس حدیث پر ان کا عمل نہ کرنا اس کی صحت کو داغدار نہیں بناتا۔" ❶

مکہ، مدینہ، بغداد، دمشق اور کوفہ و بصرہ علمی مراکز تھے، حرم مکی اور حرم مدنی کو تو صحابہ کرام ہی کے زمانے سے مرکزیت حاصل تھی ہر دور میں ان دونوں میں تفسیر وحدیث کے حلقات قائم ہوتے اور تفسیر وحدیث کا علم حاصل کرنے والے ان حلقوں میں برابر حصہ لیتے اور وقت کے ائمہ تفسیر وحدیث سے فیض یاب ہوتے۔

مکہ اور مدینہ میں راویان حدیث کی بھی مسلسل آمدورفت رہتی تبع تابعین کے دور میں اہل سنت و جماعت کے علاوہ دوسرے فرقے بھی پیدا ہو چکے تھے اور حدیث سے استدلال کرنا سب کا وتیرہ تھا محدثین کا بڑی تعداد میں ان کے مقدس شہروں میں قیام بھی رہتا اور علمی پیاس بجھانے کے لیے بھی وہ بار بار ان کا رخ کرتے حج کے زمانے میں تو ہر سال مکہ میں

❶ حجۃ اللہ البالغۃ، ص: ۴۲۱۔۴۲۲، ج: ۱.

Marfat.com

لاکھوں انسان جمع ہو جاتے، اہل سنت و جماعت اور ان کے علماء کے علاوہ مسلمانوں کے نئے فرقوں کے لوگ بھی اپنے ائمہ کے ساتھ یہاں جمع ہوتے اس طرح صحیح حدیثوں کے ساتھ جھوٹی اور من گھڑت روایات بھی محدثین کے علم میں آتیں چونکہ صحیح اور ضعیف ہر روایت سند کے ساتھ بیان کی جاتی اس طرح علمائے رجال کو ایسے راویوں کا بھی علم ہوتا جو بحث و تحقیق کرنے پر ضعیف یا جھوٹے، یا حدیث وضع کرنے والے ثابت ہوتے اس طرح ضعیف، وضاع اور جھوٹے راوی منظر عام پر آئے اور ان اغراض و مقاصد کا بھی علم ہوا جن کی خاطر انہوں نے یہ میدان اختیار کیا تھا۔

معلوم ہوا کہ راویوں کی جرح و تعدیل مشاہدات، تجربات اور معاملات پر مبنی ہے متقدمین میں حدیث کے درس و مطالعہ کے دوران اس کی سند بھی زیر بحث آتی اور جو حدیث وہ سنتے قطع نظر اس کے کہ وہ صحیح ہے یا ضعیف اس کے راویوں کے بارے میں پوری واقفیت حاصل کرتے جن شہروں سے ان کا تعلق ہوتا ان کا سفر کرتے، حدیث کے راوی ہونے کی وجہ سے ایسے لوگ معروف بھی ہوتے، نہ ہوتے تو محدثین ان کو تلاش کر لیتے، بحث رجال کا یہ عمل روایت حدیث سے جڑا ہوا تھا اور راویان حدیث آسمانی مخلوق نہیں، زمینی مخلوق تھے، محدثین کے ہم شہر نہ سہی، ہم عصر تھے ایسی صورت میں زمان و مکان کے فاصلوں کی بات حقیقت حال سے لاعلمی پر دلالت کرتی ہے۔

عمر رضی اللہ عنہ کی سیرت کا ذکر بے محل ہے:

ڈاکٹر افتخار برنی صاحب کو اپنے آپ پر ضرورت سے زیادہ اعتماد ہے، انہوں نے سند میں اپنی من گھڑت دو کمزوریوں کے ذکر کے بعد عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے منسوب ایک اثر کا ذکر کرنے کے بعد علمائے حدیث کو یہ مشورہ دیا ہے کہ سند کی دونوں کمزوریوں کو اس اثر کی میزان میں تول کر ان کا وزن معلوم کریں، فرماتے ہیں:

> ''سند کی مندرجہ بالا دونوں کمزوریوں کو حضرت عمر فاروق کے اسوہ کی روشنی میں دیکھنے کی ضرورت ہے فاروق اعظم اس بات کو پسند نہیں کرتے تھے کہ کسی کے ساتھ معاملہ، سفر اور قیام کیے بغیر کوئی حتمی رائے دی جائے (رائے بھی وہ جس کا تعلق علم رسول اللہ ﷺ کی منتقلی سے ہو) حسن ظن رکھنا اچھی بات ہے، مگر یہ غلو کی حد تک نہیں جانا چاہیے، محدثین کرام بہت عظیم لوگ تھے، مگر انسان تھے، انہیں فرشتہ بنانے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔''

موصوف کے سینہ میں حدیث اور ائمہ حدیث کے خلاف جو زہر تھا اس کو انہوں نے اس عبارت میں انڈیل دیا ہے، ان کے نقل کردہ اس اثر یا اسوہ عمری پر سنجیدہ تبصرہ کرنے سے قبل یہ عرض کر دینا چاہتا ہوں، محدثین کا وضع کردہ علم جرح و تعدیل عمر یا غیر عمر کے اسوہ پر نہیں، فرمان الٰہی: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَإٍ فَتَبَيَّنُوا﴾ پر مبنی ہے جس کے پابند خود عمر رضی اللہ عنہ بھی تھے اور انہوں نے راویان حدیث کی جو جرح و تعدیل کی ہے وہ آیت مبارکہ کے حکم ﴿فَتَبَيَّنُوا﴾ کی صحیح اور مکمل تفسیر ہے میرے اس دعویٰ کی تصدیق کے لیے آپ اور آپ کے ہمنوا و ہم خیال ''علوم الحدیث'' کی کسی بھی مستند کتاب کے باب: ((معرفة صفة من تُقبل روايته ومن ترد روايته.)) اس شخص کی

Marfat.com

صفت کا علم جس کی روایت قبول کر لی جاتی ہے اور جس کی روایت مسترد کر دی جاتی ہے۔ کا مطالعہ کر سکتے ہیں اس باب کے تحت ان تمام فرضی اشکالات کا مکمل جواب مل جائے گا جو آپ اور آپ کے امام ومرشد جیسی ذہنیت رکھنے والے لوگ برابر اٹھاتے رہتے ہیں، اور میں نے آپ کے امام اصلاحی صاحب کے ارشادات کا جواب دیتے ہوئے بڑی تفصیل سے حدیث کی سند میں ''خلا'' سے متعلق ان کے بلند بانگ، مگر فرضی دعووں کی حقیقت بیان کر دی ہے، آپ نے الفاظ بدل کر دراصل انہیں دعووں کو دُہرایا ہے۔

عرض کر چکا ہوں کہ علمی مباحث میں انشا پردازی کے بجائے دلائل کی زبان میں بات کی جاتی ہے۔ چونکہ آپ کا ماخذ معلومات اصلاحی صاحب کے افادات ہی ہیں اور ان کے یہ افادات ''علوم الحدیث'' کے گہرے، وسیع اور مخلصانہ مطالعہ کا حاصل نہیں ہیں، بلکہ الکفایہ کے مطالعہ کا حاصل ہیں اور اس کتاب کو بھی انہوں نے محدثین کے کام میں جھول دکھانے کی غرض سے پڑھا تھا، لہٰذا اس کی جو باتیں مفید مطلب تھیں ان کو تو بطور دلیل نقل کر دیا ہے اور جن سے ان کی کور دبتی تھی ان کو نظر انداز کر دیا ہے۔

حافظ خطیب بغدادی کی بعض آراء سے صرف نظر کرتے ہوئے عرض کر دوں کہ حدیث کے قبول ورد کے مسئلہ میں جمہور محدثین اور ان کے نقطہ نظر میں کوئی خاص فرق نہیں ہے، اور اپنی کتاب ''الکفایہ'' میں عام طور پر انہوں نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ وہ ہر باب کے تحت علمائے حدیث کے اقوال نقل کرنے سے پہلے اس باب کے موضوع سے متعلق اپنا نقطہ نظر بیان کر دیتے ہیں، چنانچہ جس باب کے تحت انہوں نے عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا وہ اثر نقل کیا ہے جس کا ذکر آپ نے اپنے الفاظ میں کیا ہے اس باب کا عنوان ہے:

((الرد على من زعم أن العدالة هى إظهار الإسلام وعدم الفسق الظاهر .))

''اس شخص کا جواب جس کا دعویٰ ہے کہ عدالت اسلام کے اظہار اور ظاہری فسق کی غیر موجودگی سے عبارت ہے۔''

اس کے بعد اپنا نقطہ نظر بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

((الطريق إلى معرفة العدل المعلوم عدالته مع إسلامه وحصول أمانته ونزاهته واستقامة طرائقه ، لا سبيل إليها إلا باختبار الأحوال وتتبع الأفعال التى يحصل معها العلم من ناحية غلبة الظن بالعدالة .))

''جس عدل راوی کی عدالت اس کے اسلام، امانت داری، پاکیزگی اور مسلک کی درستگی کے ساتھ معلوم کرنی ہو اس کی معرفت اور شناخت کا طریقہ صرف یہ ہے کہ اس کے حالات کی چھان پھٹک کی جائے اور اس کے ان اعمال کا پتا لگایا جائے جن کے ذریعہ ''غلبہ ظن'' کی صورت میں اس کی عدالت کا علم حاصل ہوتا ہے۔'' [1]

[1] (ص: ۲۷۴، ج: ۱)

Marfat.com

اس مختصر سی عبارت میں بغدادی نے جرح وتعدیل کے تمام مطلوبہ اصول سمیٹ دیے ہیں، اور یہ واضح فرما دیا ہے کہ راوی کے حالات اور سلوک کو جانچے اور پرکھے بغیر اس کو عدل نہیں قرار دیا جا سکتا ہے، اور یہ مقصد اس کے بغیر حاصل نہیں کیا جا سکتا کہ ہر راویٔ حدیث سے اگر وہ زندہ ہو اس کے حالات، نشست و برخاست، خیالات ونظریات، سلوک، امانت داری، صدق گوئی، پاکیزگیٔ اخلاق اور معاملات کی درستگی کو معلوم کیا جائے۔ جس کو ہمارے محدثین نے نہایت خوبی کے ساتھ ادا کر کے ہزاروں راویوں کو اس شکل میں پیش کر دیا ہے کہ ہم ان کو روایت حدیث کا اہل یا نا اہل اور ثقہ اور غیر ثقہ قرار دینے کا مقام حاصل کر چکے ہیں، محدثین کا یہ کام ایسا نہیں ہے کہ اس کی تعریف میں یہ کہنا درست ہو کہ: ''ماہرین فن اسماء الرجال نے انسانی صلاحیت کی آخری حد تک کوششیں کی ہین اور اس سے زیادہ کے وہ مکلّف بھی نہیں تھے (برنی) بلکہ اس کام کی تعبیر ان الفاظ میں زیادہ مناسب ہے: محدثین نے راویان حدیث کی جرح وتعدیل کے لیے جو اعمال انجام دیے ہیں ان سے بہتر عمل کا کوئی تصور بھی ذہن انسانی میں نہیں تھا، اور اس سے زیادہ کرنا بھی انسانی قدرت میں نہیں تھا، اور صرف وہی نہیں بلکہ، دنیا کا کوئی بھی انسان اس سے زیادہ کا مکلّف نہیں ہے اور نہ کبھی تھا۔''

آگے بڑھنے سے پہلے یہ عرض کر دوں کہ اگر ڈاکٹر برنی یہ مانتے ہیں کہ فن اسماء الرجال کے ماہرین نے انسانی صلاحیت کی آخری تک کوششیں کی ہیں، تو پھر سند میں کمزوریاں کہاں سے آ گئیں، جبکہ علم جرح وتعدیل سیکڑوں ائمہ جرح وتعدیل کے مجموعی عمل کا نتیجہ ہے؟!!

جو راوی بقید حیات نہیں ہوتے تو ناقدین ان کے رشتے داروں، متعلقین، اس کے شہر کے اہل علم وفضل سے ان کے بارے میں معلومات جمع کرتے اور ان کی روشنی میں معلومات دینے والوں کے حوالہ سے ان کی ثقاہت اور عدم ثقاہت کا حکم لگاتے، تاریخ بغداد میں حافظ بغدادی نے اور تاریخ دمشق میں حافظ ابن عساکر نے بے شمار ایسے راویوں کے حالات وکوائف بیان کیے ہیں اور ان کے بارے میں ان کے متعلقین کے اقوال درج کیے ہیں۔

عمر رضی اللہ عنہ سے منسوب اثر صحیح نہیں ہے:

بغدادی نے الکفایہ میں عمر رضی اللہ عنہ کا جو اثر نقل کیا ہے اس کی روایت امام بیہقی نے السنن الکبری اور السنن الصغریٰ میں (نمبر: ۴۱۴۰) اور حافظ عقیلی نے الضعفاء (نمبر ۱۵۱۱) میں کی ہے۔ حافظ عقیلی کی کتاب کا موضوع ہی ضعیف راویوں کا بیان ہے۔ انہوں نے شیبان نحوی کے حوالے سے اس اثر کے راوی فضل بن زیاد کے بارے میں لکھا ہے: ((لا يُعرف إلا بهذا وفيه نظر.)) وہ صرف اسی روایت کے ذریعہ معروف ہے اور اس کی صحت محل نظر ہے، امام ذہبی اور حافظ ابن حجر نے بھی اس کو مجہول قرار دیا ہے۔ حافظ عقیلی نے اس اثر کا جو متن نقل کیا ہے وہ درج ذیل ہے:

اثر عمری کا متن:

((شهد رجل عند عمر بن الخطاب، رضي الله عنه بشهادة، فقال: لست أعرفك ولا يضرك

Marfat.com

أن لا أعرف، إيت بمن يعرفك، فقال رجل من القوم: أنا أعرفه قال: بأى شيء تعرفه؟ قال: بالعدالة والفضل، فقال: هو جارك الأدنى الذى تعرف ليله ونهاره ومدخله ومخرجه؟ قال: لا، قال: فعاملك بالدينار والدرهم الذى يُستدل به على مكارم الأخلاق؟ قال: لا، قال: لستَ تعرفه، ثم قال للرجل: إيت بمن يعرفك.))

''عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے پاس ایک شخص نے گواہی دی، انہوں نے فرمایا: میں تمہیں نہیں جانتا اور میرا نہ جاننا تمہارے لیے نقصان دہ بھی نہیں ہے، ایسے شخص کو لاؤ جو تمہیں جانتا ہو، لوگوں میں سے ایک شخص عرض گزار ہوا: میں اسے جانتا ہوں، فرمایا: کس حیثیت سے اسے جانتے ہو؟ عرض کیا: عدالت اور فضیلت کی حیثیت سے، فرمایا: کیا یہ تمہارا قریبی پڑوسی ہے کہ اس کی رات اور دن اور اس کے دخول وخروج سے تم واقف ہو؟ عرض کیا: نہیں، فرمایا: کیا اس نے تم سے دینار ودرہم کا معاملہ کیا ہے جن سے پرہیز گاری کو معلوم کیا جاتا ہے؟ عرض کیا: نہیں، فرمایا: کیا یہ تمہارا رفیق سفر رہا ہے جس سے اخلاق کی بلندی پر استدلال کیا جاتا ہے؟ عرض کیا: نہیں فرمایا: تم اسے نہیں جانتے، پھر گواہی دینے والے شخص سے فرمایا: ایسے شخص کو لاؤ جو تمہیں پہچانتا ہو۔'' ❶

اثر عمری سے وجہ استدلال:

بلاشبہ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ ایک جلیل القدر صحابی تھے اور سبقت الی الاسلام، دین میں استقامت، معاملہ فہمی، لوگوں کی شناخت، حق گوئی اور جرأت وبیبا کی کے حوالہ سے آپ کو صحابہ میں ایک امتیازی مقام حاصل تھا اور اس اثر سے، بشرط صحت کسی انسان کی شناخت اور معرفت کے نہایت اہم اصول معلوم ہوتے ہیں، کل اصول نہیں، بایں ہمہ اس اثر سے ڈاکٹر برنی کا حدیث کی سند میں کمزوری پر استدلال چند وجوہ سے بے محل بھی ہے اور غلط بھی۔

۱۔ سند میں اصلاحی صاحب نے جس خلا اور برنی صاحب نے جس کمزوری کا دعویٰ کیا ہے وہ خود فرضی ہے جس کی کوئی حقیقت نہیں ہے اور خود ان دونوں بزرگوں کے اعتراف سے، محدثین نے راویان حدیث کی جو جرح وتعدیل کی ہے وہ انسانی صلاحیت کی آخری حد کو پہنچی ہوئی ہے'' ایسی صورت میں انسانوں کی پہچان کے اصول عمری پر عمل تحصیل حاصل ہے، بایں معنی کہ یہ عمل ان اصولوں سے زیادہ جامعیت کے ساتھ ادا کیا جا چکا ہے اور سیکڑوں ''ماہرین فن'' نے اتفاقاً نہیں قصداً اور ارادۃً ناقلین حدیث نبوی کے حالات، ان کی عدالت وامانت اور صدق گوئی اور حفظ وضبط کی صفات خود اپنے ذریعہ سے اور حد درجہ بے لوث اور صدق گو متعلقین کی شہادتوں کے ذریعہ معلوم کر کے ثبت کر دی ہیں، اس عمل پر صدیاں گزر چکی ہیں اور ان ناقلین کی سیرتوں پر دسیوں ایسی کتابیں مدون

❶ الضعفاء، ص: ۱۱۴۲، ج: ۳، الکفایہ، ص: ۲۷۷۔۲۷۹، ج: ۱۔

Marfat.com

ہو چکی ہیں جن کے عالی مقام اور گراں قدر مصنفین دوستوں سے پہلے دشمنوں میں مؤیدین سے پہلے مخالفین میں، قدر دانوں سے پہلے ناقدروں میں اور انصاف پسندوں سے پہلے غیر منصفوں میں اپنے علم وفضل، وسعت معلومات، اصابت رائے اور حق پسندی اور غیر معمولی قوت حافظہ کے اعتبار سے شہرت رکھتے ہیں اور ان نفوس قدسیہ نے اپنی خداداد صلاحیتوں کے ساتھ اس مقدس کام کے لیے اپنی عمر مستعار کا بیشتر حصہ وقف کر رکھا تھا اور راویوں کے حالات معلوم کرنے کے لیے ہمہ وقت سفر میں رہتے تھے، چنانچہ مایہ ناز ناقد رجال امام شعبہ اور جرح وتعدیل کے غیر منازع امام ابو حاتم اور ان کے بیٹے ابن ابی حاتم کی پوری زندگی سفر ہی میں گزر گئی، کیا اس کے بعد بھی زمان ومکان کے فاصلوں کی بات اور راویوں کے حالات معلوم کرنے کے لیے سیرت عمری پر عمل کا مشورہ زیب دیتا ہے۔

۲۔ محدثین سیرت عمری نہیں، سیرت مصطفوی کے پابند تھے، اور انہوں نے فرمان الٰہی: ﴿فَتَبَيَّنُوْا﴾ کی اپنی صوابدید کے مطابق تعمیل کا حق ادا کر دیا جس کے وہ اہل بھی تھے، بلاشبہ وہ فرشتہ نہیں تھے، لیکن مسجود ملائکہ ضرور تھے، اور ان کا نصب العین سید البشر ﷺ کی حدیث کی حفاظت تھا جن کی خدمت میں سید الملائکہ باادب حاضر ہوتے تھے اس تناظر میں وہ اس مقدس جماعت میں شامل تھے اور شامل رہیں گے جو اللہ تعالیٰ کی انعام اور فضل یافتہ جماعت تھی (النساء: ٦٩) آپ کا مشورہ کہ: حسن ظن رکھنا اچھی بات ہے، مگر یہ غلو کی حد تک نہیں جانا چاہیے'' سر آنکھوں پر، مگر اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ ان کی ''ناقدری'' کی جائے جس کے مرتکب وہ لوگ ہو رہے ہیں جو ان کی کتابوں کی ایک سطری عبارت سمجھنے کی استعداد بھی نہیں رکھتے، اور خدمت حدیث کی راہ میں ایک قدم بھی نہیں چلے ہیں۔

۳۔ آپ اور آپ جیسے جدید محققین سیرت عمر پر چلنے کی دعوت ''حب عمر'' میں نہیں دے رہے ہیں، بلکہ اس زعم میں دے رہے ہیں کہ محدثین نے راویوں کی جرح وتعدیل تجربے، مشاہدے اور معاملات کے بغیر کر دی ہے۔

۴۔ طلبۂ حدیث پر راویوں کے شہر اور وطن کی معرفت ضروری ہے۔ آپ علوم الحدیث کی کوئی بھی کتاب اٹھا لیجیے اس میں آپ کو ''معرفة أوطان الرواة وبلادهم'' کا باب ضرور ملے گا اس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ محدثین نے راویوں کی ثقاہت وعدم ثقاہت معلوم کرنے کے جتنے طریقے ذہن بشری میں تھے سب پر عمل کیا ہے اور اس راہ پر چلنے والوں کے لیے اس کو لازمی قرار دے دیا ہے، چنانچہ یونس بن محمد مؤدب بغدادی نے لیث بن سعد مصری سے حدیث روایت کی ہے، یونس بن محمد بغداد کے رہنے والے تھے اور ثقہ اور سچے تھے [1] جبکہ لیث بن سعد مصر سے تعلق رکھتے تھے، اور حدیث اور فقہ کے امام تھے حافظ ابو الحجاج یوسف بن زکی مزی (۷۴۲ھ) کے زمانے میں کسی عالم حدیث کے ذہن میں یہ اشکال پیدا ہوا کہ بغداد کے رہنے والے یونس بن محمد نے یہ حدیث مصر کے رہنے

[1] الجرح والتعدیل ص: ۳۰۲، ج: ۹۔

Marfat.com

والے محدث لیث بن سعد سے کہاں اور کیسے سنی؟ اور جب یوسف مزی سے پوچھا گیا تو انہوں نے بتایا کہ لیث بغداد گئے تھے'' ❶

معلوم ہو کہ لیث بن سعد ۱۶۱ھ ہجری میں عراق گئے تھے اور وہاں چند ماہ قیام کر کے حدیث کے حلقات قائم کیے تھے۔ ❷

یہ ایک چھوٹا سا واقعہ ہے، مگر ان منکرین کے منہ پر ایک زوردار طمانچہ ہے جو راوی اور مروی عنہ یا ناقد رجال اور راوی حدیث کے درمیان مکانی فاصلوں کو ''ہوا'' بنا کر ناقدین کے احکام اور راویوں کی مرویات کو نا قابل اعتبار قرار دینے کی سعی مذموم کرتے ہیں۔

مولانا شبلی کی لغزش پا:

عمر فاروق رضی اللہ سے منسوب ایک دوسرا قول کچھ مختلف الفاظ میں بھی منقول ہے، اور خطیب بغدادی نے الکفایہ میں اسے نقل کیا ہے، (نمبر: ۲۲۰) اس کا ترجمہ درج ذیل ہے:

''عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے پاس ایک شخص نے ایک شخص کی تعریف کی، عمر نے اس سے فرمایا: کیا کبھی کسی سفر میں تم اس کے ساتھ رہے ہو؟ اس نے کہا: نہیں، فرمایا: کیا کسی امانت میں اس پر اعتماد کیا ہے؟ کہا: نہیں، فرمایا: کیا کسی حق کے معاملے میں تمہارے اور اس کے درمیان معاملہ ہوا ہے؟ کہا: نہیں، فرمایا: چپ رہو، میرے خیال میں تمہیں اس کے بارے میں کوئی علم نہیں ہے، میرا گمان ہے کہ اللہ کی قسم تم نے اسے مسجد میں سر جھکاتے اور اٹھاتے دیکھا ہے۔'' ❸

اس قول کی نسبت عمر سے پہلے قول سے بھی زیادہ کمزور ہے اس کی سند کا ایک راوی مصاد بن عقبہ ہے جس کو صرف ابن حبان نے ثقہ کہا ہے اور ابن حبان کی توثیق ان کی سہل انگاری کی وجہ سے محدثین کے یہاں مقبول نہیں ہے، اس مصاد نے یہ اثر جس شخص کے حوالہ سے روایت کیا ہے وہ مجہول ہے، اس طرح یہ نا قابل التفات ہے۔

یہ قول مولانا شبلی نے نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ ''احادیث کے باب میں بڑی غلطی جو لوگوں سے ہوئی، یہی تھی کہ اکثر محدثین جس شخص کو ظاہر میں زاہد و پارسا دیکھتے تھے ثقہ سمجھ کر اس سے روایت شروع کر دیتے تھے۔ عبدالکریم بن ابی المخارق جو ایک ضعیف الروایہ شخص تھا اس سے امام مالک نے روایت کی ہے، لوگوں نے پوچھا کہ آپ ایسے شخص سے روایت کرتے تھے؟ فرمایا: ((غرنی بكثرة جلوسه في المسجد.)) ''مسجد میں اپنے بکثرت بیٹھنے سے اس نے مجھے دھوکا دے دیا۔'' ❹

❶ فتح المغیث ص: ۵۱۵، ج: ۴.
❷ سیر أعلام النبلاء، ص: ۴۲۵، ج: ۷.
❸ ص: ۲۷۹، ج: ۱
❹ الفاروق، ص: ۳۶۰.

Marfat.com

مذکورہ بالا عبارت میں جہاں تک مولانا کے پہلے قول کا معاملہ ہے تو یہ ان کی بھول اور لغزش پا ہے۔ راوی کی عدالت میں زہد وتوکل اور کثرت عبادت کا شمار ہی نہیں ہوتا۔ ایسی صورت میں کسی محدث کے بظار کسی زاہد وعابد اور سفید پوشی سے حدیث روایت کرنے کی بات بالکل غلط ہے، خاص طور پر جبکہ اہل تصوف زہد وتوکل، کثرت صوم وصلوٰۃ اور اَوراد و اَذکار کی کثرت کے باوجود روایت حدیث میں کذب بیانی کے لیے مشہور ہو چکے تھے اور محدثین ان کی حقیقت سے واقف ہو چکے تھے، ایسی صورت میں اکثر محدثین کا ان کا ظاہری پارسائی سے دھوکا کھا جانا بعید از وقوع ہے۔

محدثین کے دور میں صوفیا اور زہاد صالحین کے ناموں سے جانے جاتے تھے اور ان کے بارے میں اکابر محدثین کے کیا نظریات تھے ان کا اندازہ علم الرجال کے امام یحییٰ بن سعید قطان کے اس قول سے کیا جا سکتا ہے:

((لم نر الصالحين فی شیء أكذب منهم فی الحديث .))

''ہم نے صالحین کو حدیث سے زیادہ کسی اور چیز میں جھوٹا نہیں دیکھا۔'' ❶

یہی یحییٰ ایک دوسرے موقع پر فرماتے ہیں:

((يجری الكذب علی لسانهم ولا يتعمدون الكذب .))

''جھوٹ ان کی زبانوں پر جاری رہتا ہے اور وہ قصداً جھوٹ نہیں بولتے۔'' ❷

اس قول کا مطلب یہ ہے کہ کذب گوئی ان کی لازمی صفت بن چکی ہے اور جھوٹ بولتے ہوئے ان کو اس کا احساس بھی نہیں ہوتا، اور تصوف کی کتابیں ان کی کذب بیانیوں کی شاہد ہیں۔

عباد بن کثیر بڑا صالح وزاہد شخص گزرا ہے، زہد و ورع اور اعمال خیر میں اس کی مثال دی جاتی تھی، لیکن روایت حدیث میں وہ غیر ذمہ دار اور غیر امین تھا۔ امام مسلم نے اپنی صحیح کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ عبداللہ بن مبارک نے سفیان ثوری سے پوچھا کہ آپ کو عباد کا حال تو معلوم ہے، کیا میں لوگوں سے یہ کہوں کہ وہ اس سے حدیث روایت نہ کریں؟ فرمایا: ہاں۔ (ص: ۳۸)

جس وقت عباد بن کثیر کا انتقال ہوا اس وقت سفیان ثوری مکہ میں تھے، مگر اس کی نماز جنازہ میں شریک نہیں ہوئے، اور امام شعبہ اس کے لیے استغفار نہیں کرتے تھے۔ ❸

کیا ان تفصیلات کے بعد بھی یہ دعویٰ درست ہو سکتا ہے کہ ''اکثر محدثین جس شخص کو ظاہر میں زاہد و پارسا دیکھتے تھے ثقہ سمجھ کر اس سے روایت شروع کر دیتے تھے؟

رہا عبدالکریم بن ابی المخارق سے امام مالک رحمہ اللہ کے حدیث روایت کرنے کا واقعہ تو اپنے ثابت ہونے کے باوجود یہ امام مالک کے معمول پر دلالت نہیں کرتا اور روایت حدیث میں ان کی احتیاط پسندی اور شدت کے منافی بھی نہیں ہے کہ

❶ مقدمہ مسلم: ۳۸. ❷ ص: ۳۹ ❸ فتح المنعم فی شرح مسلم، ص: ۳۸.

Marfat.com

اس کی بنیاد پر کوئی قاعدہ کلیہ بنا لیا جائے اور یہ دعویٰ شروع کر دیا جائے کہ ''اکثر محدثین جس شخص کو ظاہر میں زاہد و پارسا دیکھتے تھے ثقہ سمجھ کر اس سے روایت شروع کر دیتے تھے'' کیونکہ زہد و پارسائی کسی بھی محدث کے نزدیک ثقاہت کی علامت اور دلیل نہیں رہی ہے۔ عبدالکریم بن ابی المخارق سے ان کے حدیث روایت کرنے کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ وہ بصرہ کا رہنے والا تھا اور مکہ کے ایک مدرسہ میں معلم تھا، بظاہر بڑا باوقار اور صاحب جلال تھا، امام مالک کے شہر مدینہ کا باشندہ بھی نہیں تھا اس طرح وہ اس کی اس ظاہری حالت اور مسجد میں اس کی باقاعدہ حاضری اور خشوع وخضوع سے نماز کی ادائیگی سے متاثر ہو گئے، پھر امام مالک نے اس سے جو دو حدیثیں روایت کی ہیں وہ اس کے سوا دوسری سندوں سے مروی ہیں اور صحیح وثابت ہیں، ایک حدیث نماز میں بائیں ہاتھ پر دائیں ہاتھ کے رکھنے کی حدیث ہے۔ ❶

راوی کی عدالت معلوم کرنا انسانی بس سے باہر نہیں:

ڈاکٹر افتخار برنی کا دعویٰ ہے کہ سند کی دوسری کمزوری کا تعلق براہ راست جرح وتعدیل سے ہے، کسی شخص کے کردار کا تعین کرنا کوئی آسان کام نہیں ہوتا، کردار کی تمام پرتوں سے آگاہی انسانی بس سے باہر ہے'' تو یہ دعویٰ حدیث اور محدثین کے بارے میں ان کی بدظنی اور جرح وتعدیل کی حقیقت سے ان کی لاعلمی کا غماز ہے؛ دراصل راوی کی جرح وتعدیل کا اس کی جن صفات سے تعلق ہے ان کے بارے میں مکمل اور اطمینان بخش واقفیت حاصل کرنا محنت طلب تو ضرور ہے، لیکن ناممکن ہرگز نہیں ہے، ورنہ اللہ تعالیٰ نے اس کا حکم نہ دیا ہوتا اس کا اعلان ہے کہ وہ انسانوں کو انہی کاموں کی ذمہ داری سونپتا ہے جن کی وہ استطاعت رکھتے ہوں، قارئین سے درخواست ہے کہ میں نے عدل راوی اور مجروح راوی کے جو اوصاف بیان کیے ہیں ان پر ایک نظر ڈال کر موصوف کے اس دعویٰ پر غور کریں تو ان شاء اللہ ان کو جہاں یہ معلوم ہو جائے گا کہ جن اوصاف کا حامل راوی ثقہ قرار دیا جاتا ہے اور جن اوصاف سے موصوف ہونے کی وجہ سے وہ غیر ثقہ قرار پاتا ہے ان کو معلوم کرنا قطعاً انسانی بس سے باہر نہیں ہے؛ محدثین اپنے زمانے کے تمام لوگوں کے کردار کا تعین کرنے نہیں نکلے تھے، بلکہ صرف ان لوگوں کے حالات معلوم کرنے کی غرض سے نکلے تھے جن کے نام روایت حدیث سے جڑے ہوئے تھے، بسا اوقات کسی انسان سے مختصر سی ملاقات اور اس کے ساتھ محض چند باتیں اس کے عقائد بھی بیان کر دیتی ہیں، روایت حدیث سے متعلق اس کے نقطہ نظر کو بھی واضح کر دیتی ہیں، زہد وورع اور تقویٰ اور پاکیزگی اخلاق کے بارے میں اس کے تصورات سے پردہ بھی اٹھا دیتی ہیں اور لوگوں سے عموماً اور روایت حدیث میں خصوصاً صدق گوئی اور امانت داری کی جو اہمیت ہے اس کے بارے میں اس کے نظریے کو بھی عیاں کر دیتی ہیں، ایسا بھی ہوتا کہ

---

❶ ابن خزیمہ: ۴۷۷، ۴۷۸، ۴۷۹، بخاری: ۷۴۰، ابوداود: ۷۵۵، نسائی: ۸۸۷، ابن ماجہ: ۸۱۱، اور دوسری حدیث حیاء سے متعلق ہے۔ "إذا لم تستحی فاصنع ماشئت" (بخاری: ۳۴۸۴) الجرح والتعدیل، ص: ۷۵-۷۶، ج: ۶، میزان الاعتدال، ص: ۳۸۷-۳۸۸، ج: ۴، فتح المغیث، ص: ۱۸۲، ج: ۲.

Marfat.com

کسی کتاب یا مضمون کا ''تقیہ'' اور تحفظات کے غلاف میں لپٹا ہوا صرف ایک فقرہ اس کے عقائد ونظریات کا پردہ چاک کر دیتا ہے اور ظاہری بات ہے کہ انسان کا کردار اس کے عقائد ونظریات ہی کا ترجمان ہوتا ہے۔

انسانوں کے کردار کے مطالعہ سے متعلق یہ تو عام لوگوں کے انکشافات ہیں، محدثین اور راویان حدیث تو خاص لوگ تھے؛ محدثین اور ائمہ نقد کو تو اپنا مشن معلوم تھا اور اس کی نزاکتوں کا بھی ان کو علم تھا، اسی کے ساتھ وہ امت کے نہایت پاکیزہ، صالح اور فرشتہ صفت انسان تھے اور ان کے مشن سے زیادہ پاکیزہ اور با مقصد مشن کا تصور بھی ذہن انسانی میں نہیں پیدا ہوا تھا، پھر وہ اس مشن کے جسمانی، ذہنی، علمی اور اخلاقی اعتبار سے اہل بھی تھے۔

رہے راویان حدیث تو چاہے وہ صحیح حدیث کے راوی رہے ہوں یا ضعیف اور نا قابل اعتبار حدیث کے چاہے وہ ثقہ رہے ہوں یا ضعیف، دونوں معروف اور خاص لوگ تھے اور دونوں اپنے خاص مقاصد رکھتے تھے اس میدان میں یوں نہیں کود پڑے تھے ان حالات میں جرح وتعدیل تمام اولاد آدم سے متعلق نہیں تھی، خاص لوگوں سے یعنی صرف راویان حدیث سے متعلق تھی اور اپنے اپنے عہد اور زمانے کے محدثین اور نقاد رجال کو اسی زمانے کے راویوں کے حالات معلوم کرنے تھے جن میں سے بہت سے تو ان کے شہروں میں چلتے پھرتے تھے اور جو دوسرے شہروں میں بستے تھے وہ روایت حدیث کے حوالہ سے معروف بھی تھے اور ان تک پہنچنا اور ان کے شب وروز، اخلاق وکردار، عقاید ونظریات اور عدالت وصدق گوئی کو معلوم کرنا بالکل دشوار نہیں تھا، نقاد حدیث کی سیرتیں بھی مدون ہیں ان کو مدون کرنے والے نہایت قابل اعتماد اور مخلص لوگ تھے فضائل ومناقب کے باب میں مبالغہ آرائی تو آجاتی ہے، لیکن اہل نظر کے لیے ان سے حقیقت معلوم کر لینا مشکل نہیں ہوتا۔ کوئی ان عظیم انسانوں کی سیرتوں کو تعصب سے پاک ہو کر پڑھے تو ان کے ادب واحترام سے اس کی گردن خم ہو جائے گی۔

میں نے ابھی جو کچھ بیان کیا ہے وہ ''غلو'' نہیں ہے (برنی) بلکہ ''حقائق مسلمہ'' کا اعتراف ہے۔ اصلاحی، غامدی اور برنی ان سے زیادہ مخلص، بے لوث، منصف، با اہل، اور غیر جانبدار انسانوں کو جانتے ہوں تو ان میں سے صرف ایک نام کی مثال پیش کر دیں، ورنہ پھر محدثین کے کارناموں کو داغدار بنانے کی روش سے باز آجائیں، مجھے یہ معلوم ہے کہ یہ کون لوگ ہیں اور کیا چاہتے ہیں، لیکن میں ان سے اس لب ولہجہ میں صرف اس وجہ سے مخاطب ہوں کہ ان کا دعویٰ ہے کہ یہ مخلص اور موحد مسلمان ہیں اور حدیث کے شرعی مقام کے معترف ہیں۔

حدیث اسلام کا دوسرا شرعی ماخذ ہے اور سیرت پاک مسلمانوں کے لیے اللہ تعالیٰ کا مقرر کردہ مشعل راہ ہے۔ (احزاب: ۲۱) محدثین نے اس حدیث کی حفاظت اور اس کو ہر ملاوٹ سے پاک کرنے اور پاک رکھنے کے لیے جو عظیم کارنامہ انجام دیا ہے ان سے پہلے انسانوں کے ذہنوں میں اس کا تصور تک نہیں آیا تھا، بعض لوگ محدثین کے اس عمل کو ''انسانی صلاحیت'' کی آخری حد سے تعبیر کرتے ہیں۔ پھر اس حدیث کی نقل وروایت اور غیر حدیث کی آمیزش اور

Marfat.com

ملاوٹ سے اس کو پاک رکھنے کی کوششوں کو انسانی طاقت کی آخری حد قرار دیتے ہیں، میرا دعویٰ ہے کہ یہ بات اگرچہ درست ہے، لیکن امر واقعہ کی صحیح تصویر نہیں ہے؛ محدثین کی خدمات حدیث کی صحیح تصویر اور عکاسی یہ ہے کہ یہ اپنے آخری رسول اور محبوب رہنما اور قائد کی حسین ترین اور مطلوب ترین خدمات ہیں، انفرادی طور پر تو ہر محدث کی خدمات میں بعض کمزوریاں مل سکتی ہیں، مگر مجموعی طور پر ان کمزوریوں کو ثابت کرنا جوئے شیر نکالنے کے مترادف ہے۔

محمود ابوریہ، سلیمان ندوی، انور کشمیری، شبلی نعمانی، امین اصلاحی، جاوید غامدی اور افتخار برنی وغیرہ نے نقاد حدیث کی جرح وتعدیل اور حدیث کی صحت وسقم معلوم کرنے کے اہم اور بنیادی ذریعہ سند میں جس خلا یا کمزوریوں کے دعوے کیے ہیں اور ان کو دکھانے کی سعی لاحاصل کی ہے۔ میں ان کو مان لوں گا، مگر اس شرط پر کہ وہ کسی خبر، یا واقعہ یا اولاد آدم میں سے محمد بن عبداللہ فداہ ابی وامی ﷺ کے سوا کسی اور نبی، رسول یا بزرگ کے اقوال وافعال اور سیرت کی حفاظت سے متعلق محدثین کی خدمات کی مثال، کسی اور فرد، جماعت اور قوم کی خدمات کی حوالہ کے ساتھ پیش کر دیں، اگر نہیں کر سکتے اور یقیناً نہیں کر سکتے تو ڈینگیں ہانکنا چھوڑ دیں، ورنہ پھر انکار حدیث کے ساتھ تمام فقہی اقوال، شعر وادب کے تمام ذخیروں، ارسطور وافلاطون کے فلسفوں، بلکہ ان کے ناموں، لغت ومحاورات کے تمام نمونوں، اقوام عالم کی سرگزشتوں، حتیٰ کہ انسانی نسب ناموں کا انکار کر دیں، کیونکہ ان کی حفاظت کے لیے محدثین کے کاموں کا عشر عشیر کام بھی نہیں ہوا ہے۔

(۳)...... سند کا تیسرا خلا، اہل بدعت سے حدیث کی روایت:

مولانا امین احسن اصلاحی کی ''مبادیٔ تدبر حدیث'' کے مطالعہ سے یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ اولاً تو حدیث اور متعلقات حدیث کا ان کا مطالعہ نہایت سطحی اور محدود تھا؛ لے دیکے انہوں نے صرف حافظ بغدادی کی کتاب ''الکفایہ'' پڑھی تھی، ثانیاً: وہ جو کچھ پڑھتے تھے اس میں محدثین کے نقائص اور عیوب تلاش کرتے تھے، مستشرقین نے بھی یہی کیا ہے، لیکن اس اعتبار سے وہ معذور ہیں کہ غیر مسلم اور معاند اسلام ہونے کی وجہ سے حدیث کے ذخیرے کو ناقابل اعتبار قرار دینے کی ان کی کوششیں ان کے مذہبی فرائض میں داخل تھیں، لہٰذا علم کے نام پر انہوں نے جہالتوں کا ارتکاب کر کے اپنا فرض مذہبی ادا کیا ہے، رہے اصلاحی صاحب اور ان کے دونوں شاگرد، غامدی اور برنی تو ان کا شمار تو اسلام اور مسلمانوں کے بہی خواہوں میں ہوتا ہے، پھر انہوں نے کس جذبے سے مستشرقین کی روش اپنائی ہے؟

حافظ بغدادی نے اپنی کتاب "الکفایہ فی معرفة اصول علم الروایہ" جلد اول میں تین ابواب ان عنوانات کے تحت قائم کیے ہیں:

۱۔ ((باب ما جاء فی الأخذ عن أهل البدع والأهواء، والاحتجاج بروایاتهم.)) اہل بدعت اور خواہشات کے بندوں سے حدیث روایت کرنے اور ان کے مرویات سے استدلال کرنے کا باب۔

۲۔ ((باب ذکر بعض المنقول عن ائمه اصحاب الحدیث فی جواز الروایه عن اهل الأهواء

Marfat.com

والبـدع .)) خواہش پرستوں اور بدعتوں کے خوگر لوگوں سے روایت حدیث کے جواز پر اہل حدیثوں کے ائمہ سے جو بعض اقوال منقول ہیں ان کے بیان کا باب۔

۳۔ ((باب التشدد فی أحادیث الأحکام والتجوز فی فضائل الاعمال .)) احکام کی حدیثوں کو لینے میں سخت گیری اور اعمال کے فضائل کی حدیثوں کو لینے میں سہل انگاری کا باب۔

ان تینوں ابواب کے تحت انہوں نے ائمہ حدیث میں سے بعض کے ایسے اقوال نقل کیے ہیں جن میں سے کچھ تو اہل بدعت واہواء کی جملہ روایات مسترد کر دینے پر دلالت کرتے ہیں، کچھ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر بدعتی بدعت کا داعی نہ رہا ہو تو اس کی صدق گوئی پر اعتماد کر کے اس کی مرویات قبول کر لی جائیں گی اور کچھ اہل حدیث یہاں تک گئے ہیں کہ اگر راوی کذب بیانی کا قائل نہ رہا ہو تو اس کی مرویات روایت بھی کی جائیں گی اور ان سے استدلال بھی کیا جائے گا۔

بغدادی نے ان تینوں ابواب کے تحت علمائے حدیث کے جو اقوال نقل کیے ہیں، اولاً: تو ان میں سے بیشتر کی نسبت ان کے قائلین سے صحیح نہیں ہے، ثانیاً: ان سے جمہور محدثین کے مسلک کی نمایندگی نہیں ہوتی، ثالثاً: اہل بدعت سے علی الاطلاق روایت حدیث کا دعویٰ درست نہیں ہے، پہلے میں اصلاحی صاحب کے دعوی کا خلاصہ نقل کر دیتا ہوں پھر امر واقعہ کی روشنی میں اس پر تبصرہ کروں گا، مولانا تحریر فرماتے ہیں:

''سند کی تحقیق میں تیسرا خلا یہ ہے کہ ہمارے ائمہ نے اہل بدعت، خصوصاً شیعہ اور روافض سے روایات لینے میں بڑی مسامحت برتی ہے۔ یہ لوگ دوسرے معاملات میں تو بڑے بیدار ثابت ہوئے ہیں، لیکن صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس معاملہ میں انہوں نے واقعی چشم پوشی سے کام لیا ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ سے متعلق تو بے شک اس معاملہ میں احتیاط منقول ہے، لیکن دوسرے تمام ائمہ: امام شافعی، امام احمد بن حنبل، امام ابوحنیفہ، قاضی ابو یوسف، امام مسلم (۲۳) وغیرہ کے متعلق صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ حضرات اہل بدعت سے روایت لینے میں کوئی قباحت نہیں خیال کرتے تھے۔ بس اتنی احتیاط فرماتے تھے کہ ان کے خیال میں وہ اپنی بدعت کا باقاعدہ داعی نہ ہو، گویا ان کے نزدیک مبتدع سے روایت لینے میں کوئی قباحت نہیں تھی۔

لیکن واقعہ یہ ہے کہ از روئے قرآن، از روئے حدیث اور حدیث کے مجموعی مزاج کے تقاضے کے لحاظ سے مجرد اہل بدعت کے گروہ سے ہونا ضعف کے لیے کافی ہے، اگر چہ راوی اپنی بدعت کا داعی نہ رہا ہو۔'' ❶

جاوید غامدی صاحب نے سند کے مسئلہ میں کچھ زیادہ نہیں فرمایا ہے، بلکہ سند کی تحقیق کے متعلق محدثین کے قائم کردہ معیار کو سراہا ہے اور اس کو قطعی قرار دیتے ہوئے یہ فرمایا ہے کہ ''اس میں کوئی کمی بیشی نہیں کی جا سکتی۔'' ❷

رہے ڈاکٹر برنی تو ان کا ماخذ صرف ''مبادی تدبر حدیث'' ہی ہے، لیکن انداز بیان ایسا ہے گویا انہوں نے علوم الحدیث کی امہات الکتب کا گہرا مطالعہ کرنے اور محدثین کے اعمال کا جائزہ لینے کے بعد سند میں یہ کمزوریاں پائی ہیں۔

❶ ص: ۹۵ ❷ ص: ۷۸

Marfat.com

انہوں نے بھی زیب داستان کے لیے ''الکفایہ'' سے امام احمد کا یہ قول نقل کیا ہے کہ: ''اگر معاملہ فضائل اعمال وغیرہ کا ہو جس سے نہ کوئی حکم قائم ہوتا ہو اور نہ کوئی حکم منسوخ ہوتا ہو تو حدیث کی سند میں ہم تساہل برتتے ہیں۔'' ❶

عرض ہے کہ امام احمد کی طرف منسوب یہ قول جھوٹ اور افترا ہے اس کی سند کے ایک راوی ابوعبداللہ نوفلی کو، جس نے امام احمد سے یہ قول سننے کا دعویٰ کیا ہے، امام ابوزرعہ، امام ابوحاتم اور ان کے بیٹے ابن ابی حاتم نے جھوٹا قرار دیا ہے، امام عبدالرحمٰن بن ابی حاتم فرماتے ہیں: میں نے اپنے والد کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ: ''اس نے ایسے شخص سے بھی روایت کی ہے، جو پیدا بھی نہیں ہوا'' اس کا پورا نام اور لقب ہے: احمد بن خلیل بن حرب بن عبداللہ بن سوار بن سابق قومسی نوفلی۔ ❷

اہل بدعت سے حدیث روایت کرنے اور حدیث لینے میں فرق:

اصلاحی، برنی اور دوسرے منکرین نے یہ تاثر دیا ہے کہ تمام محدثین یا محدثین کی اکثریت اہل بدعت اور گمراہ فرقوں سے تعلق رکھنے والوں سے روایات لینے میں کوئی قباحت نہیں خیال کرتے تھے، تو یہ کئی وجہوں سے امر واقعہ کی صحیح ترجمانی نہیں ہے جس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

۱۔ پہلی بات تو یہ کہ اہل بدعت سے علی الاطلاق روایات لینے کی بات غلط اور امر واقعہ کے خلاف ہے؛ جو بات امر واقعہ ہے وہ صرف اتنی ہے کہ بعض محدثین نے سب نے نہیں بعض مبتدعین سے، سب سے نہیں احادیث روایت کی ہیں اور رویات لی نہیں ہیں، بایں معنی کہ جو بدعتی روایت حدیث میں صدق گو اور سچا تھا بعض محدثین نے، جن میں امام شافعی، امام احمد بن حنبل، امام مالک، امام بخاری، امام مسلم جیسے اکابر شامل ہیں انفرادی طور پر ان سے حدیث روایت کی ہے، اور یہ بھی اعتبار کے لیے زیادہ بطور دلیل بہت کم، اعتبار کے معنی ہیں کہ ایسے راوی کی روایت کردہ حدیث کے متعلق غور و تدبر اور تتبع کر کے یہ دیکھا جاتا تھا کہ اس حدیث کی روایت میں اس سے بہتر کوئی راوی شریک ہے یا نہیں۔ دوسرے لفظوں میں ایسے بدعتی کی روایت کردہ حدیث کو اس سے بہتر سند سے مروی حدیث کی تائید (متابعت) اور موافقت کی غرض سے لیا جاتا تھا، امام مسلم نے اپنی صحیح میں ایسا بہت کیا ہے کہ کسی باب کے تحت پہلے وہ صحیح احادیث لائے ہیں، پھر بعد میں وہ اسی مضمون سے متعلق ایسی حدیثیں بھی لائے ہیں جن کے راوی ثقاہت میں کچھ فروتر ہیں ایسے راوی کو اصطلاح میں ''متابع'' یا ''مقرونا بغیرہ'' کہتے ہیں جس کا مطلب ہے: ایسا راوی جو کسی دوسرے راوی سے مل کر قابل اعتماد ہوتا ہے تنہا نہیں، مثال کے طور پر ایک راوی عبدالمجید بن عبدالعزیز ہے جو تقریباً تمام نقاد رجال کے نزدیک ضعیف ہے، حافظ ابن حجر نے تہذیب التہذیب

❶ روشنی، ۲۹ مئی ۲۰۰۹ء

❷ الجرح والتعدیل ص: ۱۱، ج: ۲، ترجمہ ۴۹، میزان الاعتدال ص: ۲۳۲، ج: ۱، ترجمہ ۳۶۶

Marfat.com

(ص: ۳۸۱، ج: ٦) میں اس کے بارے میں لکھا ہے: "من رجال مسلم" مسلم کے راویوں میں سے ہے، اس سے بعض لوگ یہ سمجھ بیٹھتے ہیں کہ جب یہ مسلم کے راویوں میں سے ہے تو لازماً ثقہ ہوگا۔ اسی وجہ سے راویوں کی صحیح جان کاری کے لیے رجال کی متعدد کتابیں دیکھنی پڑتی ہیں، جس طرح کسی لفظ کی تشریح کے لیے لغت کی کئی کتابیں دیکھنی پڑتی ہیں۔ چنانچہ حافظ ابوالحجاج یوسف مزی نے تہذیب الکمال (ص: ۲۷٦، ج: ۱۸) میں اس کے بارے میں لکھا ہے: "روی لہ مسلم مقرونا بغیرہ" مسلم نے اس کی حدیث دوسرے راوی کے ساتھ روایت کی ہے" اس تعبیر نے بات صاف کر دی، اور کوئی اشتباہ باقی نہیں رہا جس کی تفصیل یہ ہے کہ امام مسلم نے کتاب الحج میں ایک باب باندھا ہے جس کا عنوان ہے:

((لا یحل القارن إلا بعد ما ینحر ھدیہ .))

"قران کرنے والا اپنی قربانی کر لینے بعد ہی احرام سے آزاد ہوتا ہے۔"

اس باب کے تحت امام مسلم رحمہ اللہ پانچ حدیثیں لائے ہیں۔ [1] یہ ساری حدیثیں مختلف سندوں کے ساتھ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہیں اور آخری سند کے علاوہ تمام سندیں بے غبار ہیں، اور اس آخری سند میں عبدالمجید بن عبدالعزیز شامل ہے جس نے یہ حدیث ابن جریج سے روایت کی ہے۔

۲۔ کسی راوی سے حدیث روایت کرنے اور حدیث لینے میں فرق ہے، روایت کے معنی ہیں کہ اس کے حوالہ سے حدیث بیان کر دی اور بس، جیسا کہ امام مسلم نے کیا ہے، لیکن حدیث لینے کے معنی ہیں کہ اس کی روایت کردہ حدیث کو دلیل بنایا ہے ان دونوں میں خلط ملط کر دینے سے جو غلط نتائج نکلتے ہیں وہ بھی اہل نظر پر مخفی نہیں، اصلاحی، برنی اور ان کے ہمنوا فن حدیث سے تو واقف نہیں، اس پر مستزاد یہ کہ محدثین کے کاموں میں جھول اور خلا دکھا کر "ذخیرۂ حدیث" کو مشکوک بنانا بھی ان کے پیش نظر ہے اس لیے ان کے قلم سے صحیح باتیں نکلتی بھی نہیں اور نکل بھی نہیں سکتیں۔

۳۔ جس محدث نے کسی بدعتی سے کوئی حدیث روایت کی ہے یا شاذ و نادر اس کو دلیل بھی بنایا ہے تو اپنی تحقیق کی روشنی میں اس کو روایت حدیث میں صدق گو اور امانت دار پا کر ہی ایسا کیا ہے اور بالکل درست کیا ہے اور حکم الٰہی کے عین مطابق کیا ہے اللہ تعالیٰ نے فاسق کی دی ہوئی خبر ملنے پر اس کو رد کرنے اور ٹھکرانے کا حکم نہیں دیا ہے، بلکہ تحقیق کرنے اور چھان پھٹک کر کے اس کی صحت و سقم معلوم کرنے کا حکم دیا ہے، اور ڈاکٹر برنی کے بقول آیت میں "نبأ" سے مراد اہم خبر ہے، اور یہ معلوم ہے کہ حدیث سے زیادہ کوئی خبر "اہم" نہیں ہو سکتی۔

جن محدثین نے ایسا کیا ہے تو اولاً تو انہوں نے ایسا کسی ضابطہ یا قاعدہ کلیہ کے تحت نہیں، بلکہ اپنی انفرادی

[1] نمبر: ۱۲۲۹، ۱۷٦، ۱۷۷، ۱۷۸، ۱۷۹۔

Marfat.com

تحقیق کے دائرہ میں کیا ہے، ورنہ ''عدالت راوی'' کے معاملہ میں وہ جمہور کے ساتھ ہیں۔ امام مسلم نے اپنی صحیح کے مقدمہ میں ایک عنوان ان الفاظ میں قائم کیا ہے۔

((لا يؤخذ الحديث إلا ممن هو أهله من ثقة وصاحب دين وسنة دون بدعة وأن الإسناد من الدين.))

''حدیث صرف ان لوگوں سے لی جاتی ہے جو قابل اعتماد، دیندار اور سنت کے پیرو ہوں، بدعتی نہ ہوں اور سند بیان کرنا دین میں شمار ہوتا ہے۔''

اس کے بعد ایک دوسرا باب ان الفاظ میں قائم کیا ہے:

((الجرح على الرواة وبيان أحوالهم وكشف معايبهم، وأنه واجب وليس من الغيبة وبيان قبح من يعتد بأحاديث الضعفاء ويرويها.))

''راویوں کی جرح، اور ان کے حالات کا بیان اور ان کے عیوب کی نقاب کشائی فرض ہے، غیبت نہیں ہے، اور اس شخص کا طرز عمل معیوب ہے جو ضعیف راویوں کی روایت کردہ حدیثوں کو درخور اعتناء سمجھتا ہے اور ان کی روایت کرتا ہے۔''

روایت حدیث میں اپنے اس سخت نقطہ نظر اور احتیاط پسندی کے باوجود بعض ضعیف راویوں سے ان کا حدیث روایت کرنا محل اعتراض نہیں ہے، اس لیے کہ ان کی اپنی تحقیق کی رو سے وہ سچے اور امانتدار تھے۔

۴۔ بدعتی اور گمراہ لوگوں میں سچے اور امانت دار اور قابل اعتماد افراد ہو سکتے ہیں، مشرکین کی حق دشمنی مسلم ہے، قرآن پاک میں ان سے ہوشیار رہنے، ان پر اعتماد نہ کرنے اور ان سے بچتے رہنے کی بڑی تاکید آئی ہے اس کے باوجود ان میں قابل اعتماد، حد درجہ سچے، امانت دار اور ہمدرد بھی تھے، ایسے لوگوں کی مثال میں عبداللہ بن اُرقُد (اُریقط) کا نام پیش کیا جا سکتا ہے۔ یہ شخص مشرک تھا، مگر ابو بکر رضی اللہ عنہ کے تجربے اور تحقیق کی رو سے بے حد قابل اعتماد تھا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کے لیے اذن الٰہی کے منتظر تھے ابو بکر رضی اللہ عنہ کو یہ توقع تھی کہ یہ موقع بہت جلد آنے والا ہے اور ان کو یہ امید اور خواہش دونوں تھیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو اپنا رفیق سفر بنائیں گے اس لیے وہ خفیہ طور پر ہجرت کی تیاری کر رہے تھے، انہوں نے عبداللہ بن اُرقد کے حوالہ دو اونٹنیاں کر دی تھیں کہ وہ انہیں کھلائے پلائے اور طویل سفر کے لیے تیار کرے وہ بڑی آسانی سے مشرکین مکہ کو یہ خبر دے سکتا تھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور ابو بکر سفر ہجرت کی تیاریاں کر رہے ہیں اس طرح وہ ان کا محبوب نظر بن سکتا تھا اور بعد میں ان کا انعام بھی حاصل کر سکتا تھا، مگر ابو بکر نے اس کو جس بات کا راز دار بنایا تھا اس کو اس نے اپنوں سے زیادہ اپنے دل میں دفن کیے رکھا، اذن الٰہی کی آمد پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور ابو بکر رضی اللہ عنہ شہر سے نکلے اور غار ثور میں جا کر روپوش ہو گئے اور تین دن روپوش رہے۔ ادھر مکہ

Marfat.com

میں کھل بلی مچ گئی، کفار مکہ نے اولاد آدم کے سردار اور ان کے رفیق سفر کو گرفتار کرنے والے یا ان کے بارے میں پتا دینے والے کے لیے ۲۰۰ اونٹوں کے گراں قدر انعام کا اعلان بھی کر دیا، مگر ابن اُرقد کا دل نبی اور ان کے جاں نثار صحابی کے سفر ہجرت کے راز کا مدفن بنا رہا تین دن بعد وہ اپنی تحویل میں موجود دونوں اونٹنیاں لے کر غار کے پاس پہنچ گیا اور ان کو ساتھ لے کر بحفاظت وسلامتی مدینہ کے لیے روانہ ہو گیا اور نہایت پر امن اور محفوظ راستے سے اللہ کے ان محبوب بندوں کو مدینہ پہنچا دیا اور وہاں سے واپس آ گیا، اور فقیر کا فقیر رہا۔

میں نے یہ واقعہ اس لیے بیان کیا ہے کہ تا کہ یہ واضح کر سکوں کہ عبداللہ بن اُرقد کے اس استثنائی واقعہ سے مشرکین پر عدم اعتماد کے الٰہی حکم پر زد نہیں پڑتی۔

ٹھیک اسی طرح بعض محدثین نے معاشرے کے جن مبتدعین اور نفس پرستوں سے احادیث روایت کی ہیں وہ عام نقاد رجال کے نزدیک تو ضعیف تھے، مگر ان محدثین کی ذاتی تحقیق کی رو سے صادق و امین تھے اور تجربہ یہ بتاتا ہے کہ بدعتوں کا ارتکاب کرنے والے کتنے لوگ مثالی کردار رکھتے ہیں اور صدق گوئی میں اپنا ثانی نہیں رکھتے، اور محدثین کے انفرادی طرز عمل سے عدالت راوی کی شرائط بھی متاثر نہیں ہوتیں۔

حب علی یا بغض معاویہ؟

امین اصلاحی اور ڈاکٹر برنی اپنی تحریروں سے یہ تاثر دینے کے خوگر نظر آتے ہیں کہ انہوں نے حدیث کی کتابوں کا مطالعہ بھی کیا ہے اور وہ فن رجال سے بھی واقف ہیں اور بڑی بڑی کتابوں کے حوالے بھی دیتے ہیں۔ اصلاحی صاحب نے اہل بدعت سے روایات لینے میں امام مالک رحمہ اللہ کو مستثنیٰ قرار دیا ہے ویسے بھی وہ مؤطا اور صاحب مؤطا کے بڑے مداح تھے۔ ڈاکٹر برنی اپنی تحریروں سے یہ تاثر دیتے ہیں کہ وہ مستقل شخصیت کے مالک ہیں اور انہوں نے خود مطالعہ کر کے ''سند حدیث'' میں یہ کمزوریاں معلوم کی ہیں یہ دونوں بزرگ ہیں تو ایک دوسرے کی کاپی، اور ڈاکٹر برنی، جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں قرآن کی کسی آیت اور رسول اللہ ﷺ کی کسی حدیث کا ترجمہ بھی نہیں کر سکتے اس لیے اصلاحی صاحب کی تحریروں سے بے نیاز نہیں ہو سکتے۔ انہوں نے بھی اپنے ''غیر معلن'' امام کی سُر میں سُر ملا کر یہ راگ الاپا ہے کہ ''اہل بدعت سے روایت لینے میں امام مالک یقیناً محتاط تھے'' کیا یہ توارد افکار ہے یا امام بخاری کی پرخاش میں باہمی اتفاق اور ہم خیالی؟ اوپر صحابی سے دو تابعین کے حدیث روایت کرنے سے متعلق امام مسلم کی جس شرط کا دعویٰ انہوں نے کیا ہے اس کو میں ''کنڈم'' کر چکا ہوں اور اس دوسرے دعویٰ کی تردید میں عبدالکریم بن ابی المخارق سے امام مالک کے حدیث روایت کرنے کے واقعہ کو پیش کیا جا سکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں بزرگ اور ان کے ہمنوا اور ہم روش دوسرے اہل قلم برملا تو امام بخاری کو نشانہ بنا کر اپنی رسوائی کا کام نہیں کر سکتے، اس لیے اپنی ''جھوٹی تحقیق'' کے حوالہ سے ان کو نشانہ بناتے ہیں، ورنہ نہ ان کو امام مالک سے

Marfat.com

محبت ہے اور نہ بخاری اور مسلم سے، اور ان کے ان مغالطوں سے عام قاری دھوکا کھا جاتے ہیں، کیونکہ بذات خود صحیح ماخذوں تک ان کی رسائی نہیں ہے۔

شرم ان کو مگر نہیں آتی:

ڈاکٹر برنی کی ڈھٹائی ملاحظہ ہو، فرماتے ہیں:

سند کی ان کمزوریوں کو کہیں زیادہ شدت کے ساتھ خطیب بغدادی، علامہ ابن عبدالبر اور دوسرے علماء بیان کر چکے ہیں ان علماء کو خواہ متاخرین قرار دیا جائے یا معتزلہ کے زیر اثر سمجھا جائے، مگر ان کے دلائل کی مضبوطی سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

جناب والا! اگر آپ Panadol یا Aspirin کی ترکیب اور ان کے طبی خواص بیان فرماتے، تو ہم کہتے کہ ایک طبیب ہونے کے ناطے آپ کا یہ حق ہے، لیکن الکفایہ اور اس کے مصنف کا نام تو آپ کو اپنے امام کی تحریروں سے معلوم ہوا ہے اور اپنی تحریروں میں آپ اپنے الفاظ میں انہی کے دعووں کو دہراتے بھی ہیں، ایسی صورت میں، کیا حدیث کی سند میں اپنی من گھڑت اور فرضی کمزوریوں کے بیان کو ان کی طرف منسوب کرتے ہوئے آپ کو شرم نہیں آئی، شرم وحیا تو مومن کا زیور ہے، پھر آپ نے یہ کیا ستم کر ڈالا کہ بغدادی کے ساتھ آپ نے ابن عبدالبر قرطبی کو بھی گھسیٹ لیا، مزید کچھ بے نام علماء کو بھی، کوئی بھی اپنی متاع حیات کو آگ نہیں لگاتا اور حدیث ان علماء کی متاع حیات تھی اس کی قدسیت میں وہ کیڑے کس طرح نکالتے؟

ڈاکٹر صاحب! میں حدیث کا بہت معمولی سا طالب علم ہوں، مگر جو دعویٰ کرتا ہوں اس کے دلائل کا انبار لگا دیتا ہوں، آپ اور آپ کے امام تو صرف دعوے کرتے ہیں دلائل سے آپ کی جھولی خالی ہے، مستشرقین دین کے دشمن تھے اس کے باوجود جو دعوے کرتے تھے اس کے دلائل دیتے تھے غلط ہی سہی اس لیے کہ جس زاویہ نظر سے ہو انہوں نے حدیث اور علوم الحدیث کا مطالعہ کیا تھا آپ نے جب اتنی بڑی بات زبان سے نکالی تھی تو اس کی تائید میں بغدادی اور قرطبی کی کتابوں سے خود ان کی مختصر عبارتیں نقل کر دیتے۔

بغدادی اور قرطبی نے حدیث کی سند پر کوئی تنقید نہیں کی ہے:

حافظ خطیب بغدادی نے اپنی کتاب الکفایہ میں ائمہ حدیث کے اقوال کی روشنی میں علم روایت کے اصول بیان کیے ہیں، بعض ابواب کے تحت انہوں نے مختصراً اپنے خیالات کا بھی اظہار کیا ہے، رہے ائمہ کے اقوال تو ان میں سے بہت سے اقوال کی نسبت ان کے قائلین سے صحیح نہیں، اور اس کو معلوم کرنا آپ کے امام کے بس میں بھی نہیں تھا اور آپ کے بس میں بھی نہیں ہے اس کتاب میں بغدادی نے علم روایت کے وہی اصول بیان کیے ہیں جو متقدمین کی کتابوں میں موجود ہیں، کتاب کی پہلی جلد کے ص: ۳۶۷ سے ۴۰۰ تک سند حدیث کے بیان سے متعلق ہیں۔ ان صفحات میں انہوں نے حدیث کی سند میں کسی کمزوری، خلا یا عیب کی نشاندہی نہیں کی ہے شدت کے ساتھ بیان کرنا تو دور کی بات ہے،

Marfat.com

دراصل اس کتاب کا موضوع سند حدیث پر تنقید نہیں ہے۔

آپ نے زیب داستان کے لیے یا اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے حافظ ابن عبدالبر، ابوعمر یوسف بن عبداللہ قرطبی کو بھی حدیث کی سند میں کمزوری دکھانے والوں میں شامل کر لیا، جبکہ ان کی کتابوں، "جامع بیان العلم وفضله اور التمهيد" کا موضوع حدیث کی سند میں کسی کمزوری کی نشاندہی نہیں ہے، بلکہ یہ کتابیں، خاص طور پر جامع بیان العلم حدیث کی قدر و منزلت اور محدثین کی خدمات حدیث کے بیان سے عبارت ہے۔ یہ دونوں ائمہ ایک ہی عصر میں تھے، ابن عبدالبر بغدادی سے ۲۴ برس قبل ۳۶۸ھ میں پیدا ہوئے، جبکہ بغدادی ۳۹۲ھ میں، البتہ دونوں کا سال وفات ایک ہی یعنی ۴۶۳ھ ہے، بغدادی کا تعلق بغداد سے تھا اور ابن عبدالبر کا قرطبہ، اندلس سے۔

قرآن وحدیث میں مبتدعین سے حدیث روایت کرنے کی ممانعت نہیں آئی ہے:

امین احسن اصلاحی کو بڑ مارنے کی عادت تھی وہ اپنے شاگردوں کو حدیث سے متنفر کرنے کے لیے حدیث کے خلاف بڑے بڑے دعوے کرنے کے خوگر تھے۔ اس تیسرے "خلا" کے دوسرے فقرے میں فرماتے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ از روئے قرآن، از روئے حدیث اور حدیث کے مجموعی مزاج کے تقاضے کے لحاظ سے مجرد اہل بدعت کے گروہ سے ہونا ضعف کے لیے کافی ہے، اگرچہ راوی اپنی بدعت کا داعی نہ رہا ہو۔" [1]

ان کے خلیفہ ڈاکٹر برنی نے بھی اس دعویٰ میں کچھ مزید شدت پیدا کرتے ہوئے اسے دہرایا ہے۔

ان دونوں بزرگوں سے عرض گزار ہوں کہ اہل بدعت بلاشبہ گمراہ ہیں، لیکن قرآن وحدیث کے حوالہ سے ان کو ضعیف قرار دینا اللہ ورسول پر افترا ہے قرآن نے جس خبر دینے والے کو فاسق کہا ہے وہ مسلمانوں ہی کا ایک گمراہ فرد ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کی دی ہوئی خبر کو مسترد کرنے کے بجائے اس کی تحقیق کرنے کا حکم دیا ہے اور محدثین میں سے جن لوگوں نے کسی بدعتی سے کوئی حدیث روایت کی ہے، یہ تاکید کر لینے کے بعد روایت کی ہے کہ وہ مبتدع ہونے کے باوجود روایت حدیث میں عدل اور امین تھا، رہا اس کا حافظہ اور ضبط تو یہ محل بحث ہی نہیں ہے کیونکہ جو شخص حافظ وضابط نہ رہا ہو اس سے کوئی بھی محدث حدیث روایت نہیں کر سکتا، الا یہ کہ اس نے اپنی کتاب سے حدیث روایت کی ہو، یہاں یہ بتانا تحصیل حاصل ہے کہ اصول روایت محدثین ہی کے وضع کردہ ہیں اور وہ ان اصولوں اور ان کے ساتھ دین کے احکام کو اصلاحی اور برنی سے سے زیادہ جانتے تھے اور ان کو حدیث رسول کی اہمیت کا علم بھی ان سے زیادہ تھا۔

ڈاکٹر برنی کا یہ فرمانا کہ: "اول تو یہ بات ہی ناقابل یقین ہے کہ کسی عقیدے پر قائم رہنے والے اس کے داعی نہ رہے ہوں...... بالفرض اگر مان بھی لیا جائے کہ حدیث کا راوی اپنے بدعتی عقیدے کا داعی نہیں، لیکن اس کی روایتوں سے لازماً اس کے عقیدے کا انعکاس ہوگا" محض ان کی بڑ ہے۔ ایسا ہونا قطعاً لازمی نہیں ہے۔ اولاً تو محدثین نے ایسے

[1] ص: ۹۵

Marfat.com

راویوں سے صرف ایک دو حدیثیں روایت کی ہیں اور وہ بھی ایسی جوان کے عقیدے، بلکہ اسلامی عقائد سے متعلق نہیں تھیں اور بدعتی راوی صرف وہی حدیثیں روایت بھی نہیں کرتے تھے، جن کا تعلق عقائد سے ہو، بلکہ وہ دین کے دوسرے امور سے متعلق بھی ہوتی تھیں، اگر ہم برنی کا یہ دعویٰ مان بھی لیں کہ ''اس کی روایتوں سے لازماً اس کے عقیدے کا انعکاس ہوگا اور عقیدہ بھی وہ جس کے تحفظ کے لیے کسی نہ کسی درجے میں دروغ گوئی کو روا رکھا گیا ہو، تو کیا امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی اور امام احمد رحمہم اللہ جیسے اساطین علم اسلامی عقائد سے اس قدر ناواقف تھے کہ اسلامی عقائد اور غیر اسلامی عقائد میں تمیز نہیں کر سکتے تھے۔ میرے خیال میں ایسا دعویٰ صرف غیر مسلم مستشرق ہی کر سکتا ہے کہ ائمہ اسلام اور اکابر محدثین بھی صحیح اسلامی عقائد نہیں جانتے تھے اور بدعتی راویوں سے ایسی حدیثیں بھی روایت کرتے تھے جن میں غیر اسلامی یا من گھڑت عقائد منعکس ہوتے تھے یا ایسا دعویٰ ''جماعت المسلمین'' کا کوئی فرد کر سکتا ہے جو اپنے عقیدے کے سوا تمام دوسرے عقائد کو باطل سمجھتا ہے اور ان کو ماننے والوں کے پیچھے نماز پڑھنے کو جائز نہیں مانتا، جو اسلام کا پہلا عملی رکن ہے۔

رہی بات دروغ گوئی کی تو اس امر پر محدثین کا اتفاق ہے کہ دروغ گو اور جھوٹا راوی ''ساقط الاعتبار'' ہے۔ البتہ اس امر میں اختلاف ہے کہ کیا عام دنیوی معاملات میں کذب بیانی اور روایتِ حدیث میں کذب بیانی دونوں یکساں درجے میں ہیں، یا ان میں فرق ہے؟ تو اگرچہ کذب بیانی کی ان دونوں قسموں میں انجام کے اعتبار سے فرق ہے، معاملات دنیوی میں لوگوں سے جھوٹ بولنے والا ''فاسق'' ہے، خارج از ملت نہیں ہے اور فسق ''ثقہ راوی'' کی صفتِ عدالت کے منافی تو ہے، لیکن اگر وہ اس بری صفت سے تائب ہو جائے تو اس کی روایت قابل قبول ہے۔

لیکن حدیث رسول کی روایت میں کذب بیانی ایسا جرم ہے جس کی سزا جہنم ہے۔ ایسا شخص نبی ﷺ کی طرف ایسی بات منسوب کر کے جو آپ نے نہیں فرمائی ہے شریعت سازی کرتا ہے جو کفر ہے اور ایسا شخص اس حدیث میں بیان کردہ وعید کا مستحق ہے جس کے راوی صحابہ کی تعداد ۸۰ سے زیادہ ہے اور اس کا یہ عمل مسلمانوں کے اجماع کے خلاف ہے۔ حافظ ابن صلاح اپنے مقدمہ میں تحریر فرماتے ہیں:

((التائب من الكذب فی حديث الناس و غيره من اسباب الفسق تقبل روايته الا التائب من الكذب متعمدا فی حديث رسول الله ﷺ، فإنه لا تقبل روايته أبدا، و إن حسنت توبته علی ما ذكر غير واحد من اهل العلم منهم أحمد بن حنبل و ابو بكر الحميدی شيخ البخاری))

''لوگوں سے بات چیت میں کذب بیانی اور دوسرے اسباب فسق سے توبہ کرنے والے کی روایت قبول کی جائے گی، رہا رسول اللہ ﷺ کی حدیث کی روایت میں جان بوجھ کر جھوٹ بولنے والا تو اس کی روایت کبھی بھی قبول نہیں کی جائے گی، اگرچہ اس کی توبہ صحیح ہو، ایک سے زیادہ اہل علم کا، جن میں احمد بن حنبل اور

Marfat.com

بخاری کے استاد ابو بکر حمیدی بھی شامل ہیں، یہی مسلک ہے۔" ❶

حافظ خطیب بغدادی نے، جو اصلاحی اور برنی کے محبوب مصنف ہیں ان السفہ یسقط العدالۃ و یوجب رد الروایۃ "حق ناشناسی عدالت کو ساقط کر دیتی ہے اور روایت مسترد کر دینے کی موجب ہے" کے باب کے آخر میں امام مالک کا وہ قول صحیح سند کے ساتھ نقل کیا ہے جس میں انہوں نے چار صفات کے حامل راویوں سے روایت قبول نہ کرنے کی تلقین کی ہے۔

۱۔ ایسا حق ناشناس اور بے دین جو اپنی بے دینی کا اعلان کرتا پھرے، اگرچہ وہ حدیثوں کا بہت بڑا راوی ہو۔

۲۔ لوگوں سے بات چیت میں دروغ گوئی کرنے والا جس کی دروغ گوئی کا تجربہ ہو، اگرچہ اس پر یہ الزام نہ ہو کہ وہ رسول اللہ ﷺ پر جھوٹ گھڑتا ہے۔

۳۔ ایسا شیخ جو صاحب فضل اور عبادت گزار ہو، لیکن وہ علم کے بغیر روایت کرتا ہو، یا اس کو یہ نہ معلوم ہو کہ وہ کیا چیز روایت کرتا ہے۔ ❷

امام مالک کا یہ قول نقل کرنے کے بعد بغدادی نے مقابل کے صفحہ پر جو باب قائم کیا ہے اس کا عنوان ہے:

"ان الکذاب فی غیر حدیث رسول اللہ ﷺ ترد روایتہ" رسول اللہ ﷺ کی حدیث کے علاوہ دوسری چیزوں میں دروغ گو کی رویات مسترد کرنے کے قابل ہے۔

پھر نیچے امام مالک کے مذکورہ بالا قول کا حوالہ دینے کے بعد لکھا ہے:

((وَ یَجِبُ اَن یَقْبل حدیثہ اذا ثبتت توبتہ))

"اور اگر اس کی توبہ ثابت ہو جائے تو اس کی روایت کردہ حدیث کو قبول کرنا فرض ہے۔"

پھر وہ تحریر فرماتے ہیں:

"رہا حدیث گھڑ کر اور سماع کا دعویٰ کر کے رسول اللہ ﷺ پر جھوٹ بولنا تو ایک سے زیادہ اہل علم کا قول ہے کہ ایسا کرنے والے کے تائب ہو جانے کے باوجود اس کی روایت کردہ حدیث کو ہمیشہ کے لیے مسترد کرنا فرض ہے۔" ❸

حاصل کلام:

حافظ ابن صلاح اور حافظ خطیب بغدادی کا جو مسلک ان کی کتابوں میں بیان کیا گیا ہے۔ وہی مسلک، حافظ ابن عبدالبر، حافظ محمد بن عبدالرحمٰن سخاوی اور علوم الحدیث کے دوسرے تمام مصنفین نے ائمہ حدیث کی طرف منسوب کیا ہے، جس کا حاصل ہے:

❶ مقدمہ، ص ۲۲ ❷ ص ۳۵۶ ج ۱ ❸ ص ۳۵۲ ج ۱

Marfat.com

۱۔ عام دروغ گو کی روایت اگر وہ اس مذموم صفت سے موصوف رہے، نا قابل قبول ہے، لیکن اگر وہ اس سے صدق دل سے تائب ہو جائے تو اس کی عدالت بحال ہو جائے گی اور اس سے اس کی مرویات سنی اور قبول کی جائیں گی۔

۲۔ حدیث رسول میں کذب بیانی کے مرتکب کی روایت کسی بھی حال میں قبول نہیں کی جائے گی؛ نہ قبل از توبہ اور نہ بعد از توبہ۔

۳۔ جن مبتدعین سے بعض ائمہ حدیث نے جو ایک دو حدیثیں روایت کی ہیں وہ ایسے بدعتی تھے جو کذب بیانی کی مذموم صفت سے پاک تھے۔

۴۔ انسان کی صدق گوئی اور کذب بیانی ایسی صفتیں ہیں جن کو بڑی آسانی سے معلوم کیا جا سکتا ہے اور رسول اللہ ﷺ نے صادق و کاذب کی پہچان کا ایک قاعدہ بھی بیان کر دیا ہے۔ ارشاد نبوی ہے:

((ان الصدق يهدى إلى البر و ان البر يهدى إلى الجنة و إن الرجل ليصدق حتى يكتب عند الله صديقا و إن الكذب يهدى إلى الفجور و إن الفجور يهدى إلى النار و إن الرجل ليكذب حتى يكتب عند الله كذابا))

''درحقیقت صدق گوئی نیکی کی راہ دکھاتی ہے، اور نیکی جنت کی طرف لے جاتی ہے اور ایک آدمی صدق بیانی کو معمول بنا لیتا ہے یہاں تک کہ وہ اللہ کے نزدیک راست رو اور صدق گو لکھ لیا جاتا ہے اور جھوٹ برائی کی طرف لے جاتا ہے اور برائی جہنم کی طرف لے جاتی ہے اور ایک آدمی جھوٹ کا عادی ہو جاتا ہے، یہاں تک کہ وہ اللہ کے نزدیک بہت بڑا جھوٹا لکھ لیا جاتا ہے۔'' [1]

اللہ تعالیٰ کے نزدیک جو لوگ سچے یا جھوٹے ہوتے ہیں اس دنیا میں بھی اپنی ان دونوں صفتوں میں معروف ہو جاتے ہیں۔ کفار مکہ رسول اللہ ﷺ کے شدید مخالف تھے اور ہمیشہ آپ کے درپۂ آزار رہتے تھے اور آپ کو صادق و امین بھی مانتے تھے۔ قرآن پاک کے مطابق قید میں یوسف علیہ السلام کے ساتھی آپ کی صداقت اور نیکوکاری کے معترف اور مداح تھے اور ان قیدی ساتھیوں میں سے رہائی پانے والے ایک قیدی نے جب بادشاہ کے خواب کا واقعہ سنا تو بادشاہ سے یہ درخواست کی کہ وہ اس کو یوسف علیہ السلام سے اس خواب کی تعبیر معلوم کرنے کی اجازت دے اس کو یوسف علیہ السلام کے بارے میں تو کچھ نہیں معلوم تھا، البتہ وہ اپنے اس خواب سے پریشان تھا اور درباری علماء اس کی تعبیر سے اپنی عاجزی کا اظہار اس کو ''خواب پریشاں'' کہہ کر کر چکے تھے۔ اس لیے اس نے اس شخص کو اجازت دے دی، اس نے یوسف علیہ السلام کو دیکھتے ہی آپ کو حدیث میں مذکور اس لقب ''صدیق'' سے مخاطب کیا اور کہا: يوسف أيها الصديق! یوسف اے نہایت سچے!

تابعین، تبع تابعین اور تبع تبع تابعین کے دور میں محدثین کا سب سے بڑا مشغلہ اس حدیث اور اس کے راویوں کی

[1] بخاری: ۶۰۹۴، مسلم: ۲۶۰۷

Marfat.com

ثقاہت وعدم ثقاہت کی بحث وتحقیق، حدیث کا تعلم وتعلیم اور مدارسہ تھا۔ مسلمانوں میں متعدد فرقے پیدا ہو چکے تھے، زمانے کی عام رو سے متاثر ہو کر اور اپنے مذہبی مقاصد کے لیے بھی سبھی حدیث کے تعلم وتعلیم اور تحصیل وروایت میں مصروف ہو چکے تھے، ان میں روایت حدیث میں صدق گوئی اور امانتداری سے موصوف لوگ بھی تھے اور جھوٹے بھی۔ ایسی صورت میں محدثین انہی لوگوں سے حدیثیں روایت کرتے تھے جو لوگ ان کے تجربات اور دوسرے اہل علم وفضل کے تجربات کی روشنی میں صادق وامین تھے۔ امام مسلم نے اپنی صحیح کے مقدمہ میں ایسے متعدد لوگوں کی فہرست دی ہے جن کے ظاہری تقویٰ وصلاح، زہد وتوکل اور دین داری کے باوجود ان سے حدیثیں روایت نہیں کی جاتی تھیں۔ اس لیے کہ وہ روایت حدیث میں صادق وامین نہیں تھے۔ لیکن انہیں میں ایسے بھی تھے جو اگرچہ اقلیت میں تھے، مگر روایت حدیث میں صدق گوئی اور امانت سے موصوف تھے۔ ان سب کے کوائف ''رجال'' کی کتابوں میں مدون ہیں۔

حدیث کا مجموعی مزاج:

امین اصلاحی صاحب کی تحریروں میں دین کے مجموعی مزاج اور حدیث کے مجموعی مزاج کی تعبیر اکثر وبیشتر استعمال ہوئی ہے اس سے ان کی کیا مراد ہے یہ وہ جانیں، روایت حدیث کا مزاج یہ ہے کہ راوی عدالت سے موصوف ہو جس کا بنیادی عنصر ''صدق'' ہے اور محدثین نے اس کی پوری پوری رعایت کی ہے۔

سند کا چوتھا خلا:

اصلاحی صاحب تحریر فرماتے ہیں:

سند کی تحقیق میں چوتھا خلا یہ ہے کہ ہمارے اکابر حدیث نے حلال وحرام کے متعلق حدیثیں قبول کرنے میں فی الجملہ احتیاط برتی ہے، لیکن ترغیب وترہیب اور فضائل وغیرہ کی روایات میں انہوں نے عمداً تساہل برتا ہے، الکفایہ فی علم الروایہ میں امام احمد بن حنبل کا قول نقل ہوا ہے وہ فرماتے ہیں:

> "إذا روينا عن رسول الله ﷺ في الحلال و الحرام و السنن و الأحكام تشددنا في الأسانيد و إذا روينا عن النبي ﷺ في فضائل الأعمال و ما لا يضع حكما و لا يرفعه تساهلنا في الأسانيد))

> ''جب ہم رسول اللہ ﷺ کے حوالہ سے حلال وحرام اور سنن واحکام کے متعلق حدیث روایت کرتے ہیں تو سند کے بیان میں شدت پسندی سے کام لیتے ہیں اور جب فضائل اعمال کی حدیث اور ایسی حدیث روایت کرتے ہیں جو نہ تو کوئی حکم بیان کرتی ہے اور نہ کسی حکم کو کالعدم کرتی ہے تو سند کے بیان میں نرمی سے کام لیتے ہیں۔''

ڈاکٹر برنی صاحب نے بھی امام احمد سے منسوب اس قول کا ذکر فرمایا ہے اور اپنے امام سے زیادہ سخت الفاظ میں

Marfat.com

سند کے مذکورہ فرضی اور من گھڑت خلا پر تنقید کی ہے اور اپنے امام کی ہمنوائی کرتے ہوئے امت میں شرک و بدعت اور صوفیانہ افکار کے رواج پانے کے پیچھے سند کی اس کمزوری -خلا- کو کارفرما بتایا ہے۔

اس مسئلہ میں ان دونوں بزرگوں کا تعاقب کرنے اور صورت واقعہ بیان کرنے سے پہلے اپنے قارئین کے علم میں ایک بار پھر یہ بات لانا چاہتا ہوں کہ یہ دونوں بزرگ اور اصلاحی مکتبۂ فکر سے وابستہ دوسرے اہل قلم، الامین رحم ربی، حدیث اور علوم الحدیث کی کتابوں کا مطالعہ کرتے ہی اس لیے ہیں کہ ان میں ان کو عیوب و نقائص ملیں اور محدثین کے اعمال میں ان کو کمزوریاں نظر آئیں۔

امام احمد کے قول کی استنادی حیثیت:

خطیب بغدادی نے اس مسئلہ سے متعلق جو باب باندھا ہے وہ بڑا مختصر اور صرف دو صفحوں پر مشتمل ہے اور ۴ ائمہ حدیث کے اقوال نقل کیے ہیں؛ ایک قول سفیان ثوری کا ہے، دوسرا سفیان بن عیینہ کا۔ دو اقوال امام احمد کی نسبت سے نقل کیے ہیں اور پانچواں قول ابو زکریا عنبری کی طرف منسوب کیا ہے۔ ان پانچوں اقوال میں سے ۴ کی نسبت ان کے قائلین سے صحیح نہیں ہے۔ صرف ابن عیینہ کا قول ان کی نسبت سے صحیح ہے۔

اس تفصیل سے یہ معلوم ہوا کہ امت کے یہ مجددین اور بہی خواہ اپنے باطل اور گمراہ کن افکار و نظریات کا قصر جن بنیادوں پر تعمیر کرتے ہیں وہ ریت سے عبارت ہوتی ہیں، اس کے باوجود ان کو اپنے علم و مطالعہ پر اس قدر ناز ہے کہ اپنے حق میں یہ اور اس طرح کی تعبیریں اختیار کرتے ہیں: ہمارے نزدیک، ہمارے اصولوں کے مطابق، ہماری معلومات کی رو سے، وغیرہ فاعتبروا یا أولی الأبصار

امام احمد کی طرف منسوب جو قول اوپر نقل کیا گیا ہے اس کے بارے میں اس سے قبل عرض کر چکا ہوں کہ یہ امام احمد پر جھوٹ ہے، کیونکہ اس کا راوی ابو عبداللہ نوفل کذاب تھا۔

بغدادی نے امام احمد کی نسبت سے جو دوسرا قول نقل کیا ہے، اس کے الفاظ ہیں:

((الأحادیث الرقاق یحتمل ان نتساهل فیها، حتی یجیء شیء فیه حکم))

''رقت پیدا کرنے والی حدیثوں کے بارے میں ہمارے نرمی کرنے کا امکان ہے یہاں تک کہ زیر بحث مسئلہ میں کوئی ایسی حدیث آجائے جس میں حکم بیان کیا گیا ہو۔'' [1]

اس قول کی روایت بغدادی نے ''حدثت عن عبدالعزیز بن جعفر'' کہہ کر کی ہے جس کا ترجمہ ہے: عبدالعزیز بن جعفر کے واسطہ سے مجھ سے بیان کیا گیا، یعنی اس شخص کی تصریح نہیں کی ہے جس نے ان سے یہ قول ''عبدالعزیز'' کے حوالہ سے بیان کیا ہے اس طرح یہ قول ساقط الاعتبار ہوگیا۔

[1] الکفایہ: ص ۳۹۸ ج ۱

Marfat.com

اصلاحی صاحب کے پاس الکفایہ کا جو نسخہ رہا ہوگا اس میں بھی ائمہ حدیث کے اقوال بذریعہ سند ہی بیان کیے گئے ہوں گے، مگر وہ چونکہ علم الاسناد سے تہی دامن تھے اس لیے اپنے مطلب کی ہر رطب و یابس چیز نقل کر دیتے تھے، رہے ان کے پیروکار تو وہ طوطے کی طرح ان کی ہر بات نقل کر دینے ہی کو ''علم'' سمجھتے ہیں اور اس کے سہارے بڑے بڑے دعوے کرتے ہیں۔

حافظ بغدادی نے اس زیر بحث باب کے نیچے محدثین کے حوالہ سے جو مسلک بیان کیا ہے وہ ان کے الفاظ میں یہ ہے:

((قد ورد عن غير واحد من السلف انه لا يجوز حمل الاحاديث المتعلقة بالتحليل و التحريم الا عمن كان برئيا من التهمة، بعيد من المظنة و اما احاديث الترغيب و المواعظ و نحو ذلك، فانه يجوز كتبها عن سائر المشائخ))

''اسلاف میں سے ایک سے زیادہ سے یہ بات منقول ہے کہ تحلیل و تحریم سے متعلق احادیث کی نقل و روایت صرف ایسے راوی سے جائز ہے جو کذب بیانی کے الزام سے پاک ہو اور بدگمانی سے دور ہو، رہیں ترغیب و نصائح اور اس قبیل کی احادیث تو تمام شیوخ کے حوالہ سے ان کا لکھنا جائز ہے۔'' (1)

مشائخ: مشیخہ کی جمع ہے اور مشیخہ شیخ کا ہم معنیٰ اور مترادف ہے، اور شیخ تعدیل راوی کا تیسرا درجہ ہے حافظ ابن صلاح جرح و تعدیل کے مسلم اور مستند امام ابن ابی حاتم کے حوالہ سے تحریر فرماتے ہیں:

((الثالثة: قال ابن ابی حاتم اذا قيل: "شيخ" فهو بالمنزلة الثالثة، يكتب حديثه و ينظر فيه، الا انه دون الثانية))

''تعدیل کا تیسرا درجہ: اگر راوی کا ذکر ''شیخ'' کہہ کر کیا جائے تو وہ تیسرے درجے پر ہے اس کی روایت کردہ حدیث غور و فکر کی غرض سے لکھی جائے گی، مگر وہ دوسرے درجے سے کمتر ہے۔'' (2)

یاد رہے کہ دوسرے درجہ کا ''عدل راوی'' وہ ہے جس کا ذکر ائمہ نقد رجال ان الفاظ سے کرتے ہیں: انه صدوق وہ بہت سچا ہے۔ او محله الصدق یا اس کا مقام صدق گوئی ہے او لا باس به یا اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔

امام احمد کا مسلک:

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ اور ان کے شاگرد رشید امام ابن القیم امام احمد کے اقوال، اور مسلک کو معلوم کرنے کا سب سے زیادہ قابل اعتماد ماخذ کا درجہ رکھتے ہیں اور ان دونوں کی حق گوئی اور صدق بیانی مجھ جیسے کم علم کے ''تزکیہ'' کی محتاج نہیں ہے، ابن القیم اپنی معرکۃ الآرا کتاب: اعلام الموقعین میں مرسل اور ضعیف حدیث کو دلیل بنانے سے متعلق امام احمد کے مسلک کو بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

(1) ص ۳۹۸ ج ۱ (2) ص ۸۲

Marfat.com

((الاصل الرابع: الاخذ بالمرسل و الحدیث الضعیف اذا لم یکن فی الباب شیء و هو الذی رجحه علی القیاس، و لیس المراد بالضعیف عنده الباطل و لا المنکر، و لا مافی رواته متهم؛ بحیث لا یسوغ الذهاب الیه و العمل به، بل الحدیث الضعیف عنده قسیم الصحیح، و قسم من اقسام الحسن، و لم یکن یقسم الحدیث الی: صحیح و حسن و ضعیف، بل الی صحیح و ضعیف، و الضعیف عنده مراتب، فاذا لم یجد فی الباب اثرا یدفعه، و لا قول صاحب و لا اجماع علی خلافه: کان العمل به عنده اولی من القیاس.

و لیس احد من الائمة الاربعة الا و هو موافقه علی هذا الاصل من حیث الجملة، فانه ما منهم احد الا و قد قدم الضعیف علی القیاس))

''شرعی مسائل کے بیان کے باب میں ان کے معمول بہ اصولوں میں سے چوتھا اصول یہ تھا کہ وہ مرسل حدیث اور ضعیف حدیث کو لے لیتے تھے، بشرطیکہ اس سے متعارض کوئی دلیل نہ ہو۔ یہی وہ ضعیف حدیث ہے جس کو وہ قیاس پر ترجیح دیتے تھے، اور ان کے یہاں ضعیف سے مراد باطل اور منکر روایت نہیں تھی، اور نہ وہ روایت تھی جس کے راویوں میں کوئی کذب بیانی اور حدیث گھڑنے کا ملزم ہو کہ اس کی طرف رخ کرنا اور اس پر عمل کرنا روا نہیں ہے، بلکہ ان کے نزدیک ضعیف حدیث صحیح حدیث ہی کی ایک قسم اور حسن حدیث کی قسموں میں سے ایک قسم تھی، ان کے یہاں حدیث: صحیح، حسن اور ضعیف میں تقسیم نہیں کی جاتی تھی، بلکہ صرف صحیح اور ضعیف میں تقسیم کی جاتی تھی اور ان کے یہاں ضعیف کے درجات تھے۔ لہٰذا جب وہ پیش آمدہ مسئلہ میں ایسا کوئی صحیح اثر نہیں پاتے جو اس ضعیف حدیث سے مزاحم ہو۔ یا کسی صحابی کا قول، یا اجماع اس کے خلاف ہوتو اس پر عمل کرنا ان کے نزدیک اولیٰ تھا۔

اور ائمہ اربعہ میں کوئی بھی ایسا نہیں ہے جو اس اصول میں اجمالی طور پر ان سے متفق نہ رہا ہو؛ ان میں سے ہر ایک نے ضعیف حدیث کو قیاس پر ترجیح دیا ہے۔'' [1]

اس کے بعد حافظ ابن القیم نے امام ابوحنیفہ، امام شافعی اور امام مالک کا طرز عمل بیان کیا ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا ضعیف حدیث سے متعلق جو طرز عمل تھا اس کا ذکر ''حدیث واحد سے قرآن پر اضافہ'' کے عنوان کے تحت ان شاء اللہ تفصیل سے کروں گا۔

حافظ ابن القیم نے امام احمد کے زمانے میں حدیث کی جن دو قسموں، صحیح وضعیف کے متعارف ہونے کی بات لکھی

---

[1] ص ۵۵-۵۶ ج ۲

Marfat.com

ہے وہی حق ہے۔ اب جبکہ یہ بات واضح ہوگئی کہ ضعیف حدیث وہی ہے جس کو متاخرین کی کتابوں میں ''حسن'' کہا جاتا ہے، اور اس میں کوئی باطل، منکر اور کذب بیانی اور وضع کے ملزم راوی کی روایت کردہ حدیث داخل نہیں ہے، تو اس سے یہ بات بھی معلوم ہوگئی کہ اصلاحی اور برنی نے سند میں چوتھا ''خلا'' دکھاتے ہوئے محدثین پر ترغیب و ترہیب اور فضائل اعمال کے باب میں کمزور روایات پر عمل کرنے کا جو الزام لگایا ہے وہ ان کی بیمار ذہنیت کی پیداوار ہے امام احمد یا اور کوئی محدث نہ معروف اور متداول معنی میں ضعیف روایت کے پھیلانے اور قبول عام بنانے کا مرتکب ہوا ہے اور نہ ترغیب و ترہیب کے باب میں احادیث کی سند میں تساہل برتنے کے قول ہی کی نسبت امام احمد اور اکابر محدثین کی طرف صحیح ہے۔

میں نے الکفایہ میں منقول امام احمد سے منسوب اقوال کی حقیقت بھی بیان کر دی ہے اور اس مسئلہ سے متعلق خود بغدادی کے نقطۂ نظر کو بھی انہی کے الفاظ میں بیان کر دیا ہے اس طرح ان دونوں، اصلاحی اور برنی کے غبارے سے ہوا نکل چکی ہے، لیکن اُردو قارئین کے اطمینان قلب اور ایضاح مزید کے طور پر پہلے ''حسن'' حدیث کی تعریف اور ارباب تصوف کے حلقوں میں فضائل اعمال میں ضعیف حدیثوں پر عمل کے رواج پانے کے اسباب کو بیان کر دینا مناسب خیال کرتا ہوں، تا کہ اکابر محدثین کے دامن کو اس الزام سے پاک کر سکوں۔

حسن حدیث کی تعریف:

حافظ ابن صلاح رحمہ اللہ نے اپنے مقدمہ میں امام ابوعیسیٰ ترمذی صاحب الجامع، اور مشہور عالم حدیث، امام حاکم کے شیخ اور اعلام الجامع الصحیح للبخاری اور معالم السنن لابی داؤد کے مصنف حمد بن محمد بن ابراہیم ابوسلیمان خطابی متوفی ۳۸۸ھ کی تعریفاتِ ''حسن'' کا ذکر کرنے کے بعد پہلے ان کی تعریفوں کے بارے اپنی رائے کا اظہار کیا ہے، پھر حسن اور اس کی قسموں کی خود تعریف کی ہے، چونکہ حافظ ابن صلاح نہایت قانونی زبان لکھتے تھے اور قانون کی زبان جامع ہونے کے ساتھ مختصر ہوتی ہے اور حشو و زوائد سے خالی ہوتی ہے۔ اس لیے اس مسئلہ کی اہمیت اور محدثین پر ضعیف حدیثوں کی ترویج کے الزام کا پردہ چاک کرنے کے لیے میں پہلے ابن صلاح کی عربی عبارت نقل کروں گا، پھر اس کا ترجمہ، پھر اس کے مندرجات کی ضروری وضاحت، فرماتے ہیں:

((قلت: كل هذا مستبهم لا يشفى الغليل، و ليس فيما ذكره الترمذى و الخطابى ما يفصل الحسن من الصحيح، و قد امعنت النظر فى ذلك و البحث جامعا بين اطراف كلامهم، ملاحظا مواقع استعمالهم فتنقح لى و اتضح ان الحديث الحسن قسمان:

احدهما: الحديث الذى لا يخلو رجال اسناده من مستور لم تتحقق اهليته غير انه ليس مغفلا كثير الخطأ فيما يرويه، و لا هو متهم بالكذب فى الحديث، اى لم يظهر منه تعمد الكذب فى الحديث و لا سبب اخر مفسق، و يكون متن الحديث

Marfat.com

مع ذلك قد عرف بأن روى مثله او نحوه من وجه آخر او اكثر حتى اعتضد بمتابعة من تابع راويه على مثله او بما له من شاهد، و هو ورود حديث آخر بنحوه، فيخرج بذلك عن ان يكون شاذا و منكرا و كلام الترمذى على هذا القسم يتنزل.

القسم الثانى: ان يكون راويه من المشهورين بالصدق والامانة، غير انه لم يبلغ درجة رجال الصحيح لكونه يقصر عنهم فى الحفظ و الاتقان، و هو مع ذلك يرتفع عن حال من يعد ما ينفرد به من حديثه منكرا و يعتبر فى كل هذا مع سلامة الحديث من ان يكون شاذا و منكرا سلامته من ان يكون معللا و على هذا القسم يتنزل كلام الخطابى، فهذا الذى ذكرناه جامع لما تفرق فى كلام من بلغنا كلامه فى ذلك.))

''میں کہتا ہوں: یہ سب مغلق اور غیر تشفی بخش ہے، اس سے پیاس نہیں بجھتی؛ ترمذی اور خطابی کی تعریفوں سے حسن حدیث صحیح حدیث سے جدا نہیں ہوتی اور جب میں نے اس مسئلہ کی گہرائی میں نظر ڈال کر اس کی تحقیق کی، علمائے حدیث کے کلام کے گوشوں کو ایک ساتھ جمع کر کے دیکھا اور ان کے استعمالات کا جائزہ لیا تو یہ مسئلہ میرے لیے منقح ہو گیا اور یہ بات واضح ہو گئی کہ حسن حدیث دو قسموں سے عبارت ہے:

ا۔ پہلی قسم وہ حدیث ہے جس کی سند کے راویوں میں سے کوئی ایسا ''پاک دامن'' ہونے سے کم نہ ہو جس کی صلاحیت تو ثابت نہ ہو، لیکن اپنی مرویات میں بے خبر اور بے تحاشا غلطیوں کا مرتکب بھی نہ ہو، اور نہ اس پر حدیث کی روایت میں کذب بیانی کا الزام ہو یعنی اس سے روایت حدیث میں دروغ گوئی کے ارادے کا اظہار نہ ہوا ہو اور نہ موجب فسق کسی اور سبب کا ان تمام باتوں کے ساتھ حدیث کا متن ایسا ہو جو اس اعتبار سے معروف ہو کہ اس کے مانند یا اس سے متقارب متن کسی دوسری ایک سند یا متعدد سندوں سے مروی ہو، تا کہ اس طرح کے راوی کی موافقت، یا اس کے شاہد ہونے سے اس کو تقویت حاصل ہو، یعنی اس طرح کی کوئی اور حدیث اس کی مانند سند سے بھی مروی ہو اور وہ شاذ اور منکر کے دائرے سے نکل جائے۔ ترمذی کی تعریف حسن حدیث کی اسی قسم پر منطبق ہوتی ہے۔

حسن حدیث کی دوسری قسم وہ ہے جس کا راوی سچائی اور امانت داری کی شہرت رکھنے والوں میں سے ہو، البتہ حفظ اور مہارت میں کمی کے باعث صحیح حدیث کے راویوں کے درجے پر نہ پہنچا ہو، اس کے باوجود وہ اس راوی کے مقام سے بلند ہو جس کی منفرد روایت منکر حدیث شمار ہوتی ہے اور ان تمام امور میں قابل اعتبار بات یہ ہے کہ یہ حدیث شاذ اور منکر نہ ہونے کے ساتھ کسی علت کی حامل بھی نہ ہو، اس قسم پر خطابی کی تعریف صادق آتی ہے۔ ہم نے یہ جو بیان کیا ہے وہ ان علمائے حدیث کے کلام کے متفرق گوشوں کا جامع

Marfat.com

ہے جن کا کلام ہم تک پہنچا ہے۔'' ❶

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کے شاگرد حافظ محمد بن عبدالرحمن سخاوی رحمہ اللہ نے حافظ عبدالرحیم بن حسین عراقی کی ''الفیہ'' کی شرح ''فتح المغیث'' کے نام سے چار جلدوں میں لکھی ہے جو بجا طور پر علوم الحدیث کی ''جمہرۃ'' ہے اور الفیہ میں جس کے معنی ہزار اشعار والی کے ہیں، حافظ عراقی نے حافظ ابن صلاح کے مقدمہ کو نہایت مہارت اور خوبصورتی کے ساتھ ایک ہزار اشعار میں ڈھال دیا ہے۔ حافظ سخاوی نے فتح المغیث میں انہیں اشعار کی شرح کی ہے جو ایسی شرح ہے جو علوم الحدیث کے تمام گوشوں کو نہایت خوبصورتی، جامعیت اور حسن بیان کے ساتھ سمیٹے ہوئے ہے اس کتاب میں انہوں نے ایسے اضافے بھی کیے ہیں جو مقدمہ میں نہیں ہیں یا مجمل ہیں۔ ائمہ حدیث کے اقوال نقل کر کے ان میں سے ہر ایک پر تبصرہ کیا ہے، ہر علم کی وضاحت کرتے ہوئے صحیح حدیثوں کی مثالیں دے کر ان کو قریب الفہم بھی بنایا ہے اور آسمان حدیث میں بکھرے ہوئے ستاروں کا تعارف بھی کرایا ہے۔

حافظ سخاوی نے حافظ ابن صلاح کی مذکورہ بالا عبارت میں حسن حدیث کی پہلی قسم کو ''حسن لغیرہ'' اور دوسری قسم کو ''حسن لذاتہ'' بتایا ہے۔ موضوع کی نزاکت کے پیش نظر ذیل میں دونوں قسموں کی آسان اور جامع تعریف کر دینا چاہتا ہوں۔

حسن لذاتہ:

وہ حدیث ہے جس کی سند متصل ہو، اس کے تمام راوی عدالت سے موصوف ہوں، اور وہ علت اور شذوذ سے بھی پاک ہو، مگر اس کے راویوں یا کسی ایک راوی کا حافظہ اور ضبط صحیح حدیث کے راویوں کے حافظہ اور ضبط سے کم تر ہو۔

مثال:

((حدثنا قتيبة: حدثنا ابو الاحوص، عن سماك بن حرب، عن قبيصة بن هلب، عن ابيه، قال: كان رسول الله ﷺ يؤمنا، فينصرف على جانبيه جميعا: على يمينه و على شماله))

''ہم سے قتیبہ نے بیان کیا، کہا: ہم سے ابو الاحوص نے سماک بن حرب سے، انہوں نے قبیصہ بن ہلب سے اور انہوں نے اپنے باپ سے، انہوں نے کہا: رسول اللہ ﷺ ہماری امامت فرماتے تھے اور اپنی دونوں جانب: دائیں اور بائیں گھوم جاتے تھے۔'' ❷

یہ حدیث حسن لذاتہ ہے، اس لیے کہ:

قتیبہ ثقہ ہیں، ابو الاحوص ثقہ ہیں، سماک بن حرب سچے ہیں، قبیصہ مقبول ہیں اور ہلب صحابی ہیں۔

اس طرح اس حدیث کے دو راوی: سماک بن حرب اور قبیصہ بن ہلب صحیح حدیث کے راویوں سے کمتر درجے کے

---

❶ ص ۳۰-۳۱ ❷ ابوداود: ۱۰۴۱، ترمذی: ۳۰۱، ابن ماجہ: ۹۲۹

Marfat.com

ہیں، اس لیے یہ حدیث صحیح کے درجے سے اتر کر حسن کے درجے پر ہوگئی۔ اسی وجہ سے امام ترمذی نے یہ حدیث روایت کرنے کے بعد لکھا ہے:

"حديث هلب حديث حسن" ہلب کی حدیث حسن ہے۔

حسن لغیرہ:

ایسی ضعیف حدیث ہے جو ایک سے زیادہ سندوں سے مروی ہو، بشرطیکہ اس کا ضعف شدید نہ ہو، یعنی اس کا کوئی راوی کذب بیانی اور حدیث گھڑنے کا ملزم نہ ہو۔ کیونکہ ایسی حدیث کو موضوع یا متروک کہا جاتا ہے اور ایسی حدیث نا قابل قبول اور نا قابل استدلال ہے۔ سند کے بہت زیادہ کمزور اور ضعیف ہونے میں یہ بھی داخل ہے کہ اس میں متعدد عیوب -علل- ہوں۔ لہٰذا اگر کسی حدیث کی سند متصل نہ ہو، اس کا راوی ضعیف بھی ہو، اور مجہول بھی تو اس میں تین عیوب -علتیں- جمع ہو گئے۔ لیکن اگر مذکورہ علتوں میں سے اس میں صرف کوئی ایک ہی علت ہو اور وہ ایک سے زیادہ سندوں سے مروی ہو تو دوسری سندوں سے مروی ہونے کی وجہ سے اس کا ضعف قدرے کم ہو جاتا ہے اور اس کو قوت حاصل ہو جاتی ہے۔ ایسی حدیث ''حسن لغیرہ'' ہے جس کا مطلب ہے کہ وہ اپنی ذاتی قوت سے حسن نہیں ہے، بلکہ اس کو حسن ہونے کی صفت دوسری سند، یا سندوں سے حاصل ہوئی ہے۔

حسن لغیرہ کی مثال:

حسن لغیرہ کی مثال میں وہ حدیث پیش کی جاسکتی ہے جو امام احمد نے اپنی مسند میں، امام بخاری کے شیخ حافظ ابوبکر عبداللہ بن زبیر حمیدی نے اپنی مسند میں اور حافظ سعید بن منصور نے اپنی سنن میں اپنے شیخ امام سفیان بن عیینہ کے واسطہ سے روایت کی ہے، فرماتے ہیں:

مجھ سے محمد بن علی بن ربیعہ سلمی نے، عبداللہ بن محمد بن عقیل سے اور انہوں نے جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایات کرتے ہوئے بیان کیا، انہوں نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا:

((يا جابر! اعلمت ان الله أحيا أباك، فقال له: تمن علي، فقال: أرد الى الدنيا فاقتل مرة اخرى، فقال: اني قضيت الحكم انهم اليها لا يرجعون))

''اے جابر! کیا تمہیں معلوم ہے کہ اللہ نے تمہارے باپ کو زندہ کر کے ان سے فرمایا مجھ سے اپنی خواہش بیان کرو، انہوں نے عرض کیا: دنیا میں لوٹایا جاؤں اور دوبارہ قتل کیا جاؤں۔ اللہ نے فرمایا: میں نے یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ وفات پا جانے والے اس کی طرف واپس نہیں کیے جائیں گے۔'' [1]

تو اس سند میں سفیان بن عیینہ ثقہ ہیں، ان کے شیخ محمد بن علی سلمی ثقہ ہیں، لیکن عبداللہ بن محمد بن عقیل کی ثقاہت

[1] مسند امام احمد: ۱۴۹۴۲

Marfat.com

مختلف فیہ، وہ سچے تو ہیں، مگر حافظہ کے کمزور ہیں اس لیے ان کی حدیث ''حسن لذاتہ'' کے درجے پر نہیں پہنچتی۔ لیکن تتبع سے معلوم ہوا کہ یہ حدیث دوسری سندوں سے بھی مروی ہے۔ مثلاً امام ترمذی، امام ابن ماجہ اور امام ابن حبان نے اس حدیث کا مضمون ایک دوسری سند سے روایت کیا ہے جس میں موسیٰ بن ابراہیم بن کثیر نے یہ حدیث طلحہ بن خراش سے اور انہوں نے جابر بن عبداللہ سے۔ موسیٰ بن ابراہیم حافظہ کے تو کمزور تھے لیکن سچے تھے۔ اس طرح اس دوسری سند کی وجہ سے مثال میں پیش کردہ حدیث ''حسن لغیرہ'' کے درجہ پر پہنچ گئی۔ مگر اس کو یہ درجہ اس کی ذاتی قوت سے نہیں ملا، بلکہ دوسری حدیث سے ملا، اس لیے اس کو ''حسن لذاتہ'' کے بجائے ''حسن لغیرہ'' کہا جاتا ہے۔ ❶

امام احمد اس حسن حدیث کو اس کی دونوں قسموں کے ساتھ قیاس اور رائے پر ترجیح دیتے تھے، کیونکہ اولاً تو اس کی، قیاس ورائے کے مقابلے میں ایک شرعی حیثیت تھی ثانیاً قیاس ورائے کے بکثرت استعمال سے حدیث پر عمل کم ہوتا جا رہا تھا اور اس کا شرعی مقام دلوں اور نگاہوں میں گھٹتا جا رہا تھا، جبکہ یہ قرآن ہی کے مساوی شرعی ماخذ ہے اور اس کو اللہ تعالیٰ ہی نے رسول کی اطاعت اپنی اطاعت کی طرح فرض قرار دے کر یہ حیثیت دی ہے۔

تعدد طرق سے ہر ضعیف حدیث کا ضعف دور نہیں ہوتا:

سطور بالا میں سندوں میں تعدد اور کثرت کے اثرات سے متعلق جو طویل بحث کی گئی ہے اس سے غلط نتیجہ نکالنے کا سدباب کرنے کے لیے اس اہم سوال کا جواب دے دینا بھی ضروری ہے کہ ''کیا ہر ضعیف حدیث متعدد سندوں سے مروی ہونے کی وجہ سے ''حسن لغیرہ'' ہو جاتی ہے؟

حافظ ابن صلاح اس کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

> ''ایسا نہیں ہے کہ حدیث میں موجود ہر ضعف اور کمزوری دوسرے طرق اور سندوں سے اس کے مروی ہونے سے دور ہو جاتی ہے، بلکہ اس ضعف کے درجات ہیں، مثلاً: حدیث میں ایسا ضعف بھی ہوتا ہے جو راوی کے حافظ کی کمزوری کا نتیجہ ہوتا ہے، جبکہ اس کا شمار اہل صدق وامانت میں ہوتا ہو، تو ایسے راوی کی روایت کردہ حدیث کو جب ہم دیکھتے ہیں کہ وہ کسی دوسری سند سے بھی مروی ہے تو ہمیں پتا چل جاتا ہے کہ اس نے اپنی حدیث یاد رکھی تھی اور اس کے ضبط میں کوئی خلل واقع نہیں ہوا تھا۔
>
> اسی طرح اگر حدیث ''مرسل'' ہونے کی وجہ سے ضعیف ہو اور ''ارسال'' کرنے والا کوئی امام اور حافظ ہو تو یہ بہت معمولی ضعف ہے جو اس کے دوسری سند یا سندوں سے مروی ہونے سے دور ہو جاتا ہے، لیکن حدیث میں ایسا ضعف بھی ہوتا ہے جو اتنا گہرا اور قوی ہوتا ہے کہ اس کی دوسری سند اس کو دور کرنے کی قدرت نہیں رکھتی، بطور مثال: اگر حدیث راوی کے جھوٹا ہونے اور شاذ ہونے کی وجہ سے ضعیف ہو تو ایسی حدیث متعدد

❶ ترمذی ۳۰۱۰، ابن ماجہ ۲۸۰۰، ابن حبان ۷۰۲۲

Marfat.com

طرق اور سندوں سے مروی ہونے کے نتیجے میں "حسن لغیرہ" نہیں ہوگی اور ضعیف کی ضعیف ہی رہے گی۔" ❶

اس مسئلہ کو واضح کرتے ہوئے علامہ احمد محمد شاکر تحریر فرماتے ہیں:

"اگر حدیث اس وجہ سے ضعیف ہو کہ اس کا راوی فاسق ہے یا اس پر کذب بیانی کا الزام ہے تو اگر یہ حدیث اس طرح کے متعدد طرق سے مروی ہو پھر بھی اس کا یہ عیب باقی رہے گا، بلکہ کثرتِ طرق سے اس کا یہ ضعف بڑھ جائے گا، اس لیے کہ جن لوگوں پر جھوٹ بولنے کا الزام ہے یا جن کی عدالت داغ دار ہو ان کا کسی حدیث کی روایت میں منفرد ہونا ان کی حدیث کے اعتبار کو ختم کر دیتا ہے۔" ❷

فضائل اعمال کے باب میں ضعیف حدیث پر عمل:

حسن حدیث کی دونوں قسموں، حسن لذاتہ اور حسن لغیرہ کی بحث سے یہ بات واضح ہو گئی ہو گی کہ ائمہ حدیث کے یہاں ضعیف حدیث کی جو قسم درخور اعتنا سمجھی گئی ہے، وہ صرف وہ ہے جس کا راوی عدالت کی تو تمام صفات سے موصوف رہا ہو، البتہ اس کا حافظ یا تو صحیح حدیث کے راویوں کے حافظہ کے معیار کا نہ رہا ہو یا کچھ کمزور رہا ہو۔ اس کو بعد کے اہل حدیث علماء نے جن کے سرفہرست مستند اور متقدمین و متاخرین کے علوم کے جامع محدث حافظ ابن حجر رحمہ اللہ ہیں، ایسی ضعیف حدیث بتایا ہے "جس کا ضعف بہت شدید نہ ہو" اس ضعیف حدیث کے علاوہ ضعیف کی بقیہ دوسری قسمیں، مثلاً: مرسل، موقوف، مقطوع، منقطع، معضل، مضطرب، معلل، شاذ، منکر اور مقلوب وغیرہ مردود ہیں جن کے سرفہرست موضوع ہے۔

مسلمانوں کے جس طبقہ میں فضائل اعمال کے باب میں ضعیف حدیث پر عمل کا موضوع سب سے پہلے زیر بحث آیا، اور پھر اس نے ایک قاعدہ کلیہ کی شکل اختیار کر لی وہ صوفیا کا طبقہ ہے۔ صوفیا کے بارے میں جس بات کو میں مسلسل دہراتا آ رہا ہوں اور جو ان کی کتابوں کے گہرے، سنجیدہ اور وسیع مطالعہ کا نتیجہ ہے، یہ ہے کہ اس طبقہ کے عقائد اور اعمال حق اور باطل اور اسلام اور غیر اسلام کا ملغوبا ہیں، اگر صوفیا میں کچھ لوگ آپ کو سنت پر عمل پیرا ملیں تو یہ مت سمجھئے کہ ایسا وہ سنت کی محبت میں کر رہے ہیں، بلکہ اس کا سبب یہ ہے کہ سنت کی جو باتیں ان کے من گھڑت اور خود ساختہ عقائد اور اعمال کے مطابق ہو گئی ہیں ان پر وہ سنت رسول ﷺ کی محبت اور احترام میں عمل نہیں کر رہے، بلکہ اس وجہ سے عمل کر رہے ہیں کہ یہ ان کے مشائخ کا معمول بہ تھیں اس کو میں ایک مثال سے واضح کر دینا چاہتا ہوں:

منکرین حدیث، سنت اور حدیث کا مطالعہ اس میں عیوب اور نقائص تلاش کرنے کے لیے کرتے ہیں اور صوفیا قرآن اور حدیث دونوں کا مطالعہ اپنے باطل عقائد و نظریات اور اپنے مشائخ سے منقول اعمال، اوراد و اذکار اور ریاضتوں کے دلائل تلاش کرنے کے لیے، اس وجہ سے تصوف کی کتابیں اور ان کے مشائخ کے فضائل و مناقب کی تصنیفات جھوٹی روایتوں کا پلندا ہیں، اور صوفیا کی اکثریت کا تعلق چونکہ اشعری اسکول کے متکلمین یا ماتریدی متکلمین سے

❶ ص ۳۱-۳۲ ❷ الباعث الحثیث ص ۵۰۔

Marfat.com

رہا ہے اور ہے اس لیے ان کی کتابوں میں قرآن و حدیث کی نصوص کی تاویلات -بمعنی تحریفات- کی بھر مار ہے۔

مذکورہ وضاحت کی روشنی میں فضائل اعمال کے باب میں ضعیف حدیث پر عمل کے خیال کے صوفیا کے حلقے میں رواج پانے کے سبب کو سمجھنا آسان ہو جاتا ہے۔

ضعیف حدیث پر عمل کے بارے میں ابن العربی کا نقطۂ نظر:

ضعیف حدیث پر عمل کے مسئلہ میں جس عالم نے سب سے پہلے اپنی رائے کا برملا اعلان کیا ہے وہ مالکی مفسر اور فقیہ قاضی ابوبکر بن العربی متوفی ۵۴۲ھ ہیں انہوں نے ضعیف حدیث پر عمل کو علی الاطلاق ممنوع قرار دیا ہے اور اپنے شاگردوں کو ہدایات دیتے ہوئے فرمایا ہے کہ وہ ایسی حدیث سے کوئی وابستگی نہ رکھیں جس کی سند ضعیف ہو۔" ❶ انہوں نے اپنی کتاب عارضۃ الاحوذی شرح الترمذی میں مشہور زاہد عالم حدیث ابوعبداللہ حارث بن اسد محاسبی بصری متوفی ۲۴۳ھ کی ضعیف احادیث سے استدلال پر سخت گرفت کی ہے۔ ❷ یہ ابوبکر بن العربی ملحد اور زندیق صوفی اور وحدۃ الوجود کے داعی محی الدین ابن عربی متوفی ۶۳۸ھ کے علاوہ ہیں۔

قاضی ابوبکر بن العربی کا قول ہے کہ: فضائل شارع سے حاصل کیے جاتے ہیں۔ لہٰذا ضعیف احادیث کے ذریعہ ان کا اثبات نئی عبادت کی ایجاد اور ایسی شریعت سازی ہے جس کی اجازت اللہ تعالیٰ نے نہیں دی ہے۔ ❸

نووی کا نقطۂ نظر:

امام ابوزکریا محی الدین نووی متوفی ۶۷۶ھ نے قاضی ابن العربی کے بالکل برعکس ضعیف حدیث پر عمل کو پہلے تو جائز بتایا، پھر اس عمل کو مستحب قرار دے ڈالا، انہوں نے مقدمہ ابن صلاح کا اختصار کرتے ہوئے اس مسئلہ میں اپنی طرف سے ایسے اضافے کیے جو غیر مقبول ہیں۔ حافظ ابن صلاح نے اپنے مقدمہ میں ضعیف حدیث پر عمل سے متعلق بعض محدثین کے اقوال بڑے تحفظات کے ساتھ نقل کیے تھے اور اس ارادے سے کہ ان کی یہ شاہکار کتاب رہتی دنیا تک اہل حدیث کے لیے "اصل ماخذ" بنی رہے، ضعیف حدیث کو معمول بہ بنانے کا سد باب کرنے کی غرض سے ایسی تعبیرات اختیار کرنے سے گریز کیا جو بعد میں "ایجاد بدعت" کا باعث بنیں یا ان کی آڑ میں کوئی مبتدع دین میں بدعت کو مقبول عام بنا سکے۔

لیکن نووی نے اس کو مقبول عام بنا دیا۔ اگرچہ انہوں نے اپنی بیشتر کتابوں میں، مثلاً: "الاربعین" اور "المجموع" میں اس کو جائز بتایا تھا، مگر "الاذکار" میں اس کو مستحب قرار دے ڈالا۔

امام نووی دین میں "بدعت" کے جس قدر خلاف تھے اس کو ہر خاص و عام جانتا ہے اور المجموع میں انہوں نے مبتدعین اور ان کی ایجاد کردہ بدعتوں کی جس طرح خبر لی ہے وہ قابل تعریف اور قابل ستائش ہے، لیکن علم حدیث میں اپنی

---

❶ فتح المغیث ص ۱۵۴ ج ۲، احکام القرآن ص ۵۸۰ ج ۲ ❷ ص ۲۰۱-۲۰۲ ج ۵ ❸ الفتح المبین ، ص ۳۶
❹ ص ۳......ص ۵۹ ج ۱......ص ۸

Marfat.com

گہری نظر کے باوجود انہوں نے ضعیف حدیث پر عمل سے متعلق جس نقطۂ نظر کا اظہار کیا، اس نے ضعیف اور ساقط روایتوں کو ماخذ شریعت بنانے والوں کے ''مشن'' کو شرعی رنگ دے دیا اور ضعیف حدیث پر عمل کی کوئی شرط نہ بیان کر کے اہل بدعت صوفیا کے لیے ضعیف حدیث کی ہر قسم پر عمل کے دلائل فراہم کر دیے، جبکہ اس مسئلہ میں بعض علماء نے صرف ایسی ضعیف حدیث پر عمل سے متعلق سہل انگاری کا اظہار کیا تھا جو بہت زیادہ ضعیف نہ ہو، جیسا کہ آگے بیان کروں گا۔

نووی کے بعد جو لوگ آئے ان میں اس مسلک اور نقطۂ نظر کے حامی انہی کے خرمن کے خوشہ چین تھے اور ان کی اکثریت کی وجہ سے ضعیف حدیث پر عمل کے خلاف آواز اٹھانے والوں کی آواز نقار خانے میں طوطی کی آواز ''ثابت ہو رہی تھی، اس لیے کہ اس وقت ہر جگہ صوفیا کی کثرت ہو چکی تھی اور ان کے عقائد سے لے کر تزکیۂ نفس کے اعمال تک تقریباً ہر چیز خود ساختہ اور من گھڑت تھی جس کو شرعی رنگ دینے کے لیے ضعیف حدیثوں سے استدلال عام ہوتا چلا گیا، اس پر ستم بالائے ستم یہ ہوا کہ موضوع، باطل اور منکر روایتیں بھی ''ضعیف'' کے نام سے شرعی اعمال کا ماخذ بنا لی گئیں اور میں نے اوپر ضعیف کی جو مردود قسمیں گنوائی ہیں وہ منظر سے غائب ہو گئیں۔

حافظ ابن حجر کا کارنامہ:

حافظ ابن حجر متوفی ۸۵۲ھ متقدمین اور متاخرین علمائے حدیث کے علوم کے جامع، تقریباً تمام مستند و غیر مستند کتب حدیث سے مطلع، صحیح بخاری کے رمز شناس اور منفرد شارح، اور علوم الحدیث کی باریکیوں پر گہری نظر رکھنے والے ایسے محدث اور حافظ حدیث گزرے ہیں جن کی عظمت کے قائل ان کے حامیوں سے پہلے ان کے مخالفین ہیں۔ ان کے عہد میں عقائدی اور عملی بدعتوں کا زور تھا، مسلکی تعصب اپنی انتہا کو پہنچ چکا تھا، صوفیا نے جھوٹی اور بے بنیاد روایتوں کا انبار لگا دیا تھا ایسے وقت میں انہوں نے ضعیف حدیث پر عمل کی ایسی شرائط وضع کیں جو متقدمین ائمہ حدیث کی آراء کی ترجمان اور کتاب وسنت کی تعلیمات کی غماز تھیں، انہوں نے اس مسئلہ میں فضائل اعمال اور ضعیف حدیث دونوں کا تعین کر کے ان ناعاقبت اندیشوں کی من مانیوں کے سامنے آہنی بند باندھ دیا جو علی الاطلاق ضعیف حدیثوں کو ماخذ شریعت بنائے ہوئے تھے۔

حافظ سخاوی حافظ ابن حجر کے شاگرد تھے، انہوں نے ''الفیہ العراقی'' کی اپنی شاہکار شرح ''فتح المغیث'' میں مختصراً اور القول البدیع میں تفصیلاً اپنے شیخ کی وضع کردہ یہ شرائط بیان کی ہیں، فتح المغیث میں چند علماء کے اقوال نقل کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں:

> ''ہمارے شیخ نے ہمیں بتایا ہے کہ ''اس ضعیف حدیث پر عمل جائز ہے جس کا ضعف شدید نہ ہو اور یہ حدیث اس معمول بہ اصل عام کے تحت ہو جس سے روکنے والی کوئی خاص دلیل نہ ہو اور اس حدیث پر عمل کرنے والا اس کے ثابت ہونے کا اعتقاد نہ رکھے۔'' [1]

[1] ص ۱۵۴ ج ۲

Marfat.com

وضاحت:

جس ضعیف حدیث کا ضعف شدید نہ ہوا ایسی ضعیف حدیث ہے جس کی روایت میں کوئی ایسا راوی منفرد نہ ہو جس کا شمار جھوٹوں، اور کذب بیانی کے ملزموں میں ہوتا ہو اور اسی طرح وہ روایت میں بے تحاشا غلطیوں کا مرتکب بھی نہ ہوتا رہا ہو، اس پر خلیل بن کیکلدی علائی متوفی ۷۶۱ھ نے علمائے حدیث کا اتفاق نقل کیا ہے۔ ❶

سخاوی نے القول البدیع میں ان شرائط کو قدرے تفصیل سے بیان کیا ہے:

۱۔ ضعیف حدیث پر اس اعتقاد سے عمل نہ کیا جائے کہ وہ ثابت ہے، بلکہ از راہ احتیاط عمل کیا جائے۔

۲۔ ضعیف حدیث کا موضوع اعمال کے فضائل ہوں (یعنی ایسے اعمال کے فضائل جو شرعاً ثابت ہوں اور یہ فضائل صحیح حدیث میں بیان کردہ فضائل سے کچھ زیادہ ہوں، ورنہ بصورت دیگر عمل کرنے والا مبتدع قرار پائے گا۔

۳۔ ضعیف حدیث پر عمل کرنے والا اس کو مشتہر نہ کرے تاکہ وہ ایسے عمل کو شرعی حیثیت دینے والا نہ قرار پائے جو مشروع نہیں ہے۔

۴۔ کوئی صحیح حدیث اس ضعیف حدیث کی مخالف نہ ہو۔

۵۔ ضعیف حدیث پر عمل کرنے والا یہ اعتقاد نہ رکھے کہ وہ اپنے اس عمل کے ذریعہ سنت پر عمل پیرا ہے۔ ❷

ان شرائط کی روشنی میں ضعیف حدیث پر عمل ''عبث'' قرار پاتا ہے قطع نظر اس کے کہ اس کا تعلق فضائل سے ہے یا عقائد اور احکام سے اور اگر اس کے ساتھ یہ بات بھی شامل کر لی جائے کہ ضعیف حدیث کے درجات اور اس کے ضعف کے اسباب معلوم کرنے کے لیے جن علوم میں مہارت درکار ہے ان سے حدیث کا علم رکھنے والوں میں بھی بہت کم لوگ بہرہ ور رہے ہیں، اور ہیں اور آئندہ رہیں گے، لہٰذا مناسب یہی ہے کہ جن حدیثوں کو معتبر علمائے حدیث نے ضعیف قرار دے دیا ہے ان سے دور رہا جائے اور اگر کسی ضرورت سے ان کا ذکر کیا بھی جائے تو ان کو یقینی صیغوں میں نبی ﷺ کی طرف منسوب کرنے کے بجائے اس طرح کی تعبیریں اختیار کی جائیں: روایت ہے، بیان کیا جاتا ہے، روایت میں آیا ہے وغیرہ۔

نتیجہ بحث:

اصلاحی صاحب اور برنی صاحب نے اکابر محدثین، خاص طور پر امام اہل سنت و جماعت: امام احمد بن حنبل پر امت میں جھوٹی روایات کے پھیلنے کے اسباب فراہم کرنے کا جو الزام لگایا تھا میں نے گزشتہ صفحات میں اس کی حقیقت بیان کر دی ہے جس پر ایک نظر ڈال کر قارئین یہ یقین حاصل کر سکتے ہیں کہ امت میں جھوٹی اور بے بنیاد روایات کے پھیلنے اور پھیلانے میں ان اکابر کا کوئی ہاتھ نہیں رہا ہے، بلکہ یہ کام ان گمراہ فرقوں نے انجام دیا ہے جو اسلام اور مسلمانوں

❶ یحیٰی معلمی: مجموع الرسائل الحدیثیہ: ۱۶۴　❷ ص ۲۵۸

Marfat.com

ہی سے منسوب تھے، مگر ان کے عقائد اور اعمال کا بڑا حصہ کتاب وسنت سے ماخوذ نہیں تھا۔ بلکہ ان کا اپنا وضع کردہ تھا، یا ان کا ماخذ یونانی اور ہندوستانی فلسفہ تھا۔ یا اہل کتاب کے راہبوں، ہندو سادھوؤں اور بدھ بھکشوؤں کے عقائد، عبادات اور روحانی ریاضتوں سے ماخوذ تھا۔ ان جھوٹی اور بے بنیاد روایتوں کو گھڑنے اور رواج دینے میں اہل تصوف نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ ہمارے اکابر محدثین نے تو احادیث کے ذخیرے سے ان جھوٹی روایتوں کو نکالنے اور چھانٹنے کا کام کیا ہے۔

روایت بالمعنیٰ کا ہوّا:

اصلاحی صاحب نے بزعم خویش حدیث میں صدق وکذب کے پہچاننے اور پرکھنے کے اصول بیان کرتے ہوئے حدیث کی سند میں جو خلا دکھانے کی کوشش کی تھی اور جس کو ان کے خلیفہ نے سند کی کمزوریوں سے تعبیر کیا ہے، ان میں سے ہر خلا اور ہر کمزوری کا جواب دلائل کی زبان میں دے دیا گیا ہے، ان کی نظر میں حدیث کے صدق وکذب کے فیصلے میں سند کی طرح حدیث کا متن بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے جس کو بیان کرنے کے لیے انہوں نے ایک باب ''روایت بالمعنیٰ اور اس کے مضمرات'' کے عنوان سے قائم کیا ہے، فرماتے ہیں:

> ''اب ہم متن حدیث پر بحث کریں گے، تاکہ اس کے بعض کمزور پہلوؤں کی نشاندہی کی جائے اور وہ فطری طریقے تجویز کیے جائیں جو تحقیق حق میں معین ثابت ہو سکتے ہیں۔''

اس باب کے تحت بھی ان کا سارا مدار حافظ خطیب بغدادی کی کتاب الکفایہ کے باب: ذکر الحجة فی اجازة الحدیث بالمعنی و باب ذکر من کان یذهب الی اجازة الروایة علی المعنی پر ہے۔

انہوں نے روایت بالمعنی کی مشروط اجازت کے زیر عنوان دو مرفوع حدیثیں، تین موقوف روایتیں اور تین مقطوع روایتیں نقل کی ہیں جن میں سے دونوں مرفوع حدیثیں اور دونوں دو موقوف روایتیں تو جھوٹ ہیں، صرف انس بن مالک رضی اللہ عنہ کا موقوف اثر صحیح ہے جو زیر بحث موضوع سے غیر متعلق ہے۔ یہی حال مقطوع روایتوں کا بھی ہے ان سب کی استنادی حیثیت میں بعد میں واضح کروں گا۔

اصلاحی صاحب نے روایت بالمعنی میں غلطی کا احتمال کے زیر عنوان براء بن عازب رضی اللہ عنہ کی جو حدیث نقل کی ہے وہ روایت بالمعنی کی مشروط اجازت کے ان کے دعویٰ کو باطل کر دیتی ہے اور اس حدیث کی ایک تعبیر کی انہوں نے جو توجیہ فرمائی ہے وہ ان کے فہم قرآن کا بھی مذاق اڑا رہی ہے۔

اس باب کے آخری فقرے کا عنوان ہے: ''روایت باللفظ کا اہتمام'' اس کے تحت انہوں نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک روایت بالمعنی جائز نہیں تھی جس کی انہوں نے بڑی حد تک رعایت کی ہے اور یہ شان موطا میں فی الجملہ نظر آتی ہے اسے پڑھیے تو جگہ جگہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کی شان نظر آتی ہے۔ [1]

---

[1] ص ۱۱۲

Marfat.com

اصلاحی صاحب کے خلیفہ ڈاکٹر برنی نے بھی اس فقرے کی باتیں دہرائی ہیں، اصلاحی صاحب تو عربی داں تھے، مفسر قرآن تھے ان کو یہ دعویٰ کرنے کا کسی حد تک تو حق تھا۔ مگر برنی موطا کی ایک سطری عبارت پڑھ بھی نہیں سکتے، پھر انہوں نے بھی یہ دعویٰ کیوں کر ڈالا؟

میں ''تدبر حدیث'' کے اس باب کے مندرجات پر ایک ایک کر کے تبصرہ کروں گا، کیونکہ اصلاحی مکتبہ فکر سے وابستگی رکھنے والوں کے نزدیک ان کی حیثیت آئین سے کم نہیں، لیکن پہلے میں ان کے ''فرمودات'' کا خلاصہ کر دینا چاہتا ہوں، پھر ہر ہر بات کا ما لہ اور ما علیہ بیان کروں گا۔ میں اوپر یہ بیان کر چکا ہوں کہ اصلاحی صاحب محدثین پر تنقید کرنے سے پہلے کچھ دعوے کرتے ہیں۔ کچھ باتیں امر واقعہ کے برعکس بیان کرتے ہیں اور کچھ باتوں کو ''ہوّا'' بنا کر پیش کرتے ہیں، پھر انہی پر اپنی ہرزہ سرائیوں کا قصر تعمیر کرتے ہیں۔

روایت بالمعنی کے دعاوی ایک نظر میں:

ا۔ ذخیرۂ احادیث کا بہت بڑا حصہ روایت باللفظ کے بجائے روایت بالمعنی کے ذریعہ منقول ہے۔

۲۔ قرآن و حدیث کے کام کی نوعیت اور مقام وحیثیت میں بڑا فرق ہے۔

۳۔ قرآن کی حفاظت میں جبریل، نبی ﷺ اور کاتبین وحی تینوں کی کوششیں شامل رہی ہیں۔

۴۔ حدیث نبی ﷺ کے ان اقوال، افعال اور تصویبات سے عبارت ہے جو نبی ﷺ کے سفر وحضر کے دوران ہزاروں صحابہ کے درمیان ظاہر ہوتے تھے۔

۵۔ نبی ﷺ امت کے لیے کامل نمونہ ہیں اور آپ کی آنکھوں کی گردش اور لقمہ اٹھانے کا انداز تک بھی امت کے لیے نمونہ ہے۔

۶۔ احادیث کی ''روایت باللفظ'' کی پابندی سے علم نبی ﷺ کے پچانوے حصہ کے غائب ہو جانے کا اندیشہ تھا، جو امت کے لیے عظیم سانحہ ہوتا۔

۷۔ روایت باللفظ کی ضرورت بھی نہیں تھی، اس لیے کہ قرآن کی کسوٹی موجود ہے۔ اگر حدیث میں کوئی نقص رہ جاتا تو اس کو قرآن مجید اور ''سنت عملی'' کی کسوٹی پر رکھ کر درست کیا جا سکتا تھا۔

۸۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی ﷺ نے بعض شرائط کے ساتھ ''روایت بالمعنی'' کی اجازت دی ہے۔

۹۔ روایت بالمعنی راویوں کی صوابدید پر مبنی ہے کہ ان میں سے کون مطلب میں تبدیلی لائے بغیر یہ کام کر سکتا ہے۔

۱۰۔ صحیح روایت بالمعنی کے لیے راوی کا ''ذہین'' ہونا ضروری ہے۔

۱۱۔ ''روایت باللفظ'' کا سب سے زیادہ اہتمام امام مالک رحمہ اللہ نے کیا ہے موطا میں کلام نبوی کی شان نظر آتی ہے۔[1]

[1] ص ۱۰۱-۱۱۲

Marfat.com

تبصرہ

پہلا دعویٰ:

علمی اور اصولی بحثوں میں الفاظ ناپ تول کر استعمال کیے جاتے ہیں۔ اصلاحی صاحب نے اپنی جس کتاب میں یہ دعویٰ کیا ہے اس کا عنوان ہے ''مبادئ تدبر حدیث'' اس عنوان کا تقاضا تھا کہ وہ یہ دعویٰ کرنے سے پہلے نہایت واضح اور صریح لفظوں میں یہ بتاتے کہ حدیث کا آدھے سے زیادہ حصہ نبی ﷺ کے افعال، تقاریر۔تصویبات۔ مغازی اور شمائل مظہر پر مشتمل ہے جن کے نقل و روایت میں الفاظ کی پابندی یا عدم پابندی بے معنی ہے اور آدھے سے کم حدیث کا جو حصہ ہے اس میں بھی کثیر تعداد میں ایسی حدیثوں کو مستثنیٰ کیا جا سکتا ہے، جو ہیں تو قول رسول، مگر ان کا تعلق یا تو قرآنی احکام کی تشریح و تبیین سے ہے یا عام ہدایات سے اس تناظر میں اگر راوی سے ان کی روایت کرتے ہوئے بعض الفاظ تبدیل ہو جائیں یا ان میں تقدیم و تاخیر ہو جائے تو ان کا مقصود متاثر نہیں ہوتا۔ پھر یہ بات بھی ذہن سے اوجھل نہیں ہونی چاہیے کہ قرآن کے مطابق رسول اللہ ﷺ معلم کتاب و سنت بھی تھے، امت کے مربی بھی اور صحابہ کے اندر پیدا ہونے والے تنازعات کا فیصلہ کرنے والے حاکم اور قاضی بھی اور آپ کے فیصلوں کو دوسروں سے بیان کرتے وقت نہ آپ کے لیے الفاظ کو بیان کرنا ضروری تھا اور نہ ہی عملی تھا۔

اب رہی وہ احادیث جن کا تعلق اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات کے بیان سے ہے، یا غیبی امور کی خبروں سے، یا نمازوں اور دوسری عبادتوں میں پڑھی جانے والی دعاؤں سے یا عام اذکار و اوراد سے، یا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سوالوں کے جواب سے تو ایسی حدیثیں نبی ﷺ کے الفاظ میں بیان ہوئی ہیں۔ اگر ان میں کوئی اختلاف ملتا ہے تو یہ نتیجہ ہے اس بات کا کہ وہ نبی ﷺ نے مختلف اوقات میں مختلف صحابہ رضی اللہ عنہم سے فرمائی ہیں اور ان میں تنوع مقصود بھی ہے اور اگر آپ نے ایک ہی طرح کے سوال کا مختلف جواب دیا ہے تو ایسا دراصل ہر سائل کے سوال کا مقصود سمجھ کر کیا ہے۔ اس کو سمجھنے کے لیے تشہد اور درود کے کلمات اور ایمان و اسلام سے متعلق سوال کے جوابات سے مدد لی جا سکتی ہے، ایسے اختلافات نہ تو راویوں کی بھول کا نتیجہ ہیں اور نہ روایت حدیث میں ان کے تصرفات کا اور نہ ان سے ''روایت بالمعنیٰ'' کے جواز پر استدلال کرنا ہی درست ہے۔ رہا بعض حدیثوں میں مترادفات کا استعمال تو اس کی مثال خود قرآن پاک میں ایک ہی بات کے بیان میں موجود ہے، جبکہ موقع و محل ایک ہے۔

قرآن میں مترادفات کا استعمال:

قرآن پاک کی سورۂ بقرہ آیت نمبر ۶۰ میں اللہ تعالیٰ نے پتھر سے پانی کے چشمے پھوٹ نکلنے کے لیے ''انفجرت'' کی تعبیر اختیار فرمائی ہے اور بالکل اسی موقع و محل میں سورۂ اعراف آیت نمبر ۱۶۰ میں اس کے لیے ''انبجست'' کی تعبیر

Marfat.com

اختیار فرمائی ہے۔

اسی طرح موسیٰ علیہ السلام کی لاٹھی کے بطور ''آیت'' سانپ بن جانے کے واقعہ کو بیان کرتے ہوئے کہیں ''ثعبان'' کہیں ''حیۃ'' اور کہیں ''جان'' کے الفاظ استعمال فرمائے ہیں، موقع و محل ایک ہے، البتہ ہر جگہ اس ''معجزاتی'' سانپ کی صفت مختلف ہے۔

موقع و محل اور سیاق و سباق کے تقاضوں کے مطابق بیان میں اختلاف کی مثالوں میں سورۂ بقرہ کی آیت نمبر ۶۲، سورۃ مائدہ کی آیت نمبر ۶۹ اور سورۂ حج کی آیت نمبر ۱۷ پیش کی جا سکتی ہے۔ ان آیتوں میں الفاظ میں کمی بیشی، اعراب اور اختتام ہر چیز میں اختلاف ہے، یعنی بادی النظر میں، ورنہ حقیقت میں کوئی اختلاف نہیں ہے اور قرآن و حدیث ایک ہی چشمۂ نور سے نکلے ہیں، یعنی ''نور وحی'' لہٰذا نہ قرآن حدیث کے خلاف ہے اور نہ حدیث قرآن کے، اسی طرح نہ قرآن کے اندر اختلافات ہیں اور نہ حدیث کے اندر۔

دوسرا دعویٰ:

اصلاحی صاحب نے یہ دعویٰ یا تو نیم بیداری اور نیم خواب کی حالت میں کیا ہے یا ان کا عقیدہ یہی ہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ یہ ان کا عقیدہ نہیں ہوگا، لیکن حدیث سے ان کی بیزاری نے ان کے قلب و نگاہ پر پردہ ڈال دیا ہے۔ وہ تدبر حدیث کے اصول و مبادی بیانی کر رہے ہیں ایسے موقعوں پر اہل علم جہاں الفاظ ناپ تول کر استعمال کرتے ہیں وہیں کوئی بات گول مول کہنے کے بجائے نہایت واضح الفاظ میں کہتے ہیں اور ان کی تشریح بھی کر دیتے ہیں، ضرورت پڑنے پر مثالوں سے اپنی بات کو مدلل بھی کر دیتے ہیں۔

ان کے خلیفہ ڈاکٹر برنی کے مضامین اور دعووں کی روشنی میں اصلاحی صاحب کے اس قول: ''قرآن و حدیث'' کے کام کی نوعیت اور دونوں کے مقام اور حیثیت میں بڑا فرق ہے'' کا مطلب یہ ہے کہ دونوں کا تشریعی مقام و مرتبہ ایک نہیں ہے۔ میرے لیے پریشانی یہ ہے کہ میں ان کے دعووں کو پہلے درست کرتا ہوں، واضح کرتا ہوں، پھر ان کا جواب دیتا ہوں۔ یہ دونوں بزرگ اور ان کے ہمنوا چونکہ اللہ تعالیٰ کے کلام سے اپنی جھوٹی محبت کا بڑا دم بھرتے ہیں اور اس کے غم میں مگرمچھ کے آنسو بہاتے رہتے ہیں۔ لہٰذا ان دونوں کو خاص طور پر اصلاحی صاحب کو قرآن و حدیث کے کام کی نوعیت اور حیثیت میں اس ''بڑے فرق'' کو بیان کرنا اور متعین کرنا فرض تھا۔ یہ دین کا ایسا بنیادی مسئلہ ہے جس کے ماننے پر ایمان اور انکار پر کفر لازم آتا ہے۔ ایسی صورت میں گول مول باتوں سے اپنے قارئین اور پیروکاروں کو ''گومگو'' کی حالت میں رکھنا ایک مفسر قرآن اور ''تدبر حدیث'' کے اصول سمجھانے والے کے شایان شان نہیں ہے۔

اگر ان کا اور ان کے ہم مسلک دوسرے لوگوں کا دعویٰ ہے کہ قرآن کلام الٰہی ہے، اس کا ہر ہر لفظ اللہ تعالیٰ کا نازل کردہ ہے اور یہ ایسا معجزاتی کلام ہے جس کے مانند کوئی کلام گھڑنا اور تالیف کرنا جن و انسان کے بس سے باہر ہے،

Marfat.com

نمازوں میں اور ان سے باہر اس کی تلاوت اللہ تعالیٰ کی محبوب عبادت ہے۔ تو ان کا یہ دعویٰ سو فیصد حق ہے جس کا انکار کفر ہے۔

اب رہی قرآن و حدیث کے کام کی نوعیت اور دین میں ان دونوں کا مقام وحیثیت تو میرے خیال میں قرآن و حدیث کا معمولی سا طالب علم بھی یہ جانتا ہو گا کہ اس میں خود قرآن پاک کی رو سے ادنیٰ سا بھی فرق نہیں ہے، دونوں کے کام کی نوعیت بھی ایک ہے اور دین میں دونوں کا مقام اور حیثیت بھی ایک۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی اسی کتاب عزیز میں بار بار اور مختلف اسلوبوں میں رسول اللہ ﷺ کو اپنا واجب الاطاعت رسول، ہادی، معلم، مربی، آمر و ناہی، محلل و محرم، حاکم و قاضی اور شارع قرار دیا ہے اور خود اصلاحی صاحب کے اعتراف سے ''آپ امت کے لیے اسوۂ کامل اور آئیڈیل ہیں اور آپ کی تو آنکھوں کی گردش اور لقمہ اٹھانے تک بھی امت کے لیے نمونہ ہے۔'' ❶ تو کیا نبی ﷺ کی ان تمام حیثیتوں کو تسلیم کر کے ان کے مطابق آپ کی اطاعت و اتباع کرنا حدیث کی تشریعی حیثیت کو قرآن کی تشریعی حیثیت کے بالکل مماثل اور مساوی مانے بغیر ممکن ہے؟ میرا یہ عقیدہ ہے کہ ممکن نہیں ہے، اس لیے کہ اس سے اللہ کی تکذیب ہوتی ہے، اگر اصلاحی اور برنی کا دعویٰ ہے کہ میرا یہ عقیدہ غلط ہے تو قرآن پاک کی کسی ایک ہی آیت سے اس کو بیان کر دیں، قرآن سے باہر کی کوئی دلیل نا قابل قبول ہے۔

اگر وہ یہ کہیں کہ قرآن تو سورۂ فاتحہ سے سورۂ ناس تک مرتب شکل میں محفوظ ہے اور اس کا ایک لفظ بھی ضائع نہیں ہوا ہے تو ہم کہیں گے کہ قرآن کے اس شکل میں محفوظ ہونے ہی کا یہ لازمی تقاضا ہے کہ حدیث بھی محفوظ رہے اور اس کے محفوظ رہنے کی یہ شرط قطعاً نہیں ہے کہ وہ بھی دو دفتیوں کے درمیان محفوظ ہو، بلکہ وہ اس لیے محفوظ ہے کہ اسلامی شریعت قرآن اور حدیث سے عبارت ہے اور جب قرآن محفوظ ہے تو لازماً حدیث بھی محفوظ ہے۔

اگر وہ یہ کہیں کہ قرآن تو ہر ملاوٹ اور آمیزش سے پاک ہے، لیکن حدیث میں غیر حدیث بھی شامل ہو گئی ہے تو ہم کہیں گے کہ بلا شبہ حدیث میں غیر حدیث بھی شامل ہو گئی ہے۔ لیکن اس کے باوجود صحیح حدیث محفوظ ہے، ورنہ رسول کی اطاعت و اتباع کا الٰہی حکم نا قابل تعمیل ہو گا اور اللہ تعالیٰ کے بارے میں یہ اعتقاد کہ وہ نا قابل تعمیل حکم بھی دیتا ہے کفر ہے اور صحیح احادیث جاننے والے ہر زمانے میں موجود تھے اور موجود رہیں گے۔

اگر وہ کہیں کہ صحیح احادیث کا علم رکھنے والے اور ان کو من گھڑت اور جھوٹی روایتوں سے سے الگ کرنے والے ہر زمانے میں بہت کم رہے ہیں تو ہم کہیں گے کہ جس طرح قرآن پاک کے سمجھنے والوں کی قلت سے اس کے ''کتاب مبین'' ہونے پر حرف نہیں آتا اسی طرح صحیح حدیث کا علم رکھنے والوں کی قلت سے صحیح احادیث کے موجود ہونے اور محفوظ ہونے پر کوئی زد نہیں پڑتی۔

---

❶ ص ۱۰۱، فقرہ نمبر ۲

Marfat.com

حاصل کلام:

حاصل کلام یہ کہ قرآن کی طرح اور اس کے بالکل مساوی حدیث بھی شرعی ماخذ ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ ہی کی اطاعت کی طرح رسول کی اطاعت بھی فرض ہے اور خود اللہ تعالیٰ کے فرض کرنے سے فرض ہے اور یہ فرضیت اس امر کی متقاضی ہے کہ وہ چیز بھی محفوظ ہو جس میں رسول کی اطاعت اور اتباع فرض ہے، کیونکہ قرآن کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے رسول کی اطاعت نہیں، رسول کی اطاعت اس کے قول وفعل اور اس کے اوامر ونواہی کی تعمیل سے عبارت ہے جو قرآن کے علاوہ ہیں۔

تیسرا دعوی:

اس دعوی اور اس کے مضمرات کی دھجیاں میں حفاظتِ حدیث کی بحث میں دلائل و براہین سے بکھیر چکا ہوں اور یہ واضح کر چکا ہوں کہ حدیث کی حفاظت کے ساتھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جو اہتمام برتا ہے وہ حفاظت قرآن کے ساتھ ان کے اہتمام سے کم نہیں زیادہ تھا، یہی حال تابعین اور تبع تابعین کے دور میں بھی رہا اور یہ بھی بیان کر چکا ہوں کہ حدیث بھی وحی ہے اور اس کو بھی نازل کرنے والے جبریل علیہ السلام اور ان کے ساتھ دوسرے فرشتے تھے۔ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک حدیث کی تشریعی حیثیت قرآن کی تشریعی حیثیت سے کچھ کم نہیں تھی۔

رہی قرآن پاک کی کتابت جس کو منکرین حدیث بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہیں تو نزول قرآن کے زمانے میں اس کی حقیقت اس کے سوا کچھ اور نہیں تھی کہ بعض صحابہ نازل ہونے والی آیتوں اور سورتوں کو متفرق شکل میں لکھ لیا کرتے ان کا یہ عمل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علم میں تو ضرور تھا، مگر آپ نے اس کا حکم نہیں دیا تھا، کیونکہ کسی صحیح حدیث میں اس کا ذکر نہیں آیا ہے۔

قرآن کے لکھے ہوئے متفرق اجزا کا اس کی حفاظت میں اس کے علاوہ کوئی کردار نہیں رہا کہ اگر ضرورت پڑی تو ان سے رجوع کیا جا سکتا ہے، لیکن ایسی ضرورت کبھی بھی نہیں پڑی، اور حدیث کی طرح قرآن بھی سینہ بسینہ منتقل ہوتا رہا، اور ابوبکر رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں قرآن پاک کا جو ایک نسخہ تیار کیا گیا اور اس کے بعد عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں اس کے جو سات نسخ تیار کیے گئے۔ وہ نہ عام لوگوں کے پڑھنے کے لیے تھے نہ پڑھے گئے اور نہ پڑھے جا سکتے تھے اس لیے کہ صحابہ کی اکثرت امی تھی اور ان میں لکھنے پڑھنے والے لوگ انگلیوں پر گنے جا سکتے تھے، ان کے امی ہونے کی شہادت خود قرآن نے دی ہے۔ درحقیقت قرآن کے ہر آمیزش سے محفوظ رہنے کا سبب اس کا اعجاز ہے۔

تابعین کے دور میں بھی یہی حال رہا اور امر واقعہ اس بات کی گواہی دے رہا ہے کہ اگر اسی ۸۰ اور ۹۰ سالہ دور میں قرآن پاک کے کچھ نسخے تیار بھی ہوئے ہوں گے تو وہ لاکھوں مسلمانوں کے پڑھنے کے لیے کافی نہیں تھے۔

دراصل منکرین حدیث قرآن کے ساتھ صحابہ اور تابعین کے اہتمام کو حب قرآن کے جذبے سے نہیں۔ بغض

Marfat.com

حدیث کے جذبے سے بڑھا چڑھا کر بیان کرتے ہیں اور میں نے اس مسئلہ کو جس تفصیل سے بیان کر دیا ہے انصاف پسندوں کے لیے وہ کافی ہے۔

چوتھا دعویٰ:

یہ دعویٰ خلط مبحث کا شاہکار ہے، اصلاحی صاحب نے اولاً تو حدیث کی ساری قسموں کو خلط ملط کر دیا، پھر نبی ﷺ کی ذات سے ان کے صدور کی ایسی تصویر کشی کی ہے، گویا آپ ہمیشہ بڑے بڑے مجمعوں اور جلسوں میں رہتے تھے اور آپ کے اقوال کو ہزاروں افراد سنتے تھے جن کے لیے ان کو اپنے لوح قلب پر نقش کرنا ممکن نہیں تھا۔ اسی طرح آپ کے افعال کا مشاہدہ کرنے والے بھی ہزاروں ہوتے تھے جن کے لیے ان افعال کا استحضار بعید از امکان تھا۔ دعویٰ نمبر ایک پر میں نے جو بھرپور تبصرہ کیا ہے اس میں اس چوتھے دعوی کا مفصل جواب موجود ہے۔

پانچواں دعویٰ:

امین اصلاحی کا یہ دعویٰ مبنی بر حق ہے جو حدیث کے بارے میں ان کی تمام تشکیکی کوششوں پر خط تنسیخ پھیر دیتا ہے۔

چھٹا دعویٰ:

یہ دعویٰ بھی ایسا ہے جو ''روایت باللفظ'' کی اہمیت سے متعلق ان کی تمام ''تاکیدات'' کو کالعدم کر دیتا ہے اور اس کے برعکس یہ یقین دہانی کرا رہا ہے کہ حدیث کی حفاظت کے لیے ''روایت باللفظ'' کی عدم پابندی ضروری اور لازمی تھی۔

ساتواں دعویٰ:

یہ منکرین حدیث کا روایتی دعویٰ ہے۔ قرآن کے ذریعہ حدیث کے نقص، کمزوری، عیب اور خلا کی نشاندہی اور پھر اصلاح کی باتیں انکار حدیث کی تاریخ سے جڑی ہوئی ہیں۔ میں نے صحیح بخاری کی بعض احادیث پر اصلاحی اور غزالی کے اعتراضات کا جو مفصل جواب دیا ہے اس سے منکرین حدیث کے فہم قرآن اور فہم حدیث دونوں کی حقیقت سمجھی جا سکتی ہے۔ اعادہ لاطائل ہوگا، اور ''عملی سنت'' پر بھی روشنی ڈال چکا ہوں۔

آٹھواں دعویٰ:

یہ دعویٰ باطل اور نا قابل التفات ہے؛ نبی ﷺ نے احادیث کی مشروط یا غیر مشروط ''روایت بالمعنیٰ'' کی قطعاً کوئی اجازت نہیں دی ہے اصلاحی صاحب نے بغدادی کی نقل کردہ جن احادیث کی بنیاد پر یہ دعویٰ کیا ہے وہ حدیث نہیں جھوٹ ہیں، تعجب ہوتا ہے کہ جس شخص نے اکابر محدثین پر نا قابل اعتبار بدعتیوں سے حدیث روایت کرنے اور لینے کا الزام لگا کر ان کو امت میں جھوٹی روایات پھیلانے کا ذمہ دار قرار دے ڈالا ہے وہ الکفایہ کے صرف ۶ صفحات پر منقول احادیث و آثار کی صحت و سقم معلوم کرنے سے قاصر تھا، یہی تمام منکرین حدیث کا حال رہا ہے اور آئندہ رہے گا، حدیث بیزاری نور بصیرت سلب کر لیتی ہے۔

Marfat.com

پہلی حدیث: ......اصلاحی صاحب نے روایت بالمعنی کی مشروط اجازت پر جس حدیث سے استدلال کیا ہے اس کو حافظ بغدادی نے روایت بالمعنی کے جواز کی پہلی دلیل کے طور پر نقل کیا ہے، اس کے الفاظ ہیں:

ولید بن سلمہ فلسطینی -طبرانی ازدی- سے روایت ہے مجھے یعقوب بن عبداللہ بن سلیمان بن اکیمہ لیثی نے اپنے باپ عبداللہ سے اور انہوں نے ان کے دادا سلیمان بن اکیمہ سے روایت کرتے ہوئے خبر دی، انہوں نے کہا: ہم نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! ہمارے ماں باپ آپ پر قربان، ہم حدیث سنتے ہیں، اور اس کو جس طرح سنتے ہیں اس طرح اس کو بیان کرنے پر قدرت نہیں رکھتے، فرمایا:

((إذا لم تحلوا حرامًا و لا تحرموا حلالًا فلا بأس))

''اگر تم حرام کو حلال اور حلال کو حرام نہ کرو، تو کوئی حرج نہیں ہے۔''

یہ حدیث نہیں جھوٹ ہے اس کی روایت طبرانی نے ''المعجم الکبیر'' میں ابونعیم نے ''المعرفة'' میں اور حسین بن ابراہیم جوزقانی نے ''الاباطیل و المناکیر'' میں کی ہے اور اس کے راوی ولید بن سلمہ کے کذاب ہونے کی وجہ سے اس کو باطل قرار دیا ہے۔ امام ابو حاتم، امام ابوزرعہ، امام ابن حبان، امام دارقطنی اور امام عقیلی وغیرہ نے اس کو متروک، کذاب، حدیث گھڑنے والا اور منکر الحدیث قرار دیا ہے۔ ❶

الکفایہ میں اس حدیث کی صحت وسقم کے بارے میں کچھ نہیں لکھا گیا ہے۔ بغدادی نے اس باب اور دوسرے ابواب کے تحت جو مرفوع حدیثیں اور صحابہ اور محدثین کے جو اقوال نقل کیے ہیں ان میں اکثر موضوع اور باطل ہیں، خود روایت بالمعنی سے متعلق انہیں دونوں ابواب میں انہوں نے جو حدیثیں اور اقوال و آثار نقل کیے ہیں ان میں سے بیشتر ثابت نہیں ہیں اور اصلاحی صاحب چونکہ اس علم سے بالکل نابلد تھے اس لیے انہوں نے آنکھیں بند کر کے اس سے حدیثیں اور آثار نقل کر لیے ہیں اور انہیں پر اپنے استدلالات کا قصر تعمیر کا ڈالا ہے۔

دوسری حدیث: ......اصلاحی صاحب نے روایت بالمعنی کی مشروط اجازت پر جس دوسری حدیث سے استدلال کیا ہے اس کے الفاظ ہیں:

((سأل رجل النبی ﷺ فقال: یا رسول الله! إنك لتحدثنا حدیثًا لا نقدر ان نسوقه کما نسمعه، فقال: إذا أصاب أحدکم المعنی فلیحدث))

''ایک شخص نے نبی ﷺ سے سوال کرتے ہوئے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! درحقیقت آپ ہم سے ایسی حدیثیں بیان کرتے ہیں، جن کو ہم اس طرح نقل کرنے پر قدرت نہیں رکھتے جس طرح ہم انہیں سنتے

❶ المعجم الکبیر، نمبر۶۲۹۱۔ المعرفة، نمبر۳۳۶۶۔ الاباطیل والمناکیر، نمبر۹۲۔ الضعفاء والمجروحین ص۳۲۲ ج ۲، ترجمہ ۱۱۳۶، لسان المیزان ص۱۳۱ ج ۲، ترجمہ ۹۳۸۰، الجرح والتعدیل ص۹ ج ۹، ترجمہ ۱۵۶۸۲۔

Marfat.com

ہیں؟ فرمایا: اگر تم میں سے کوئی مفہوم درست بیان کر دے تو وہ حدیث بیان کرے۔"
یہ بھی حدیث نہیں جھوٹ ہے اور اس کی سند میں سعید بن جبیر اور عبداللہ بن مسعود کا نام زبردستی داخل کر دیا گیا ہے۔
اس کی سند میں دو راوی، اسماعیل بن محمد زنجی اور عبدالعزیز بن عبدالرحمٰن بالسی متروک اور نا قابل اعتبار ہیں۔ خود بغدادی نے تاریخ بغداد (ص ۳۰۸ ج ۶) میں ابوالقاسم ازہری کے حوالہ سے لکھا ہے زنجی دو کوڑی کے برابر بھی نہیں ہے۔ ❶

اور دوسرے راوی، عبدالعزیز بن عبدالرحمٰن بالسی کے بارے میں امام ابن حبان کا قول ہے کہ وہ ثقہ راویوں کے نام سے مقلوب روایتیں بیان کیا کرتا تھا۔ امام ذہبی نے اس کے بارے میں لکھا ہے کہ امام احمد کے نزدیک وہ وضع حدیث کا ملزم تھا۔ ابونعیم کا قول ہے: اس سے منکر روایتیں منقول ہیں۔ ❷

آثار صحابہ:

اصلاحی صاحب نے روایت بالمعنی کی مشروط اجازت کی دلیل میں صحابہ کے تین آثار بھی الکفایہ سے نقل کیے ہیں، جن میں سے دو ضعیف اور ایک صحیح ہے اور صحیح اثر موضوع سے غیر متعلق ہے۔

پہلا اثر:

یہ اثر واثلہ بن اسقع رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس کی مختصر سند ہے:
معن بن عیسی معاویہ بن صالح سے روایت کرتے ہیں، وہ علاء بن حارث سے، وہ مکحول سے اور وہ واثلہ بن اسقع رضی اللہ عنہ سے انہوں نے فرمایا ہے:

((اذا حدثناكم ، و قال قتيبة: إذا جئناكم بالحديث على معناه فحسبكم))

"جب ہم تم لوگوں سے حدیث بیان کریں" قتیبہ نے کہا: جب ہم تمہارے پاس حدیث اس کے معنی کے مطابق لائیں تو وہ تمہارے لیے کافی ہے۔"

یہ اثر امام ترمذی نے "العلل الصغیر" میں نقل کیا ہے جو جامع ترمذی کے آخر میں درج ہے۔ حافظ سیوطی نے "تدریب الراوی" میں امام بیہقی کے حوالہ سے اس اثر کی ایک شان نزول بھی بیان کی ہے، جو مکحول شامی سے روایت ہے، کہتے ہیں:

"میں اور ابوازہر واثلہ بن اسقع کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے عرض کیا: ابو اسقع! ہم سے کوئی ایسی حدیث بیان کیجیے جو آپ نے رسول اللہ ﷺ سے سنی ہو اور وہ وہم وگمان، اضافے اور بھول چوک سے پاک ہو؟ انہوں نے فرمایا: کیا تم میں سے کسی نے قرآن کا کوئی حصہ پڑھا ہے؟ ہم نے عرض کیا: ہاں اور ہم قرآن کے اچھے حافظ نہیں ہیں؛ ہم واو اور الف وغیرہ کا اضافہ یا کمی کر دیتے ہیں۔ فرمایا: یہ قرآن

❶ لسان المیزان ص ۴۰۸ ج ۱، ترجمہ ۹۴۱ ❷ المجروحین ص ۱۲۱ ج ۲، ترجمہ ۷۳۹، لسان المیزان ص ۳۶۷ ج ۴، ترجمہ ۵۱۱۷

Marfat.com

تمہارے درمیان لکھا ہوا موجود ہے جس کو یاد کرنے میں تم کوئی کوشش اٹھا نہیں رکھتے، پھر بھی تمہارا خیال ہے کہ تم اس کی تلاوت میں کوئی اضافہ یا کوئی کمی کر دیتے ہو، پھر ان احادیث کا کیا حال ہوگا جو ہم نے رسول اللہ ﷺ سے سنی ہیں، جو ممکن ہے کہ ہم نے آپ سے انہیں ایک ہی بار سنا ہو؟ تمہارے لیے یہی بس ہے کہ ہم تم سے حدیث معنی کی رعایت کرتے ہوئے بیان کریں۔'' ❶

اس اثر کے دو راوی، معاویہ بن صالح حضرمی اور ان کے شیخ علاء بن حارث ضعیف ہیں: معاویہ بن صالح سچے تو تھے لیکن وہم و گمان کے مریض تھے، بعض ائمہ نے ان کو ثقہ اور بعض نے غیر ثقہ قرار دیا ہے۔ یحییٰ بن معین نے ان کو ضعیف بتایا ہے اور امام بخاری نے ان کے ضعیف ہونے کی وجہ سے صحیح بخاری میں ان کی کوئی حدیث نہیں روایت کی ہے۔ ان کی عدالت کا اعلیٰ درجہ یہ تھا کہ وہ ''صدوق'' سچے تھے، ایسے راوی کی مرویات غور و تدبر کے لیے لکھی جاتی ہیں، برائے استدلال نہیں۔ ❷

رہے معاویہ کے شیخ علاء بن حارث تو ان کا بھی یہی حال تھا، مزید یہ کہ سن رسیدہ ہونے پر ان کا ذہنی توازن بھی جاتا رہا تھا۔ امام بخاری نے ان کو ''منکر الحدیث'' قرار دیا ہے۔ ❸

اس اثر کی شان نزول پر دوسرے اثر کے متن کے ساتھ ہی گفتگو کریں گے۔

دوسرا اثر:

یہ اثر ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، مختصر سند کے ساتھ اس کا متن ہے:

((عن کثیر بن یحییٰ بن کثیر، حدثنی ابی، حدثنا سعید الجریری، عن ابی نضرۃ، عن ابی سعید، قال: کنا نجلس إلی النبی ﷺ، عسی ان نکون عشرۃ انفار، نسمع الحدیث، فما منا اثنان یؤدیانہ علی حرف، غیر ان المعنی واحد))

''کثیر بن یحییٰ بن کثیر سے روایت ہے کہتے ہیں مجھ سے میرے والد نے بیان کیا، انہوں نے کہا: ہم سے سعید جریری نے ابونضرہ سے اور انہوں نے ابوسعید سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا کہ انہوں نے فرمایا: ہم نبی ﷺ کی خدمت میں بیٹھا کرتے تھے، ممکن ہے کہ ہماری تعداد دس رہتی رہی ہو، ہم حدیث سنتے تھے اور ہم میں دو بھی الفاظ کی پابندی کے ساتھ اس کو بیان نہیں کرتے تھے، البتہ مطلب ایک ہوتا تھا۔''

یہ حدیث یا اثر بے حد ضعیف اور ناقابل استدلال ہے۔ اس کی سند کے ایک راوی کثیر بن یحییٰ بن کثیر بصری سچے تو تھے، لیکن ان کی مرویات میں منکر روایتیں ہوتی تھیں، یہ اثر ان سے ان کے والد یحییٰ بن کثیر نے بیان کیا ہے ابو حاتم نے

---

❶ ص ۳۰۰ ❷ لسان المیزان ص ۴۵۶ ج ۶، ترجمہ ۸۶۳۰۔
❸ لسان المیزان ص ۱۲۱ ج ۵، ترجمہ ۵۷۲۷۔

Marfat.com

ان کو ضعیف اور روایت حدیث میں نا قابل اعتبار قرار دیا ہے۔ دار قطنی کا قول ہے: وہ متروک تھے۔ نسائی کہتے ہیں: وہ ثقہ نہیں تھے، ابن حبان نے لکھا ہے: وہ ثقہ راویوں سے ایسی حدیثیں روایت کرتے تھے جو ان کی مرویات میں شامل نہیں ہیں۔ ❶

یحییٰ سے یہ اثر روایت کرنے والے سعید جریری ہیں پورا نام سعید بن ایاس جریری ہے یہ ثقہ تھے، لیکن آخری عمر میں ان کا ذہنی توازن جاتا رہا تھا اور حافظہ بھی کمزور ہو گیا تھا، متعدد نقاد حدیث نے ان کے ذہنی توازان کے بگڑ جانے اور حافظہ کے کمزور ہو جانے کی مشاہداتی گواہی دی ہے۔ ❷

اوپر جو کچھ عرض کیا گیا ہے وہ اس اثر کی سند سے متعلق تھا۔ اب میں اس کے متن پر تبصرہ کروں گا۔

تبصرہ:

مذکورہ بالا دونوں آثار میں حفظ حدیث، بلکہ حفظ قرآن کی بالکل غلط تصویر پیش کی گئی ہے۔ اس سے یہ تاثر ملتا ہے کہ صحابہ اور تابعین کے دور میں قرآن پاک کا کوئی جید اور عمدہ حافظ نہیں تھا اور ہر شخص زبانی تلاوت کرتے ہوئے قرآن میں واو اور الف وغیرہ کا اضافہ یا کمی کر دیا کرتا تھا۔ واثلہ بن اسقع کے اثر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کے دور میں ہی قرآن پاک ہر گھر میں لکھا ہوا موجود تھا اور صحابہ و تابعین کوشش کے باوجود قرآن پاک کسی اضافے یا کمی سے پاک صورت میں حفظ نہیں کر پاتے تھے، جبکہ آج کے اس دور انحطاط میں بھی عرب و عجم کے ایسے لاکھوں حفاظ قرآن مل جائیں گے جو سورۂ فاتحہ سے سورۂ ناس تک ہر اغلاط اور ہر کمی بیشی سے پاک تلاوت کرنے پر قدرت رکھتے ہوں گے جن میں ہزاروں ایسے حفاظ بھی ہوں گے جو قرآن پاک کا ایک لفظ بھی نہیں سمجھتے ہوں گے۔

ان دونوں آثار اور ان کے علاوہ دوسرے آثار میں حدیث کے ساتھ صحابہ و تابعین کے جس عدم اہتمام کی تصویر کشی کی گئی ہے وہ امر واقعہ کے خلاف ہے، حدیث صحابہ، تابعین اور ان کے بعد کے ادوار کے مسلمانوں کے لیے مشعل راہ تھی اور صحابہ اور ان کے بعد کے تینوں قرون مفضلہ میں حدیث کے درس و مطالعہ، اس پر بحث و تحقیق، اس کے راویوں کی ثقاہت و عدم ثقاہت اور حدیث کے الفاظ کی لغوی تحقیق سے لے کر اس کے معانی پر غور و تدبر اور اس سے احکام کے استنباط کی جو مہم جاری تھی اس کو دیکھتے ہوئے لگتا ہے کہ مسلمانوں کے سامنے قرآن و حدیث کے درس و مطالعہ کے سوا کوئی اور کام نہیں رہ گیا تھا۔

روایت بالمعنیٰ کی حقیقت:

امین اصلاحی اور ان سے پہلے کے اور بعد کے منکرین نے ''روایت بالمعنیٰ'' کو اس کی حقیقی شکل میں نہیں پیش کیا

❶ لسان المیزان ص ۲۱۲ ج ۲، ترجمہ ۹۶۱۶، الجرح والتعدیل ص ۲۲۴ ج ۹، ترجمہ ۱۶۴۱۴، المجروحین ص ۴۸۳ ج ۲، ترجمہ ۱۲۲۴

❷ لسان المیزان ص ۱۸۸ ج ۳، ترجمہ ۳۱۴۵، تاریخ البخاری الکبیر ص ۴۵۶ ج ۳، الصغیر ص ۸۷ ج ۲، تقریب التہذیب ترجمہ ۲۲۷۳

Marfat.com

ہے، بلکہ اس شکل میں پیش کیا ہے کہ راوی، حدیث کی روایت کرتے ہوئے الف سے یاء تک اس کو بدل دیتے تھے اور اسی تناظر میں انہوں نے اور ان کے خلیفہ اور وکیل ڈاکٹر برنی نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ ذخیرۂ احادیث کا بہت بڑا حصہ انہیں روایات پر مشتمل ہے جو روایت باللفظ کی بجائے روایت بالمعنیٰ ہی کے ذریعہ سے ہم تک پہنچی ہیں۔ ❶

یہ دعویٰ درحقیقت حدیث اور محدثین کے بارے میں ان کی بدنیتی کی پیداوار ہے، پھر یہ فرما کر: ''روایت حدیث کا بالمعنیٰ ہونا کوئی ایسی بات نہیں جس پر کوئی معقول آدمی اعتراض کر سکے، احادیث کے لیے قرآن کی طرح الفاظ کی پابندی کے ساتھ روایت کی قید اس کام کو بالکل ناممکن بنا دیتی'' اپنی نظر میں گویا حدیث اور محدثین پر ایک احسانِ عظیم کیا ہے اور روایت باللفظ کو ناممکن قرار دے کر محدثین کو اپنے زعم باطل میں، روایت بالمعنیٰ کرنے پر ''حق بجانب'' قرار دیا ہے، اس طرح ''مبادی تدبر حدیث'' کی پہلی سطر سے آخری سطر تک میں حدیث کی شرعی حیثیت اور محدثین کی خدمات حدیث سے متعلق جو کچھ فرمایا ہے، وہ ''الذم بما یشبہ المدح'' کی بدترین مثال ہے۔

اور یہ سب کچھ اپنے اس دعویٰ کو درست ثابت کرنے کے لیے کیا ہے کہ ''قرآن و حدیث کے کام کی نوعیت اور دین میں دونوں کے مقام اور حیثیت میں بڑا فرق ہے۔ ❷ مگر اتنے بڑے دعوی کی ایک معمولی سی اور کمزور سی دلیل پیش کرنے سے قاصر رہے ہیں، میں نے اوپر قرآن و حدیث کے مقام اور حیثیت کے ایک ہونے پر جو مدلل بحث کی ہے اس پر ایک طائرانہ نظر ڈال کر ان کی اس غلط بیانی کو سمجھا جا سکتا ہے۔

دراصل ائمہ حدیث کی کتابوں اور ان سے منسوب صحیح اقوال میں جس روایت بالمعنی کا ذکر آیا ہے اس کا تعلق حدیث کے بعض الفاظ کی روایت بالمعنی سے ہے۔ پورے متن حدیث کی روایت بالمعنی سے نہیں۔ ورنہ حدیث پر قول رسول کا اطلاق صحیح نہیں ہوگا، کیونکہ یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ کسی عبارت کو الف سے یاء تک بدل دینے کے بعد اس کو اس کے اصل کاتب کی طرف منسوب کرنا جھوٹ اور غلط بیانی ہے۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ''نخبۃ الفکر'' کے صرف ایک سطری جملے میں روایت بالمعنی کی جو ''مقبول'' صورت بیان کر دی ہے اس میں اس مسئلہ سے متعلق متقدمین اور متاخرین اہل حدیث کی آراء کو نہایت خوبصورتی اور دقت کے ساتھ سمیٹ دیا ہے، فرماتے ہیں:

((و لا یجوز تعمد تغییر المتن بالنقص و المرادف الا لعالم بما یُحیل المعانی))

''عبارت حدیث میں کمی اور مترادف کے استعمال کے ذریعہ دانستہ تبدیلی صرف اس شخص کے لیے جائز ہے جسے اس چیز کا علم ہو جو معنی بدل دیتی ہے۔''

ایسا عام طور پر اس وقت ہوتا ہے جب کوئی محدث حدیث کی روایت اختصار کے ساتھ کرتا ہے یا اس سے کسی مسئلہ

❶ ص ۱۰۰ ❷ ص ۱۰۱

Marfat.com

پر استدلال کرتا ہے۔ ہم قرآن کی کسی آیت سے استدلال کرتے ہوئے بھی ایسا کرتے ہیں، خود احادیث میں بھی قرآنی آیات اختصار کے ساتھ بیان ہوئی ہیں۔

روایت بالمعنیٰ کی مثالیں:

قرآن پاک کی سورۂ زمر کی آیت نمبر ۶۷: ﴿وَالْأَرْضُ جَمِيعًا قَبْضَتُهُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِيّٰتٌ بِيَمِيْنِهِ﴾ ''اور قیامت کے دن پوری زمین اس کی مٹھی میں ہوگی اور آسمان اس کے داہنے ہاتھ میں لپیٹے ہوئے ہوں گے۔'' کی تفسیر میں جو صحیح احادیث بخاری، مسلم، ابو داؤد اور بیہقی وغیرہ میں منقول ہیں ان کے راوی عبداللہ بن عمر اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم ہیں۔

صحیح بخاری میں یہ حدیث متعدد ابواب کے تحت آئی ہے یہ کتاب التفسیر، باب ۳ کی حدیث ابو ہریرہ سے مروی ہے، جس کے الفاظ ہیں:

((عن ابن شهاب، عن ابی سلمة: ان ابا هريرة قال: سمعت رسول الله ﷺ يقول: يقبض الله الارض و يطوى السموات بيمينه ......))

''ابن شہاب -زہری- سے روایت ہے، اور وہ ابو سلمہ -بن عبدالرحمٰن بن عوف- سے روایت کرتے ہیں کہ ابو ہریرہ نے کہا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے: اللہ زمین کو مٹھی میں لے لے گا اور آسمانوں کو اپنے داہنے ہاتھ میں لپیٹ لے گا......'' ❶

امام بخاری نے یہی حدیث کتاب الرقاق، باب ۴۴ میں اور کتاب التوحید، باب ۶ میں انہی الفاظ میں دہرائی ہے، البتہ ان دونوں جگہوں پر ''السموات'' کے بجائے ''السماء'' آیا ہے۔ ❷

اور کتاب التوحید، باب ۱۹ میں عبداللہ بن عمر کی روایت سے اس کا جو اعادہ کیا ہے اس کے الفاظ ہیں:

((ان الله يقبض يوم القيامة الارض و تكون السموات بيمينه......))

''درحقیقت اللہ قیامت کے دن زمین کو مٹھی میں لے لے گا اور آسمان اس کے داہنے ہاتھ میں ہوں گے......'' ❸

یہاں یہ واضح کرنا تحصیل حاصل ہے کہ نبی کریم ﷺ سے ان دونوں صحابیوں کا ایک ہی وقت میں یہ حدیث سننا ضروری نہیں ہے، بلکہ مختلف اوقات میں سننا اقرب الی الصواب ہے۔ کیونکہ اولاً تو انہوں نے نبی ﷺ کے حوالہ سے اس کی روایت کی ہے، ابو ہریرہ نے کہا ہے: ''میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے'' اور ابن عمر کے الفاظ ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے۔ اس تفصیل کا تقاضا ہے کہ دونوں نے نبی ﷺ کی زبان مبارک سے الگ الگ

❶ نمبر ۴۸۱۲ ❷ ۶۵۱۹، ۷۳۸۲ ❸ ۷۴۱۲

Marfat.com

اوقات میں یہ حدیث سنی ہے ثانیا دونوں کی روایتوں میں جو معمولی سا فرق ہے وہ طبعی بھی ہے اور ادائے معنی کے مطابق بھی جس کی مثالوں سے قرآن پاک بھرا پڑا ہے، جبکہ اللہ تعالیٰ کی صفت ہے: لا یضل ربی ولا ینسی'' میرا رب نہ غلطی کرتا ہے اور نہ بھولتا ہے۔(طہ: ۵۲) اور قرآن کو نازل کرنے والے سید الملائکہ جبریل علیہ السلام کی صفت: الروح الامین ہے۔ (شعراء: ۱۹۳)

صحیح مسلم میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اس حدیث کے راوی سید التابعین سعید بن مسیب رحمہ اللہ ہیں اور حدیث کے الفاظ ہیں:

((قال رسول الله ﷺ: يقبض الله تبارك و تعالىٰ الارض يوم القيامة و يطوى السماء بيمينه......))

''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: اللہ تبارک وتعالیٰ قیامت کے دن زمین کو مٹھی میں لے لے گا اور آسمان کو اپنے داہنے ہاتھ میں لپیٹ لے گا۔'' ❶

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی جو حدیث بخاری میں آئی ہے، وہ مسلم میں دوسرے موقع سے متعلق ہے، یعنی نبی ﷺ نے منبر پر خطبہ دیتے ہوئے فرمایا اور عبداللہ بن عمر نے یہ منظر دیکھا اور نبی ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا۔ روایت کے الفاظ ہیں:

((رايت رسول الله ﷺ على المنبر، و هو يقول: ياخذ الجبار عز و جل، سماواته و أرضيه بيديه......))

''میں نے رسول اللہ ﷺ کو منبر پر دیکھا اور آپ فرما رہے تھے: جبار عز وجل اپنے آسمانوں اور زمینوں کو اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لے گا۔''

اس حدیث سے پہلے امام مسلم انہی ابن عمر سے جو حدیث لائے ہیں اس میں انہوں نے مذکورہ خطبہ کے وقت رسول اللہ ﷺ کی کیفیت بیان کی ہے جس سے قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی غضب ناکی پوری شدت سے منعکس ہوتی ہے اور اس کو بیان کرتے ہوئے نبی ﷺ پر ایک ایسی ہیبت طاری ہے کہ آپ کے نیچے منبر ہلنے لگتا ہے اور لگتا ہے کہ وہ آپ کو لے کر گر جائے گا۔ اس حدیث میں جو چیز قابل توجہ ہے، وہ اللہ تعالیٰ کے لیے دو ہاتھوں کا اثبات ہے۔

اللہ تعالیٰ کے دونوں ہاتھ داہنے ہیں:

قرآن و حدیث کے مطابق اللہ تعالیٰ کے لیے دو ہاتھ تو ثابت ہیں اور اس کے ایک ہاتھ کا داہنا ہونا بھی ثابت ہے، لیکن مذکورہ بالا آیت قرآنی اور احادیث میں یہ صراحت نہیں ہے کہ زمین اس کے کس ہاتھ کی مٹھی میں ہو گی۔ البتہ صحیح مسلم کی حدیث: ''اس کے آسمان اور اس کی زمینیں اس کے دونوں ہاتھوں میں ہوں گی'' سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ

❶ نمبر ۲۷۸۷

Marfat.com

جب اللہ تعالیٰ آسمانوں کو اپنے داہنے ہاتھ میں لپیٹ لے گا تو زمین اس کے دوسرے ہاتھ کی مٹھی میں ہو گی، لیکن ابو داؤد کی جس حدیث میں آیا ہے: "ثم یطوی الارضین، ثم یاخذھن بیدہ الاخری" پھر وہ زمینوں کو لپیٹ دے گا، پھر ان کو اپنے دوسرے ہاتھ میں لے لے گا۔" ❶ تو اس میں "بیدہ الاخری" حدیث کا ٹکڑا نہیں، بلکہ حدیث کی سند کے ایک راوی محمد بن علاء کا قول ہے، جیسا کہ امام ابو داؤد نے تصریح کر دی ہے۔

اسی طرح مسلم میں جو یہ آیا ہے کہ: "ثم یطوی الارض بشمالہ" "پھر وہ زمین کو اپنے بائیں ہاتھ میں لپیٹ لے گا" ❷ تو یہ منکر ہے جس کی دو وجہیں ہیں: (۱) سالم بن عبداللہ بن عمر سے اس کے راوی عمر بن حمزہ - بن عبداللہ بن عمر - ضعیف ہیں، یحییٰ بن معین اور نسائی نے ان کو ضعیف قرار دیا ہے، اور امام احمد نے ان کی مرویات کو منکر بتایا ہے۔ ❸ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ صحیح احادیث میں اللہ تعالیٰ کے دونوں ہاتھوں کو "یمین" قرار دیا گیا ہے، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

"و کلتا یدیہ یمین" اور اس کے دونوں ہاتھ داہنے ہیں۔ ❹

اس طویل بحث کا سبب:

میں نے اس مسئلہ پر اتنی طویل بحث اس لیے کی ہے تاکہ یہ دکھا سکوں کہ روایت بالمعنی کا جواز نہایت کڑی شرطوں سے مشروط ہے اور صحیح مسلم میں مروی ہونے کے باوجود یہ حدیث اس وجہ سے ناقابل اعتبار ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی صفت کے بیان میں دقت بیانی مفقود ہے۔ یاد رہے کہ بایاں ہاتھ دائیں سے کمزور ہوتا ہے اور صفات الٰہی نقص اور کمزوری سے پاک ہیں۔

صحیحین کی جو حدیثیں روایت بالمعنی کی مثال میں پیش کی گئی ہیں ان کی روشنی میں اس مسئلہ کو سمجھا جا سکتا ہے، منکرین اس کو ہوا بنا کر اس لیے پیش کرتے ہیں تاکہ حدیث کی شرعی حیثیت پر "قدغن" لگا سکیں، لیکن یہ ان کی خود فریبی ہے؟ اللہ تعالیٰ کی روشنی پھونکوں سے نہیں بجھائی جا سکتی۔

قرآن سے روایت بالمعنیٰ کی مثال:

اب میں قرآن پاک کی تین سورتوں سے ایسی تین آیتیں نقل کروں گا جن کا تعلق ایک ہی واقعہ سے ہے۔ یہ واقعہ مدین سے موسیٰ علیہ السلام کی واپسی کے موقع پر راستہ میں پیش آیا، رات تاریک بھی ہے اور سرد بھی اور راستہ بھی نامعلوم۔

۱: ...... ﴿اِذْ رَاٰ نَارًا فَقَالَ لِاَهْلِهِ امْكُثُوْٓا اِنِّیْٓ اٰنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّیْٓ اٰتِیْكُمْ مِّنْهَا بِقَبَسٍ اَوْ اَجِدُ عَلَى النَّارِ هُدًى﴾ (طہ: ۱۰)

---

❶ ۴۷۳۲ ❷ ۲۷۸۸-۲۴-

❸ لسان المیزان ص ۲۳۰ ج ۵، ترجمہ ۶۰۹۳، تقریب التہذیب، ترجمہ ۴۸۸۴، الجرح والتعدیل ص ۱۲۷ ج ۶، ترجمہ ۹۸۰۰

❹ مسلم ۱۸۲۷، الاسماء والصفات للبیہقی ص ۱۴۰ ج ۲ حدیث نمبر ۲۰۲، ۷۰۸.

Marfat.com

''جب اس نے ایک آگ دیکھی تو اپنے گھر والوں سے کہا تم ٹھہرو، دراصل میں نے ایک آگ محسوس کی ہے، تاکہ میں تمہارے پاس اس کا کوئی انگارا لے آؤں یا مجھے آگ کے پاس کوئی رہنمائی مل جائے۔''

۲:..... ﴿إِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِأَهْلِهِ إِنِّي آنَسْتُ نَارًا سَآتِيكُم مِّنْهَا بِخَبَرٍ أَوْ آتِيكُم بِشِهَابٍ قَبَسٍ لَّعَلَّكُمْ تَصْطَلُونَ﴾ (النمل: ۷)

''جب موسیٰ نے اپنے گھر والوں سے کہا دراصل میں نے ایک آگ محسوس کی ہے، میں وہاں سے تمہارے پاس کوئی خبر لے آؤں گا، یا تمہارے پاس اس کا کوئی سلگتا ہوا انگارا لے آؤں گا تاکہ تم لوگ تاپو۔''

۳:..... ﴿فَلَمَّا قَضَىٰ مُوسَى الْأَجَلَ وَسَارَ بِأَهْلِهِ آنَسَ مِن جَانِبِ الطُّورِ نَارًا قَالَ لِأَهْلِهِ امْكُثُوا إِنِّي آنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّي آتِيكُم مِّنْهَا بِخَبَرٍ أَوْ جَذْوَةٍ مِّنَ النَّارِ لَعَلَّكُمْ تَصْطَلُونَ﴾ (القصص: ۲۹)

''جب موسیٰ نے مدت پوری کر لی تو اپنے گھر والوں کو لے کر چل پڑا، اس نے طور کی طرف سے ایک آگ محسوس کی، اپنے گھر والوں سے کہا ٹھہرو دراصل میں نے ایک آگ محسوس کی ہے، شاید میں اس سے کوئی خبر لے آؤں یا آگ کا کوئی انگارا، تاکہ تم تاپو۔''

واقعہ بھی ایک ہے اور موقع و محل بھی ایک، اگر کسی حدیث میں اختصار و تفصیل اور الفاظ میں اس طرح کا کوئی فرق نظر آ جائے تو منکرین کے ایوانوں کے پائے چوبیں لرزنے لگتے ہیں، اور صحابۂ کرام سے لے کر ائمہ حدیث تک اور روایت حدیث سے تدوین حدیث تک ہر چیز کے خلاف ان کی زبان وقلم سے زہر ابلنے لگتا ہے۔

یہاں قرآن پاک کی مذکورہ بالا آیتوں سے متعلق یہ عرض کر دوں کہ یہ جس موقع و محل میں آئی ہیں اس کا تقاضا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام اور ان کے اہل خانہ کے درمیان بہت سی باتیں ہوئی ہوں گی، لیکن قرآن پاک نے صرف موسیٰ علیہ السلام کے بعض اقوال نقل کرنے پر اکتفا کیا ہے، کیونکہ مقصود واقعہ کی تفصیلات بیان کرنا نہیں تھا، بلکہ اس نعمت عظمیٰ کے بیان کی تمہید تھا جو نبوت و رسالت کی شکل میں اس وقت ان کو عطا کی گئی۔

مذکورہ بالا آیتوں کی تعبیروں میں جو اختلاف اور فرق ہے اس کو سمجھنے کے لیے یہ بات بھی ذہن میں رہنی چاہیے کہ مذکورہ آیتوں میں جو باتیں فرمائی گئی ہیں وہ سب وقوع پذیر ہوئی ہیں جن میں بعض کا ذکر کسی آیت میں ہوا ہے اور بعض کا کسی اور میں اور یہ بھی ذہن میں رہے کہ موسیٰ علیہ السلام اور ان کے گھر والے عربی زبان نہیں بولتے تھے۔

میں نے اس مسئلہ سے متعلق اتنی تفصیلی بحث اس وجہ سے کی ہے کہ اصلاحی صاحب نے بعض حدیثوں میں اس طرح کے تعبیری فرق و اختلاف کو بھی وجہ انتقاد بنایا ہے۔

روایت بالمعنیٰ کی دوسری مثال:

روایت بالمعنیٰ کی دوسری مثال وہ مشہور حدیث ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ گھڑنے یا آپ کی طرف

Marfat.com

کوئی جھوٹی بات منسوب کرنے کی وعید آئی ہے، یہ حدیث صحابہ کی بہت بڑی تعداد سے ان الفاظ میں مروی ہے:

((من كذب علي متعمّدًا فليتبوأ مقعده من النار))

''جو میرے اوپر قصداً جھوٹ بولے وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے۔'' ❶

((من تقول علي ما لم اقله ، فليتبوأ مقعده من النار))

''جو میری طرف ایسی بات منسوب کرے جو میں نے نہیں کہی ہے وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے۔''

یہ حدیث بخاری میں "من يقل علي ما لم أقل" کے الفاظ میں آئی ہے۔ (نمبر ۱۰۹) اور اس کا شمار ثلاثیات بخاری میں ہوتا ہے، رہے ابن ماجہ اور احمد تو انہوں نے اس کی روایت پہلے الفاظ ہی میں کی ہے۔ ❷

مذکورہ بالا تینوں تعبیروں میں سے کسی بھی تعبیر میں یہ حدیث اس معنیٰ میں ''روایات بالمعنیٰ'' میں شمار نہیں ہوتی جس کا دعوی منکرین حدیث کرتے ہیں، یعنی حدیث کے راوی صحابہ اور تابعین نے حدیث کے الفاظ قصداً بدل دیے ہیں، روایت بالمعنیٰ کی تعریف سے متعلق اوپر حافظ ابن حجر کا جو قول نقل کیا گیا ہے اس کی رو سے اگرچہ ایسا کرنا جائز تھا، مگر صحابہ اور تابعین روایت حدیث میں جس دقت بیانی اور امانت داری سے موصوف تھے اس کے پیش نظر درست اور صحیح بات یہی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ بات ان تمام الفاظ میں فرمائی ہے۔ ذیل میں، میں "كذب عليّ" کے مترادفات درج کر دینا چاہتا ہوں، تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ مذکورہ تینوں تعبیروں میں حدیث کے معنی اور مطلب میں ذرہ برابر بھی تبدیلی نہیں ہوتی۔

كذب عليَّ کے مترادفات:

أفِكَ (جھوٹ بولنا، کسی پر غلط الزام لگانا) اختلق (جھوٹ گھڑنا) افترى (کوئی بات گھڑ کر کسی کی طرف منسوب کرنا، کسی پر جھوٹا الزام لگانا) تقوَّل (کوئی بات خود گھڑ کر کسی دوسرے کے سر تھوپنا) زوَّر (جعل سازی کرنا، جھوٹی بات سچ کے قالب میں پیش کرنا، ملمع سازی کرنا)

"كذب عليّ" کے ان مترادفات میں سے بعض قرآن پاک میں بھی مستعمل ہیں۔

ایک ضروری وضاحت:

عربی میں جو افعال بطور ''صلہ'' کسی حرف جر کے ساتھ استعمال ہوتے ہیں، تو حروف جر ان کا لازمی حصہ بن جاتے ہیں اور ان کا مفہوم ان کے ساتھ جڑا ہوتا ہے، نہ تو ان حروف کا الگ سے کوئی مفہوم ہوتا ہے اور نہ ان کے بغیر ان افعال کا استعمال درست ہے، اور نہ ان کی جگہ متبادل حروف ہی استعمال کیے جا سکتے ہیں۔

اس وضاحت کی روشنی میں "كذب عليَّ" میں "على" کا الگ سے کوئی مفہوم نہیں ہے یاد رہے کہ "عليَّ" میں

❶ بخاری: ۱۱۰، ۱۲۹۱، ۳۴۶۱، ۶۱۹۷، مسلم: ۳، ۴، ۳۰۰۴، ابوداود: ۳۶۵۱، ترمذی: ۲۲۵۷، ۲۶۶۹، ۲۹۵۱، ۳۷۱۵، ابن ماجہ: ۳۰، ۳۲، ۳۶، ۳۷.

❷ ابن ماجہ: ۳۴، ۳۵، مسند ۸۲۴۹.

Marfat.com

"علی" یائے متکلم کی طرف مضاف ہے اور مطلب ہے کہ کوئی بات خود گھڑ کر، بنا کر یا وضع کر کے میری طرف منسوب کر دینا کہ میں نے وہ بات کہی ہے۔

لیکن صوفیا اور کرّامیہ فرقے کے لوگوں نے ترغیب و ترہیب اور فضائل کے بارے میں بہت سی عبارتیں خود گھڑ کر ان کو نبی ﷺ کی طرف منسوب کر دیا ہے اور جب ان کو زیر بحث حدیث سنائی گئی اور اس میں بیان کردہ وعید سے ان کو خبردار کیا گیا تو انہوں نے یہ کہہ کر اپنے اس "مذموم فعل" کی وجہ جواز پیش کی کہ "کذبنا له لا علیه" "ہم نے آپ کے لیے جھوٹ گھڑا ہے، آپ کے خلاف نہیں۔" حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں ان کے استدلال کی نکیر کرتے ہوئے اس کو عربی زبان سے ناواقفیت قرار دیا ہے۔ ابن حجر نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس حدیث کی بعض سندوں میں "لیضل به الناس" کا اضافہ بھی ملتا ہے۔ جس کے ساتھ حدیث کی عبارت یوں ہوگئی ہے: "من کذب علی لیضل به الناس" "جو میرے اوپر اس لیے جھوٹ بولے کہ اس کے ذریعہ لوگوں کو گمراہ کرے" لیکن یہ اضافہ ثابت نہیں ہے جس کی روایت بزار نے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی نسبت سے کی ہے۔ ❶

روایت بالمعنیٰ ہی کے ضمن میں ایک اور بات کا ذکر بڑی اہمیت کا حامل ہے جس کی تفصیل یہ ہے کہ اس مسئلہ کو رواج دینے میں صوفیا ہمیشہ سے پیش پیش رہے ہیں، چونکہ ان کی کتابیں جھوٹی اور من گھڑت روایتوں سے مملو ہوتی ہیں اور ان کی مجلسوں میں جھوٹی روایتوں سے بہت زیادہ استدلال کیا جاتا ہے، اس لیے اگر کوئی ان کے اس فعل کی از راہ "خیر خواہی" نکیر کرتا ہے تو وہ یہ کہہ کر اس کی وجہ جواز پیش کرتے ہیں کہ یہ "روایت بالمعنیٰ" ہے۔

حاجی امداد اللہ برصغیر کے ایک غالی صوفی گزرے ہیں وہ دینی علوم سے بے بہرہ تھے، لیکن اہل حق اور اہل توحید سے شدید بغض و کینہ رکھتے تھے، مکہ مکرمہ میں اپنے دوران قیام انہوں نے برصغیر کے اہل توحید اور اہل حدیثوں پر "وہابیت" کا الزام لگا کر جو ظلم و ستم کیا ہے اس کی داستان مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی کتاب: آزاد کی کہانی آزاد کی زبانی" میں مدون کر دی ہے۔

طرفہ تماشا یہ کہ "وحدۃ الوجود" کے داعی یہ صوفی بزرگ برصغیر کے اکابر احناف کے پیر و مرشد تھے۔ جن میں سے ایک مولانا اشرف علی تھانوی بھی تھے۔ جو ان کو قطب عالم مانتے تھے۔ حاجی امداد اللہ اپنے کتابچوں اور اقوال میں جھوٹی روایتیں اور جھوٹے واقعات حدیث کے نام سے بیان کرنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے اور مولانا تھانوی ان کے اس فعل کی "تبریر" روایت بالمعنی کہہ کر کیا کرتے تھے۔ میرے اس دعویٰ کی صداقت جانچنے کے لیے مولانا تھانوی کی کتاب "امداد المشتاق الی اشرف الأخلاق" پر ایک طائرانہ نظر ڈال لینا کافی ہے۔

یہ ایک ضمنی بات تھی جس کا ذکر موضوع کی مناسبت سے خالی از فائدہ نہیں۔

---

❶ ص ۳۴۱ ج ۱

Marfat.com

خلاصۂ بحث:

روایت بالمعنیٰ کے مسئلہ میں، میں نے جو طویل بحث کی ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ اصلاحی صاحب نے اس کی جو بھیانک تصویر پیش کی ہے وہ ان کی اپنی ذہنی اپج ہے، حقیقت میں اس کا کوئی وجود نہیں ہے۔ اصلاحی صاحب کے گرد و پیش جو لوگ تھے اور ان کے بعد انکار حدیث کا پرچم جو لوگ اٹھائے ہوئے ہیں وہ میرے اصل مخاطب نہیں ہیں، بلکہ ان کے مسموم افکار سے متاثر ہو جانے والے وہ لوگ مخاطب ہیں جو براہ راست حدیث اور علم الحدیث کی امہات الکتب کا مطالعہ کرنے اور سمجھنے کی استعداد نہیں رکھتے۔ اس لیے میں نے اس مسئلہ کا مختلف زاویوں سے جائزہ لیا ہے۔

نواں دعویٰ:

یہ دعویٰ باطل ہے اس لیے کہ یہ جس روایت پر مبنی ہے وہ حدیث نہیں جھوٹ ہے اور اصول ہے کہ جو چیز باطل پر مبنی ہوتی ہے وہ باطل ہوتی ہے۔

دسواں دعویٰ:

اس کے تحت اصلاحی صاحب تحریر فرماتے ہیں:

''اس میں شبہ نہیں کہ راوی اگر ذہین ہو تو وہ دوسرے کی قابل اعتماد ترجمانی کر سکتا ہے اگر ترجمانی نہیں کر سکتا تو کم از کم وہ اس کی ضروری وضاحت کر سکتا ہے۔'' [1]

مولانا کی یہ عبارت بالکل بے معنیٰ ہے، انہوں نے جو کچھ کہنا چاہا ہے اس کی تعبیر میں قاصر رہے ہیں۔ راوی حدیث کی روایت کرتا ہے، دوسروں کو پہنچاتا ہے وہ کسی کی ترجمانی نہیں کرتا۔ اب جہاں تک ذہانت کا مسئلہ ہے تو ''ابلیس'' سے زیادہ ذہین کون ہوگا؟

حدیث میں راوی کی تعریف:

نبی کریم ﷺ نے جس راوی حدیث کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا کی ہے اس کی صفت بھی بیان کر دی ہے۔ ارشاد نبوی کے الفاظ ہیں:

((نضّر الله امرأً سمع منا حديثًا، فحفظه حتى يبلغه، فرب حامل فقه إلى من هو أفقه منه، و رب حامل فقه ليس بفقيه))

''اللہ اس شخص کو ترو تازہ رکھے جس نے ہم سے کوئی حدیث سنی اور اس کو یاد رکھا یہاں تک کہ اس کی تبلیغ کر دی، پس بہت سے علم کے نقل کرنے والے ایسے شخص کو علم منتقل کرتے ہیں جو ان سے زیادہ علم رکھنے والے ہوتے ہیں اور بہت سے علم کے ناقل خود عالم نہیں ہوتے۔'' [2]

---

[1] ص ۱۰۶

[2] ابو داود ۳۶۶۰، ترمذی ۲۶۵۶، ابن ماجہ ۲۳۰، ۳۵۰۶ دارمی ۲۳۵.

Marfat.com

یہ حدیث زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔اس مضمون کی حامل احادیث عبداللہ بن مسعود، انس بن مالک، ابوسعید خدری، عبداللہ بن عمرو بن عاص، نعمان بن بشیر، معاذ بن جبل، ابو ہریرہ اور ابوالدرداء رضی اللہ عنہم سے بھی مروی ہیں۔ ❶

نَضَّرَ یُنَضِّرُ کے معنی ہیں: تروتازہ رکھنا، خوش وخرم رکھنا، بارونق بنانا اور رکھنا وغیرہ، محدثین اور رواۃ حدیث کے حالات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر دور میں یہ لوگ دوسرے لوگوں سے اس اعتبار سے ممتاز اور نمایاں رہے ہیں کہ ان کے چہروں کی رونق اور ان کی تروتازگی ان کے اطمینان قلب اور ان کی باطنی سعادت و مسرت کی غماز رہی ہے، جبکہ مادی طور سے ان کی اکثریت فقر و فاقہ سے دوچار رہی ہے۔

حدیث میں ''فقہ'' سے مراد اصطلاحی فقہ نہیں، بلکہ علم مراد ہے اور نبی ﷺ نے اپنے ارشاد سے یہ واضح فرما دیا ہے کہ حفظ حدیث اور روایت حدیث کے لیے بہت زیادہ علم کی ضرورت نہیں ہے۔ چنانچہ قرآن پاک کے لاکھوں حفاظ اس کا ایک لفظ بھی نہیں سمجھتے لیکن حفظ میں سند کا درجہ رکھتے ہیں۔

حدیث کے مطابق حفظ وضبط راوی کی بنیادی صفت ہے، رہی اس کی عدالت تو اس کا ذکر اس لیے نہیں فرمایا کہ جو لوگ اس حدیث کے مخاطب ہیں ان کا عدالت کی صفت سے موصوف ہونا محل بحث تھا ہی نہیں اور جھوٹی اور باطل روایتوں کے ناقل وراوی ''رواۃ حدیث'' میں شمار نہیں ہوتے۔

اس حدیث سے اس ''روایت بالمعنی'' کی جڑ کٹ جاتی ہے جس کی ترویج منکرین کرتے ہیں، کیونکہ حدیث کے بعض الفاظ کی ان کے مترادف کے ذریعہ روایت اس میں شمار نہیں ہوتی اور ایسا نہایت ناگزیر حالت میں کیا جاتا ہے۔

معلوم ہوا کہ ''راوی کی ذہانت'' کی بات وہی شخص کر سکتا ہے جو حدیث اور روایت حدیث کے مفہوم سے ناآشنا ہے؛ درحقیقت حدیث کے اصل الفاظ کی جگہ مترادف الفاظ لانا ذہانت نہیں، زبان کے علم کا متقاضی ہے۔ پھر جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے حدیث کا راوی، اس کا ناقل اور مبلغ ہوتا ہے، اس کے فرائض منصبی میں ''مروی عنہ'' کی ترجمانی یا اپنی مرویات کی وضاحت بھی داخل نہیں ہے، اگر وہ کسی بات کی وضاحت کرتا بھی ہے تو مروی عنہ کے حوالہ سے کرتا ہے اس میں بھی وہ ایک طرح کا ناقل ہوتا ہے۔

براء بن عازب کی حدیث سے استدلال بے محل ہے:

اللہ تعالیٰ اصلاحی صاحب کو معاف فرمائے، انہوں نے لوگوں میں ''حدیث بیزاری'' کو عام کرنے کے لیے کوئی کوشش اٹھا نہیں رکھی ہے اور ذخیرۂ حدیث کو ناقابل اعتبار قرار دینے کے لیے مغالطے پر مغالطے دیے ہیں اسی طرح وہ اسلامی شریعت کے اس دوسرے بنیادی ماخذ کو تو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے ہیں، البتہ ایک عالم دین اور مفسر قرآن کی حیثیت سے اپنی شناخت پر ''کالک'' مل دی ہے۔

❶ ترمذی ص ۲۰۲۵ ج ۲، تحقیق فتح المغیث ص ۱۶۲ ج ۲.

Marfat.com

انہوں نے پہلے تو ''روایت بالمعنی'' کا ایک نیا مفہوم متعین کیا ہے، پھر اس کی کمزوریاں دکھائی ہیں اور اپنی بدنیتی کی وجہ سے ٹھوکر پر ٹھوکر کھاتے چلے گئے ہیں۔

براء بن عازب رضی اللہ عنہ کی حدیث کا متن پیش کرنے سے قبل یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک سکھائی ہوئی دعا کو دہراتے ہوئے انہوں نے اس کے ایک فقرہ: "و بنبیك الذی ارسلت" کی جگہ "و برسولك الذی ارسلت" کہہ دیا تھا جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تنبیہ فرما دی اور اپنے ہی الفاظ کو ادا کرنے کی تاکید فرما دی۔

حدیث کا متن:

((عن البراء بن عازب قال: قال النبی ﷺ: إذا أتیت مضجعك فتوضأ وضوءك للصلاة، ثم اضطجع علی شقك الأیمن، ثم قل: اللهم أسلمت وجهی إلیك، و فوضت أمری إلیك، و ألجأت ظهری إلیك رغبة و رهبة إلیك، لا ملجأ و لا منجا منك إلا إلیك، اللهم آمنت بکتابك الذی أنزلت و بنبیك الذی أرسلت، فإن مت من لیلتك، فأنت علی الفطرة، و اجعلهن اخر ما تتکلم به، قال: فرددتها علی النبی ﷺ فلما بلغت: اللهم آمنت بکتابك الذی أنزلت، قلت: و برسولك الذی أرسلت قال: لا، و بنبیك الذی أرسلت))

''براء بن عازب سے روایت ہے، کہتے ہیں: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: جب تم اپنے بستر پر جانے کا ارادہ کرو تو نماز کے لیے اپنے وضو کی طرح وضو کرو۔ پھر اپنے دائیں پہلو پر لیٹ جاؤ، پھر کہو: اے اللہ! میں نے اپنے آپ کو تیرے حوالے کیا، اپنا معاملہ تیرے سپرد کیا، اور اپنے تمام امور میں تجھ کو سہارا بنایا، یہ سب کچھ میں نے تیری رضا کی خواہش اور تیری ناراضگی کے خوف کے جذبے سے کیا، تیرے سوا کوئی جائے پناہ نہیں اور تیرے عذاب سے نجات صرف تیرے پاس ہے، اے اللہ! میں تیری اس کتاب پر ایمان لایا جو تو نے نازل کی ہے اور تیرے اس نبی پر ایمان لایا جس کو تو نے بھیجا ہے۔ پس اگر اسی رات تمہاری موت آ گئی تو تم فطرت-توحید- پر مرو گے۔ ان کلمات کو اس دن کے اپنے آخری کلمات بنا لو۔

کہتے ہیں: جب ان کلمات کو یاد کرنے کے لیے آپ پر ان کو دہراتے ہوئے میں آمنت بکتابك الذی أنزلته" تک پہنچا تو کہہ دیا: "و برسولك الذی ارسلت" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں، "و بنبیك الذی أرسلت"[1]

[1] بخاری ۲۴۷، ۶۳۱۱، ۶۳۱۳، ۶۳۱۵، ۷۴۸۸، مسلم ۲۷۱۰۔

Marfat.com

اصلاحی کی ہرزہ سرائی:

اصلاحی صاحب یہ حدیث نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

''اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی ﷺ نے سونے کے وقت کے آداب اور دعا سکھانے کے بعد جب اس حدیث کے راوی حضرت براء بن عازب سے دعا کے الفاظ دہرانے کے لیے کہا تو انہوں نے اس کے آخر میں "و بنبیك الذی ارسلت" کی جگہ "و برسولك الذی ارسلت" کر دیا ان کی اس تبدیلی پر آپ نے ٹوکا اور اصلاح فرما دی، اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں ایک ایسی غلطی ہوگئی تھی جس کا تعلق دین کی ایک حقیقت سے تھا۔ اس لیے کہ "برسولك الذی أرسلت" میں نبی ﷺ کا جو اصل منصب ہے کہ آپ نبی ہیں اور نبی ہونے کے ساتھ ساتھ رسول بھی ہیں واضح نہیں ہوتا۔'' ❶

آپ کی توجیہ صحیح نہیں:

محمد بن عبداللہ ﷺ اصلاً نبی تھے اور تبعاً رسول تھے یا اصلاً رسول تھے اور تبعاً نبی؟ میں اس بحث میں پڑنا نہیں چاہتا، صرف اتنا عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اگر براء بن عازب رضی اللہ عنہ کے نبی کی جگہ رسول کہہ دینے سے دین کی کسی حقیقت پر پردہ پڑ رہا تھا تو پھر آپ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے بارے میں کیا فرمائیں گے: ''هُوَ الَّذِیْ أَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ'' وہی ہے جس نے اپنا رسول بھیجا۔ (سورۂ فتح: ۲۸) کیا "رسولك الذی ارسلت" اور "ارسل رسوله" میں کوئی ادنیٰ سا فرق ہے؟ کیا نعوذ باللہ، اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں بھی دین کی کسی حقیقت پر پردہ ڈال دیا گیا ہے؟

براء کی تعبیر قرآنی ہے:

براء بن عازب رضی اللہ عنہ کی زبان سے نبی کریم ﷺ کی سکھائی ہوئی دعا دہراتے ہوئے "بنبیك الذی أرسلت" کی جگہ "و برسولك الذی أرسلته" کے الفاظ اس لیے نکل گئے تھے کہ پورے قرآن پاک میں دو جگہوں کو چھوڑ کر (اعراف ۹۴، زخرف ٦) فعل "ارسال" کے ساتھ رسول ہی کا ذکر آیا ہے۔ یہ میں اس وجہ سے کہہ رہا ہوں کہ پوری دعا کے الفاظ انہوں نے صحیح دہرائے ہیں، پھر کیا وجہ ہے کہ اس جگہ انہوں نے الفاظ بدل دیے دراصل قرآن پاک میں جس کثرت سے "ارسلنا" کے ساتھ رسول کا ذکر آیا ہے اس کی وجہ سے ان کی زبان سے بے ساختہ "و برسولك الذی ارسلت" نکل گیا۔ ان کے ذہن میں نہ آپ کی فلسفیانہ توجیہ تھی اور نہ دوسرے شراح حدیث کی توجیہات۔

نبی ﷺ کی تنبیہ کی اصل وجہ:

براء بن عازب رضی اللہ عنہ نے ''وبنبیک الذی أرسلت'' کی جگہ ''وبرسولک الذی ارسلت'' کہہ کر کوئی عقائدی یا شرعی غلطی نہیں کی تھی اور نہ اس کی وجہ سے نبی کریم ﷺ نے ان کی اصلاح فرمائی تھی۔ دراصل ان کی سب سے بڑی غلطی یہ تھی

❶ ص ۱۰۸

Marfat.com

کہ انہوں نے نبی ﷺ کے تلقین کردہ اور سکھائے ہوئے لفظ کو بدل دیا تھا جو رسول کی رسالت پر ایمان کے منافی تھا اور ان کی اصلاح کر کے نبی ﷺ نے قیامت تک آنے والے ان لوگوں کو جو آپ کی رسالت پر ایمان کے مدعی ہوں گے۔ یہ حکم دیا ہے کہ وہ آپ کی زبان مبارک سے نکلنے والے کسی شرعی لفظ کو نہ بدلیں اور نہ آپ کی طرف کوئی ایسا لفظ منسوب کریں جو آپ کی زبان مبارک سے نہیں نکلا ہے۔ کیونکہ یہ سب کچھ وحی الٰہی پر مبنی ہے۔

عام دعائیہ کلمات، نماز کے ارکان اور سنن اور ان کے اذکار، غیبی امور کی خبریں، اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات اور بعض پیشین گوئیاں۔ اسی طرح تشریعی احکام وغیرہ سے متعلق نبی ﷺ کے اپنے الفاظ خاص معانی اور مدلولات رکھتے ہیں ان کی پابندی نہ کرنے سے احکام بدل سکتے ہیں۔ لیکن اس طرح کی حدیثیں متعدد صحابہ سے مروی ہیں اور خود نبی ﷺ نے مختلف مواقع پر فرمائی ہیں اس لیے اگر ذہنوں میں فتور اور دلوں میں روگ نہ ہو تو ان سے اخذ مطالب میں کوئی دقت نہیں ہوگی۔

براء بن عازب کی حدیث میں بھی نبی کی جگہ رسول کہہ دینے سے حدیث کا مفہوم قطعاً نہیں بدلا تھا، اس لیے کہ نبی اور رسول الگ الگ ایک دوسرے کے مترادف اور ایک جگہ ایک دوسرے سے مغایر ہیں اور نبی کے عام اور رسول کے خاص ہونے کے باوجود نبی فرما کر خود قرآن پاک میں رسول اور نبی دونوں کو مراد لیا گیا ہے۔ ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِبْرٰهِيْمَ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا﴾ (مریم: ۴۱)

''اور کتاب میں ابراہیم کو یاد کرو درحقیقت وہ نہایت راست رو نبی تھا۔''

احادیث احکام سے احکام کے استنباط کے موقع پر اولا تو ساری حدیثیں پیش نظر ہونی چاہئیں جس طرح کسی ایک موضوع سے متعلق تمام قرآنی آیات کا استحضار ضروری ہے۔ ثانیا مجموعی احادیث کو سامنے رکھ کر احکام کا استنباط کرنا چاہیے۔

لوط علیہ السلام کی خدمت میں بصورت مہمان فرشتوں کی آمد کے موقع پر اپنی بدکردار قوم کی گندی خصلتوں کی وجہ سے ان کو جس ذہنی کوفت اور دلی الم کا سامنا تھا اس کا نقشہ سورۂ ہود میں موجود ہے اس سخت آزمائش کے وقت فرشتوں نے یہ کہہ کر ان کو دلاسہ تو دے دیا تھا کہ یہ بدطینت ان تک نہیں پہنچ سکتے۔ (۸۱) مگر وہاں اس سے زیادہ کچھ نہیں فرمایا گیا ہے، لیکن سورۂ قمر میں، جس میں بہت زیادہ غضب ناکی پائی جاتی ہے یہ بات کھول دی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کا نور بصارت سلب کر لیا تھا:

﴿وَلَقَدْ رَاوَدُوْهُ عَنْ ضَيْفِهٖ فَطَمَسْنَآ اَعْيُنَهُمْ ..... الآية﴾ (۳۷)

''درحقیقت انہوں نے ان کے مہمانوں کو حاصل کرنے کے لیے ان کو ورغلایا تو ہم نے ان کی آنکھیں بے نور کر دیں۔''

Marfat.com

پورے قرآن پاک میں لوط علیہ السلام اور دوسرے رسولوں کی کثرت ذکر کے باوجود یہ تعبیر صرف اسی ایک سورت میں آئی ہے۔

حدیث میں عیب جوئی کی ایک اور مثال:

اصلاحی صاحب نے براء بن عازب رضی اللہ عنہ کے "بنبيك الذى أرسلته" کی جگہ "برسولك الذى أرسلته" کہہ دینے کو "روایت بالمعنیٰ" سے حدیث کے معنی میں ایسے فرق کا سبب قرار دیا ہے جس سے فلسفۂ دین کی تعبیر میں غلطی کا اندیشہ تھا۔ اس فلسفۂ دین یا حقیقتِ دین کا پردہ چاک کرنے کے بعد روایت میں اختلاف سے ان کے غلط استدلال کی ایک اور مثال پیش کر رہا ہوں جس سے ان کی نظر میں احکام میں فرق پڑ سکتا ہے، فرماتے ہیں:

"ایک روایت میں یہ بیان ہوا ہے کہ ایک بدو نے عمداً رمضان کا ایک روزہ توڑ دیا اور سر پیٹتا ہوا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی پریشانی کا سبب دریافت فرمایا تو اس نے تمام روداد سنائی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو روزے کا جو کفارہ بتایا اس کی روایت میں راویوں کا اختلاف دیکھیے جو روایت بالمعنیٰ ہی کا نتیجہ ہے۔" ❶

واقعہ کی غلط تصویر:

اصلاحی صاحب نے جس حدیث کی روایت میں راویوں کے اختلاف بیان کی تمہید کے طور پر یہ عبارت لکھی ہے اس سے واقعہ کی صحیح تصویر نہیں بنتی اور یہ نہیں معلوم ہوتا کہ وہ جس حدیث میں راویوں کا اختلاف دکھانے جا رہے ہیں اس میں حالت صوم میں جنسی فعل کا کفارہ بیان کیا گیا ہے ایک مختصر سی تمہیدی عبارت میں دقت بیانی کا یہ فقدان صاحب عبارت کو یہ حق نہیں دیتا کہ وہ کسی حدیث کی روایت میں ایسے اختلاف بیان کو بنیاد بنا کر اس کی صحت کو مشکوک بنائیں جو درحقیقت ایسا اختلاف بیان نہیں ہے جس سے اس حدیث سے نکلنے والا حکم متاثر ہوتا ہے، جیسا کہ ان شاء اللہ آئندہ واضح کروں گا۔

اصلاحی صاحب نے اس زیر بحث مسئلہ سے متعلق ابو ہریرہ اور ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی دو صحیح حدیثوں کو نقل کرنے اور اپنی نظر میں ان کے باہمی اختلاف کو بیان کرنے کے بعد یہ دعویٰ کیا ہے کہ "روایت بالمعنیٰ" کے فرق نے ایک حکم کو غیر واضح کر دیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ فقہاء کے درمیان کفارہ کے تعین میں بڑا اختلاف پایا جاتا ہے۔ ❷

تو عرض ہے کہ یہ بھی ان کی غلط بیانیوں میں سے ایک ہے، کیونکہ حالتِ روزہ میں جنسی فعل کے کفارہ کے مسئلہ میں جمہور اہل حدیث، مذاہب اربعہ اور اہل الظاہر کے درمیان جو اتفاق پایا جاتا ہے ویسا اتفاق شاید ہی کسی مسئلہ میں پایا جاتا ہو۔ مالکیہ نے اس مسئلہ میں دوسروں سے جو الگ راہ اختیار کی ہے وہ کفارہ کی تینوں صورتوں - (۱) گردن آزاد کرنا، (۲) دو ماہ کے مسلسل روزے رکھنا (۳) ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانا - میں ترتیب کی عدم پابندی ہے، اور بس نفس کفارہ

❶ ص ۱۰۸　❷ ص ۱۱۰

Marfat.com

میں وہ بھی سب کے ساتھ ہیں۔

حدیث کا متن:

یہ حدیث ابو ہریرہ اور ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا نے روایت کی ہے دونوں کی روایتوں میں جو فرق ہے وہ تفصیل اور اختصار کا فرق ہے، ابو ہریرہ اس مجلس میں موجود تھے جس میں اس صحابی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر روزہ کی حالت میں اپنی بیوی کے ساتھ مباشرت کر لینے کا واقعہ بیان کیا تھا اور ام المومنین نہ شریک مجلس تھیں اور نہ ہو سکتی تھیں، یعنی انہوں نے اپنے حجرے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے صحابی کے درمیان ہونے والی گفتگو سنی تھی۔

دونوں روایتوں میں جن باتوں میں اتفاق ہے ان میں تعبیر کی حیرت ناک یکسانیت ہے۔

ابو ہریرہ کی حدیث:

((بینما نحن جلوس عند النبی ﷺ إذ جاء ه رجل، فقال: یا رسول الله! هلكت، قال: مالك؟ قال: وقعت علی امرأتی و انا صائم، فقال رسول الله ﷺ: هل تجد رقبة تعتقها؟ قال: لا، قال: فهل تستطیع أن تصوم شهرين متتابعين؟ قال: لا، فقال: فهل تجد إطعام ستين مسكينا؟ قال: لا فمكث النبی ﷺ، فبينا نحن على ذلك اتی النبی ﷺ بعرق فيها تمر - العرق المكتل - قال: اين السائل؟ فقال: أنا، قال: خذ هذا فتصدق به" فقال الرجل: اعلی أفقر منی یا رسول الله؟ فو الله ما بين لابتيها -يريد الحرتين- أهل بيت افقر من اهل بيتی، فضحك النبی ﷺ حتی بدت أنيابه، ثم قال: أطعمه أهلك))

''جس وقت کہ ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بیٹھے ہوئے تھے آپ کی خدمت میں ایک شخص آ گیا اور عرض کیا: اے اللہ کے رسول! میں ہلاک ہو گیا، فرمایا: کیا ہوا؟ عرض کیا: میں روزے کی حالت میں اپنی بیوی سے مباشرت کر بیٹھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا تمہارے پاس کوئی غلام ہے جس کی گردن آزاد کر سکتے ہو؟ عرض کیا: نہیں، فرمایا: کیا تم لگا تار دو ماہ کے روزے رکھ سکتے ہو؟ عرض کیا: نہیں، فرمایا: کیا تمہارے اندر ساٹھ مسکینوں کو کھلانے کی استطاعت ہے؟ عرض کیا: نہیں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم تھوڑی دیر ٹھہرے رہے اور ہماری حالت بھی وہی رہی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک تھیلی لائی گئی جس میں کھجوریں تھیں اور عرق مکتل کو کہتے ہیں یعنی ٹوکری، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سوال کرنے والا کہاں ہے؟ اس نے عرض کیا: میں، فرمایا: یہ لو اور اسے صدقہ کر دو: اس شخص نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! کیا اپنے سے زیادہ محتاج پر صدقہ کر دوں؟ اللہ کی قسم مدینہ کی دونوں سیاہ پہاڑیوں -مراد سیاہ پتھریلی زمین ہے- کے درمیان کوئی گھرانہ میرے گھرانے سے

Marfat.com

زیادہ محتاج نہیں ہے۔ نبی ﷺ ہنس پڑے یہاں تک کہ آپ کے دندان مبارک ظاہر ہو گئے۔ پھر آپ نے فرمایا اسے اپنے اہل خانہ کو کھلا دو۔'' ❶

اوپر ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث کا جو متن اور ترجمہ پیش کیا گیا ہے وہ صحیح بخاری کی روایت ہے۔

صحیح مسلم کی روایت میں بعض الفاظ کم ہیں اور ایک دو الفاظ مختلف بھی ہیں جو بیان واقعہ سے متعلق ہیں۔ رہا شرعی حکم تو اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

امام بخاری ام المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت دو جگہ لائے ہیں۔ (نمبر ۱۹۳۵، ۶۸۲۲)

ام المؤمنین عائشہ کی حدیث:

عباد بن عبداللہ بن زبیر نے خبر دی ہے کہ انہوں نے عائشہ رضی اللہ عنہا کو فرماتے ہوئے سنا ہے:

((إن رجلا اتى النبى ﷺ فقال انه احترق ، قال: مالك؟ قال: أصبت اهلى فى رمضان ، فاتى النبى ﷺ بمكتل يدعى العرق ، فقال: اين المحترق؟ قال: انا قال: تصدق بهذا))

''ایک شخص نبی ﷺ کی خدمت میں آیا اور عرض کیا: وہ جل گیا، فرمایا: کیا ہوا؟ عرض کیا: رمضان میں اپنی بیوی سے جماع کر بیٹھا، نبی ﷺ کے پاس ایک ٹوکری لائی گئی جس کو ''عرق'' کہتے ہیں، فرمایا: جلنے والا کہاں ہے؟ عرض کیا: میں، فرمایا: اسے صدقہ کر دو۔'' ❷

اس روایت کا لفظ لفظ یہ گواہی دے رہا ہے کہ ام المومنین نے نبی ﷺ کے الفاظ مالك ، اين المحترق اور تصدق بهذا کے علاوہ سب کچھ اپنے الفاظ میں ادا کیا ہے۔

ام المومنین کی دوسری حدیث:

((اتى رجل النبى ﷺ فى المسجد ، قال: احترقت ، قال: مم ذاك؟ قال: وقعت بامرأتى فى رمضان ، قال له: تصدق ، قال: ما عندى شىء ، فجلس و أتاه إنسان يسوق حمارا و معه طعام -قال عبدالرحمن: ما أرى ما هو؟- إلى النبى ﷺ ، فقال: أين المحترق؟ فقال: ها أنا ذا ، قال: خذ هذا فتصدق به ، قال: على أحوج منى؟ ما لأهلى طعامٌ ، قال: فكلوه))

''ایک شخص نبی ﷺ کی خدمت میں مسجد میں آیا اور عرض کیا میں جل گیا، پوچھا: ''ایسا کس چیز سے ہوا؟'' عرض کیا: میں رمضان میں اپنی بیوی سے جماع کر بیٹھا، آپ ﷺ نے اس سے فرمایا: ''صدقہ کرو'' اس

❶ بخاری ۱۹۳۶، ۱۹۲۷، ۲۶۰۰، ۵۳۶۸، ۶۰۸۷، ۶۱۶۴، ۶۷۰۹، ۶۷۱۰، ۶۷۱۱، ۶۸۲۱۔ ❷ بخاری ۱۹۳۵۔

Marfat.com

نے عرض کیا: میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ پھر بیٹھ گیا، اتنے میں ایک آدمی وہاں ایک گدھا ہانکتے ہوئے آ گیا جس کے ساتھ کھانا تھا۔ حدیث کے راوی عبدالرحمٰن بن قاسم کہتے ہیں مجھے نہیں معلوم وہ کیا تھا۔ وہ آدمی نبی ﷺ کے پاس آیا، آپ ﷺ نے پوچھا: ''جلنے والا کہاں ہے؟'' اس نے جواب دیا: میں یہ ہوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''یہ لو اور اسے صدقہ کر دو۔'' اس نے عرض کیا: اپنے سے زیادہ محتاج پر؟ میرے اہل خانہ کے پاس تو کھانے کو کچھ نہیں، فرمایا ''تو اسے کھا لو۔'' ❶

مسلم کی روایت:

امام مسلم اپنی صحیح میں ام المومنین کی یہ حدیث دو سندوں سے لائے ہیں دونوں کے الفاظ میں قدرے اختلاف ہے۔

پہلی حدیث:

((جاء رجل إلى رسول الله ﷺ فقال: احترقت، قال رسول الله ﷺ: "لم" قال: وطئت امرأتي في رمضان نهارا، قال: "تصدق تصدق" قال: ما عندي شيء، فامره ان يجلس، فجاء عرقان فيهما طعام، فأمره رسول الله ﷺ ان يتصدق به))

''ایک شخص رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آیا اور کہا: میں جل گیا، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کیوں؟ عرض کیا: میں نے رمضان میں دن کے وقت اپنی بیوی سے جماع کر لیا، فرمایا: ''صدقہ کرو، صدقہ کرو'' عرض کیا: میرے پاس کچھ نہیں، آپ ﷺ نے اس کو حکم دیا کہ بیٹھ جائے۔ اتنے میں دو تھیلیاں آئیں جن میں کھانا تھا اور رسول اللہ ﷺ نے اس کو یہ حکم دیا کہ اس کو صدقہ کر دے۔'' ❷

دوسری حدیث:

((اتى رجل الى رسول الله ﷺ في المسجد في رمضان، فقال: يا رسول الله! احترقت، احترقت، فسأله رسول الله ﷺ: "ما شأنه؟" فقال: أصبت أهلي، قال: "تصدق"، فقال: و الله! يا نبي الله، ما لي شيء و ما اقدر عليه، قال: "اجلس" فجلس، فبينا هو على ذلك أقبل رجل يسوق حمارا عليه طعام، فقال رسول الله ﷺ: أين المحترق آنفا؟ فقام الرجل، فقال رسول الله ﷺ: تصدق بهذا، فقال: يا رسول الله اغيرنا، فو الله! إنا لجياع، ما لنا شيء قال: فكلوه))

''ایک شخص رسول اللہ ﷺ کے پاس ماہ رمضان میں مسجد میں آیا اور بولا اے اللہ کے رسول! میں جل گیا

❶ بخاری ۶۸۲۲.
❷ مسلم ۱۱۱۲

Marfat.com

میں جل گیا، رسول اللہ ﷺ نے اس سے اس کا ماجرا پوچھا، وہ عرض گزار ہوا کہ میں نے اپنے اہل خانہ سے مباشرت کر لی، فرمایا: صدقہ کرو، عرض کیا: اللہ کی قسم! اے اللہ کے نبی! میں کچھ نہیں رکھتا اور صدقہ کرنے کی قدرت نہیں رکھتا، فرمایا: بیٹھ جاؤ، وہ بیٹھ گیا، اسی اثنا میں ایک شخص ایک گدھا ہانکتے ہوئے آیا جس پر کھانا تھا، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ابھی ابھی جلنے والا کہاں ہے؟ وہ آدمی کھڑا ہو گیا، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اس کو صدقہ کر دو، اس نے عرض کیا: اپنے سوا کسی اور پر؟ اللہ کی قسم! ہم بھوکے ہیں، ہمارے پاس کچھ بھی نہیں، فرمایا: تو اسے کھالو۔'' (1)

تمام روایات ایک نظر میں:

رمضان میں روزہ کی حالت میں ''جماع'' کے حکم سے متعلق زیر بحث حدیث پر گہری اور سنجیدہ نظر ڈالنے سے جو حقائق منکشف ہوتے ہیں وہ درج ذیل ہیں:

۱۔ ام المومنین عائشہ اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما دونوں نے یہ تصریح کی ہے کہ رمضان میں اپنی بیوی سے بحالت روزہ جماع کر لینے والے صحابی اپنا مسئلہ لے کر نبی ﷺ کی خدمت میں مسجد نبوی میں حاضر ہوئے تھے جہاں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے علاوہ متعدد اور صحابی بھی موجود تھے، مگر اس واقعہ کے راوی تنہا ابو ہریرہ ہیں، یعنی ان کا کوئی موافق یا مخالف نہیں پایا جاتا۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جس کسی حدیث کا راوی صرف ایک ہو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس حدیث کا علم رکھنے والا بھی ایک ہی رہا ہو۔

۲۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت کا اسلوب بیان اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ انہوں نے اس کی روایت نہایت صحت، دقت اور ترتیب و تسلسل کے ساتھ کی ہے، جبکہ ام المومنین نے اصل واقعہ کو اختصار کے ساتھ اپنے الفاظ میں بیان کیا ہے اور نبی ﷺ نے تینوں کفاروں: غلام آزاد کرنے، لگا تار دو ماہ کے روزے رکھنے اور ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانے، کو جس ترتیب سے بیان فرمایا تھا ابو ہریرہ نے بھی اسی ترتیب سے اس کی روایت کی ہے اور نبی ﷺ نے ہر کفارہ کے بیان کے وقت جس طرح حرف ''ف'' استعمال کیا ہے، انہوں نے بھی اس کی رعایت کی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ رمضان میں بحالت روزہ بیوی سے مباشرت کرنے والے کا کفارہ پہلے درجہ میں غلام آزاد کرنا ہے، اگر وہ اس کی استطاعت نہ رکھے تو دو ماہ کے لگا تار روزے رکھے اور اگر اس کی قدرت بھی نہ رکھے تو ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائے۔

۳۔ ابو ہریرہ سے اس حدیث کے راوی حمید بن عبدالرحمٰن بن عوف سے اس کی روایت کرنے والے امام زہری سے اس کی روایت ۴۰ سے زیادہ اکابر محدثین نے کی ہے جن میں سے چند کے نام ہیں: سفیان بن عیینہ، لیث بن سعد، معمر،

(1) مسلم ۱۱۱۲-۸۷۔

Marfat.com

منصور، اوزاعی، شعیب، ابراہیم بن سعد، مالک، ابن جریج، یحییٰ بن سعید، عراک بن مالک، عبدالجبار بن عمر وغیرہ۔

۴۔ تمام مسالک نے اس کفارہ کا حکم اسی حدیث سے لیا ہے۔ ام المومنین کی حدیث کو کسی نے بنیاد نہیں بنایا ہے اور اصلاحی صاحب کا یہ دعوی جھوٹ ہے کہ اس مسئلہ میں اس حدیث کی وجہ سے کفارہ کے تعین میں بڑا اختلاف پایا جاتا ہے۔

۵۔ ام المومنین عائشہ اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما کی روایتوں میں، هلكت، احترقت، أصبت أهلي، وقعت بامرأتي اور وطئت امرأتي ایک ہی مفہوم کے حامل الفاظ ہیں ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ اُن صحابی نے اپنے سرزد ہو جانے والے فعل کے انجام سے اپنی خوف زدگی کے نتیجے میں یہ سارے الفاظ خود ادا کیے ہوں یا اس واقعہ کے راویوں: ابو ہریرہ اور ام المومنین نے مختلف مواقع پر یہ واقعہ بیان کرتے ہوئے یہ الفاظ استعمال کیے ہوں، اس کا زیادہ امکان ہے کہ ان صحابی نے گھبراہٹ اور خوف کی حالت میں اپنا واقعہ بیان کرتے ہوئے خود ہی یہ الفاظ استعمال کیے ہوں اور اور بعد میں ان کے راویوں نے جب بھی یہ واقعہ بیان کیا تو کبھی کوئی تعبیر نقل کر دی اور کبھی کوئی اور یہ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ رسول اللہ ﷺ کی عظیم شخصیت بڑی پُر ہیبت اور بارعب تھی اور پہلی ملاقات میں آپ سے ملنے والا سہم جاتا تھا۔ (شمائل عن علی نمبر ۵) یاد رہے کہ وہ صحابی ایک بدو تھے کوئی ادیب نہ تھے اور نہ کوئی تحریر ہی پڑھ رہے تھے کہ جچے تلے الفاظ استعمال کرتے۔ مزید یہ کہ سید اولاد آدم اور خیر الرسل ﷺ سے اپنا انوکھا واقعہ بیان کر رہے تھے۔

۶۔ اگر کسی مسئلہ سے متعلق احادیث ایک سے زیادہ ہوں، جن میں سے کوئی مفصل ہو اور کوئی مختصر تو مختصر کو مفصل کی روشنی میں سمجھا جاتا ہے اور شرعی احکام کا استنباط مفصل سے کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر اللہ تعالیٰ نے موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کے اپنے حکم سے فرعون کے پاس جانے اور اس کو دعوتِ حق دینے کی سرگزشت سورۂ اعراف، سورۂ طٰہ، سورۂ شعراء، سورۂ قصص اور سورۂ نازعات میں بیان کی ہے، لیکن ہر جگہ اسلوب بیان مختلف ہے، کہیں تفصیل ہے تو کہیں اختصار، کہیں اسلوب بیان نرم ہے تو کہیں تیز وتند، اسی طرح کسی جگہ ایسی باتیں ہیں جو دوسری جگہ نہیں ہیں اب اگر کوئی اس سرگزشت کو بیان کرنا چاہے تو اس کو اپنے سامنے تمام آیتوں کو رکھنا ہوگا۔

۷۔ جن احادیث میں واقعات بیان ہوئے ہیں جیسا کہ اس زیر نظر حدیث میں تو ان کے راوی صحابہ نے ان کی روایت اس طرح کی ہے کہ ان واقعات کی حقیقی تصویر سامنے آ گئی اور ہر واقعہ کے کرداروں کے الفاظ بھی جوں کے توں دہرا دیے ہیں اور ایسا بھی کیا ہے کہ واقعہ کو اپنے الفاظ میں بیان کر دیا ہے۔ چنانچہ یہی حدیث صحیح مسلم میں ایک جگہ نہایت اختصار کے ساتھ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے الفاظ میں آئی ہے، مگر ''روح مسئلہ'' موجود ہے۔ حدیث کے الفاظ ہیں:

((أن رجلا وقع بامرأته في رمضان، فاستفتى رسول الله ﷺ عن ذلك فقال فهل

Marfat.com

تجد رقبة؟ قال: لا ، قال: "و هل تستطيع صيام شهرين؟" قال: لا ، قال: فأطعم ستين مسكينًا))

''ایک شخص نے رمضان میں اپنی بیوی سے مباشرت کر لی اور رسول اللہ ﷺ سے اس کا شرعی حکم دریافت کیا، آپ نے فرمایا: کیا تمہارے پاس آزاد کرنے کے لیے کوئی گردن ہے؟ عرض کیا: نہیں، فرمایا: کیا دو ماہ کے روزے رکھ سکتے ہو؟ عرض کیا: نہیں، فرمایا: تو ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلاؤ۔'' ❶

غور فرمایئے اس قدر اختصار کے باوجود کفارہ کا حکم بھی بیان کر دیا اور اس کی ترتیب بھی۔

گیارہواں دعویٰ:

یہ دعویٰ اصلاحی صاحب نے اپنی عربی دانی اور حدیث نبوی کی مزاج شناسی کے اظہار کے لیے کیا ہے، ورنہ نہ تو وہ اس کی کوئی مثال ہی دے سکتے تھے کہ امام مالک رحمہ اللہ نے روایت باللفظ کا سب سے زیادہ اہتمام کیا ہے اور نہ وہ کلام نبوی کی شان ہی بیان کر سکتے تھے یہ حق تو ان محدثین کو حاصل تھا جن کا حاصل زندگی ہی حدیث رسول کا درس و مطالعہ تھا، ایک لطیفہ یہ ہے کہ ڈاکٹر برنی نے بھی ایسا ہی دعوی کیا ہے جو مؤطا کی ایک سطر صحت کے ساتھ پڑھنے سے بھی قاصر ہیں۔ اللہ تعالیٰ غرور نفس سے محفوظ رکھے۔ آمین۔

---

❶ مسلم: ۱۱۱۱-۸۲-

Marfat.com

جاوید احمد غامدی کی ہرزہ سرائیاں

امین اصلاحی صاحب نئے اور معاصر منکرین حدیث کے قائد اور راہنما گزرے ہیں، انہوں نے حدیث کی ایک تعریف، ''خبر'' پر اپنے باطل اور غلط افکار و نظریات کا قصر تعمیر کیا ہے۔ جس میں جھوٹ اور سچ دونوں کا احتمال ہوتا ہے، میں نے گزشتہ صفحات میں قرآن و حدیث کی روشنی میں رسول اللہ ﷺ کے قول، فعل اور تقریر کو حدیث ہی کا نام دے کر ان کے خیالی قصر کی بنیادیں زمین بوس کر دی ہیں اور ''خبر واحد'' کے بجائے ''حدیث واحد'' کی شرعی اصطلاح استعمال کر کے، اس کے قابل اعتبار ہونے کی مثالوں اور شرعی حجت ہونے کی دلیلوں کا انبار لگا دیا ہے، یہاں اپنے قارئین کو یہ بتاتا چلوں کہ ''خبر واحد'' کے دعوی کی بنیاد پر انہوں نے ''مبادئ تدبر حدیث'' میں جو کچھ فرمایا ہے وہ ''سود خوروں کی اس دلیل سے ذرہ بھر بھی مختلف نہیں ہے جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب عزیز میں کیا ہے، اور فوراً ہی اس کی غلطی واضح فرما دی ہے سود خوروں نے سود کو درست ثابت کرنے کے لیے یہ دعویٰ کیا تھا: ''إنما البيع مثل الربو'' بیع -خرید و فروخت- تو سود ہی کی طرح ہے۔ (سورۂ بقرہ ۲۷۵)

دیکھیے کس ڈھٹائی سے مقیس -فرع اور قیاس کردہ چیز- کو مقیس علیہ -اصل- قرار دے دیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی معکوس منطق کو یہ فرما کر باطل قرار دے دیا کہ ''و احل الله البيع و حرم الربو'' اور اللہ نے بیع کو حلال اور سود کو حرام کر دیا ہے۔ یعنی ایک تو یہ کہ خرید و فروخت حلال ہے اور سود حرام، دوم یہ کہ کسی چیز کو حلال یا حرام قرار دینے کا حق صرف اللہ تعالیٰ کو ہے تمہیں نہیں ہے۔ لہٰذا اللہ کے بندے ہونے کی حیثیت سے تمہارے اوپر فرض یہ تھا کہ رائے اور قیاس کا سہارا لینے کے بجائے تم اللہ تعالیٰ کے کسی ارشاد کو اپنی دلیل بناتے۔

اصلاحی صاحب اپنی تحریروں میں یہ ''رٹ'' لگانے سے نہیں تھکتے کہ ''حدیث رسول'' میں جو شرعی مسئلہ بھی بیان ہوا ہے اس کی اصل اور بنیاد کا قرآن میں ہونا ضروری ہے ورنہ وہ ناقابل تسلیم ہے۔

''اصول و مبادی'' کے مصنف جاوید احمد غامدی صاحب نئے ''مجدد دین'' پیدا ہوئے ہیں ان کا یہ کتابچہ ان کے امام ہی کے افادات سے عبارت ہے۔ علوم حدیث میں ان کا ماخذ بھی الکفایہ ہی ہے، بلکہ اس کے ان مباحث اور صفحات سے زیادہ ایک سطر بھی ان کے مطالعہ میں نہیں آئی ہے جن کا مطالعہ اصلاحی صاحب نے کیا تھا اس کتاب کے گزشتہ صفحات میں ان کے اصولوں کا تفصیلی جائزہ لے چکا ہوں۔

غامدی صاحب بھی ''حدیث واحد'' سے قرآن پر اضافے کے منکر ہیں اور حدیث سے قرآن کے نسخ اور اس کی

Marfat.com

تحدید و تخصیص کے مسئلہ کو سوء فہم اور قلت تدبر کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ ❶ جہاں تک حدیث سے قرآن کے نسخ کا مسئلہ ہے تو یہ مختلف فیہ ہونے اور حدیث میں کوئی قابل اعتماد مثال نہ رکھنے کی وجہ سے خارج از بحث ہے، لیکن حدیث سے قرآن کی تحدید و تخصیص کا انکار مکابرہ اور ہٹ دھرمی ہے جس پر آگے بحث آ رہی ہے۔

غامدی صاحب اپنے امام سے دو قدم آگے ہیں ان کا دعویٰ ہے کہ اخبار آحاد جنہیں حدیث کہا جاتا ہے ان سے دین میں کسی عقیدہ و عمل کا اضافہ نہیں ہوتا...... بلکہ یہ چیز حدیث کے دائرے ہی میں نہیں آتی کہ دین میں کسی نئے حکم کا ماخذ بن سکے۔'' ❷

دروغ گورا حافظہ نہ باشد:

غامدی صاحب نے اس کتابچے میں فہم سنت کے کچھ راہنما اصول بھی بیان کیے ہیں اور اپنے امام کے برعکس سند حدیث کے باب میں ائمہ رجال کے مواد کو قطعی اور نا قابل حذف و اضافہ قرار دیا ہے جس سے یہ لازم آتا ہے کہ ائمہ رجال کے اصولوں پر پوری اترنے والی احادیث آحاد نہ صرف صحیح، بلکہ قطعی ہیں اس سے ان کا یہ دعویٰ غلط ثابت ہو جاتا ہے کہ ''یہ حدیث کے دائرے ہی میں نہیں آتیں کہ وہ دین میں کسی نئے حکم کا ماخذ بن سکیں؟''

اس طرح کی تضاد بیانیاں ان نئے ''مدعیان علم'' کی خاص پہچان ہیں۔

غامدی صاحب کی ایک اور بات ان کی غفلت، ناسمجھی اور دروغ گوئی پر دلیل ہے کہ انہوں نے عربی زبان کے بیشتر لغات کو اہل زبان کے اجماع اور تواتر پر مبنی قرار دیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اجماع اور تواتر کے مفہوم ہی سے ناواقف ہیں ان کو شاید یہ معلوم ہی نہیں کہ التہذیب، المحکم، الصحاح، الجمہرۃ، اور النہایہ وغیرہ میں، امثال، محاوروں اور الفاظ اور ان کے استعمال کے جو قواعد و ضوابط ہیں وہ صدیوں بعد مدون کیے گئے ہیں اور اہل زبان سے ان کی روایت میں روایتِ حدیث کے عشر عشیر اصولوں کی بھی رعایت نہیں کی گئی ہے۔ لیکن چونکہ قرآن کے الفاظ و تراکیب کی تحقیق میں ان کتب لغات اور عرب شعراء کے کلام کو مستند ماخذ مانا جاتا ہے اس لیے غامدی صاحب کو بھی یہ کہنا پڑ گیا کہ ''اگر اس میں کچھ ''منحول'' -من گھڑت- کلام بھی شامل ہو گیا ہے، لیکن جس طرح نقد حدیث کے علماء اس کی صحیح اور سقیم روایتوں میں امتیاز کر سکتے ہیں، اسی طرح اس کلام کے نقاد بھی روایت و درایت کے نہایت واضح معیارات کی بنا پر اس کے خالص اور منحول کو ایک دوسرے سے الگ کر دے سکتے ہیں۔'' ❸

مگر غامدی صاحب آپ سے اور آپ کے تمام ہمنواؤں سے ایک سوال ہے اور وہ یہ کہ حدیث کے نقاد بھی معلوم ہیں جن کے وجود اور ان کے علمی مقام و مرتبے کا انکار نہیں کیا جا سکتا، اور حدیث کی صحت و سقم معلوم کرنے کے ان کے وضع کردہ اصولوں اور قواعد و ضوابط کو قطعی اور نا قابل حذف و اضافہ آپ بھی قرار دے چکے ہیں۔ ❹ ازراہِ کرم ذرا یہ

---

❶ ص ۴۱ ❷ ص ۷۷ ❸ ص ۱۷ ❹ ۷۸

Marfat.com

بتا دیجیے کہ وہ کون سے نقاد زبان وادب ہیں اور وہ کون سے واضح معیارات ہیں جن کی مدد سے ہم کلام عرب کے خالص اور منحول کو ایک دوسرے سے الگ کر سکتے ہیں؟

انکار حدیث کے ''اقنوم ثالث'' ہمارے ڈاکٹر افتخار برنی صاحب ہیں، یہ ائمہ کے انداز میں بات کرنے کے عادی ہیں، ذرا تیور ملاحظہ ہوں:

''ہماری معلومات'' کے مطابق عقیدے اور ایمان کا کوئی بھی بنیادی اصول ایسا نہیں جو مجرد خبر واحد سے ہمیں ملا ہو اور جس کی بنا پر کسی شخص کے مسلمان یا کافر ہونے کا فیصلہ ہوتا ہو۔'' (اردو نیوز، جدہ، ۲۲ مئی ۲۰۰۹ء)

ان تینوں ''اقانیم ثلاثہ'' سے پہلے ماتریدی متکلمین میں شمار ہونے والے فقہائے احناف کا نظریۂ حدیث مستند و مشہور حنفی عالم شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کی درج ذیل عبارت میں ملاحظہ فرمائیے:

((ان المسألة القالة بأن الخاص مُبيَّن و لا يلحقه البيان، و ان الزيادة نسخ، و ان الغام قطعي كالخاص، و ان لا ترجيح بكثرة الرواة، و انه لا يجب العمل بحديث غير الفقيه اذا نسد به باب الرائ، و ان لا عبرة بمفهوم الشرط و الوصف اصلا، و ان موجب الأمر هو الوجوب البتة))

''یہ مسئلہ کہ خاص اپنے حکم میں واضح ہے اور اس کے ساتھ کوئی توضیحی بیان نہیں جوڑا جا سکتا اور قرآن پر کوئی اضافہ نسخ ہے اور خاص کی طرح عام بھی قطعی ہے اور راویوں کی کثرت وجہ ترجیح نہیں ہے اور اگر رائے کا دروازہ بند ہو جائے تو غیر فقیہ کی روایت موجب عمل نہیں ہے اور شرط اور وصف کے مفہوم کا کوئی اعتبار نہیں اور امر کا صیغہ حکم کے واجب ہونے کا متقاضی ہے۔'' ❶

میں آئندہ صفحات میں اصلاحی، غامدی، برنی اور فقہائے احناف کے ان دعووں کا مفصل جائزہ لوں گا، اور دلائل سے ان کو غلط ثابت کروں گا، مگر اس سے قبل متاخرین فقہائے احناف کے ان دعووں پر شاہ ولی اللہ کا تبصرہ نقل کر دینا مناسب خیال کرتا ہوں تاکہ تفصیلات جاننے سے پہلے ایک ایسے حنفی عالم اور فقیہ کا نقطۂ نظر سامنے رہے جس کو بجا طور پر اجتہاد کا درجہ حاصل تھا۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں:

((و أمثال ذلك: أصول مخرجة على كلام الأئمة، و انه لا تصح بها رواية عن أبي حنيفة و صاحبيه، و أنه ليست المحافظة عليها و التكلف في جواب ما يرد عليها من صنائع المتقدمين في استنباطهم، كما يفعله البزدوي وغيره أحق من المحافظة على خلافها و الجواب عما يرد عليه))

❶ الإنصاف في بيان أسباب الاختلاف: ص ۱۳۵.

Marfat.com

''مذکورہ بالا یہ اصول اور ان کی طرح کے دوسرے اصول ائمہ فقہ کے کلام کو سامنے رکھ کر خود وضع کیے گئے ہیں اور ابوحنیفہ اور صاحبین سے ان کی روایت و نقل صحیح نہیں ہے، لہٰذا بزدوی وغیرہ کی طرح خود ائمہ متقدمین کے استنباطات کے تناظر میں ان اصولوں پر وارد ہونے والے سوالوں کا جواب دینا ان کے مخالف اصول اور ان کے خلاف وارد ہونے والے سوالوں کے جواب سے زیادہ قابل التفات و توجہ نہیں ہے۔'' (ایضا)

اس کے بعد شاہ صاحب رحمہ اللہ نے فقہ حنفی کی کتابوں سے یہ دکھایا ہے کہ خود فقہائے احناف نے ان اصولوں کو کس طرح توڑا ہے۔

دراصل جب کوئی کتاب و سنت سے ہٹ کر محض قیاس اور رائے یا عقل کی بنیادوں پر کوئی ضابطہ بناتا ہے تو وہ دو قدم بھی اس کا ساتھ نہیں دیتا اور اسے خود اپنے اصولوں اور ضابطوں سے اس کو توڑنا پڑ جاتا ہے جس کی مثالوں سے فقہ حنفی کی کتابیں بھری پڑی ہیں، اور ان میں تضادات کی بھرمار ہے۔

Marfat.com

باب ہفتم:

قرآن کے ساتھ حدیث کا تعلق

قرآن کے ساتھ حدیث کے تعلق کی صورتیں:

قرآن اور حدیث کے مطالب کے تتبع، استقراء اور بحث سے قرآن کے ساتھ حدیث کے تعلق کی چار صورتیں سامنے آتی ہیں:

۱۔ مشکل کی تفسیر؛ مشکل: أشکل یشکل إشکالا سے اسم فاعل ہے باب اِفعال کا اسم فاعل مُفْعِلٌ کے وزن پر آتا ہے اور أشکل یشکل إشکالا کے معنی ہیں: پیچیدہ، مشتبہ، اور ہم شکل و ہم مثل۔

اور تفسیر: فسر یفسر کا مصدر ہے۔ جس کا مطلب ہے، کھول دینا، واضح کر دینا، متکلم کے مراد کو متعین کر دینا۔

قرآن پاک کی سورۂ یونس کی آیت ہے: "للذین أحسنوا الحسنی و زیادة" جن لوگوں نے نیکی کی، انہی کے لیے ہے حسنِ جزا اور مزید۔ (۲۶)

مطلب یہ ہے کہ اللہ کے جو مومن بندے صالح اور نیک اعمال انجام دیتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کے ان اعمال کا بہترین بدلہ دے گا، اور اس کے ساتھ ان کو مزید فضل سے نوازے گا۔

آیت مبارکہ میں "زیادۃ" کا لغوی مفہوم تو واضح ہے، لیکن اس سے کیا مراد ہے، مشکل، مشتبہ اور غیر واضح ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنے ایک ارشاد مبارک میں اس کو کھول دیا ہے اور واضح اور متعین فرما دیا ہے، چنانچہ صہیب رضی اللہ عنہ نبی ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا:

((إذا دخل أهل الجنة الجنة ، قال: يقول الله تبارك و تعالى: تريدون شيئا أزيدكم ، فيقولون: الم تبيض وجوهنا ، ألم تدخلنا الجنة و تنجنا من النار؟ قال: فيكشف الحجابَ ، فما أُعطوا شيئًا أحبَ إليهم من النظر إلى ربهم عز و جل))

"جب اہل جنت، جنت میں چلے جائیں گے، آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ تبارک و تعالیٰ فرمائے گا: کیا تم لوگ کچھ اور چاہتے ہو میں تمہیں بڑھا دوں؟ وہ عرض کریں گے: کیا آپ نے ہمارے چہرے روشن نہیں کر دیے، کیا ہمیں جنت میں داخل نہیں کر دیا اور ہمیں دوزخ سے بچا نہیں لیا؟ نبی ﷺ نے فرمایا: پھر اللہ پردہ کھول دے گا تو ان کی حالت یہ ہوگی کہ ان کے نزدیک اپنے رب عز و جل کی طرف دیکھنے سے زیادہ محبوب کوئی چیز نہیں ہوگی۔" ❶

❶ مسلم ۱۸۱

Marfat.com

پھر نبی ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی:

﴿لِلَّذِيْنَ أَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَ زِيَادَةٌ﴾

اصلاحی کی حدیث بیزاری کی بدترین مثال:

تدبر قرآن کا مطالعہ کرنے والے اس بات کی گواہی دیں گے کہ اصلاحی صاحب اپنی اس تفسیر میں محرف آسمانی صحیفوں کے موقع بے موقع طویل سے طویل تر اقتباسات نقل کرنے میں شہرت رکھتے ہیں، مگر اس زیر بحث آیت کی تفسیر کرتے ہوئے مذکورہ بالا حدیث نقل کرنے کے روادار نہیں ہوئے، بلکہ ''زیادہ'' کی غلط تفسیر کر کے اس حدیث سے اپنی بیزاری کا بھی اظہار کر گئے۔ آیت میں ''وزیادۃ'' کے بارے میں فرماتے ہیں: اور ان پر مزید فضل بھی ہوگا، یہاں اس مزید فضل کی وضاحت نہیں ہوئی ہے۔ دوسرے مقام میں اس کی تفصیل یوں آتی ہے: ''من جاء بالحسنة فله عشر أمثالها'' جو بھلائی لے کر حاضر ہوگا تو اس کے لیے اس کا دس گنا اجر ہے۔ (الانعام: ۱۶۰)

اللہ کے بندے! یہ دس گنا اُجر تو "حسنی" ہی میں داخل ہے جو اللہ تعالیٰ کے عمومی فضل ہی کا ایک حصہ ہے۔ مگر ''وزیادۃ'' اس کا خاص فضل ہے جو اس کے تمام فضلوں پر بھاری ہوگا۔

غامدی انہی اصلاحی صاحب کے سعادت مند شاگرد اور صالح پیرو ہیں ان کی تحقیق یہ ہے کہ نبی ﷺ نے نماز میں قعدہ کے جو اذکار بتائے ہیں ان کی پابندی کرنا لوگوں پر لازم نہیں ہے یہ آپ کے پسندیدہ اذکار تو ہیں، لیکن یہ اذکار سکھاتے ہوئے آپ لوگوں کو ان کا پابند نہیں بنانا چاہتے تھے، اگر وہ چاہیں تو یہ دعا و مناجات بھی کر سکتے ہیں اور چاہیں تو دعا و مناجات کے لیے کوئی اور طریقہ بھی اپنا سکتے ہیں، لہٰذا سنت صرف یہی ہے کہ ہر نماز کی دوسری اور آخری رکعت میں نماز پڑھنے والا دو زانو ہو کر قعدے کے لیے بیٹھے اس کے علاوہ کوئی چیز بھی اس موقع پر سنت کی حیثیت سے مقرر نہیں کی گئی ہے۔ ❶

میرے خیال میں غامدی کی یہ تحقیق کسی تبصرے کی محتاج نہیں ہے، کیونکہ اس کی زد براہ راست نبی ﷺ کے ''اسوۂ حسنہ'' بنائے جانے (احزاب: ۲۱) اور آپ کے ''متبوع'' بنائے جانے (آل عمران: ۳۱) کے فرمان الٰہی پر پڑتی ہے۔

حدیث سے قرآن کے مشکل کی تفسیر کی دوسری مثال:

سورۂ انفال میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَ اَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّ مِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَ عَدُوَّكُمْ ..... الآية﴾ (الانفال: ۶۰)

''اور ان کے مقابلے کے لیے اپنے مقدور بھر طاقت اور گھوڑے باندھ کر تیاری کرو جس کے ذریعہ تم اللہ

❶ ص ۷۶

Marfat.com

کے دشمنوں اور اپنے دشمنوں کو خوف زدہ کرو۔''

اس آیت مبارکہ میں ''قوۃ'' کے لغوی مفہوم کے واضح ہونے کے باوجود یہ نہیں معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کس قسم کی طاقت مراد لی ہے اس طرح یہ لفظ مشکل ہے، اس لیے کہ اس میں طاقت کے متعدد وجوہ اور مظاہر کا احتمال ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنے ایک ارشاد میں یہ واضح فرما دیا ہے کہ ''قوۃ'' سے مراد تیر اندازی ہے۔ چنانچہ عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، کہتے ہیں:

((سمعت رسول الله ﷺ و هو على المنبر يقول: "و أعدوا لهم ما استطعتم من قوة" "ألا ان القوة الرمى ، ألا إن القوة الرمى ، ألا إن القوة الرمى"))

''میں نے رسول اللہ ﷺ کو منبر پر فرماتے ہوئے سنا ہے: اور ان کے لیے اپنے مقدور بھر طاقت تیار کرو' غور سے سن لو: طاقت تیر اندازی ہے، خوب غور سے سن لو: طاقت تیر اندازی ہے، خوب غور سے سن لو: طاقت تیر اندازی ہے۔'' ❶

کلام نبوی کا اعجاز دیکھیے کہ رسول اللہ ﷺ نے قرآن پاک کے ایک لفظ کی ایسی تفسیر فرما دی جو نزول قرآن کے وقت کے لیے بھی سو فیصد مناسب تھی، اس کے بعد آنے والے زمانے کے لیے بھی سو فیصد مناسب رہی اور آئندہ کے لیے بھی سو فیصد مناسب رہے گی۔ اس ''رمی'' میں جہاں اس وقت کی روایتی تیر اندازی داخل تھی، اسی طرح اس میں منجنیق سے سنگ باری، بندوق سے گولی چلانا، توپوں اور ٹینکوں سے گولے باری کرنا، طیاروں سے بم برسانا اور میزائل داغنا یہ ساری چیزیں اس ''رمی'' میں داخل ہیں، علامہ رشید رضا تفسیر منار میں تحریر فرماتے ہیں:

''اگر نبی ﷺ نے ''رمی السهام'' تیر پھینکنے کی تعبیر استعمال کی ہوتی جو اس زمانے میں معروف بات تھی تو بھی اس وقت کے لیے موزوں و مناسب ہوتی، اور اب جبکہ آپ نے صرف ''رمی'' کا لفظ استعمال فرمایا ہے تو لگتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی زبان مبارک سے اس لفظ ''رمی'' کو ہر قید سے خالی صورت میں اس لیے جاری کر دیا کہ یہ آپ کی امت کے لیے ہر زمانے میں عام اور مناسب رہے۔'' ❷

حدیث سے اعراض کیوں؟

اصلاحی صاحب نے حدیث سے دامن بچانے اور اپنی تفسیر میں اس کا ذکر نہ آنے دینے کے لیے اس لفظ ''قوۃ'' کی جو تفسیر کی ہے وہ نہایت مضحکہ خیز ہے اور اپنی رائے پر استدلال کرتے ہوئے انہوں نے قرآن پاک کی جن آیتوں کے حوالے دیے ہیں اس سے تو ایسا لگتا ہے کہ قرآن کے نظام کی بنیاد پر اس کی تفسیر لکھنے والے یہ بزرگ اللہ کی کتاب کو بھی نہیں سمجھتے تھے۔ ذرا اس زیر بحث آیت کے لفظ ''قوۃ'' کی ان کی تفسیر ملاحظہ فرمائیے:

❶ مسلم: ۱۹۱۷. ❷ ص ۷۰ ج ۱۰ بحوالہ منۃ المنعم فی شرح مسلم ص ۲۹۶ ج ۳.

Marfat.com

''لفظ قوۃ قرآن میں، جیسا کہ ۶۹ توبہ، ۸۰ ہود، ۶۵ کہف اور ۱۵ فصلت اور دوسری آیات سے واضح ہے عددی قوت MAN POWER کے لیے بھی آتا ہے۔'' ❶

اصلاحی صاحب عربوں کی تاریخ سے واقف تھے، جاہلی عرب شعراء کا کلام ان کے سامنے تھا اور قرآنی الفاظ اور تراکیب کی تشریح کے لیے وہ عرب شعراء کے کلام سے استدلال کرنے کے بھی بڑے خوگر تھے، پھر آیت میں ''من قوۃ'' کے بعد ''و رباط الخیل'' کی تعبیر بھی آئی ہے یہ تمام قرائن اس امر پر دلالت کرتے ہیں کہ اس کا مفہوم آیت کے سیاق وسباق اور نظم کلام سے ہم آہنگ ہو، لہٰذا ''من قوۃ'' سے عددی قوت مراد لینا حدیث سے پیچھا چھڑانے کی ایک مذموم کوشش ہے۔

قرآن کے ساتھ حدیث کے تعلق کی دوسری صورت:

قرآن کے ساتھ حدیث کے تعلق کی دوسری صورت یہ ہے کہ وہ قرآن کے اجمال کی توضیح کرتی ہے اور اس کی تفصیل بیان کرتی ہے۔ اجمال کے معنی ہیں کسی چیز یا حکم کو مختصرا بیان کرنا، مشکل اور مجمل میں فرق یہ ہے کہ مشکل لفظ کی ''مراد'' مشتبہ اور نامعلوم ہوتی ہے۔ جبکہ ''مجمل'' حکم یا چیز تو فی نفسہ معلوم ہوتی ہے، البتہ اس کی ضروری تفصیلات اور اس کی ادائیگی کے طریقے معلوم نہیں ہوتے قرآن پاک میں اقامت نماز کا حکم آیا ہے جو اپنے معنی اور مراد میں واضح ہے۔ لیکن اس اقامت نماز کی تفصیلات، اس کی تعداد، اوقات اور رکعتوں وغیرہ کی تفصیلات نہیں بیان ہوئی ہیں۔ یہ ساری چیزیں حدیث نے بیان کی ہیں۔ یہی حال زکوٰۃ، روزہ اور حج کا بھی ہے۔ اسی طرح یہ عملی ارکان اربعہ حدیث کے بغیر ناقابل عمل ہیں۔

قرآن کے ساتھ حدیث کے تعلق کی تیسری صورت:

قرآن کے ساتھ حدیث کے تعلق کی تیسری صورت ہے کہ شرعی احکام میں، جن میں عقائد اور اعمال دونوں داخل ہیں مکمل مطابقت ہے، اگر ان میں کوئی فرق ہے تو تعبیر کا فرق ہے یا اختصار وتفصیل کا فرق۔

مثال: ......قرآن کے ساتھ حدیث کی مکمل مطابقت کی مثال میں سورۂ بقرہ کی آیت نمبر ۲۸۵ اور حدیث جبریل کے اس فقرے کو پیش کیا جا سکتا ہے جس کا تعلق ایمانیات سے ہے۔ سورۂ بقرہ کی مذکورہ آیت کے الفاظ ہیں:

﴿اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ مَلٰٓئِكَتِهٖ وَ كُتُبِهٖ وَ رُسُلِهٖ لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ .... الآیة﴾ (البقرة: ۲۸۵)

''ایمان لایا رسول اس پر جو اس کے رب کی طرف سے اس پر نازل کیا گیا ہے اور مومنوں نے، سب اللہ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے......''

❶ ص ۹۳ ج ۳

Marfat.com

اور حدیث کے الفاظ ہیں:

ایمان کے بارے میں جبریل علیہ السلام کے سوال کا جواب دیتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((أن تؤمن بالله ، و ملائکته ، و کتبه ، و رسله ، و الیوم الآخر ، و تؤمن بالقدر خیره و شره))

''ایمان یہ ہے کہ تم اللہ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر، یوم آخرت پر اور اچھی اور بری تقدیر پر ایمان لاؤ۔'' ❶

قرآن وحدیث کے بیان میں فرق:

سورۂ بقرہ کی مذکورہ بالا آیت اور حدیث جبریل کے بیان میں جو فرق ہے وہ درج ذیل ہے:

۱۔ آیت مبارکہ میں اصول دین یا ارکان ایمان پر ایمان لانے والوں کے سرفہرست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، جس سے یہ معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سب سے پہلے اپنی رسالت پر اور اپنے اوپر نازل ہونے والی ہدایت پر اور تمام اصول دین اور ارکان ایمان پر ایمان لانے کے مکلف تھے اور اس ایمان سے مراد ایسا اقرار ہے جو دل کے یقین و اذعان، زبان کے اقرار و اعتراف اور اس ایمان کے مقتضیات کی عملی تنفیذ سے عبارت ہے، انہی باتوں کی دعوت دینے کے لیے تمام رسول مبعوث کیے گئے تھے اور سب سے پہلے ان پر ایمان لانے کے وہی مکلف بھی تھے۔ جس میں دوسرے اہل ایمان ان کے تابع تھے، اسی وجہ سے ہر رسول اپنے اوپر ایمان لانے والوں کے لیے اسوۂ ایمان وعمل ہوتا تھا اور ہمارے رسول محمد بن عبداللہ صلی اللہ علیہ وسلم فداہ ابی و امی ہمارے لیے اسوۂ ایمان وعمل ہیں۔ (احزاب:۲۱)

میں نے ابھی جو کچھ عرض کیا ہے اس کی دلیل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے:

((أشهد أني رسول الله))

''میں گواہی دیتا ہوں کہ میں اللہ کا رسول ہوں۔'' ❷

۲۔ آیت میں یہ نہیں فرمایا گیا ہے کہ ایمان لایا رسول قرآن پر، بلکہ یہ فرمایا گیا ہے کہ ''ایمان لایا رسول اس پر جو اس کے رب کی طرف سے اس پر نازل کیا گیا ہے'' اور قرآن ہی کی رو سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن اور حدیث دونوں کو نازل کیا گیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:

﴿وَ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَیْكَ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ﴾ (النساء: ۱۱۳)

''اور اللہ نے تمہارے اوپر کتاب اور حکمت نازل کی ہے۔''

اس آیت میں مذکور لفظ ''حکمت'' سے مراد حدیث کے علاوہ کچھ نہیں ہے جس پر تفصیلی بحث گزر چکی ہے۔ جس کی تائید اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے ہوتی ہے جس میں اس نے یہ اعلان فرمایا ہے کہ قرآن کا بیان اس کے ذمہ ہے: ''ثم

❶ مسلم ۱ ❷ بخاری ۵۴۴۱

Marfat.com

إن علينا بيانه" پھر درحقیقت اسے بیان کر دینا ہمارے ذمہ ہے۔ (القیامہ : ۱۹)

اور جب یہ معلوم ہے کہ نزول قرآن کا ذریعہ ''وحی'' ہے تو اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ قرآن کے بیان- حدیث- کے نزول کا ذریعہ بھی ''وحی'' ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ براہ راست اپنے بندوں میں سے کسی سے ہم کلام نہیں ہوتا۔

۳۔ قرآن کی مذکورہ آیت میں یوم آخرت اور اچھی اور بری تقدیر پر ایمان کا کوئی ذکر نہیں، جبکہ حدیث میں اس کا ذکر ہے تو اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ قرآن پاک یوم آخرت اور تقدیر پر ایمان کے ذکر سے بھرا پڑا ہے، اس لیے اللہ کی کتابوں اور اس کے رسولوں پر ایمان میں آخرت اور تقدیر پر ایمان داخل ہے یا یہ ایمان "بما أنزل إليه من ربه" کے عموم میں داخل ہے۔

قرآن کے ساتھ حدیث کے تعلق کی چوتھی صورت:

قرآن کے ساتھ حدیث کے تعلق کی چوتھی صورت یہ ہے کہ قرآن کی طرح حدیث بھی مستقل بالذات ماخذ شریعت ہے اور جب ہم یہ کہتے ہیں کہ ''اسلام کا دوسرا شرعی ماخذ حدیث ہے تو اس سے ہماری مراد شرعی ماخذ کی تعداد بیان کرنے سے ہوتی ہے حدیث کے درجہ کے بیان سے نہیں ہوتی ہمارے ایسا کہنے سے کتاب اللہ پر حدیث کو مقدم کرنا ہرگز لازم نہیں آتا جس طرح رسول کی رسالت پر مطلق اور غیر مشروط ایمان سے اللہ تعالیٰ کی "الوهيت مطلقه" پر کوئی حرف نہیں آتا۔

اور جب ہم یہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں قرآن میں مذکور عقائد کے علاوہ جو عقائد دیے ہیں اور قرآن میں مذکور شرعی احکام کے علاوہ جو احکام دیے ہیں ان میں آپ کی غیر مشروط اطاعت فرض ہے اور ان میں آپ کی نافرمانی حرام ہے، تو ایسا ہم اللہ تعالیٰ کے صریح حکم کی تعمیل کرتے ہوئے کہتے ہیں اور قرآن کی طرح حدیث کو بھی مستقل بالذات تشریعی ماخذ قرار دیتے ہوئے ہم اللہ تعالیٰ کے حکم پر عمل کرتے ہیں اور اس کا ارشاد ہے:

﴿وَ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ احْذَرُوْا فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ﴾ (المائدة: ۹۲)

''اور اللہ کی اطاعت کرو، اور رسول کی اطاعت کرو اور خبردار رہو، اور اگر تم نے اعراض کیا تو جان لو کہ ہمارے رسول پر صرف واضح تبلیغ ہے۔''

اسی آیت کا اسلوب بیان وعید آمیز ہے جس میں ''وَ احْذَرُوْا'' کا فقرہ تازیانۂ تنبیہ ہے۔ مطلب ہے کہ اللہ کی نافرمانی اور رسول کی نافرمانی سے خبردار رہو، ہوشیار رہو، چوکنے رہو، کیونکہ اس کا انجام بڑا برا اور عبرت ناک ہے۔ پھر ''رسولنا'' کی تعبیر کس قدر بلیغ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کی اضافت اپنی طرف کر کے اور وہ بھی جمع متکلم کی ضمیر کی طرف کر کے آپ کی اطاعت کی جو اہمیت بیان فرما دی ہے اس کو محسوس تو کیا جا سکتا ہے بیان نہیں کیا جا سکتا۔

اس طرح سورۂ نساء میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

Marfat.com

﴿مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ﴾ (النساء: ۸۰)

''جس نے رسول کی اطاعت کی درحقیقت اس نے اللہ کی اطاعت کی۔''

اور سورۂ حشر کی آیت تو حدیث کے مستقل بالذات شرعی ماخذ ہونے میں نص قاطع ہے۔ ارشار ربانی ہے:

﴿وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا﴾ (الحشر: ۷)

''اور رسول تمہیں جو دے وہ لے لو اور جس سے تمہیں روکے اس سے رک جاؤ۔''

یہ تمام آیتیں حدیث کے مستقل شرعی ماخذ ہونے پر بصراحت دلالت کرتی ہیں، کیونکہ قرآن کے احکام کی پابندی اللہ کی اطاعت ہے، رسول کی اطاعت نہیں ہے، جبکہ ان آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے جہاں اپنی اطاعت کے ساتھ رسول کی اطاعت کا حکم مستقل فعل: ''اطیعوا'' فرما کر دیا ہے، وہیں آپ کی اطاعت کو عین اپنی اطاعت بھی قرار دیا ہے اور رسول کے اوامر و نواہی کی مطلق تنفیذ کا حکم بھی دیا ہے۔

قرآن پاک کی مذکورہ بالا آیات مبارکہ رسول اللہ ﷺ کے منصبِ رسالت اور آپ کی حدیث کے شرعی مقام و مرتبے کی توضیح و تعیین میں اس قدر واضح، دوٹوک اور صریح ہیں کہ ان کے بعد بھی اگر کوئی شخص رسول اللہ ﷺ کے غیر مشروط مطاع ہونے کا عقیدہ نہیں رکھتا اور ہر عقیدے اور ہر شرعی حکم کے قرآن میں ہونے کی شرط لگاتا ہے تو وہ حدیث سے پہلے قرآن کی تکذیب اور اس کا انکار کرتا ہے۔

اوپر میں نے قرآن کے ساتھ حدیث کے تعلق کی جو چار صورتیں حصر کے ساتھ بیان کی ہیں اور قرآن و حدیث سے مدلل کر کے بیان کی ہیں ان کے بارے میں اگر میں یہ کہوں کہ اردو زبان میں یہ پہلی کوشش ہے کہ کسی خادم حدیث نے اس انداز سے اور اس طرح کے ناقابل تردید و تاویل دلائل سے حدیث رسول اللہ ﷺ کے شرعی مقام و مرتبے کو واضح اور متعین کیا ہو تو اس میں ذرہ برابر مبالغہ نہ ہوگا، البتہ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے فضل و توفیق کا نتیجہ ہے، ورنہ من آنم کہ من دانم۔

اب میں پہلے متاخرین احناف کے ان اصولوں کے بارے میں شاہ ولی اللہ کے نقطۂ نظر کو بیان کروں گا جو انہوں نے قرآنی احکام کی شرح و تبیین اور تحدید و تخصیص کے باب میں حدیث کے کردار سے متعلق وضع کیے ہیں اس کے بعد میں حدیث سے قرآن میں اضافے کی معرکۃ الآراء بحث شروع کروں گا جس میں اللہ تعالیٰ کے فضل و توفیق اور عون و تائید سے ان شاء اللہ تعالیٰ قدیم و جدید منکرین حدیث کے دعووں کا ابطال انہی کے دعووں سے کروں گا۔

احناف کے فقہی اصول شاہ ولی اللہ کی نظر میں:

احناف کے فقہی اصول میں شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کی کتاب ''الإنصاف فی بیان اسباب الاختلاف'' سے نقل کر چکا ہوں۔ میری نظر میں ان اصولوں پر تبصرہ کا مناسب مقام ''قرآن کے ساتھ حدیث کے تعلق کی صورتیں'' کے بعد تھا اور

Marfat.com

ان پر میرے تبصرے سے زیادہ شاہ ولی اللہ کا تبصرہ وزنی اور اہم ہے اس لیے کہ احناف سے نسبت کے باوجود وہ ایک متبحر، حق گو اور امانت دار عالم تھے اور خود اپنے مسلک کے بارے میں ان کی گواہی غیر احناف کی گواہی سے زیادہ وقیع ہے۔

شاہ صاحب نے احناف کے جو اصول بیان فرمائے ہیں ان میں سرفہرست یہ اصول ہے:

۱۔ خاص اپنے حکم میں واضح ہے اور اس کے ساتھ کوئی توضیحی بیان نہیں جوڑا جا سکتا۔

اس عبارت کا مطلب یہ ہے کہ قرآن پاک میں جو خاص احکام آئے ہیں وہ خود اتنے واضح اور عملی ہیں کہ ان کی توضیح و بیان کے لیے ان کے ساتھ حدیث کا توضیحی ضمیمہ لگانا درست نہیں ہے، کیونکہ حدیث کے توضیحی بیان کے بغیر اس پر عمل کافی بھی ہے اور درست بھی۔

شاہ صاحب فرماتے ہیں:

متاخرین نے متقدمین کے اس قول سے جو انہوں نے اللہ تعالیٰ کے ارشاد: "اِرْکَعُوا وَ اسْجُدُوا" رکوع کرو اور سجدہ کرو۔ (سورۂ حج: ۷۷) کے بارے میں اختیار کیا ہے اور اس حدیث کو اس کا توضیحی بیان نہیں مانا ہے جس میں یہ آیا ہے کہ "کسی شخص کی نماز اس وقت تک مطلوبہ صورت میں ادا نہیں ہوتی جب تک رکوع و سجود میں اپنی پیٹھ پوری طرح سیدھی نہ رکھے۔" جس کی رو سے مطلق رکوع و سجود کو فرض مانا ہے اور حدیث پر عمل کرتے ہوئے رکوع و سجود میں پیٹھ سیدھی رکھنے کو ضروری نہیں قرار دیا ہے۔ متقدمین کے اسی مسلک سے متاخرین نے یہ قاعدۂ کلیہ بنا لیا کہ "خاص اپنے حکم میں واضح ہے اور اس کے ساتھ کوئی توضیحی بیان نہیں جوڑا جا سکتا۔"

تبصرہ:......مذکورہ مسئلہ میں متقدمین کا مسلک سو فیصد غلط ہے، کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد:

﴿وَ اَنْزَلْنَاۤ اِلَیْکَ الذِّکْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْهِمْ...... الآیة﴾ (النحل: ٤٤)

"اور ہم نے تمہاری طرف ذکر اس لیے اتارا ہے تاکہ تم لوگوں کے لیے اس چیز کو کھول کر بیان کر دو جو ان کی طرف اتاری گئی ہے۔"

مطلب یہ ہے کہ نبی ﷺ پر قرآن کے نازل کیے جانے کا مقصد ہی یہ ہے کہ آپ اس کے احکام اور ان پر عمل کے طریقوں کو اپنے قول و عمل سے لوگوں کو بتا دیں، اگر آپ سے رجوع کیے بغیر ہی قرآنی احکام پر عمل ممکن ہوتا اور مقبول و درست بھی تو پھر آپ کو رسول بنانے اور صرف آپ پر قرآن نازل کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ اس پر مزید یہ کہ قرآن پاک میں آپ کی اطاعت، اتباع اور اوامر و نواہی کی تعمیل پر اتنا زور دینے کی کیا ضرورت تھی؟

حدیث پر ایک نظر:

اوپر جس حدیث کا مختصر ترجمہ "الانصاف" کے بیان کی روشنی میں کیا گیا ہے اس کا مکمل متن اور اس کا ترجمہ پیش کر دینا چاہتا ہوں تاکہ اس میں بیان کردہ حکم پوری طرح واضح ہو جائے۔

Marfat.com

ابو مسعود بدری انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

((لا تجزئ صلاة الرجل حتى يقيم ظهره فى الركوع و السجود))

''کسی شخص کی نماز اس وقت تک نہیں ہوتی جب تک کہ وہ رکوع اور سجدوں میں اپنی پیٹھ بالکل سیدھی نہ کر لے۔'' ❶

اس حدیث میں جو حکم مختصرا دیا گیا ہے وہ خلاد بن رافع رضی اللہ عنہ کی حدیث میں بڑی تفصیل سے دیا گیا ہے اور یہ حدیث خود انہی سے متعلق ہے، لیکن اس کے راوی ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہیں:

((أن رسول الله ﷺ دخل المسجد، فدخل رجل، فصلى، فسلم على النبى ﷺ فرد النبى ﷺ عليه السلام، فقال: ارجع فصل، فإنك لم تصل" فرجع يصلى كما صلى، ثم جاء، فسلّم على النبى ﷺ فقال: إرجع فصل فإنك لم تصل" ثلاثًا، فقال: و الذى بعثك بالحق ما أحسن غيره، فعَلِّمْنِىْ، فقال: إذا قمت إلى الصلاة فكبِّر، ثم اقرأ ما تيسر معكَ من القرآن، ثم اركعْ حتى تطمئن راكعًا، ثم ارفع حتى تعدل قائما، ثم اسجد حتى تطمئن ساجدا، ثم ارفع حتى تطمئن جالسًا، و افعل ذلك فى صلاتك كلها))

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں داخل ہوئے تو ایک اور شخص داخل ہوئے اور نماز پڑھی، پھر آ کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام کیا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے سلام کا جواب دیا اور فرمایا: واپس جا کر دوبارہ نماز پڑھو، اس لیے کہ تم نے نماز پڑھی ہی نہیں۔ وہ گئے اور اسی طرح پڑھنے لگے جس طرح پڑھی تھی، پھر آئے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام کیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: واپس جاؤ اور نماز پڑھو، اس لیے کہ تم نے نماز پڑھی ہی نہیں۔'' آپ نے تین بار یہ حکم دیا۔ اس پر ان شخص نے عرض کیا: جس ذات نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے اس کی قسم! میں اس کے سوا عمدگی سے نماز نہیں پڑھ سکتا، مجھے سکھا دیجیے۔ فرمایا: جب تم نماز پڑھنے کے ارادے سے کھڑے ہو تو ''اللہ اکبر'' کہو، پھر قرآن کا جو حصہ تمہیں آسانی سے یاد ہو اس کی تلاوت کرو، پھر اس طرح رکوع کرو کہ رکوع کی حالت میں بالکل مطمئن اور پرسکون ہو جاؤ، پھر اس طرح کھڑے ہو جاؤ کہ اس حالت قیام میں سیدھے ہو جاؤ، پھر سجدہ کرو اور سجدہ کرتے ہوئے بھی پرسکون رہو، پھر اٹھ کر اس طرح بیٹھ جاؤ کہ تمہارا جلوس پرسکون ہو، یہی عمل اپنی پوری نماز میں انجام دو۔'' ❷

---

❶ ابو داود ۸۵۵، ترمذی ۲۶۵، نسائی ۱۰۲۶، ابن ماجہ ۸۷۰، مسند امام احمد ۱۷۲۰۱۔

❷ بخاری ۲۵۲، ۲۹۳، ۶۲۵۱، ۶۲۵۲، ۶۶۶۷، مسلم ۳۹۷، ابو داود ۸۵۶، ترمذی ۳۰۲، نسائی ۸۸۴۔

Marfat.com

اس حدیث میں جن صحابی کا واقعہ بیان ہوا ہے انہوں نے نماز کے سارے ارکان ادا کیے تھے اس کے باوجود رسول اللہ ﷺ نے ان کی پڑھی ہوئی نماز کو ''صفتِ صلاۃ'' سے عاری قرار دے دیا اور یہ حکم لگا دیا کہ تم نے نماز پڑھی ہی نہیں، کیونکہ ان کی نماز اطمینان اور اعتدال سے خالی تھی۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ جس طرح نماز میں قرآنی حکم رکوع اور سجدہ فرض ہے اسی طرح نبوی حکم اطمینان وسکون اور اعتدال کے ساتھ نماز پڑھنا بھی فرض ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی اطاعت کے بالکل مساوی اپنے رسول کی اطاعت کا حکم دے کر یہ اعلان فرما دیا کہ قرآن کا حکم اور حدیث کا حکم اپنی فرضیت میں یکساں ہے۔ نیز یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب عزیز میں اور رسول اللہ ﷺ نے اپنے ارشادات میں کسی ایک جگہ اشارۃً بھی حدیث کو ''واحد'' اور ''متواتر'' میں تقسیم کر کے دونوں سے حاصل ہونے والے حکم میں تفریق نہیں کی ہے لہٰذا فقہاء، معتزلہ اور متکلمین نے اس مسئلہ میں جو کچھ بھی کہا ہے اور جو اصول بھی بنائے ہیں وہ محض عقلی اور قیاسی ہیں اور ان کو کتاب وسنت کی کوئی سند حاصل نہیں ہے۔

ایک اشکال اور اس کا جواب:

خلاد بن رافع رضی اللہ عنہ سے متعلقہ حدیث میں سورۂ فاتحہ پڑھنے کا ذکر نہیں ہے جس سے بہت سے لوگ نماز میں قراءت فاتحہ کی عدم فرضیت پر استدلال کرتے ہیں، لیکن دو وجوں سے ان کا یہ استدلال باطل ہے:

۱۔ نماز میں قراءت فاتحہ کی رکنیت دسیوں صحیح ترین حدیثوں سے ثابت ہے۔

۲۔ اس واقعہ سے متعلق رفاعہ بن رافع رضی اللہ عنہ کی حدیث میں یہ صراحت ہے:

((...... ثم اقرأ بام القرآن و بما شاء الله ان تقرأ))

''پھر تم ام القرآن پڑھو اور جو اللہ چاہے وہ پڑھو۔'' [1]

شاہ ولی اللہ کی گرفت:

شاہ ولی اللہ نے مذکورہ بالا احناف کے اصول پر خود انہی کے اعمال کی روشنی میں گرفت کر کے اس کو غلط ثابت کیا ہے، فرماتے ہیں:

احناف نے ارشاد الٰہی ''ارکعوا و اسجدوا'' کی بنیاد پر صرف رکوع وسجود کو فرض مانا ہے اور حدیث: ''لا تجزئ صلاۃ الرجل حتی یُقیم ظهره فی الرکوع و السجود'' کی بنیاد پر اطمینان کو فرض نہیں قرار دیا ہے۔ یعنی حدیث کو قرآنی آیت کا بیان نہیں تسلیم کیا۔ لیکن جب ان پر یہ اعتراض کیا گیا کہ انہوں نے اسی طرح کی آیتوں کے لیے احادیث کو بیان مان کر اپنا اصول توڑ دیا ہے تو اس اعتراض کے جواب میں انہوں نے تکلفات سے کام لینا شروع کر دیا ہے۔

شاہ صاحب نے ''الانصاف'' میں بطور مثال جو آیتیں نقل کی ہیں اور جن کے لیے احناف نے احادیث کو بیان مانا

[1] ابوداود ۸۵۹

Marfat.com

ہے وہ اپنے حکم میں "ارکعوا و اسجدوا" سے ذرہ برابر بھی مختلف نہیں ہیں ذیل میں یہ آیتیں اور ان کے توضیحی بیان سے متعلق وہ احادیث ایک ایک کر کے درج کر رہا ہوں جن کو قابل اعتبار مان کر احناف نے اپنا اصول توڑا ہے۔

پہلی آیت:

آیت وضو میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "و امسحوا برء وسکم" اور اپنے سروں کا مسح کرو۔ (المائدۃ: ٦)

احناف کے مذکورہ بالا اصول کی رو سے یہ حکم خاص اور واضح ہے اور کسی خارجی توضیح اور بیان کا محتاج نہیں ہے، مگر احناف نے مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کی اس حدیث کو اس کا بیان مان کر اپنا اصول توڑ ڈالا جس میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو کیا اور اپنی پیشانی پر مسح کیا۔ ❶ انہوں نے اسی پر بس نہیں کیا، بلکہ چوتھائی سر کے مسح کی فرضیت کا فتویٰ دے ڈالا۔ ❷

مغیرہ بن شعبہ کی حدیث کا آیت وضو سے کوئی تعلق نہیں:

اگر احناف نے آیت "ارکعوا واسجدوا" کی طرح مغیر بن شعبہ رضی اللہ عنہ کی حدیث کو "وامسحوا برء وسکم" کا بیان نہ مانا ہوتا تو ان کی غلطی اور حدیث سے ان کی عدم وابستگی کی شناعت اس کو بیان ماننے سے کم ہوتی اس لیے کہ انہوں نے اس حدیث کو آیت کا بیان مان کر چوتھائی سر کے مسح کی فرضیت کا فتویٰ دے کر یہ ثابت کر دیا ہے کہ حدیث سے ان کا تعلق بڑا سطحی ہے۔ درحقیقت مغیرہ بن شعبہ کی حدیث کا تعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس مسح سے ہے جو آپ نے اس وقت کیا تھا جب آپ اپنے سر پر عمامہ باندھے ہوئے تھے۔ جبکہ قرآنی آیت میں اس مسح کا بیان ہے جو ننگے سر پر کیا جاتا ہے۔ قرآن میں عمامہ بندھے سر پر مسح کرنے کا کوئی حکم نہیں بیان کیا گیا ہے اور نہ کسی صحیح حدیث میں یہ آیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کھلے سر کی پیشانی پر مسح کیا کہ چوتھائی سر کے مسح کی فرضیت کا دعویٰ کرنا درست ہو، وضو سے متعلق جتنی احادیث آئی ہیں سب میں پورے سر کا مسح ہی بیان ہوا ہے اور قرآن کا اسلوب بھی اس پر دلالت کرتا ہے۔ صحیح مسلم میں جس باب کے تحت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کی حدیث آئی ہے اس کا عنوان "المسح علی العمامة" امام ابوداود اپنی سنن میں جس باب کے تحت یہ حدیث لائے ہیں اس کا عنوان "المسح علی الخفین" اور سنن ابوداود کی جس حدیث میں یہ آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا ہاتھ عمامہ کے اندر ڈال کر سر کے اگلے حصہ پر مسح کیا۔ ❸ انس بن مالک سے مروی یہ حدیث ضعیف ہے۔ صحیح ترین احایدث کے مطابق نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیشہ پورے سر کا مسح کیا ہے۔

دوسری آیت:

شاہ صاحب نے دوسری جس آیت میں احناف کے اپنے مذکورہ بالا اصول کو توڑ دینے کو دکھایا ہے وہ سورۂ نور کی آیت نمبر ۲ میں "الزانية و الزاني" ہے جو مطلق زنا کرنے والی عورت اور زنا کرنے والے مرد پر دلالت کرتے ہیں

❶ ابوداود ۱۵۰ ❷ ہدایہ ۳۹ ج ۱ ❸ ۱۴۲

Marfat.com

اور یہ خاص الفاظ غیر شادی شدہ زنا کرنے والی عورت اور زنا کرنے والے مرد کا مفہوم نہیں دیتے اس کا پتا اس حدیث سے چلتا ہے جس میں رسول اللہ ﷺ نے غیر شادی شدہ زنا کرنے والی عورت اور زنا کرنے والے مرد اور شادی شدہ زنا کرنے والی عورت اور زنا کرنے والے مرد کی حد بیان فرمائی ہے، جس کے الفاظ ہیں:

((خذوا عنی قد جعل لهن سبيلا: البكر بالبكر جلد مائة و نَفيُ سنة و الثيب بالثيب جلد مائة و الرجم))

''مجھ سے لے لو، مجھ سے لے لو، اللہ نے ان کے لیے راہ نکال دی ہے، غیر شادی شدہ عورت سے غیر شادی شدہ مرد کے زنا کرنے کی حد سو کوڑے اور ایک سال کی جلا وطنی ہے اور شادی شدہ عورت سے شادی شدہ مرد کے زنا کرنے کی حد سو کوڑے اور سنگ ساری ہے۔''[1]

نبی ﷺ نے ''قد جعل الله لهن سبيلا'' سے مراد وہ وعدہ لیا ہے جو اللہ تعالیٰ نے سورۂ نساء کی آیت نمبر ۱۵ میں کیا ہے: ''او يجعل الله لهن سبيلا'' یا اللہ ان کے لیے کوئی راہ پیدا کر دے، اور یہ راہ سورۂ نور کی آیت نمبر ۲ میں بیان کردہ ''حد'' ہے۔

تیسری آیت:

تیسری جس آیت میں احناف نے اپنا یہ اصول کہ ''خاص اپنے حکم میں واضح ہے اس کے ساتھ کوئی توضیحی بیان نہیں جوڑا جا سکتا'' توڑا ہے وہ سورۂ مائدہ کی آیت نمبر ۳۸ کا فقرہ: ''و السارق و السارقة فاقطعوا ايديهما'' ہے۔ اس فقرے میں ''السارق و السارقة'' خاص الفاظ ہیں اور ان کا مفہوم بالکل واضح ہے، یعنی ہر طرح کے مال اور ہر مقدار کی چوری کرنے والا اور والی اس میں داخل ہے۔ لیکن احناف نے اپنا بنایا ہوا یہ اصول اس حدیث سے توڑ دیا جس میں آیا ہے کہ دس درہم سے کم کی چوری کی حد ''قطع ید'' نہیں ہے اور اس سے زیادہ عجیب اور مضحکہ خیز بات یہ ہے کہ یہ حدیث حد درجہ ضعیف اور نا قابل استدلال ہے اور جتنی سندوں سے بھی مروی ہے ان میں سے کوئی سند بھی صحیح نہیں ہے۔ اس کے الفاظ ہیں: ''لا قطع فى اقل من عشرة دراهم'' ''دس درہم سے کم میں ہاتھ نہ کاٹا جائے۔''

یہ حدیث عمرو بن شعیب، عن ابیہ، عن جدہ - عبداللہ بن عمرو - عبداللہ بن مسعود اور ام ایمن رضی اللہ عنہم کی نسبت سے مسند احمد (۶۹۰) ابن حبان کی کتاب المجروحين (ص ۲۷۳ ج ۱، ترجمه ۲۰۷) میں، طبرانی کی المعجم الاوسط (نمبر ۷۱۴۲) میں، مسند ابی حنیفه (ص ۲۱۴-۲۱۵) میں، طبرانی کی المعجم الكبير (نمبر ۹۷۴۲-۹۷۸۳) میں مروی ہے اور کسی بھی سند سے صحیح نہیں ہے۔

[1] مسلم ۱۶۹۰

Marfat.com

دوسرا اصول، عام بھی خاص کی طرح قطعی ہے:

اس من گھڑت اصول کا مطلب یہ ہے کہ قرآن میں جو احکام عام ہیں وہ اس کے خاص کی طرح قطعی ہیں، ان کے عموم کو حدیث کے ذریعہ محدود نہیں کیا جا سکتا، اس تناظر میں انہوں نے اللہ تعالیٰ کے ارشاد "فاقرء وا ما تیسر من القرآن" "قرآن سے جو آسان ہو وہ پڑھو" (المزمل: ۲۰) سے استدلال کرتے ہوئے نماز میں قرآن کے کسی بھی حصے کے پڑھ لینے کو فرض قرار دیا ہے اور حدیث: "لا صلاۃ الا بفاتحۃ الکتاب" فاتحۃ الکتاب کے بغیر کوئی نماز نہیں ہوتی کو آیت کا "مخصص" نہیں مانا ہے اس طرح نماز میں سورۂ فاتحہ کی قراءت کی فرضیت کا انکار کر دیا ہے۔

لیکن جب ان پر یہ اعتراض کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد "فما استیسر من الھدی" "تو قربانی کے جانوروں میں سے جو میسر ہو" (البقرۃ: ۱۹۶) بھی "ما تیسر من القرآن" کی طرح عام ہے لہٰذا جو چھوٹی بڑی ہدی میسر آ جائے اس کی قربانی کرنی چاہیے، لیکن انہوں نے نبی ﷺ کے بیان کہ "وہ بکری اور اس سے بڑا جانور ہے" کو آیت کا مخصص اور بیان مان کر ہدی کے لیے بکرا یا بکری سے بڑا کوئی جانور مقرر کر دیا۔

ہدایہ میں ہے:

((الھدی ادناہ شاۃ لما روی انہ علیہ الصلاۃ و السلام سئل عن الھدی فقال: ادناہ شاۃ، قال: و ھو من ثلاثۃ انواع الابل، و البقر و الغنم، لأنہ علیہ الصلوۃ و السلام لما جعل الشاۃ ادنی، فلا بد ان یکون لہ اعلی و ھو البقر و الجزور))

روایت کے مطابق چھوٹی ترین "ہدی" بکری ہے، کیونکہ نبی ﷺ سے "ہدی" کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا: چھوٹی ترین ہدی بکری ہے، جس کی تین قسمیں ہیں: اونٹ، گائے، بھیڑ، بکری اور جب نبی علیہ السلام نے سب سے چھوٹی "ہدی" بکری قرار دے دی ہے تو ضروری ٹھہرا کہ بڑی ہدی گائے اور اونٹ ہو۔" [1]

حافظ زیلعی "نصب الرایہ" میں تحریر فرماتے ہیں: روایت ہے کہ نبی ﷺ سے "ہدی" کے بارے میں سوال کیا گیا تو فرمایا: سب سے چھوٹی ہدی بکری ہے۔

میں کہتا ہوں: "یہ باطل ہے، یہ مجھے صرف عطاء کے قول کے طور پر ملی ہے اور اس کی روایت بیہقی نے شافعی کے طریق سے کی ہے: ہمیں مسلم بن خالد زنجی نے ابن جریج سے روایت کرتے ہوئے خبر دی ہے کہ عطاء نے کہا: "ادنی ما یھراق من الدماء فی الحج و غیرہ شاۃ" حج اور غیر حج میں چھوٹے ترین جس جانور کا خون بہایا جائے وہ بکری ہے۔" [2]

اس کے بعد حافظ زیلعی نے لکھا ہے: ہمارے شیخ علاء الدین ۔مغلطائی بکجری۔ نے ہدی کے لیے دوسرے کی تقلید کرتے ہوئے اس حدیث سے استدلال کیا ہے جو بخاری نے ابو جمرہ نصر بن عمران ضبعی سے روایت کی ہے، انہوں نے

[1] ص ۲۰۰-۲۰۱ ج ۳ [2] ص ۲۰۰ ج ۳

Marfat.com

کہا: میں نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ''متعہ'' -عمرہ- کے بارے میں سوال کیا تو انہوں نے مجھے اس کا حکم دیا اور ان سے ہدی کے بارے میں پوچھا تو فرمایا: اس میں اونٹ یا گائے، یا بکری یا خون میں شراکت داخل ہے...... ❶

''شرعی ہدی''

شریعت میں قربانی کے لیے جو جانور معتبر قرار دیا گیا ہے وہ بھیڑ اور دنبے کے علاوہ وہ جانور ہے جس کے سامنے کے دانت گر گئے ہوں جس کو ''ثني'' کہا جاتا ہے اس کی دلیل نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے۔

((لا تذبحوا الا مسنة الا ان يعسر عليكم فتذبحوا جذعة من الضأن))

تم لوگ ایسے جانور -اونٹ یا گائے یا بکری کے قسم سے- کی قربانی کرو جو سن رسیدہ -جس کے سامنے کے دانت گر چکے ہوں- ہو سوائے اس کے کہ تم کو ایسا جانور حاصل کرنا دشوار ہو تو ایک سال کی عمر سے کم بھیڑ کے بچے کو قربان کرو۔'' ❷

حاصل کلام:

احناف نے جس اصول پر عمل کرتے ہوئے ''لا صلاة الا بفاتحة الكتاب'' کو آیت ''فاقرءوا ما تيسر من القرآن'' کے عموم کا مخصص نہ مان کر نماز میں قراءت فاتحہ کی فرضیت کا انکار کر دیا تھا، اس کو ''ہدی'' سے متعلق حدیث سے ''فما استيسر من الهدى'' کے عموم کی تخصیص کر کے توڑ دیا اور یہ شرعی حکم صادر کر دیا کہ ہدی کے لیے بکرا یا بکری سے بڑا کوئی جانور ہونا چاہیے۔

تیسرا اصول: ......متاخرین احناف کا تیسرا اصول یہ ہے کہ رائے اور قیاس سے متعارض کسی غیر فقیہ راوی کی روایت کردہ حدیث قابل عمل نہیں ہے۔

حدیث مصراۃ:

حدیث مصراۃ وہ حدیث ہے جس کے قبول ورد میں احناف نے بڑی ٹھوکریں کھائی ہیں اور کہیں اس کا انکار کر کے اور کہیں اس سے استدلال کر کے اپنے متضاد نقطہ ہائے نظر کا ثبوت دیا ہے یہ حدیث ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے جس کے الفاظ ہیں:

((لا تُصَرُّوا الإبل و لاغنم، فمن ابتاعها بعد، فإنه بخير النظرين بعد أن يحتلبها: إن شاءَ أمسك و إن شاء ردها و صاعَ تَمرٍ))

''اونٹنی اور بکری کے تھنوں میں دودھ جمع مت کرو، تو جس نے اس کو ایسا کر لیے جانے کے بعد خریدا اس کو اسے دوھنے کے بعد دو باتوں میں سے ایک کا اختیار ہے؛ چاہے تو اس کو اپنے پاس باقی رکھے اور چاہے تو ایک صاع کھجور کے ساتھ اس کو لوٹا دے۔'' ❸

❶ بخاری ۱۶۸۸ ❷ مسلم ۱۹۶۳، علامہ عثیمین رحمہ اللہ تفسیر سورۂ بقرہ ص ۳۹۲ ج ۲، آیت ۱۹۶ ❸ بخاری: ۲۱۴۸

Marfat.com

حدیث کی شرح:

حدیث کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص اونٹنی یا بکری کو بیچنے سے پہلے اس کا دودھ نہ دوہے، جس کی وجہ سے اس کا تھن دودھ سے بھر جائے گا اور بڑا دکھائی دے گا اور خریدار اس دھوکے میں اس کو خرید لے کہ اس کا تھن قدرتی طور پر ایسا ہی ہے اور قیمت توقع سے زیادہ ادا کر دے، اور جب اس کا دودھ دوہے تو اسے اس حقیقت کا پتا چلے کہ یہ قدرتی طور پر زیادہ دودھ دینے والی نہیں ہے۔ تو خریدار کو یہ اختیار ہے کہ چاہے اس اونٹنی یا بکری کو یہ انکشاف ہونے کے بعد بھی اپنے پاس باقی رکھے یا اسے بائع کو ایک صاع کھجور یا کسی اور غلہ کے ساتھ لوٹا دے ایسی اونٹنی یا بکری کو ''مصراۃ'' کہتے ہیں جو أصرّی یُصَرِّی تصریۃ بروزن زکّی یزکی تزکیۃ کا اسم مفعول ہے۔ یعنی ایسی اونٹنی یا بکری جس کا تھن بن دوہا ہوا چھوڑ دیا جائے۔

احناف کا دعویٰ:

احناف نے یہ دعویٰ کر کے کہ یہ حدیث قیاس کے خلاف بھی ہے اور غیر فقیہ راوی - ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ - کی روایات کردہ ہے اس کو ماننے سے انکار کر دیا۔

شاہ ولی اللہ نے ان کے اس نقطۂ نظر پر تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ تتبع کرنے والے پر اس طرح کے تضادات کی حقیقت مخفی نہیں ہو سکتی۔ مثلاً یہی قول کہ جو راوی عدالت اور ضبط سے تو موصوف ہو، مگر فقیہ نہ ہو اس کی حدیث اگر قیاس کے خلاف ہو گی تو رد کر دی جائے گی قبول نہ کی جائے گی جیسا کہ انہوں نے ''حدیث مصراۃ'' کے ساتھ کیا، لیکن پھر ان میں اختلاف پیدا ہو گیا اور اس کو عیسیٰ بن ابان کا مسلمہ اُصول کہہ کر کچھ لوگوں نے تو تسلیم کر لیا اور کچھ لوگوں نے ''راوی کے فقیہ'' ہونے کی شرط کو ماننے سے انکار کر دیا یہ مسلک کرخی اور ان کے پیروؤں کا ہے جن کا کہنا ہے کہ خبر واحد قیاس پر مقدم ہے اس دوسرے فریق کا کہنا ہے کہ ہمارے ائمہ سے یہ منقول نہیں ہے کہ راوی غیر فقیہ کی حدیث قیاس کے خلاف ہونے کی صورت میں مسترد کر دی جائے گی، چنانچہ بھول کر کھانے پینے سے روزہ ٹوٹنے کی اس حدیث کو مانا ہے جو ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جبکہ وہ ان کے نزدیک ''فقیہ'' نہیں تھے، یہاں تک کہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ اگر یہ حدیث نہ ہوتی تو میں قیاس کو اختیار کرتا۔ [1]

عبداللہ بن مسعود کی حدیث:

صحیح بخاری میں عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی ایک موقوف حدیث ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی مذکورہ بالا حدیث ''مصراۃ'' کی ہم معنی آئی ہے۔ الفاظ مختلف ہیں:

((من اشتری شاۃ محلفۃ فردھا، فلیرد معھا صاعًا من تمرٍ......))

''جو بن دوہی ہوئی بکری خریدے جس کا دودھ تھن میں جمع ہو گیا ہو، پھر اس کو لوٹا دے تو اس کے ساتھ ایک

[1] الانصاف ص ۱۴۰-۱۴۱

Marfat.com

صاع کھجور بھی لوٹائے۔"❶

"شاة محفلة" "شاة مصراة" کی ہم معنی ہے اور تحفیل کے معنی تصریہ ہی کی طرح بکری، گائے اور اونٹنی کو دوہے بغیر چھوڑے رکھنا ہے، تا کہ اس کے تھن میں دودھ زیادہ جمع ہو جائے اور وہ بڑا ہو جائے۔

یہ صحیح ہے کہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے "بن دوہی" بکری کی بیع فسخ کرنے کا جو حکم بیان کیا ہے اس کو رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب نہیں کیا ہے، مگر یہ مبنی حدیث پر ہی ہے۔ کیونکہ صحابہ کے فتاویٰ کے تتبع سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ شرعی فتوے اپنی رائے سے نہیں دیتے تھے، بلکہ قرآن و حدیث سے دیتے تھے۔

لگتا ہے کہ احناف کو ابن مسعود کی یہ روایت نہیں معلوم تھی، ورنہ اس مسئلہ میں ان کی رائے اور ہوتی، کیونکہ ان کا دعویٰ ہے کہ حنفی مسلک عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایات اور اقوال پر مبنی ہے۔

ایک لطیفہ:

اوپر کی بحث سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ احناف "حدیث مصراۃ" کو رد کر چکے ہیں اور عیسیٰ بن ابان اور کرخی کے درمیان جو اختلاف ہے وہ غیر فقیہ راوی کی حدیث کے قبول اور رد سے متعلق ہے اور جو روایت مقبول نہ ہو مردود ہو وہ کسی مسئلہ میں شرعی دلیل نہیں بن سکتی، یہ سب واضح ہو جانے کے بعد قارئین کے لیے یہ بات ایک لطیفہ سے کم نہیں ہوگی کہ احناف نے مشروط خرید و فروخت -بیع الخیار- کے لیے زیادہ سے زیادہ تین دن کی مدت مقرر کرنے پر اسی حدیث "مصراۃ" سے استدلال کیا ہے، جبکہ اس حدیث میں اس کا کوئی ذکر نہیں آیا ہے، چنانچہ امام ابن القیم رحمہ اللہ اعلام الموقعین میں تحریر فرماتے ہیں:

"انہوں نے معاملات بیع و شراء کو نافذ کرنے یا کالعدم کر دینے کے اختیار کے لیے زیادہ سے زیادہ تین دنوں کی مدت مقرر کرنے پر اسی حدیث "مصراۃ" سے استدلال کیا ہے جو ان کے عجائبات میں سے ایک ہے، جبکہ یہ اس حدیث کے سب سے بڑے منکر ہیں اور اس کو ماننے کے روادار نہیں ہیں، اگر یہ حدیث حق و ثابت ہے تو اس پر عمل کرنا فرض ہے اور اگر صحیح نہیں ہے، تو پھر اختیار سے مشروط معاملات بیع و شراء کے لیے تین دن کی مدت مقرر کرنے پر اس سے استدلال بھی درست نہیں ہے اور حدیث میں اختیار کی شرط کا کوئی ذکر بھی نہیں آیا ہے، اس طرح حدیث کا جو مدعا ہے اور جس پر وہ دلالت کرتی ہے انہوں نے اس کی تو مخالفت کر دی ہے اور جو اس کا مدلول ہی نہیں ہے اس کو دلیل بنا لیا۔"❷

اختیار سے مشروط بیع و شراء:

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

((المتبايعان: كل واحد منهما بالخيار على صاحبه ما لم يتفرقا، إلا بيع الخيار))

❶ بخاری نمبر ۲۱۴۹ ❷ ص ۲۹۷ ج ۳

Marfat.com

''بیع وشراء کا معاملہ کرنے والے دونوں میں سے ہر ایک کو اپنے ساتھی پر- معاملہ کو قبول کر لینے یا رد کر دینے کا- اختیار اس وقت تک حاصل ہے جب تک وہ ایک دوسرے سے جدا نہ ہو، سوائے اختیار سے مشروط خرید وفروخت کے۔'' ❶

حدیث کی تشریح:

عام معاملات بیع وشراء میں بیچنے والے اور خریدنے والے دونوں میں سے ہر ایک کو سودا طے کر لینے یا رد کر دینے کا حق اس وقت تک حاصل ہے جب تک وہ موقع خرید وفروخت پر اکٹھے رہیں اور جوں ہی وہ ایک دوسرے سے الگ اور جدا ہوئے اسی لمحہ یہ حق اور اختیار بھی ختم ہو جائے گا۔ اس حکم سے خرید وفروخت کا وہ معاملہ خارج ہے جو اختیار سے مقید اور مشروط ہو، جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر سامان فروخت کرنے والے اور اس کے خریدار نے بیع وشراء کا سودا کرتے ہی اس کے نفاذ کا حق اختیار کر لیا تو یہ سودا اسی وقت واجب التنفیذ ہو جائے گا اور دونوں کے ایک دوسرے سے الگ اور جدا ہونے کی مدت کا کوئی اعتبار نہیں رہ جائے گا۔

حدیث میں ''إلا بیع الخیار'' خرید وفروخت کے سودے کے نفاذ یا عدم نفاذ کے، دونوں کی جدائی اور علیحدگی تک ممتد ہونے سے استثنا ہے بایں معنی کہ اگر دونوں نے علیحدہ اور جدا ہونے سے پہلے ہی سودے کے نفاذ کو اختیار کر لیا تو بیع وشرا کا سودا طے پا جائے گا اور ان کی علیحدگی کی مدت غیر معتبر ہو جائے گی۔

مذکورہ حدیث کی تشریح سے متعلق اوپر جو کچھ عرض کیا گیا ہے اس کی تائید صحیحین کی ایک دوسری حدیث سے ہوتی ہے جس کے الفاظ ہیں:

((إذا تبایع الرجلان ، فکل واحد منهما بالخیار ما لم یتفرقا و کانا جمیعًا ، أو یَخیر أحدهما الاخر ، فتبایعا علی ذلك فقد وجب البیع ، و ان تفرقا بعد أن یتبایعا و لم یترك واحدٌ منهما البیع ، فقد وجب البیع))

''اگر دو آدمیوں نے خرید وفروخت کا معاملہ کیا تو ان میں سے ہر ایک کو اس وقت تک اس کے نفاذ اور عدم نفاذ کا حق واختیار حاصل ہے جب تک وہ ایک دوسرے سے جدا نہ ہو جائیں اور اکٹھے رہیں، یا ان میں سے ایک دوسرے کو اختیار دے اور اس بنیاد پر وہ خرید وفروخت کا معاملہ کریں، تو بیع واجب ہو جائے گی اور اگر وہ خرید وفروخت کے بعد جدا ہوئے اور ان میں سے کسی نے بیع کو کالعدم نہیں کیا تو بھی بیع واجب ہو جائے گی۔'' ❷

حدیث کا مطلب:

اس حدیث میں ''و کانا جمیعًا'' تک عام معاملات خرید وفروخت کی صورت بیان ہوئی ہے اور ''یا ان میں سے

❶ بخاری ۲۱۱۱، مسلم ۱۵۳۱ ❷ (بخاری ۲۱۱۲ مسلم ۱۵۳۱-۴۴-)

Marfat.com

ایک دوسرے کو اختیار دے اور اسی بنیاد پر معاملہ ہو' یہ بیع وشراء کی دوسری صورت ہے، یعنی اختیار سے مقید اور مشروط بیع اس کی شکل یہ ہے کہ دونوں میں سے کوئی اپنے ساتھی کو بیع کے نفاذ کا اختیار دے دے اور وہ اسے اسی وقت قبول کر لے تو اسی وقت وہ بیع واجب التنفیذ ہو جائے گی اور دونوں کے ایک دوسرے سے الگ اور جدا ہونے تک ان کا یہ اختیار ممتد نہیں ہوگا۔

حدیث میں "فقد وجب البیع" کا دوسرا فقرہ حدیث کے پہلے حصہ سے متعلق ہے جس میں بیع وشراء کی عام صورت بیان ہوئی ہے یعنی اگر دو آدمیوں نے آپس میں بیع وشراء کا معاملہ کیا اور جس مجلس میں یا جگہ انہوں نے یہ معاملہ کیا اور اس جگہ کو چھوڑنے سے پہلے تک ان میں سے کسی نے اس بیع کو کالعدم یا منسوخ نہیں کیا تو وہ واجب التنفیذ ہوگی اور اس جگہ سے چلے جانے کے بعد ان میں سے کسی کو اسے کالعدم کرنے کا اختیار نہیں رہ جائے گا۔ ❶

خرید وفروخت کے معاملے میں شرط لگانے کا اختیار:

خرید وفروخت اور زندگی سے متعلق ضروری اشیاء کے تبادلے کا معاملہ ایسا ہے جس سے کسی بھی ملک اور کسی بھی معاشرے کا انسان نہ کبھی بے نیاز ہوا ہے اور نہ کبھی ہوگا اس تناظر میں نبی کریم ﷺ کے عہد مبارک میں بھی سامان حیات کے لین دین اور خرید وفروخت سے ہر مسلمان دو چار ہوتا تھا اور چونکہ لین دین اور تجارتی اعمال میں دھوکے اور فریب کے بڑے امکانات اور مواقع آتے ہیں اس لیے نبی ﷺ نے اپنے اقوال وافعال کے ذریعہ جہاں اس معاملہ کی جائز شرعی صورتیں واضح فرما دی ہیں وہیں لین دین اور خرید وفروخت کے ایسے طریقے بتا دیے ہیں جن پر عمل کر کے فریقین نقصان اٹھانے اور نقصان پہنچانے، دونوں سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔

موضوع کے اندر رہتے ہوئے سطور بالا میں معاملات بیع وشراء اور ان سے متعلق جن احادیث کا ذکر آیا ہے ان سے بیع وشراء کی دو صورتیں سامنے آئی ہیں۔

۱۔ بیچنے والے اور خریدنے والے جس جگہ یہ معاملہ کریں وہ یہ معاملہ کرتے ہی اس کو نافذ العمل قرار دے دیں۔ جس کے نتیجے میں فریقین میں سے کسی کو سودا کالعدم کرنے یا منسوخ کرنے کا کوئی اختیار نہیں رہ جاتا اور وہ واجب التنفیذ ہو جاتا ہے۔ حدیث میں اس کو "بیع الخیار" اختیاری خرید وفروخت کا نام دیا گیا ہے۔

۲۔ عام معاملاتِ بیع وشراء: ان میں فریقین میں سے کوئی اپنے ساتھی کو بیع نافذ کرنے یا کالعدم کرنے کا اختیار نہیں دیتا اور دونوں میں سودا طے پا جاتا ہے۔ اس طرح کی خرید وفروخت اور لین دین کا معاملہ اس وقت تک واجب التنفیذ یا نافذ العمل نہیں ہوتا جب تک فریقین اس جگہ رہیں جہاں انہوں نے سودا کیا ہے، اگر ان میں سے کوئی ایک بھی وہاں سے چلا گیا یا دونوں ایک دوسرے سے الگ اور جدا ہو گئے، تو سودا واجب التنفیذ ہو جاتا ہے اور اس کو منسوخ

❶ فتح الباری ص ۱۱۴۶ ج ۲، منۃ المنعم ص ۱۶ ج ۳۔

Marfat.com

کرنے کا اختیار کسی کو نہیں رہ جاتا۔

اس مسئلہ سے متعلق حدیث کی کتابوں میں جو صحیح احادیث منقول ہیں ان میں سے کسی بھی حدیث میں سودے کو نافذ کرنے یا کالعدم کرنے کی کوئی مدت نہیں بیان ہوئی ہے، سوائے ان کے ایک دوسرے سے الگ اور جدا ہو جانے کی مدت کے۔

شرط عائد کرنے کا اختیار:

لیکن احناف کا مسلک یہ ہے کہ "خیار المجلس" کے علاوہ بیچنے والے اور خریدنے والے، ہر ایک کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ بیع کے نفاذ یا عدم نفاذ کے لیے تین دن کی مہلت سے فائدہ اٹھائیں اس سے زیادہ نہیں۔ شرط عائد کرنے کے اس اختیار کا نتیجہ یہ نکلا کہ اگر کسی نے کسی سے کسی جگہ کوئی چیز خریدی قیمت بھی ادا کر دی گئی خریدار نے خریدی ہوئی چیز کو اپنے قبضے میں بھی لے لیا مگر شرط کے اس اختیار کی وجہ سے تین دن تک وہ اس کو استعمال میں نہیں لا سکتا، کیونکہ جہاں بیچنے والے کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ تین دن کے اندر اندر اپنی بیچی ہوئی چیز کو واپس لے لے وہیں خریدنے والے کو بھی یہ حق حاصل ہے کہ وہ خریدی ہوئی چیز کو لینے سے انکار کر دے۔

شرط عائد کرنے کے اس اختیار کی ایک دلیل تو یہ لوگ حدیث ''مصراۃ'' کو دیتے ہیں جیسا کہ امام ابن القیم کے حوالہ سے اوپر ذکر آ چکا ہے، جبکہ اس حدیث میں ''تین دن کی مہلت'' کا کوئی ذکر نہیں ہے اور بیع فسخ کرنے کے لیے تین دن کی مہلت کی دلیل میں یہ لوگ حبان بن منقذ رضی اللہ عنہ کی ایک حدیث کو پیش کرتے ہیں جو ضعیف ہونے کے علاوہ تمام صحیح حدیثوں کے خلاف بھی ہے۔ صاحب ہدایہ علامہ برہان الدین مرغینانی نے یہی حدیث بطور مثال نقل کی ہے، وہ کتاب البیوع "باب خیار الشرط" کے تحت تحریر فرماتے ہیں:

((خيار الشرط جائز في البيع للبائع و المشتري و لهما الخيار ثلاثة أيام فما دونها ، و الأصل فيه ما روى: أن حبان بن منقذ بن عمرو الأنصاري رضي الله عنه كان يغبن في البياعات ، فقال له النبي ﷺ: إذا بايعت فقل لا خلابة و لي الخيار ثلاثة أيام))

''بیع و شراء میں بیچنے والے اور خریدنے والے کے لیے شرط لگانے کا اختیار جائز ہے اور ان دونوں کو تین دن اور اس سے کم مدت کے لیے یہ اختیار حاصل ہے، اس حکم کی اصل یہ روایت ہے کہ حبان بن منقذ بن عمرو انصاری رضی اللہ عنہ خرید و فروخت کے معاملات میں دھوکا دہی سے دو چار ہوا کرتے تھے اس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا: جب تم خرید و فروخت کا معاملہ کرو، تو کہہ دیا کرو: دھوکا نہیں اور مجھے تین دن کا اختیار حاصل ہے۔ [1]

اس حدیث کی صرف اس روایت میں ''تین دن کے اختیار'' کا فقرہ آیا ہے جو محمد بن اسحاق سے مروی ہے اور محمد

[1] ص ۱۳-۱۵ ج ۴

Marfat.com

بن اسحاق ''مدلس'' ہونے کی وجہ سے جمہور محدثین کے نزدیک ضعیف ہیں اور ان کی "معنعن" روایت ناقابل استدلال ہے، البتہ جس حدیث کی روایت میں انہوں نے سماع کی تصریح کی ہے وہ ''حسن درجہ'' پر ہے۔

جن کتابوں میں ''تین دن کے فقرہ'' کے ساتھ یہ حدیث آئی ہے وہ مستدرک حاکم (نمبر ۲۲۴۸) بیہقی کی معرفۃ السنن (۳۲۲۶) اور السنن الکبری (۱۰۴۵۸) اور سنن ابن ماجہ (۲۳۵۵) وغیرہ ہیں اور ان تمام کتابوں میں ''اضافے والی'' روایت: کی تمام سندوں میں محمد بن اسحاق شامل ہیں جنہوں نے بذریعہ ''عن'' نافع سے اس کی روایت کی ہے۔

لیکن بخاری (نمبر ۲۱۱۷، ۲۴۰۲، ۲۴۱۴، ۴۹۶۴) مسلم (نمبر ۱۵۳۳) ابوداود (نمبر ۳۵۰۱) ترمذی (نمبر ۱۲۵۰) نسائی (۴۴۸۹) اور مسند امام احمد (نمبر ۵۰۳۶-۵۲۷۱، ۵۵۶۱، ۵۵۱۵، ۵۸۵۴، ۵۹۷۰) میں یہ حدیث عبداللہ بن عمر اور انس بن مالک رضی اللہ عنہم سے مروی آئی ہے جس میں ''ثلاثۃ ایام'' کا اضافہ نہیں ہے۔

حافظ زیلعی نے بھی ''نصب الرایہ تخریج احادیث الہدایہ'' میں (ص ۱۴-۱۶ ج ۴) ان تمام حدیثوں کو ضعیف قرار دیا ہے، جن میں ثلاثۃ أیام'' کا فقرہ آیا ہے اور جن کی سندوں میں محمد بن اسحاق شامل ہیں۔

امر واقعہ یہ ہے کہ صحیح احادیث کی مخالفت اور ان سے عدم استدلال اور ضعیف حدیثوں سے استدلال احناف کی پہچان بن گیا ہے۔

حدیث واحد سے قرآن پر اضافہ:

یہ اس باب کا نہایت اہم اور معرکۃ الآراء موضوع ہے متاخرین علمائے احناف، متکلمین کے دونوں اسکولوں -اشعری، اور ماتریدی- منکرین حدیث اور حدیث کو مشروط ماخذ شریعت ماننے والے تمام لوگوں کا یہ محبوب موضوع ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو کتاب اللہ کے ساتھ اپنے تعلق خاطر کے بڑے دعوے کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے کلام سے محبت و عقیدت کا اظہار ان کی خاص شناخت ہے یوں تو یہ لوگ حدیث واحد سے قرآن کی تفسیر اور تبیین کے بھی خلاف ہیں، لیکن اس کا اظہار یہ برملا اور علی الاعلان نہیں کرتے، بلکہ ان حدیثوں کی صحت کا انکار کر کے کرتے ہیں جو قرآن پاک کی تفسیر و تبیین سے متعلق ہیں۔ رہا حدیث سے قرآن پر اضافے کا مسئلہ تو اس کے ذکر سے ان کے ایوان ہائے امن و سکون میں زلزلہ آ جاتا ہے۔ حدیث میں ایسے لوگوں کو ''مسند نشین'' فرمایا گیا ہے۔ [1]

جب سے اس گروہ کا ظہور ہوا ہے اس وقت سے آج تک اس کا ایک فرد بھی اپنے دعوے پر قرآن سے کوئی دلیل نہیں پیش کر سکا ہے، جو اس امر کی دلیل ہے کہ اس کے پاس دعویٰ اور بڑ کے سوا کچھ نہیں ہے۔

حدیث رسول کے ایک ادنیٰ خادم کی حیثیت سے میرا یہ عقیدہ ہے کہ محمد بن عبداللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول اور ہادی ماننے کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ آپ کو قرآن کا شارح، مفسر، معلم اور مُبَیِّن ماننے کے ساتھ ساتھ آپ کو مستقل بالذات شارع

[1] ابوداود ۴۶۰۴، ۴۶۰۵، ترمذی ۲۶۶۳، ۲۶۶۴، ابن ماجہ ۱۲، ۱۳۔

Marfat.com

بھی مانا جائے، کیونکہ قرآن کے مطابق آپ کی تشریحات قرآنی، تفسیرات قرآنی اور تبیینات قرآنی کو ماننا اور ان کو عملی جامہ پہنانا اللہ کی اطاعت ہے آپ کی اطاعت نہیں، جبکہ قرآن ہم سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ ہم آپ کی بالکل ویسی ہی اطاعت کریں جیسی اطاعت اللہ کی کرتے ہیں پورے قرآن پاک میں کوئی ایک بھی ایسی آیت نہیں آئی ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے اپنی اطاعت کے ساتھ اپنے رسول کی اطاعت کا حکم نہ دیا ہو، البتہ ایسی آیت آئی ہے جس میں صرف رسول کی اطاعت کا حکم دیا ہے۔ (سورۂ نور ۵۶) اور ایسی بھی جس میں رسول کی اطاعت کو عین اللہ کی اطاعت قرار دیا گیا ہے۔ (سورۂ نساء: ۸۰)

رہی آپ کی اتباع، آپ کے نقش قدم کی پیروی اور آپ کو نمونۂ عمل قرار دینا تو یہ تو عقیدے کا ایک حصہ ہے، کیونکہ شہادتین کے دوسرے حصے محمد رسول اللہ کا یہی تقاضا ہے جس کے بغیر کوئی بھی مومن اللہ کا محبوب نہیں بن سکتا، بلکہ مبغوض بنے گا (سورۂ آل عمران: ۳۱) رسول کی دعوت پر لبیک اللہ کی دعوت پر لبیک ہے۔

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو براہ راست دعوتِ حق نہیں دیتا اور نہ وہ کسی سے براہ راست ہم کلام ہی ہوتا ہے۔ بلکہ اس کے احکام کو اس کے بندوں تک پہنچانے والے ہمیشہ سے اس کے رسول رہے ہیں جن کو فرشتوں کے ذریعہ یہ احکام دیے جاتے تھے، چاہے یہ اللہ کی کتابوں کی صورت میں رہے ہوں یا ان رسولوں کی زبانوں سے نکلنے والے ارشادات کی صورت میں۔ اللہ تعالیٰ نے سورۂ انفال کی آیت نمبر ۲۴ میں اہل ایمان کو مومن ہونے کی حیثیت سے یہ حکم دیا ہے کہ وہ اس کے اور اس کے رسول کے احکام کی تعمیل کریں، ارشاد الٰہی ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَجِيبُوا لِلَّهِ وَ لِلرَّسُولِ إِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيكُمْ.... الآية﴾ (الانفال : ٢٤)

"اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ و رسول کا حکم مانو جب رسول تمہیں اس چیز کی دعوت دے جو تمہیں زندگی بخشتی ہے۔"

یہ آیت اس امر میں صریح ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے احکام کی بجا آوری اللہ کے احکام کی بجا آوری ہے اور یہ اللہ و رسول پر ایمان کا لازمی تقاضا ہے اور "اذا دعاکم" سے مراد وہ براہ راست دعوتِ حق ہے جو رسول اللہ ﷺ ان کو دیتے تھے، "دعا" کا فاعل اس میں پوشیدہ ضمیر: "ھو" ہے جس سے مراد "الرسول" ہے اور "لما یحییکم" اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ رسول کی دعوت سراسر حیات بخش ہے۔

رسول اللہ ﷺ مستقل بالذات شارع بھی تھے۔

بنو اسرائیل کے مومنین کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الرَّسُولَ النَّبِيَّ الْأُمِّيَّ الَّذِي يَجِدُونَهُ مَكْتُوبًا عِندَهُمْ فِي التَّوْرَاةِ وَ

Marfat.com

الْاِنْجِيْلِ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهٰهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ يُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَ يُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَ يَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَ الْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَ عَزَّرُوْهُ وَ نَصَرُوْهُ وَ اتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾ (الاعراف: ۱۵۷)

''جو اس امی نبی رسول کی پیروی کرتے ہیں جس کو وہ اپنے پاس تورات اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں، جو انہیں نیکی کا حکم دیتا ہے اور برائی سے روکتا ہے اور ان کے لیے پاکیزہ چیزیں حلال کرتا ہے اور ناپاک چیزیں حرام کرتا ہے، اور ان سے ان کا بوجھ اور وہ طوق اتارتا ہے جو ان پر تھے تو جو اس پر ایمان لائے، اس کو تقویت دی اور اس کی مدد کی اور اس نور کی پیروی کی جو اس کے ساتھ نازل کیا گیا ہے، وہی فلاح پانے والے ہیں۔''

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کی جو صفات بیان فرمائی ہیں وہ سب تشریعی صفات ہیں جو تلاوت کتاب، تبلیغ کتاب اور تبیین وتفسیر کتاب کے علاوہ ہیں، کیونکہ یہ آپ کی ذاتی صفات ہیں۔

اس آیت سے یہ معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کے اوامر ونواہی اور آپ کے تشریعی احکام اپنے مقام، حیثیت اور درجے میں اللہ کے اوامر ونواہی اور احکام کی طرح ہیں، اور خود اللہ تعالیٰ نے دونوں کو یہ مساوی درجہ دیا ہے۔

غامدی کی یاوہ گوئیاں:

جاوید احمد غامدی ہیں تو مولانا اصلاحی کے پروردہ، مگر ان کی تحریروں میں قرآن وحدیث کے تدبر وفہم، تفسیر وتفہیم کے اصولوں کے بیان، قرآن وحدیث کے باہمی تعلق کے تعین اور دونوں کے مقام وحیثیت کے فرق کے حوالہ سے زیادہ جرأت پائی جاتی ہے اصلاحی صاحب کی تحریروں میں جو تحفظات تھے وہ ان کی تحریروں میں مفقود ہیں، بلکہ ان کی جرأتوں نے یاوہ گوئیوں کی صورت اختیار کر لی ہے۔ نیز وہ خلط مبحث میں بھی بڑے جری اور ماہر ہیں۔

غامدی صاحب قرآن سے تعلق کے حوالے سے جس تناظر میں سابقہ آسمانی صحیفوں کو دیکھتے اور لیتے ہیں اسی تناظر میں وہ حدیث کو بھی لیتے ہیں، حالانکہ قدیم آسمانی صحیفے ضائع ہو چکے ہیں اور ان میں نازل شدہ شریعت بھی منسوخ ہو چکی ہے اور سابق انبیاء اور رسولوں کے اللہ کے نبی اور رسول ہونے پر ایمان تو فرض ہے، لیکن وہ ہمارے متبوع نہیں رہے ہمارے متبوع صرف محمد بن عبداللہ ﷺ ہیں۔

اسی طرح سابق رسولوں کی شریعتوں پر عمل کرنا بھی ہمارے لیے جائز نہیں رہا، حتی کہ ان شریعتوں کے جو احکام محمد بن عبداللہ ﷺ کی لائی ہوئی شریعت کے احکام کے مطابق ہیں ان پر بھی ہم اس وجہ سے عمل کرتے ہیں کہ یہ ہماری شریعت کے احکام ہیں، نہ کہ ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ علیہم السلام پر نازل ہونے والی شریعتوں کے احکام۔

رہا سابق رسولوں کے درمیان عدم تفریق کا حکم تو اس کا تعلق ان کے صدق رسالت سے ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے

Marfat.com

سارے رسول اپنی رسالت میں سچے تھے۔

غامدی نے سورۂ مائدہ کی آیت نمبر ۴۸ میں موجود لفظ "مُھَیـمِـن" سے قرآن کے میزان اور فرقان ہونے پر جو استدلال کیا ہے تو اس سے مراد یہ ہے کہ قرآن سابقہ کتب آسمانی پر محافظ اور نگراں ہے، نہ کہ حدیث پر، یہ لفظ قرآن پاک میں دو جگہ آیا ہے؛ سورۂ حشر، آیت ۲۳ میں اور سورۂ مائدہ کی آیت ۴۸ میں، اللہ تعالیٰ کے لیے یہ بطور اسم صفت کے آیا ہے اور اس کا شمار ''اسمائے حسنیٰ'' میں ہوتا ہے اور قرآن کے لیے بطور صفت اور صفت اور اسم صفت میں جو فرق ہے اس سے اہل علم واقف ہیں۔ اس لفظ کے مترادفات ہیں:

رقیب (نگراں) مؤتمن (قابل اعتماد، معتمد علیہ) شھید (گواہ) حاکم۔

اس کے بعد انہوں نے اپنے ''کچلی'' کے دانت دکھاتے ہوئے فرمایا ہے:

''قرآن سے باہر کی کوئی وحی خفی یا جلی، یہاں تک کہ خدا کا وہ پیغمبر بھی جس پر یہ نازل ہوا ہے اس کے کسی حکم کی تحدید وتخصیص یا اس میں کوئی ترمیم وتغیر نہیں کرسکتا۔ دین میں ہر چیز کے رد وقبول کا فیصلہ اس کی آیات ''بینات'' کی روشنی میں ہوگا، ایمان وعقیدہ کی ہر بحث اس سے شروع ہوگی اور اسی پر ختم کر دی جائے گی۔''

دوسری یہ کہ اس کے الفاظ کی دلالت اس کے مفہوم پر بالکل قطعی ہے یہ جو کچھ کہنا چاہتا ہے پوری قطعیت کے ساتھ کہتا ہے اور کسی معاملہ میں بھی اپنا مدعا بیان کرنے سے ہرگز قاصر نہیں رہتا، اس کا مفہوم وہی ہے جو اس کے الفاظ قبول کر لیتے ہیں وہ نہ اس سے مختلف ہے نہ متبائن۔ [1]

موصوف نے اس عبارت کے ذریعہ نثر میں شاعری فرمائی ہے، وہ اپنے مافی الضمیر کی ادائیگی میں صحیح اور موزوں اور مناسب الفاظ کے انتخاب سے بھی قاصر رہے ہیں، اور انہوں نے اپنے اس پر تکلف کلام میں جو دعوے کیے ہیں ان میں سے کسی کی دلیل بھی قرآن سے نہیں پیش کر سکتے۔ نیز ان کے اس ارشاد سے اللہ کا رسول ''عضو معطل'' بن کر رہ جاتا ہے۔ میں موصوف کی اس عبارت کے ضروری اور اہم اجزاء کا، جو دراصل ان کے عقیدے کی نمائندگی کرتے ہیں تجزیہ کر کے ہر ایک کا مالہ وما علیہ دکھاؤں گا، تاکہ یہ واضح کرسکوں کہ سابق منکرین حدیث کے نقش قدم کی پیروی کرتے ہوئے وہ انشاپردازی کے پردے میں کون ساز ہر پھیلانا چاہتے ہیں۔

غامدی کے دعاوی ایک نظری میں:

۱۔ قرآن کے کسی حکم کی تحدید وتخصیص کا مجاز کوئی نہیں، رسول بھی نہیں۔

۲۔ دین میں ہر چیز کے رد وقبول کا فیصلہ قرآن کی آیات بینات ہی کی روشنی میں ہوگا۔

۳۔ ایمان وعقیدہ کی ہر بحث اسی سے شروع ہوگی اور اسی پر ختم کر دی جائے گی۔

---

[1] ص ۲۶-۲۷

Marfat.com

۴۔ قرآن کا ہر لفظ اپنے مفہوم پر قطعی الدلالہ ہے۔

اب میں ان میں سے ہر دعویٰ کی نکارت بیان کروں گا۔

قرآن کے کسی حکم کی تحدید و تخصیص کا مجاز کوئی نہیں:

غامدی صاحب کی پوری عبارت یوں ہے: قرآن سے باہر کی کوئی وحی خفی یا جلی، یہاں تک کہ خدا کا وہ پیغمبر بھی جس پر یہ نازل ہوا ہے اس کے کسی حکم کی تحدید یا تخصیص یا اس میں کوئی ترمیم و تغیر نہیں کر سکتا۔

یہ دعویٰ انہوں نے قرآن کے کتب سابقہ پر "مہیمن" اور نگراں ہونے کے تناظر میں کیا ہے، اس کے بعد انہوں نے یہی بات قرآن کے اپنے مفہوم پر قطعی الدلالہ ہونے کے نتیجے کے طور پر دہرائی ہے [1] اور ص ۴۱ پر حدیث اور قرآن کے زیر عنوان رقم طراز ہیں: حدیث سے قرآن کے نسخ اور اس کی تحدید و تخصیص کا یہ مسئلہ محض سوئے فہم اور قلت تدبر کا نتیجہ ہے اس طرح کا کوئی نسخ یا تحدید و تخصیص سرے سے واقع ہی نہیں ہوئی۔"

انہوں نے اولاً تو خلط مبحث کرتے ہوئے تحدید و تخصیص، ترمیم و تغیر اور نسخ وغیرہ کے الفاظ ایک ہی سلسلۂ بیان میں جمع کر دیے ہیں ثانیاً انہوں نے یہ دعویٰ اس بنیاد پر کیا ہے کہ قرآن محافظ و نگراں ہے اور میزان و فرقان ہے جس کا تقاضا ہے کہ اس کے کسی حکم کی تحدید و تخصیص نہ کی جائے۔ ان کی یہ بات خود ایک دعویٰ ہے جو دلیل نہیں بن سکتا۔ ثالثاً اپنے اس دعوے پر قرآن سے کوئی صریح دلیل دینے کے بجائے ان جانوروں کی لمبی فہرست پیش کر دی ہے جن میں سے کچھ کا کھانا حلال ہے اور کچھ کا حرام۔

حدیث سے قرآن کے نسخ کا مسئلہ مختلف فیہ ہے اور کوئی ایسی قابل اعتماد حدیث بھی نہیں ہے جس سے عملی طور پر حدیث سے قرآن کا نسخ کا پتا چلتا ہو اور چونکہ میں اس کتاب میں مسلمہ امور سے بحث کرتا ہوں اس لیے اس مسئلہ کو خارج از موضوع قرار دیتے ہوئے اس سے صرف نظر کرتا ہوں۔ مگر اسی کے ساتھ یہ بھی واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ حدیث سے قرآن کے بیان، تفسیر اور تخصیص میں اس کے حکم کی ترمیم، تغیر اور نسخ داخل نہیں ہے۔

غامدی کا دعویٰ ہے کہ قرآنی احکام کا بذریعہ وحی یا بذریعہ رسول ناقابل تحدید و تخصیص ہونا اور اس کے الفاظ کی دلالت کا اس کے مفہوم پر بالکل قطعی ہونا اس کے میزان اور فرقان ہونے کا لازمی تقاضا ہے۔ اس لیے میں مناسب خیال کرتا ہوں کہ پہلے میں قرآن میں میزان اور فرقان کے معنیٰ ان کے سیاق و سباق اور نظم کلام کی روشنی میں متعین کر دوں، پھر ان کے دعوے کی حقیقت بیان کروں۔

میزان اور فرقان کیا ہے؟

غامدی صاحب فرماتے ہیں:

---

[1] ص ۲۸

Marfat.com

''قرآن مجید اس زمین پر حق و باطل کے لیے میزان اور فرقان اور تمام سلسلۂ وحی پر ایک مہیمن کی حیثیت سے نازل ہوا ہے۔

﴿اللّٰهُ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ الْکِتٰبَ بِالْحَقِّ وَالْمِیْزَانَ﴾ (الشوری: ۱۷)

''اللہ وہی ہے جس نے حق کے ساتھ کتاب اتاری، یعنی میزان نازل کی ہے۔''

اس آیت میں ''المیزان'' سے پہلے ''و'' تفسیر کے لیے ہے اسی طرح المیزان درحقیقت یہاں ''الکتاب'' ہی کا بیان ہے۔ آیت کا مدعا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حق و باطل کے لیے قرآن اتارا ہے جو دراصل ایک میزان عدل ہے اور اس لیے اتارا ہے کہ ہر شخص اس پر تول کر دیکھ سکے کہ کیا چیز حق ہے اور کیا باطل؟'' [1]

انہوں نے جو یہ فرمایا ہے کہ ''المیزان'' سے پہلے ''و'' تفسیر کے لیے ہے تو اس کے متعلق عرض ہے کہ یہ ''و'' ہے تو عام واو عطف، لیکن ترکیب ''عطف الصفۃ علی الموصوف'' کی ہے۔ یعنی المیزان'' الکتاب کی صفت ہے، چنانچہ سورۂ حدید میں ہے:

﴿لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْکِتٰبَ وَالْمِیْزَانَ لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ﴾ (الحدید: ۲۵)

''درحقیقت ہم نے اپنے رسولوں کو واضح دلیلوں کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان نازل کی تاکہ لوگ انصاف پر قائم رہیں۔''

اس آیت میں بھی ''المیزان'' الکتاب کی صفت ہے اور ترکیب: عطف الصفۃ علی الموصوف ہے۔

یہ آیت مبارکہ یہ بھی بتا رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس زمین پر اپنے جتنے رسول بھیجے سب کے ساتھ کتاب نازل کی جو میزان عدل تھی اور اس کے ساتھ ان کو اپنی وحدانیت اور ان کے صدق رسالت پر دلالت کرنے والے واضح اور ناقابل تردید دلائل کے ساتھ بھیجا۔

۲۔ المیزان کی طرح الفرقان بھی قرآن کی صفت ہے قرآن کے مطابق الفرقان صرف قرآن اور تورات کی صفت ہے، سورۂ بقرہ میں ارشاد الٰہی ہے:

﴿وَ اٰتَیْنَا مُوْسَی الْکِتٰبَ وَ الْفُرْقَانَ لَعَلَّکُمْ تَهْتَدُوْنَ﴾ (البقرۃ: ۵۳)

''اور جب ہم نے موسیٰ کو کتاب اور فرقان دیا تاکہ تم ہدایت یاب ہو۔''

اس آیت مبارکہ میں الکتاب سے مراد ''تورات'' ہے جس کی ''الفرقان'' صفت ہے اور ترکیب: عطف الصفۃ علی الموصوف ہے۔

قرآن اور تورات کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے کسی اور آسمانی کتاب کی صفت الفرقان نہیں قرار دی ہے۔ ایسا ان دونوں

---

[1] ص ۲۵

Marfat.com

کی عظمت اور ان کے احکام کی جامعیت کے اعتبار سے ہے۔

سورۂ قصص میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿قُلْ فَاْتُوْا بِكِتٰبٍ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ هُوَ اَهْدٰى مِنْهُمَآ اَتَّبِعْهُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ۝﴾ (القصص: ٤٩)

''کہہ دو، تو لاؤ اللہ کے پاس سے کوئی ایسی کتاب جو ان دونوں سے زیادہ ہدایت دینے والی ہو کہ میں اس کی پیروی کروں اگر تم سچے ہو۔''

اس سے قبل موسی و ہارون علیہما السلام کی دعوتِ حق اور اس کے خلاف فرعون اور اس کی قوم کے معاندانہ طرز عمل کی سرگزشت بیان کی جا رہی تھی، اور اس سے بالکل متصل سابقہ آیت میں فرمایا گیا ہے:

﴿فَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوْا لَوْلَآ اُوْتِيَ مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى اَوَلَمْ يَكْفُرُوْا بِمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى مِنْ قَبْلُ قَالُوْا سِحْرٰنِ تَظٰهَرَا وَقَالُوْٓا اِنَّا بِكُلٍّ كٰفِرُوْنَ۝﴾ (القصص: ٤٨)

''پس جب ان کے پاس ہمارے پاس سے حق آ گیا تو انہوں نے کہا اسے اس چیز جیسی چیز کیوں نہ دی گئی جو موسی کو دی گئی تھی؟ کیا اس سے قبل انہوں نے اس کا انکار نہیں کر دیا تھا جو موسیٰ کو دیا گیا تھا اور کہا تھا کہ دونوں جادو ہیں جو آپس میں ایک دوسرے کے متعاون ہیں اور انہوں نے کہا کہ ہم سب کے منکر ہیں۔''

سورۂ شوریٰ کی جس آیت میں المیزان کا لفظ آیا ہے اس سے سابقہ آیت میں نبی ﷺ کی دعوتِ توحید کو بعض لوگوں کے قبول کر لینے کے بعد مشرکین مکہ، یا یہود و نصاریٰ کی، اللہ کے بارے میں کٹ حجتیوں کا ذکر آیا ہے اور اعلان کیا گیا ہے کہ ان کی حجت بازی اللہ کے نزدیک باطل ہے، ارشاد الٰہی ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ يُحَآجُّوْنَ فِي اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا اسْتُجِيْبَ لَهٗ حُجَّتُهُمْ دَاحِضَةٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ وَّلَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ۝﴾ (الشوری: ١٦)

''اور جو لوگ اللہ کے بارے میں، بعد اس کے کہ اس کی دعوتِ-توحید- مان لی گئی ہے جھگڑتے ہیں ان کی حجت بازی اللہ کے نزدیک باطل ہے ان پر بڑا غضب ہے اور ان کے لیے نہایت سخت عذاب مقدر ہے۔''

قرآن پاک کے لیے اس کی صفت ''فرقان'' دو جگہ بیان کی گئی ہے؛ سورۂ بقرہ آیت: ۱۸۵ اور سورۂ فرقان آیت:

۱، سورۂ بقرہ کی آیت کے الفاظ ہیں:

﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ﴾

(البقرة: ١٨٥)

''رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا، لوگوں کو ہدایت دینے والا اور ہدایت اور حق و باطل کو واضح کر دینے والا۔''

Marfat.com

مطلب یہ ہے کہ قرآن لوگوں کو ہدایت دینے والی اور اپنی خبروں کے حق وصدق ہونے اور اپنے احکام کے عادلانہ ہونے پر دلالت کرنے والی واضح دلیلوں پر مشتمل کتاب ہے، اور اس کے ذریعے سابقہ آسمانی کتابوں کے حق و باطل میں تمیز بھی کی جا سکتی ہے۔

قرآن کی صفت ''مہیمن'' کی وضاحت اوپر کی جا چکی ہے، یعنی سابقہ آسمانی کتابوں پر حاکم، نگراں اور ان میں حق و باطل کو معلوم کرنے اور جاننے کا ذریعہ جس سے یہ بھی لازمی قرار پایا کہ معیار حق صرف یہی قرآن ہے، کیونکہ یہ ہر تبدیلی اور ہر آمیزش سے پاک ہے۔

البینات:

بینات: بینہ کی جمع ہے یہ واحد اور جمع دونوں صورتوں میں قرآن پاک میں آیا ہے، اور ہر صورت میں بطور صفت آیا ہے، اگر واحد کے صیغے میں آیا ہے تو موصوف ''آیۃ'' ہے اور اگر جمع آیا ہے تو موصوف ''آیات'' ہے اور اس کے معنی ہیں: حد درجہ واضح اور ظاہر۔ واحد کے صیغے میں یہ ۱۹ مرتبہ آیا ہے اور جمع کے صیغے میں ۵۲ مرتبہ۔

ابھی میں نے عرض کیا کہ ''بینۃ'' یا بینات'' آیۃ یا آیات کی صفت کے طور پر آیا ہے اور قرآن پاک میں اپنے استعمال کے اعتبار سے ''آیۃ'' کے معنی علامت، نشانی اور دلیل کے ہیں اور مراد تکوینی یا شرعی دلیل ہے اور اپنی صفت بینہ کے ساتھ اس کے معنی ہیں: تکوینی یا شرعی امور پر دلالت کرنے والی نہایت واضح اور صریح دلیل۔ علامت اور نشانی، واحد اور جمع دونوں صورتوں میں اس کا استعمال ان آیتوں کے لیے بھی ہوا ہے جو سابق رسولوں کے ذریعہ ان کی امتوں کے لیے بیان کی گئیں، خاص طور پر بنو اسرائیل کے لیے اور اس امت کے لیے بھی۔ سب سے زیادہ بنو اسرائیل کو واضح اور ناقابل تردید دلائل اور آیات کے ذریعہ قبول حق پر آمادہ کرنے کا ذکر آیا ہے جس پر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد دلیل ہے:

﴿سَلْ بَنِيٓ إِسْرَآءِيلَ كَمْ اٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ اٰيَةٍ بَيِّنَةٍ﴾ (البقرة: ۲۱۱)

''بنو اسرائیل سے پوچھو ہم نے انہیں کتنی واضح نشانیاں دی ہیں۔''

نتیجہ:

مذکورہ بالا بحث جن حقائق پر منتج ہوتی ہے وہ حسب ذیل ہیں:

۱۔ قرآن پاک سابقہ آسمانی کتابوں کے حق میں میزان عدل، ان کے حق و باطل میں فرق کرنے والی، ان میں کیا حق ہے اور کیا باطل؟ ان کی پرکھ اور جانچنے کا معیار اور کسوٹی اور سابق رسولوں اور ان کی تعلیمات اور آخری نبی و رسول محمد بن عبداللہ ﷺ کی دعوت، صدق رسالت اور کمال شریعت پر واضح اور روشن دلائل سے عبارت ہے۔

۲۔ باطل کی آمیزش صرف سابقہ کتابوں اور ان میں بیان کردہ شرعی اور عقائدی احکام میں ہوئی ہے جن کو جانچنے اور پرکھنے کا ذریعہ قرآن پاک ہے جو نہ کسی تبدیلی اور تحریف سے دوچار ہوا ہے نہ اس کی کوئی آیت، بلکہ کوئی حرف

Marfat.com

ضائع ہوا ہے، اور نہ اس میں کوئی باہر کی چیز شامل ہوئی ہے۔

۳۔ قرآن کا میزان، فرقان، مہیمن اور بینات ہونا اس امر کا متقاضی اور مستلزم نہیں ہے کہ رسول اللہ ﷺ قرآن کے کسی حکم کی تفسیر، تبیین اور تخصیص کے مجاز نہیں تھے اور آپ کی وفات کے بعد حدیث بھی قرآن کی تفسیر، تبیین اور تخصیص نہیں کر سکتی، کیونکہ رسول اللہ ﷺ کی یہ تمام حیثیتیں خود قرآن میں منصوص ہیں اور ان کا انکار خود قرآن کا انکار ہے۔

۴۔ سابقہ تمام آسمانی کتابیں میزان کی صفت سے موصوف تھیں، یعنی یہ صرف قرآن کی صفت نہیں ہے، البتہ قرآن کے بعد ان کی یہ صفت بھی باقی نہیں رہی اور نہ یہ ہمارے لیے ماخذ شریعت ہی رہیں۔

۵۔ قرآن کی طرح تورات بھی فرقان تھی، لیکن قرآن کے مطابق تورات بھی محرف ہو چکی ہے اور اگر محرف نہ بھی ہوتی تب بھی ہمارے لیے شرعی ماخذ نہ ہوتی۔

۶۔ سورۂ شوریٰ کی جس آیت سے آپ نے اپنے نظریۂ میزان پر استدلال کیا ہے، پھر یہ دعویٰ کیا ہے کہ اللہ نے اسے اس لیے اتارا ہے کہ ہر شخص اس پر تول کر دیکھ سکے کہ کیا چیز حق ہے اور کیا باطل، چنانچہ تولنے کے لیے یہی ہے، اس دنیا میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے۔ جس پر اسے تولا جا سکے۔ تو عرض ہے کہ قرآن کے اس اعلان کا تعلق اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کے بارے میں یہود و نصاریٰ اور مشرکین کی کٹ حجتیوں سے ہے جن کا ذکر سابقہ آیت میں آیا ہے اور ان کو باطل قرار دے دیا گیا ہے۔ آپ کے امام اصلاحی صاحب تحریر فرماتے ہیں:

''...... ظاہر ہے کہ جب اللہ نے نبی ﷺ کو اس کام پر مامور فرمایا تھا کہ ملتوں کے درمیان اللہ کے دین کے بارے میں جو اختلاف ہے آپ اس کا فیصلہ کریں تو ضروری ہوا کہ آپ کو ایک ایسی کتاب بالحق عطا ہو جو میزان عدل کا کام دے اور آپ اس پر پرکھ کر بتا سکیں کہ کس کے پاس کتنا حق ہے اور کتنا باطل، قرآن کی اسی خصوصیت کی وجہ سے اس کا ایک نام ''مہیمن'' بھی ہے جس کے معنی کسوٹی کے ہیں۔'' [1]

معلوم ہوا کہ آپ قرآن کے میزان، فرقان اور مہیمن ہونے کا جو یہ مطلب لے رہے ہیں کہ یہ رسول اللہ ﷺ کے منصب رسالت اور آپ کے اقوال و افعال کے لیے بھی میزان اور کسوٹی ہے تو یہ آپ کی بھیانک غلطی ہے، کیونکہ نبی ﷺ کے اقوال و افعال سراسر حق ہیں۔

۷۔ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ پر قرآن کے ساتھ حدیث بھی نازل کی ہے ارشاد الٰہی ہے:

﴿وَ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ﴾ (النساء: ۱۱۲)

''اور اللہ نے تمہارے اوپر کتاب اور حکمت نازل کی ہے۔''

قرآن یہ بھی کہتا ہے کہ آپ کے منصب رسالت میں کتاب اور حکمت دونوں کی تعلیم و تبیین بھی داخل تھی اور آپ

---

[1] ص ۱۵۲ ج ۶

Marfat.com

کے امام نے سورۂ بقرہ کی آیت نمبر ۱۲۹ کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ:

''حکمت کا ذکر یہاں کتاب کے ساتھ اس بات پر دلیل ہے کہ تعلیم حکمت تعلیم کتاب کے ساتھ ایک زائد شے ہے، اگرچہ یہ حکمت سرتاسر قرآن حکیم ہی سے ماخوذ ومستنبط ہو، اس وجہ سے ہمارے نزدیک جو لوگ حکمت سے حدیث مراد لیتے ہیں ان کی بات میں بڑا وزن ہے۔''❶

جن مفسرین نے حکمت سے فہم دین مراد لیا ہے وہ اگرچہ اسلوب کلام سے مناسب نہیں ہے، جیسا کہ میں تفصیل سے بیان کر چکا ہوں، لیکن وہ حدیث مراد لینے کے خلاف بھی نہیں ہے، کیونکہ حدیث فہم دین ہی سے عبارت ہے، یہاں میں جو عرض کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کتاب وحکمت دونوں کے لیے فعل ''أنزل'' استعمال کیا ہے اور قرآن کے مطابق نبی ﷺ اپنے اوپر نازل ہونے والی ہر شیء پر ایمان لانے اور اس کی پیروی کرنے کے پابند تھے:

﴿اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ﴾ (البقرة: ٢٨٥)

''رسول اس پر ایمان لایا جو اس کے رب کی طرف سے اس پر نازل ہوا ہے اور مومنین بھی۔''

اور سورۂ نساء کی مذکورہ بالا آیت کے مطابق اللہ تعالیٰ نے آپ پر دو چیزیں نازل کیں:

اس طرح آپ پر قرآن کے ساتھ حدیث پر بھی ایمان فرض تھا اور آپ کے ساتھ اہل ایمان پر بھی فرض تھا، فرض ہے اور فرض رہے گا۔ یہاں یہ وضاحت تحصیل حاصل ہے کہ ایمان لانے سے مراد ایسا قلبی ازعان ویقین اور ایسا زبانی اقرار واعتراف ہے جس کے ساتھ عمل بھی شامل ہو محض ایمان واقرار کافی نہیں ہے۔

جب قرآن سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ قرآن کی طرح حدیث بھی رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوئی ہے اور یہ بات معلوم ومعروف ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن اور اس کے علاوہ جو چیز بھی آپ پر نازل فرمائی ہے سب ماخذ شریعت ہے اور سب کی پیروی پہلے درجہ میں آپ پر اور دوسرے درجے میں آپ کو نبی ورسول ماننے والوں پر- باعتبار ترتیب- فرض تھی، فرض ہے اور فرض رہے گی:

﴿اِتَّبِعْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَ اَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ٥﴾ (الانعام: ١٠٦)

''تمہارے رب کی طرف سے تمہاری طرف جو چیز وحی کی گئی ہے اس کی پیروی کرو اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور مشرکوں سے کنارہ کش رہو۔''

قرآن کی عدالت کے فیصلے:

غامدی صاحب کا دعویٰ ہے کہ:

۱۔ قرآن سے باہر کی کوئی وحی خفی یا جلی، یہاں تک کہ خدا کا وہ پیغمبر بھی جس پر یہ نازل ہوا ہے اس کے کسی حکم کی

❶ ص ۲۹۷ ج ۱

Marfat.com

تحدید و تخصیص یا اس میں کوئی ترمیم و تغیر نہیں کر سکتا دین میں ہر چیز کے رد و قبول کا فیصلہ اس کی آیات بینات ہی کی روشنی میں ہوگا، ایمان و عقیدہ کی ہر بحث اس سے شروع ہوگی اور اس پر ختم کر دی جائے گی، ہر وحی، ہر الہام، ہر القاء، ہر تحقیق اور ہر رائے کو اس کے تابع قرار دیا جائے گا۔

۲۔ اس کے الفاظ کی دلالت اس کے مفہوم پر بالکل قطعی ہے......اس کا مفہوم وہی ہے جو اس کے الفاظ قبول کر لیتے ہیں وہ نہ اس سے مختلف ہے نہ متبائن۔ ❶

یہ دونوں دعوے کرنے کے بعد انہوں نے فرمایا ہے:

''یہ دونوں باتیں قرآن کے میزان اور فرقان ہونے کا لازمی تقاضا ہیں ان کے بارے میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں۔'' ❷

میں نے اوپر قرآن پاک کے میزان، فرقان اور مہیمن ہونے کا مفہوم خود قرآنی آیات کی روشنی میں واضح کر دیا ہے اور یہ بھی بیان کر دیا ہے کہ ''بینات'' کیا ہیں اور کن امور سے متعلق ہیں اس طرح ان الفاظ سے اپنے دعووں پر ان کا استدلال بے محل ہے۔

رہے ان کے یہ دونوں دعوے تو ان میں سے دعویٰ نمبر (۱) کا ماحصل یہ ہے کہ قرآن سے باہر کی اس کی ہر تشریح، ہر تبیین اور ہر تخصیص مردود ہے قطع نظر اس کے کہ ایسا بذریعہ وحی کیا جائے یا یہ کام رسول اللہ ﷺ کریں یا آپ کے علاوہ کوئی اور اس مسئلہ میں حدیث اور ائمہ فقہ، ائمہ حدیث، ائمہ تصوف اور ائمہ کلام کے اقوال و آراء میں کوئی فرق نہیں ہے۔

اور دوسرا دعویٰ یہ ہے کہ قرآن کے الفاظ اپنے معانی اور مفاہیم میں اس قدر واضح ہیں کہ قرآن سے باہر کی کسی تشریح و تبیین کی ضرورت نہیں۔

حدیث سے متعلق ان کا یہ نقطۂ نظر بالکل واضح ہے، یعنی حدیث ماخذ شریعت نہیں۔ ❸

موصوف نے اپنی اس کتاب میں بعض قرآنی احکام کی توضیح و تفصیل سے متعلق بعض احادیث بطور مثال نقل کی ہیں اور یہ دعویٰ کیا ہے کہ قرآن کا ایک عام طالب علم بھی یہ قرآنی آیات سن کر ان کے سمجھنے میں غلطی نہیں کر سکتا۔ ❹

انہیں باتوں کی وجہ سے میں نے یہ مناسب اور ضروری سمجھا کہ ان کے ان افکار کو قرآن کی عدالت میں پیش کر کے ان کے بارے میں اس کا حکم اور فیصلہ حاصل کیا جائے، کیونکہ اولاً تو نزاع ہونے کی صورت میں ایسا کرنے کا حکم قرآن ہی نے دیا ہے۔ ثانیاً ان کا دعویٰ ہے کہ وہ قرآن کو شرعی ماخذ تسلیم کرتے ہیں۔

قرآن نے نزاعی مسائل میں اللہ اور رسول دونوں سے رجوع کرنے کا حکم دیا ہے، لیکن چونکہ غامدی حدیث کی شرعی اور قانونی حیثیت کو تسلیم نہیں کرتے اس لیے میں صرف وہ فیصلے بیان کروں گا جو قرآن نے جاری کیے ہیں۔

❶ ص ۲۶-۲۷ ❷ ص ۲۷ ❸ ص ۷۷ ❹ ص ۴۵

Marfat.com

۱۔ پہلا فیصلہ:

﴿یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَیْنَ یَدَیِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ٥﴾

(الحجرات: ۱)

''اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ اور رسول سے آگے نہ جاؤ اور اللہ سے ڈرو، درحقیقت اللہ سب کچھ سننے والا، سب کچھ جاننے والا ہے۔''

اس آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے مومنین کو جو حکم دیا ہے اس سے پہلے ان کو، ان کی صفت ایمان سے موصوف کر کے مخاطب بنایا ہے اس طرح آنے والا حکم ان کی اس صفت کی صحت کے لیے ایک کسوٹی اور معیار بن گیا ہے بایں معنیٰ کہ اس حکم کی تعمیل تمہارے ایمان کی صحت کی دلیل اور عدم تعمیل صفتِ ایمان سے تمہارے عاری ہونے کی دلیل ہے۔ دوسرے لفظوں میں اللہ و رسول سے آگے نہ جانا تمہارے مومن ہونے کا لازمی تقاضا ہے۔

چونکہ آیت میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ دونوں سے آگے جانے اور پیش قدمی کرنے سے روکا گیا ہے، لہٰذا اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ و رسول کے حکم اور قول پر کسی بھی انسان کے حکم اور قول کو مقدم نہ کرو اللہ تعالیٰ تو ماورائے حس و عقل ہے اس لیے اس سے آگے نہ جانے کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں کہ کتاب اللہ کے کسی حکم پر کوئی اور حکم مقدم نہ کرو۔ البتہ رسول کریم ﷺ کی حیات پاک میں تو یہ حکم آپ کی زبان مبارک سے جاری ہونے والے احکام و ہدایات یا آپ کے حوالہ سے دوسروں سے ملنے والے احکام و ہدایات کے متعلق تھا، لیکن آپ کی رحلت کے بعد قرآن کی طرح یہ حیثیت حدیث یا سنت کو منتقل ہوگئی ہے۔ یہ آیت سورۂ نساء کی آیت نمبر ۵۹ کے اس فقرہ کی طرح ہے:

﴿فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَی اللّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ﴾ (النساء: ۵۹)

''اور اگر تم کسی چیز میں جھگڑ پڑو تو اسے اللہ و رسول کی طرف پھیر دو۔''

تو جہاں تک متنازع امور کو اللہ کی طرف پھیر دینے اور اس کے پاس لے جانے کا معاملہ ہے، تو یہ کسی بھی زمانے میں کسی کے لیے ممکن نہیں تھا، صوفیا کی بات الگ ہے اور اس کا مطلب یہی تھا کہ اس طرح کے معاملات کا حکم اس کی کتاب میں تلاش کرو، اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نبی ﷺ کی حیات پاک میں اپنے نزاعی امور آپ کی خدمت میں لے جاتے تھے، لیکن آپ کی وفات کے بعد یہ حیثیت حدیث یا سنت کو حاصل ہوگئی ہے۔

۲۔ دوسرا فیصلہ:

سورۂ حجرات کی دوسری آیت ہے:

﴿یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِیِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ٥﴾ (الحجرات: ۲)

Marfat.com

''اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! اپنی آوازیں نبی کی آواز پر بلند نہ کرو اور نہ اس سے آپس میں ایک دوسرے سے بلند آواز میں اپنے بات کرنے کی طرح، بلند آواز میں بات کرو، ایسا نہ ہو کہ تمہارے اعمال برباد ہو جائیں اور تمہیں شعور بھی نہ ہو۔''

اس آیت مبارکہ میں نبی ﷺ کی آواز پر آواز بلند نہ کرنے اور اونچی آواز میں آپ سے بات نہ کرنے کا جو حکم دیا گیا ہے اس کا تعلق عام گفتگو سے بھی ہے اور ایسے اوقات سے بھی ہے جب آپ کوئی حدیث بیان کرتے تھے اور آپ کی وفات کے بعد یہ حکم کلی طور پر حدیث کی سماعت سے متعلق ہے یعنی اگر کوئی مسلمان کسی دوسرے مسلمان سے کوئی حدیث سنے تو خاموش ہو جائے اور پوری توجہ اور شوق سے اسے سنے، جب یہ حکم حدیث سننے کے وقت کے لیے ہے تو پھر اسے بسر و چشم قبول کرنے کا حکم آپ سے آپ معلوم ہو گیا، چنانچہ قاضی ابوبکر بن العربی احکام القرآن میں تحریر فرماتے ہیں:

''نبی ﷺ کی حرمت زندگی اور بعد از موت دونوں حالتوں میں یکساں ہے، آپ کی وفات کے بعد آپ کا منقول کلام اپنی عظمت و بلندی میں آپ کے اپنے الفاظ میں آپ سے سنے جانے والے کلام کی طرح ہے۔ لہٰذا جب آپ کا ارشاد پڑھا جائے تو موقع پر موجود ہر شخص پر فرض ہے کہ وہ اس پر اپنی آواز بلند نہ کرے اور اس سے اعراض نہ برتے جس طرح یہ اس وقت آپ کی مجلس میں لازمی تھا جب آپ اپنے الفاظ میں اپنا ارشاد بیان فرماتے تھے، اللہ تعالیٰ نے مرور زمانہ کے ساتھ کلام نبی کی اس حرمت کی بقاء و دوام کی تاکید فرما دی ہے:

﴿وَ اِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَ اَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ۝﴾ (الاعراف: ۲۰۴)

''جب قرآن پڑھا جائے تو اسے غور سے سنو اور خاموش رہو۔''

اور نبی کا کلام بھی وحی ہے اور اس کو بھی وہی حرمت حاصل ہے جو قرآن کو حاصل ہے۔''❶

۳۔ تیسرا فیصلہ:

سورۂ حشر میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا﴾ (الحشر: ۷)

''اور رسول جو تمہیں دے اسے لے لو اور جس سے روکے رک جاؤ۔''

یہ ان لوگوں کے منہ پر زوردار طمانچہ ہے جو حدیث کی شرعی حیثیت کے منکر ہیں، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں صرف قرآن ہی نہیں دیا ہے، بلکہ حدیث اور سنت بھی دی ہے اور اس آیت مبارکہ کی رو سے دونوں کو لینا، قبول کرنا اور

❶ القسم الرابع ۱۱۱، تفسیر سورۃ الحجرات، المسالۃ الثانیۃ۔

Marfat.com

دستور حیات بنانا یکساں درجے میں فرض ہے۔

بعض لوگوں کا دعویٰ ہے کہ آیت کا تعلق ''فے'' کی تقسیم سے ہے اور آیت کا مدعا یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ''فے'' کے مال میں سے جو جس کو دے دیا اسے وہ بطیب خاطر لے لینا چاہیے۔ بلاشبہ آیت کا تعلق ''فے'' کی تقسیم سے ہے، لیکن آیت میں ایک شرعی قانون بیان کیا گیا ہے اور اس کا حکم فے کی تقسیم اور اسے قبول کرنے تک محدود نہیں ہے، بلکہ عام ہے اور رسول اللہ ﷺ کے ان تمام اوامر ونواہی کو شامل ہے جو آپ سے صادر ہوئے ہیں اور چونکہ دونوں فعل: آتی اور ''نہی'' کی نسبت صریح لفظوں میں رسول اللہ ﷺ کی طرف کی گئی ہے اس لیے یہ حکم سنت یا حدیث پر عمل کے لیے خاص ہے اور اس حکم میں قرآن پر عمل صرف اس اعتبار سے داخل ہے کہ یہ قرآنی حکم ہے، جس طرح رسول کی اطاعت و اتباع کے تمام احکام قرآنی ہیں، اور آپ کو مطاع اور متبوع بنانا قرآنی احکام کی تعمیل ہے۔

اس آیت میں بیان کردہ حکم کے عام ہونے یا شرعی قانون اور قاعدہ ہونے کی سب سے بڑی دلیل اس کا اسلوب بیان ہے، کیونکہ اگر یہ حکم صرف فے کی تقسیم اور اسے قبول کرنے سے متعلق ہوتا تو اللہ تعالیٰ نے آتی کے بالمقابل ''منع، حجب، حظر، حرم وغیرہ استعمال کیا ہوتا، لیکن ''نہی'' آتی کی ضد کے طور پر کبھی استعمال نہیں ہوتا، یہی قرآن کا اعجاز ہے کہ ایک خاص واقعہ کا حکم بھی بیان کر دیا اور صرف ایک فعل کے ذریعہ اس کو ایک شرعی قاعدہ بھی قرار دے دیا۔

۴۔ چوتھا فیصلہ:

﴿فَلَا وَ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْۤ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا﴾ (النساء: ٦٥)

''پس تمہارے رب کی قسم لوگ مومن نہیں ہو سکتے تا آنکہ تم کو اپنے درمیان پھوٹ پڑنے والے جھگڑے میں اپنا حکم بنالیں، پھر جو فیصلہ تم کرو اس سے اپنے دلوں میں کوئی تنگی محسوس نہ کریں اور سر بسر تسلیم کر لیں۔''

ذرا اسلوب بیان پر غور کیجیے، کلام کا آغاز حرف تنبیہ: ''لا'' سے فرمایا اور قسم کے ذریعہ اس کی تاکید فرما دی، اور قسم بھی کس کی؟ رب محمد کی، اس لیے کہ حکم کا تعلق آپ کو تمام تنازعات اور جھگڑوں میں بلاشرکت غیرے حکم اور فیصلہ کنندہ بنانے سے ہے، لہٰذا رب کی اضافت آپ کی طرف کر کے قسم کھائی ہے جس سے آپ کی اطاعت کی تاکید در تاکید ہو گئی ہے۔

اسی سورۂ نساء کی آیت نمبر ۵۹ میں اللہ و رسول کی اطاعت کا حکم دینے کے بعد نزاعی مسائل اور امور کا حکم معلوم کرنے کے لیے ان کو اللہ و رسول کی طرف پھیر دینے اور لوٹا دینے کا حکم دیا گیا ہے اور بطور تحدی اور چیلنج فرمایا گیا ہے:

﴿اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ﴾ (النساء: ٥٩)

''اگر تم اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہو۔''

اس سے یہ مطلب نکلا کہ جو اللہ اور یوم آخر پر ایمان کا تو مدعی ہو، لیکن نزاعی مسائل میں اللہ و رسول - کتاب و

Marfat.com

سنت- سے رجوع نہ کرے وہ اپنے دعوئ ایمان میں جھوٹا ہے۔

اور اس زیر بحث آیت میں ایمان کے جانچنے اور پرکھنے کی تین کسوٹیاں بیان کی گئی ہیں:

۱۔ تمام نزاعی معاملات میں صرف رسول اللہ ﷺ کو حکم اور فیصلہ کنندہ بنانا اور ماننا، یعنی جو آپ کے سوا کسی اور کو حکم بنائے وہ مومن نہیں ہے۔

۲۔ آپ کے فیصلے پر دل میں کوئی تنگی، انقباض اور حرج محسوس نہ کرنا، یعنی جس کے دل میں آپ کے فیصلے پر دلی تنگی، انقباض اور حرج پیدا ہو وہ بھی مومن نہیں ہے۔

۳۔ آپ کے حکم اور فیصلے پر سرِ تسلیم خم کر دینا اور برضا و رغبت اس کو مان لینا یعنی اگر کسی نے سرکشی دکھائی اور آپ کا حکم سن کر سرِ تسلیم خم نہیں کیا تو وہ بھی مومن نہیں۔

۵۔ پانچواں فیصلہ:

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَ الْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَ ذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًاؕ﴾ (الاحزاب: ۲۱)

"درحقیقت تمہارے لیے رسول اللہ کے اندر بہترین نمونہ ہے، اس کے لیے جو اللہ اور یوم آخر کی امید رکھتا ہو۔"

اس آیت مبارکہ کا مطلب ہے کہ رسول اللہ ﷺ ہی عقیدہ، قول، فعل اور ترکِ فعل میں ہمارے لیے نمونۂ عمل ہیں: ہمارا عقیدہ بے کم و کاست وہی ہو جو آپ کا تھا۔ شریعت کی شکل میں جن اقوال اور ارشادات کی نسبت آپ سے صحیح ہو ان میں ہم کوئی کمی بیشی نہ کریں اور سب کو ماخذ شریعت مانتے ہوئے ان پر عمل کریں۔ آپ کی سیرت پاک کی پیروی ہمارا نصب العین ہو اور ہم کسی بھی پیر و مرشد کی سیرت کو یہ درجہ نہ دیں اور ترکِ فعل میں رسول اللہ ﷺ کے بہترین نمونہ ہونے کا تقاضا یہ ہے کہ عبادات کے قبیل کے کسی بھی ایسے فعل کے ہم قریب نہ جائیں جو رسول اللہ ﷺ نے نہیں کیا ہے۔

۶۔ چھٹا فیصلہ:

﴿وَ اَنْزَلْنَاۤ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ۝﴾ (النحل: ٤٤)

"اور ہم نے تمہاری طرف ذکر اس لیے نازل کیا ہے تاکہ تم لوگوں کے لیے اسے بیان کر دو جو ان کی طرف تدریجاً نازل کیا جاتا رہا ہے۔"

یہ آیت بتا رہی ہے کہ قرآن کو نبی ﷺ پر نازل کرنے کا مقصد ہی یہ ہے کہ آپ اسے لوگوں کے عمل کے لیے بیان کرتے جائیں اس میں قرآن کی تفسیر، تشریح، تبیین اور تخصیص سب داخل ہے، جیسا کہ حدیث واحد سے قرآن پر اضافے کے تحت مثالوں سے اس کو واضح کروں گا، تبیین میں "تنسیخ" داخل نہیں ہے۔ غامدی لوگوں کو حدیث سے متنفر

Marfat.com

کرنے کے لیے تحدید تخصیص، ترمیم، تنسیخ اور تغیر کے الفاظ ایک ساتھ استعمال کرتے ہیں۔

یہ آیت مبارکہ یہ بھی بتا رہی ہے کہ قرآن کی وہی تفسیر، توضیح، تفصیل اور تبیین قابل قبول ہے جو رسول اللہ ﷺ نے کی ہے، دوسروں کی تفسیر و توضیح کی صحت وسقم معلوم کرنے کا ذریعہ اور کسوٹی ''تبیین نبوی'' ہے۔

۷۔ ساتواں فیصلہ:

﴿وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ صِرَاطِ اللّٰهِ الَّذِيْ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ﴾ (شوری: ۵۲-۵۳)

''اور یقیناً تم ایک سیدھے راستے کی طرف راہنمائی کرتے ہو اس اللہ کے راستے کی طرف جس کی ملک ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں۔''

اس آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے ہدایت دینے اور راہنمائی کرنے کے فعل کی نسبت رسول اللہ ﷺ کی طرف کی ہے، جو یقیناً اور آپ کے اسلوب میں: ''لا ریب، تلاوتِ قرآن اور تبلیغ قرآن کے علاوہ ہے، خود دعائے ابراہیمی میں بھی تلاوتِ آیات اور تعلیم کتاب وحکمت کو الگ الگ بیان کیا گیا ہے۔ (البقرۃ: ۱۲۹)

معلوم ہوا کہ سورۂ شوریٰ کی اس زیر نظر آیت میں جس ہدایت کو آپ کی طرف منسوب کیا گیا ہے وہ کتاب اللہ کی آیات کی تلاوت کے ساتھ ان کے کافی وشافی بیان اور آپ کے اپنے تشریعی احکام پر بھی مشتمل تھی، یہ اس لیے کہ سورۂ بقرہ کی آیات ۱۲۹، ۱۵۱ سورۂ آل عمران کی آیت ۱۶۴، اور سورۂ جمعہ کی آیت ۲ میں رسول اللہ ﷺ کے جو فرائض منصبی بیان کیے گئے ہیں ان میں تلاوتِ آیات کے بعد الگ سے تعلیم کتاب وحکمت کا ذکر آیا ہے اور قرآن کے مطابق رسول اللہ ﷺ اپنے فرائض رسالت کے ضمن میں جو اعمال بھی انجام دیتے تھے ان سب میں بلا استثنا آپ غیر مشروط مطاع تھے، مطاع ہیں اور قیامت تک مطاع رہیں گے۔

یہ ہیں وہ بعض آیات بینات جو قرآن کی طرح حدیث یا سنت کے ماخذ شریعت ہونے پر صریح اور قطعی دلیل ہیں، اور یہ وہ میزان اور فرقان بھی ہیں جن کی روشنی میں ہم آپ کے اور آپ کے ہمنوا دوسرے ''مجددین امت'' کے افکار و نظریات میں حق اور باطل اور غث اور سمین کے درمیان فرق اور تمیز کر سکتے ہیں۔

غامدی کا رسول:

قارئین! اس عنوان پر آپ کو تعجب نہ ہو، اس سے قبل متکلمین کے عقائد بیان کرتے ہوئے میں نے یہ ذیلی عنوان قائم کیا ہے: متکلمین کے خدا کا کوئی وجود نہیں ہے۔ میں نے ایسا اس وجہ سے کیا ہے کہ متکلمین نے اللہ تعالیٰ کی جو منفی صفات بیان کی ہیں وہ ان کی اپنی گھڑی ہوئی ہیں ان صفات سے موصوف نہ کوئی معبود ہے، نہ ہو سکتا ہے اور نہ معبود ہونے کا مستحق ہے۔

Marfat.com

اس طرح غامدی صاحب نے جس رسول کا تصور پیش کیا ہے ویسا رسول، افضل الرسل تو کیا، کوئی بھی رسول نہیں گزرا ہے؛ غامدی کا رسول وہ ہے جس نے سنت ابراہیمی کی بعض روایات کو، تجدید و اصلاح کے بعد اور اس میں بعض اضافوں کے ساتھ اپنے ماننے والوں میں دین کی حیثیت سے جاری کر دیا۔ ❶

احادیث آحاد-اخبار آحاد- نہ حدیث ہیں اور نہ دین میں ان سے کسی عقیدہ وعمل کا اضافہ ہی ہوتا ہے۔ ❷

قرآن سے حدیث کے تعلق کی نوعیت اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے کہ حدیث قرآن کے مدعا کی شرح و بیان ہے اور بس۔ ❸

وراثت کے مسئلہ میں اسلامی شریعت کا جو یہ حکم ہے کہ نہ مسلمان کافر کا وارث ہوسکتا ہے اور نہ کافر مسلمان کا۔ ❹ تو یہ حکم جزیرۂ نمائے عرب کے مشرکین اور یہود و نصاریٰ کے بارے میں ہے۔ ❺

قرآن و حدیث میں جن زانی مردوں اور زانی عورتوں کو سو کوڑے مارنے اور رجم کر دینے کا حکم دیا گیا ہے وہ ایسے زانی مرد اور عورتیں ہیں جنھوں نے زنا کو اپنا پیشہ بنا لیا ہو۔

دین فطرت، سنت ابراہیمی اور نبیوں کے صحائف کی نئی تشریح وتفہیم۔ ❻

دین خوب و ناخوب سے عبارت ہے جس کا شعور انسانی فطرت میں ودیعت ہے قرآن نے اس کی تعبیر معروف و منکر سے کی ہے۔ ❼

سنت قرآن کے بعد نہیں، بلکہ قرآن سے مقدم ہے، اس لیے وہ لازماً اس کے حاملین کے اجماع و تواتر ہی سے اخذ کی جائے گی؟ ❽

الہامی لٹریچر کے خاص اسالیب، یہود و نصاریٰ کی تاریخ، انبیائے بنی اسرائیل کی سرگزشتوں، اور اس طرح کے دوسرے موضوعات سے متعلق قرآن کے اسالیب و اشارات کو سمجھنے اور اس کے اجمال کی تفصیل کے لیے قدیم صحیفے ہی اصل ماخذ ہوں گے۔ اس باب میں جو روایتیں تفسیر کی کتابوں میں نقل ہوئی ہیں اور زیادہ تر سنی سنائی باتوں پر مبنی ہیں، انہیں ہرگز قابل التفات نہ سمجھا جائے گا۔ ❾

نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور قربانی کا حکم بھی اگرچہ جگہ جگہ قرآن میں آیا ہے، لیکن یہ بات خود قرآن سے واضح ہوتی ہے کہ ان کی ابتدا پیغمبر کی طرف سے دین ابراہیمی کی تجدید کے بعد اس کی تصویب سے ہوئی ہے اس لیے لازماً یہ سنن ہیں؟ ❿

کسی چیز کا حکم اگر اصلاً قرآن پر مبنی ہے اور پیغمبر نے اس کی وضاحت فرمائی ہے یا اس پر "طابق النعل بالنعل" عمل کیا ہے تو پیغمبر کے اس قول و فعل کو ہم سنت نہیں، بلکہ قرآن کی تفہیم و تبیین اور اسوۂ حسنہ سے تعبیر

❶ ص ۱۰ ❷ ص ۱۱ ❸ ص ۴۶ ❹ بخاری ۶۷۶۴، مسلم ۱۶۱۴
❺ ص ۴۶ ❻ ص ۵۴ ❼ ص ۵۸ ❽ ص ۵۸ ❾ ص ۵۸ ❿ ص ۴۷

Marfat.com

کریں گے۔ ❶

نبی ﷺ کی نفل نمازیں، نفل روزے اور وضو وغسل کے طریقے سنت نہیں، بلکہ اسوۂ حسنہ ہیں۔ ❷

نماز میں قعدے کے اذکار، تشہد کے اذکار اور درود وغیرہ سنت نہیں ہیں۔ ❸

ہمارے رسول:

جاوید احمد غامدی نے جس رسول کی تصویر پیش کی ہے وہ وہ رسول نہیں ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے پوری دنیا کے لیے بشیر ونذیر بنا کر بھیجا تھا، میں نے اوپر رسول اللہ ﷺ کے حق میں قرآنی عدالت کے جو فیصلے بیان کیے ہیں ان میں اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے ان رسول کی صحیح تصویر دیکھی جا سکتی ہے میں ان کی ان ہرزہ سرائیوں کا ایک ایک کر کے جواب دے کر اپنا وقت ضائع نہیں کروں گا، البتہ جہاں تک سنت ابراہیم کا تعلق ہے تو اس سے متعلق ان کے مغالطوں کا تعاقب ضروری ہے، اس لیے کہ یہ حد درجہ گمراہ کن ہیں، بقیہ دعاوی کا جواب ''حدیث واحد سے قرآن پر اضافہ'' کی مثالیں بیان کرتے ہوئے ضمناً دیتا جاؤں گا۔ رسول اللہ ﷺ کے منصب رسالت کے گوشوں کو واضح کرتے ہوئے میں نے قصداً صرف قرآنی آیات سے استدلال کیا ہے اور ہر آیت کا مفہوم آسان الفاظ میں بیان کر دیا ہے۔ ایسا میں نے اتمام حجت کے لیے کیا ہے۔

ہمارے نبی اور رسول محمد بن عبداللہ بن عبدالمطلب قریشی ہاشمی ﷺ ہیں آپ سلسلۂ نبوت و رسالت کی آخری کڑی ہیں، اللہ کے تمام رسول ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجے گئے تھے اور اللہ تعالیٰ نے آپ کے ذریعہ رسالت کی تکمیل فرما دی اور انبیاء کی آمد اور بعثت کے سلسلے کو بند کر دیا۔

محمد بن عبداللہ ﷺ ہمارے مطاع کامل اور متبوع کامل ہیں اور آپ کی اطاعت ہمارے اوپر ٹھیک اسی طرح فرض ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کی اطاعت فرض ہے، اور اللہ سے محبت کے دعوے کی صحت آپ کی کامل پیروی پر موقوف ہے۔ یعنی اگر کوئی اللہ تعالیٰ کی محبت کا دعویٰ تو کرتا ہے، مگر رسول اللہ ﷺ کی سنت کی پیروی نہیں کرتا ہے، یا کرتا تو ہے لیکن جزوی طور پر کرتا ہے یا اس کو اپنی من گھڑت قرآنی میزان میں تول کر اس کی پیروی کرتا ہے تو ایسا شخص بھی مومن نہیں ہے، اس لیے کہ اولاً تو اس کے اس دعوے کی کوئی دلیل قرآن میں نہیں ہے۔ ثانیاً اس کی یہ مشروط اتباع حکم قرآنی کے خلاف ہے۔

ہمارے نبی اور رسول اللہ ﷺ خود قرآن کی رو سے اللہ کی کتاب کے شارح، مستقل معلم و مربی، مستقل شارع اور مطلق نمونۂ تقلید ہیں اور ان تمام حیثیتوں میں مطاع مطلق ہیں اور ان میں سے آپ کی کسی بھی حیثیت کا انکار، یا اس کے بارے میں کوئی ادنیٰ سا شک بھی ایمان کی صحت کے منافی ہے۔

---

❶ ص ۴۷ ❷ ص ۴۷-۷۵ ❸ ص ۷۶

Marfat.com

قرآن اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب ہے، یہ نبی عربی امی محمد بن عبداللہ ﷺ پر نازل ہوا ہے اور لفظاً اور معناً اللہ تعالیٰ کا کلام ہے جس کے مانند کلام پیش کرنا جن وانس کی قدرت سے باہر ہے، اپنے نزول کے وقت سے لے کر آج تک ہر آمیزش اور ہر کمی بیشی سے پاک ہے اور تا قیامت پاک رہے گا۔ یہ اسلامی عقائد، عبادات، آداب معاشرت اور اللہ کی مرضی کے مطابق زندگی گزارنے سے متعلق جملہ امور کا اصل الاصول ہے۔

اسلامی شریعت کا دوسرا بنیادی ماخذ حدیث یا سنت ہے یہ تعداد کے اعتبار سے دوسرا ماخذ ہے۔ ترتیب اور درجہ کے اعتبار سے نہیں یعنی اسلامی شریعت کے جن امور میں قرآن ماخذ ہے ان میں حدیث بھی قرآن کے بالکل مساوی ماخذ ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کی اطاعت کو اپنی اطاعت کے بالکل مساوی فرض قرار دیا ہے اور اللہ کی اطاعت اس کی کتاب کے احکام کی تعمیل کا نام ہے لہٰذا رسول کی اطاعت حدیث یا سنت کے احکام کی تعمیل قرار پائی۔

قرآن پر غور وتدبر کر کے اس سے احکام کا استنباط کرنے والا صرف ایک چیز کا محتاج ہے یعنی قرآن کے جس لفظ یا عبارت سے وہ کسی مسئلہ کا استنباط کر رہا ہے وہ اس پر بصراحت دلالت کر رہا ہے، یا کر رہی ہے کہ نہیں، جبکہ حدیث یا سنت سے مسائل اور احکام کا استنباط کرنے والا دو چیزیں جاننے کا محتاج ہے:

۱۔ نبی ﷺ سے اس کی نسبت صحیح ہے۔

۲۔ وہ اپنے حکم پر بصراحت دلالت کرتی ہے۔

جس حدیث یا سنت کو ہم صحیح کہتے ہیں تو اس سے ہماری مراد یہ ہوتی ہے کہ نبی کریم ﷺ سے اس کی نسبت صحیح ہے اور اس صحت کو معلوم کرنے کے طریقے اور اصول صرف وہی ہیں جو اس فن کے ائمہ نے وضع کیے ہیں اور یہ بات ہم پورے یقین واذعان سے کہتے ہیں کہ حدیث کی تصحیح وتضعیف اور اس کی معرفت کے جو اصول ائمہ حدیث نے بنائے ہیں اور پھر ان کو برت کر دکھایا ہے اس کی نظیر دنیا کے کسی علم وفن کے اصولوں اور ان پر عمل کرنے میں نہیں ملتی۔ بلکہ تواریخ عالم اور عظمائے عالم کے کسی بھی واقعہ یا خبر کی حفاظت، ملاوٹ اور آمیزش سے اس کو پاک رکھنے اور اس کی امانت دارانہ نقل وروایت سے متعلق اس اہتمام کا عشر عشیر اہتمام بھی نہیں کیا گیا ہے جو اہتمام محدثین نے اپنے محبوب نبی ورسول اور اپنے امام ...... محمد بن عبداللہ ﷺ کی سیرت پاک، آپ کی تشریعات، آپ کے اقوال و افعال اور تقریروں کی حفاظت، ان کو ملاوٹ اور آمیزش سے پاک رکھنے اور ان کی امانت دارانہ نقل وروایت سے متعلق کیا ہے۔

مذکورہ طریقوں اور اصولوں سے جن حدیثوں یا سنن کی نسبت رسول اللہ ﷺ سے صحیح وثابت ہے وہ ہدایت اور معرفت حق میں قرآن ہی کے درجے پر ہیں، بلکہ ان کا دائرہ کار قرآن سے زیادہ وسیع ہے، جس کی وجہ یہ ہے کہ حدیث، قرآن کی شرح وبیان، اس کے مجمل کی تفصیل اور اس کے مبہم کی توضیح ہونے کے علاوہ مستقل بالذات تشریع بھی ہے اور اس میں ایک مسلم فرد کی زندگی سے متعلقہ ہر چھوٹی بڑی چیز، جماعت کے امور، اس جماعت کے تمام افراد کے باہمی

Marfat.com

روابط اور تعلقات کے بارے میں مکمل راہنمائی بھی موجود ہے۔

جن لوگوں کا یہ دعویٰ ہے کہ عقائد اور ایمانیات کا قرآن میں ہونا ضروری ہے، اور کوئی بھی عقیدہ یا ایمانیات کا کوئی مسئلہ تنہا حدیث سے ثابت نہیں ہوتا، اس طرح جن کا یہ دعویٰ ہے کہ خبر واحد کسی عقیدہ کا ماخذ نہیں ہوسکتی وہ اپنے ان دعووں کی ایک دلیل بھی قرآن سے نہیں پیش کر سکتے اور قرآن نے کہیں اشارۃً بھی اپنے اور حدیث کے درمیان یہ درجہ بندی نہیں کی ہے اور نہ کہیں حدیث کے ماخذ شریعت ہونے کے لیے اس کے متواتر ہونے کی شرط ہی عائد کی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی آخری شریعت اپنے آخری رسول محمد بن عبداللہ ﷺ پر نازل فرمائی ہے یہ کامل ترین شریعت ہے جو آپ سے پہلے آنے والے کسی بھی رسول کو نہیں دی گئی تھی اس لیے کہ یہ آخری اور دائمی شریعت ہے، وقتی اور عارضی نہیں ہے، یہ قیامت تک پیدا ہونے والے مسائل کا اپنے اندر حل رکھتی ہے۔

سنت کا ایک اطلاق تو اسی اسلامی شریعت پر ہوتا ہے جو قرآن و حدیث دونوں کی تعلیمات پر مبنی ہے اور اس کا دوسرا اطلاق رسول اللہ ﷺ کے قول، فعل اور تقریر پر ہوتا ہے۔

سنت ابراہیمی کی روایت:

قرآن اور حدیث کی شکل میں اسلامی شریعت رسول اللہ ﷺ کی گھڑی ہوئی نہیں، بلکہ منزل من اللہ ہے اور یہ ابراہیم علیہ السلام کی سنت کی اصلاح شدہ اور ترمیم شدہ ایڈیشن نہیں ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ اور نازل کردہ ہے:

﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَ دِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَ لَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ۝﴾ (التوبة: ۳۳)

''وہی ہے جس نے اپنا رسول ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا تا کہ اسے ہر دین پر غالب کر دے اگرچہ مشرکوں کو ناگوار ہو۔''

اس آیت مبارکہ میں ''ہدایت عام'' ہے جس سے علم اور راہنمائی دونوں مراد ہے اسی معنیٰ میں قرآن کو ہدایت -ہدی- کہا گیا ہے؛ کیونکہ یہ علم و معرفت اور عقیدہ و نظریہ ہر ایک کو درست کرتا ہے اور پھر صحیح راستے کا پتا دیتا ہے۔

اور ''دین حق'' سے مراد توحید اور اس پر مبنی ضابطۂ حیات ہے، آیت مبارکہ یہ صراحت کر رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی نے اپنے رسول کو یہ دونوں چیزیں دے کر زمین میں بھیجا ہے۔ اس نے یہ دونوں چیزیں اپنے پہلے آنے والے کسی نبی یا رسول سے لے کر اور ان میں ترمیم و اضافہ کر کے یا اصلاح و تجدید کر کے لوگوں کے سامنے پیش نہیں کر دیا ہے، بلکہ یہ بذریعۂ وحی اس کو عطاء کی گئی ہیں۔

اولاً تو سنت ابراہیمی رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے وقت موجود ہی نہیں تھی؛ توحید کا تصور تک ذہنوں میں نہیں تھا، اور ختنہ، قربانی اور حج کی شکل میں جن روایات پر عمل ہو رہا تھا وہ ختنہ کے سوا سب شرک آمیز ہو چکی تھیں۔

Marfat.com

ثانیاً رسول اللہ ﷺ امی تھے اور علم کتاب اور ایمان اور اس کی حقیقت اور متعلقات سے ناواقف تھے۔

﴿وَ كَذٰلِكَ اَوْحَيْنَا اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ﴾ (شوری: ۵۲)

''اور اسی طرح ہم نے تیری طرف اپنے حکم سے ایک روح وحی کی ہے، تم نہیں جانتے تھے کہ کتاب کیا ہے، اور نہ یہ جانتے تھے کہ ایمان کیا ہے؟ لیکن ہم نے اسے ایک روشنی بنا دیا جس سے ہم اپنے بندوں میں سے جسے چاہتے ہیں ہدایت دیتے ہیں اور تم یقیناً سیدھے راستے کی طرف راہنمائی کرتے ہو۔''

مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ جس سیدھے راستے کی لوگوں کو دعوت دیتے تھے، نہ آپ کا بنایا ہوا اور متعین کردہ تھا اور نہ سنت ابراہیمی کا اصلاح شدہ ایڈیشن تھا، بلکہ اللہ تعالیٰ نے آپ پر اپنی نازل کردہ کتاب، قرآن میں اس راستے کا تعین کیا تھا اور اس کے نشانات اور تقاضے بیان فرمائے تھے۔

یہ درست ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جتنے نبی اور رسول بھی بھیجے ہیں سب کی دعوت ''توحید'' ہی پر مرکوز تھی اور عقیدۂ توحید میں ان کے درمیان ذرہ برابر بھی فرق نہیں تھا، مگر ہر نبی اور رسول اپنی دعوت کا مکلّف وحی الٰہی کے ذریعہ بنایا گیا تھا کوئی بھی اپنے سے سابق نبی یا رسول کی سنت یا طریقے کو لے کر اور اس میں کانٹ چھانٹ کر کے دین کی حیثیت سے اس کو پیش نہیں کرتا تھا:

﴿اِنَّآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ كَمَآ اَوْحَيْنَآ اِلٰى نُوْحٍ وَّ النَّبِيّٖنَ مِنْ بَعْدِهٖ وَ اَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ وَ الْاَسْبَاطِ وَعِيْسٰى وَ اَيُّوْبَ وَ يُوْنُسَ وَ هٰرُوْنَ وَ سُلَيْمٰنَ وَ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا﴾ (النساء: ۱۶۳)

''درحقیقت ہم نے تمہاری طرف وحی کی ہے، جس طرح ہم نے نوح اور اس کے بعد کے نبیوں کی طرف وحی کی تھی اور ہم نے ابراہیم، اور اسماعیل، اور اسحاق اور یعقوب اور اس کی اولاد، اور عیسیٰ اور ایوب اور یونس، اور ہارون اور سلیمان کی طرف وحی کی اور ہم نے داود کو زبور دی۔''

جاوید احمد غامدی نے اپنی من گھڑت اور خود ساختہ سنت کا تعارف کراتے ہوئے تحریر فرمایا ہے:

''سنت سے ہماری مراد دین ابراہیمی کی وہ روایت ہے جس کو نبی ﷺ نے اس کی تجدید و اصلاح کے بعد اور اس میں بعض اضافوں کے ساتھ اپنے ماننے والوں میں دین کی حیثیت سے جاری فرمایا ہے۔ قرآن میں اس کا حکم آپ کے لیے اس طرح بیان ہوا ہے:

﴿ثُمَّ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا وَ مَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ﴾ (النحل: ۱۲۳)

''پھر ہم نے تمہیں وحی کی کہ ملتِ ابراہیم کی پیروی کرو جو بالکل یک سو تھا اور مشرکوں میں سے نہ تھا۔''

Marfat.com

ملت اور دین:

غامدی خود بھی تفسیر کے ''امام'' ہیں اور ایک امام تفسیر کے شاگرد اور پیرو بھی ہیں انہوں نے سورۂ نحل کی مذکورہ بالا آیت سے اپنے گمراہ کن اور من گھڑت دعوے پر جو استدلال کیا ہے وہ ان کی قرآن فہمی کا مذاق اڑا رہا ہے، خاص طور پر جو شخص فہم قرآن کے لیے ''نظم کلام'' کی روایت کو بنیادی درجہ دیتا ہو اس کے قلم سے ایسا غلط استدلال مزید تعجب اور حیرت کا باعث ہے۔

قرآن پاک میں ''ملت'' کا استعمال صرف اضافت کے ساتھ ہوا ہے اور ابراہیم علیہ السلام کے علاوہ اس لفظ کا ''مضاف الیہ'' ہر جگہ کوئی جماعت یا قوم ہے جو بلا استثناء مشرک جماعت یا قوم ہے، اس طرح اس لفظ کے معنی عقیدۂ شرک کے ہو گئے ہیں اور اسی مفہوم میں اس کا استعمال ہوا ہے، چنانچہ یہود و نصاریٰ، مشرکین اور جن قوموں میں انبیاء و رسول بھیجے گئے ان سب کے طریقوں کو ''ملت'' کہا گیا ہے۔ مگر اسی کے ساتھ ابراہیم علیہ السلام کے طریقے کو بھی ''ملت'' فرمایا گیا ہے، البتہ سورۂ بقرہ کی آیت نمبر ۱۳۰ کے علاوہ جتنی آیتوں میں ''ملت ابراہیم'' کا ذکر آیا ہے اس میں ان کی صفت ''حنیف'' بھی بیان کی گئی ہے اس طرح ان کی ملت یقینی اور متعینہ طور پر ''ملت توحید'' کے معنی میں ہے مطلق ''ملت'' نہیں ہے۔'' (البقرہ ۱۳۵، آل عمران ۶۷، ۹۵، نساء ۱۲۵، انعام ۷۹، نحل ۱۲۳)

حنیف کی لغوی تحقیق:

ابراہیم علیہ السلام کی صفتِ حنیف: حَنَفَ يَحْنِفُ حَنْفًا سے بنی ہے جو صفت مشبہ ہے۔ "صفت مشبہ" ایسی صفت کو کہتے ہیں جو "اسم فاعل" کے برعکس اپنے موصوف سے کبھی جدا نہیں ہوتی، بلکہ وہ بہ صورت دوام اس سے موصوف رہتا ہے اور حَنَفَ يَحْنِفُ حَنْفًا کے معنی ہیں: اعراض کرنا، کنارہ کش ہونا، الگ ہونا اور کٹ کر رہنا وغیرہ، اور قرآن پاک میں ابراہیم علیہ السلام کو عقیدہ توحید پر ان کے غیر معمولی اور بے مثال ثبات اور استقامت کی تاکید کے طور پر حنیف کہا گیا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ وہ مشرکوں یا شرک کرنے والوں میں سے نہ تھے۔ قرآن کے مطابق تمام انبیاء اور رسول، جن کے سرفہرست ہمارے نبی اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں موحد خالص تھے اور شرک سے کلی طور پر پاک تھے۔ پھر ابراہیم علیہ السلام کے موحد ہونے اور شرک سے پاک ہونے کی اتنی تاکید کیوں کی گئی ہے اور بار بار یہ کیوں فرمایا گیا ہے کہ وہ مشرکوں میں سے نہ تھے؟

اس سوال کا جواب خود قرآن پاک میں موجود ہے، جس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

۱۔ ابراہیم علیہ السلام بنو اسماعیل اور بنو اسحاق کے جد امجد ہیں اور یہود و نصاریٰ اور مشرکین سب انہی سے رشتہ جوڑتے ہیں، قرآن ان سب سے یہ کہتا ہے کہ ابراہیم سے تمہاری نسبت کا یہ دعویٰ صحیح نہیں ہے، کیونکہ اگر تم صحیح معنوں میں ان کی اولاد ہوتے اور ان سے اپنے اس دعویٰ نسب میں سچے ہوتے تو ان کی طرح تم بھی موحد ہوتے، اب جبکہ تم

Marfat.com

نے توحید کے بجائے شرک کی روش اختیار کر رکھی ہے تو پھر تم ابراہیمی کیسے ہوئے، وہ نہ تو یہودی تھے، نہ نصرانی اور نہ مشرک، بلکہ مسلم خالص تھے۔

﴿مَا كَانَ إِبْرٰهِيمُ يَهُودِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا وَّلٰكِن كَانَ حَنِيفًا مُّسْلِمًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ۝﴾ (آل عمران: ٦٧)

''ابراہیم نہ یہودی تھا اور نہ نصرانی، بلکہ یکسو مسلمان تھا اور مشرکوں میں سے نہ تھا۔''

۲۔ ابراہیم علیہ السلام سے رشتہ و قرابت صرف ان کو حاصل ہے جو اس کے طریقے کے پیرو ہیں اور اس صفت سے موصوف ان کی زندگی میں اور ان کی وفات کے بعد ان پر ایمان لانے والے اور ان کی پیروی کرنے والے تھے اور یہ آخری نبی اور ان پر ایمان لانے والے، ان تین گروہوں کے علاوہ تمام مذاہب والے ان سے کوئی رشتہ و قرابت نہیں رکھتے:

﴿إِنَّ أَوْلَى النَّاسِ بِإِبْرٰهِيمَ لَلَّذِينَ اتَّبَعُوهُ وَهٰذَا النَّبِيُّ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِينَ۝﴾ (آل عمران: ٦٨)

''درحقیقت لوگوں میں سب سے زیادہ ابراہیم سے قریب وہ ہیں، جنہوں نے اس کی پیروی کی اور یہ نبی اور وہ جو ایمان لائے اور اللہ مومنوں کا دوست ہے۔''

۳۔ ابراہیم علیہ السلام سے رشتہ و قرابت کے دعوے دار یہود و نصاریٰ اور مشرکین کا یہ فرض تھا کہ وہ نبی عربی امی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت توحید پر سب سے پہلے لبیک کہتے، مشرکین کو یہ معلوم تھا کہ محمد بن عبداللہ صلی اللہ علیہ وسلم بنو اسماعیل بن ابراہیم علیہما السلام کے افضل ترین اور اشرف ترین خانوادوں سے تعلق رکھتے ہیں:

((إن الله عز و جل اصطفى كنانة من ولد اسماعيل عليه الصلاة والسلام واصطفى قريشا من كنانة واصطفى من قريش بنى هاشم و اصطفانى من بنى هاشم .))

''درحقیقت اللہ عز و جل نے کنانہ کو اولاد اسماعیل علیہ السلام سے منتخب فرمایا، کنانہ سے قریش کو چنا، قریش سے بنو ہاشم کا انتخاب فرمایا اور بنو ہاشم سے مجھے اختیار فرمایا۔'' [1]

مشرکین کو یہ اعتراف تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سب سے زیادہ سچے اور امانت دار ہیں، انہوں نے آپ کا لقب ''صادق و امین'' قرار دے رکھا تھا، مگر جب آپ نے اپنی دعوت توحید پیش کی تو انہوں نے اس کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اس طرح اپنے جد امجد ابراہیم علیہ السلام سے اپنا رشتہ و ناتا توڑ لیا۔

[1] مسلم: ۴: ۲۲۷۶، عن واثلۃ بن اسقع رضی اللہ عنہ

Marfat.com

یہود و نصاریٰ کو اپنی کتابوں، تورات اور انجیل سے یہ معلوم تھا کہ سب سے آخری اور سب سے افضل نبی اور رسول محمد بن عبداللہ ﷺ ہی ہیں اور وہ آپ کی بعثت کا نہایت بے صبری سے انتظار بھی کر رہے تھے:

﴿وَ لَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ وَ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ۝﴾ (البقرۃ: ۸۹)

''اور جب ان کے پاس اللہ کے ہاں سے وہ کتاب آئی جو ان کے پاس موجود- کتاب- کی تصدیق کرنے والی ہے، جبکہ وہ اس سے قبل ان لوگوں پر فتح طلب کیا کرتے تھے جنہوں نے کفر کیا ہے، پھر جب ان کے پاس وہ چیز آ گئی جس کو انہوں نے پہچان لیا تو انہوں نے اس کا انکار کر دیا، پس اللہ کی لعنت ہے کافروں پر۔''

اس طرح یہود و نصاریٰ نے بھی رسول عربی امی ﷺ کی دعوت توحید کو ماننے سے انکار کر کے ابراہیم علیہ السلام سے اپنا رشتہ و ناتا توڑ لیا۔

مذکورہ بالا قرآنی حقائق کی روشنی میں رسول اللہ ﷺ کو ''ملت ابراہیم'' کی پیروی کرنے کے حکم کا مطلب جہاں ''ملت توحید'' کی پیروی کا حکم ہے وہیں یہ حکم اس امر پر بھی دلالت کرتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کی ملت توحید کے پیرو صرف رسول اللہ ﷺ اور مومنین ہیں، یہود و نصاریٰ اور مشرکین نہیں ہیں، قرآنی اسلوب کے مطابق نبی ﷺ کو کسی کام کا حکم دینے کا مطلب جہاں یہ ہوتا ہے کہ یہ کام بڑی اہمیت کا حامل اور بنیاد دین ہے وہیں آپ کے ذریعہ آپ پر ایمان لانے والوں پر بھی آپ کی پیروی فرض ہے، بلکہ یہی آخری چیز سرفہرست ہوتی ہے، کیونکہ رسول تو حکم الٰہی کی عملی تصویر ہوتا ہے، اس چیز کو اس حکم الٰہی کی روشنی میں سمجھئے:

﴿يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اتَّقِ اللّٰهَ وَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا۝ وَّاتَّبِعْ مَا يُوْحٰٓى اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا۝﴾ (الاحزاب: ۱-۲)

''اے نبی! اللہ سے ڈرو اور کافروں اور منافقوں کی باتیں مت مانو درحقیقت اللہ سب کچھ جاننے والا بڑی حکمت والا ہے اور تمہارے رب کی جانب سے تمہاری طرف جس چیز کی وحی کی جاتی ہے اس کی پیروی کرو درحقیقت اللہ اس سے پوری طرح باخبر ہے جو تم لوگ کرتے ہو۔''

آیت میں ''تعملون'' سے میری گزشتہ باتوں کی تائید ہوتی ہے، فتدبروا فھم!!

اگر......

اگر سورۂ نحل کی آیت کا مطلب وہی ہوتا جو غامدی صاحب نے لیا ہے اور ''ملت ابراہیم'' سے سنت ابراہیمی مراد ہوتی جس کو، تجدید و اصلاح کے بعد اور اس میں بعض اضافوں کے ساتھ نبی ﷺ نے اپنے ماننے والوں میں دین کی حیثیت سے جاری فرمایا۔ تو دعاء ابراہیمی: رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمْ

Marfat.com

الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ..... کے بجائے۔

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا يجدد سنتي اے ہمارے رب! تو ان میں ایک رسول مبعوث فرما جو میری سنت کی تجدید کرے'' ہوتی!!!

اور اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان پر اپنا فضل بیان کرتے ہوئے یہ نہ فرمایا ہوتا کہ:

﴿لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْ أَنفُسِهِمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ .....﴾

بلکہ یہ فرمایا ہوتا:

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْ أَنفُسِهِمْ ، يجدد سنة ابراهيم .... درحقیقت اللہ نے مؤمنین پر اس وقت بڑا فضل کیا جب اس نے ان میں، انہی میں سے ایک ایسا رسول بھیجا جو ابراہیم کی سنت کی تجدید کرتا ہے۔!!!

امر واقعہ یہ ہے کہ ''عقیدہ توحید'' میں اللہ کے تمام نبیوں اور رسولوں کے درمیان کلی اتفاق و اتحاد تھا اور مخصوص طریقے پر نبی ﷺ کو ''ملت ابراہیم'' کی پیروی کا حکم اس لیے دیا گیا ہے کہ یہود و نصاریٰ اور مشرکین سبھی ان کو اپنی ملت کی اصل مانتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے یہ فرما کر کہ ابراہیم تو ''موحد خالص'' تھا اور ''مشرکوں میں سے نہ تھا'' پھر نبی ﷺ کو یہ حکم دے کر کہ ''ملت ابراہیم'' کی پیروی کرو جو توحید کے لیے یک سو تھا اور مشرکوں میں سے نہ تھا۔ ان کے زعم باطل کو کھول دیا ہے، ورنہ عقیدۂ توحید تو سارے نبیوں اور رسولوں کا ایک ہی تھا، البتہ سب کی شریعتیں ایک دوسری سے مختلف تھیں۔

چنانچہ سورۂ مائدہ میں اللہ تعالیٰ نے یہود و نصاریٰ اور منافقین مدینہ کی حق دشمنیوں، اور معاندانہ سرگرمیوں کا بڑی تفصیل سے ذکر فرمایا ہے آغاز میں رسول اللہ ﷺ کو یہ حکم دیتے ہوئے فرمایا کہ کفر کے میدان میں ایک دوسرے سے بازی لے جانے کے لیے جو لوگ سرگرم کار ہیں ان کی دوڑ دھوپ سے آپ رنجیدہ خاطر نہ ہوں، پھر ان کے ناپاک کرتوتوں کی ایک فہرست پیش کرنے کے بعد تورات و انجیل کے بعض شرعی احکام اور قوانین وحدود بیان فرمائے ہیں، اور آخر میں یہ فرمایا ہے کہ یہ کتاب ہم نے حق کے ساتھ اتاری ہے جو پہلی کتابوں کی تصدیق کرتی ہے اور ان کی نگراں بھی ہے اور نبی ﷺ کو حق کے ساتھ فیصلہ کرنے اور ان اہل کتاب کی خواہشات کے پیچھے نہ چلنے کا حکم دیا ہے اور آخر میں یہ اصولی حکم بیان فرمایا ہے کہ سابقہ تمام امتوں میں سے ہر ایک کے شرعی راستے اور طریقے مختلف بنائے گئے تھے۔ ایسا ان کی آزمائش کے لیے کیا گیا تھا ورنہ اللہ چاہتا تو سب کو ایک ہی امت بنا دیتا۔ (۴۱-۴۸)

ارشاد ربانی ہے:

﴿لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا وَلَوْ شَاءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ أُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِن لِّيَبْلُوَكُمْ

Marfat.com

فِیْ مَآ اٰتٰکُمْ....﴾ (المائدۃ: ٤٨)

''ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لیے ایک شریعت اور ایک راستہ مقرر کیا ہے اور اگر اللہ چاہتا تو تمہیں ایک ہی امت بنا دیتا، لیکن وہ تمہیں اس چیز میں آزمانا چاہتا ہے جو اس نے تمہیں دے رکھی ہے۔''

میں نے اتنی تفصیل سے توحید اور شرعی احکام یا اصول یا فروع کو اس لیے بیان کیا ہے تاکہ غامدی صاحب کے مغالطوں کا پردہ چاک کر سکوں۔ یہاں انہوں نے نبی ﷺ کی سنت کو سنت ابراہیمی کا اصلاح شدہ نسخہ قرار دیا ہے آگے انہوں نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ ''سنت قرآن کے بعد نہیں، بلکہ قرآن پر مقدم ہے جو اس کے حاملین کے اجماع و تواتر ہی سے اخذ کی جائے گی، قرآن میں اس کے جن احکام کا ذکر ہوا ہے ان کی تفصیلات بھی اسی اجماع و تواتر پر مبنی روایت سے متعین ہوں گی۔'' ❶

موصوف کی اس ہرزہ سرائی پر تبصرہ میں بعد میں کروں گا سلسلہ بیان کے اندر رہتے ہوئے دین کا مفہوم مختصراً واضح کر دینا چاہتا ہوں۔

دین کیا ہے؟

دین کا لفظ ملت کے مقابلے میں زیادہ وسیع المعنی ہے اور قرآن پاک میں اتنی کثرت سے استعمال ہوا کہ اس کے تمام معانی کے ساتھ اس کو سمیٹنا ناممکن نہ سہی مشکل اور دشوار ضرور ہے میں نے اوپر بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مشرکین اور اہل کتاب کی عبادت یا طریقۂ عبادت کو دین کا نام نہیں دیا ہے، بلکہ ''ملت'' فرمایا ہے، اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ مشرکانہ عبادت دین نہیں ملت ہے، مگر اسی کے ساتھ ابراہیم علیہ السلام کی طرف اضافت کے ساتھ ان کے طریقے کو بھی ملت کہا ہے جو مشرکانہ طریقہ نہیں ہو سکتا۔ گزشتہ سطور میں اس کی توضیح اور توجیہ دونوں کی جا چکی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کے طریقے کو ''ملت'' یہود و نصاریٰ اور مشرکین کے طریقۂ عبادت کے مقابلے میں کہا گیا ہے اور ان کی خاص صفتِ ''حنیف'' فرما کر ان کی ملت کو خالص ''ملت توحید'' قرار دے دیا گیا ہے اور ان کے طریق عبادت کے لیے دین کی تعبیر اختیار کرنے کے بجائے ''ملت'' کی تعبیر اس لیے اختیار کی گئی ہے کہ یہود و نصاریٰ اور مشرکین ان کو اپنا جد امجد اور پیشوا مانتے ہیں، جبکہ طریقہ اور روش مشرکانہ اختیار کر رکھی ہے، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے ان کے طریقے کو ملت کہنے کے ساتھ ان کو حنیف فرما کر اور مشرکین سے ان کے نہ ہونے کی تاکید فرما کر ان کی ملت کو مشرکین اور اہل کتاب کی ملت کے برعکس خالص ملت توحید قرار دے دیا ہے، کیونکہ حنیف اس کو کہتے ہیں جو تمام باطل اور مشرکانہ عقائد سے کٹ کر اور ان سے کنارہ کش ہو کر صرف توحید کے لیے یکسو ہو جائے دین کے لفظ میں جو جامعیت ہے اس کے پیش نظر ان کی طرف

❶ ص ۵۸

Marfat.com

اضافت کے ساتھ ملت کے بجائے دین کے لفظ کا استعمال مناسب اور برمحل نہیں تھا۔

قرآن پاک میں ایک جگہ ''ملت ابراہیم'' سے پہلے ''دینا قیما'' کی تعبیر اختیار فرمائی گئی ہے اور بعد میں ان کی صفت حنیف کی، ارشاد الٰہی ہے:

﴿قُلْ اِنَّنِیْ هَدٰىنِیْ رَبِّیْۤ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ دِیْنًا قِیَمًا مِّلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا وَ مَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ۝﴾ (الانعام: ١٦١)

''کہہ دو درحقیقت میرے رب نے مجھے ایک سیدھے راستے کی ہدایت دی ہے کجی سے پاک دین کی ملت ابراہیم کی جو یکسو تھا اور مشرکوں میں سے نہ تھا۔''

سورۂ انعام مکی ہے اور ملت ابراہیم سے پہلے اور بعد میں اس کے سیدھی ہونے اور کجی سے پاک ہونے اور ابراہیم علیہ السلام کے مشرکوں میں سے نہ ہونے کی یہ ساری تاکیدات اسی لیے تو ہیں کہ اہل کتاب اور مشرکوں کو بتا دیا جائے کہ اس ملت یعنی توحید سے تمہارا کوئی تعلق نہیں رہا ہے۔ اس توحید پر تو نبی عربی امی اور ان کے سچے پیرو قائم ہیں۔

نزول قرآن سے پہلے لفظ دین عربوں میں مستعمل تو تھا، مگر ان کے تصور دین کی طرح نہایت محدود معنوں میں مستعمل تھا اس کے معنی میں غیر معمولی وسعت قرآن نے دی ہے اور یہ بھی مدنی سورتوں میں، کیونکہ شرائع اسلام کا تفصیلی بیان انہیں سورتوں میں ہوا ہے رہیں مکی سورتیں تو ان میں مختلف طریقوں سے توحید کو بیان کیا گیا ہے اور شرک کی مذمت کی گئی ہے۔

عربی ادبیات میں دین کا لفظ استعمال کیا جاتا تھا اور قرآن عربی زبان میں نازل ہوا ہے:

﴿وَ هٰذَا لِسَانٌ عَرَبِیٌّ مُّبِیْنٌ۝﴾ (النحل: ١٠٣)

''اور یہ واضح عربی زبان ہے۔''

نضر بن شمیل ایک لغوی اور عالم حدیث گزرا ہے اس نے عربی لغت اور ادب کے امام خلیل بن احمد کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا اور عرب بادیہ نشینوں میں رہ کر نامانوس عربی الفاظ سیکھے اس کا بیان ہے کہ اس نے ایک اعرابی سے کسی چیز کے بارے میں پوچھا تو اس نے کہا: "لو لقیتنی علی دین غیر هذه لأخبرتك" اگر تم مجھ سے اس حالت کے علاوہ کسی اور حالت میں ملے تو میں تمہیں اس کی خبر دوں گا۔ ❶

لگتا ہے کہ یہ دین کا بہت قدیم استعمال تھا، جب قرآن نازل ہوا تو اس نے اس کے استعمال کو غیر معمولی وسعت بخش دی وہ دین کو مفرد معنوں میں بھی استعمال کرتا ہے اور مرکب معنوں میں بھی قرآن کی مکی سورتوں میں توحید کو مختلف طریقوں سے بیان کیا گیا اللہ تعالیٰ کی الوہیت اور ربوبیت کو دلائل، مثالوں اور آفاق و انفس کے شواہد سے واضح کیا گیا ہے اور اس کے بالمقابل شرک کی مذمت کی گئی ہے اس کو فطرت انسانی کے منافی قرار دیا گیا ہے اور خودساختہ معبودان

❶ بحوالۂ اباطیل واسمار ص ۳۱۴۔

Marfat.com

باطل کی درماندگیوں کو گنایا گیا ہے اور انہی اغراض اور معانی کے اظہار کے لیے ''دین'' کے لفظ کو استعمال کیا گیا ہے۔

قرآن میں دین کتنے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے ان سب کا بیان دشوار ہے، البتہ ان میں سے نمایاں استعمالات کا ذکر ممکن بھی ہے اور مفید بھی۔

۱۔ قرآن میں اعمال کے حساب و کتاب اور ان کی جزا اور سزا کے معنیٰ میں دین کا بکثرت استعمال ہوا ہے اور یوم آخر کو اسی معنیٰ میں ''یوم الدین'' فرمایا گیا ہے، کیونکہ اس دن لوگوں سے ان کے اعمال کا حساب لیا جائے گا اور ان کے خیر یا شر ہونے کے اعتبار سے ان کو ان کا بدلہ دیا جائے گا۔ سورۂ فاتحہ جو نماز کی سورت ہے اور جس کا اس کی ہر رکعت میں پڑھنا فرض ہے اس میں اللہ تعالیٰ کے اسمائے صفات بیان کرتے ہوئے اس کو ''مالك يوم الدين'' روزِ جزا کا مالک فرمایا گیا ہے۔

۲۔ دین بمعنی طاعت الٰہی:

اللہ تعالیٰ کے غلبہ و قہر اور اس کے غیر محدود اقتدار کے سامنے تذلل اور خضوع اور فروتنی اور عاجزی، سورۂ لقمان میں ہے:

﴿وَ إِذَا غَشِيَهُمْ مَّوْجٌ كَالظُّلَلِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّيْنَ﴾ (لقمان: ۳۲)

''اور جب ان کو کوئی موج سائبانوں کی طرح ڈھانپ لیتی ہے تو وہ اللہ کو، طاعت کو اس کے لیے خالص کرتے ہوئے پکارتے ہیں۔''

مطلب یہ ہے کہ اس موقع پر وہ صرف اللہ تعالیٰ کو قادر، نجات دینے والا، دعا سننے اور قبول کرنے والا مان کر اسے پکارتے ہیں۔ اس آیت میں کفار اور مشرکین کا حال بیان ہوا ہے جو اس طرح کے جان لیوا مواقع پر اپنے تمام معبودوں کو نظر انداز کر کے صرف اللہ تعالیٰ کے مطیع و فرماں بردار بندے بن کر اس کو پکارتے اور اس سے فریاد کرتے ہیں، لیکن صوفیا اس طرح کے مواقع پر بھی غوث اعظم، یا اپنے پیر و مرشد اور قطب کی دہائی دیتے ہیں؟!!!

۳۔ دین بمعنی حکم اور فیصلہ:

﴿الزَّانِيَةُ وَالزَّانِي فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ وَّلَا تَأْخُذْكُمْ بِهِمَا رَأْفَةٌ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ﴾ (النور: ۲)

''زانی عورت اور زانی مرد، دونوں میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو اور تم کو ان کے متعلق اللہ کے حکم میں نرمی کا جذبہ دامن گیر نہ ہو اگر تم اللہ اور یوم آخر پر ایمان رکھتے ہو۔''

۴۔ دین بمعنی قانون:

﴿مَا كَانَ لِيَأْخُذَ أَخَاهُ فِيْ دِيْنِ الْمَلِكِ إِلَّا أَنْ يَّشَاءَ اللّٰهُ﴾ (یوسف: ۷۶)

Marfat.com

''ممکن نہ تھا کہ وہ بادشاہ کے قانون میں اپنے بھائی کو پکڑے، مگر یہ کہ اللہ چاہے۔''

۵۔ دین اس معنی میں کہ اللہ تعالیٰ کی محبت اور تعظیم کے جذبے سے اس کی طاعت، عبادت و بندگی، اس کے احکام کی تعمیل و بجا آوری اور اس کے لیے عاجزی اور فروتنی وغیرہ اس معنی میں ''دین'' اللہ کے تمام نبیوں اور رسولوں میں ہمیشہ ایک رہا ہے:

﴿شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ﴾ (شوری: ۱۳)

''اس نے تمہارے لیے طاعت کا وہی طریقہ مقرر کیا ہے جس کا حکم اس نے نوح کو دیا تھا اور جس کی وحی ہم نے تمہاری طرف کی ہے اور جس کا حکم ہم ابراہیم، اور موسیٰ اور عیسیٰ کو دے چکے ہیں، وہ یہ کہ دین کو قائم رکھو اور اس میں جدا جدا نہ ہو۔''

۶۔ دین بمعنی طریق عبادت قطع نظر اس کے کہ وہ صحیح ہے یا غلط، پسندیدہ ہے یا ناپسندیدہ، صرف اس معنی میں اس کی اضافت مشرکین کی طرف کی گئی ہے اور اس معنی میں اس کی اضافت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بھی کی گئی ہے اور یہ بھی صرف ایک سورت، سورۂ کافرون میں، ارشاد الٰہی ہے:

﴿لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ﴾ (الکافرون: ٦)

''تمہارے لیے تمہارا دین ہے اور میرے لیے میرا دین۔''

مطلب یہ ہے کہ تمہارے لیے وہ طریقۂ عبادت ہے جسے تم نے اور تمہارے باپ دادا نے اختیار کر رکھا ہے اور میرے لیے وہ طریقہ عبادت ہے جس کی ہدایت مجھے میرے رب نے دی ہے اور جو سیدھا اور ہر کجی سے پاک راستہ اور طریقہ ہے۔

یہ آیت کفار مکہ کے دین کے لیے پروانۂ تصویب اور تصدیق نہیں، بلکہ اعلان و اظہار براءت ہے، جس کی تائید سورۂ یونس کی آیت نمبر ۴۱ سے ہوتی ہے، ارشاد ربانی ہے:

﴿وَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ لِّيْ عَمَلِيْ وَلَكُمْ عَمَلُكُمْ اَنْتُمْ بَرِيْٓـــُٔوْنَ مِمَّآ اَعْمَلُ وَاَنَا بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ﴾ (یونس: ٤١)

''اور اگر وہ تمہیں جھٹلائیں تو کہہ دو میرے لیے میرا عمل ہے اور تمہارے لیے تمہارا عمل، تم اس سے بری ہو جو میں کرتا ہوں اور میں اس سے بری ہوں جو تم کرتے ہو۔''

۷۔ دین بمعنی مکمل ضابطۂ حیات اور کامل طریقۂ زندگی جس میں عقائد، شرعی احکام، عبادات، اخلاق، آداب اور معاملات سب داخل ہیں ان جامع و شامل معانی کا حامل لفظ ''دین'' قرآن پاک کی متعدد سورتوں میں آیا ہے،

Marfat.com

چند آیتیں درج ذیل ہیں:

۱:.... ﴿إِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْإِسْلَامُ﴾ (آل عمران: ۱۹)

''درحقیقت اللہ کے نزدیک دین اسلام ہی ہے۔''

۲:.... ﴿فَلَوْ لَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ﴾ (التوبة: ۱۲۲)

''پس کیوں نہ نکلے ان کی ہر آبادی سے کچھ لوگ تا کہ دین میں بصیرت پیدا کریں۔''

۳:.... ﴿اَلْيَوْمَ يَئِسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ دِيْنِكُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَ اخْشَوْنِ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَ رَضِيْتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِيْنًا﴾ (المائدة: ۳)

''جن لوگوں نے کفر کی روش اختیار کی ہے آج وہ تمہارے دین کی طرف سے مایوس ہو چکے ہیں، لہٰذا تم لوگ ان سے مت ڈرو اور مجھ سے ڈرو، آج میں نے تمہارے لیے تمہارے دین کو مکمل کر دیا ہے اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمہارے لیے دین کے طور پر اسلام کو پسند کر لیا۔''

۴:.... ﴿وَ مَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ وَ هُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ﴾ (آل عمران: ۸۵)

''اور جو کوئی اسلام کے سوا کوئی اور دین چاہے تو وہ اس سے ہرگز قبول نہ کیا جائے گا اور آخرت میں وہ نامرادوں میں سے ہوگا۔''

ان ارشادات مبارکہ میں دین اپنے کامل ترین اور جامع ترین معنوں میں استعمال ہوا، لیکن اپنے کسی معنیٰ میں بھی اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی کامل فرماں برداری، جس سیدھے راستے کی اس نے ہدایت دی ہے اس پر چلتے رہنے، اس کی نازل کردہ کتاب کے جملہ احکام کی تعمیل اور اس کے رسول ﷺ کے اوامر ونواہی کی مکمل پابندی کے مفہوم سے خالی نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب عزیز میں اپنے رسول کے کلام کے وحی ہونے کی جو یقین دہانی کرائی ہے (سورۂ نجم: ۲-۳) اس کی اطاعت کو ایمان واسلام کی جو شرط قرار دی ہے۔ (سورۂ نساء: ۵۹) ایمان بالرسالت کی صحت کو اس کی غیر مشروط اور مکمل اطاعت پر جو مبنی قرار دیا ہے۔ (النساء: ۶۴) اس کے حکم اور فیصلے پر بطیّب خاطر اور انشراح صدر کے سر تسلیم خم کر دینے کا جو حکم دیا ہے۔ (النساء: ۶۵) وغیرہ یہ سب کچھ اللہ کے حکم کی اطاعت میں شامل ہونے کی وجہ سے دین ہی کا ایک حصہ ہیں۔

مذکورہ بالا آیات کریمہ اور ان کے علاوہ دوسری آیات مبارکہ سے یہ حقیقت روز روشن سے زیادہ واضح ہے کہ ہم مسلمانوں کے نزدیک دین ہی اسلام ہے اور اسلام ہی دین ہے اور سورۂ آل عمران کی آیت ۱۹ اس امر میں نص قطعی ہے

Marfat.com

کہ اسلام سے مراد اپنے تمام ظاہری اور باطنی شرائع کے ساتھ دین ہی ہے جن میں عقائد اور اعمال سبھی شامل ہیں۔

اور قرآن کے مطابق اسلام اللہ کی کتاب قرآن اور رسول اللہ ﷺ کے اوامر و نواہی، حدیث اور سنت سے عبارت ہے اور یہی دونوں دین بھی ہیں جس کو اللہ نے ہمارے لیے پسند فرمایا ہے اور ہمیں یہ حکم دیا ہے کہ اس کی پیروی کریں اس طرح اسلام سے نسبت کا دعویٰ کرنے والے کسی بھی شخص کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اللہ کی نازل کردہ کتاب کے کسی حکم کی اور رسول اللہ ﷺ کی سنت میں موجود رسول اللہ ﷺ کے کسی حکم اور فیصلے کی خلاف ورزی کرے، قطع نظر اس کے کہ ان دونوں کے حکم کا تعلق لوگوں کے معاملات کے فیصلوں سے ہے جن کا نام شریعت ہے، یا لوگوں کے اخلاق سے ہے، جن کو آداب کہتے ہیں، یا دل، اعضائے ظاہری اور زبان سے اللہ تعالیٰ کے لیے تذلل، انقیاد اور خضوع سے، جس کو عبادت کہا جاتا ہے، مختصر لفظوں میں دین اور اسلام کا ہر حکم چاہے وہ قرآن میں آیا ہو یا حدیث یا سنت میں، اپنی شرعی حیثیت اور اپنی فرضیت اور مطلوبیت میں بالکل یکساں ہے اگر دونوں کے حکم میں کسی طرح کا بھی فرق کوئی کرتا ہے تو وہ کتاب اللہ کی تکذیب کرتا ہے، اس لیے کہ دونوں کی یہ یکساں حیثیت اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں مقرر فرمائی ہے:

﴿قَدْ نَعْلَمُ إِنَّهُ لَيَحْزُنُكَ الَّذِي يَقُولُونَ فَإِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُونَكَ وَلَٰكِنَّ الظَّالِمِينَ بِآيَاتِ اللَّهِ يَجْحَدُونَ﴾ (الانعام: ۳۳)

''یقیناً ہم جانتے ہیں کہ لوگ جو کچھ کہتے ہیں وہ تمہیں رنجیدہ کرتا ہے، لیکن یہ ظالم تمہاری تکذیب نہیں کرتے، بلکہ اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے ہیں۔''

غامدی کی سنت:

جاوید احمد غامدی نے اپنے کتابچہ ''اصول و مبادی'' میں جو کچھ فرمایا ہے وہ ان کی بیمار ذہنیت کی پیداوار ہے اس میں اگر بعض باتیں صحیح ہیں تو ان سے غلط نتائج اخذ کرنے کی انہوں نے جو کوشش کی ہے اس نے ان کو بھی باطل بنا دیا ہے۔ انہوں نے یہ دکھانے کی بھرپور سعیٔ مذموم کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ ہمیں جو دین و شریعت ملی ہے وہ تمام تر دین ابراہیمی کا اصلاح شدہ، ترمیم شدہ اور تجدید کردہ نسخہ ہے میں نے قرآنی آیات سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ہر رسول نے جو شریعت پیش کی ہے وہ سابق رسول کی شریعت سے ماخوذ نہیں، بلکہ وحی پر مبنی تھی، حتی کہ جن عقائدی اور اصولی باتوں میں تمام انبیاء اور رسولوں میں مکمل اتفاق تھا، وہ بھی ہر رسول کو بذریعہ وحی دی گئی تھی، سورۂ نساء کی آیت نمبر ۱۶۳ اور سورۂ شوریٰ کی آیت نمبر ۱۳ اس پر نص قاطع ہیں۔

غامدی صاحب نے ''سنت'' کی بحث لی تو ''تدبر قرآن اور تدبر حدیث'' سے ہے، مگر اس میں اپنی طرف سے اضافے کر کے اس کی نکارت بڑھا دی ہے، انہوں نے سنت کو قرآن پر مقدم کر کے سنت کو قرآن کا ماخذ بنا دیا ہے اور یہ

Marfat.com

مطالبہ کیا ہے کہ یہ سنت قرآن سے نہیں، بلکہ اس کے حاملین اور ناقلین کے اجماع و تواتر سے لی جائے۔ (۵۸) ان کے نزدیک قدیم آسمانی صحیفے نہ صرف یہ کہ محفوظ ہیں، بلکہ یہی ''الہامی لٹریچر'' کے خاص اسالیب، یہود و نصاریٰ کی تاریخ، انبیائے بنی اسرائیل کی سرگزشتوں اور اس طرح کے دوسرے موضوعات سے متعلق قرآن کے اسالیب و اشارات کو سمجھنے اور اس کے اجمال کی تفصیل جاننے کے لیے اصل ماخذ ہیں۔ رہی تفسیر کی کتابوں میں منقول روایتیں تو وہ سنی سنائی باتوں پر مبنی ہیں۔ ❶

انہوں نے یہ بھی دکھانے کی کوشش کی ہے کہ اسلام میں حلال و حرام اور معروف و منکر کو جاننے کا ذریعہ قرآن و حدیث نہیں، بلکہ انسانی فطرت میں ودیعت خوب و ناخوب کا شعور ہے۔ ❷

ان کا دعویٰ ہے کہ انسان فطری طور پر اللہ تعالیٰ کی صحیح عبادت بھی کر سکتا ہے وہ خلط مبحث کرنے میں بڑے ماہر ہیں اور اپنے مطلب کی چیزیں تلاش کرنے اور پھر ان پر اپنا خیالی قصر تعمیر کرنے میں بڑے تیز ہیں۔ وہ اجماع، تواتر اور فطرت وغیرہ کا بے تحاشا استعمال کرتے ہیں، مگر ان میں سے کسی کے بھی صحیح مفہوم سے واقف نہیں ہیں۔

ملت ابراہیمی کی حقیقت میں قرآنی آیات کی روشنی میں بیان کر چکا ہوں، ان کا دعویٰ ہے کہ سنت ابراہیمی ہی ملت ابراہیمی ہے اور نماز، روزہ، حج، اور زکوۃ وغیرہ اسی ملت کے احکام ہیں، قرآن کے احکام نہیں اور قرآن کے مخاطب ان کی اس مزعومہ حقیقت سے پوری طرح واقف تھے، انہوں نے اپنے اس دعوے پر صحیح مسلم کی اس حدیث سے استدلال بھی کیا ہے جس میں آیا ہے کہ ابوذر رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے پہلے ہی نماز کے پابند ہو چکے تھے۔ ❸

غامدی کے نزدیک ''سیرت پاک'' عنوان عمل نہیں، عنوان زینت ہے، ان کے نزدیک قرآن و حدیث کی ہدایات کے بغیر عقیدۂ توحید بھی پایا جا سکتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی مقبول عبادت بھی کی جا سکتی ہے۔ اپنی تحریروں کی روشنی میں نہ ان کا قرآن پر ایمان ہے اور نہ رسالت پر، اب وہ مسلمان ہیں یا غیر مسلم؟ اس کا فیصلہ قارئین کر سکتے ہیں۔

بعثت سے پہلے عرب کھلی گمراہی میں مبتلا تھے:

۱:..... ﴿لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ﴾

(آل عمران: ١٦٤)

''یقیناً اللہ نے مومنین پر اس وقت بڑا فضل فرمایا جب اس نے ان میں ایک رسول انہی میں سے بھیجا جو ان کو اس کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے، اور ان کا تزکیہ کرتا ہے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے، جبکہ حقیقت میں وہ کھلی گمراہی میں مبتلا تھے۔''

یہ آیت یہ بتا رہی ہے کہ عربوں میں رسول اللہ ﷺ کی بعثت ان پر اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا فضل ہے۔

❶ ص: ۵۸ ❷ ص: ۵۸ ❸ ص: ۵۵

Marfat.com

رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ مومنین کا تزکیہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ ان کو حسی اور معنوی طور پر پاک کرتے تھے، بایں معنی کہ آپ نے قولا ان کو نماز کے وقت وضو کرنے، حالت جنابت میں غسل کرنے اور جسم ولباس کو نجاستوں سے پاک کرنے کا حکم دیا اور عملاً اپنی سیرت پاک سے اس طہارت و پاکیزگی کے نمونے پیش کیے، اور ان کا معنوی تزکیہ اس طرح کیا کہ ان کے دلوں کو شرک، شک و تذبذب اور نفاق اور برے اخلاق سے پاک کیا۔

کتاب وحکمت کی تعلیم دینے کے معنی ہیں کہ ان کو کتاب اللہ کی آیات پڑھ کر سنانے کے علاوہ ان کے معانی اور مفاہیم ان سے بیان فرمائے اور اسی کے ساتھ اپنے مستقل اوامر ونواہی کی شکل میں ان کو حدیث اور سنت کی تعلیم دی اور ان کی تعمیل وتنفیذ کے طریقے سکھائے اور آخر میں یہ فرمایا کہ رسول کی بعثت کی صورت میں اپنے اوپر اللہ کے فضل سے پہلے وہ ایسی مرکب ضلالت اور گمراہی میں مبتلا تھے جو ہر جانب سے ان کو گھیرے ہوئی تھی، توحید کے بجائے وہ شرک اور بت پرستی میں مبتلا تھے۔ اللہ کی عبادت سے ناواقف تھے، ان کے اندر بداخلاقی عام ہو چکی تھی اور رحم دلی اور انسانیت کے نام کی کوئی چیز ان کے اندر باقی نہیں رہی تھی۔

۲۔ سورۂ بقرہ کی آیت نمبر ۱۵۱ میں مومنین پر اپنے اتمام نعمت کے طور پر فرمایا ہے:

﴿كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ﴾ (البقرة: ۱۵۱)

''جس طرح ہم نے تمہارے اندر ایک رسول تمہی میں سے بھیجا جو تمہیں ہماری آیتیں پڑھ کر سناتا ہے اور تمہیں پاک کرتا ہے اور تمہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے اور تمہیں وہ سب سکھاتا ہے جو تم نہیں جانتے تھے۔''

یہ آیت مبارکہ سابقہ آیت کے فقرہ: وَلِاُتِمَّ نِعْمَتِیْ عَلَیْكُمْ وَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ''اور تاکہ میں اپنی نعمت تم پر تمام کروں اور تاکہ تم ہدایت پاؤ'' سے متعلق ہے اور اہل ایمان پر اتمام نعمت اس کے علاوہ اور کیا ہو سکتی تھی کہ اس نے ان کے اندر اپنا رسول بھیج کر ان کو اپنی عبادت کا صحیح طریقہ سکھایا۔ قرآن کے مطابق اللہ تعالیٰ نے جنوں اور انسانوں کی تخلیق اپنی عبادت کے لیے کی ہے، اور اس کی عبادت اس کی مرضی کے مطابق اس کے بیان کردہ احکام کے مطابق کرنے ہی سے ہو سکتی ہے اور یہ احکام صرف اس کے رسول ہی بتا سکتے ہیں، کیونکہ انسان اپنی عقل اور فطرت اور آفاق و انفس کے شواہد سے یہ تو جان سکتا ہے کہ اس کائنات کا خالق اور رب کوئی بے مثال، بے پایاں قدرتوں کا مالک اور ہر مخلوق کی ضرورتوں کا علم رکھنے والا ہی ہو سکتا ہے اور وہ اللہ کے سوا کوئی نہیں ہو سکتا، جس کا تقاضا یہ ہے کہ تنہا وہی معبود بھی ہو، مگر کوئی بھی انسان حتی کہ اس کے نبی اور رسول بھی اپنے آپ یہ نہیں جان سکتے کہ اس کی عبادت کس طرح کی جائے؟

لہٰذا رب رحمٰن ورحیم نے ہر زمانے اور ہر آبادی میں اپنے رسول بھیجے کہ وہ اولاد آدم کو اللہ کی عبادت کے طریقے قولا بتائیں اور عملاً کر کے دکھائیں۔ ہمارے نبی اور رسول ﷺ سلسلۂ نبوت ورسالت کی آخری کڑی تھے آپ نے

Marfat.com

اللہ کی کتاب اور اپنی سنت کے ذریعہ ہمیں صرف عبادت کے طریقے ہی نہیں سکھائے، بلکہ ہمیں ایسا علم بھی دیا کہ اس پر عمل کر کے ہم اللہ کے مومن اور صالح بندے بن سکتے ہیں۔ اللہ نے اپنے اوپر ہمارے ایمان کی تکمیل کے لیے اپنے رسول کی رسالت پر ایمان کو اس لیے فرض کر دیا کہ جو عبادت اور شرعی احکام اللہ کی کتاب اور محمد بن عبداللہ قریشی ہاشمی ﷺ کی حدیث اور سنت سے باہر سے لیے جائیں گے اور ان میں منصوص نہیں ہوں گے وہ سب مردود ہوں گے اور ان پر عمل اللہ کی عبادت نہیں، اس کی معصیت ہوگی۔

فطرت ماخذ شرع نہیں ہے:

فطرت ماخذ شرع نہیں ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی بھی انسان اپنی فطرت سے یہ نہیں معلوم کر سکتا کہ وہ اللہ کی عبادت کس طرح کرے، البتہ اللہ کی توحید بذریعہ فطرت معلوم کی جا سکتی ہے، اسی وجہ سے اسلام کو دین فطرت کہا گیا ہے اور فطرت سلیمہ اللہ کی عبادت میں غیر اللہ کو شریک بنانے سے ابا کرتی ہے اور اولاد آدم نے جتنی بھی چیزوں کو اللہ کا شریک بنایا ہے ان میں سے کوئی بھی چیز معبود بننے کی صفت نہیں رکھتی، لہٰذا یہ حق بھی نہیں رکھتی کہ اس کو معبود بنایا جائے:

﴿ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَ اَنَّ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهِ الْبَاطِلُ وَ اَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُo﴾

(لقمن: ۳۰)

"یہ اس لیے ہے کہ درحقیقت اللہ ہی حق ہے اور یہ کہ اس کے سوا یہ جس کو پکارتے ہیں یقیناً وہ باطل ہیں، بلاشبہ اللہ بہت بلند اور بہت بڑا ہے۔"

آیت میں "وحدۃ الوجود" کے قائلین کے لیے کوئی دلیل نہیں ہے، کیونکہ اس میں اللہ ہی کے حق ہونے کا مطلب تنہا اس کے معبود ہونے کا حق ہے، اس لیے کہ وہ سب سے بلند اور ہر چیز سے بڑا اور عظیم ہے اور جو سب پر بلند ہو اور سب سے بڑا ہو وہی مستحق عبادت ہے۔

آیت میں اللہ تعالیٰ کے سوا پکاری جانے والی تمام چیزوں کے معبود ہونے کا بطلان ہے، ان کے وجود کا بطلان نہیں ہے۔

جاوید احمد غامدی نے اس بات کی پوری کوشش کی ہے کہ اولاً تو وہ اس دینِ اسلام کو سنت ابراہیمی کا تجدید و اصلاح شدہ نسخہ ثابت کریں جس کی نکارت قرآن سے ثابت کی جا چکی ہے۔

ثانیاً انہوں نے یہ ثابت کرنے کی سعیٔ مذموم کی ہے کہ دین ابراہیمی: عبادات، معاشرت، خورد و نوش اور رسوم و آداب سے عبارت ہے، اور یہی سنت ہے اور ثبوت کے اعتبار سے اس میں اور قرآن مجید میں کوئی فرق نہیں ہے۔ دونوں صحابہ کے اجماع اور عملی تواتر سے ملے ہیں۔ [1] ان دونوں کے علاوہ ان کے نزدیک کوئی بھی چیز دین نہیں ہے۔

[1] ص ۱۰-۱۱

Marfat.com

اس کے بعد انہوں نے جو کچھ فرمایا ہے۔ ❶ وہ ان کے اسی مزعوم دین کی تفصیل ہے جس کی قرآن پہلی نہیں اور آخری کتاب ہے جو سر تا سر فطرتِ انسانی میں ودیعت حقائق کا بیان ہے اور ان حقائق نے ''سیّدنا ابراہیم علیہ السلام کی نبوت میں پوری انسانیت کے لیے واضح سنت کی صورت اختیار کر لی۔'' ❷

دین کی یہ تاریخ بیان کرنے کے بعد انہوں نے قرآنی دعوت کو تین مقدمات میں بند کر دیا ہے:

(۱) دین فطرت (۲) سنت ابراہیمی (۳) نبیوں کے صحائف

غامدی صاحب کو یہ اصرار ہے کہ قرآن میں نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، قربانی اور اعتکاف وغیرہ سب ملت ابراہیمی کے احکام ہیں ان کا دعویٰ ہے کہ نزول قرآن سے پہلے ہی سے عرب ان اعمال سے واقف تھے، جمعہ کی اقامت کا مفہوم بھی جانتے تھے، نماز جنازہ بھی پڑھتے تھے، روزہ بھی رکھتے تھے، زکوٰۃ بھی دیتے تھے، حج بھی کرتے تھے اگرچہ اس میں چند بدعتیں داخل کر دی تھیں۔

ان کی ہرزہ سرائیوں کی تان اس دعوے پر ٹوٹی ہے:

''یہ پورا دین خوب و ناخوب کے شعور پر مبنی ان حقائق سے مل کر مکمل ہوتا ہے جو انسانی فطرت میں روز اول سے ودیعت ہیں اور جنہیں قرآن معروف اور منکر سے تعبیر کرتا ہے، شریعت کے جو اوامر و نواہی تعین کے ساتھ قرآن میں بیان ہوئے ہیں، وہ ان معروفات و منکرات کے بعد اور ان کی اساس پر قائم ہیں، انہیں چھوڑ کر شریعت کا کوئی تصور اگر قائم کیا جائے گا تو وہ ہر لحاظ سے ناقص اور قرآن کے منشا کے خلاف ہوگا۔'' ❸

غامدی صاحب نے قبل از نزول قرآن ملت ابراہیمی کے احکام کے عربوں میں معروف ہونے کے جو دلائل دیے ہیں ان میں صرف ایک صحیح مسلم سے ماخوذ ہے اور بقیہ لسان العرب اور المفصل فی تاریخ العرب قبل الاسلام سے ماخوذ ہیں۔ حج و عمرہ سے متعلق ان کا دعویٰ ہے کہ قریش نے چند بدعتیں ان میں بے شک داخل کر دی تھیں، لیکن ان کے مناسک فی الجملہ وہی تھے جن کے مطابق یہ عبادات اس وقت ادا کی جاتی ہیں اور لوگ ان بدعتوں سے واقف بھی تھے، انہوں نے اس کی مثال میں فرمایا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بعثت سے پہلے جو حج کیا وہ قریش کی ان بدعتوں سے الگ رہ کر بالکل اسی طریقے پر کیا جس طریقے پر سیّدنا ابراہیم علیہ السلام کے زمانے سے حج ہمیشہ سے جاری رہا ہے۔ ❹ انہوں نے اپنی مثال کے حوالہ میں صحیح بخاری کی حدیث نمبر ۱۵۸۱ کا ذکر کیا ہے جو جھوٹ ہے۔

نزول قرآن کے وقت دین ابراہیم کا کوئی وجود نہیں تھا:

غامدی صاحب کے نزدیک اسلام جس دین ابراہیمی کا تجدید اور اصلاح شدہ نسخہ ہے اس دین کا کوئی بھی تصور ذہنوں میں نہیں رہ گیا تھا جس ''الٰہ واحد'' کے عقیدے پر یہ دین قائم تھا وہ عربوں کے نزدیک عمومی طور پر اور اہل مکہ کے

❶ ص ۵۲-۵۸ ❷ ۵۲-۵۳ ❸ ص ۵۸ ❹ ص ۵۶

Marfat.com

نزدیک ایک عجوبہ بن کر رہ گیا تھا:

﴿اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ عُجَابٌ٥﴾ (ص: ٥)

''کیا اس نے سارے معبودوں کو ایک ہی معبود بنا ڈالا درحقیقت یہ تو بڑی عجیب بات ہے۔''

اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان پر، اپنا رسول بھیج کر جو انعام فرمایا ہے وہ اس رسول کی صفات بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے:

﴿وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ٥﴾ (البقرة: ١٥١)

''اور وہ تمہیں ان باتوں کی تعلیم دیتا ہے جو تم نہیں جانتے تھے۔''

اگر غامدی صاحب کی طرح اہل ایمان نعوذ باللہ جھوٹے اور منکر حق ہوتے تو یہ آیت سن کر رسول اللہ ﷺ سے عرض کرتے کہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کا کیا مطلب ہے؟ کیونکہ جو باتیں آپ ہمیں بتا اور سکھا رہے ہیں ہم انہیں پہلے سے جانتے اور مانتے تھے، یہ باتیں ہم بذریعہ فطرت بھی جانتے تھے اور ابراہیم علیہ السلام سے ان کے حاملین کے ''اجماع اور تواتر'' کے ذریعہ بھی یہ ہمیں ملتی رہتی تھیں۔

اہل مکہ کے بعض مشرکانہ اعمال کی جھلکیاں:

۱۔ مشرکین اپنے بتوں کی عبادت اس عقیدے سے کرتے تھے کہ وہ اللہ کے ہاں ان کی سفارش کریں گے۔ (یونس: ١٨)

۲۔ مشرکین بتوں کی عبادت کی یہ توجیہ کرتے تھے کہ وہ انہیں اللہ سے قریب کر دیں گے۔ (الزمر: ٣)

۳۔ مشرکین قربانی کے جانوروں کو کبھی بتوں کے آستانوں پر لے جا کر ذبح کرتے اور کبھی کسی بھی جگہ ذبح کر لیتے تھے، مگر بتوں کے نام پر (المائدة: ٣، الانعام: ١٢١)

۴۔ بتوں سے تقرب کا ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ مشرکین کھانے پینے کی چیزیں اور اپنی کھیتی اور چوپائے کی پیداوار کا ایک حصہ بتوں کے لیے خاص کر دیتے تھے اور ایک حصہ اللہ کے لیے اور یہ دعویٰ کرتے تھے کہ یہ اللہ کے لیے ہے اور ہمارے شرکاء کے لیے (الانعام: ١٣٦)

۵۔ مشرکین نے بعض اوصاف کے حامل اونٹوں کو تقدس کا درجہ دے رکھا تھا۔ (المائدة: ١٠٣)

غامدی کے نزدیک یہ سب ملت ابراہیمی یا سنت ابراہیمی کی روایات تھیں؟!!

قریش اور دوسرے عرب حج تو ضرور کرتے تھے جس طرح قربانی کرتے تھے، مگر قریش نے اس زعم میں کہ وہ ابراہیم علیہ السلام کی اولاد ہیں حج کا رکن اعظم ''وقوف عرفہ'' نہیں کرتے تھے، بلکہ مزدلفہ جا کر وہیں سے واپس آ جاتے، دوسرے عرب عرفات تک جاتے تھے۔ اب جہاں تک ان کی بدعتوں کا تعلق ہے تو ان کو جاننے کے لیے صرف یہ جان لینا کافی ہے کہ وہ ''توحید نا آشنا'' تھے۔ جبکہ حج سرتا سر توحید ہے، ایسی صورت میں ان کا حج سنت ابراہیمی کی کتنی کچھ

Marfat.com

ترجمانی کرتا رہا ہوگا؟ بتانے کی ضرورت نہیں، البتہ قرآن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ مزدلفہ میں اور منیٰ میں اپنے باپ دادا کی منقبت میں قصیدے گاتے تھے۔ یعنی معاملہ صرف چند بدعتوں کا نہیں تھا، بلکہ پورے حج کی کایا پلٹ کا تھا۔

انہوں نے بعثت سے قبل نبی ﷺ کے جس حج کا بخاری کے حوالہ سے ذکر کیا ہے وہ بخاری میں نہیں سیرت ابن ہشام میں ہے۔ ❶ جس کی روایت علی متقی نے کنز العمال میں طبرانی کی المعجم الکبیر کے حوالہ سے کی ہے۔ روایت کے الفاظ ہیں:

جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

((لقد رأيت رسول الله ﷺ، قبل أن ينزل عليه الوحي، و إنه واقف على بعير له بعرفات مع الناس من بين قومه حتى يدفع معهم منها توفيقا من الله))

''میں نے رسول اللہ ﷺ کو نزول وحی سے پہلے عرفات میں اپنے اونٹ پر لوگوں کے ساتھ وقوف کرتے دیکھا ہے، آپ اپنی قوم کے لوگوں کے درمیان تھے اور اللہ کی توفیق سے ان کے ساتھ عرفات سے افاضہ کرنا چاہتے تھے۔''

اس روایت سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ نبی ﷺ نے قریش کی روایات کے برعکس عرفات میں وقوف فرمایا تھا۔ یہاں یہ بتانا تحصیل حاصل ہے کہ بعثت سے قبل بھی آپ کی زندگی شرک سے پاک تھی اور آپ حسن اخلاق سے موصوف تھے، مگر اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ سنت ابراہیمی سے لوگ نہ صرف واقف تھے، بلکہ اس پر عمل بھی کرتے تھے، قرآن کی تکذیب ہے۔

دراصل قرآن کے مطابق مشرکین مکہ اور دوسرے عرب دین ابراہیمی سے کوسوں دور تھے شریعت ابراہیمی نے جن مکارم اخلاق کی تعلیم دی تھی ان سے بھی مشرکین کو کوئی واسطہ نہیں تھا، ان میں گناہوں کی بھرمار تھی وہ سر سے پاؤں تک بت پرستی میں غرق تھے۔

اہل مکہ اور دوسرے عربوں میں بت پرستی کے نتیجے میں جو اجتماعی حالات پیدا ہو گئے تھے انہوں نے فطرت کو مسخ کر ڈالا تھا اور ان کی اخلاقی پستی اور انحطاط نے ان کو رذائل کے ارتکاب کا عادی، بلکہ عاشق بنا دیا تھا، شراب نوشی، جوئے بازی، لاتعداد عورتوں سے شادیاں اور عورتوں پر ناروا ظلم، فقر کے خوف یا فقر کے باعث بچوں کا قتل، جھوٹی عار، غیرت اور شرم کے پردے میں بچیوں کو زندہ درگور کر دینا، اور معمولی معمولی اسباب پر جنگ و جدال ان کی پہچان بن گیا تھا ان کی ان برائیوں اور رذالتوں کا قرآن میں جگہ جگہ ذکر آیا ہے اور ان کی اس دینی، اخلاقی اور اجتماعی حالت کی سچی تصویر اس تقریر میں دیکھی جا سکتی ہے جو جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے شاہ حبش نجاشی کے دربار میں کی تھی اور جس نے اس رحم دل

❶ ص ۲۰۴ ج ۱، المجعم الکبیر، نمبر ۱۲۶۳۲

Marfat.com

اور صالح بادشاہ کو رونے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس واقعہ کی راوی ام سلمہ ام المؤمنین رضی اللہ عنہا ہیں جو واقعہ کی شاہد تھیں اور اس کی روایت امام احمد نے صحیح سند کے ساتھ مسند میں حافظ ہیثمی نے مجمع میں ابن ہشام نے سیرت میں اور بیہقی نے دلائل النبوۃ میں اور طبرانی نے المعجم الکبیر میں کی ہے۔ ❶

دعوت حق اور اہل مکہ کا رد عمل:

جب اللہ تعالیٰ کے حکم سے رسول اللہ ﷺ نے اپنی قوم کو دعوت حق دی تو اس کے جواب میں انہوں نے جو طرز عمل اختیار کیا اس کے ذکر سے قرآن پاک بھرا پڑا ہے وہ اہل مکہ جن کی زبانیں رسول اللہ ﷺ کی مدح خوانی سے نہیں تھکتی تھیں، جنہوں نے آپ کو صادق و امین کا لقب دے رکھا تھا، آپ کی دعوت سنتے ہی آپ کے دشمن بن گئے اور آپ پر الزامات لگانے لگے اور بعد میں آپ اور آپ پر ایمان لانے والوں کو جو ایذائیں دیں وہ قرآن پاک میں مختلف مواقع پر ثبت ہیں۔ کیا بقول غامدی یہ لوگ دین ابراہیمی کے وارث حقیقی اور اس کے احکام کے محافظ نہیں تھے۔ پھر انہوں نے یہ معاندانہ روش کیوں اختیار کی اور اپنے دلوں کی آواز اور فطرت کی پکار سن کر بھیڑیے کیوں بن گئے ان کو تو اپنے جد امجد ابراہیم علیہ السلام کے دین کے احکام سن کر خوش ہونا چاہیے تھا۔ اس طرح تو ان کی دیرینہ آرزو پوری وہ رہی تھی؟!!

زمانہ فترت کے عقائد و اعمال:

میں نے اوپر عرض کیا ہے کہ توحید فطرت کی آواز ہے، لہٰذا زمانہ ''فترت'' کا انسان توحید کے بارے میں جواب دہ ہے فترت سے مراد دو رسولوں کے درمیان کا زمانہ ہے جب سابق رسول کی تعلیمات مٹ چکی ہوں۔ دلوں کی بیماریاں سب سے پہلے توحید پر حملہ آور ہوتی ہیں اور توحید میں فتور اور بگاڑ کے بعد اعمال بگڑنا شروع ہوتے ہیں اسی لیے ہر رسول کی دعوت توحید سے شروع ہوتی تھی۔

توحید فطرت کی آواز ہونے کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی ہمہ گیر ربوبیت کا تقاضا بھی ہے جس کے قائل مشرکین بھی رہے ہیں قرآن نے ربوبیت کی دعوت نہیں دی ہے، بلکہ اس کو ''توحید الوہیت'' کی دلیل بنا کر پیش کیا ہے، ربوبیت کے دلائل اور مظاہر سے کائنات کا ذرہ ذرہ بھرا ہوا ہے۔

غامدی مغالطہ دینے اور رائی کو پہاڑ بنانے میں بڑے ماہر ہیں۔ انہوں نے دین ابراہیم کے امتیازی پہلو ''توحید'' کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے۔ انہوں نے بعثت سے پہلے اور اس سے متصل زمانہ میں موجود انگلیوں پر گنے جانے والے بعض لوگوں کی نماز روزے سے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ دین ابراہیم موجود تھا، اور لوگ اس پر عمل پیرا تھے، پھر اس سے اپنا یہ باطل ''نظریہ'' بنایا ہے کہ انسان فطرت کے ذریعہ صحیح اور غلط اعمال جان سکتا ہے، معاشرتی آداب و رسوم بنا سکتا ہے۔ کیا کھائے اور کیا پیے ان کا تعین کر سکتا ہے وغیرہ اور چونکہ ان کی من گھڑت سنت جو قرآن پر مقدم ہے، فطرت ہی

❶ مسند احمد، نمبر ۱۷۴۰، مجمع، ص ۲۴-۲۷ ج ۶۔ ابن ہشام، ص ۳۳۵-۳۳۶ ج ۱۔ دلائل النبوۃ، ص ۳۰۱-۳۰۴ ج ۲۔ المعجم الکبیر، نمبر ۱۴۷۹۔

Marfat.com

پر مبنی ہے، لہٰذا اس کو معلوم کرنے کا ذریعہ قرآن نہیں یا صرف قرآن نہیں، بلکہ دین فطرت، سنت ابراہیمی اور نبیوں کے صحائف ہیں۔ ان کے دین میں حدیث کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔

ملت ابراہیمی کی اپنی غلط اور قرآن سے متصادم تشریح کی بنیاد پر انہوں نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ یہ سب اسی ملت کے احکام ہیں جن سے قرآن کے مخاطب پوری طرح واقف، بلکہ بڑی حد تک ان پر عامل تھے، سیدنا ابوذر کے ایمان لانے کی جو روایت مسلم میں بیان ہوئی ہے اس میں وہ صراحت کے ساتھ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے پہلے ہی وہ نماز کے پابند ہو چکے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب عزیز میں بعثت سے قبل اہل مکہ اور دوسرے عربوں کی جو دینی، اخلاقی اور اجتماعی حالت بیان فرمائی ہے اس کی ایک جھلک حوالوں کے ساتھ اوپر دکھائی جا چکی ہے اس کو اپنے سامنے رکھئے اور پھر موصوف کے اس دعوے پر غور کیجیے تو آپ کو دونوں کا تضاد معلوم ہو جائے گا۔ پھر آپ آزاد ہیں، چاہیں تو علام الغیوب کی خبر کو مانیں یا غامدی صاحب کے دعوے کو۔

غامدی صاحب نے جن اعمال کو ''ملت ابراہیم'' کے احکام کا نام دیا ہے ان سے حج کے علاوہ کسی رسول کی شریعت خالی نہیں تھی، کیونکہ یہ ارکان اسلام ہیں جن کے سرفہرست توحید ہے جس کا ذکر صاحب میزان بھول کر بھی نہیں کرتے، جبکہ پورے قرآن پاک میں جہاں بھی اس ملت کا ذکر آیا ہے تو اس کے ساتھ دو باتوں کا ضرور ذکر آیا ہے:

۱۔ ابراہیم علیہ السلام کا مشرکوں سے کوئی تعلق نہیں تھا۔
۲۔ وہ ہر ملت سے منہ موڑ کر ملت توحید کے لیے یکسو ہو چکے تھے۔

میں نے اوپر ملت اور دین دونوں کی وضاحت قرآنی آیات کی روشنی میں کر دی ہے اور یہ دکھا دیا ہے کہ پورے قرآن پاک میں ابراہیم علیہ السلام کی طرف اضافت کے ساتھ یہ لفظ صرف ملت توحید کے معنی میں آیا ہے جو شریعت کے معنی میں نہیں ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہر رسول کو خاص شریعت دی تھی جو اس کے زمانے اور اس زمانے کے لوگوں کے لیے مناسب تھی:

﴿لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنكُمْ شِرْعَةً وَّ مِنْهَاجًا﴾ (المائدة: ٤٨)

لیکن توحید ہر شریعت کا بنیادی رکن تھی۔

﴿وَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ٥﴾

(الانبياء: ٢٥)

''اور ہم نے تم سے پہلے کوئی بھی رسول نہیں بھیجا، مگر اس کی طرف یہی وحی کرتے رہے کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں، سو میری ہی عبادت کرو۔''

Marfat.com

توحید کی طرح اللہ کی کوئی شریعت بھی نماز، روزہ اور زکوٰۃ سے خالی نہیں تھی۔ لہٰذا ملت ابراہیم کو شریعت ابراہیم قرار دینا اور مذکورہ عبادات کو ملت ابراہیم کے احکام قرار دینا حد درجہ گمراہ کن غلط بیانی ہے۔

آپ نے صرف ایک فرد-ابو ذر رضی اللہ عنہ- کے قبل از بعثت پابند نماز ہونے سے قرآن کے مخاطب اہل مکہ اور جزیرۂ عرب کے دوسرے لوگوں کے ملت ابراہیم کے احکام سے پوری طرح واقف ہونے اور ان پر عمل بھی کرنے پر جو استدلال کیا ہے وہ آپ کی قرآن فہمی اور قرآنی آیات پر ''ڈیرے'' ڈالنے کے آپ کے دعوے کا مذاق اڑا رہا ہے۔ نماز جو ایمانیات کے بعد تمام ارکان اسلام کے سرفہرست ہے اور جس سے اللہ کی کوئی بھی شریعت خالی نہیں رہی ہے اس نماز کو قرآن کے مخاطب کتنا سمجھتے تھے؟ اس کا جواب اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد مبارک میں ملاحظہ فرمایئے:

﴿وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ إِلَّا مُكَآءً وَّتَصْدِيَةً فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُونَ۝﴾ (الانفال: ۳۵)

''اور ان کی نماز بیت-اللہ- کے پاس محض سیٹیاں بجانے اور تالیاں پیٹنے کے سوا کچھ نہیں ہوتی تھی، سو چکھو عذاب بسبب اپنے کفر کے۔''

اور ذرا ایک قدم اور آگے بڑھایئے اور اپنے اس دعوے کا جواب بھی سنتے چلیے کہ ''وہ ان پر-ملت ابراہیم کے احکام پر- بڑی حد تک عامل تھے:

﴿كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِينَةٌ۝ إِلَّا أَصْحٰبَ الْيَمِينِ۝ فِي جَنّٰتٍ يَتَسَآءَلُونَ۝ عَنِ الْمُجْرِمِينَ۝ مَا سَلَكَكُمْ فِي سَقَرَ۝ قَالُوا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّينَ۝ وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِينَ۝ وَكُنَّا نَخُوضُ مَعَ الْخَائِضِينَ۝ وَكُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوْمِ الدِّينِ۝ حَتّٰى أَتٰنَا الْيَقِينُ۝﴾ (المدثر: ۳۸-۴۷)

''ہر شخص اس کے بدلے جو اس نے کمایا ہے گروی رکھا ہوا ہے، سوائے دائیں والوں کے وہ باغوں میں رہ کر مجرموں کے بارے میں سوال کریں گے، تمہیں کیا چیز جہنم میں لے گئی وہ جواب دیں گے ہم نماز پڑھنے والوں میں سے نہ تھے اور نہ ہم مسکین کو کھانا کھلاتے تھے اور ہم فضول باتیں کرنے والوں کے ساتھ شامل ہو کر فضول باتیں کیا کرتے تھے اور ہم یوم جزا کو جھٹلاتے تھے یہاں تک یقین ہمارے پاس آ گیا۔''

میں یہ بات کرتا آ رہا ہوں کہ مشرک کا کوئی عمل معتبر نہیں ہے، مگر یہ آیتیں یہ بتا رہی ہیں کہ ان کی بدعملیاں شمار ہو رہی ہیں، اس کا جواب یہ ہے کہ مشرک کے نیک اعمال کا کوئی اعتبار نہیں۔ قرآن اس کی صراحت کرتا ہے:

﴿وَلَقَدْ أُوحِيَ إِلَيْكَ وَإِلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكَ لَئِنْ أَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ وَلَتَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ۝﴾ (الزمر: ۶۵)

Marfat.com

''درحقیقت تمہاری طرف یہ وحی کی گئی ہے اور ان کی طرف جو تم سے پہلے تھے کہ اگر تم نے شرک کا ارتکاب کیا تو تمہارا عمل غارت ہو جائے گا اور تم یقینی طور پر نقصان اٹھانے والوں میں ہو جاؤ گے۔''

لیکن مشرکین کو ان کی بدعملیوں کی سزا دی جائے گی۔ غامدی کے استاد مولانا اصلاحی تحریر فرماتے ہیں:

''یہاں یہ امر ملحوظ رہے کہ دین کے عقائد میں جس طرح توحید کو سب پر تقدم حاصل ہے اسی طرح اعمال میں نماز کو سب پر تقدم حاصل ہے، ہر نبی نے سب سے پہلے اسی عمل کی دعوت دی ہے اور اس کے اہتمام اور اس کے ترک پر دین کو منحصر بتایا ہے۔'' ❶

سورۂ مدثر کی مذکورہ بالا آیتوں سے معلوم ہوا کہ نماز، انفاق اور یوم جزا پر ایمان وغیرہ ''ملت ابراہیم'' کے خاص احکام نہیں تھے، بلکہ ہر نبی کی شریعت میں یہ احکام موجود تھے؟!!

ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کا واقعہ:

صحیح مسلم میں ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کے سفر مکہ اور ایمان لانے کا جو طویل واقعہ بیان ہوا ہے اس میں یہ آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شرف ملاقات حاصل کرنے سے تین برس پہلے ہی سے وہ عشاء کی نماز پڑھتے تھے نہ اس نماز کی کوئی کیفیت بیان ہوئی اور نہ اس قبلہ ہی کا کوئی بیان ہے جس کی طرف رخ کر کے وہ نماز پڑھتے تھے جب ان سے پوچھا گیا کہ وہ کس طرف رخ کرتے تھے تو فرمایا: "أتوجه حيث يوجهني ربي عز و جل" ''میں ادھر رخ کرتا تھا جدھر میرا رب عزوجل میرا رخ پھیرتا تھا۔'' البتہ انہوں نے یہ صراحت کی ہے کہ وہ نماز اللہ کے لیے پڑھتے تھے۔ جو ان کے موحد ہونے کی واضح دلیل ہے۔

حدیث میں یہ صراحت نہیں ہے کہ یہ واقعہ بعثت سے پہلے کا ہے اور نہ اس میں ایسا ہی کوئی اشارہ ہے کہ وہ ملت ابراہیمی اور اس کے احکام سے واقف تھے۔ یہ غامدی صاحب کا اپنا استنتاج ہے۔ میں اوپر عرض کر چکا ہوں کہ ایک انسان توحید کی روشنی تو فطرت سے پا سکتا ہے اور فطرت ہی کے تقاضے سے شرک سے کنارہ کش ہو سکتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ کی صحیح اور مطلوبہ عبادت کا طریقہ فطرت سے نہیں معلوم کر سکتا اور نہ فطرت سے یہ جان سکتا ہے کہ معروف کیا ہے اور منکر کیا اور کن چیزوں کا کھانا اور پینا حلال ہے اور کن کا حرام؟ وغیرہ، ورنہ اللہ تعالیٰ اتنی بڑی تعداد میں اپنے رسول نہ بھیجتا اور لوگوں کو ان کی فطرت پر چھوڑ دیتا۔

زید بن نُفیل رضی اللہ عنہ کا واقعہ:

ابوذر رضی اللہ عنہ سے زیادہ تفصیلی اور زیادہ سبق آموز واقعہ زید بن نُفیل رضی اللہ عنہ کا ہے جو حقیقی معنوں میں موحد تھے شرک سے ان کی نفرت اور توحید سے ان کا لگاؤ فطری تھا۔ صحیح روایات کے مطابق انہوں نے دین حق کی تلاش میں شام کا سفر بھی کیا جس میں پہلے ان کی ملاقات ایک یہودی عالم سے ہوئی اور انہوں نے اس سے اس کے دین کے بارے میں

❶ تدبر قرآن، ص ۶۳ ج ۸

Marfat.com

واقفیت چاہی تا کہ اس کی پیروی اختیار کر لیں، لیکن اس یہودی عالم نے یہودیت کی پیروی کو اللہ کے غضب کا موجب قرار دیتے ہوئے انہیں ''حنیف'' بننے کا مشورہ دیا اور جب انہوں نے اس سے حنیف کے بارے میں پوچھا تو اس نے جواب دیا ''دین ابراہیم'' ❶

اسی روایت میں ہے کہ جب وہ شام سے نکلے تو اپنے دونوں ہاتھ اٹھا کر کہا: ((اللّٰھم إنی أشھد أنی علی دین إبراھیم)) ''اے اللہ! میں گواہی دیتا ہوں کہ میں دین ابراہیم پر ہوں۔''

یعنی ان کو مکی ہونے کی وجہ سے دین ابراہیم یا دین حنیف کے بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا بلکہ یہودی عالم سے معلوم ہوا کہ ابراہیم علیہ السلام کے دین کا نام حنیف ہے۔ جبکہ ان کا تعلق قریش کے معزز گھرانے بنو مخزوم سے تھا۔ وہ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے چچا زاد بھائی اور مشہور صحابی سعید کے والد ماجد تھے۔

ان کی نماز کا حال اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا نے بیان کیا ہے، وہ فرماتی ہیں:

''میں نے زید بن عمرو بن نفیل کو دیکھا ہے وہ بہت بوڑھے ہو چکے تھے اور کعبہ سے اپنی پیٹھ لگائے کہہ رہے تھے: اے معشر قریش! اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں زید بن عمرو کی جان ہے، میرے علاوہ تم میں سے کوئی دین ابراہیم پر نہیں ہے، پھر کہتے: اے اللہ! اگر مجھے یہ معلوم ہوتا کہ عبادت کا کون سا طریقہ تجھے محبوب ہے تو میں اسی کے مطابق تیری عبادت کرتا، لیکن وہ مجھے نہیں معلوم ہے۔ پھر وہ اپنی ہتھیلی پر سجدہ کرتے۔'' ❷

غور فرمایئے قریش کے معزز گھرانے سے تعلق رکھنے والا ایک ''موحد حنیف'' جس نے دین حق کی تلاش میں شام کا پر مشقت سفر کیا وہ اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود بھی نماز کا صحیح طریقہ نہیں معلوم کر سکا، بلکہ اسے دین ابراہیم کا نام تک ایک یہودی عالم سے معلوم ہوا۔ اس پر بھی غامدی صاحب کا یہ دعویٰ ہے کہ ملت ابراہیم کے احکام سے قرآن کے مخاطب پوری طرح واقف، بلکہ بڑی حد تک ان پر عامل تھے، کیا اس سے بڑی کوئی غلط بیانی ہو سکتی ہے؟

زید نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا تھا۔ مگر آپ کی بعثت سے پہلے توحید ہی پر ان کی وفات ہوئی۔

معروف و منکر:

غامدی صاحب نے اسلام کی نہایت اہم اصطلاح معروف و منکر کو ایمان و اخلاق کے بنیادی حقائق میں شمار کیا ہے۔ فرماتے ہیں: یعنی وہ باتیں جو انسانی فطرت میں خیر کی حیثیت سے پہچانی جاتی ہیں اور وہ جن سے فطرت ابا کرتی اور انہیں برا سمجھتی ہے، قرآن ان کی کوئی جامع و مانع فہرست نہیں پیش کرتا، بلکہ اس حقیقت کو مان کر کہ انسان ابتداء ہی سے معروف و منکر، دونوں کو پورے شعور کے ساتھ بالکل الگ الگ پہچانتا ہے، اس سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ معروف کو اپنائے اور منکر چھوڑ دے۔ ❸

❶ بخاری ۳۸۲۷ ❷ ابن ہشام ص ۲۲۵ ج ۱ ❸ ص ۵۴-۵۵

Marfat.com

ان کی یہ بات بالکل صحیح ہے کہ معروف و منکر کا ایمان و اخلاق کے بنیادی حقائق سے تعلق ہے، لیکن ان کا یہ دعویٰ صحیح نہیں ہے کہ معروف صرف وہ باتیں ہیں جن کو فطرت ''خیر'' کی حیثیت سے جانتی اور پہچانتی ہے اور ان کو پسند بھی کرتی ہے اور جن باتوں سے فطرت ابا کرتی ہے اور ان کو برا جانتی ہے وہ منکر ہیں، بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ شریعت نے جن باتوں کو معروف کہا ہے اور معروف سے تعبیر کیا ہے جب ان کو صحیح الفطرت اور سلیم الفطرت انسان کے سامنے پیش کیا جاتا ہے یا وہ ان کو سنتا ہے یا عملی طور پر دیکھتا ہے تو ان کو پسند کرتا ہے، ان سے اجنبیت محسوس نہیں کرتا اور اس کی فطرت سلیمہ ان سے نفرت اور ابا نہیں کرتی، اور اس کے برعکس جو چیزیں ہیں وہ منکر ہیں۔

غامدی صاحب اور ان کے ہمنواؤں اور کتاب و سنت کو ماخذ رشد و ہدایت ماننے والے ہم مسلمانوں کے درمیان اختلافِ فکر و نظر اس نقطہ سے شروع ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک فطرت یا عقل ہی خیر و شر کے درمیان تمیز کرتی ہے۔ تنہا وہی یہ فیصلہ کرتی ہے کہ کیا حق ہے اور کیا باطل، جبکہ ہمارا یہ ایمان و عقیدہ ہے کہ عقل یا فطرت کی یہ صلاحیت اور اہلیت محدود بھی ہے اور مبہم بھی اور وہ توحید و شرک، خیر و شر اور معروف و منکر کے بارے میں جب شریعت کے احکام سنتی ہے تو ان کی مخالفت نہیں کرتی، بلکہ ان کو صحیح اور درست مانتی ہے وہ از خود توحید و شرک، خیر و شر اور معروف و منکر کی تفصیلات جاننے سے عاجز اور قاصر ہے۔

پھر غامدی صاحب اور ان کے ہم نواؤں کے نزدیک معروف و منکر کا تعلق نہایت محدود معنی میں صرف فضائل اخلاق سے ہے، جبکہ ہمارے نزدیک معروف و منکر کا تعلق دین کے تمام امور سے ہے، ایمانیات سے لے کر آداب معاشرت تک دین کا ہر شعبہ اس میں داخل ہے، ایسی صورت میں یہ بات کس طرح درست ہو سکتی ہے کہ ''انسان ابتداء ہی سے معروف و منکر، دونوں کو پورے شعور کے ساتھ بالکل الگ الگ پہچانتا ہے۔'' [1]

ان کا یہ دعویٰ ان کے اس دعویٰ کی طرح ہے کہ ''عرب ملتِ ابراہیمی کے احکام: نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ سے پوری طرح واقف تھے، بلکہ بڑی حد تک ان پر عامل تھے'' اگر یہی حق ہے تو نبی کریم ﷺ اور مشرکین مکہ اور دوسرے عربوں کے درمیان لڑائی کس بات پر تھی جس کے ذکر سے قرآن پاک بھرا پڑا ہے؟

غامدی ایمانیات کا ذکر بھول کر بھی نہیں کرتے اور توحید کا لفظ ان کے قلم کی نوک پر آتا ہی نہیں، ایسا کرنے سے ان کا سارا بھانڈا پھوٹ جاتا، جبکہ معروف کا حکم دینا اور منکر سے روکنا اہل ایمان کی صفت ہے، منافقین جو انسانوں کی بدترین صنف کی نمائندگی کرتے ہیں ان کی صفت اہل ایمان سے مختلف ہے۔ ارشاد الٰہی:

﴿اَلْمُنٰفِقُوْنَ وَ الْمُنٰفِقٰتُ بَعْضُهُمْ مِّنْ بَعْضٍ يَاْمُرُوْنَ بِالْمُنْكَرِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوْفِ﴾

(التوبة: ٦٧)

---

[1] ص ۵۵

''منافق مرد اور منافق عورتوں کا ایک دوسرے سے تعلق ہے اور وہ برائی کا حکم دیتے ہیں اور نیکی سے روکتے ہیں۔''

معروف و منکر کیا ہے؟

معروف وہ نہیں ہے جس کو فطرت جانتی اور پہچانتی ہو اور جو لوگوں میں معروف و مانوس ہو۔ اسی طرح منکر وہ نہیں ہے جو لوگوں میں غیر معروف، غیر مانوس اور اجنبی ہو۔ بلکہ معروف وہ ہے جس کا اللہ و رسول نے حکم دیا ہو۔ جو شرعاً معروف ہو، شرع نے پہلے سے موجود جس چیز کو برقرار رکھا ہو۔ اس طرح صرف اللہ تعالیٰ کو اپنا معبود اور رب ماننا، ہر عیب و نقص سے اس کو پاک ماننا اور ہر صفت کمال سے اس کو موصوف ماننا معروف ہے، جن غیبی امور کی اللہ و رسول نے خبر دی ہے ان کو حق ماننا معروف ہے۔ نماز قائم رکھنا، زکوٰۃ دینا، روزہ رکھنا اور حج کرنا معروف ہے۔ والدین کے ساتھ حسن سلوک کرنا، عام انسانوں کے ساتھ حسن معاملہ کرنا، اور اعلیٰ اخلاقی صفات سے موصوف ہونا، محتاجوں کی مدد کرنا، کمزوروں کو سہارا دینا اور مظلوموں کی حمایت کرنا وغیرہ معروف ہے۔

اسی طرح منکر وہ ہے جس سے شریعت نے منع کیا ہے، اللہ کے ساتھ کسی کو شریک بنانا، کتاب و سنت میں منصوص طریقوں کے علاوہ کسی اور طریقے سے اللہ کی عبادت کرنا، زنا، چوری، شراب نوشی، ناحق قتل، لوگوں کی حرمتوں اور املاک پر دست درازی، جھوٹ، غیبت اور لوگوں کی عیب جوئی وغیرہ منکر ہیں۔

مذکورہ بالا امور میں سے بعض کا معروف و منکر ہونا فطرت کو بھی معلوم ہے، مگر یہ علم ناقص اور مبہم ہے شریعت نے اس کو واضح کر دیا ہے ان میں سے کسی بھی چیز کی عقل یا فطرت مخالفت نہیں کرتی۔

معروف و منکر قرآنی اصطلاح ہے جس میں پورا دین داخل ہے اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے نیکی کا حکم دینے اور برائی سے روکنے کی تعبیر خیر سے کی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ أُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ إِلَى الْخَيْرِ وَ يَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۝﴾ (آل عمران: ۱۰۴)

''اور تم میں سے ایسے لوگوں کا ہونا لازمی ہے جو نیکی کی طرف دعوت دیں اور اچھے کام کا حکم دیں اور برے کام سے روکیں اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔''

ذرا اسلوب قرآنی پر غور فرمایئے، دعوت الی الخیر کو مقدم رکھا، کیونکہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی یہی بنیاد ہے؛ شریعت نے جن باتوں کا حکم دیا ہے اور جن باتوں سے منع کیا ہے وہ خیر ہی خیر ہے۔ دنیا اور آخرت دونوں کے لیے خیر، مثلاً آپ کا دوسروں کو طاعت الٰہی اور طاعت رسول کی دعوت دینا، اقامت صلاۃ، زکوٰۃ کی ادائیگی، روزہ رکھنے اور حج کرنے، والدین کے ساتھ حسن سلوک، صلہ رحمی اور بیع و شراء میں امانت داری اور صدق گوئی کی دعوت وغیرہ دین ہے، اسی طرح لوگوں

Marfat.com

کو منکرات سے باز رہنے کی دعوت دینا، مثلاً: زنا نہ کرو، چوری نہ کرو، شراب نوشی نہ کرو، بلاحق کسی کو ہلاک مت کرو، اپنے والدین کی نافرمانی نہ کرو، رشتہ داروں سے قطع رحمی نہ کرو، جھوٹ مت بولو کاروبار تجارت اور لین دین اور معاملات میں دھوکا دہی سے باز رہو، لوگوں کی جان و مال اور عزت و آبرو کو نشانہ مت بناؤ وغیرہ خیر ہی خیر ہے جو سراسر دین ہے۔

اس دعوت الی الخیر کے بعد نیکی کا حکم اور برائی سے روکنا اجمال کی تفصیل بھی ہے اور اس دعوت الی الخیر کی اہمیت کا اظہار بھی، کیونکہ حکم کا مرحلہ دعوت کے بعد آتا ہے اس آیت کی روشنی میں ہر مسلمان کا پہلا فرض یہ ہے کہ وہ خیر کی دعوت دے۔

کسی ایک مسلمان کے نزدیک بھی یہ بات صحیح نہیں ہوگی کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان پر جس معروف کا حکم دینے اور جس منکر سے روکنے کو فرض قرار دیا ہے وہ وہی معروف و منکر ہیں جن کو ''انسان ابتداء سے پورے شعور کے ساتھ بالکل الگ الگ پہچانتا ہے۔ کیونکہ اس دعوے کو درست مان لینے سے تمام رسولوں کی بعثت اور ان پر کتابوں کا نزول فعل عبث قرار پاتا ہے۔

میں نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ یہ پورا دین معروف و منکر سے عبارت ہے یا اوامر و نواہی یا افعل و لاتفعل سے عبارت ہے اسی وجہ سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اسلام کا اہم اور بنیادی فریضہ ہے۔ مومن کی پہچان اور اس کی لازمی صفت ہے۔ اہل ایمان کے علاوہ تمام انبیاء اور رسول بھی اس کے مکلّف رہے ہیں۔

اگر معروف و منکر کو ہر انسان فطرتاً اور شعوراً جانتا اور مانتا ہے تو پھر منافقین کے بارے میں یہ کیوں فرمایا گیا کہ وہ منکر کا حکم دیتے ہیں اور معروف سے روکتے ہیں۔ پیدائشی طور پر اور فطرتاً تو وہ بھی انسان ہی ہیں؟!!

اگر معروف و منکر کی معرفت فطرت انسانی میں ودیعت ہے تو پھر تو پوری دنیا کے انسانوں کو قطع نظر اس کے کہ ان کا دین و مذہب کیا ہے یہ مہم دل و جان سے ادا کرنی چاہیے، مگر امر واقعہ اس کے برعکس ہے اور یہ فریضہ انجام دینے والے ہمیشہ اقلیت میں رہے ہیں اور اکثرت کی نظروں میں ناپسندیدہ بھی۔

حدیث واحد سے قرآن پر اضافے کی مثالیں

اس مسئلہ پر اصولی بحث ذرا طویل ہوگئی جو ضروری تھی۔ حدیث یا سنت کے خلاف جو طوفان بدتمیزی برپا ہے اس کا تقاضا تھا کہ منصب رسالت کے ضروری پہلوؤں کو اتنا واضح کر دیا جائے کہ اس بحث کو سمجھنے کے لیے ذہن تیار ہو جائے۔

پہلی مثال، اللہ تعالیٰ کا رات کے تیسرے پہر میں آسمانِ دنیا پر نزول:

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

((ینزل ربنا تبارك و تعالى كل ليلة إلى السماء الدنيا حين يبقى ثلث الليل الآخر يقول: من يدعونى فأستجيب له ، من يسألنى فأعطيه ، من يستغفرنى فأغفر له))

''ہمارا رب تبارک و تعالیٰ ہر رات اس وقت آسمان دنیا پر اترتا ہے جب اس کا آخری تیسرا پہر باقی رہ جاتا

Marfat.com

ہے وہ فرماتا ہے: کون مجھے پکارتا ہے کہ میں اس کی پکار کا جواب دوں، کون مجھ سے مانگتا ہے کہ میں اس کو عطا کروں اور کون مجھ سے مغفرت کا طالب ہے کہ میں اس کی مغفرت کروں۔'' ❶

یہ حدیث واحد ہے۔ نبی کریم ﷺ کے قول، فعل اور تقریر کے لیے جامع لفظ حدیث یا سنت ہے، میں نے اس کتاب میں حدیث یا سنت کو ''خبر'' کہنے سے حتی الامکان احتراز کیا ہے اور مناسب مقام پر اس کا سبب بھی بیان کر چکا ہوں۔

اللہ تعالیٰ کی ذاتی اور فعلی صفات:

۱۔ اللہ تعالیٰ کی ذاتی صفات سے اس کی ایسی صفات مراد ہیں جن سے وہ ہمیشہ سے موصوف ہے۔

اللہ تعالیٰ کی ان ذاتی صفات کی دو قسمیں ہیں؛ معنوی اور خبری۔

اس کی معنوی صفات میں حیات، علم، قدرت اور حکمت وغیرہ داخل ہیں، اور خبری صفات میں اس کے لیے ہاتھ، چہرہ اور آنکھیں وغیرہ داخل ہیں ان کو خبری صفات اس وجہ سے کہتے ہیں کہ ان کا علم ہمیں اللہ و رسول کے خبر دینے سے ہوا ہے۔

۲۔ اللہ تعالیٰ کی فعلی صفات وہ ہیں جو اس کی مشیت سے متعلق ہیں، ان میں سے کچھ کا سبب تو معلوم ہے، جیسے رضا، -رضامندی-، سَخَط -ناراضگی-، غضب -غضب ناکی- وغیرہ۔ جن آیات میں یہ صفات بیان ہوئی ہیں ان میں ان کے اسباب بھی بیان کر دیے گئے۔

(ملاحظہ ہو سورۂ زمر: ۷، سورۂ بقرہ: ۶۱، اور سورۂ آل عمران: ۱۶۲)

اور کچھ فعلی صفات ایسی ہیں جن کا سبب معلوم نہیں، جیسے اللہ تعالیٰ کا ہر رات میں آسمانِ دنیا پر اترنا۔

اللہ کی اس صفت کا ذکر قرآن میں نہیں آیا ہے، صرف حدیث میں آیا ہے اور یہ حدیث، حدیث واحد ہے اور اس میں جو خبر دی گئی ہے وہ ہمارے عقیدے سے متعلق ہے اس سے دو باتیں معلوم ہوئیں: (۱) حدیث واحد سے قرآن پر اضافہ شرعی حیثیت رکھتا ہے۔ (۲) حدیث واحد سے بھی عقیدہ ثابت ہوتا ہے۔

ہر رات اللہ تعالیٰ کے آسمانِ دنیا پر نزول کا عقیدہ اپنے حکم میں قرآن میں بیان کردہ عقائد کے مانند ہے؛ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کی اطاعت کو عین اپنی اطاعت قرار دیا ہے۔ (النساء: ۸۰) اور رسول اللہ ﷺ کی طرف سے ملنے والے ہر امر دینی کی تعمیل کا حکم دیا ہے۔ (الحشر: ۷)

رات کے تیسرے پہر میں اللہ تعالیٰ کے آسمان دنیا پر اترنے کی خبر کا انکار قرآن کا انکار ہے، کیونکہ آپ کی اطاعت اور آپ کی دی ہوئی خبر کی تصدیق قرآنی ہے۔

❶ بخاری ۱۱۴۵، مسلم ۷۵۸-۱۶۸

Marfat.com

اللہ تعالیٰ کی فعلی صفات کا ذکر قرآن میں بھی آیا ہے:

جس طرح قرآن پاک سے اللہ تعالیٰ کا رضا، عدم رضا، حب اور کرہ وغیرہ کی فعلی صفات سے موصوف ہونا ثابت ہے، اسی طرح اس کا، حر کی فعلی صفات سے موصوف ہونا بھی ثابت ہے؛ پہلے کی مثال میں قرآن پاک کی ان آیتوں کو پیش کیا جا سکتا ہے:

۱:.... ﴿رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ﴾ (المائدة: ۱۱۹)

''اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ ان سے راضی ہوئے۔''

۲:.... ﴿اِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِیٌّ عَنْكُمْ وَلَا یَرْضٰى لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ وَاِنْ تَشْكُرُوْا یَرْضَهُ لَكُمْ﴾ (الزمر: ۷)

''اگر تم کفر کرو تو درحقیقت اللہ تم سے بے نیاز ہے اور اپنے بندوں کے لیے کفر کو پسند نہیں کرتا اور اگر تم شکر کرو تو وہ اسے تمہارے لیے پسند کرتا ہے۔''

۳:.... ﴿وَ اَحْسِنُوْا اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ٥﴾ (البقرة: ۱۹۵)

''اور احسان کرو درحقیقت اللہ احسان کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔''

اس آیت میں اللہ کے بندوں کے ساتھ نیکی اور حسن سلوک کا حکم دیا گیا ہے اور یہ وہ احسان نہیں ہے جو اللہ کی عبادت سے متعلق ہے اور جس کا ذکر حدیث جبریل میں آیا ہے۔

۴:.... ﴿وَّلٰكِنْ كَرِهَ اللّٰهُ انْۢبِعَاثَهُمْ فَثَبَّطَهُمْ﴾ (التوبة: ۴۶)

''اور لیکن اللہ نے ان کا اٹھنا ناپسند کیا تو انہیں روک دیا۔''

۵:.... ﴿تَرٰى كَثِیْرًا مِّنْهُمْ یَتَوَلَّوْنَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لَبِئْسَ مَا قَدَّمَتْ لَهُمْ اَنْفُسُهُمْ اَنْ سَخِطَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ﴾ (المائدة: ۸۰)

''تو ان میں سے بہتوں کو دیکھتا ہے کہ انہوں نے ان سے دوستی کر رکھی ہے، جنہوں نے کفر کیا ہے، یقیناً بہت برا ہے وہ جو ان کے نفسوں نے آگے بھیجا ہے کہ اللہ ان پر غضب ناک ہو گیا۔''

=:.... ﴿اَفَمَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَ اللّٰهِ كَمَنْۢ بَآءَ بِسَخَطٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ مَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ وَ بِئْسَ الْمَصِیْرُ٥﴾ (آل عمران: ۱۶۲)

''تو کیا جس نے اللہ کی رضا کی پیروی کی اس کی مانند ہے جو اللہ کی ناراضگی کا مستحق ٹھہرا۔''

ان آیتوں میں اللہ تعالیٰ کی وہ فعلی صفات بیان ہوئی ہیں جن کے اسباب بھی بیان کر دیے گئے ہیں۔ مگر قرآن میں مذکورہ ہونے کے باوجود معتزلہ، جہمیہ اور متکلمین -اشعریہ اور ماتریدیہ- ان میں سے بعض کا انکار کرتے ہیں اور بعض کو

Marfat.com

تاویل کر کے مانتے ہیں؛ مثلاً: اللہ تعالیٰ کی رضا سے ثواب اور سخط سے انتقام یا ارادۂ انتقام مراد لیتے ہیں اور بندوں سے اللہ تعالیٰ کی محبت کا اس دعویٰ میں انکار کرتے ہیں کہ محبت ہم جنسوں کے درمیان ہوتی ہے، لہٰذا اللہ، جو خالق ہے اور بندوں، جو مخلوق ہیں کے درمیان محبت عقلاً ناممکن ہے۔

لیکن ہم ان کو جواب دیتے ہوئے عرض گزار ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب میں جو الفاظ آئے ہیں، چاہے وہ اللہ تعالیٰ کے اسماء اور اسمائے صفات سے متعلق ہوں یا عام امور سے متعلق وہ اپنے معنی، مفہوم اور مدلول میں بالکل واضح ہیں اور اس میں جہاں، رضا، سخت اور کرہ وغیرہ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں وہیں ثواب وعقاب اور انتقام وغیرہ کے الفاظ بھی استعمال ہوئے اب اگر جیسا کہ تمہارا دعویٰ ہے کہ رضا سے مراد ثواب ہے اور سخط سے مراد انتقام ہے تو پھر اللہ تعالیٰ نے براہ راست یہی الفاظ کیوں نہ استعمال فرمائے؟

رہے وہ لوگ جو اللہ تعالیٰ کی تمام فعلی صفات کے منکر ہیں اور دعویٰ کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نہ راضی ہوتا ہے، نہ غضب ناک ہوتا ہے اور نہ ناراض ہوتا ہے اور نہ محبت کرتا ہے اور نہ ناپسند کرتا ہے، اور ان کا دعویٰ ہے کہ رضا، ناراضگی، محبت اور کراہیت وغیرہ حادث ہیں اور جو چیز حادث ہو وہ صرف حادث کی صفت بن سکتی ہے اور اس کا صدور صرف حادث ہی سے ہوسکتا ہے۔ ازلی ذات کی صفت نہیں بن سکتی اور اس کا صدور ''ازلی'' سے نہیں ہوسکتا ہے۔ تو اس مغالطہ کا پہلا جواب تو یہ ہے کہ:

۱۔ تمہاری یہ بات نص کے خلاف ہے اور جو بات نص کے خلاف ہو وہ باطل اور مسترد ہے۔

۲۔ متکلمین میں اشاعرہ اللہ تعالیٰ کی سات صفات کے قائل ہیں: حیات، علم، قدرت، ارادہ، سمع، بصر اور کلام، اور ماتریدی مذکورہ صفات کے ساتھ آٹھویں صفت: تکوین کے بھی قائل ہیں۔ اب اگر صفات میں تعدد سے موصوف میں تعدد لازم آتا ہے تو نعوذ باللہ ان کے عقیدے کی رو سے اللہ رب العالمین کی صفت ''احدیث'' کا ان کا عقیدہ صحیح نہیں ہے، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات کی طرح اپنی صفات میں بھی ایک اور یکتا ہے اور خلق، معلوم اور مسموع وغیرہ میں تعدد اور تجدد کے باوجود وہ ازل سے زندہ ہے، خالق ہے، عالم ہے، سمیع ہے اور بصیر ہے، اور فعلی صفات سے بھی موصوف ہے، مگر اس کی یہ صفات اس کی مشیئت سے جڑی ہوئی ہیں۔

رہے وہ جو اللہ تعالیٰ کی کسی بھی صفت کے قائل نہیں ہیں تو ان کے ''الٰہ'' کا کوئی وجود نہیں ہے، جیسا کہ میں اس کو مناسب موقع پر بیان کر چکا ہوں۔

۳۔ اللہ تعالیٰ کی فعلی صفات کے منکرین کا دعویٰ ہے کہ ان سے اللہ تعالیٰ کو موصوف ماننے میں اس کے لیے نقص اور عیب لازم آتا ہے جو اس کی صفت کمال کے منافی ہے، کیونکہ یہ صفات حادث ہیں۔ ان کے اس مغالطہ کا جواب ہے کہ فعل کے حادث ہونے سے فاعل کا حادیث ہونا لازم نہیں آتا۔ مثال کے طور پر اللہ تعالیٰ ازل سے خالق ہے،

Marfat.com

لیکن مخلوق حادث ہے اس کو ایک مثال سے سمجھئے: اللہ تعالیٰ نے ہم سب کے اندر سننے اور دیکھنے کی جو قدرت پہلے دن پیدا کر دی ہے وہ ایک ہے، لیکن جو چیزیں ہم دیکھتے ہیں اور جو آوازیں ہم سنتے ہیں ان کا سلسلہ جاری رہتا ہے اس سے ہماری یہ صفات متاثر نہیں ہوتیں اور نہ ان کے تعدد سے ہماری ان صفات میں تعدد پیدا ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی حرکی فعلی صفات قرآن میں:

متکلمین اشاعرہ اور ماتریدیہ نے اللہ تعالیٰ کے ہر رات کے تیسرے پہر میں آسمان دنیا پر نزول کی خبر کا تو انکار کر دیا ہے، کیونکہ یہ خبر ''حدیث واحد'' میں دی گئی ہے اور ''احادیث آحاد'' سے ان کے نزدیک عقیدہ ثابت نہیں ہوتا۔ مگر خود قرآن پاک میں بھی اللہ تعالیٰ کے لیے مجیٔ اور ''اتیان'' یعنی آنے کے افعال استعمال ہوئے ہیں، چونکہ وہ قرآن کا انکار نہیں کر سکتے، اس لیے انہوں نے ان کی تاویل کی ہے ان کا دعویٰ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف منتقلی اور حرکت وغیرہ کی نسبت کرنا جائز نہیں ہے اسی مناسبت سے میں نے ''حرکی فعلی صفات'' کی تعبیر اختیار کی ہے۔ میں پہلے وہ آیتیں نقل کروں گا، پھر ان کی بکواس کا جواب دوں گا۔

﴿هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ وَ قُضِيَ الْاَمْرُ وَ اِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ﴾ (البقرة: ۲۱۰)

''یہ لوگ صرف یہ انتظار کر رہے ہیں کہ اللہ ان کے پاس بادلوں کے سائبانوں کے ساتھ آ جائے اور فرشتے۔''

اس آیت مبارکہ میں ''یَاْتِی'' کا فاعل اللہ تعالیٰ ہے اور فعل اپنے حقیقی معنی ہی میں ہے اور اس سے اس کا آنا ہی مراد ہے اور جن لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ ''قرآن پاک میں اس طرح کے الفاظ کو ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے، حرکت کرنے اور زوال کے معنی پر محمول کرنا جائز نہیں ہے، کیونکہ یہ بدن اور جسم کی صفت ہے۔ ❶

تو یہ قرآن کی تاویل کے نام سے تحریف ہے، قرطبی نے "یــأتــي" کے حقیقی معنی کو اللہ کے حق میں ناقابل قبول بنانے کے لیے اس میں ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونے اور زائل ہونے کا جو مفہوم شامل کر دیا ہے اور پھر اس کو جسم کی صفت قرار دیا ہے تو اس طرح انہوں نے متکلمین کے افکار کی ترجمانی کی ہے اور عبدالماجد دریا آبادی نے جو یہ فرمایا ہے کہ عقائد کا یہ اصول اور مسلم مسئلہ ہے کہ ذات باری کے لیے نہ محل ہے نہ ظرف، اس لیے اسلامی عقیدہ کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ کے لیے آنے یا جانے کے لیے کوئی معنی ہی نہیں۔ ❷

تو یہ رازی کا عقیدہ ہے جو ان کے نزدیک امام المفسرین گزرے ہیں ورنہ حقیقت میں رازی ''امام المحرفین'' تھے دریا آبادی کو رازی کے بجائے اپنے پیرومرشد تھانوی کی تفسیر کو حجت ماننا چاہیے تھا جو یہ فرما گئے ہیں: اللہ تعالیٰ کے لیے

❶ قرطبی ص ۲۲ ج ۲ ❷ ص ۳۹۴-۳۹۵ ج ۱

Marfat.com

آنا وغیرہ جہاں مذکور ہے اس کی حقیقت کے درپے ہونا جائز نہیں، کیونکہ جس طرح اس کی ذات کی حقیقت کسی کو مدرک نہیں ہوتی ہے اسی طرح اس کی صفات وافعال کی کنہ معلوم نہیں ہوسکی ہے، البتہ وجود اور وقوع پر اجمالا بلاتعیین کیفیت ایمان لے آنا چاہیے کہ اس سے زیادہ فکر میں پڑنا مالا یطاق کا قصد کرنا ہے۔ ❶

یہ قول اقرب الی الصواب ہے۔

اس آیت کی تفسیر میں شیخ محمد متولی شعراوی رحمہ اللہ نے جو کچھ فرمایا ہے وہ سونے کے پانی سے لکھے جانے کے قابل ہے، فرماتے ہیں:

جب اللہ سبحانہ وتعالیٰ قرآن میں ایسی کوئی مثال دے جسے ہم اس کی مخلوق کی صفت کے طور پر جانتے ہیں جیسے آنا، چہرہ اور ہاتھ وغیرہ تو اسے اسی طرح، لیکن "لیس کمثله شیء" کے دائرہ میں لے لو۔'' اللہ موجود ہے اور تم بھی موجود ہو، تو کیا تمہارا وجود اس کے وجود کی طرح ہے؟ نہیں۔

اللہ تعالیٰ زندہ ہے تم بھی زندہ ہو، تو کیا تمہاری زندگی اللہ کی زندگی کی طرح ہے؟ نہیں۔ اللہ تعالیٰ بھی سننے والا ہے اور تم بھی سننے والے ہو، تو کیا تمہارا سننا اللہ کے سننے کی طرح ہے؟ نہیں...

جو لوگ اللہ کے وجہ کی تفسیر ذات سے اور ید کی تفسیر قدرت سے کرتے ہیں ان سے ہم یہ کہتے ہیں: ان تفسیروں کی کیا ضرورت؟ اگر ہم ان کو اسی طرح لے لیں جس طرح اللہ نے فرمایا ہے اور ان کو ''اس کے مانند کوئی نہیں ہے'' کے دائرہ میں سمجھنے کی کوشش کریں، تو ہم غلطی سے بھی محفوظ رہیں گے، اس کو اس کی مخلوقات سے تشبیہ دینے سے بھی محفوظ رہیں گے اور اس کے کسی ارشاد کو اس کے حقیقی مفہوم سے عاری کرنے کے مرتکب بھی نہیں ہوں گے۔ ❷

میں نے آیت میں "فی" کا ترجمہ: ساتھ، کیا ہے تو فی کا یہ ترجمہ بھی حقیقی ہے اور جس طرح فی ظرفیت - میں - کے معنیٰ میں مستعمل ہے اسی طرح مصاحبت - ساتھ - کے معنیٰ میں بھی مستعمل ہے۔ خود قرآن پاک میں بھی اسی معنیٰ میں استعمال ہوا ہے:

﴿قَالَ ادْخُلُوْا فِیْٓ اُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ مِّنَ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ فِی النَّارِ﴾ (الاعراف: ۳۸)

''فرمائے گا تم سے پہلے جنوں اور انسانوں میں سے جو لوگ گزر چکے ہیں ان کے ساتھ آگ میں داخل ہو جاؤ۔''

سورۂ بقرہ کی زیر بحث آیت میں "فـــی" کو ظرفیت - میں - کے معنیٰ میں اس لیے نہیں لیا جا سکتا کہ اس طرح اللہ تعالیٰ "ظـلـل" - سائبانوں - میں گھر جائے گا اور اللہ تعالیٰ کی شان اس سے اعلیٰ اور ارفع ہے کہ اس کی مخلوقات میں سے کوئی اس کو اپنے احاطہ میں لے۔

سورۂ بقرہ کی آیت میں اللہ تعالیٰ کے لیے فعل "یـأتی" آیا ہے اور سورۂ فجر میں "جـاء" اور اتیـان اور مـجیٔ

❶ بیان القرآن ص ٦٦ ❷ ص ۸۹۰ ج ۲

Marfat.com

دونوں ہم معنیٰ ہیں۔ ارشاد الٰہی ہے:

﴿وَجَآءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّاۚ﴾ (الفجر: ۲۲)

''اور تمہارا رب آئے گا اور فرشتے صف درصف۔''

یہاں بھی فعل ''جاء'' اپنے حقیقی معنی میں ہے اور جن لوگوں نے ''ربك'' سے پہلے امر قضاء کو مضاف مانا ہے یا ''جاء'' کا مطلب ''جلوہ فرمانا'' لیا ہے انہوں نے دراصل متکلمین کی ترجمانی کی ہے۔ اگر یأتی اور جاء سے اللہ کے فیصلہ، یا حکم یا عذاب کا آنا مراد ہوتا یا اس کا مطلب اللہ کا تجلی فرمانا ہوتا تو اس کی صراحت کر دی جاتی جیسا کہ ''اَتیٰ امر اللہ'' اللہ کا حکم آ گیا اور:

﴿اَفَاَمِنَ اَهْلُ الْقُرٰٓى اَنْ يَّاْتِيَهُمْ بَاْسُنَا﴾ (الاعراف: ۹۷)

''کیا بستیوں والے اپنے اوپر ہمارا عذاب آنے سے بے خوف ہو گئے۔''

اور:

﴿فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ﴾ (الاعراف: ۱۴۳)

''پس جب اس کا رب پہاڑ کے لیے جلوہ افروز ہوا'' میں صراحت ہے۔

لزوم ما لا يلزم:

متکلمین کا یہ دعویٰ ہے کہ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کے لیے ہاتھ، چہرہ، آنکھ اور یأتی اور جاء وغیرہ کی جو تعبیریں آئی ہیں اور حدیث میں اس کی نسبت سے جو ینزل فرمایا گیا ہے، اسی طرح قرآن میں اس کے لیے عرش پر قرار پکڑنے اور رونق افروز ہونے -استوی علی العرش- کی جو خبر دی گئی ہے یہ سب اپنے حقیقی معنیٰ میں نہیں، بلکہ مجازی معنیٰ میں ہیں، اس لیے کہ ان کے حقیقی معنیٰ مراد لینے سے یہ لازم آتا ہے کہ مخلوق کی طرح اللہ کا بھی جسم ہے، جس کے اعضا ہیں، مخلوق کی طرح وہ بھی نقل مکانی کرتا ہے اور مخلوق کی طرح کسی خاص جگہ، یا سمت میں اپنا وجود رکھتا ہے وغیرہ، لہٰذا اللہ تعالیٰ کو ان نقائص اور عیوب سے پاک کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ان الفاظ کے حقیقی معنیٰ نہ مراد لیے جائیں، مجازی معنیٰ مراد لیے جائیں، مثلاً اللہ کے ہاتھ سے مراد اس کی قدرت، اس کے چہرے سے اس کی ذات، اس کی آنکھ سے اس کی عنایت و توجہ، اس کے آنے سے اس کے فیصلے کے آنے اور اس کے نزول سے اس کی رحمتوں اور برکتوں کے نزول کے معنی مراد لیے جائیں۔

متکلمین کے ان دعووں کا مختصر جواب تو یہ ہے کہ، اولاً: ہر زبان کے الفاظ حقیقت ہی کی تعبیر کے لیے وضع کیے گئے ہیں مجاز کی تعبیر کے لیے نہیں۔ ثانیاً اللہ تعالیٰ نے اپنی صفت کے طور پر جو الفاظ استعمال کیے ہیں اگر ان کے حقیقی معنیٰ مراد لینے سے مخلوق سے اس کی تشبیہ لازم آتی تو اللہ تعالیٰ نے ان کو استعمال کرنے کے بجائے وہ الفاظ استعمال کیے ہوتے جو تم اپنے

Marfat.com

زعم باطل میں اس کی تنزیہ اور پاکی بیان کرنے کی غرض سے قرآنی الفاظ کی جگہ استعمال کرتے ہو۔ ثالثاً: تمہارا یہ دعویٰ کہ ان الفاظ کو حقیقی معنوں میں لینے سے مخلوق سے اللہ کی تشبیہ لازم آتی ہے اور اس سے اس کے لیے جسم، جگہ اور سمت و جہت وغیرہ لازم آتی ہے لزوم مالا یلزم کے قبیل سے ہے ورنہ عالم واقعہ میں اس کا کوئی وجود نہیں ہے۔ اب آیئے تفصیل کی طرف:

۱۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب عزیز میں اپنے لیے نہ جسم کا اثبات کیا ہے اور نہ نفی کی ہے لہٰذا اس کے لیے جسم کا اثبات اور اس سے جسم کی نفی دونوں غیر قرآنی ہیں، اور اگر بالفرض اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت کی تعبیروں سے حقیقی معنی مراد لینے سے ایسا کچھ لازم آتا ہے جو عقل پرستوں کے نزدیک اللہ تعالیٰ کے حق میں درست نہیں ہے تو ہم ان سے کہیں گے کہ مُوتُوا بِغَيْظِكُمْ... ''اپنے غصے میں مرمٹو'' ہم تو کلام اللہ اور کلام الرسول کا وہی مطلب لیں گے جس پر اس کے الفاظ دلالت کرتے ہیں۔

اب اگر تم یہ کہتے ہو کہ اللہ تعالیٰ ایسی ذات نہیں رکھتا جس کی وہ صفات ہوں جو قرآن اور حدیث میں بیان کی گئی ہیں تو تمہارا یہ قول باطل، مردود اور غیر قرآنی ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کا چہرہ بھی ہے، اس کے ہاتھ بھی ہیں، آنکھیں بھی ہیں اور پاؤں بھی ہیں۔

۲۔ اگر تمہارا دعویٰ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لیے چہرہ، ہاتھ، آنکھیں اور پاؤں ماننے کی صورت میں اس کے لیے جسم ماننا پڑتا ہے، تو ہم تم سے پوچھیں گے کہ جسم سے تمہاری کیا مراد ہے؟ اگر جسم سے تمہاری مراد ایسا جسم ہے جو ہڈیوں، گوشت اور خون وغیرہ سے مرکب ہے اور ہاتھ، اور پاؤں وغیرہ اس کے ایسے اعضاء ہیں جیسے ہمارے جسم کے اعضاء ہیں جو ہمارے جسموں سے جدا بھی ہو سکتے ہیں تو ہم کہیں گے کہ اللہ کے حق میں ایسا تصور بھی کفر ہے، بلاشبہ اللہ تعالیٰ کا چہرہ، اس کی آنکھیں ہیں، اس کے ہاتھ اور پاؤں بھی ہیں جو اس کی لازمی اور ازلی اور ابدی صفات ہیں جو اس سے جدا نہیں ہو سکتیں، اور اپنے حقیقی معنوں میں ہی ہیں، مگر مخلوق کے اعضاء کے مانند نہیں۔ ليس كمثله شيء.

۳۔ اگر تمہارا دعویٰ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے عرش پر ہونے، اس کے آنے اور اس کے نزول کو حقیقت پر محمول کرنے سے اس کے لیے حد، جہت اور جگہ وغیرہ لازم آتی ہے تو ہم تم سے پوچھیں گے کہ ان الفاظ سے تمہاری مراد کیا ہے؟ اگر تمہاری مراد یہ ہے کہ عرش اللہ تعالیٰ کو گھیرے ہوئے ہے اور اللہ تعالیٰ سب سے اوپر اور سب سے بلند ہے'' کا مطلب یہ ہے کہ ''وہ کسی خاص جگہ محصور ہے'' تو یہ سب باطل ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ ہر شے کو محیط ہے اور کوئی چیز اس کو محیط نہیں ہے وہ عرش اور غیر عرش سے بھی عظیم اور بڑا ہے، اس کی کرسی جو اس کے عرش کے مقابلے میں بہت چھوٹی ہے، آسمانوں اور زمین کو سموئے ہوئے ہے، تو پھر اس کا عرش کتنا بڑا ہوگا۔

لیکن اگر حد اور جہت وغیرہ سے تمہاری مراد ایسی حد، یا ایسی جہت یا سمت ہے جس سے انسان واقف ہیں تو اس

Marfat.com

طرح کی حدوں اور سمتوں سے اس کی تنزیہ لازمی اور فرض ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يُحِيطُونَ بِهِ عِلْمًا﴾ (طٰہٰ: ۱۱۰)

''وہ جانتا ہے جو ان کے آگے ہے اور جو ان کے پیچھے ہے اور وہ علم سے اس کا احاطہ نہیں کر سکتے۔''

لیکن جس طرح ہم اللہ تعالیٰ کے لیے ہاتھ اور پاؤں وغیرہ کی ذاتی صفات کے قائل ہیں اور ان کو ان کے حقیقی معنوں میں لیتے اور ان سے اللہ تعالیٰ کو موصوف مانتے ہیں اور یہ بھی کہتے ہیں کہ ان کی کیفیت کا علم صرف اسی کو ہے، اسی طرح اس کے لیے وہ حد اور جہت اور سمت بھی مانتے ہیں جس طرح اس نے خود اپنے لیے ان کا اثبات کیا ہے اس لیے کہ اس بات پر ہمارا گہرا اور غیر متزلزل ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی تعریف کرنا جانتا ہے اور اس نے اپنی جو صفات بیان فرمائی ہیں وہی حق ہیں اور انہیں معنوں میں ہیں جو ان کے ظاہری الفاظ سے معلوم ہوتے ہیں اور انسانوں کی بنائی حدوں اور جہتوں سے اس کے منزہ اور پاک ہونے کے یہ معنیٰ قطعاً نہیں ہیں کہ وہ عرش پر موجود اور رونق افروز بھی نہیں اور ساری مخلوقات سے بلند بھی نہیں ہے، البتہ اس کے ساتھ ہم یہ بھی کہتے ہیں کہ اس کی کسی بھی صفت کی کیفیت اور حقیقت ہمیں معلوم نہیں، اور عرش پر اس کا ہونا اور تمام مخلوق سے بلند ہونا بھی اس کی صفت ہے۔

اب میں اللہ تعالیٰ کی صفات سے متعلق لوگوں میں پھیلی ہوئی اور گشت کرنے والی زبان زد بعض اصطلاحوں کا صحیح تعارف کرا دینا چاہتا ہوں تاکہ یہ واضح کر سکوں کہ اس مسئلہ میں صحیح اور درست نقطۂ نظر کیا ہے اور غلط کیا ہے؟ اس مسئلہ میں بھی ہمارا تمام تر اعتماد قرآن اور حدیث اور انہیں سے مستنبط ہونے والے احکام پر ہوگا۔

متکلمین اہل سنت و جماعت نہیں ہیں:

اہل سنت و جماعت سے مراد وہ لوگ ہیں جو رسول اللہ ﷺ کے طریقے اور آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم کے طریقے پر ہیں اور اس سے سر مو انحراف نہیں کرتے، اسی طریقے پر تمام ائمہ حدیث اور تمام متقدمین ائمہ فقہ اور وہ لوگ بھی ہیں جن کا لقب اور پہچان اہل حدیث ہے یہ لوگ اس مسئلہ میں بے مثال اتفاق رکھتے ہیں دوسری صدی ہجری سے مسلمانوں میں جو فرقے پیدا ہوئے ان میں سے کوئی ایک فرقہ بھی عقائد اسلام اور اصول اسلام میں متفق الخیال نہیں رہا ہے؛ خوارج، معتزلہ، شیعہ اور متکلمین مسلمانوں میں شمار ہونے والے سب سے بڑے فرقے ہیں، جن کا حال یہ ہے کہ ان میں سے کسی بھی فرقہ کے افراد کے درمیان ''عقائد'' کے بارے میں کبھی بھی اتفاق نہیں رہا ہے، جس کی وجہ یہ ہے کہ کتاب و سنت کی تعلیمات پر ایمان و عمل کے بجائے رائے اور قیاس پر ان کا اعتماد زیادہ رہا ہے۔

لیکن اہل سنت و جماعت کے درمیان صحابۂ کرام کے دور سے آج تک عقائد کے باب میں کبھی بھی کوئی اختلاف نہیں ہوا جس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ ہمیشہ سے ہر آمیزش اور ملاوٹ سے پاک خالص اسلامی تعلیمات کے پیرو رہے ہیں اور جو لوگ ان تعلیمات سے منحرف یا دور ہوئے بھی تو یا تو عقائد سے اپنی لاعلمی کی وجہ سے یا عملی کوتاہی کی وجہ سے

Marfat.com

لیکن کتاب وسنت سے باہر کی کسی چیز کو بھی عقائد واعمال کا ماخذ نہیں بنایا۔

موجودہ دور میں عربوں میں عموماً اور برصغیر میں خصوصاً فقہ کے چاروں مسلکوں سے وابستہ مسلمانوں کی اکثریت یا تو حنفی ہے یا شافعی، برصغیر میں احناف کی اکثریت ہے، عربوں میں مسلمانوں کی اکثریت عقائد میں متکلمین اشاعرہ کی پیرو ہے اور برصغیر کے مسلمانوں کی اکثریت متکلمین ماتریدیہ کی پیرو، اور متکلمین، چاہے وہ اشاعرہ ہوں یا ماتریدی، ان کا شمار اہل سنت و جماعت میں نہیں ہوتا۔ عقائد کے باب میں یہ احادیث آحاد کو نہیں مانتے اور صفات باری تعالیٰ سے متعلقہ تمام آیتوں میں تاویل کے قائل ہیں۔

لہٰذا برصغیر کے مفسرین، فقہاء، ارباب تصوف اور دوسرے مصنفین کی کتابوں میں جہاں بھی اسلاف، یا اہل سنت و جماعت کے الفاظ ملیں اور ان کے حوالہ سے کوئی عقیدہ بیان کیا گیا ہو تو اس کو آنکھیں بند کر کے اہل کلام یا متکلمین کا عقیدہ سمجھنا چاہیے، سوائے ان مصنفین کے جن کا تعلق جماعت اہل حدیث سے ہو، لیکن موجود وقت میں اس جماعت سے وابستگی رکھنے والے بہت سے مصنفین، خطباء اور ارباب فکر و دانش بھی صحیح اسلامی عقائد سے واقف نہیں رہے ہیں۔

مجھے یہ وضاحت اس لیے کرنی پڑی کہ اس کو سمجھے بغیر میری گفتگو سے خاطر خواہ استفادہ مشکل تھا، میں عقائد سے متعلقہ جن زبان زد اصطلاحوں کو بیان کرنے جا رہا ہوں وہ تمام تر شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ اور ان کے شاگرد امام ابن القیم (۲۲) کے افادات سے ماخوذ ہیں۔

ا۔ تفویض:

یہ فَوَّضَ یُفَوِّضُ کا مصدر ہے، جس کے معنیٰ حوالہ کرنا، سونپنا، سپرد کرنا اور کسی معاملہ کو اپنے تصرف سے نکال کر دوسرے کے تصرف میں دینا، ہیں قرآن پاک میں ہے:

﴿فَسَتَذْكُرُوْنَ مَا اَقُوْلُ لَكُمْ وَاُفَوِّضُ اَمْرِیْٓ اِلَى اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ﴾

(المؤمن: ٤٤)

"پس عنقریب تم وہ یاد کرو گے جو میں تم سے کہہ رہا ہوں اور میں اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کر رہا ہوں درحقیقت اللہ بندوں کو خوب اچھی طرح دیکھنے والا ہے۔"

تفویض کا لفظ اپنے لغوی معنی سے زیادہ ایک عقیدہ بن چکا ہے جس کو ہر طبقہ اور ہر مسلک سے وابستہ علماء بکثرت استعمال کرتے ہیں اور یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ یہی اسلاف کا مسلک ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں مذکور اللہ تعالیٰ کے لیے ہاتھ، چہرہ، آنکھ اور پاؤں وغیرہ کے بارے میں کہتے ہیں کہ ہم ان کے معنیٰ اللہ کے سپرد کرتے ہیں، جبکہ امر واقعہ یہ ہے کہ ان الفاظ کے معنیٰ معلوم و معروف ہیں، لیکن ان کی کیفیت اور صفت نامعلوم ہے اور یہی اسلاف کا مسلک ہے کہ وہ ان کے حقیقی معنیٰ مراد لیتے رہے ہیں اور ان کی کیفیت کے علم کو اللہ کے حوالہ اور سپرد کرتے رہے ہیں، لہٰذا یہ دعویٰ جھوٹ

Marfat.com

ہے؛ یہ اسلاف کا مسلک نہیں رہا ہے، امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((و اما التفویض: فإن من المعلوم أن الله تعالیٰ أمرنا أن نتدبر القرآن، و حضنا علی عقله و فهمه، فکیف یجوز مع ذلك أن یراد منا الإعراض عن فهمه و معرفته، و عقله؟))

''رہی تفویض: تو یہ بات معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ حکم دیا ہے کہ ہم قرآن میں تدبر کریں اور اس نے ہمیں اس کے سمجھنے اور ذہن نشین کرنے کی ترغیب دی ہے ایسی صورت میں یہ کیسے جائز ہوسکتا ہے کہ ہم سے قرآن کے فہم، اس کی معرفت اور اس کو ذہن نشین کرنے سے اعراض بھی مطلوب ہو؟''

آگے تحریر فرماتے ہیں:

((فتبین أن قول أهل التفویض الذین یزعمون أنهم متبعون للسنة و السلف من شر أقوال أهل البدع و الإلحاد))

''واضح ہوا کہ تفویض کا عقیدہ رکھنے والوں کا یہ قول، جو اس خود فریبی میں مبتلا ہیں کہ وہ سنت کے پیرو اور اسلاف کے طریقے پر گامزن ہیں مبتدعین اور ملحدین کے بدترین اقوال میں سے ایک ہے۔'' [1]

بلاشبہ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے صفات باری تعالیٰ کے معانی کی تفویض کرنے والوں پر جو حکم لگایا ہے وہ مبنی برحق ہے، اس قول پر غور کرنے سے یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ یہ قرآن کی تکذیب، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن سے ناواقف قرار دینے اور فلاسفہ کی غیر معمولی تصدیق سے عبارت ہے۔

تفویض کا یہ عقیدہ قرآن کی تکذیب اس لیے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿وَ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ﴾ (النحل: ۸۹)

''اور ہم نے تمہارے اوپر اس کتاب کو ہر چیز کا نہایت واضح بیان بنا کر نازل فرمایا ہے۔''

اور جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے معنی اور مفہوم ہی سے واقف نہیں تھے تو پھر یہ کتاب بیان کس طرح ہوئی؟ قرآن پاک میں ہر چیز سے زیادہ اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات کا ذکر ہے، اور اگر ہم ان اسماء و صفات کے معنی ہی نہیں جانتے، تو قرآن ہر چیز کا واضح بیان کیسے ہوا؟

متکلمین کا یہ دعویٰ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قرآن میں مذکور اسماء و صفات کے معنی نہیں جانتے تھے اور جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے معنی نہیں جانتے تھے تو دوسرے لوگ بدرجۂ اول نہیں جان سکتے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے بھیجے ہوئے رسول تھے اور آپ کو اس لیے بھیجا گیا تھا کہ آپ لوگوں کو اللہ کی توحید

[1] درء تعارض العقل والنقل: ص ۲۱۴، ۲۱۷ ج ۱۔

Marfat.com

بتائیں، لیکن آپ خود ہی اسماء وصفات کی آیات اور احادیث کے معنی نہیں جانتے تھے اور لوگوں سے ایسی باتیں فرماتے تھے جن کے مفہوم سے خود ناواقف تھے کیا رسول اللہ ﷺ کی اس سے بڑی کوئی ہتک ہوسکتی ہے؟ ❶

مذکورہ بالا وضاحتوں کا حاصل یہ ہے کہ قرآن پاک اور احادیث میں مذکور اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کے معنی معلوم ومعروف ہیں اور یہ سب اپنے حقیقی معنوں ہی میں ہیں مجازی معنوں میں نہیں، البتہ ان کی کیفیت اور حقیقت کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے، یہی ہمارے اسلاف کا عقیدہ تھا اور یہی اہل سنت و جماعت کا عقیدہ ہے، رہے اسماء وصفات کے باب میں تفویض کا عقیدہ رکھنے والے تو اسلام اور اہل سنت و جماعت سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے، اس باب میں امام مالک رحمہ اللہ کا قول بہت معروف ومتداول ہے اور اہل سنت و جماعت کے عقیدے کی ہر کتاب میں اس کا حوالہ دیا جاتا ہے۔ چنانچہ جب ان سے اللہ تعالیٰ کے ارشاد ﴿اَلرَّحۡمٰنُ عَلَی الۡعَرۡشِ اسۡتَوٰی﴾ ''رحمن عرش پر مستقر ہے'' (سورۂ طٰہٰ: ۵) کے بارے میں سوال کیا گیا تو فرمایا:

''استواء معلوم ہے، اس کی کیفیت نامعلوم ہے اور اس کے بارے میں کھوج کرید بدعت ہے۔''

امام بیہقی نے اسماء وصفات میں امام مالک کا جو قول صحیح سند سے نقل کیا ہے اس میں آیا ہے کہ ایک شخص ان کی خدمت میں آیا اور پوچھا: اے ابو عبداللہ! رحمن عرش پر بلند ہوا، اس بلند ہونے اور استقرار کی کیفیت کیا ہے؟ یہ سن کر امام مالک نے سر جھکا لیا، یہاں تک کہ ان کی پیشانی عرق آلود ہوگئی، پھر فرمایا: استواء نامعلوم نہیں، کیفیت غیر معقول۔ عقل کی رسائی سے باہر۔ ہے اس پر ایمان فرض ہے اور اس کے بارے میں سوال کرنا بدعت ہے اور میرے خیال میں تم بدعتی ہو، اور حکم دیا کہ اس کو ان کی مجلس سے نکال دیا جائے۔ ❷

یہی رائے امام مالک کے استاذ ربیعہ بن ابی عبدالرحمن کی بھی تھی۔ ❸

۲۔ تاویل:

اَوَّلَ یُؤَوِّلُ کا مصدر ہے، جس کے متعدد معنی آتے ہیں:

ا۔ تفسیر، اور حقیقت کا ادراک اور فہم

سورۂ آل عمران کی آیت نمبر ۷ میں اللہ تعالیٰ کے ارشاد: ﴿وَ مَا یَعۡلَمُ تَاۡوِیۡلَہٗۤ﴾ میں تاویل کے معنی تفسیر اور فہم کے بھی لیے جاسکتے ہیں اور کنہ اور حقیقت کے ادراک کے بھی، لیکن دونوں صورتوں میں آیت کی قراءت میں وصل اور وقف کا اختلاف ہوگا؛ جس کی تفصیل یہ ہے کہ اگر تاویل کے معنی تفسیر یا فہم کے لیے جائیں تو ﴿وَ مَا یَعۡلَمُ تَاۡوِیۡلَہٗۤ اِلَّا اللّٰہُ﴾ پر رکنے اور وقف کرنے کے بجائے ﴿وَ الرّٰسِخُوۡنَ فِی الۡعِلۡمِ﴾ کو لفظ ''جلالۃ'' اللہ تعالیٰ پر عطف کرکے دونوں کو ملا دیا جائے گا اس طرح قراءت یوں ہو جائے گی: ﴿وَ مَا یَعۡلَمُ تَاۡوِیۡلَہٗۤ اِلَّا اللّٰہُ وَ الرّٰسِخُوۡنَ فِی الۡعِلۡمِ﴾ اور

❶ شرح العقیدۃ الواسطیہ ص ۷۴-۷۵۔ ❷ ص ۳۰۶ ج ۲، نمبر ۸۶۷ ❸ فتاوی ابن تیمیہ ص ۳۶۵ ج ۵۔

Marfat.com

ترجمہ ہوگا: اس کے معنیٰ اور تفسیر صرف اللہ تعالیٰ اور علم میں گہرائی رکھنے والے ہی جانتے ہیں۔ اور اس کا مطلب یہ ہوگا کہ قرآن کی متشابہ آیات کے معنی صرف اللہ تعالیٰ کو معلوم ہیں یا ان کو جو علم میں رسوخ اور گہرائی رکھتے ہیں۔

یہ قراءت کرنے اور تاویل کے یہ معنیٰ لینے میں قواعدِ زبان اور عقیدہ دونوں اعتبار سے کوئی مانع نہیں ہے۔ اس لیے کہ اسلاف اور اہل سنت و جماعت کا اس امر پر اتفاق ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات کے معنیٰ معلوم اور معروف ہیں اور یہ وہی ہیں جو ان کے ظاہری الفاظ سے نکلتے اور متبادر ہوتے ہیں، البتہ ان اسماء اور صفات کی کنہ اور حقیقت کا ادراک اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں رکھتا۔

اور اگر تاویل سے مراد حقیقت کا ادراک ہو، تو اس صورت میں آیت کی تلاوت یوں ہو گی: ﴿وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ﴾ اور اس کی حقیقت صرف اللہ جانتا ہے اس تلاوت میں ﴿إِلَّا اللَّهُ﴾ پر وقف لازم ہوگا۔ اسلاف کی اکثریت اس دوسری تلاوت اور قراءت کے حق میں رہی ہے۔

اس صورت میں قواعد زبان کے اعتبار سے ﴿الرّٰسِخُوْنَ﴾ سے پہلے کا واو "عاطفہ" نہیں، بلکہ آغاز کلام کا واوَ ہوگا۔

اوپر آیت مبارکہ کی قراءت کی جو دونوں صورتیں بیان کی گئی ہیں، ان سے نہ تو پوری آیت کا عمومی مفہوم متاثر ہوگا، نہ بعد کے فقرہ کا سابق فقرہ سے ربط ٹوٹے گا اور نہ اسماء وصفات کے معنیٰ ومفہوم سے متعلق ہمارے صحیح اسلامی عقیدے پر کوئی برا اثر پڑے گا۔ بعد کا فقرہ ہے: ﴿يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا﴾ "وہ کہتے ہیں اس پر ہمارا ایمان ہے اور یہ سب کچھ ہمارے رب کے پاس سے ہے۔"

مطلب یہ ہے کہ جو لوگ علم میں راسخ اور گہرے ہیں وہ پوری صاف گوئی اور تردد سے پاک لب ولہجہ میں یہ اعلان کرتے ہیں کہ قرآن کی محکم اور متشابہ دونوں طرح کی آیتوں پر ان کا ایمان ہے اور وہ پورے یقین قلب کے ساتھ ان کو اللہ کا کلام مانتے ہیں۔

اب پوری آیت کا ترجمہ ملاحظہ فرمایئے جس میں دونوں قراءتوں کے فرق کی رعایت کی گئی ہے:

﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَ اُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَ ابْتِغَآءَ تَاْوِيْلِهٖ وَ مَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ وَ الرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا﴾ (آل عمران: ۷)

"وہی ہے جس نے تمہارے اوپر کتاب نازل کی ہے، جس کی کچھ آیتیں محکم -اپنے مفہوم، حکم اور خبر میں واضح- ہیں وہی اصل کتاب ہیں اور دوسری متشابہات -مفہوم میں واضح اور حکم میں غیر واضح- ہیں تو جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہے وہ فتنہ کی تلاش میں اس کے متشابہ کے پیچھے لگے رہتے ہیں اور اس کی حقیقت جاننا

Marfat.com

چاہتے ہیں، جبکہ اس کی حقیقت صرف اللہ -اور اس کی تفسیر علم میں گہرائی رکھنے والے جانتے ہیں- جانتا ہے، اور علم میں گہرائی رکھنے والے کہتے ہیں ہم اس پر ایمان لائے، سب کچھ ہمارے رب کے پاس سے ہے۔''

تاویل بمعنی تفسیر سورۂ یوسف کی آیت نمبر ۳۶ کے اس فقرہ میں بھی ہے: ''نبئنا بتأویله'' ہمیں اس کی تعبیر- تفسیر- بتا دیجیے۔

بعض مفسرین، مثلاً امام طبری جب یہ کہتے ہیں کہ ''اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی تاویل یہ ہے'' تو اس سے ان کی مراد تفسیر ہی ہوتی ہے۔

۳۔ نتیجہ اور انجام:

سورۂ اعراف میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿هَلْ يَنْظُرُونَ إِلَّا تَأْوِيلَهُ يَوْمَ يَأْتِي تَأْوِيلُهُ يَقُولُ الَّذِينَ نَسُوهُ مِنْ قَبْلُ قَدْ جَاءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ﴾ (الاعراف: ۵۳)

''یہ لوگ صرف اس کے انجام کا انتظار کر رہے ہیں، جس دن اس کا انجام آ جائے گا تو وہ لوگ، جنہوں نے اسے پہلے بھلائے رکھا تھا کہیں گے یقیناً ہمارے رب کے رسول حق لے کر آئے تھے۔''

قرآن پاک میں دوسرے مقام پر بھی تاویل انجام اور نتیجہ کے معنی میں آئی ہے۔

۴۔ تعمیل اور تنفیذ:

اگر تاویل کا تعلق امر اور نہی سے ہو تو اس سے مراد اس کی تعمیل اور تنفیذ ہے۔ سورۂ نصر میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ إِنَّهُ كَانَ تَوَّابًا﴾

''تم اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرو اور اس سے مغفرت طلب کرو یقیناً وہ بہت توبہ قبول کرنے والا ہے۔''

صحیح احادیث کے مطابق رسول اللہ ﷺ سورۂ نصر کے نزول کے بعد اپنے رکوع اور سجود میں ''سبحانك اللهم ربنا و بحمدك اللهم اغفرلی'' کہنے لگے تھے، چنانچہ مسروق ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہیں، وہ فرماتی ہیں:

إِذَا جَاءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ کے نازل ہونے کے بعد رسول اللہ ﷺ نے ایسی کوئی نماز نہیں پڑھی ہے جس میں آپ نے ''سبحانك اللهم ربنا و بحمدك اللهم اغفرلی'' نہ کہا ہو۔ [1]

ایک دوسری حدیث میں ام المومنین کے الفاظ ہیں:

[1] بخاری ۴۹۶۷، مسلم ۴۸۴۔

Marfat.com

((كان رسول الله ﷺ يكثر أن يقول فى ركوعه و سجوده: "سبحانك اللهم ربنا و بحمدك اللهم اغفرلى" يتأول القرآن))

"رسول اللہ ﷺ اپنے رکوع و سجدے میں کثرت سے سبحانك اللهم ربنا و بحمدك اللهم اغفرلى کہا کرتے تھے، قرآن کی تاویل فرماتے تھے۔" ❶

ام المومنین کے قول: "يتأول القرآن" کے معنیٰ ہیں: "يعمل بالقرآن" قرآن پر عمل کرتے تھے اور قرآن سے مراد سورۂ نصر کی آیت ﴿فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ﴾ ہے اس لیے کہ جس طرح سورۂ فاتحہ سے سورۂ ناس تک قرآن ہے اسی طرح قرآن کی ایک آیت بھی قرآن ہے۔

"يتأول القرآن" ام المومنین کا قول ہے جو زبان داں ہونے کے علاوہ رسول اللہ ﷺ کے ایک ایک عمل کا نہایت دقت نظر سے دیکھتی تھیں اور آپ کے اذکار کو سراپا گوش بن کر سنتی تھیں اور ان کی سیرت کا مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے رکوع میں "سبحان ربی العظيم" اور سجدے میں "سبحان ربی الاعلى" کے بجائے کثرت سے "سبحانك اللهم ربنا و بحمدك اللهم اغفرلى" سننے پر آپ سے اس کا سبب دریافت کیا ہو اور رسول اللہ ﷺ نے انہیں بتایا ہو کہ آپ اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں ایسا کر رہے ہیں اور پھر مسروق سے یہ واقعہ بیان کرتے ہوئے ام المومنین نے اس کے لیے نہایت دقیق تعبیر "يتأول القرآن" اختیار کی ہو۔

احادیث کے فحوی سے ایسے حقائق معلوم ہوتے ہیں، ان میں تمام باتوں کی تفصیلات نہیں مل سکتیں، ایسی باتیں حدیث کے راوی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی سیرت اور ان کے مزاج اور افتاد طبع سے واقفیت کی روشنی میں بھی معلوم کی جا سکتی ہیں، ام المومنین تو ام المومنین تھیں۔

۵۔ ظاہر لفظ سے متبادر معنیٰ کے علاوہ کوئی اور معنیٰ مراد لینا:

معتزلہ، متکلمین اور ان کے پیروکاروں کا تمام تر مدار عقل پر ہے، اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات سے متعلق وہ احادیث کو نہیں مانتے اور قرآن کی عقلی تاویلیں کرتے ہیں جن آیتوں میں اللہ تعالیٰ کی ذاتی، معنوی اور فعلی صفات بیان ہوئی ہیں، وہ ان کو ان کے ظاہری الفاظ سے متبادر ہونے والے معنوں میں نہیں لیتے، بلکہ اپنے خود ساختہ مجازی معنوں میں لیتے ہیں، مثلاً وہ "ید اللہ" سے اللہ کا ہاتھ مراد نہیں لیتے، کیونکہ اس سے ان کے زعم باطل میں اللہ تعالیٰ کے لیے جسم کا ہونا لازم آتا ہے، لہٰذا وہ "ید اللہ" سے اللہ کی قوت مراد لیتے ہیں، لیکن جب یہ اعتراض کیا گیا کہ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کے "دو ہاتھوں" کا بھی ذکر آیا ہے اور قوت، طاقت، قدرت وغیرہ کی تعداد نہیں ہوتی، چنانچہ سورۂ ص میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

❶ بخاری ۴۹۶۸، مسلم ۴۸۴

Marfat.com

﴿قَالَ يَاإِبْلِيسُ مَا مَنَعَكَ أَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ﴾ (ص: ۷۵)

''فرمایا، اے ابلیس! تجھے اس کا سجدہ کرنے سے کس چیز نے روکا جسے میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے تخلیق بخشی ہے۔''

تو اس اعتراض کا ان سے کوئی جواب نہیں بن پڑا، پھر بھی وہ تاویل سے باز نہیں آئے۔

ایک جملہ معترضہ:

یہاں جملہ معترضہ کے طور پر بعض مترجمین قرآن کی اس بھیانک اور فحش غلطی کی طرف اشارہ کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے جو ان سے ''اسجدوا لآدم'' آدم کو سجدہ کرو، یا ﴿أَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ﴾ تم اس کا سجدہ کرتے جس کو میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے پیدا کیا ہے'' کے ترجموں میں ہوئی ہے، بعض مترجمین نے آدم سے پہلے آنے والے ''لام'' کا ''لیے'' ترجمہ کیا ہے اور بعض نے کہیں ''لیے'' ترجمہ کیا ہے اور کہیں نہیں کیا ہے۔ جبکہ امر واقعہ یہ ہے کہ ''لام'' سجد یسجد کا لازمی ''صلہ'' ہے یہ لام مسجود پر داخل ہوتا ہے اور الگ سے اس کا کوئی مفہوم نہیں ہوتا، فعل ''سجد یسجد'' کا یہ لازمی صلہ ہے جس کے بغیر اس کا استعمال نہیں ہوتا۔ پھر ''لیے'' کے اضافے سے یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ فرشتوں کو یہ حکم نہیں دیا گیا تھا کہ وہ آدم کو سجدہ کریں، بلکہ آدم کے لیے سجدہ کریں، یعنی مسجود وہ نہیں تھے کوئی اور تھا وہ صرف سجدہ کی علت اور سبب تھے۔

مترجمین سے شاید یہ غلطی اس وجہ سے ہوئی کہ غیر اللہ کا سجدہ کرنا حرام ہے اور اللہ تعالیٰ نے غیر اللہ - آدم - کا سجدہ کرنے کا جو حکم دیا ہے وہ ان کا سجدہ نہیں، ان کے سبب اور علت سے کسی اور کا سجدہ کیا ہے، اور بعض لوگوں نے خود سجدہ ہی کی تاویل کر ڈالی ہے، لیکن ایسا کرنے والوں نے یہ نہیں سوچا کہ اللہ تعالیٰ اپنے امر و نہی اور قول و فعل میں کسی کے سامنے جواب دہ نہیں ہے:

﴿لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْئَلُونَ﴾ (الانبیاء: ۲۳)

''وہ جو کرتا ہے اس کے بارے میں اس سے سوال نہیں کیا جا سکتا اور وہ پوچھے جائیں گے۔''

دراصل فرشتوں کو اور ابلیس کو آدم علیہ السلام کا سجدہ کرنے کا حکم اللہ تعالیٰ نے دیا تھا اور وہ جو حکم چاہے دے اور جس چیز سے چاہے روکے یَفْعَلُ مَا یُرِیْدُ وَ یَفْعَلُ مَا یَشَآءُ۔

معلوم ہوا کہ غیر اللہ - آدم - کا سجدہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے تھا، لہٰذا عبادت تھا اور اس حکم کی تعمیل کر کے فرشتے مطیع قرار پائے اور اس سے اعراض کر کے ابلیس کافر اور نافرمان قرار پایا۔

اسی طرح کسی بے قصور اور معصوم انسان کو قتل کرنا حرام ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو جو یہ حکم دیا تھا کہ وہ اپنے بیٹے اسماعیل علیہ السلام کو ذبح کر دیں تو یہ ان کے حق میں عبادت تھا جس کی تعمیل ان پر فرض تھی اور انہوں نے اس حکم کی

Marfat.com

تعمیل کی بھی، مگر اللہ تعالیٰ نے ان کے بیٹے کو بچا لیا۔

معتزلہ، متکلمین اور جہمیہ نے سب سے زیادہ ''گند'' ''استوی علی العرش'' کی تاویل میں کی ہے اور جہمیہ کے امام رازی تو اس میدان میں بہت آگے نکل گئے ہیں اس کتاب میں ان کے بعض افکار کا جائزہ مفصل لے چکا ہو۔ یہاں میں ''استوی علی العرش'' سے متعلق ان گمراہ فرقوں کے دعووں کا جواب دوں گا۔

عرش:

عربی میں عرش سریر الملک -تختِ حکومت- کو کہتے ہیں۔ نزول قرآن کے وقت عربوں میں اس کے معنی معلوم و معروف تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ملکۂ سبا کے تخت حکومت کو عرش عظیم سے تعبیر کیا ہے ہدہد نے سبا سے واپسی کے بعد سلیمان علیہ السلام کو قوم سبا کی خبر دیتے ہوئے کہا تھا:

﴿إِنِّي وَجَدتُّ امْرَأَةً تَمْلِكُهُمْ وَأُوتِيَتْ مِن كُلِّ شَيْءٍ وَلَهَا عَرْشٌ عَظِيمٌ۝﴾ (النمل: ۲۳)

''درحقیقت میں نے ایک ایسی عورت کو ان پر حکومت کرتے ہوئے پایا جسے ہر چیز سے حصہ دیا گیا ہے اور اس کا تخت بہت عظیم الشان ہے۔''

یہ ہدہد کے اپنے تاثرات ہیں اور ''من کل شیء'' سے امور سلطنت سے متعلقہ اشیاء مراد ہیں، ورنہ اللہ تعالیٰ نے سلیمان علیہ السلام کو اس سے کہیں زیادہ اسباب طاقت وشوکت عطا فرما رکھے تھے۔

اسی سورت نمل کی آیت نمبر ۲۶ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے عرش کو بھی عظیم فرمایا ہے ارشاد ہے:

﴿اللَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ۝﴾ (النمل: ۲۶)

''اللہ وہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں عرش عظیم کا مالک۔''

اس طرح کی ترکیب میں ''رب'' صاحب کے معنی میں ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ کے عرش کے مقابلے میں ملکۂ سبا کے عرش کی کیا حیثیت، اس سے معلوم ہوا کہ ایک ہی صفت سے دو چیزوں کے موصوف ہونے سے دونوں کی صفتوں میں مماثلت اور مساوات ضروری نہیں۔

قرآن و حدیث میں عرش الٰہی کے بارے میں مزید کوئی تفصیل نہیں بیان ہوئی ہے۔ البتہ صحیح احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنے سے پچاس ہزار سال پہلے پانی اور عرش کی تخلیق فرما دی تھی، چنانچہ عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے مروی صحیح بخاری کی حدیث کے الفاظ ہیں:

((کان اللہ و لم یکن شیء قبله و کان عرشه علی الماء، ثم خلق السموات و الأرض و کتب فی الذکر کل شیء))

''اللہ تھا اور اس سے پہلے کوئی چیز نہیں تھی اور اس کا عرش پانی پر تھا، پھر اس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا[1]

Marfat.com

اور ذکر-لوح محفوظ- میں ہر چیز لکھی۔'' ❶

اور صحیح مسلم میں عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما سے جو حدیث مروی ہے اس کے الفاظ ہیں:

((کتب اللہ مقادیر الخلائق قبل أن یخلق السموات و الأرض بخمسین الف سنة ، قال: و عرشه علی الماء))

''اللہ نے مخلوقات کی تقدیریں آسمانوں اور زمین کی تخلیق سے پچاس ہزار سال پہلے لکھیں، آپ نے فرمایا: اور اس کا عرش پانی پر تھا۔'' ❷

استوی علی العرش:

قرآن پاک میں فعل استوی یستوی استواء تین طریقوں سے استعمال کیا گیا ہے؛ حرف جر کے بغیر اور حرف جر کے ساتھ، اور حرف جر کے ساتھ دو طریقوں سے استعمال ہوا ہے؛ (۱) حرف جر "إلی" کے ساتھ (۲) حرف جر "علی" کے ساتھ۔

حرف جر کے بغیر استوی یستوی کے معنیٰ ہیں: کامل ہونا، مکمل جوان ہونا سورۂ قصص میں موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَ لَمَّا بَلَغَ أَشُدَّهٗ وَ اسْتَوٰى﴾ (القصص : ١٤)

''اور جب وہ اپنی توانائی کو پہنچ گیا اور مکمل جوان ہو گیا۔''

حرف جر "إلی" کے ساتھ "استوی إلی" کے معنی ہیں: مکمل قصد کرنا، ارادہ کرنا، سورۂ بقرہ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا ثُمَّ اسْتَوٰۤى اِلَى السَّمَآءِ﴾ (البقرة : ٢٩)

''وہی ہے جس نے تمہارے لیے زمین کی ساری چیزیں پیدا کیں، پھر اس نے آسمان کا قصد کیا۔''

حرف جر "علی" کے ساتھ "استوی علی" کے معنی ہیں بلند ہونا اہل لغت نے اس "استوی" کے تین معنی لکھے ہیں: علا، ارتفع اور صعد بلند ہوا، اوپر ہوا۔ یعنی یہ تینوں الفاظ مترادف اور ہم معنی ہیں۔

قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کی صفت کے طور پر سات سورتوں میں استوی علی العرش کی تعبیر آئی ہے؛ (اعراف: ۵۴، یونس: ۳، رعد: ۲، طہٰ: ۵، فرقان: ۵۹، سجدہ: ۴، حدید: ۴)

ایک ہی اسلوب اور تعبیر میں اللہ تعالیٰ کی کسی صفت کے بیان میں یہ تکرار اس کی اہمیت پر دلالت کرنے کے ساتھ اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ اس کو اسی معنیٰ اور مفہوم میں لیا جائے جو اس کے الفاظ سے نکلتا ہے اور متبادر ہوتا ہے، کیونکہ اگر اس اسلوب بیان سے اللہ تعالیٰ کے عرش پر بلند ہونے کے علاوہ کچھ اور مراد لینا درست ہوتا تو اللہ تعالیٰ نے کسی

❶ بخاری: ۳۱۹۱، ۷۴۱۸ ❷ نمبر ۲۶۵۳

Marfat.com

ایک ہی جگہ اس کو کسی اور اسلوب میں بیان کر دیا ہوتا۔

متکلمین اور معتزلہ نے "استوی علی العرش" کی استولی علی العرش۔ -عرش پر قابض ہوا، غالب ہوا- سے جو تاویل کی ہے اس کے حق میں ان کے پاس اہل لغت اور کتب لغت سے کوئی دلیل نہیں ہے۔

رہی ان کی یہ دلیل کہ استوی علی العرش کے حقیقی معنی مراد لینے سے اللہ کے لیے جسم ہونا لازم آتا ہے، لہٰذا جسم سے اس کی تنزیہ کے لیے استوی کے معنی ''استولی'' لینا ضروری ہے، ان کی خام خیالی اور ان کی سطحیت کے علاوہ اللہ تعالیٰ پر یہ اعتراض ہے کہ وہ نعوذ باللہ اپنی صفات اور دوسرے احکام بیان کرنے پر قدرت نہیں رکھتا:

﴿كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ إِنْ يَقُولُونَ إِلَّا كَذِبًا﴾ (الكهف : ٥)

یہ ان کی دلیل کا پہلا جواب تھا۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ: قرآن و حدیث کے احکام کو عام طور پر اور ان میں مذکور اللہ تعالیٰ کی صفات کو خاص طور پر حقیقی معنوں میں لینے سے جو کچھ بھی لازم آتا ہے، جو نتیجہ بھی نکلتا ہے اور جو کچھ بھی ضروری قرار پاتا ہے صرف وہی حق ہے اور صرف اسی کو ماننا ہمارے اوپر فرض ہے، اس تناظر میں اگر معتزلہ، متکلمین اور ان کے ہم نواؤں کی نگاہوں کو اللہ تعالیٰ کے عرش پر بلند ہونے اور اس پر رونق افروز ہونے میں اس کا جسم نظر آتا ہے تو آیا کرے، شریعت میں ان کی بیمار نگاہوں اور ان کے احکام کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں اور اس کے رسول ﷺ نے اپنی سنت یا حدیث میں ایک بار بھی نہ اللہ کے لیے جسم کا اثبات کیا ہے اور نہ جسم کی نفی کی ہے۔ قرآن نے جو مسلمہ قاعدہ بیان فرما دیا ہے وہ یہ ہے کہ قرآن و حدیث میں اس کی جو صفات بیان ہوئی ہیں ان کو لیس كمثله شيء کے دائرہ اور حدود میں لیا جائے اور بس۔

چند ضروری وضاحتیں:

۱۔ عربی کے مقابلے میں اردو زبان کا دامن تنگ ہے لہٰذا اردو میں اللہ تعالیٰ کی صفات کا بالکل صحیح ترجمہ مشکل ہے اس تناظر میں اللہ تعالیٰ کی صفات کے وہ تمام ترجمے درست اور صحیح ہیں جو حقیقی ہوں اور مجازی نہ ہوں اور ان میں ان صفات کی کوئی کیفیت نہ بیان کی گئی ہو، مثال کے طور پر استوی علی العرش کا اردو ترجمہ عرش پر بلند ہوا بھی صحیح ہے اور رونق افروز ہوا بھی صحیح ہے، لیکن وہ عرش پر بیٹھا صحیح نہیں ہے اس لیے کہ اس میں ''علو'' کی ایک خاص کیفیت بیان ہوئی ہے۔

۲۔ اللہ تعالیٰ کی صفت علو اور فوقیت اس کی ذاتی اور ازلی و ابدی صفت ہے جس سے وہ کبھی بھی غیر موصوف نہیں رہا ہے اور نہ غیر موصوف ہوگا، لیکن عرش پر اس کی بلندی اور فوقیت فعلی اور خاص بلندی اور فوقیت ہے اور اللہ تعالیٰ کی فعلی صفات اس کی مشیت کے تابع ہیں۔ قرآن میں استوی علی العرش سے پہلے حرف عطف ''ثم'' آیا ہے جو معطوف

Marfat.com

کے معطوف علیہ کے بعد آنے اور وقوع پذیر ہونے پر دلالت کرتا ہے، یعنی آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنے کے بعد وہ عرش پر بلند ہوا۔ تو یہ اس کی خاص ''علو'' ہے۔

اللہ تعالیٰ کی علو، بلندی اور فوقیت کی دو قسمیں ہیں: معنوی اور ذاتی۔

اللہ تعالیٰ کی معنوی بلندی کے قائل اہل سنت اور اہل بدعت دونوں ہیں۔

رہی اللہ تعالیٰ کی ذاتی فوقیت تو اہل سنت و جماعت اس کے قائل ہیں لیکن اہل بدعت اس کے قائل نہیں ہیں۔ جبکہ اس کے دلائل سے قرآن و حدیث بھری پڑی ہیں اور اس علو اور فوقیت کو عقل اور فطرت بھی مانتی ہے۔ اہل شرک اور کفر بھی، بلکہ دنیا کے تمام مذاہب کے ماننے والوں پر جب کوئی آفت آتی ہے یا وہ کسی مصیبت سے دو چار ہوتے ہیں جس کو دفع کرنے کی طاقت نہیں رکھتے تو ان کی نگاہیں آسمان کی طرف اٹھ جاتی ہیں۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کی ذاتی علو اور فوقیت کا انکار مکابرہ اور ہٹ دھرمی ہے۔

تعطیل:

عطل یعطلُ کا مصدر ہے جس کے معنی ترک کر دینے، چھوڑ دینے اور بیکار کر دینے کے ہیں، قرآن پاک میں ''و بئر معطلة'' ''بے کار چھوڑے ہوئے کنویں'' آیا ہے۔ یہ معطلة اسی فعل سے اسم مفعول ہے۔ عقیدہ کے باب میں تعطیل کے معنی ہیں: اللہ تعالیٰ نے اپنے جو اسماء اور صفات بیان فرمائی ہیں ان سب کا یا ان میں سے کسی کا انکار۔ یہ انکار ان کو نہ مان کر بھی کیا جا سکتا ہے اور ان کی تحریف کر کے بھی۔

تعطیل اور تحریف میں یہ فرق ہے کہ تعطیل کسی صفت کے حقیقی معنیٰ کے انکار سے عبارت ہے، مثلاً ''ید الله'' سے قوة الله اور قدرة الله'' اللہ کی قوت اور اللہ کی قدرت مراد لینا تحریف ہے، اور اللہ تعالیٰ کی کسی صفت کے بارے میں یہ کہنا: میں اس کے معنیٰ کو اللہ کے حوالہ کرتا ہوں، کیونکہ مجھے وہ معلوم نہیں ہے تعطیل ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے اسماء اور صفات کی تاویل کرنے والا ان کا محرف ہے۔

تکییف:

یہ ''کیف'' سے بنا ہے اور کَیَّفَ یُـکَیِّفُ کا مصدر ہے۔ اس کے معنیٰ ہیں: اللہ تعالیٰ کی کسی صفت کی خاص کیفیت، حالت اور شکل بیان کرنا، کتاب وسنت میں اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کی کیفیت بیان کرنے سے بصراحت منع نہیں کیا گیا ہے، لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ کی کسی صفت کی شکل اور کیفیت بیان کرنا اللہ کی نسبت سے بلا علم کوئی بات کہنا ہے جو حرام ہے۔ لہٰذا اللہ کی کسی صفت کی کیفیت بیان کرنا بھی حرام ہوا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّیَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَ مَا بَطَنَ وَ الْاِثْمَ وَ الْبَغْیَ بِغَیْرِ الْحَقِّ وَ اَنْ تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ یُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا وَّ اَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ۝﴾ (الاعراف: ۳۳)

Marfat.com

''کہہ دو، میرے رب نے تو صرف ظاہری اور چھپی بے حیائیوں کو، اور گناہ کو، اور ناحق زیادتی کو، اور یہ کہ تم اللہ کا ایسا شریک ٹھہراؤ جس کی اس نے کوئی دلیل نہیں اتاری ہے اور یہ کہ تم اللہ کی نسبت سے کوئی ایسی بات کہو جس کا تم علم نہیں رکھتے، حرام کیا ہے۔''

تمثیل:

مثل سے بنا ہے اور مثل یمثل کا مصدر ہے جس کے معنی ہیں: کسی کا مماثل اور مشابہ بنانا اللہ تعالیٰ کی صفات کی تمثیل یہ ہے کہ یہ کہا جائے کہ اس کی فلاں صفت اس چیز کی طرح ہے، یا یہ کہنا کہ اس کا ہاتھ ہمارے ہاتھوں کی طرح ہے یا اس کا علم ہمارے علم کی طرح ہے وغیرہ۔

قرآن پاک میں اللہ کے لیے مثالیں دینے سے منع کیا گیا ہے:

﴿فَلَا تَضْرِبُوْا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ وَ اَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ٥﴾ (النحل: ٧٤)

''اللہ کے لیے مثالیں نہ دو، کیونکہ اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔''

تکییف اور تمثیل میں یہ فرق ہے کہ تکییف میں اللہ تعالیٰ کی صفت کی خاص حالت یا کیفیت تو بیان کی جاتی ہے، لیکن اس کی کوئی مثال نہیں دی جاتی، جبکہ تمثیل میں اس کی مثال دی جاتی ہے۔

تکییف اور تمثیل میں دوسرا فرق یہ ہے کہ اللہ کی صفات کی کیفیات ہیں لیکن ہمیں ان کا علم نہیں مثلاً عرش پر اللہ کے بلند ہونے اور رونق افروز ہونے کی کیفیت اور صفت تو ہو گی اس طرح اس کے آسمان دنیا پر نزول کی کیفیت بھی ضرور ہو گی، لیکن ہم اس کو نہیں جانتے، جبکہ اللہ کا مماثل کوئی نہیں۔ لیس کمثله شیء

تشبیہ:

تشبیہ اور تمثیل تقریباً ہم معنی ہیں دونوں میں معمولی سا فرق ہے: اگر کوئی چیز کسی دوسری چیز کے ہر اعتبار سے برابر ہو تو وہ اس کی مماثل ہے اور دونوں میں مماثلت ہے، لیکن اگر کوئی چیز کسی دوسری چیز کے بعض صفات یا اکثر صفات میں مانند ہو تو وہ اس کی مشابہ ہے اور دونوں میں مشابہت ہے۔ مشبہ ایک فرقہ ہے جو خالق کو مخلوق کے مانند مانتا ہے۔ معتزلہ، جہم بن صفوان کے پیرو-جہمیہ- اور متکلمین اہل سنت و جماعت کو ''مشبہ'' کہتے ہیں، اس لیے کہ یہ قرآن و حدیث میں مذکور اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کو ان کے حقیقی معنوں میں لیتے ہیں اور ان کی تاویل و تحریف نہیں کرتے۔ صاحب کشاف زمخشری اہل سنت و جماعت کا ذکر اسی لفظ: ''مشبہ'' ہی سے کرتے ہیں۔ مشہور حنفی متکلم محمد زاہد کوثری محدثین اور اہل سنت و جماعت کے خلاف بدزبانی میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے اور مشہور مفسر قرآن اور متکلم فخر الدین رازی اس مذموم صفت میں کوثری کے امام تھے یہ دونوں بھی محدثین اور اہل سنت و جماعت کو ''مشبہ'' کہتے تھے۔

Marfat.com

تجسیم:

جسم یجسم تجسیما کے معنی ہیں جسم ثابت کرنا جسم کے معنی بدن اور ڈھانچہ کے ہیں، اور ہر وہ چیز جس میں لمبائی، چوڑائی اور گہرائی پائی جائے اس پر جسم کا اطلاق کرتے ہیں۔

اس اصطلاح: تجسیم کا استعمال سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کی صفات کا انکار کرنے والوں نے اہل سنت و جماعت کے حق میں کیا، پھر ان کی کتابوں میں ''مجسمہ'' اہل سنت و جماعت کا لقب بن گیا، کوثری کی تحریروں میں اہل سنت و جماعت اور محدثین کی مذمت کے طور پر اس کا بہت زیادہ استعمال ہوا ہے۔

صفاتِ الٰہی کے منکرین کا دعویٰ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی جن صفات کا اثبات کیا ہے، جیسے: ہاتھ، چہرہ، پنڈلی، نزول اور آنا وغیرہ تو یہ ایسی صفات یا اعراض ہیں جو کسی جسم کے ساتھ ہی پائی جا سکتی ہیں۔ جسم کے بغیر ان کا کوئی وجود نہیں ہوتا، جبکہ اللہ کے لیے جسم ہونا محال ہے۔ لہٰذا اپنے زعم باطل میں ''تجسیم'' سے بچنے کے لیے انہوں نے صفات ہی کا انکار کر دیا، رہے متکلمین-اشاعرہ اور ماتریدیہ-تو انہوں نے اللہ تعالیٰ کے لیے آٹھ صفات مانی ہیں، جیسے: حیات، علم اور قدرت وغیرہ تو یہ بھی ایسی صفات ہی سے عبارت ہیں جو کسی جسم کے ساتھ وابستہ رہ کر ہی پائی جا سکتی ہیں۔

یہاں میں ''احقاقِ حق'' کی خاطر ایک بار پھر یہ واضح کر دوں کہ قرآن و حدیث میں اللہ تعالیٰ کے لیے نہ تو جسم کا اثبات ہے اور نہ نفی۔ لہٰذا جو شخص اللہ تعالیٰ کے لیے جسم ثابت کرتا اور مانتا ہے اس سے اور جو اس سے اس جسم کی نفی کرتا ہے، اس سے یہ منطقی سوال کیا جا سکتا ہے: جسم سے تمہاری مراد کیا ہے؟

''اگر جسم سے تمہاری مراد لمبائی چوڑائی اور دبازت سے موصوف بدن ہے، کیونکہ لغت میں اسی کو جسم کہتے ہیں، تو اللہ تعالیٰ کی ذات عقل و نقل دونوں کی رو سے ایسا جسم رکھنے سے پاک اور منزہ ہے، دوسرے لفظوں میں وہ ہڈیوں، خون اور گوشت سے مرکب جسم نہیں رکھتا۔

اور اگر تمہاری مراد یہ ہے کہ وہ جوہر-عرض کی ضد- مادہ اور شکل سے مرکب ہے تو ایسا جسم بھی اللہ تعالیٰ سے منفی ہے۔

لیکن اگر تم جسم سے مراد ایسا جسم لیتے ہو جو صفات سے موصوف ہے، آنکھوں سے دیکھتا ہے، بات کرتا ہے، اس سے بات کی جاتی ہے، وہ سنتا ہے، دیکھتا ہے، راضی ہوتا ہے، خوش ہوتا ہے اور غضب ناک ہوتا ہے تو اس کے لیے یہ صفات ثابت ہیں اور ان کی وجہ سے اس کے حق میں جسم ثابت ہونے کے تمہارے دعویٰ کی بنیاد پر اس کی ذات سے ہم ان کی تردید اور انکار نہیں کرتے۔'' [1]

اسی بات کو میں علامہ محمد بن صالح عثیمین رحمہ اللہ کے الفاظ میں یوں کہہ سکتا ہوں:

[1] تعلیق علی لوامع الانہار البہیۃ لابن سحمان بحوالہ معجم الفاظ العقیدہ ص ۸۱

Marfat.com

"اگر تمہارا مطلب اللہ تعالیٰ کا جسم نہ ہونے سے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ایسی ذات نہیں جو اپنے شایان شان صفات سے موصوف ہے، تو تمہارا دعویٰ باطل ہے؛ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کی حقیقی ذات صفات سے موصوف ہے اور اس کا چہرہ بھی ہے اور ہاتھ بھی اور آنکھ بھی ہے اور پاؤں بھی اور تم ان سے لازم آنے کی جو رٹ چاہو لگاتے رہو؛ اس کی صفات سے لازم آنے والی اور ضروری قرار پانے والی ہر شے حق ہے۔" ❶

اہل سنت و جماعت کا عقیدہ:

میں نے اللہ تالیٰ کے اسماء وصفات سے متعلق لوگوں میں زبان زد اصطلاحوں کو عام فہم زبان میں بیان کر دیا ہے اب ان اسماء وصفات کے بارے میں اہل سنت و جماعت کا عقیدہ شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے الفاظ میں بیان کر دینا چاہتا ہوں جو سونے کے پانی سے لکھے جانے کے قابل ہیں، فرماتے ہیں:

((و من الإيمان بالله: الإيمان بما وصف به نفسه في كتابه، و بما وصفه به رسوله ﷺ من غير تحريف، و لا تعطيل، و من غير تكييف و لا تمثيل،

بل يؤمنون بأن الله سبحانه ليس كمثله شيء و هو السميع العليم، فلا ينفون عنه ما وصف به نفسه، و لا يحرفون الكلم عن مواضعه، و لا يلحدون في أسماء الله و آياته، و لا يكيفون و لا يمثلون صفاته بصفات خلقه، لأنه سبحانه لا سمي له، و لا كفو له و لا ندله))

"اللہ پر ایمان میں اُن صفات پر ایمان بھی داخل ہے جن سے اس نے اپنی کتاب میں اپنے آپ کو اور جن سے اس کے رسول محمد ﷺ نے اس کو موصوف کیا ہے، اور ان میں کوئی تحریف، تعطیل اور تکییف اور تمثیل روا نہیں ہے۔

بلکہ اہل سنت و جماعت اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ اللہ سبحانہ ایسا ہے جس کے مانند کوئی شے نہیں اور وہ ہر چیز سننے والا ہے اور ہر چیز کا علم رکھتا ہے، وہ اُن صفات کا انکار نہیں کرتے جن سے اس نے اپنے آپ کو موصوف کیا ہے اور نہ کلام کو اس کے محل سے پھیرتے ہیں اور نہ اللہ کے اسماء اور آیات کے بارے میں کج روی کے مرتکب ہوتے ہیں، اور نہ ان کی کوئی کیفیت بیان کرتے ہیں اور نہ اس کی صفات کو اس کی مخلوقات کی صفات کے مانند قرار دیتے ہیں، اس لیے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا نہ کوئی مماثل ہے، نہ کوئی ہمسر، اور نہ کوئی ہم رتبہ۔" ❷

دوسری مثال، عیسیٰ علیہ السلام کا نزول:

رسول اللہ ﷺ نے اپنی احادیث میں قرب قیامت کی جن علامتوں کی پیشین گوئیاں کی ہیں ان میں مہدی کے

❶ شرح العقيدة الواسطية ص ۳۲۱ ❷ العقيدة الواسطية، ص ٦۔

Marfat.com

ظہور، عیسیٰ علیہ السلام کے نزول، دجال کے خروج، یاجوج ماجوج کے آزاد کیے جانے اور دابۃ الارض کے خروج کے واقعات سرفہرست ہیں ان میں سے یاجوج ماجوج کے آزاد کیے جانے اور ہر جگہ سے ان کے نکل پڑنے اور دابۃ الارض کے خروج کا ذکر تو مختصراً قرآن پاک میں آیا ہے، لیکن مہدی کے ظہور، عیسیٰ کے نزول اور دجال کے خروج کی پیشین گوئیاں صرف احادیث میں کی گئی ہیں، اور نہایت تفصیل سے کی گئی ہیں۔ جو لوگ عقیدہ سے متعلق ہر چیز کی صحت کے لیے اس کے قرآن میں مذکور ہونے کی شرط لگاتے ہیں اور جو لوگ اس طرح کی کوئی شرط تو نہیں لگاتے، البتہ احادیث کو تنقیدی نظروں سے دیکھنے کے خوگر ہیں وہ مہدی کے ظہور، عیسیٰ علیہ السلام کے نزول اور دجال کے خروج کی حدیثوں کو نہیں مانتے، اس طرح کے لوگوں کی تعداد ہر زمانے میں بہت زیادہ رہی ہے، اس لیے اولاً تو میں اس مسئلہ میں ان لوگوں کے دعووں کا ذکر کیے بغیر اصولی بحث کروں گا ثانیاً میری یہ بحث نزول عیسیٰ کے نقطہ پر مرکوز ہوگی جس سے مہدی کا ظہور اور دجال کا خروج جڑا ہوا ہے۔

عیسیٰ علیہ السلام زندہ ہیں یا وفات پا گئے؟

قرآن پاک میں نہ اس بات کی صراحت ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام زندہ ہیں اور نہ اس بات کی طرف کوئی معمولی سا ہی اشارہ ہے کہ ان کی وفات ہوگئی، البتہ قرآن پاک میں اس مسئلہ کو جس معجزانہ اسلوب اور پیرائے میں بیان کیا گیا ہے اس سے ان کی زندگی کا نہایت یقینی ثبوت ملتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کو کس طرح بچایا؟

میں عیسیٰ علیہ السلام کے زندہ ہونے پر قرآنی شہادت پیش کرنے سے قبل سورۂ آل عمران کی آیات نمبر ۵۴-۵۸ اور سورۂ نساء کی آیت ۱۵۷-۱۵۸ کی روشنی میں ان کے قتل کی یہودی سازش اور اللہ تعالیٰ کے اپنی تدبیر خاص سے اس کو ناکام بنا دینے اور عیسیٰ علیہ السلام کو جسم و روح کے ساتھ آسمان پر اٹھا لینے کے واقعہ کو مرتب شکل میں بیان کر دینا چاہتا ہوں، تاکہ جہاں ان آیات کا صحیح مفہوم سمجھ میں آ جائے وہیں یہ بھی پورے یقین سے معلوم ہو جائے کہ یہودی نہ تو ان کو قتل کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں اور نہ وہ قدرتی موت ہی مرے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب عزیز میں یہودیوں کی جو ناپاک خصلت بیان کی ہے وہ قرآن کے الفاظ میں یہ ہے:

﴿لَقَدْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ وَ اَرْسَلْنَآ اِلَیْهِمْ رُسُلًا كُلَّمَا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓی اَنْفُسُهُمْ فَرِیْقًا كَذَّبُوْا وَفَرِیْقًا یَّقْتُلُوْنَ۝﴾ (المائدۃ: ۷۰)

''ہم نے بنو اسرائیل سے پختہ عہد لیا تھا اور ان کی طرف متعدد رسول بھیجے تھے، جب بھی ان کے پاس کوئی رسول ایسی بات لے کر آتا جو ان کی خواہش کے خلاف ہوتی تو کچھ کی انہوں نے تکذیب کی اور کچھ کو قتل کرتے رہے۔''

Marfat.com

اسی طرح یہودیوں نے عیسیٰ علیہ السلام کی تکذیب کی اور ان پر اور ان کی پاکباز والدہ پر نہایت گندے الزامات لگائے اور جب انہوں نے دیکھا کہ وہ اپنی دعوت سے باز نہیں آ رہے ہیں اور ان کی دعوت کو مقبولیت بھی حاصل ہوتی جا رہی ہے تو انہوں نے ان کو راستے سے ہٹانے کا فیصلہ کر لیا یہ سب کچھ انہوں نے یہ جانتے ہوئے کیا کہ عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے رسول ہیں خود موسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا رسول جانتے ہوئے وہ ایذائیں دے چکے تھے جو ان کے بہت بڑے محسن بھی تھے اور آخری رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف جو سازشیں کیں، آپ کو جو ایذائیں دیں اور آپ کو شہید کرنے کے جو منصوبے بنائے وہ تاریخ کے صفحات پر ثبت ہیں۔

اپنی اس مذموم اور اخلاق سوز خصلت پر چلتے ہوئے یہودیوں نے بنو اسرائیل کے آخری رسول عیسیٰ علیہ السلام کو بھی قتل کرنے کا منصوبہ بنایا اور جس جگہ وہ موجود تھے یا جس جگہ ان کو انہوں نے قید کر رکھا تھا اپنے چند اوباشوں کو بھیجا کہ وہ ان کو ان کے پاس پا بجولاں لائیں اور وہ ان کو سولی دے دیں، مگر قبل اس کے کہ وہ اپنی اس شیطانی سازش کو عملی جامہ پہنائیں اللہ نے اپنے رسول کو ان کی اس سازش کی اطلاع دیتے ہوئے ان کو یہ خوشخبری دے دی کہ وہ ان کو ان کی روح وجسم کے ساتھ اپنی حفاظت میں لے کر ان کو آسمان پر اٹھا لے گا اور ان کو اس گندی فضا سے نکال لے گا جس میں ان کو گندے اور ناپاک الزامات کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔

اس طرح جب یہودی اوباش اور شرپسند عیسیٰ علیہ السلام کے پاس پہنچے تو اللہ تعالیٰ نے ان میں سے ایک کو عیسیٰ علیہ السلام کا شبیہ اور ہم شکل بنا دیا اور ان کو اسی حال میں آسمان پر اٹھا لیا۔ ادھر جب یہ یہودی اپنے اکابر مجرمین کے پاس واپس آئے تو انہوں نے عیسیٰ علیہ السلام کے ہم شکل کو سولی دے دی، جبکہ وہ چلاتا رہا کہ میں مسیح نہیں ہوں اس طرح اللہ تعالیٰ نے ان کی چال خود انہی پر الٹ دی۔

بعد میں مسیح علیہ السلام کے شبیہ کو قتل کرنے والوں نے یہ دعویٰ کرنا شروع کر دیا کہ ہم نے مسیح عیسیٰ ابن مریم، اللہ کے رسول کو قتل کر دیا ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے ان کے اس دعویٰ کی تکذیب فرما دی اور نہایت واضح اور دو ٹوک الفاظ میں اعلان فرما دیا کہ انہوں نے نہ تو اسے قتل کیا ہے اور نہ اس کو سولی پر چڑھایا ہے، بلکہ انہوں نے جس کو قتل کیا ہے وہ ان کا شبیہ تھا۔

مطلب یہ ہے کہ انہوں نے قتل تو کیا ہے، لیکن مقتول اور مصلوب عیسیٰ نہیں ان کا شبیہ تھا۔ پورا واقعہ میں نے مرتب شکل میں بیان کر دیا ہے۔ سورۂ آل عمران میں اللہ تعالیٰ نے یہ واقعہ بیان کرنے سے پہلے ارشاد فرمایا ہے:

﴿وَ مَكَرُوْا وَ مَكَرَ اللّٰهُ وَ اللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ﴾ (آل عمران : ٥٤)

"اور انہوں نے خفیہ تدبیر کی اور اللہ نے خفیہ تدبیر کی اور اللہ خفیہ تدبیر کرنے والوں میں سب سے بہتر ہے۔"

دشمن سے انتقام لینے اور اس کو نیچا دکھانے اور اس کو خود اس کے بچھائے ہوئے جال میں پھنسانے کے لیے مخفی اسباب و ذرائع استعمال کرنے کو مکر، کید اور خداع وغیرہ سے تعبیر کرتے ہیں۔

Marfat.com

اللہ تعالیٰ کی صفتِ مکر و کید:

مذکورہ آیت میں جس طرح مکر کی نسبت یہودیوں کی طرف کی گئی ہے اسی طرح اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی گئی ہے۔ اوپر ہم یہ بتا چکے ہیں کہ قرآن و حدیث میں اللہ تعالیٰ کی جو صفات بیان ہوئی ہیں وہ اپنے حقیقی معنوں میں ہیں، چاہے یہ معنوی صفات ہوں، یا فعلی، البتہ فعلی صفات اس کی مشیت کے تابع ہیں ازلی اور ابدی نہیں ہیں۔

اب جہاں تک اللہ تعالیٰ کی صفت مکر اور کید کا تعلق ہے تو یہ بھی اس کی فعلی صفت ہے اور مکر اور کید دونوں مترادف اور ہم معنیٰ ہیں، اور دونوں فعل اور اسم کی صورت میں اللہ تعالیٰ کی نسبت سے آئے ہیں۔ مکر کا ذکر دوسروں کے مکر کے مقابلے میں آیا ہے، لیکن بطور اسم کید کی نسبت اللہ تعالیٰ سے مطلق کی گئی ہے۔ (الاعراف: ۱۸۳، القلم: ۴۵)

اور دوسروں کے کید کے جواب میں بھی (الطارق: ۱۵-۱۶)

سورۂ آل عمران کی اس زیر بحث آیت میں "مکر اللہ" "مکروا" کے جواب اور مقابلے میں ہے اور آیت کے آخر میں و اللہ خیر الماکرین فرمایا گیا ہے اور ارشاد الٰہی کا مطلب ہے کہ یہودیوں نے عیسیٰ کو قتل کرنے کی خفیہ تدبیر کی اور اپنی تدبیر کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ایسے حالات پیدا کر دیے کہ ان کے لیے کسی سے مدد لینا یا خود اپنا دفاع کرنا ممکن نہ رہا ان حالات میں اللہ نے یہ خفیہ تدبیر کی کہ انہیں کے ایک آدمی کو ان کا شبیہ بنا دیا جس کو انہوں نے عیسیٰ مسیح سمجھ کر قتل کر دیا اور عیسیٰ کو اللہ نے اپنے قبضہ اور تحویل میں لے کر آسمان پر اٹھا لیا اور آیت کے آخر میں فرمایا: اور اللہ خفیہ تدبیر کرنے والوں میں سب سے بہتر ہے۔ کیونکہ اس کی تدبیر میں خیر ہی خیر ہوتی ہے۔

تَوَفّٰی یَتَوَفّٰی کی لغوی تحقیق:

اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کی مکاری اور اپنی تدبیر خاص سے اس کو ناکام بنانے کی طرف اشارہ کرنے کے بعد یہ خبر دی ہے کہ عین اس وقت جب یہودی عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنے کی سازش اور خفیہ تدبیر کر رہے تھے تو اس نے اپنے بندے اور رسول سے کیا فرمایا؟

ارشاد الٰہی ہے:

﴿اِذْ قَالَ اللّٰهُ یٰعِیْسٰۤی اِنِّیْ مُتَوَفِّیْكَ وَ رَافِعُكَ اِلَیَّ وَ مُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا﴾

(آل عمران: ۵۵)

"یاد کرو جب اللہ نے کہا اے عیسیٰ! درحقیقت میں تمہیں قبض کرنے والا، اور تم کو اپنی طرف اٹھا لینے والا اور تمہیں ان لوگوں سے پاک کرنے والا ہوں جنہوں نے کفر کیا۔"

اس آیت مبارکہ میں "متوفی" توفی یتوفی کا اسم فاعل اور حرف خطاب -ك- اس کا "مفعول بہ" ہے جو بصورت مضاف الیہ استعمال ہوا ہے۔

Marfat.com

"توفی یتوفی" باب تفعل سے ہے اور اس کی اصل "وفی" ہے توفی کے لغوی معنی لینے اور قبض کرنے کے ہیں۔ کہتے ہیں: توفی فلان حقه فلاں نے اپنا پورا پورا حق لے لیا۔ اگر اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو اور کہا جائے: توفی الله فلانا اللہ نے فلاں کو وفات دے دی، تو معنی ہوں گے: وہ شخص مر گیا۔ اسم فاعل کی صورت میں، یعنی "متوفی" صرف اللہ تعالیٰ ہے اور جو وفات پاتا ہے اس کو حرف "ف" پر زبر کے ساتھ "متوفَی" کہتے ہیں جو اس فعل کا اسم مفعول ہے۔

قرآن پاک میں ایک جگہ کے علاوہ ہر جگہ چاہے اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو یا فرشتوں کی طرف یہ لفظ موت ہی دینے کے معنی میں آیا ہے۔ صرف سورۂ انعام کی آیت نمبر ۶۰ میں "نیند" طاری کر دینے کے معنی میں آیا ہے:

﴿وَ هُوَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰىكُمْ بِالَّيْلِ وَ يَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ﴾ (الانعام: ٦٠)

"وہی تو ہے جو تمہیں رات میں قبض کر لیتا ہے اور جانتا ہے کہ دن میں تم نے کیا کمایا۔"

معلوم ہوا کہ "توفی" کے معنی اماتة - مار دینے - اور انامة - سلا دینے - دونوں کے ہیں اور اس کا اصل معنی "قبض کر لینا دونوں میں موجود ہے اور یہ دونوں معنی اس لفظ توفی کے حقیقی معنی ہیں۔

موت اور نیند دونوں میں اللہ تعالیٰ روح قبض کر لیتا ہے، البتہ موت کی حالت میں جسم سے روح کا تعلق اور رشتہ باقی نہیں رہتا اور اس دنیا میں اس جسم میں اس کی دوبارہ واپسی کا کوئی امکان نہیں رہ جاتا۔ جبکہ نیند کی حالت میں بھی روح جسم سے نکل جاتی ہے، مگر اس سے اس کا رشتہ باقی رہتا ہے اور وہ اس میں واپس بھی آتی رہتی ہے اس طرح ایک انسان ہر روز مرتا اور زندہ ہوتا ہے۔ یہ دونوں حقیقتیں ایک ہی آیت میں بیان کر دی گئی ہیں۔

﴿اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا فَيُمْسِكُ الَّتِيْ قَضٰى عَلَيْهَا الْمَوْتَ وَيُرْسِلُ الْاُخْرٰى اِلٰى اَجَلٍ مُّسَمًّى اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ﴾ (الزمر: ٤٢)

"اللہ روحیں ان کی موت کے وقت قبض کر لیتا ہے اور وہ بھی جو نہیں مری ہیں ان کی نیند میں، پھر جن پر اس نے موت کا فیصلہ کر دیا ہے ان کو روک لیتا ہے اور دوسری کو ایک متعینہ وقت تک چھوڑ دیتا ہے، یقیناً اس میں ان لوگوں کے لیے بڑی نشانیاں ہیں جو غور و فکر کرتے ہیں۔"

اس آیت مبارکہ سے بصراحت یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ موت اور نیند دونوں حالتوں میں روحیں قبض کر لیتا ہے۔

سورۂ آل عمران کی آیت میں اللہ تعالیٰ کے ارشاد: إنی متوفیك کا یہ مطلب ہو ہی نہیں سکتا کہ میں تم کو "موت دینے والا ہوں" کیونکہ جہاں اس کے بعد کا فقرہ و رافعك إلی یہ مطلب لینے میں مانع ہے وہیں سورۂ نساء میں اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کے دعوے: اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ "ہم نے اللہ کے رسول مسیح عیسیٰ ابن مریم کو قتل کر دیا ہے۔" کی تردید میں جو یہ فرمایا ہے وَ مَا قَتَلُوْهُ وَ مَا صَلَبُوْهُ .... وَ مَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا "انہوں نے

Marfat.com

نہ اسے قتل کیا اور نہ اسے سولی پر چڑھایا...... اور انہوں نے یقیناً اسے قتل نہیں کیا۔''

ان کے دعویٰ کی تردید نہیں، تائید بن جائے گا۔ لہٰذا "تـوفـی" کے قرآنی استعمال کی رعایت کرتے ہوئے انـی متوفیك کے معنی ہیں کہ میں تم پر نیند طاری کر کے تم کو اپنے قبضہ اور تحویل میں لے کر تم کو اپنی طرف آسمان میں اٹھالوں گا۔

سورۂ نساء کی آیت ۱۵۸ میں بھی اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کو آسمان پر اٹھا لینے کا ذکر کیا ہے ایک تو اس کا اعادہ دوم اس کا سیاق وسباق ان کے قتل کیے جانے اور قدرتی موت مرنے دونوں کے تمام امکانات کا خاتمہ کر دیتا ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿وَ مَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا٥ بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ وَ كَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا٥﴾

(النساء: ۱۵۷-۱۵۸)

''اور یقیناً انہوں نے اسے قتل نہیں کیا، بلکہ اللہ نے اس کو اپنی طرف اٹھا لیا اور اللہ ہر چیز پر غالب کمال حکمت والا ہے۔''

اللہ تعالیٰ نے پورے سلسلۂ بیان کے آخر میں اپنے جن دو صفاتی ناموں کا ذکر فرمایا ہے ان سے عیسیٰ علیہ السلام کے یہودیوں کی ناپاک سازش سے محفوظ رکھے جانے اور زندہ اٹھا لیے جانے کی حکمت آشکارا ہوتی ہے۔ اللہ ہی کمال عزت و غلبہ سے موصوف ہے اس کے فیصلے اور تدبیر کو کوئی بھی بدلنے یا نافذ ہونے سے نہیں روک سکتا، پھر اس کا ہر فعل اور فیصلہ عظیم تر حکمتوں کا حامل ہوتا ہے، جن کی تفصیلات احادیث پاک میں بیان ہوئی ہیں۔

نزول عیسیٰ حدیث میں

ا۔ پہلی حدیث:

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، کہتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

((و الذی نفسی بیده، لَيُوْشَكَنَّ أَنْ ينزل فيكم ابن مريم حَكَمًا عَدلًا، فيكسِرُ الصليبَ و يقتل الخِنزيرَ، و يضع الجزية و يَفِيْضَ المال، حتى لا يقبله أحد، حتى تكون السجدة الواحدة خيرا من الدنيا و ما فيها))

''اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے تمہارے اندر ابن مریم حاکم عادل بن کر، ضرور نازل ہوں گے۔ پھر وہ صلیب کو توڑ ڈالیں گے، سور کو ہلاک کر دیں گے، اور جزیہ ختم کر دیں گے، اور مال کی کثرت ہو جائے گی یہاں تک کہ کوئی اسے قبول نہیں کرے گا اور حالت یہ ہو جائے گی کہ ایک سجدہ دنیا و ما فیہا سے بہتر ہوگا۔'' [1]

اس حدیث کے آخر میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے اس قول کا اضافہ ہے:

[1] بخاری ۲۲۲۲، ۳۴۴۸، مسلم ۱۵۵

Marfat.com

اگر تم چاہو تو پڑھو:

﴿وَ اِنۡ مِّنۡ اَهۡلِ الۡكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤۡمِنَنَّ بِهٖ قَبۡلَ مَوۡتِهٖ ۚ وَ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ يَكُوۡنُ عَلَيۡهِمۡ شَهِيۡدًا ۝﴾

(النساء: ۱۵۹)

''اور اہل کتاب میں سے کوئی ایسا نہ ہوگا جو ان کی موت سے پہلے - یا اپنی موت سے پہلے - ان پر ایمان نہ لے آئے گا اور وہ قیامت کے دن ان پر گواہ ہوگا۔''

آیت مبارکہ میں ''قبل موته'' کی دو تفسیریں کی گئی ہیں؛ پہلی تفسیر اس اعتبار سے کی گئی ہے کہ ''موته'' کی ضمیر کا مرجع عیسیٰ علیہ السلام ہیں اور آیت کا مطلب یہ ہے کہ ان کے نزول کے بعد اہل کتاب - یہود و نصاریٰ - میں کوئی ایسا نہیں رہ جائے گا جو ان پر ایمان نہ لے آئے گا۔ دوسری تفسیر اس اعتبار سے ہے کہ ''موتہ'' کی ضمیر کا مرجع مرنے والا کتابی ہے اور آیت کا مطلب ہے کہ یہود و نصاریٰ میں سے ہر مرنے والا شخص عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آتا ہے۔ یہ دونوں مطلب آیت سے نکلتے ہیں اور الفاظ قرآن کے مطابق ہیں، البتہ ان کے نزول کے بعد ان پر ایمان لانے والے کا ایمان معتبر ہوگا، جبکہ دوسرے کا ایمان مجبوری کا ایمان ہونے کی وجہ سے نا قابل قبول ہوگا۔

۲۔ دوسری حدیث:

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

((كيف انتم إذا نزل ابن مريم فيكم و إمامكم منكم؟))

''کیسے ہوگے تم جب ابن مریم تم میں نازل ہوں گے اور تمہارا امام تمہی میں سے ہوگا۔'' [1]

۳۔ تیسری حدیث:

جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، کہتے ہیں میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے:

((لا تزال طائفة من أمتي يقاتلون على الحق ظاهرين الى يوم القيامة ، قال: فينزل عيسى ابن مريم ، فيقول أميرهم: تعال صل لنا ، فيقول: لا ، إن بعضكم على بعض أمراء ، تكرمة الله هذه الأمة))

''میری امت کا ایک گروہ برابر حق کی بنیاد پر لڑے گا اور قیامت تک غالب رہے گا، پھر فرمایا: پس عیسیٰ ابن مریم نازل ہوں گے، مسلمانوں کا امیر ان سے عرض کرے گا: آیئے ہمیں نماز پڑھایئے، وہ جواب دیں گے: نہیں، تم میں سے بعض بعض کے امیر ہیں، وہ اللہ کی طرف سے اس امت کی عزت افزائی کا لحاظ کرتے ہوئے یہ فرمائیں گے۔'' [2]

[1] بخاری ۳۴۴۹، مسلم ۱۵۵-۲۴۴ [2] مسلم: ۱۵۶

Marfat.com

۴۔ چوتھی حدیث:

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، کہتے ہیں:

"ذكر رسول الله ﷺ يوما ، بين ظهراني الناس: المسيح الدجال فقال: إن الله تبارك و تعالى ليس بأعور ، ألا إن المسيح الدجال أعور عيني اليُمنى ، كأن عينه عنبة طافئة ، قال: و قال رسول الله ﷺ: أراني الليلة في المنام عند الكعبة ، فإذا رجل آدم كاحسن ما ترى من أدم الرجال ، تضرب لمته بين منكبيه ، رجل الشعر ، يقطر رأسه ماء ، واضعا يديه على منكبي رجلين ، و هو بينهما يطوف بالبيت ، فقلت: من هذا؟ فقالوا: المسيح ابن مريم ، و رأيت وراء ه رجلا جعدا قططا اعور عين اليمنى ، كأشبه من رأيت من الناس بابن قطن واضعا يديه على منكبي رجلين ، يطوف بالبيت ، فقلت من هذا؟ قالوا: هذا المسيح الدجال))

"رسول اللہ ﷺ نے ایک دن لوگوں کے درمیان مسیح دجال کا ذکر فرمایا اور فرمایا: بے شک اللہ تبارک و تعالیٰ کانا نہیں ہے، غور سے سن لو کہ مسیح دجال دائیں آنکھ کا کانا ہے- یک چشم- گویا اس کی آنکھ خوشۂ انگور میں نمایاں انگور کا دانہ ہو" ابن عمر کہتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ایک رات میں خواب میں اپنے آپ کو کعبہ کے پاس دیکھتا ہوں، اچانک میں نے گندمی رنگ کے ایک شخص کو دیکھا جو ان گندمی رنگ کے مردوں میں حسین ترین تھا جو تم نے دیکھے ہوں گے، اس کی زلف اس کے مونڈھوں کو چھو رہی تھی، اس کے سر کے بال کنگھا کئے ہوئے تھے اور ان سے پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے، وہ اپنے دونوں ہاتھ دو مردوں کے کندھوں پر رکھے اور ان کے درمیان رہتے ہوئے بیت اللہ کا طواف کر رہا تھا، میں نے پوچھا: یہ کون ہے؟ لوگوں نے بتایا، مسیح ابن مریم، اور میں نے ان کے پیچھے ایک اور شخص کو دیکھا جس کے بال گھنگھریالے اور کھڑے تھے اور وہ دائیں آنکھ کا کانا تھا، میں نے جتنے لوگ دیکھے ہیں ان میں وہ ابن قطن -عبدالعزی بن قطن- کے زیادہ مشابہ تھا، وہ دو مردوں کے کندھوں پر اپنے دونوں ہاتھ رکھے بیت اللہ کا طواف کر رہا تھا، میں نے پوچھا: یہ کون ہے؟ لوگوں نے بتایا: یہ مسیح دجال ہے۔" ❶

۵۔ پانچویں حدیث:

نواس بن سمعان رضی اللہ عنہ سے دجال اور یاجوج ماجوج کے خروج سے متعلق ایک نہایت طویل حدیث صحیح مسلم میں آئی ہے جس میں نزول عیسیٰ کے بارے میں آیا ہے:

❶ بخاری: ۳۴۳۹-۳۴۴۰، مسلم ۱۶۹-۲۷۴

Marfat.com

((فبينما هو كذالك إذ بعث الله المسيح ابن مريم فينزل عند المنارة البيضاء شرقی دمشق، بين مهر و ذتين، واضعا كفيه على أجنحة ملكين إذ اطأطا رأسه قطر و إذا رفعه تحدر منه جمان كاللؤلوء، فلا يحل لكافر يجد ريح نفسه إلا مات، و نفسه ينتهى حيث ينتهى طرفه، فيطلبه، حتى يدركه بباب لد فيقتله))

''اس اثنا میں کہ دجال یہ شرانگیزیاں کر رہا ہوگا کہ اللہ مسیح ابن مریم کو بھیج دے گا جو دمشق کے مشرقی حصے میں واقع سفید مینار کے پاس، زرد رنگ کے دو کپڑے زیب تن کیے ہوئے دو فرشتوں کے بازوؤں پر اپنے ہاتھ رکھے ہوئے اتریں گے، جب وہ اپنا سر جھکائیں گے تو ایسا محسوس ہوگا کہ قطرے ٹپک رہے ہیں اور جب سر اٹھائیں گے تو موتی کی طرح قطرے ڈھلکتے نظر آئیں گے اور جو کافر ان کے سانس کی خوشبو پائے گا وہ ہلاک ہوئے بغیر نہ رہے گا اور ان کے سانس کی ہوا ان کی حد نظر تک جائے گی، اور وہ دجال کا پیچھا کریں گے یہاں تک کہ ''لُد'' کے دروازے پر اسے دھر لیں گے اور اسے قتل کر دیں گے۔'' ❶

نتیجہ بحث:

میں نے عیسیٰ علیہ السلام کے نزول سے متعلق چار صحابیوں سے مروی پانچ صریح اور صحیح ترین حدیثیں نقل کر دی ہیں اُن قرآنی آیتوں کے ساتھ، جو ان کی زندگی پر بصراحت دلالت کرتی ہیں ان احادیث پر غور کرنے سے یہ حقیقت روز روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام زندہ ہیں اور آسمان پر ہیں اور وہ دجال کے ظہور اور اس کی شرانگیزیوں کے پھیل جانے کے موقع پر نازل ہوں گے اور دجال کو ہلاک کرنے کے علاوہ یہودیت اور نصرانیت کا ابطال کریں گے اور صرف صحیح دین اسلام اور سچے مسلمان باقی رہیں گے اور ایک بار پھر حق کا بول بالا ہوگا، شرک و بدعات سے اللہ کی زمین پاک ہو جائے گی اور یہود و نصاریٰ کے ہاتھوں جو شر و فساد برپا ہے، پوری انسانیت جس ظلم و استبداد سے کراہ رہی ہے اور اہل حق کو جس طرح ستایا جا رہا ہے ان سب کا خاتمہ ہو جائے گا اور قیام عدل و انصاف سے اللہ کی یہ زمین گل و گلزار بن جائے گی۔

ظہور مہدی:

میں نے جو حدیثیں نقل کی ہیں وہ نزول عیسیٰ اور خروج دجال کے مسئلہ میں تو صریح ہیں، مگر ان میں مہدی کے ظہور کا ذکر نہیں ہے، لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ مہدی کے ظہور کے بارے میں صحیح احادیث نہیں آئی ہیں، بلکہ اس کے برعکس ان کے ظہور کے بارے میں بکثرت صحیح احادیث اور آثار مروی ہیں، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ظہور مہدی، خروج دجال اور نزول عیسیٰ کے واقعات آپس میں جڑے ہوئے ہیں اور میں نے موضوع بحث کے اندر رہتے ہوئے نزول عیسیٰ کی

❶ مسلم: ۲۹۳۷

Marfat.com

روایتیں قصداً نقل کی ہیں۔ ذیل میں میں اشارۃً ان روایتوں کا ذکر کر دینا چاہتا ہوں جو ان کے ظہور سے متعلق ہیں:

۱۔ جن صحیح حدیثوں میں مہدی کے نام "محمد بن عبداللہ" کی صراحت ہے ان کی تعداد ۸ ہے جو علی، ابن مسعود، ابوسعید خدری، جابر بن عبداللہ، ثوبان ہاشمی اور ام المومنین ام سلمہ رضی اللہ عنہم سے مروی ہیں اور سنن ابوداود (۴۲۸۵) ابن ماجہ (۴۰۸۵) مستدرک حاکم (۸۷۱۶) مسند احمد (۱۱۲۳۰) میں موجود ہیں۔

۲۔ وہ صحیح روایتیں جن میں ان کے نام کی صراحت نہیں، مگر ان کے اوصاف اور ان کے ظہور کے وقت کی صراحت ہے ان کی تعداد ۲۲ ہے اور یہ علی، ابن مسعود، ابوہریرہ، ابوسعید خدری، جابر بن عبداللہ، جابر بن سمرہ، اور ام المومنین ام سلمہ رضی اللہ عنہم سے مروی ہیں اور صحیح بخاری (۳۴۴۹، ۷۲۲۲)، مسلم: (۳۹۲، ۳۹۴، ۳۹۵، ۷۲۷۸، ۷۳۱۵، ۲۳۱۲، ۲۳۱۸)، ابو داؤد (۴۲۸۲، ۴۲۸۳، ۴۲۸۴، ۴۲۸۵)، ترمذی (۲۲۳۰-۲۲۳۲)، مسند احمد (۳۵۷۱-۳۵۷۳، ۴۰۹۸) صحیح ابن حبان (۵۹۵۳، ۵۹۵۴) میں موجود ہیں۔

۳۔ وہ صحیح موقوف اور مقطوع روایتیں جن میں ان کا ذکر آیا ہے ان کی تعداد ۱۱ ہے جو علی، عبداللہ بن عمرو، محمد بن سیرین، علی بن عبداللہ بن عباس، سعید بن مسیّب اور مطر بن طہمان رضی اللہ عنہم سے مروی ہیں۔

اس کثرت سے یہ حدیثیں اس امر پر دلالت کرتی ہیں کہ ظہور مہدی حق ہے اور ان سے متعلق بکثرت ضعیف اور موضوع روایتوں کے وجود سے ان صحیح حدیثوں کی صحت اور دلالت متاثر نہیں ہوتی، بلکہ ان کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔

تیسری مثال اقامت نماز

اسلام میں نماز عملی ارکان کا پہلا رکن ہے، تعداد کے اعتبار سے بھی اور ترتیب و درجہ کے اعتبار سے بھی، اقامت نماز سے اللہ کی کوئی شریعت بھی خالی نہیں رہی ہے اور اللہ کی اس شریعت، شریعت محمدی میں شہادتیں یا اللہ و رسول پر ایمان کے بعد مومن پر فرض کیا جانے والا یہ پہلا عمل ہے، اقامت نماز کے حکم سے قرآن پاک بھرا پڑا ہے، یہ ایمان اور کفر کے درمیان حد فاصل ہے، مگر نماز کی اس تمام تر اہمیت کے باوجود قرآن پاک میں نماز کی اقامت کا کوئی ایسا طریقہ نہیں بتایا گیا ہے جس پر عمل کر کے ایک مومن وہ نماز ادا کر سکتا ہو جو اللہ تعالیٰ کو مطلوب ہے، یہ صحیح ہے کہ قرآن میں قیام، رکوع اور سجود کا ذکر بھی آیا ہے اور قراءت قرآن کا بھی، اور قرآن سے نماز کے اوقات کا مبہم اشارہ بھی ملتا ہے، لیکن ان قرآنی بیانات کی روشنی میں کوئی شخص صحیح اور مطلوبہ وقت میں نماز کا کوئی ایک فعل بھی، مثلاً قیام بھی ادا نہیں کر سکتا، پوری نماز ادا کرنے کی بات تو الگ ہے۔

نماز سے متعلق مذکورہ بالا حقائق سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر نماز جیسی اہم عبادت، جو ایمان اور کفر کے درمیان حد فاصل ہے اور جو ایمان کی صحت کی علامت ہے، صرف قرآن کی روشنی میں ادا نہیں کی جا سکتی، تو پھر دین کے دوسرے فرائض کس طرح ادا کیے جا سکتے ہیں؟ اس سوال نے حدیث یا سنت کی ضرورت کو واضح کر دیا اور قرآن پر حدیث سے

Marfat.com

اضافہ کو ایک ناگزیر شرعی عمل قرار دے دیا، اس سے اس سوال کا جواب بھی مل گیا کہ تنہا اللہ تعالیٰ کے معبود برحق ہونے پر ایمان کے ساتھ محمد بن عبداللہ قریشی ہاشمی کو رسول ماننا کیوں فرض ہے؟ یعنی یہ معلوم ہو گیا کہ کوئی بھی عبادت اور کوئی بھی شرعی عمل اگر کتاب وسنت یا قرآن وحدیث سے اپنی دلیل نہیں رکھتا تو اللہ کے یہاں اس کا کوئی اعتبار نہیں ہے اور وہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کے اقرار واعلان کے منافی بھی ہے۔

یہاں یہ بتانا تحصیل حاصل ہے کہ نماز کی ہیئت، صفت اور طرز ادا ہر چیز، تکبیر تحریمہ سے لے کر سلام پھیرنے تک رسول اللہ ﷺ کی بیان کردہ اور متعین کردہ ہے اگرچہ اس کے بعض اعمال قرآنی حکم پر بھی بنی ہیں، دراصل نماز اللہ کے حکم اور رسول کے حکم کا حسین امتزاج ہے، اگر تکبیر تحریمہ، رفع یدین اور دعائے استفتاح رسول اللہ ﷺ کے قول اور فعل پر مبنی ہے، تو رکوع وسجود حکم الٰہی کی تعمیل سے عبارت ہیں، جن کی کیفیت رسول اللہ ﷺ کی بتائی ہوئی ہے، اس طرح اگر سورۂ فاتحہ اور نماز میں پڑھی جانے والی قرآنی آیات اور سورتیں اللہ کا کلام ہیں، تو رکوع وسجود، قعدہ، تشہد اور دوسری حالتوں کے اذکار، اور درود وسلام وغیرہ کلام رسول ہیں۔

دراصل حدیث سے قرآن پر اضافہ کی تعبیر اپنے حکم کے اعتبار سے غلط ہے کیونکہ جب قرآن کی رو سے اللہ کا حکم اور رسول کا حکم یکساں اور مساوی درجہ رکھتا ہے، تو پھر حدیث سے قرآن پر اضافے کے کیا معنی؟ مثال کے طور پر رسول اللہ ﷺ کا ارشاد: صلوا کما رایتمونی اصلی ''اس طرح نماز پڑھو جس طرح مجھے نماز پڑھتے دیکھا ہے۔''[1] اپنے حکم میں بالکل اللہ تعالیٰ کے حکم: اقیموا الصلوٰۃ ''نماز قائم کرو۔'' کی طرح ہے کیونکہ اسی نماز پر اقامت نماز کا اطلاق درست ہے جو رسول اللہ ﷺ کی نماز کی طرح ہو اور احادیث میں رسول اللہ ﷺ کی نماز اپنی تمام تفصیلات کے ساتھ اس طرح بیان کر دی گئی ہے کہ چشم تصور سے اس کو دیکھا جا سکتا ہے۔

یہاں یہ واضح کر دینا بھی ضروری ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے قول وفعل سے نماز کا جو طریقہ بتا دیا ہے وہ اللہ کے حکم: اقیموا الصلوٰۃ کا بیان نہیں، بلکہ مستقل تشریع ہے، اس کو شرح وبیان کا نام دینا اس وقت درست ہوتا جب قرآن میں نماز کی کوئی ہیئت اور صفت بیان کی گئی ہوتی اور حدیث میں اس کے بعض پہلوؤں کی وضاحت ہوتی، البتہ یہ حکم الٰہی: اقیموا الصلوٰۃ کی تعمیل ضرور ہے۔

چوتھی مثال پھوپھی اور بھتیجی اور خالہ اور بھانجی کو نکاح میں جمع کرنا

قرآن میں محرمات کا بیان:

اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب عزیز میں ان عورتوں کی فہرست بیان فرما دی ہے جن سے نکاح کرنا حرام ہے، ان میں سات قسم کی ایسی عورتیں ہیں جن سے نکاح کی حرمت دائمی ہے۔ یہ فہرست بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے نکاح کا،

[1] بخاری: ۶۳۱

Marfat.com

عارضی حرمت بیان فرمائی ہے جو دو بہنوں کو نکاح میں جمع کرنے سے متعلق ہے، ارشاد ربانی ہے: وَاَنْ تَجْمَعُوْا بَيْنَ الْاُخْتَيْنِ ''تمہارے اوپر یہ حرام کر دیا گیا ہے کہ تم (نکاح میں) دو بہنوں کو جمع کرو۔'' (سورۃ نساء:۲۳) چونکہ صلبی اور رضاعی بہنوں کا ایک ہی حکم ہے اس لیے ''جمع بين الاختين'' دونوں قسم کی بہنوں کو شامل ہے۔

قرآن پاک کی اس آیت میں صرف دو بہنوں کو نکاح میں جمع کرنے کو حرام قرار دیا گیا ہے، ان کے علاوہ دوسرے رشتے کی دو عورتوں کو جمع کرنے کا کوئی حکم نہیں بیان کیا گیا ہے۔

حدیث سے قرآن پر اضافہ:

لیکن رسول اللہ ﷺ نے پھوپھی اور بھتیجی اور خالہ اور بھانجی کو بھی بیک وقت نکاح میں جمع کرنے کو حرام قرار دیا ہے، ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

((لا يجمع بين المرأة وعمتها ولا بين المرأة وخالتها)) ❶

غامدی کی بڑ:

جاوید احمد غامدی کی بکواس یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نکاح میں پھوپھی کے ساتھ بھتیجی اور خالہ کے ساتھ بھانجی کو جمع کرنا جو حرام قرار دیا ہے، وہ آیت وَاَنْ تَجْمَعُوْا بَيْنَ الْاُخْتَيْنِ کے بعد محذوف ہے جس کو قرآن کا کوئی بھی طالب علم سمجھنے میں غلطی نہیں کر سکتا، لہٰذا لا يجمع بين المرأة وعمتها ولا بين المرأة وخالتها قرآن کے مدعا کا بیان ہے اس کے سوا کچھ نہیں ہے۔ ❷

تو ان کا یہ دعوی اور بکواس اس دعوی اور بکواس سے مختلف نہیں ہے جو انہوں نے اس سے قبل کی ہے کہ نزول قرآن سے پہلے عرب نماز، زکوٰۃ، روزہ اور حج سے واقف تھے اور یہ الفاظ سنتے ہی وہ یہ سمجھ گئے کہ ان سے کیا مطلوب ہے؟

نکاح میں پھوپھی اور بھتیجی اور خالہ اور بھانجی کو جمع کرنا قرآن کا بیان نہیں ہے:

دراصل غامدی صاحب شرح و بیان کے مفہوم ہی سے واقف نہیں، شرح و بیان کا تعلق مذکور سے ہوتا ہے اس تناظر میں اللہ تعالیٰ کے حکم کا بیان یہ ہے کہ ''اختین'' میں صلبی اور رضاعی بہنیں اور اخیافی علاتی بہنیں بھی داخل ہیں، اس طرح اس حکم میں ایسی دو لونڈیوں سے مباشرت بھی حرام ہے جو سگی بہنیں ہوں، یا رضاعی، اخیافی بہنیں ہوں یا علاتی لیکن غامدی کے سوا کوئی بھی انسان نکاح میں دو بہنوں کو جمع کرنے کی تعبیر سے پھوپھی اور بھتیجی اور خالہ اور بھانجی کو جمع کرنا نہیں سمجھ سکتا، اس لیے کہ ''اخت'' کے مفہوم میں پھوپھی، بھتیجی، خالہ اور بھانجی داخل نہیں ہیں۔

حدیث قرآن کا نسخ نہیں ہے:

مذکورہ حدیث قرآنی حکم کا نسخ بھی نہیں ہے جس کی تردید کے لیے موصوف نے یہ جھک ماری ہے اور اس کی تحدید

---

❶ بخاری: ۵۱۰۸۔۵۱۱۰۔ مسلم: ۱۴۰۸ ❷ ص ۴۵-۴۶

Marfat.com

وتخصیص بھی نہیں ہے، بلکہ ایک مستقل شرعی حکم ہے، جس کا تعلق ہے تو اسی حرمت سے جو اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں بیان فرمائی ہے لیکن وَ اَنْ تَجْمَعُوْا بَیْنَ الْاُخْتَیْنِ کے حکم میں لا یجمع بین المرأة وعمتها ولا بین المرأة وخالتها دور دور سے داخل نہیں ہے، لیکن چونکہ یہ حکم رسول اللہ ﷺ نے بیان فرما دیا، اس لیے غامدی نے بھی یہ فرما دیا کہ یہ تو مجھے معلوم تھا اور ان کے اسکول سے تعلق رکھنے والا قرآن کا ہر طالب علم وَ اَنْ تَجْمَعُوْا بَیْنَ الْاُخْتَیْنِ سنتے ہی یہ سمجھ گیا کہ الجمع بین المرأة وعمتها ولا بین المرأة وخالتها آیت کے بعد محذوف ہے اور اس کا بھی وہی حکم ہے جو آیت کا ہے۔ ❶

عجیب اتفاق:

ایک عجیب اتفاق ہے کہ فہم قرآن کے اس طرح کے مدعی ہر دور میں رہے ہیں جو حدیث سے پیچھا چھڑانے کے لیے اس طرح کے دعوے کرتے رہے ہیں، چنانچہ علامہ قرطبی نے الجامع لاحکام القرآن میں لکھا ہے کہ: کہا جاتا ہے کہ پھوپھی اور بھتیجی اور خالہ اور بھانجی کو نکاح میں جمع کرنے کی حرمت آیت ہی سے ماخوذ ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے دو بہنوں کو جمع کرنا حرام قرار دیا ہے اور عورت اور اس کی پھوپھی کے درمیان جمع کرنا دو بہنوں کے درمیان جمع کرنے ہی کے معنی میں ہے، یا اس لیے ہے کہ خالہ والدہ کے معنی میں ہے اور پھوپھی والد کے معنی میں، لیکن قرطبی نے اس کی تردید کرتے ہوئے فرمایا ہے: ان الکتاب والسنة کالشیء الواحد دراصل کتاب اور سنت ایک ہی چیز کی طرح ہیں۔ ❷

پانچویں مثال، حرام ماکولات

قرآن میں حرام ماکولات کا بیان:

سورہ بقرہ جو مدنی سورت ہے، اس میں حلال اور پاکیزہ چیزیں کھانے کا حکم دینے کے بعد اللہ تعالیٰ نے حصر اور متعین طور پر وہ چیزیں بیان فرمائی ہیں جن کا کھانا اس نے حرام قرار دے دیا ہے، ارشاد الٰہی ہے:

﴿اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَیْکُمُ الْمَیْتَةَ وَ الدَّمَ وَ لَحْمَ الْخِنْزِیْرِ وَ مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَیْرِ اللّٰهِ﴾ (البقرة: ۱۷۳)

''اس نے تو تم پر صرف مردار، اور خون اور سور کا گوشت اور ہر وہ چیز حرام کر دی ہے جس پر غیر اللہ کا نام لیا جائے۔''

آیت میں حرمت کو جن چار چیزوں میں محصور کر دیا گیا ہے تو اس حصر کا سبب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ وہ بنیادی چار چیزیں ہیں جو حرام ہیں اور دوسری آیتوں میں جن حرام چیزوں کا بیان ہے، وہ ان میں داخل ہیں، مثلاً: سورۂ مائدہ کی آیت نمبر ۳ میں وَ الْمُنْخَنِقَةُ وَ الْمَوْقُوْذَةُ وَ الْمُتَرَدِّیَةُ وَ النَّطِیْحَةُ وَ مَآ اَکَلَ السَّبُعُ گلا گھٹ کر، چوٹ کھا کر، بلندی

❶ بخاری: ۵۱۰۸، ۵۱۱۰۔ مسلم: ۱۴۰۸ ❷ ج ۳/ص ۸۷

Marfat.com

سے گر کر اور سینگ لگنے سے مرنے والے اور جسے درندے نے پھاڑ کھایا ہو تو یہ پانچوں میتہ میں داخل ہیں اور " وَ مَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ " .... " وَ مَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ" میں بھی داخل ہے۔

اور سورۂ انعام کی آیت نمبر ۱۴۵ میں بھی انہی چار چیزوں کا ذکر ہے، البتہ "دما" کے اجمال کو "مسفوحا" سے کھول دیا گیا ہے، یعنی ہر خون حرام نہیں ہے، بلکہ صرف وہ خون حرام ہے جو 'بہایا' گیا ہو۔

اور سورۂ نحل کی آیت نمبر ۱۱۵ میں بھی انہی چار چیزوں کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ اور ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ ان آیتوں کا ظاہری اختلاف اجمال اور تفصیل کا اختلاف ہو۔

حدیث سے قرآن کے حرام ماکولات میں اضافہ

رسول اللہ ﷺ نے قرآن کے حرام کردہ ان ماکولات میں ایسے چند اضافے کیے ہیں جن کا ذکر مذکورہ بالا چاروں آیتوں میں سے کسی میں بھی نہیں آیا ہے:

۱۔ ابو ثعلبہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

((ان رسول اللہ ﷺ نهى عن اكل كل ذى ناب من السباع)) ❶

"رسول اللہ ﷺ نے ہر کچلی والے جانور کو کھانے سے منع فرمایا ہے۔"

۲۔ صحیح مسلم میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہتے ہیں:

((نهى رسول الله ﷺ عن كل ذى ناب من السباع وعن كل ذى مخلب من الطير)) ❷

"رسول اللہ ﷺ نے ہر کچلی والے جانور اور ہر پنجے والے پرندے سے منع فرمایا ہے۔"

۳۔ جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، کہتے ہیں:

((نهى النبى ﷺ يوم خيبر عن لحوم الحمر ورخص فى لحوم الخيل)) ❸

"نبی ﷺ نے غزوہ خیبر کے موقع پر گدھوں کے گوشت سے منع فرمایا اور گھوڑوں کا گوشت کھانے کی اجازت دی۔"

ملت ابراہیمی کے حرام ماکولات

قرآن پاک میں مذکور حرام ماکولات میں حدیث سے اضافہ کی بحث کے درمیان ملت ابراہیم کے حرام ماکولات کا ذکر اس وجہ سے چھیڑنا پڑ گیا کہ جاوید احمد غامدی کے امام مولانا اصلاحی صاحب نے سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۱۷۳ میں مذکورہ محرمات کو ملت ابراہیمی کی محرمات قرار دیا ہے ❹ جبکہ اس آیت اور سورۂ مائدہ کی آیت نمبر ۳ اور سورۂ انعام کی آیت

---

❶ بخاری: ۵۵۳۰۔ مسلم: ۱۹۳۲ ❷ مسلم: ۱۹۳۴ ❸ بخاری: ۵۵۲۰۔ مسلم: ۱۹۴۱

❹ تدبر قرآن ص: ۳۷۰، ج ۱

Marfat.com

نمبر ۱۴۵ کے آگے پیچھے ایسی کوئی آیت نہیں آئی ہے کہ جو اس امر پر دلالت کرتی ہو کہ ان آیتوں میں جو چار چیزیں حرام قرار دی گئی ہیں ''وہ اصلاً ملت ابراہیم میں حرام ٹھہرائی گئی تھیں۔'' بلکہ اس کے برعکس سورۂ انعام کی آیت ۱۴۴ تو اس امر میں صریح ہے کہ مشرکین نے اونٹوں، گائیوں اور بھیڑ بکریوں میں سے بعض مخصوص جانوروں کو حرام اور ان کے پیٹ کے بچوں میں زندہ بچوں کو عورتوں کے لیے حرام اور مردہ کو سب کے لیے حلال قرار دے رکھا تھا تو یہ تحلیل وتحریم اللہ کے کسی حکم پر مبنی نہیں تھی، اس آیت میں اس بات کی طرف کوئی معمولی سا اشارہ بھی نہیں ہے کہ مشرکین مذکورہ چیزوں کی حلت وحرمت کو ملت ابراہیم سے منسوب کرتے تھے۔

پھر جب اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو یہ حکم دیا کہ آپ یہ اعلان کر دیں کہ آپ کو جو وحی کی گئی ہے اس میں تو صرف یہی چار چیزیں حرام ٹھہرائی گئی ہیں، تو یہ دراصل مشرکین کی خودساختہ حلت وحرمت کی تردید کی غرض سے تھا، ورنہ حرام ماکولات یا حرام چیزیں انہی چاروں میں محصور نہیں ہیں، اس آیت میں دور دور سے بھی اس امر کی جانب کوئی اشارہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ سے یہ وضاحت ملت ابراہیم کے ضابطہ حلت وحرمت سے متعلق کرائی تھی۔

امر واقعہ یہ ہے کہ اصلاحی صاحب کی تحریروں سے اشارۃ اور غامدی صاحب کی تحریروں سے صراحتاً یہ معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ ''ملت ابراہیمی'' کے مجدد تھے اپنے اس باطل اور غیر اسلامی نظریہ میں جان ڈالنے کے لیے ان دونوں نے ملت ابراہیم کو ''شریعت ابراہیم'' قرار دے ڈالا ہے، جب کہ پورے قرآن پاک میں ملت ابراہیم ''ملت توحید'' کے معنی میں آئی ہے جس میں شرعی احکام داخل نہیں ہیں، میں نے قرآنی آیات کی روشنی میں ملت اور دین کی جو تشریح کی ہے اس کو دوبارہ دیکھ لیں، حقیقت حال سامنے آجائے گی۔

میں سورۂ نحل کی آیت نمبر ۱۲۳ کا مفہوم اور مدعا بیان کرتے ہوئے یہ عرض کر چکا ہوں کہ نزول قرآن کے وقت تین گروہ ابراہیم علیہ السلام سے اپنا رشتہ وناطہ جوڑتے تھے اور ان کا نسب نامہ ان سے ملتا بھی تھا، یہودی، نصاریٰ اور مشرکین، جب کہ ابراہیم علیہ السلام امام الموحدین تھے اور یہ تینوں مشرک۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے یہ اعلان فرما دیا کہ ان تینوں میں ابراہیم سے قرابت رکھنے والے صرف وہ لوگ ہیں جنہوں نے اسلام کی آمد سے پہلے ان کی پیروی کی، اور یہ نبی ﷺ اور آپ پر ایمان والے، ارشاد ربانی ہے:

﴿اِنَّ اَوْلَى النَّاسِ بِاِبْرٰهِيْمَ لَلَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ وَهٰذَا النَّبِيُّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ (آل عمران: ٦٨)

''درحقیقت لوگوں میں ابراہیم سے نسبت کے سب سے زیادہ حق دار وہ ہیں جنہوں نے اس کی پیروی کی اور یہ نبی اور جو اس پر ایمان لائے اور اللہ مومنین کا متولی ہے۔''

آیت میں ''الناس'' سے مراد یہود ونصاریٰ اور مشرکین ہیں۔ ''اتبعوا'' سے مراد نبی ﷺ کی بعثت سے پہلے

Marfat.com

ابراہیم آیت کی پیروی کرنے والے ہیں اور "هٰذَا النَّبِی" سے مراد نبی ﷺ پر ایمان لانے والے ہیں۔

ہمارے نبی ﷺ کی بعثت سے پہلے ابراہیم آیت کے پیرو وہ تھے جو پورے دین میں یعنی اصول وفروع میں اور عقائد وشرائع میں ان کے پیرو تھے اسی وجہ سے ان کا ذکر پہلے ہے، رہے ہمارے نبی محمد بن عبداللہ ﷺ اور آپ پر ایمان لانے والے تو یہ اصول دین یعنی ''توحید'' میں تو ابراہیم علیہ السلام کے پیرو تھے، کیونکہ تمام انبیاء اور رسول اصلاً توحید ہی کی دعوت دینے کے لیے بھیجے گئے تھے:

﴿وَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ﴾

(الانبیاء: ۲۵)

''اور ہم نے تم سے پہلے جو رسول بھی بھیجا اس کی طرف یہی وحی کرتے رہے کہ بلا شبہ میرے سوا کوئی معبود نہیں، لہٰذا میری ہی عبادت کرو۔''

لیکن توحید کے سوا دعوت دین کے طریقہ کار اور شریعتوں میں رسولوں کے درمیان اختلاف تھا اور ان امور میں کوئی رسول اپنے سابق رسول کی پیروی کا پابند نہیں تھا جس پر خود قرآن دلیل ہے:

﴿لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّ مِنْهَاجًا﴾ (المائدة: ۴۸)

''تم میں سے ہر ایک کے لیے ہم نے ایک شریعت اور ایک راہ عمل مقرر کی ہے۔''

اور نبی کریم ﷺ سے فرمایا: ((ثم جعلنٰك على شريعة من الأمر فاتبعها و موتتبع أهواء الذين لا يعلمون)) ''پھر ہم نے تمہیں دین کے ایک طریقے کا پابند بنا دیا سو اس کی پیروی کرو اور ان لوگوں کی خواہشات کے پیچھے نہ چلو جو نہیں جانتے۔'' (جاثیہ: ۱۸) یہ آیت بنو اسرائیل اور ان کے اختلافات کے ذکر کے بعد آئی ہے۔

لہٰذا نبی ﷺ اور آپ پر ایمان لانے والے شرعی احکام میں ابراہیم علیہ السلام کے پیرو نہیں تھے، حتیٰ کہ شریعت کے جن احکام میں اتفاق بھی تھا، ان میں بھی ہمارے نبی ﷺ ابراہیم علیہ السلام کے پیرو نہیں، وحی الٰہی کے پیرو تھے یہاں تک کہ اگر ابراہیم علیہ السلام دوبارہ زندہ کر دیے جائیں تو ان پر ہمارے نبی ﷺ کی پیروی فرض ہوگی، کیونکہ ہمارے نبی ﷺ تمام انبیاء اور رسولوں سے افضل ہیں، جن میں ابراہیم شامل ہیں اور آپ پر ایمان لانے والے اور آپ کی پیروی کرنے والے ابراہیم علیہ السلام پر ایمان لانے والوں اور ان کی پیروی کرنے والوں سے افضل ہیں۔

بیان شریعت یا بیان فطرت:

اوپر بعض جانوروں کی حرمت سے متعلق جو صحیح احادیث نقل کی گئی ہیں ان میں بعض ایسے جانوروں کے گوشت کو حرام قرار دیا گیا ہے، جن کا ذکر قرآنی آیات میں نہیں آیا ہے اس طرح یہ احادیث قرآنی حکم میں اضافہ کا درجہ رکھتی ہیں، غامدی صاحب نسخ، تحدید اور تخصیص کے مفہوم سے ناآشنا ہیں اور وہ ان کا ذکر ایک ساتھ کرتے ہیں اور حدیث سے

Marfat.com

قرآن کی تحدید و تخصیص کے منکر ہیں۔ اوپر ان کے اس خیال کی تردید کی جا چکی ہے۔

ان کا ایک نیا انکشاف فطرت سے متعلق ہے ان کا دعوی ہے کہ اسلام میں جانوروں کی حلت و حرمت کا تعلق شریعت سے نہیں ہے، بلکہ فطرت سے ہے ان کے یہ افکار ان کے امام ہی سے ماخوذ ہیں یا انہی کے ''افادات'' ہیں، لیکن ان پر انہوں نے اپنی چھاپ لگا دی ہے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ جانوروں کی حلت و حرمت میں شریعت کا موضوع اصلاً یہ چار چیزیں ہی ہیں۔'' ❶

فطرت کیا ہے؟:

"فِطرَت" اپنے معنی اور استعمال میں خِلقَت کی طرح ہے، کہتے ہیں:

فَطَرَ یَفطُرُ فَطْرًا وَ فِطْرَۃً بَاب نَصَرَ یَنْصُرُ ایجاد کرنا، وجود میں لانا، پیدا کرنا۔

خَلَقَ یَخْلُقُ خَلْقًا وَ خِلْقَۃً بَاب نَصَرَ یَنْصُرُ ایجاد کرنا، عدم سے وجود میں لانا، پیدا کرنا۔

قرآن پاک میں "فطرۃ" ایک بار آیا ہے۔ (سورہ روم: ۳۰) اسی سے اللہ تعالیٰ کی صفت ''فاطر'' بنی ہے جو آسمان وزمین کی طرف اضافت کے ساتھ: "فاطر السموات و الارض" ۶ بار آئی ہے۔ قرآن پاک میں فعل ماضی کی شکل میں اللہ تعالیٰ کی صفت کے طور پر بھی اس کا استعمال ہوا ہے۔

"فاطر" اللہ تعالیٰ کی صفت ہے، نام نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کی جو صفات صرف ''مضاف'' بن کر آئی ہیں وہ اس کا نام نہیں ہیں۔

ایک سورت کا نام بھی ''فاطر'' ہے۔

قرآن میں اللہ تعالیٰ کی صفت کے طور پر ''خلقت'' کا لفظ نہیں آیا ہے، البتہ ''خلق'' کی صورت میں متعدد بار آیا ہے، یہ بھی ''خلقت'' کی طرح مصدر ہے، اللہ تعالیٰ کا صفاتی نام: ''خالق'' اور ''خلاق'' قرآن پاک میں متعدد بار آیا ہے۔

فطرت کے مترادف:

۱۔ خلقۃ (پیدائشی حالت، صفت، ہیئت، ساخت)

۲۔ سجیۃ (عادت، طبیعت، مزاج)

۳۔ خُلق (عادت، طبیعت، خصلت اور وہ صفت جس سے افعال کا صدور ہوتا ہے)

۴۔ بدیھۃ (غور و فکر کے بغیر حاصل ہونے والا علم) جبلۃ (خلقت، فطرت)

فطرت احکام و شرائع کی معرفت کا ذریعہ نہیں:

توحید اس کائنات کی سب سے بڑی حقیقت ہے، توحید سے میری مراد صرف اللہ تعالیٰ کے معبود ہونے کا اعتراف

❶ ص ۴۲

Marfat.com

ہے، کیونکہ تنہا اس کے رب ہونے کو تو مشرک قومیں بھی مانتی ہیں، صرف صوفیا کی جماعت ایسی ہے جو توحید ربوبیت میں بھی شرک کا ارتکاب کرتی ہے اور اپنے پیروں اور مرشدوں اور اکابر صوفیا کو امور کائنات میں صاحب تصرف مانتی ہے۔

تنہا اللہ تعالیٰ کے معبود برحق ہونے کا احساس ایک فطری احساس ہے، جبکہ شرک فطرت کے خلاف ہے اسی وجہ سے احادیث میں ہر نومولود کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ وہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے اور اس کے ماں باپ اس کو شرک میں مبتلا کر دیتے ہیں۔

معلوم ہوا کہ ایک انسان اگر اپنی فطری حالت پر باقی رہے تو شرک کا ارتکاب نہیں کر سکتا، وہ شرک کی طرف گرد و پیش کے حالات، ماں باپ اور ماحول کے دباؤ سے مائل ہوتا ہے۔ اللہ کے سوا کسی اور کو معبود بنانا اس بہترین ساخت، اس بے آمیز خلقت اور اس پاکیزہ صفت کے منافی ہے جس پر انسان پیدا ہوتا ہے۔

لیکن توحید کے سوا دوسرے حق و باطل میں تمیز، معروف و منکر کی پہچان اور حلال وحرام کی معرفت تنہا فطرت سے ممکن نہیں ہے، دوسرے لفظوں میں تنہا فطرت ان احکام و شرائع کی معرفت کا ذریعہ نہیں ہے جن پر چل کر اور جن کی پابندی کر کے ایک انسان اللہ کا محبوب اور صالح بندہ بنتا ہے۔

سورۂ روم کی جس آیت میں لوگوں کے ''فطرت'' پر پیدا کیے جانے کی خبر دی گئی ہے اس میں فطرت سے مراد یہی توحید ہے دین کے دوسرے احکام نہیں اور یہ توحید بھی اجمالی ہے اللہ تعالیٰ نے اپنے جو رسول اپنی کتابوں کے ساتھ بھیجے انہوں نے ان کتابوں کے ذریعہ اور ان کی اپنی قولی اور عملی تفسیر کر کے جہاں توحید کی تمام قسموں اور ان کے تمام پہلوؤں کو واضح کیا وہیں زندگی کے تمام امور سے متعلق اللہ تعالیٰ کی ہدایات پر عمل کرنا سکھایا۔

فطرت شرعی احکام سے ہم آہنگ ہے:

فطرت کے پاس حلال وحرام کی تفصیلات نہیں ہیں، فطرت یہ نہیں بتا سکتی کہ معروف کیا ہے اور منکر کیا ہے، اسی طرح فطرت ان جانوروں کی فہرست نہیں بتا سکتی جو حلال ہیں اور نہ ان جانوروں کے نام بتا سکتی ہے جو حرام ہیں، لیکن شریعت نے جن جانوروں کو حلال قرار دیا ہے یا جن کا کھانا حرام ٹھہرایا ہے ان کو مانتی ہے اور ان سے اتفاق کرتی ہے۔

کھانے پینے کی اشیا میں اسلامی قاعدہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس زمین پر پائی جانے والی ہر چیز انسانوں کے لیے پیدا کی ہے:

﴿هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا﴾ (البقرة: ٢٩)

''وہی تو ہے جس نے زمین میں پائی جانے والی تمام چیزیں تمہارے لیے پیدا کی ہیں۔''

اس سے یہ معلوم ہوا کہ کھانے پینے کی ہر چیز حلال ہے، سوائے ان کے جن کو اللہ و رسول نے نام لے کر حرام کر دیا ہے یا حرام قرار دے دیا ہے۔

Marfat.com

نبی بیان شریعت کا مکلف ہوتا ہے بیان فطرت کا نہیں:

رسول اللہ ﷺ نے قرآن سے زائد جن جانوروں کو کھانے سے منع فرمایا ہے، تو اپنے منصب رسالت کے تحت اور آپ شریعت کے بیان کے مکلف تھے فطرت کے بیان کے نہیں۔ البتہ آپ کا بیان فطرت سے ہم آہنگ ہوتا تھا۔ یہ غامدی اور ان کے ہم نواؤں کی غلطی ہے ان لوگوں کی نہیں جو رسول اللہ ﷺ کو قرآن کا شارح مانتے ہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو جن مناصب پر فائز کیا تھا ان میں سے ایک شرح و بیان کتاب بھی ہے۔ شرح و بیان فطرت نہیں!!

حدیث سے قرآن کا نسخ:

میں اوپر یہ واضح کر چکا ہوں کہ حدیث سے قرآن کے نسخ کا کوئی واقعہ ثابت نہیں ہے، ورنہ عقلاً اور شرعاً صحیح اور درست ہوتا، اس لیے کہ نبی ﷺ کا ہر عمل باذن خداوندی تھا، اور قرآن و حدیث اپنی تشریعی حیثیت میں یکساں درجہ رکھتے ہیں۔

جاوید غامدی نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ نبی ﷺ نے کچلی والے درندوں، چنگال والے پرندوں اور پالتوں گدھے کا گوشت کھانے سے منع فرمایا ہے تو یہ اس فطرت کا بیان ہے جس کا علم انسان کے اندر ودیعت کیا گیا ہے، اگر ہم چاہیں تو ممنوعات کی اس فہرست میں بہت سی دوسری چیزیں بھی اس علم کی روشنی میں شامل کر سکتے ہیں۔'' ❶

تو عرض ہے کہ یہ غامدی کی بڑ ہے، بڑ کے علاوہ کچھ نہیں میں نے اوپر فطرت اور اس کے جو مترادفات بیان کیے ہیں ان کی روشنی میں ''فطرت'' ایک مبہم اور غیر واضح میلان اور جذبہ کا نام ہے جو خیر و شر کے خلط ملط ہونے کی صورت میں خیر پر ابھارتی ہے اور چونکہ ''توحید'' سب سے بڑا حق ہے اور شرک مبغوض ترین باطل ہے، اس لیے جو فطرت خارجی اثرات سے پاک ہو وہ احساس و شعور کی صورت میں توحید کی تائید اور شرک کی تردید کرتی ہے قرآن کے اسلوب سے معلوم ہوتا ہے کہ فطرت ہی توحید ہے اور توحید ہی فطرت ہے۔ (سورۂ روم: ۳۰) اور حدیث میں فطرت کو جانوروں کے بے عیب نوزائیدہ بچوں سے تشبیہ دی گئی ہے۔ ❷

لیکن فطرت علم نہیں ہے، ورنہ لوگوں کی ہدایت کے لیے رسولوں کی بعثت اور ان کے ساتھ میزان اور فرقان کی صفت سے موصوف کتابیں بھیجنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

حدیث قرآن کے کسی حکم کا نہ تو ازالہ۔ نسخ۔ کرتی ہے اور نہ اس کے مدعا میں تبدیلی لہٰذا بار بار قرآن کی محبت میں مگرمچھ کے آنسو بہانے کی قطعاً ضرورت نہیں۔ شرح و بیان اور اضافہ نہ نسخ ہے اور نہ قرآن کے مدعا میں تبدیلی، ورنہ خود قرآن پر تضاد بیانی کا الزام لگ جائے گا۔

---

❶ ص ۴۳ ❷ بخاری: ۱۳۵۹، ۴۷۷۵، ۶۵۹۹، مسلم: ۲۶۵۸

Marfat.com

انسانوں کی اکثریت کی لغت میں ممنوعات کا وجود نہیں:

آج دنیا کی آبادی کا بڑا حصہ کھانے پینے کی اشیاء میں ممنوعات کا قائل نہیں، چین، تھائی لینڈ، فلپائن، جاپان اور ویٹ نام وغیرہ میں ہر جانور کھائے جاتے ہیں اور ترقی یافتہ یورپ و امریکہ کی محبوب اور مرغوب غذا سور کا گوشت ہے، کیا اتنی بڑی تعداد میں لوگوں کی فطرت مسخ ہو چکی ہے اور فطرت میں ودیعت علم کا نور بجھ گیا ہے؟

استدلال کا ایک انداز یہ بھی:

غامدی صاحب نے بعض جانوروں کے عمومی استعمال سے بھی ان کی حلت وحرمت پر استدلال کیا ہے ان کا دعویٰ ہے کہ ''انسان اپنی فطرت سے یہ جانتا ہے کہ گھوڑے اور گدھے دستر خوان کی لذت کے لیے نہیں سواری کے لیے پیدا کیے گئے ہیں۔'' ❶

اس عبارت سے انہوں نے اس حدیث پر اعتراض کیا ہے جس میں گھوڑے کے گوشت کی حلت بیان ہوئی ہے۔

میں موصوف اور ان جیسی ذہنیت رکھنے والوں سے یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ بلاشبہ گھوڑے سواری کے لیے پیدا کیے گئے، مگر ان کا یہ استعمال ان کی حرمت کا تقاضا تو نہیں کرتا، ورنہ اونٹ کا گوشت بدرجۂ اولیٰ حرام ہوتا، جو قرآن کے اولین مخاطب عربوں کے نزدیک سب سے اہم اور سب سے قیمتی جانور تھا، اور بنیادی طور پر سواری کے لیے استعمال ہوتا تھا۔

گائے کا گوشت تو مرغوب ترین اور لذیذ ترین غذا ہے، جبکہ قرآن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ گائے اور بیل کو اصل میں ہل چلانے اور پانی ڈھونے میں استعمال کیا جاتا ہے۔

غامدی صاحب! آپ نے جو یہ فرمایا ہے کہ: ''اس دنیا میں اللہ تعالیٰ نے جو جانور پیدا کیے ہیں ان میں سے بعض کھانے کے ہیں اور بعض کھانے کے نہیں ہیں، یہ دوسری قسم کے جانور اگر کھائے جائیں تو اس کا اثر چونکہ انسان کے تزکیہ پر پڑتا ہے اس لیے ان سے ابا اس کی فطرت میں داخل ہے۔'' ❷

سوال یہ ہے کہ پورا جنوب مشرق ایشیا، چین، پورا افریقہ، یورپ و امریکہ کیا فطرت رکھنے والے انسانوں سے خالی ہو گیا ہے کہ ان کے یہاں ماکولات میں کوئی استثنا ہے ہی نہیں۔؟!!

غامدی صاحب! دین کے نام پر لوگوں کو گمراہ کرنا اور فریب دینا چھوڑ دیجیے۔ جزاك الله خيراً.

---

❶ ص ۱۴۱ ❷ ایضاً

Marfat.com

باب ہشتم:

حدیث اور فقہاء

فقہاء سے میری مراد فقہائے احناف ہیں اور وہ بھی برصغیر کے احناف، یہ اپنے آپ کو اہل سنت و جماعت بھی کہتے ہیں، حدیث سے اپنے تعلق خاطر کا بھی اظہار کرتے ہیں اور حدیث کی کتابیں پڑھتے اور پڑھاتے بھی ہیں، لیکن حدیث اور اہل حدیث دونوں سے پرخاش رکھتے ہیں، میں اس باب میں حقائق بیان کرنے سے قبل، حدیث سے احناف کے تعلق کے بارے میں بعض اکابر احناف کی شہادت پیش کر دینا مناسب سمجھتا ہوں۔

و شهد شاهد من أهلها:

شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کا ذکر خیر اس کتاب میں مختلف حوالوں سے آ چکا ہے، آپ اور آپ کے آباء و اجداد کا شمار تو احناف ہی میں ہوتا تھا، مگر مرتبۂ اجتہاد پر فائز ہونے اور علم اور اہل علم کے قدر شناس ہونے کی وجہ سے آپ نے جس جماعت یا فرد کے بارے میں کوئی بات فرمائی، کوئی رائے دی اور کوئی حکم لگایا تو تعصب مسلکی سے بالکل پاک ہو کر، حنفی ہونے کے باوجود شاہ صاحب ناصر السنۃ امام شافعی رحمہ اللہ کے جس قدر مداح تھے اور جس قوت سے انہوں نے امام موصوف کو "مجتہد مطلق مستقل" کی صفات سے موصوف قرار دیا ہے۔ [1] وہ ان کی حق پسندی اور حق گوئی پر دلیل ہے۔

شاہ ولی اللہ نے "الانصاف" میں پوری صراحت کے ساتھ یہ لکھ دیا ہے کہ تیسری صدی ہجری کے بعد ہی سے "مسلک حنفی" میں "مجتہدین مطلق منتسب" کے ظہور کا سلسلہ بند ہے اور اس کی جو وجہ بتائی ہے وہ ان کے الفاظ میں یہ ہے:

((و ذلك لانه لا يكون الا محدثا جهبذا و اشتغالهم بعلم الحديث قليل قديما و حديثا))

"اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی کے "مجتہد مطلق منتسب" ہونے کے لیے ضروری ہے کہ وہ ناقدانہ صلاحیت کا مالک "محدث" ہو، جبکہ علم حدیث سے احناف کی وابستگی پہلے بھی کم رہی ہے اور بعد میں بھی۔" [2]

شاہ ولی اللہ نے حدیث سے احناف کی لاتعلقی کی جو بات فرمائی ہے وہ امر واقعہ کی ترجمان ہے جس کی تائید فقہ حنفی کی امہات الکتب سے ہوتی ہے کہ ان میں صحیح حدیثوں سے کم اور ضعیف، باطل اور موضوع حدیثوں سے زیادہ استدلال کیا گیا ہے اس لیے کہ ان کے مصنفین کو حدیث کا "واجبی" علم بھی نہیں تھا میرے اس دعوے کی تصدیق "نصب الرايه تخريج احاديث الهداية" سے ہوتی ہے جس کے مصنف حافظ زیلعی حنفی عالم حدیث تھے۔ اب اگر "الهداية"

---

[1] الإنصاف ص ۱۲۵۔ [2] ص ۱۲۹

Marfat.com

جیسی اہم اور بنیادی فقہی کتاب کے مصنف ''مرغینانی'' کی حدیث دانی کا یہ حال تھا تو ایروں غیروں کا کیا حال ہوگا۔ اس کے باوجود کسی بھی حنفی عالم اور مصنف کا لقب محدث سے کم نہیں ہوتا۔

تحصیل حدیث کا مقصد مسلک حنفی کی تائید:

احناف کا، احادیث سے استدلال کا جو طریقہ ہے اس سے بادنی تأمل یہ عیاں ہوتا ہے کہ اس مقدس علم کے تعلیم و تعلم سے ان کا مقصد یہ نہیں رہا ہے کہ اسلام کے اس دوسرے شرعی ماخذ میں ان کو بصیرت حاصل ہو، بلکہ وہ اس مقصد سے حدیث پڑھتے اور پڑھاتے رہے ہیں کہ حدیث سے ان کو ایسے دلائل حاصل ہوں جن کے ذریعہ وہ مسلک حنفی کو تمام دوسرے مسلکوں سے افضل ثابت کر سکیں چنانچہ مولانا ابو الحسن علی ندوی رحمہ اللہ اپنی کتاب: ''تاریخ دعوت وعزیمت، حصہ پنجم'' میں ہندوستان میں علم حدیث کے عروج و زوال کا جائزہ لیتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

> ''لیکن بعض معلوم اور بعض نامعلوم اسباب کی بنا پر ان حضرات کی انفرادی مساعی سے ہندوستان میں حدیث کی طرف وہ رجوع عام اور اس کی اشاعت و درس و تدریس میں وہ جوش و سرگرمی پیدا نہیں ہوئی جس کی توقع تھی شاید اس وجہ سے بھی کہ ان حضرات پر حدیث کے ذریعہ مذہب حنفی کی تائید کا جذبہ و رجحان غالب تھا۔'' [1]

مولانا علی میاں نے یہ بات اگرچہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے کارنامے کو اجاگر کرتے ہوئے فرمائی ہے، گویا ان کا دامن اس ''دھبہ'' سے پاک تھا، لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ احناف کے جن اکابر کے ناموں کے ساتھ محدث کا لقب لگا ہوا ہے وہ اپنی خدمت حدیث میں مخلص نہیں تھے، نہ عبدالحق محدث دہلوی اور نہ مولانا شاہ محمد اسحاق اور نہ شاہ محمد یعقوب، سب کی محنتوں اور کاوشوں کا مقصد تمام مسلکوں پر مسلک حنفی کی برتری کا اثبات تھا۔

میرے اس دعوے پر برصغیر کے حنفی محدثین کی کتابیں اور تحریریں اور سب سے بڑے محدث علامہ محمد انور شاہ کشمیری کا اعتراف دلیل ہے۔

احساس ندامت:

علم حدیث کے حوالہ سے علامہ کشمیری کو جو شہرت حاصل ہے اس کو چراغ دکھانے کی ضرورت نہیں ہے اس کتاب کے گزشتہ صفحات میں حدیث کی مزعوم عدم کتابت کی ان کی توجیہ اور ائمہ نقد کی جرح و تعدیل پر ان کے ''ریمارک'' کا بھرپور جائزہ لے چکا ہوں، اور آئندہ ان کی حدیث دانی کے نمونے بھی پیش کروں گا، یہاں میں اس احساس ندامت کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو زندگی کے آخری مرحلے میں ان کو لاحق ہو گیا تھا۔

معروف عالم اور مفتی محمد شفیع تحریر فرماتے ہیں:

[1] ص ۱۸۲

Marfat.com

''قادیان کے جلسہ کے موقع پر نماز فجر کے وقت حاضر ہوا تو دیکھا کہ حضرت کشمیری صاحب سر پکڑے مغموم بیٹھے ہیں۔ میں نے پوچھا: حضرت! کیسا مزاج ہے؟ کہا: ٹھیک ہی ہے، میاں مزاج کیا پوچھتے ہو؟ عمر ضائع کر دی ہے۔

میں نے عرض کیا:

''حضرت آپ کی ساری عمر علم کی خدمت میں، دین کی اشاعت میں گزری ہے، ہزاروں آپ کے شاگرد علماء اور مشاہیر ہیں جو آپ سے مستفید ہوئے اور خدمت دین میں لگے ہوئے ہیں، آپ کی عمر اگر ضائع ہوئی تو پھر کس کی عمر کام میں لگی؟!''

فرمایا:

''میں تمہیں صحیح کہتا ہوں عمر ضائع کر دی۔''

میں نے عرض کیا:

''حضرت بات کیا ہے؟''

فرمایا:

''ہماری عمر کا، ہماری تحریروں کا، ہماری ساری کد و کاوش کا خلاصہ یہ رہا ہے کہ دوسرے مسلکوں پر حنفیت کی ترجیح قائم کر دیں، امام ابوحنیفہ کے مسائل کے دلائل تلاش کریں اور دوسرے ائمہ کے مسائل پر آپ کے مسلک کی ترجیح ثابت کریں، یہ رہا ہے محور ہماری کوششوں کا تقریروں کا اور علمی زندگی کا، اب غور کرتا ہوں تو دیکھتا ہوں کہ کس چیز میں عمر برباد کی۔'' [1]

علامہ کشمیری کا مبلغ علم:

ایک محدث، جو ناقدِ رجال بھی ہو، جو بات زبان سے نکالتا ہے بہت غور و خوض کے بعد اور اس کی صداقت کا یقین کر لینے کے بعد نکالتا ہے، اس لیے کہ اس کی بات سند کا درجہ رکھتی ہے جس کا حوالہ دیا جاتا ہے۔

کشمیری نے صحیح بخاری کی اپنی شرح ''فیض الباری'' میں جلیل القدر محدث بقی بن مخلد رحمہ اللہ کے ایک خواب کا ذکر کیا ہے جو وحدۃ الوجود کے داعی زندیق صوفی ابن عربی کی کتاب ''فصوص الحکم'' میں مذکور ہے یہ خواب تو اس قابل نہیں ہے کہ اس کو بیان کیا جائے، لیکن چونکہ محدث کشمیری اس زندیق سے بھی بڑی عقیدت رکھتے تھے اور اس کو ''شیخ اکبر'' مانتے تھے اس لیے اس کو بیان کر دیا، مگر میں بقی بن مخلد کے بارے میں علامہ کشمیری کی فراہم کردہ معلومات پر تبصرہ کرنے کی غرض سے ان کا ذکر کر رہا ہوں، فرماتے ہیں:

''یاد رہے کہ ''بقی'' کا املا فیض الباری فہرست اور متن میں ''بقیع'' کیا گیا ہے، یہ بقیع بڑے جلیل القدر

[1] بحوالہ تذکرۃ الشیخین، ص: ۶۸-۶۹۔

Marfat.com

محدث تھے، ان کا شمار احمد رحمہ اللہ کے شاگردوں میں ہوتا ہے، انہوں نے حدیث میں ایک کتاب تصنیف کی ہے جس میں ۳۰ ہزار حدیثیں جمع کی ہیں، یہ بقیع بخاری کے معاصر تھے اور احمد سے بہت کچھ اخذ کیا تھا، شاید انہوں نے احمد سے اس وقت حدیث کا علم حاصل کیا تھا جب وہ درس کے لیے بیٹھا کرتے تھے...... ذہبی کے ہاتھ بقیع کی کتاب نہیں لگی۔'' ❶

بقی بن مخلد رحمہ اللہ کے بارے میں کشمیری نے جو معلومات دی ہیں ان میں سے صرف یہ بات صحیح ہوسکتی ہے کہ مسند بقی میں ۳۰ ہزار کے لگ بھگ حدیثیں رہی ہوں گی، بقیہ باتیں جھوٹ ہیں۔ نہ انہوں نے امام احمد سے کسب فیض کیا تھا اور نہ امام ذہبی ان کی مسند سے ناواقف ہی تھے امام بقی کے بارے میں مستند معلومات درج ذیل ہیں:

امام بقی بن مخلد:

امام بقی بن مخلد بن یزید رحمہ اللہ متوفی ۲۷۶ نہایت جلیل القدر محدث گزرے ہیں، ان کا مولد و مسکن اندلس تھا جس کو انہوں نے اللہ تعالیٰ کے فضل و توفیق اور پھر اپنی محنتوں سے حدیث کا مرکز بنا دیا تھا، اور وہاں کے علماء، فقہاء اور عوام میں کتاب و سنت پر عمل کی روح پھونک دی تھی، جبکہ ان سے قبل اندلس میں ائمہ فقہ خصوصاً امام مالک رحمہ اللہ کی اندھی تقلید کا زور تھا۔

بقی بن مخلد نے علم حدیث کے حصول کے لیے مشرق و مغرب کو چھان مارا اور اپنے وقت کے ۲۸۰ سے زیادہ ائمہ حدیث سے حدیثیں سنیں اور آخر میں امام ربانی اور امام اہل سنت احمد بن حنبل رحمہ اللہ متوفی ۲۴۱ سے سماع حدیث کے لیے اندلس سے بغداد کا پر مشقت سفر کیا اور امام ممدوح سے ملاقات کر کے ان سے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا۔ مگر امام احمد نے یہ کہہ کر معذرت کر لی کہ انہوں نے روایت حدیث کا سلسلہ بند کر دیا ہے۔ یہ امام احمد کا ''دور ابتلاء'' تھا۔ اس طرح امام بقی امام احمد سے سماع حدیث کی خواہش پوری نہ کر سکے۔

امام بقی بن مخلد کی مسند اور تفسیر کے بارے میں امام ابو محمد علی بن احمد بن صغرم رحمہ اللہ متوفی ۴۵۶ نے نہایت گراں قدر تعریفی کلمات فرمائے ہیں اور ان کی تفسیر کو بے مثل قرار دیا ہے۔ جبکہ امر واقعہ یہ ہے کہ ابن حزم کسی کی تعریف بہت ہی کم کرتے تھے۔ امام ابن حزم کے مطابق مسند بقی میں ۱۳۰۰ سے زیادہ صحابیوں سے مروی احادیث درج ہیں۔

علامہ شیخ احمد محمد شاکر رحمہ اللہ نے الباعث الحثیث میں (ص ۱۷۶) لکھا ہے کہ مسند امام بقی کا اسلامی کتب خانوں میں کوئی وجود نہیں ہے۔ لیکن امام ذہبی نے لکھا ہے کہ اس کے دو نسخے ان کے پاس موجود ہیں۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ امام ذہبی کے زمانے میں وہ متداول تھی اور اس دور کے علمائے حدیث نے اس سے ضرور استفادہ کیا ہوگا اور اس کی حدیثوں کو اپنی کتابوں میں نقل کر لیا ہوگا۔ ❷

❶ ص ۱۷۸-۱۷۹ ❷ سیر اعلام النبلاء، ص: ۶۱۵-۶۲۲ ج: ۱۰، طبقات علماء الحدیث، ص: ۳۳۴-۳۳۶۔

Marfat.com

علامہ کشمیری نے اس کے بعد لکھا ہے کہ "بقیع" کی کتاب اپنے درجہ و مقام میں مسند احمد کے بعد ہے جس میں ۴۰ ہزار حدیثیں ہیں، پھر کنز العمال ہے جس میں احادیث کا بہت بڑا ذخیرہ جمع ہے۔

موصوف کی یہ دونوں باتیں بھی صحت سے عاری ہیں۔ مسند امام احمد کی حدیثوں کی تعداد لگ بھگ ۲۸۱۹۹ ہے۔ ۴۰ ہزار نہیں۔

کشمیری نے یہاں محدثانہ اعتبار سے جو بھیانک غلطی کی ہے وہ یہ کہ مسانید کے ضمن میں انہوں نے کنز العمال کو بھی شامل کرلیا ہے، ایسا انہوں نے صرف اس وجہ سے کیا ہے کہ کنز العمال کے مصنف علامہ علاء الدین علی متقی ہندی حنفی تھے، ورنہ کنز العمال کا شمار نہ حدیث کی امہات الکتب میں ہوتا ہے اور نہ آباء الکتب میں۔ دراصل مسانید، سنن، مصنفات اور صحاح وغیرہ کا اطلاق ایسی کتابوں پر ہوتا ہے جن کی مندرجات ان کے "عالی مقام" مصنفین کی اپنی سندوں سے مروی ہیں، جبکہ کنز العمال کی حدیثیں، حدیث کی کتابوں سے منقول ہیں۔ علی متقی محدث نہیں جامع گزرے ہیں۔ حدیث کے فن کا واقف کار "کنز العمال" کو مسانید کے ضمن میں شمار نہیں کرسکتا۔ مقلد علماء ہی اپنا قد اونچا دکھانے کے لیے ایسی سیڑھیاں استعمال کرتے ہیں۔ کیونکہ ان کو اپنی پستہ قدی کا احساس ہوتا ہے۔

عذر گناہ بدتر از گناہ:

امام العصر علامہ محمد انور شاہ کشمیری کی سیرت انظر شاہ مسعودی نے لکھی ہے، صوفیا کی سوانح عمریاں اگر حقائق پر مبنی ہوں اور ان میں خرافات کی آمیزش نہ ہو تو پھر یہ صوفیا کی سوانح عمریاں نہ ہوئیں، بلکہ کسی "دنیا دار" کی سیرتِ بے کیف ہوگئیں۔

علامہ کشمیری کے اوصاف میں جس صفت کو امتیازی شان حاصل ہے وہ ان کا حافظہ ہے، چونکہ ہمارے اکابر محدثین اپنی قوت حافظہ میں "ضرب المثل" تھے اس لیے ایک بے مثال محدث ثابت کرنے کے لیے کشمیری کو غیر معمولی حافظہ کا مالک دکھانا ضروری تھا اور سوانح نگار بیٹے نے دکھایا بھی، اور بار بار یہ دعویٰ کیا کہ موصوف کو ہزارہا ہزار احادیث یاد تھیں، مگر ان کے حافظہ سے متعلق مبالغات کو منوانے کی راہ میں جو سب سے بڑی رکاوٹ حائل تھی وہ یہ کہ کشمیری صاحب کو نہ صرف یہ کہ قرآن پاک زبانی یاد نہیں تھا، بلکہ وہ بجبر قرآن پاک کی تلاوت کر پاتے تھے، سوال یہ تھا کہ اس "محرومی" کو سعادت میں تبدیل کس طرح کیا جائے؟ صوفیا کے لیے ایسا کرنا بائیں ہاتھ کا کھیل ہے اور سعادت مند بیٹے نے کر دکھایا اور باپ سے منسوب قرآن پاک کے عدم حفظ کی توجیہ درج ذیل الفاظ میں کر دی:

> "میں جب قرآن مجید کھول کر بیٹھتا ہوں تو اس کے علوم و معارف کی اتھاہ گہرائیوں میں اتر جاتا ہوں، حد تو یہ ہے کہ رمضان المبارک کے آخری دن جب یہ محسوس کرتا ہوں کہ نزول قرآن کے اس مقدس مہینے میں ایک قرآن حکیم ختم کرنے کی سعادت سے بھی محرومی ہو رہی ہے، تو فکر و تدبر کے اپنے خاص طریقہ کو چھوڑ کر

Marfat.com

جلد ختم کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ بے پناہ قوی الحفظ ہونے کے باوجود قرآن کریم کا حافظ نہ ہونا، اسے لطیفہ غیبی کے سوا اور کیا کہیے؟'' ❶

ایک سوال:

اس امتِ وسط و خیر کو اللہ تعالیٰ نے جن نفوس قدسیہ، جن اصحاب فضل و تقویٰ اور جن محدثین، فقہاء اور علماء سے نوازا ہے ان کی تعداد لاکھوں سے زائد ہے، کیا ان میں سے کسی کے لیے بھی حفظ قرآن سے محرومی، اگر وہ حافظ قرآن نہ رہا ہو لطیفہ غیبی تھی یا اس کے فضائل و مناقب میں نقص اور عیب تھی؟ میں یہ مانتا ہوں کہ محدثین اور فقہاء کے لیے حافظ قرآن ہونا نہ تو فرض اور لازم تھا اور نہ حفظ قرآن سے محرومی ان کے محدث اور فقیہ ہونے کی صفت میں قادح تھی، اگرچہ ایسا شاید ہی ہوا ہو کہ کوئی محدث یا حافظ حدیث اللہ تعالیٰ کی کتاب کا حافظ نہ رہا ہو، سوائے ایسے محدث اور عالم حدیث کے جس کی تحصیلِ علمِ حدیث کے پیچھے یہ جذبہ کارفرما رہا ہو کہ وہ اس مقدس علم کی روشنی سے نورِ قرآن کی طرح اپنے دل کی تاریکیوں کو دور کرنے کے بجائے حدیث کے ذریعہ غیر معصوم کی تقلید کو حق اور لازم ثابت کرے گا اور اپنے امام کے اجتہادی اقوال کو صحیح ثابت کرنے کے لیے حدیث اور اہل حدیث میں کیڑے نکالے گا، حدیث کی شرعی حیثیت کو ثانوی درجہ دینے کی کوشش کرے گا اور اپنے مسلک سے ٹکرانے والی حدیثوں کا، ان کو ''اخبار آحاد'' کہہ کر انکار کرے گا، یا بذریعہ حدیث اپنے مسلک کو تمام فقہی مسلکوں سے بہتر یا زیادہ واجب الاتباع قرار دے گا۔

حفظ قرآن سے محرومی کے، حدیث دانی اور تفقہ میں قادح نہ ہونے کی وجہ سے علم و فضل کے اعتبار سے نقص اور عیب نہ ہونے کو مانا جا سکتا ہے، بایں معنیٰ کہ ایک شخص حافظ قرآن نہ ہوتے ہوئے بھی حدیث کا جید عالم ہو سکتا ہے، تفقہ فی الدین کی صفت سے موصوف بھی ہو سکتا ہے اور اجتہادی اور استنباطی صلاحیتوں سے بھی مالا مال ہو سکتا ہے۔

مگر جو شخص ماہ قرآن -رمضان مبارک- میں بھی تلاوتِ قرآن کی رغبت اور خواہش نہ رکھتا رہا ہو اور دل پر جبر کر کے ایک ختم قرآن کرتا رہا ہو، کیا ایسے محدث اور امام العصر کے بارے میں یہ کہنا درست ہے کہ اس کی یہ صفت ''لطیفہ غیبی'' کا کرشمہ تھی یاد رہے کہ بہت سے ایسے عالم، فقیہ، محقق اور اہل قلم گزرے ہیں اور موجود بھی ہو سکتے ہیں کہ پورا قرآن اور اس کے مضامین اور مطالب، کثرت تلاوت اور کثرت تدبر و تفکر کی وجہ سے نہ کہ حفظ کی وجہ سے ان کے ذہنوں میں متحضر رہتے ہیں، بار بار قرآن ختم کرنے والے حفاظ سے زیادہ۔

پھر قرآن تو خود اپنی آیات میں تدبر اور تفکر کی بار بار دعوت دیتا ہے اور اس کو اہل ایمان کی امتیازی صفت قرار دیتا ہے اور حقیقت واقعہ بھی یہ ہے کہ اس ''امتِ ولود'' کے بطن سے بے شمار مفسر قرآن پیدا ہوئے ہیں، جنہوں نے کتاب اللہ کے علوم و معارف کی ''اتھاہ گہرائیوں'' میں ڈوب کر اس کے جواہر و لآلی نکالے ہیں اور ان کو صفحہ قرطاس پر اس طرح

---

❶ نقش دوام ص ۱۳۳

Marfat.com

بکھیر دیا ہے، گویا وہ آسمان پر بکھرے ہوئے ستارے ہیں، کیا ان سعادت مندوں اور خوش نصیبوں میں کوئی ایک ہی ایسا گزرا ہے، جس نے حفظ قرآن اور تلاوت قرآن سے محرومی کو "لطیفۂ غیبی" سمجھ کر اس پر اپنی سعادت مندی کا اظہار کیا ہو یا اس پر اس کا دل کڑھتا رہا ہو؟ یا عظمائے اسلام میں محدث کشمیری منفرد تھے؟

ایک قابل غور واقعہ:

تاریخ حدیث میں ایسے واقعات تو بہت ملیں گے کہ یہود و نصاریٰ میں سے بہت سے لوگوں نے قرآن پاک حفظ کیا۔ حفظ قرآن سے ان کے مقاصد مختلف تھے، اکثریت مستشرقین کی رہی ہے جو قرآن میں عیوب تلاش کرنے کی غرض سے عربی زبان سیکھتے تھے اور قرآن پاک حفظ کرتے تھے، مگر انہی میں ایسے نام بھی ملتے ہیں جنہوں نے کسی مذہبی غرض سے نہیں، محض عربی زبان میں مہارت پیدا کرنے اور اپنے عربی اسلوب کو نکھارنے کی غرض سے قرآن حفظ کیا اور اللہ کی کتاب کا عجیب حال ہے کہ وہ اپنے بحر معانی میں غوطہ لگانے والوں کو ان کے "حسب طلب" عطا کرتی ہے۔

حفاظ قرآن اور ادبائے عرب میں ایک نام "انطوان دحداح" کا ہے جن کا تعلق لبنان سے ہے اور یہ عیسائی ہیں۔ یہ اصلاً فوجی ہیں اور فوج میں "بریگیڈیئر جنرل" کے عہدے تک پہنچنے کے بعد انہوں نے فوجی خدمات سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور عربی زبان کی نشر و اشاعت کو اپنا نصب العین بنایا۔ انطوان دحداح نے قرآن پاک حفظ کیا اور عربی قواعد اور بعض اصطلاحات پر گراں قدر کتابیں لکھیں۔ عربی فن "صرف" پر ان کی کتاب "معجم تصریف الافعال العربیہ" ایک شاہکار ہے جس میں انہوں نے "صَرف" جیسے پیچیدہ اور خشک علم کو ادب کا حسن بخش دیا ہے۔

انطوان دحداح کی سب سے گراں قدر کتاب "اعراب القرآن" ہے جس میں انہوں نے اعراب القرآن کے موضوع پر لکھی جانے والی تمام قدیم کتابوں کو پڑھ کر اور ان کو ہضم کر کے نہایت اعلیٰ عربی ادبی اسلوب میں بیان کر دیا ہے، انہوں نے اپنی یہ کتاب ازہر کے علماء کے سامنے پیش کی اور ازہر کے ماہرین زبان نے اس کو پڑھ کر اپنے جس پہلے تأثر کا اظہار کیا تھا وہ یہ تھا کہ اس میں قرآنی تراکیب کے بیان کے ساتھ "اعراب القرآن" کی بعض مشکلات کو جس اسلوب اور انداز میں حل کیا گیا ہے وہ اپنی صحت و معقولیت کے ساتھ حد درجہ آسان اور قابل فہم ہے ان کا یہ تاثر بھی تھا کہ پوری کتاب میں "دحداح" نے کہیں ایک جگہ بھی کوئی علمی خیانت نہیں کی ہے۔ الفاظ قرآن سے متبادر ہونے والے مفاہیم نہیں بدلے ہیں اور کوئی غلط حوالہ نہیں دیا ہے اور اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ مؤلف نے کہیں بھی قرآنی الفاظ اور قرآنی تراکیب سے عیسیٰ اور ان کی والدۂ صدیقہ علیہما السلام کے بارے میں اپنے عقیدے کو درست ثابت کرنے کی کوشش نہیں کی ہے۔ مگر ان تمام خوبیوں کے باوجود ازہر نے اس کی طباعت کی اجازت دینے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ اس کا مصنف عیسائی ہے؟!!!

Marfat.com

حدیث سے کشمیری کا تعلق:

سطور بالا میں قرآن سے علامہ کشمیری کا تعلق خود ان کے قول اور ان کے بیٹے کی روایت سے معلوم ہو گیا......اس سے قبل حدیث کے حوالہ سے ان کے نظریات اور علم جرح و تعدیل سے متعلق ان کے خیالات پر بھرپور علمی تبصرہ کر چکا ہوں نگاہ بینا رکھنے والے ان بحثوں سے حدیث سے ان کے تعلق کی صورت گری کر سکتے ہیں۔ میں فیض الباری سے ان کی حدیث دانی کی ایک دو مثالیں دے کر اس بحث کو ختم کر دوں گا، اس طرح ان کے تقدس کا طلسم ٹوٹ جائے گا۔

کشمیری کا عقیدہ:

علامہ انور شاہ کشمیری صوفی تھے اور صرف صوفی ہی نہ تھے، بلکہ مسلمانوں میں سب سے پہلے ''وحدۃ الوجود'' کی دعوت دینے والے صوفی محی الدین محمد بن علی بن محمد کے پیرو تھے جو ابن عربی کے نام سے معروف تھا، کشمیری ابن عربی کا ذکر ''شیخ اکبر'' سے کرتے ہیں اور حدیث میں عقیدہ سے متعلق کسی مسئلہ کی تشریح کرنے سے قبل اپنے ''شیخ اکبر'' کا قول نقل کرتے ہیں اور پھر اس کی روشنی میں اس مسئلہ کی تشریح کرتے ہیں جیسا کہ آگے آ رہا ہے۔ وحدہ الوجود کا ''ملحدانہ'' نظریہ محی الدین ابن عربی کے نام سے جڑا ہوا ہے، لہٰذا ابن عربی، پھر کشمیری کا عقیدہ جاننے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ''وحدۃ الوجود'' کا مختصر اور جامع مفہوم سامنے رہے مولانا ابوالکلام آزاد ترجمان القرآن ج ۱ میں تحریر فرماتے ہیں:

> ''وحدۃ الوجود کا عقیدہ یہ ہے کہ خدا کی ہستی کے سوا کوئی ہستی وجود نہیں رکھتی وجود ایک ہی ہے باقی جو کچھ ہے تعینات کا فریب ہے۔'' ❶

ابن عربی نے اپنی کتاب ''فصوص الحکم'' میں وحدۃ الوجود کے عقیدے کو جن الفاظ میں بیان کیا ہے ان کا ماحصل یہ ہے:

> "أن الـوجـود كله واحد هو الله و ان ما يوجد في الكون من مخلوقات ، فوجودها خيال او وهم او ظل بالنسبة لوجود الله".

> ''پورا وجود ایک ہے اور وہ اللہ ہے اور کائنات میں جو مخلوقات پائی جا رہی ہیں تو ان کا وجود یا تو وہم و خیال ہے یا اللہ کے وجود کی نسبت سے ایک سایہ ہے۔'' ❷

ابن عربی نے اس ملحدانہ نظریہ کو پوری کتاب میں مختلف انداز میں بیان کیا ہے۔

وحدۃ الوجود کا یہ نظریہ بہت قدیم ہے یہ نظریہ یا عقیدہ یونان اور ہندوستان میں پہلے سے موجود تھا، جہاں سے اسے لے کر یہودیوں اور عیسائیوں نے اسے اپنا مذہبی عقیدہ بنایا اور ابن عربی نے اس کو صوفیا کے حلقوں میں رواج دیا۔

وحدۃ الوجود کے عقیدے کی رو سے جو خالق ہے وہی مخلوق ہے جو عابد ہے وہی معبود ہے اور جو معبود ہے وہی عابد ہے۔

ابن عربی نے اپنی دونوں کتابوں "فصوص الحكم" اور "الفتوحات المكيه" میں نور محمدی کو تمام عالم کی

---

❶ ص ۵۲۶ ❷ ص ۱۰۱

Marfat.com

اصل قرار دیا ہے اس کا یہ نظریہ حلول کے داعی حسین بن منصور حلاج کے افکار پر مبنی ہے۔ حلاج کا قول ہے:

''نبوت کے انوار اللہ کے نور سے ظاہر ہوئے ہیں اور مخلوقات کے انوار نور محمدی سے پھوٹے ہیں اور تمام نوروں میں کوئی نور صاحب کرم ''صلی اللہ علیہ وسلم'' کے نور سے زیادہ روشن، نمایاں اور قدیم نہیں ہے۔'' ❶

یہیں سے مسلمانوں میں نور محمدی کے عقیدے کو رواج ملا اور اس کے بارے میں ایک روایت گھڑ کر لوگوں میں پھیلا دی گئی۔

ابن عربی کے نزدیک انسان کامل وہ ہے جس میں ''تجلی حق'' اپنی کامل صورت میں ہوتی ہے اور اس کے مصداق انبیاء اور اولیاء رہے اور ان میں کامل ترین محمد ﷺ تھے۔ ابن عربی ''محمد'' سے رسول اللہ ﷺ کی شخصیت مراد نہیں لیتا، بلکہ ازلی حقیقی ذات محمدی مراد لیتا ہے۔ ❷

ابن عربی کا یہ دعویٰ ہے کہ رسول اللہ ﷺ خاتم الانبیاء تھے اور میں خاتم الأولیاء ہوں اس نے اس حدیث میں، جس میں نبی ﷺ نے اپنی اور سابق انبیاء کی مثال بیان فرمائی ہے، مذکور ''لبنۃ'' -اینٹ- سے اپنی ولایت کا دعویٰ کرتے ہوئے کہا ہے نبی ﷺ نے خوبصورت عمارت میں جس اینٹ کے خالی رہنے کی خبر دی ہے اور فرمایا ہے کہ وہ ''اینٹ'' میں ہوں۔ یہ اینٹ اپنے ظاہر و باطن کے اعتبار سے دو تھی اس کا ظاہر تو چاندی کا تھا اور باطن سونے کا، اینٹ کے ظاہر سے مراد اسلام کے ظاہری احکام ہیں جو نبوت سے متعلق ہیں اور اس کے باطن سے مراد وہ اصل ہے جہاں سے فرشتہ وحی لیتا تھا اور اس کو رسول اللہ ﷺ پر نازل کرتا تھا۔

ابن عربی کا دعویٰ ہے کہ وہ خوبصورت عمارت کی اس تکمیلی اینٹ میں اپنی تصویر ''مرتسم'' پاتا ہے۔ اس کے ظاہر پر اس کی تصویر اس وجہ سے مرتسم ہے کہ وہ اسلام کے ظاہری احکام کا پیرو ہے اور اینٹ کا باطنی رخ جو ''سونا'' ہے اس کی ذات سے عبارت ہے جہاں سے فرشتہ علم اخذ کرتا ہے اور اس کو رسول کی طرف وحی کرتا ہے، اس طرح رسول تو اینٹ کے ظاہری حصے یا چاندی کی اینٹ سے عبارت تھا اور خاتم الاولیاء اینٹ کے دونوں رخوں یا چاندی اور سونے دونوں سے بنی ہوئی اینٹوں سے عبارت ہے۔ اس طرح اس کو خاتم الانبیاء پر دو فضیلتیں حاصل ہیں۔ (۱) اس کی مثال ''سونے'' کی ہے۔ (۲) رسول اللہ ﷺ کے لیے وہ ''ماخذ علم'' کی حیثیت رکھتا ہے۔ ❸

عبارت ذرا طویل ہوگئی موضوع کی نزاکت کا تقاضا تھا کہ بات پوری ہو، عبارت میں تعقید اور پیچیدگی کا سبب یہ ہے کہ صوفیا کوئی بات اور کوئی عقیدہ صاف صاف اور واضح لفظوں میں بیان نہیں کرتے، تصوف کی دنیا کے امام ابو القاسم عبدالکریم قشیری اس کا سبب بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

---

❶ الكشف عن حقيقة الصوفية، ص: ۲۶۳۔ ❷ نصوص الحکم: ص ۵۴-۵۵

❸ ملاحظہ ہو نصوص الحکم ص ۶۳ ج ۱، شرح العقیدۃ الطحاویۃ ص ۳۵۶-۳۵۸ ج ۲

Marfat.com

''جان لو، علماء کی ہر جماعت کچھ ایسے الفاظ استعمال کرتی رہی ہے، جن کے استعمال میں وہ ایک دوسری سے منفرد رہی ہے اور اپنے خاص اغراض و مقاصد کے تحت اس طرح کے الفاظ کے استعمال پر ان کا اتفاق رہا ہے...... اس طرح کے الفاظ استعمال کرنے سے ان کا مقصد یہ رہا ہے کہ ان الفاظ کے معنیٰ صرف ان کو معلوم رہیں جو تصوف سے تعلق رکھتے ہیں، رہے وہ جو ان کے مسلک سے اختلاف رکھتے ہیں، تو ان تعبیرات سے ان کے پلے کچھ نہ پڑے اور ان کے مبہم اور غیر واضح مفاہیم کے علاوہ ان کے حصے میں کچھ نہ آئے۔ کیونکہ صوفیا یہ نہیں چاہتے کہ ان کے اسرار غیر صوفیا میں پھیلیں اور عام ہوں۔'' [1]

عقیدہ طحاویہ کے شارح قاضی علی بن علی بن ابی العز حنفی لکھتے ہیں:

''اس سے بڑا کافر کون ہوگا جو اپنی مثال ''سونے'' سے دے اور رسول کی چاندی سے، اس طرح اپنے آپ کو رسول سے اعلیٰ اور افضل قرار دے ڈالے، جس شخص کا یہ قول ہے اس کا کفر مخفی نہیں رہا۔ اس شخص کے اس طرح کے اور بھی اقوال ہیں، جن میں سے بعض کا کفر مضمر اور پوشیدہ اور بعض کا عیاں ہے۔ ضرورت ایک ایسے ناقد کی ہے جو اس چھپے جھوٹ کو کھول دے، کیونکہ جو فریب عیاں ہے اس کو ہر ناقد سمجھ سکتا ہے، مگر جو باطل پوشیدہ اور چھپا ہوا ہے اس کو ماہر اور صاحب بصیرت ناقد ہی جان سکتا ہے۔ دراصل ابن عربی کا کفر ان لوگوں سے بڑھا ہوا ہے جو کہتے ہیں:

﴿لَن نُّؤْمِنَ حَتّٰى نُؤْتٰى مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ رُسُلُ اللّٰهِ﴾ (الانعام: ۱۲۴)

''ہم ہرگز ایمان نہ لائیں گے تا آنکہ ہمیں اس چیز کے مانند چیز دے دی جائے جو اللہ کے رسولوں کو دی گئی تھی۔''

لیکن ابن عربی اور اس کے ہم مشرب منافق، ملحد اور وحدۃ الوجود کے داعی ہیں، مگر ان کے ساتھ مسلمانوں جیسا معاملہ اس لیے کیا جاتا ہے کہ یہ اسلام کا اظہار کرتے ہیں، جس طرح نبی ﷺ کے عہد میں منافقین ظاہر میں مسلمان بنے ہوئے تھے۔ یہ ابن عربی کشمیری کا امام، اور شیخ اکبر تھا اس طرح ان کا جو عقیدہ رہا ہوگا وہ محتاج بیان نہیں ہے۔

کشمیری کی بدعقیدگی کی ایک مثال:

صحیح بخاری کی حدیث نمبر ۲ وحی سے متعلق ایک صحابی حارث بن ہشام رضی اللہ عنہ کے ایک سوال کا جواب ہے جس میں رسول اللہ ﷺ نے بعض اوقات اپنے اوپر نازل ہونے والی وحی یا وحی لانے والے فرشتے کی آواز کو گھنٹی بجنے کی آواز سے تشبیہ دی ہے اس حدیث کے بارے میں، میں مناسب مقام پر تفصیل سے گفتگو کر چکا ہوں اور عرض کر چکا ہوں کہ یہ آواز جس کو رسول اللہ ﷺ نے گھنٹی کی آواز سے تشبیہ دی ہے فرشتے کی آواز تھی۔ صحیح بخاری کے رمز شناس حافظ ابن حجر نے لکھا ہے کہ ''صلصلة الجرس'' ایسی آواز کو کہتے ہیں جس میں ''ٹنٹناہٹ یا جھن جھناہٹ'' ہو اور یہ کہا گیا ہے

[1] رسالۃ مشیریہ، مصطلحات التصوف، ص: ۵۳

Marfat.com

کہ یہ ایسی آواز ہے جو "پے در پے" آئے اور آغاز امر میں سمجھ میں نہ آئے۔

اس کے بعد حافظ ابن حجر نے اس "صلصلة الجرس" کے بارے میں پیدا ہونے والے سوالات اور ان کا جواب دینے کے بعد لکھا ہے کہ کہا گیا ہے: مذکورہ "صلصلہ" فرشتے کی وحی آمیز آواز ہے، خطابی کہتے ہیں کہ: نبی ﷺ کی مراد ایسی آواز ہے جو پے در پے آتی ہے آپ اسے سنتے تو ہیں مگر سنتے ہی اسے سمجھ نہیں پاتے بعد میں سمجھنے لگتے ہیں۔" یہ بھی کہا گیا ہے: "صلصلہ" فرشتے کے پروں کے پھڑ پھڑانے کی آواز ہے اور اس کے پہلے سنائی دینے میں حکمت یہ ہے کہ کان وحی سننے کے لیے تیار ہو جائیں اور ان میں کسی اور چیز کے لیے جگہ نہ رہ جائے۔ [1]

حافظ ابن حجر نے ان دونوں قولوں میں سے کسی کو کسی پر ترجیح نہیں دی ہے اور حق یہ ہے کہ دونوں میں سے ہر ایک قابل اخذ ہے اگرچہ پہلا قول زیادہ قرین صواب ہے اور پر پھڑ پھڑانے سے زیادہ مناسب ہے۔

کشمیری کے دعاوی:

علامہ کشمیری نے حدیث کی شرح کرتے ہوئے یہ دعویٰ کیا ہے کہ حافظ ابن حجر نے "صلصلہ" کے دوسرے معنیٰ کو معتبر مانا ہے، یعنی "فرشتے کے پروں کا پھڑ پھڑانا" جبکہ امر واقعہ یہ ہے کہ ابن حجر نے کسی کو بھی کسی پر ترجیح نہیں دی ہے، بلکہ دوسرے قول کو آخر میں لاکر اس کے مرجوح ہونے کا اشارہ کر دیا ہے۔ لگتا ہے کہ علامہ کشمیری "فتح الباری" بھی نہیں سمجھتے تھے۔

اس کے بعد اس آواز کو باری تعالیٰ کی آواز ثابت کرنے کے لیے جو "بکواس" فرمائی ہے وہ ان کے مقام اور شہرت سے میل نہیں کھاتی، فرماتے ہیں:

> "کس قدر باریک ہے وہ بات جو شیخ اکبر نے فرمائی ہے کہ باری تعالیٰ کی آواز ہر سمت سے سنی جاتی ہے۔ یا سنی جا سکتی ہے اور اس کے لیے کوئی جہت یا سمت متعین نہیں ہے اور "صلصلہ" کی آواز بھی ایسی ہی ہے اسی طرح دونوں کے درمیان "وجہ شبہہ" یہ ہے کہ دونوں ہر طرف سے اور ہر جہت سے آتی ہیں اور یہ بھی منقول ہے کہ موسیٰ علیہ السلام طور پر اللہ تعالیٰ کا کلام ہر سمت سے سنتے تھے، اسی وجہ سے میں یہ کہتا ہوں کہ "صلصلہ" باری تعالیٰ کی آواز ہے، شارحین حدیث کی آراء کے برعکس۔" [2]

تبصرہ:

افسوس ہے کہ علامہ نے اوپر جو دعوے کیے ہیں وہ نہ صرف یہ کہ محض "بکواس" ہیں، وہیں ان کے امام العصر اور محدث عظیم ہونے کی شہرت کے بالکل منافی ہیں، میں ان دعووں پر ایک ایک کر کے تبصرہ کروں گا، تاکہ صحیح بات واضح ہو سکے اور جو لوگ امام العصر کے افکار و آراء سے متاثر ہیں اور ان کو حق سمجھتے ہیں وہ عقل کے ناخن لیں اور ان کے اندر

[1] فتح الباری، ص: ۲۶۱ ج: ۱ [2] ص ۱۹-۲۰

Marfat.com

معرفتِ حق کے لیے براہ راست کتاب وسنت سے رجوع کرنے کا جذبہ پیدا ہو۔

۱۔ علامہ نے ''صلصلۃ الجرس'' کی حقیقت جاننے اور سمجھنے کے لیے قرآن وحدیث، یا کسی تفسیر کی کتاب یا حدیث کی کتاب، یا مفسرین، محدثین حتی کہ فقہاء میں سے کسی سربر آوردہ شخصیت کی طرف دیکھنے کے بجائے ایک ایسے شخص کی طرف دیکھا جو صوفیا کے علاوہ اہل سنت و جماعت کے نزدیک متفقہ طور پر گمراہ تھا اور اس کی دونوں کتابیں "فصوص الحکم" اور "الفتوحات المکیۃ" باطل اور گمراہ کن عقائد اور نظریات سے بھری پڑی ہیں اور ''اسرار دین'' اور "بــاطنیت" کا عقیدہ رکھنے والے صوفیا ہی کے نزدیک کوئی قدر و قیمت رکھتی ہیں یاد رہے کہ ''شیعہ'' سے زیادہ ''صوفیا'' دین میں باطنیت کے قائل ہیں قرآن و حدیث کی نصوص کی جو تشریحات و توضیحات تصوف کی کتابوں میں پائی جاتی ہیں وہ سب باطنیت کی ترجمان ہیں اسی وجہ سے حافظ سیوطی جیسے صوفی نے بھی کلام اللہ کے بارے میں صوفیا کے اقوال کو تفسیر ماننے سے انکار کیا ہے اور ابو الحسن واحدی نے ابو عبدالرحمٰن سلمی صوفی کی تفسیر ''حقائق التفسیر'' کو تفسیر ماننے والے پر ''کفر'' کا حکم لگایا ہے اور حافظ ابن صلاح کے مطابق صوفیا باطنی فرقے کے مسلک پر گامزن ہیں۔'' ❶

پھر علامہ نے ابن عربی کے جس قول کو عمدہ اور باریک کہہ کر اپنی بحث کی بنیاد بنایا ہے وہ نا قابل التفات ہے۔ ابن عربی کا دعویٰ ہے کہ:

> ''باری تعالیٰ کی آواز ہر سمت اور جہت سے سنی جاتی ہے اور اس کی کوئی متعین جہت نہیں ہوتی، یہی حال گھنٹی کی آواز کا بھی ہے اور دونوں میں وجہ شبہہ ان کا ہر جہت سے آنا ہے اور یہ بھی منقول ہے کہ موسیٰ علیہ السلام طور پر اللہ تعالیٰ کی آواز ہر سمت سے سنتے تھے۔''

ابن عربی کے اس دعویٰ کی دلیل کیا ہے کہ گھنٹی کی آواز ہر سمت سے آتی ہے اور چونکہ باری تعالیٰ کی آواز بھی ہر سمت سے آتی ہے اس لیے باری تعالیٰ کی آواز کو گھنٹی کی آواز سے تشبیہ دی گئی ہے؟

عقل، نقل اور تجربہ ابن عربی کے اس قول کے باطل ہونے پر دلیل ہیں، اس کا یہ دعویٰ معلوم ہوتے ہی اگر آپ خود اس کا ذاتی تجربہ کر لیتے تو آپ کو اس کے جھوٹ ہونے کا یقین ہو جاتا مگر برا ہو اندھی تقلید کا، جو بصارت و بصیرت پر پردہ ڈال دیتی ہے۔

آپ نے جو یہ فرمایا ہے کہ ''منقول ہے کہ موسیٰ علیہ السلام طور پر اللہ تعالیٰ کی آواز ہر سمت سے سنتے تھے۔'' تو عرض ہے کہ یہ بہت بڑا جھوٹ ہے جو آپ کے مقام و مرتبے کے خلاف ہے طور پر موسیٰ علیہ السلام کے اللہ تعالیٰ کی آواز سننے کا واقعہ صرف قرآن میں بیان ہوا ہے اور قرآن میں کسی جگہ بھی یہ نہیں آیا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام یہ آواز ہر سمت اور جہت سے سنتے

❶ الاتقان: ص ۴۵۷-۴۵۸ ج ۲

Marfat.com

تھے، بلکہ اس کے برعکس یوں آیا ہے: ''اور ہم نے طور کی داہنی جانب سے اس کو آواز دی۔'' (مریم: ۵۲) ''جب وہ وہاں پہنچا تو مبارک خطہ کی وادی کے داہنے کنارے کے ایک درخت سے پکارا گیا۔'' (قصص: ۳۰)

کیا قرآن پاک کی ان صراحتوں کے بعد بھی آپ کے اس قول کا کوئی اعتبار رہ جاتا ہے کہ ''منقول ہے کہ موسیٰ علیہ السلام طور پر اللہ تعالیٰ کی آواز ہر سمت سے سنتے تھے۔''

مانا کہ آپ قرآن پاک کی تلاوت اور اس میں تدبر و تفکر سے محروم تھے، مگر آپ کسی سے پوچھ تو سکتے تھے جو آپ کو بتا دیتا کہ قرآن پاک میں یہ نہیں آیا ہے کہ طور پر موسیٰ علیہ السلام اللہ کی آواز ہر جہت اور سمت سے سن رہے تھے، بلکہ یہ آیا ہے اور بصراحت آیا ہے کہ ان کو طور کی داہنی جانب سے پکارا گیا، ''نداء'' اس آواز کو کہتے ہیں جو بلند ہو اور دور سے آئے، لہٰذا انہوں نے آواز اسی جانب سے سنی ہوگی جہاں سے وہ آ رہی تھی۔

۲۔ صحیح بخاری کی اس زیر مطالعہ حدیث میں وحی کو اللہ تعالیٰ کی آواز قرار دینے والا ابن عربی ہے آپ نہیں ہیں، مگر آپ کو یہ قول لے کر اس پر خیالی قصر تعمیر کرنے سے پہلے ایک لمحہ ہی کے لیے یہ سوچ لینا چاہیے تھا کہ ام المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا کے مطابق صحابی، حارث بن ہشام رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے وحی آنے کی کیفیت کے بارے میں سوال کیا تھا، نہ کہ اللہ تعالیٰ کی آواز آنے کی کیفیت کے بارے میں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو یہ بتانا شروع کر دیا کہ آپ کے پاس اللہ کی آواز کس طرح آتی ہے؟ کیا آپ کی نظر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نعوذ باللہ ایک سادہ سے سوال کو سمجھنے اور اس کا جواب دینے سے بھی قاصر تھے۔

میں یہ اس لیے کہہ رہا ہوں کہ حدیث کے سیاق و سباق اور پس منظر کی رو سے ''اللہ تعالیٰ کی آواز'' کی طرف اسی شخص کا ذہن جا سکتا ہے جس کے ذہن کو ''مخالفِ حق'' صوفیانہ خیالات نے مفلوج کر دیا ہو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں ایک سے زیادہ مقام پر یہ اعلان فرما دیا ہے کہ اس نے اپنی ہم کلامی کا شرف صرف موسیٰ علیہ السلام کو بخشا ہے:

﴿قَالَ يٰمُوْسٰٓى اِنِّى اصْطَفَيْتُكَ عَلَى النَّاسِ بِرِسٰلٰتِىْ وَ بِكَلَامِىْ﴾ (الاعراف: ۱۴۴)

''فرمایا، اے موسیٰ! درحقیقت میں نے تجھے لوگوں پر اپنے پیغام اور کلام سے فضیلت بخشی ہے۔''

سورۂ شوریٰ میں اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے اس ہم کلامی کو ''پردے کے پیچھے سے کیے جانے والے کلام سے تعبیر کیا ہے، جس میں قرآن کے مطابق دوسرا کوئی رسول ان کے ساتھ شریک نہیں تھا، ورنہ ''منهم من كلم الله و كلم الله موسى تكليما، إني اصطفيتك برسالاتي و بكلامي'' وغیرہ تعبیریں بے معنی ہو جائیں گی۔ حدیث معراج کے مطابق اللہ نے معراج کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی ہم کلامی کا جو شرف بخشا تھا وہ نزول وحی کے واقعات سے خارج ہے اور بالکل ایک الگ اور منفرد واقعہ ہے۔

سورۂ شوریٰ کی آیت مبارکہ میں ''اللہ کے پردے کے پیچھے سے کلام کرنے کو'' نکال دینے کے بعد وحی کی صرف دو

Marfat.com

صورتیں باقی بچتی ہیں:

۱۔ دل میں کسی بات کا ڈال دینا

۲۔ فرشتے کو بھیجنا جو مرسل الیہ کو اللہ کا پیغام پہنچائے

یاد رہے کہ دل میں بات ڈال دینے کی جس قسم کو وحی سے تعبیر کیا گیا ہے، وہ بھی بذریعہ فرشتہ وقوع پذیر ہوتی تھی، البتہ اس میں فرشتہ دوبدو رسول سے ہم کلام نہیں ہوتا تھا اس کے لیے "النفث فی الروع" یا "القاء فی الروع" کی تعبیر آئی ہے جس کے معنی ہیں: ''دل میں ڈال دینا'' حدیث کے مطابق یہ عمل بھی جبریل انجام دیتے تھے۔ [1]

ظاہری بات ہے کہ جب وحی کی یہ صورتیں بذریعہ فرشتہ وقوع پذیر ہوتی تھیں، تو وہ اللہ کا جو پیغام بھی پہنچاتا تھا اپنی آواز میں پہنچاتا تھا، نہ کہ اللہ تعالیٰ کی آواز میں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی آواز کو منتقل کرنا تو دور کی بات ہے کوئی انسان کسی دوسرے انسان کی آواز اپنی گرفت میں لے کر کسی تیسرے انسان کو نہیں سنوا سکتا، البتہ اس کے کلام کو اپنے الفاظ اور نطق کے ذریعہ جوں کا توں منتقل کر سکتا ہے، یہ سب بدیہی باتیں ہیں جن کو سمجھنے کے لیے نہ شیخ اکبر ہونے کی ضرورت ہے اور نہ امام العصر ہونے کی۔

۳۔ بلاشبہ قرآن پاک اور دوسری آسمانی کتابوں کا مصدر ذات الٰہی ہے اور اللہ تعالیٰ کی کتابیں، جن میں سے ایک قرآن بھی ہے اللہ کے کلام سے عبارت ہیں اور یہ کتابیں حروف، معانی اور آواز کے ساتھ ان کے نازل کرنے والے فرشتوں کو دی گئی تھیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ براہ راست کسی انسان سے ہم کلام نہیں ہوتا، اور ان فرشتوں نے یہ کتابیں اپنی آوازوں اور اپنے تلفظ اور نطق کی صورت میں ان کے ''مرسل الیہ'' تک پہنچائی تھیں، کلام جو حروف و معانی سے عبارت ہے وہ تو اللہ تعالیٰ کا تھا، مگر نطق اور تلفظ حاملین وحی فرشتوں کا تھا اس کی مثال یہ ہے کہ جب ہم کسی شاعر کا شعر پڑھتے ہیں تو یہ اسی کا شعر اور کلام ہوتا ہے، البتہ ادا ہماری ہوتی ہے۔

رہی آواز تو نہ وہ صاحب آواز سے جدا ہونے کے بعد کسی کی گرفت میں آسکتی ہے اور نہ وہ کسی دوسرے کے پاس اس کو منتقل کر سکتا ہے اور نہ وہ کسی کو سنوا سکتا ہے۔

۴۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے ایک تو لوگوں کو اس بات سے منع فرمایا ہے کہ وہ اللہ کے لیے مثالیں بنائیں:

﴿فَلَا تَضْرِبُوْا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ وَ اَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ (النحل: ۷۴)

''اللہ کے لیے مثالیں نہ دو اس لیے کہ اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔''

دوم اس نے یہ فرما دیا ہے کہ اس کی طرح کوئی چیز نہیں ہے:

﴿لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ﴾ (الشوریٰ: ۱۱)

---

[1] ابن ماجہ: ۲۱۴۴، بیہقی ص ۲۶۴-۲۶۵ ج ۵، ابن حبان ۳۲۳۹، ۳۲۴۱

Marfat.com

''اس کے مانند کوئی چیز نہیں ہے اور وہ ہر چیز سننے والا اور ہر چیز دیکھنے والا ہے۔''

اس دوٹوک اور واضح فرمان الٰہی کے بعد ایک امام العصر کو یہ جرات کس طرح ہوئی کہ وہ گھنٹی سے مشابہت رکھنے والی، یا گھنٹی کی آواز کی مماثل آواز کو اللہ کی آواز بتائے، پھر یہ دعویٰ بھی کرے کہ ''یہ آواز مخلوقات کی آواز کی طرح نہیں ہے، کیا "صلصلة الجرس" مخلوق نہیں ہے؟

۵۔ امام العصر نے اس انتہائی نازک عقائدی مسئلہ کے بیان میں نہ تو قرآن سے کوئی دلیل دی ہے اور نہ حدیث سے۔ بلکہ شیخ اکبر ابن عربی کا ایک قول بطور دلیل نقل کیا ہے جس کے آخر میں ہے: "و نَزِّهْهُ وَ شَبِّهْهُ" اور خود اردو میں اس کا ترجمہ بھی کر دیا ہے:

''اور تنزیہہ کیے جا اور تشبیہ دیے جا۔''

کیا ابن عربی کا قول: "شبهه" اور اس کے پیرو کشمیری کا ترجمہ ''تشبیہ دیے جا'' اللہ تعالیٰ کے ارشاد: فَلَا تَضْرِبُوْا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ کی صریح خلاف ورزی نہیں ہے؟

یاد رہے کہ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کو مخلوق سے تشبیہ دینے سے نہیں روکا گیا ہے، بلکہ اس کی مثال بیان کرنے سے روکا گیا ہے اور تشبیہ اور تمثیل میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اوپر سورۂ نحل کی جو آیت مبارکہ نقل کی گئی ہے اس میں اللہ کے لیے مثالیں گھڑنے، بنانے اور دینے سے منع کیا گیا ہے اور اس کے لیے مثالیں دینے کے معنیٰ ہیں کہ کہا جائے: اللہ کا ہاتھ فلاں کے ہاتھ کی طرح ہے، اس کا چہرہ فلاں کے چہرے کی طرح، اس کی آواز فلاں شخص یا فلاں چیز کی آواز کی طرح ہے وغیرہ، تو یہ غیر اللہ یا مخلوق سے اس کی تشبیہ اور تمثیل ہی تو ہے، جو سورۂ نحل کی آیت ۷۴ اور سورۂ شوریٰ کی آیت ۱۱ کے بموجب حرام ہے۔

لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنی جو صفات بیان فرمائی ہیں ان کو من وعن اور تاویل وتحریف کیے بغیر ان کے حقیقی معنوں میں لینا اور ماننا، نہ اللہ کی تشبیہ ہے اور نہ تمثیل۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اپنی جو مثال خود دی ہے اس کو جوں کا توں، بلا کسی تاویل وتحریف کے ماننا نہ تمثیل ہے اور نہ غیر اللہ سے تشبیہ ہے اور اگر ہے بھی، تو اللہ اپنے کسی فعل میں جواب دہ نہیں ہے۔ (الانبیاء: ۲۳)

معلوم ہوا کہ علامہ کشمیری کے امام ومقتدیٰ ابن عربی نے جو یہ فرمایا ہے کہ "و نزهه و شبهه" تو اس کا پہلا حصہ درست ہے اور ''شبہہ'' اور ''اس کی تشبیہ دیے جا'' اللہ ورسول کے خلاف اعلان جنگ ہے اور فرمان الٰہی کے خلاف چیلنج ہے۔

۶۔ امام العصر نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لیے تین جگہوں پر آواز ثابت ہے:

(۱) جب آواز باری تعالیٰ کے جناب سے صادر ہوتی ہے۔

Marfat.com

(۲) جب فرشتہ اسے وصول کرتا ہے۔

(۳) جب فرشتہ اسے نبی پر نازل کرتا ہے، القا کرتا ہے اور ڈالتا ہے۔ ❶

تو ان تین صورتوں یا موقعوں میں سے صرف پہلی دو صورتوں یا موقعوں پر اللہ تعالیٰ کی آواز ثابت ہے، مگر اس کی کوئی کیفیت، صفت اور مثال ثابت نہیں ہے، لہٰذا اس کو کسی بھی آواز سے تشبیہ دینا، یا اس کی مثال دینا اللہ کی شریعت میں حرام ہے۔

رہی تیسری اور آخری صورت یا موقع تو اس موقع پر اس کو وصول کرنے والا فرشتہ صرف وہ کلام اور وہ حکم اپنی آواز اور اپنے تلفظ اور نطق کی صورت میں اس نبی یا رسول کو پہنچاتا تھا جس کو پہنچانے کا اس کو حکم دیا جاتا تھا۔ رہی اللہ کی آواز تو فرشتہ نہ تو اس کو ''مرسل الیہ'' رسول تک پہنچاتا تھا اور نہ پہنچا سکتا تھا، یہ ایسی بدیہی حقیقت ہے جس کو ایک معمولی اور غیر تجربہ کار انسان بھی سمجھ سکتا ہے۔

لطیفہ:

علامہ کشمیری نے اس بحث کے آخر میں ایک ایسی بات تحریر فرمائی ہے جو ان کی علمی شہرت پر ایک بدنما داغ ہے، میں پہلے ان کی عربی عبارت نقل کر دیتا ہوں، پھر اس کا ترجمہ کر دوں گا، تاکہ میرے اوپر غلط بیانی کا الزام نہ لگایا جائے۔

"ثم إن هذا الصوت هل يبلغ الى النبى بعينه كما يبلغ الى اهل السموات، او يتلقاه الملك و يحفظه كما تحفظ الاصوات فى الالواح المعروفة اليوم ما يسمى بالفونو غراف" فامر يدور النظر فيه و لم يتعرض اليه الحديث"

''پھر یہ آواز کیا نبی ﷺ کو ہو بہو اسی طرح پہنچ جاتی تھی جس طرح آسمان والوں کو پہنچ جاتی تھی یا فرشتہ اس کو وصول کر کے اس کو اس طرح محفوظ کر لیتا تھا جس طرح آوازیں آج کے زمانے میں معروف ''فونوگراف'' کی پلیٹوں میں محفوظ کر لی جاتی ہیں، یہ مسئلہ زیر غور ہے اور حدیث نے اس سے تعرض نہیں کیا ہے۔'' ❷

میرے خیال میں یہ بات اسی شخص کے قلم سے نکل سکتی ہے جو وحی و رسالت کے معنوں، اور فرشتوں اور رسولوں کے فرائض منصبی سے بالکل ناواقف ہو اور قرآن پاک جس کے مطالعہ میں آتا ہی نہیں ہو یا آتا تو رہا ہو، مگر وہ اس کے اوپر ہی اوپر سے گزر جاتا رہا ہو۔

سورۂ شوریٰ کی آیت اس امر میں بالکل قاطع ہے کہ انسان کا یہ مقام ہی نہیں کہ اللہ اس سے دو بدو بات کرے، اس نے موسیٰ علیہ السلام سے اپنی خاص حکمت سے ایک بار براہ راست بات کی تھی، لیکن بعد میں ان پر بھی شرعی احکام بذریعہ وحی نازل ہوتے رہے، اگر انبیاء و رسل براہ راست اللہ تعالیٰ کی آواز سن کر اللہ کے احکام وصول کر سکتے تو پھر فرشتوں کی کیا

---

❶ ص ۲۰ ❷ ص ۲۰

Marfat.com

ضرورت تھی؟ اور اللہ کے احکام، تعلیمات، ہدایات آواز ہی کی دوش پر تو آتی ہیں، لہٰذا جب یہ معلوم ہو گیا کہ رسولوں کو اللہ کے احکام فرشتوں ہی کے ذریعہ ملتے ہیں جس کے بیان سے قرآن بھرا پڑا ہے تو پھر یہ سوال لایعنی ہے کہ کیا نبی ﷺ کو اللہ کی آواز اسی طرح پہنچ جاتی تھی جس طرح آسمانوں والوں کو پہنچ جاتی ہے؟

رہا آپ کا یہ سوال کہ کیا آواز وصول کرنے والا فرشتہ اللہ کی آواز اسی طرح محفوظ کر لیتا تھا جس طرح فونوگراف کی پلیٹوں میں آوازیں محفوظ کر لی جاتی ہیں؟ تو آپ کے اس سوال سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ان لوگوں کی مت ماری گئی تھی جنہوں نے آپ کو امام العصر قرار دے رکھا تھا، اور مولانا تھانوی کو کیا ہو گیا تھا کہ آپ کے وجود کو اسلام کے آسمانی مذہب ہونے کی دلیل قرار دے بیٹھے۔

علامہ کشمیری صاحب! آپ نے خود یہ اعتراف کیا ہے کہ صحیح بخاری کی حدیث نمبر ۲ میں گھنٹی بجنے کی آواز کی مماثل آواز کو اللہ کی آواز قرار دینے والے آپ خود ہیں اور ایسا آپ نے کسی دلیل سے نہیں کیا ہے اپنی خواہش نفس یا ذوق سے کیا ہے اور اس دنیا میں اگر آپ کی یہ ''بکواس'' کسی کی بکواس سے ہم آہنگ ہے تو وہ ابن عربی ہے جس کو صوفیا کے علاوہ سب ملحد و زندیق قرار دے چکے ہیں جن کے اس حکم اور فیصلے کی سو فیصد تائید ان کی کتابوں سے ہوتی ہے۔

فرشتوں کے پاس فونوگراف اور گراموفون کے انکشاف سے یہ یقین ہو گیا کہ جو شخص کتاب و سنت سے دور ہو جائے وہ اسی پستی میں گر جاتا ہے جس پستی میں صوفیا گر چکے تھے۔ میں اس طرز تخاطب پر اپنے قارئین سے معذرت خواہ ہوں۔ بعض لوگوں نے اپنی شہرت سے اسلام کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا ہے۔

میں نے امام العصر کی معرکۃ الآراء تصنیف ''فیض الباری علی صحیح البخاری'' کے مضامین کی صرف ایک جھلک دکھائی ہے پوری کتاب اسی طرح کی خرافاتوں سے پر ہے۔ وہ الفاظ کی تشریح فارسی زبان سے کرتے ہیں، عقائد کو فلاسفہ، متکلمین اور ابن عربی کے اقوال سے واضح کرتے ہیں اور احکام کے رد و قبول کا معیار احناف کی کتابیں ہیں۔

حدیث اور کوثری:

متاخرین علمائے احناف میں محمد زاہد کوثری ایک بہت بڑا نام ہے۔ حدیث کا علم رکھنے کے اعتبار سے بھی اور تعصب مسلکی کے اعتبار سے بھی، حدیث کو حنفیت کی تائید کے لیے استعمال کرنے کے اعتبار سے بھی اور غیر حنفیوں سے نفرت و کراہیت رکھنے کے اعتبار سے بھی، اور حنفیت کو ہر مسلک سے افضل دکھانے کے لیے حق کو باطل اور باطل کو حق قرار دینے کے اعتبار سے بھی اور اپنے مقصد کے حصول کی خاطر ہر جائز و ناجائز ذریعہ اور حربہ استعمال کرنے کے اعتبار سے بھی۔

یوں تو کوثری کا تعلق ہندوستان سے نہیں تھا، کیونکہ وہ اصلاً ترکی کے رہنے والے تھے اور اپنی زندگی کا آخری طویل مرحلہ مصری دار الحکومت قاہرہ میں گزارا تھا۔ بایں ہمہ برصغیر کے احناف سے عموماً اور اکابر دیوبند سے خصوصاً نہایت گہرا اور مضبوط رشتہ و تعلق رکھتے تھے۔

Marfat.com

جیسا کہ میں نے عرض کیا محمد زاہد کوثری کو حدیث کا وسیع علم حاصل تھا، خصوصیت کے ساتھ ''اسماء الرجال'' کی معرفت میں خصوصی مہارت حاصل تھی جس کو انہوں نے حدیث کی صحت وسقم معلوم کرنے کے لیے نہیں بلکہ اپنے مقصد کی خاطر صحیح حدیث کو ضعیف قرار دینے اور ضعیف کو صحیح میں تبدیل کرنے کے لیے استعمال کیا اور عام علماء اور ارباب فکر و دانش کے علم الرجال سے نابلد ہونے کی وجہ سے ان کو گمراہ کرنے میں خاصے کامیاب رہے۔

معلوم رہے کہ ترکی اور افغانستان کے مسلمانوں کی اکثریت، بلکہ سارے ہی مسلمان حنفی ہیں اور صوفی بھی اور مسلکی تعصب میں ہندوستان اور پاکستان کے احناف سے بہت آگے ہیں۔ طویل تجربے کی روشنی میں اگر یہ کہوں کہ ان دونوں ملکوں میں ''حنفیت'' دین ہے، فقہی مذہب ومسلک نہیں تو ذرہ برابر بھی مبالغہ نہ ہوگا۔ اس پس منظر میں اکابر دیوبند سے کوثری کے تعلق اور کوثری سے اکابر دیوبند کے تعلق کو سمجھنا آسان ہو جاتا ہے اور چونکہ کوثری کو عربوں میں رہنے کی وجہ سے عربی زبان میں اظہار مطلب پر بڑی قدرت حاصل تھی اور اعتزالی اور متکلمانہ اسلوب بیان کی چھاپ نے ان کی تحریروں کو مناظرانہ اور مجادلانہ رنگ میں رنگ دیا تھا، اس پر مستزاد یہ کہ محدثین اور غیر احناف کے حق میں نازیبا اور جارحانہ انداز بیان کے دلدادہ ہونے کی وجہ سے برصغیر کے علمائے احناف میں بڑی قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔

محمد زاہد کوثری فقہی مسلک میں سخت حنفی، سلوک میں غالی صوفی اور عقائد میں بے لچک اشعری اور ماتریدی ہونے کی وجہ سے اسلاف اور محدثین سے اتنے فاصلہ پر کھڑے تھے کہ ان سے قربت کے تمام امکانات ناپید ہو چکے تھے۔ معتزلہ نے تو محدثین اور اللہ تعالیٰ کے اسماء اور صفات سے متعلقہ قرآنی آیات اور احادیث کو حقائق پر محمول کرنے والوں کو صرف ''مشبہہ'' قرار دیا ہے اور اپنی کتابوں میں اسی لقب سے ان کو یاد کیا ہے، لیکن کوثری نے تشبیہ وتجسیم سے لے کر ہر مذموم صفت سے ان کو موصوف کیا ہے یاد رہے کہ کوثری کی تحریروں کے مطابق ہر غیر حنفی عقیدہ وعمل میں حق سے دور تھا، جبکہ محدثین اور اہل سنت و جماعت صحابہ کرام کے نقش قدم کے پیرو تھے اور اس طریقے پر تمام ائمہ فقہ، ابوحنیفہ، مالک، شافعی، احمد بن حنبل، ابو یوسف اور محمد ؒ گامزن تھے۔ امام طحاوی کی کتاب ''عقیدۂ طحاویہ'' میں امام ابوحنیفہ، امام ابو یوسف اور امام محمد کے عقائد بیان کیے گئے ہیں جو دو ایک تعبیروں کے علاوہ تمام کے تمام اسلاف کے عقائد ہیں اور ان میں معتزلہ اور متکلمین کے عقائد کا شائبہ تک نہیں ہے اور عقیدۂ طحاویہ کے گراں قدر شارح ابن ابی العز رحمہ اللہ حنفی نے اس کو عقیدہ کی ایک شاہکار کتاب میں تبدیل کر دیا ہے۔

لیکن کوثری نے امام بیہقی کی مشہور کتاب ''الاسماء والصفات'' کی جو تحقیق کی ہے اس میں اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات کی تاویل کر کے اس کو متکلمین کی کتاب بنا دیا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ متاخرین احناف عقائد و احکام دونوں میں اپنے اسلاف متقدمین کے طریقے کے خلاف ہیں۔ یہاں اس امر کا ذکر دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا کہ امام العصر مولانا کشمیری اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کے باب میں تنزیہ اور تشبیہ دونوں کے قائل تھے اور اپنے امام ابن عربی کے قول

Marfat.com

''تنزیہ کیے جا تشبیہ دیے جا'' کا ورد کیا کرتے تھے اور کوثری کے نزدیک تشبیہ و تجسیم کا قائل ملت سے خارج ہے، اہل سنت و جماعت کے نزدیک بھی ایسا شخص ملت سے خارج ہے، البتہ اہل سنت و جماعت اور متکلمین کے درمیان تشبیہ اور تجسیم کے مفہوم میں فرق ہے۔

کوثری کی غلط بیانیاں

تمہید:

حافظ خطیب بغدادی نے اپنی مشہور کتاب تاریخ بغداد میں جہاں دوسرے مشاہیر کے تذکرے لکھے ہیں وہیں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے حالات بھی قلم بند کیے ہیں اس زمانے میں لوگوں کے سوانح اور حالات روایتوں کی شکل میں بیان کیے جاتے تھے اسی طرح بغدادی نے امام ابوحنیفہ کے معاصر متعدد مشاہیر نے ان کے بارے میں اپنے تجربات اور مشاہدات بیان کیے ہیں چونکہ احناف کے نزدیک امام ابوحنیفہ غیر معمولی، بلکہ مافوق الطبعی مقام رکھتے تھے اور وہ ان کے حق میں مبالغہ آمیز ''مدح'' کے سوا کچھ اور سننے کے متحمل نہیں ہو سکتے، اس لیے بعض لوگوں نے ان کے حالات بیان کرتے ہوئے ان کی منقبت بیان کرنے کے بجائے ان پر جو تنقیدیں کی ہیں یا دوسرے لفظوں میں روایت حدیث میں ان کو بہت زیادہ قابل اعتماد نہیں قرار دیا ہے یا بعض حدیثوں کے بارے میں ان کے ایسے طرز عمل اور رویے کی نشان دہی کی ہے جن سے حدیث رسول کے عدم احترام کا تاثر ملتا ہے اس پر زاہد کوثری کا ''جامہ سے باہر ہو جانا'' تو متوقع تھا، مگر ان روایتوں پر اپنے ردعمل کا اظہار کرتے ہوئے حافظ خطیب بغدادی کی مذمت میں ''تانیب'' (سرزنش) کے عنوان سے رسالہ لکھ دینا نہ کوثری کے حق میں بہتر تھا اور نہ یہ امام ابوحنیفہ کے دفاع میں کوئی قابل قدر عمل ہی تھا۔ یہ اس صورت میں جب کوثری نے سنجیدہ لب و لہجہ میں بغدادی کو جواب دیا ہوتا اور دلائل کی زبان میں ان کی فراہم کردہ معلومات کو مبنی بر غلط قرار دیا ہوتا، لیکن اب جبکہ زاہد کوثری نے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا اتنا دفاع نہیں کیا ہے جتنا حافظ بغدادی کو گالی دی ہے، ائمہ حدیث کی بے حرمتی کی ہے۔ سو سے زیادہ حفاظ حدیث پر تعدی کی ہے اور اپنی بد اعتقادیوں کا پردہ چاک کرتے ہوئے خود اپنی رسوائی کا سامان کیا ہے اور بعض صحیح ترین حدیثوں کا انکار کر کے اپنی حق دشمنی کے دلائل فراہم کر دیے ہیں اور ''رواۃ حدیث'' کے ناموں میں تشابہ سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے بعض ثقہ ترین راویوں کو ضعیف اور بعض ضعفاء کو ثقہ دکھایا ہے تو اس طرح انہوں نے نہ ابوحنیفہ کے حق میں اچھا کیا ہے نہ فقہ حنفی کی قدر دانی کی ہے اور نہ اپنا قد اونچا کیا ہے، چنانچہ مشہور یمنی عالم، فقیہ، مفسر اور محدث علامہ عبدالرحمٰن بن یحییٰ معلمی رحمہ اللہ نے ''التنکیل'' نامی اپنی لاجواب کتاب میں کوثری کے ایک ایک دعوے، ایک ایک جواب اور بعض فقہی احکام سے متعلق ایک ایک حدیث کی تردید کا ناقابل تردید علمی جواب دے کر کوثری اور ان جیسے حق دشمنوں اور ائمہ حدیث کے قدر ناشناسوں کی صحیح تصویر پیش کر دی ہے۔ ذیل

Marfat.com

میں بعض صحیح احادیث سے متعلق کوثری کی غلط بیانیوں کا جو جواب نقل کی جا رہا ہے وہ ہے تو ''التنکیل'' سے ماخوذ مگر بیان واختصار میرا ہے:

پہلی غلط بیانی:

حدیث قلتین:

''عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ میں نے سنا ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے کسی ویرانے میں موجود ایسے پانی کے بارے میں پوچھا گیا جس کا رخ چوپائے اور درندے کرتے رہتے ہیں تو آپ نے فرمایا:

((اذا کان الماء قلتین لم ینجسه شیء))

''اگر پانی دو مٹکوں کے بقدر ہو تو اس کو کوئی چیز ناپاک نہیں کر سکتی۔'' [1]

یہ حدیث مذکورہ بالا الفاظ کے علاوہ ان الفاظ میں بھی مروی ہے:

((اذا کان الماء قلتین لم یحمل الخبث))

''اگر پانی دو مٹکوں کے بقدر ہو تو ناپاکی قبول نہیں کرتا، یعنی ناپاک نہیں ہوتا۔''

کوثری کی ہرزہ سرائیاں:

۱۔ ۲۰۰ ہجری سے قبل کسی بھی فقیہ نے اس حدیث کو دلیل نہیں بنایا ہے۔

۲۔ اس میں بڑا اضطراب ہے۔

۳۔ اس کو صرف ان لوگوں نے صحیح قرار دیا ہے جو تصحیح حدیث میں سہل انگاری سے موصوف رہے ہیں۔

۴۔ قلتین -مٹکوں- کے مفہوم کے غیر متعین ہونے کی وجہ سے اس کو صحیح قرار دینا اس کو لینے اور دلیل بنانے میں قطعاً نافع نہیں ہے۔

۵۔ ابن دقیق العید-تقی الدین محمد بن علی بن وہب بن مطیع قشیری- نے عمدۃ الاحکام کی شرح میں یہ اعتراف کیا ہے کہ ''کھڑے پانی'' کی حدیث سے احناف کا استدلال زیادہ قوی ہے۔

تبصرہ:

اب میں ان شاء اللہ تعالیٰ کوثری کی ان ہرزہ سرائیوں پر تبصرہ کر کے ان میں سے ہر ایک کو بے نقاب کروں گا۔

۱۔ کوثری کا پہلا دعویٰ ہے کہ ۲۰۰ ہجری سے قبل تک فقہاء میں سے کسی نے بھی اس حدیث کو دلیل عمل نہیں بنایا ہے۔

کوثری کے اس دعویٰ کا پہلا جواب تو ان کے بہت بڑے عالم شمس الائمہ سرخسی نے اپنے اصول میں دے دیا ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ کسی حدیث پر عدم عمل اس کے عدم ثبوت کی دلیل نہیں ہے اور اگر کسی صحابی کا عمل کسی حدیث کے

---

[1] مسند امام احمد: ۴۸۰۳، ابوداود: ۶۳، ۶۴، ۶۵، ترمذی: ۶۷، نسائی: ۳۲۷، ابن ماجہ: ۵۱۷، ۵۱۸

Marfat.com

خلاف ہوتو اس کا سبب یہ ہوسکتا ہے کہ اسے وہ حدیث معلوم ہی نہ رہی ہو اور حدیث حجت باقی رہے گی۔ ❶

شاہ ولی اللہ نے ''حجۃ اللہ البالغہ'' میں یہ دکھانے کے بعد کہ بہت سی صحیح حدیثیں جو تابعین کو نہیں معلوم تھیں شافعی کو معلوم ہوگئیں، لکھا ہے کہ: ''ان حدیثوں پر تابعین کا عدم عمل ان کی صحت کو داغ دار نہیں بناتا۔'' ❷

کوثری کے دعویٰ کا دوسرا جواب یہ ہے کہ یہ حدیث عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن عباس، ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم اور تابعین میں مجاہد اور عبداللہ بن عبداللہ بن عمر، عبیداللہ بن عبداللہ بن عمر اور بعض فقہائے مکہ سے مروی ہے جس پر ان کا عمل بھی رہا ہے، پھر متعدد صحابہ اور تابعین، مثلاً: عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن عمرو بن عاص، سعید بن جبیر، مسروق بن اجدع، محمد بن سیرین اور ابوعبیدہ بن عبداللہ بن مسعود وغیرہ سے ''قلہ'' کی تفسیر اور تعیین سے متعلق مصنف ابن ابی شیبہ اور سنن دارقطنی میں جو اقوال مروی ہیں ان سے یقینی طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ جن صحابہ اور تابعین نے یہ حدیث روایت کی ہے ان سب کا اس پر عمل تھا اور وہ اس کو حجت مانتے تھے۔ کیا ان تفصیلات کے بعد بھی کوثری کا یہ دعویٰ درخور اعتنا ہے کہ ''دو سو سالوں تک کسی فقیہ کا اس حدیث پر عمل نہیں تھا''؟

۲۔ کوثری کا دوسرا دعویٰ ہے کہ حدیث میں سخت اضطراب اس پر عمل میں مانع رہا ہے۔

تو عرض ہے کہ حدیث کی سند یا متن میں سخت اضطراب سے ایسا اختلاف مراد ہے جس کی وجہ سے حدیث کی تمام سندوں کو ایک ساتھ صحیح ماننا یا ان میں سے کسی کو کسی پر ترجیح دینا ممکن نہ ہو، تو اس طرح کا اضطراب یا اختلاف نہ اس حدیث کی سند میں ہے اور نہ متن میں، جس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

(۱) عن الولید بن کثیر، عن محمد بن عباد بن جعفر، عن عبداللہ بن عبداللہ بن عمر۔

(۲) عن الولید بن کثیر، عن محمد بن جعفر، عن عبیداللہ بن عبداللہ بن عمر ❸

ان دونوں سندوں میں ''ولید بن کثیر سے حدیث کے راوی ابو اسامہ -حماد بن اسامہ- ہیں، جن سے امام شافعی رحمہ اللہ نے یہ حدیث "عن الثقة" -ثقہ سے روایت ہے- کہہ کر روایت کی ہے۔ ❹

حدیث نقل کرنے کے بعد حاکم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اس سند میں ابو اسامہ نے محمد بن عباد بن جعفر -بن رفاعہ مخزومی- کو محمد بن جعفر -بن زبیر بن عوام- سے ملا دیا ہے۔ جوڑ دیا ہے، کبھی انہوں نے یہ حدیث، الولید بن کثیر، عن محمد بن جعفر کی سند سے اور کبھی الولید، عن محمد بن عباد کے طریق سے روایت کی ہے۔ ❺

معلوم رہے کہ ولید بن کثیر اس حدیث کی روایت میں منفرد نہیں ہیں، بلکہ محمد بن اسحاق اس کی روایت میں ان سے متفق ہیں جس کو اصطلاح میں ''متابعت'' سے تعبیر کرتے ہیں، چنانچہ مسند امام احمد کی حدیث نمبر ۴۶۰۵ کی سند ہے: ہم سے عبدہ -ابن سلیمان کلابی- نے بیان کیا، کہا: ہم سے محمد بن اسحاق نے، محمد بن جعفر بن زبیر سے اور انہوں نے

❶ ص ۸، ج ۲　❷ ص ۴۲۲، ج ۱　❸ مستدرک حاکم: ۴۷۰-۴۷۱۔　❹ حاکم ص ۱۰۴　❺ ص ۱۰۴-۱۰۵

Marfat.com

عبیداللہ بن عبداللہ سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا۔

پھر اس سند کی تائید مزید حدیث نمبر ۴۷۵۳ کی سند سے ہوتی ہے جو یہ ہے: ہم سے وکیع نے بیان کیا، کہا: ہم سے حماد بن سلمہ نے، عاصم بن منذر سے اور انہوں نے عبیداللہ بن عبداللہ بن عمر سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا۔

رہا اس حدیث کا متن تو اس میں ''اضطراب'' کوئی کور چشم ہی دیکھ سکتا ہے، چنانچہ: "اذا بلغ الماء قلتين لم ينجسه شيء" ''اگر پانی دو مٹکوں کے بقدر پہنچ جائے تو اس کو کوئی چیز ناپاک نہیں کرسکتی۔'' "اذا كان الماء قدر قلتين لم يحمل الخبث" ''اگر پانی دو مٹکوں کے بقدر ہو تو گندگی قبول نہیں کرتا۔'' "اذا كان الماء قلتين فانه لا ينجس" ''اگر پانی دو مٹکے ہو تو وہ ناپاک نہیں ہوتا۔''

جس حدیث کا تعلق نماز جیسی اہم عبادت کی اہم اور بنیادی شرط ''طہارت'' سے ہو وہ بار بار زیر بحث آئی ہوگی اور اس کے بنیادی راوی عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے لوگوں نے اس کے بارے میں بار بار سوال کیا ہوگا اور انہوں نے ایک ہی بات کو ایسے مترادف الفاظ میں بیان کیا ہوگا کہ مسئلہ بھی واضح ہو جائے اور تعبیر بھی ہم شکل رہے۔

۳۔ زاہد کوثری کا حدیث ''قلتین'' کی صحت پر تیسرا اعتراض یہ ہے کہ بقول اس کے اس کو صرف ان لوگون نے صحیح قرار دیا ہے جو حدیث کی تصحیح میں سہل انگاری سے کام لیتے رہے ہیں۔

تو کوثری کا یہ اعتراض ان کی ہٹ دھرمی اور انکار حقیقت کا ترجمان ہے، کیونکہ اس حدیث کو صحیح قرار دینے والے وہ عظیم المرتبت محدثین اور اہل علم ہیں، جن میں امام شافعی، احمد بن حنبل، اسحاق بن راہویہ اور ابو عبید قاسم بن سلام شامل ہیں۔ ❶

امام شافعی نے ''الام'' کی کتاب ''اختلاف الحدیث'' میں اپنے وقت کے اکابر اہل علم اور منکرین حدیث کے ساتھ حدیث کی شرعی حیثیت اور بعض صحیح حدیثوں کے ثبوت کے موضوع پر اپنے علمی مناظروں کے تذکرے کیے ہیں، جن میں سے ایک امام محمد بن حسن بھی ہیں جن کے ساتھ انہوں نے حدیث سے متعلق مختلف موضوعات پر مناظرے کیے ہیں ان میں سے ایک اسی زیر نظر حدیث قلتین کے ثبوت کے موضوع پر ہے اور انداز بیان سے ظاہر ہو رہا ہے کہ امام محمد نے امام شافعی کے ساتھ بحث و نظر کے بعد اس حدیث کی صحت تسلیم کر لی ہے۔ واضح رہے کہ امام شافعی نے جن لوگوں کے ساتھ مناظرے کیے ہیں ان میں سے کسی کے نام کی تصریح نہیں کی ہے، لیکن مناظرے کے موضوع اور اس کے فحوی سے یہ معلوم کیا جا سکتا ہے کہ ان کے مدمقابل کون ہے۔ ❷

۴۔ کوثری کی چوتھی بڑ یہ ہے کہ ''قلتین ۔مٹکوں۔ کے غیر متعین ہونے کی وجہ سے یہ حدیث دلیل بننے کے قابل نہیں ہے۔''

---

❶ ترمذی: ۶۲ ❷ ص ۱۷۳۶

Marfat.com

کوثری کی اس بڑ کا جواب یہ ہے کہ اس طرح کے الفاظ کے معنیٰ اور مفہوم کا تعین موضوع کی روشنی میں کیا جاتا ہے۔ عربی زبان میں ''قلہ'' کا اطلاق ''جرہ'' کی طرح چھوٹے، بڑے اور متوسط سب پر ہوتا ہے، مگر طہارت کے جس موضوع سے متعلق شارع علیہ السلام نے اس کا ذکر کیا ہے اس سے یہی متبادر ہوتا ہے کہ مراد بڑا قلہ ہے اور اسی میں احتیاط بھی ہے۔

اس وقت سب سے بڑا "قلہ" یا ''مٹکا'' ''ھَجَر" کا ہوتا تھا اور ھَجَر مدینہ کے ایک مضافاتی گاؤں کا نام ہے۔ بعض اہل لغت نے ''قلہ'' کی تفسیر "قِربتین" سے کی ہے اور قربہ ''مشک'' کو کہتے ہیں اس طرح دو مٹکے چار مشک کے مساوی ہوئے۔ ❶

قلتین کی حدیث کا انکار کرنے والوں نے اس کے بارے میں وہی طرز عمل اختیار کیا ہے جو طرز عمل یہودیوں نے گائے ذبح کرنے کے حکم سے متعلق اختیار کیا تھا، اگر وہ کسی بھی گائے کو ذبح کر دیتے تو حکم الٰہی کی تعمیل ہو جاتی، مگر انہوں نے اس کے بارے میں سوال پر سوال کر کے اس کو پیچیدہ سے پیچیدہ تر بنا دیا۔

''حدیث قلتین'' کی صحت شک وشبہ سے پاک ہے۔ معقول حجم اور گنجائش رکھنے والا ہر مٹکا مراد لیا جا سکتا ہے، لیکن چونکہ اس میں عیب لگا کر اس کو مسترد کرنا تھا، اس لیے کہ وہ حنفی مسلک سے متعارض تھی، لہٰذا قدیم زمانے سے آج تک اس حدیث کو نشانۂ اعتراض بنایا جا رہا ہے۔

اس مسئلہ کو قرآن پاک کی اس آیت کی روشنی میں سمجھا جا سکتا تھا اور سمجھا جا سکتا ہے جو قسم کے کفارہ سے متعلق ہے، ارشاد ربانی ہے:

﴿فَكَفَّارَتُهٗٓ اِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسٰكِيْنَ مِنْ اَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ اَهْلِيْكُمْ اَوْ كِسْوَتُهُمْ اَوْ تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ﴾ (المائدۃ: ۸۹)

''اس کا کفارہ دس مسکینوں کو اوسط درجہ کا وہ کھانا کھلانا ہے جو تم اپنے گھر والوں کو کھلاتے ہو یا ان کو کپڑے پہنانا یا ایک گردن کو آزاد کرنا ہے۔''

یہاں یہ بتانا تحصیل حاصل ہے کہ مسکینوں میں طویل القامت بھی ہوتے ہیں اور پستہ قامت بھی، موٹے بھی ہوتے ہیں اور نحیف بھی اس اعتبار سے ان کے کھانے کی مقدار ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہے، پھر کھانے اور لباس کی دسیوں قسمیں ہوتی ہیں اسی طرح ان میں اوسط درجہ متعین کرنا دشوار ہوتا ہے۔ اگر یہودیوں کو یہ حکم دیا گیا ہوتا تو وہ دسیوں سوال کر کے اس کو ناقابل عمل قرار دینے کی کوشش کرتے، مگر ان تمام اعتبارات کو حجت بنا کر قرآنی حکم کا انکار اس لیے نہیں کیا گیا کہ اس طرح ملت سے نکال باہر کر دیے جانے کا اندیشہ تھا، اور چونکہ یہ اندیشہ حدیث کی صحت کے انکار

❶ سنن بیہقی ص ۲۶۳-۲۶۴، ج ۱

Marfat.com

سے نہیں تھا، اس لیے اپنے مسلک کو قوی دکھانے کے لیے یہ دعویٰ کر دیا گیا کہ ''حدیث قلتین'' صحیح نہیں ہے اس حجت سے نہ جانے کتنی صحیح ترین حدیثوں کا انکار کر دیا گیا اور اہل سنت و جماعت ہونے پر آنچ بھی نہیں آئی۔

۵۔ کوثری کا پانچواں دعویٰ یہ ہے کہ ''امام ابن دقیق العید نے عمدۃ الاحکام کی شرح میں یہ اعتراف کیا ہے کہ ''کھڑے پانی'' کی حدیث سے احناف کا استدلال زیادہ قوی ہے۔ مگر کوثری کا یہ دعویٰ جھوٹ ہے۔ ابن دقیق العید مذکورہ شرح میں تحریر فرماتے ہیں:

یہ حدیث -کھڑے پانی میں پیشاب کرنے سے منع کرنے والی حدیث- ان حدیثوں میں سے ایک ہے جس سے احناف کھڑے پانی کے نجس ہونے پر استدلال کرتے ہیں، اگرچہ وہ دو مٹکوں -قلوں- سے زیادہ ہو، جبکہ اس حدیث کی عبارت ''عموم'' پر دلالت کرتی ہے اور شوافع اس عموم کی تخصیص کرتے ہوئے ''پیشاب نہ کرنے'' کو دو مٹکوں سے کم پانی پر محمول کرتے ہیں۔ لہٰذا دونوں حدیثوں پر ایک ساتھ عمل کرنے کے لیے حدیث میں عمومی ''نہی'' کو دو مٹکوں سے کم پانی کے لیے خاص مانا جائے، اس لیے کہ ''قلتین کی حدیث'' کا تقاضا یہ ہے کہ دو قلوں کے بقدر اور اس سے زیادہ پانی ''نجس'' نہیں ہوتا اور یہ چیز ہماری ذکر کردہ حدیث کے عموم سے خاص ہے اور خاص عام پر مقدم ہوا کرتا ہے۔ [1]

ابن دقیق العید کی مذکورہ بالا عبارت ببانگ دہل یہ اعلان کر رہی ہے کہ ان کو احناف کے طرز استدلال پر سخت اعتراض ہے، نہ کہ اس کے قوی ہونے کا اعتراف۔

زیلعی کا سہو:

حافظ جمال الدین عبداللہ بن یوسف زیلعی حنفی نے ''نصب الرایہ تخریج احادیث الھدایہ'' میں یہ دعویٰ کیا ہے کہ ابن دقیق العید نے اپنی کتاب ''الامام'' میں ''حدیث قلتین'' اور اس کے تمام طرق اور سندوں پر ہمہ جہتی بحث کی ہے جس کا خلاصہ اور حاصل یہ ہے کہ انہوں نے اس کو ضعیف قرار دیا ہے۔ [2]

تو یہ حافظ زیلعی کی بھول ہے، کیونکہ عمدۃ الاحکام کی شرح کی مذکورہ بالا عبارت اس امر میں قاطع ہے کہ قلتین کی حدیث صحیح اور معتمد علیہ ہے۔

صورت مسئلہ:

صحیح مسلم کی حدیث "لا یبولن احدکم فی الماء الدائم ثم یغتسل منه" ''تم میں سے کوئی کھڑے پانی میں پیشاب اور پھر اس سے غسل نہ کرے۔'' [3]

اس حدیث میں بنیادی طور پر کھڑے پانی میں پیشاب کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ پھر ''ثم'' فرما کر اس بات کو بعید از عقل قرار دیا گیا ہے کہ کوئی سمجھ دار آدمی اس پانی سے غسل کرے گا؟ دوسرے لفظوں میں کھڑے پانی میں پیشاب کرنا

[1] ص ۱۲۱-۱۲۵، ج ۱ [2] ص ۱۵۴-۱۵۵، ج ۱ [3] نمبر ۲۸۲

Marfat.com

مستقلاً منع ہے۔ قطع نظر اس کے کہ پیشاب کرنے والا اس پانی سے غسل کرے یا نہ کرے۔ پھر اس بات سے منع کر دیا گیا کہ اگر پانی کم ہو تو اس سے غسل کیا جائے۔ کیونکہ اتنے پانی میں پیشاب کرتے ہی وہ ناپاک ہو جائے گا اور اس سے پانی کے تینوں اوصاف، رنگ، بو اور مزہ میں سے کوئی وصف بدل جائے گا۔

اور ''حدیث قلتین'' کا مفہوم یہ ہے کہ کھڑا پانی اگر دو مٹکوں کے بقدر یا اس سے زیادہ ہو جائے تو پھر وہ ناپاک نہیں ہوتا۔ گویا ''ماءِ کثیر'' کی کم سے کم مقدار یہ ہے کہ وہ دو مٹکوں کے برابر ہو۔

صحیح حدیثوں کا انکار اور ضعیف حدیثوں سے استدلال:

قدیم زمانے سے احناف کی یہ پہچان رہی ہے کہ ان کے یہاں صحیح حدیثوں کے انکار اور ضعیف باطل اور منکر روایتوں سے استدلال کا رجحان غالب رہا ہے اور اس عجیب وغریب طرز عمل سے اکابر احناف کا دامن بھی پاک نہیں رہا ہے۔ بلکہ اگر میں یہ کہوں کہ اپنے مسلک کے دفاع کا جذبہ ان کے نزدیک حدیث رسول کے دفاع اور اس پر عمل سے کہیں زیادہ محبوب رہا ہے اور یہ جانتے ہوئے صحیح حدیثوں سے پیچھا چھڑانے اور اپنے مسلک سے ہم آہنگ ضعیف ترین، بلکہ باطل روایتوں سے استدلال عام رہا ہے کہ جن حدیثوں سے پیچھا چھڑایا جا رہا ہے ان کی نسبت رسول اللہ ﷺ سے قطعی طور پر صحیح اور ثابت ہے اگر یہ طرز عمل احکام القرآن کے مصنف ابوبکر احمد بن علی جصاص اور کوثری کے ساتھ خاص ہوتا تو اس خیال سے ان کو نظر انداز کیا جا سکتا تھا کہ جصاص معتزلی ہونے کی وجہ سے حدیث اور محدثین سے پرخاش رکھتے تھے اور کوثری کو تمام محدثین، بلکہ اہل سنت و جماعت کے نام سے نفرت تھی حتیٰ کہ بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی اس کی زہر پاشیوں سے محفوظ نہیں رہے، لیکن یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے اور تعجب بھی کہ امام طحاوی جیسا قد آور عالم حدیث اور کشمیری جیسا امام العصر بھی اس مذموم صفت سے پاک نہیں رہا۔

امام العصر علامہ کشمیری تو ان علمائے احناف میں سے ایک تھے جو صحیحین، بخاری اور مسلم کی حدیثوں کو قطعی الثبوت مانتے تھے۔ ❶ اس کے باوجود ضعیف حدیثوں، قیاس ورائے اور فلسفیانہ مجادلوں کے ذریعہ صحیح حدیثوں سے پیچھا چھوٹنے پر راحت محسوس کرتے تھے۔

''رفع الیدین فی الصلوۃ'' کا مسئلہ احناف اور اہل حدیث اور احناف وشوافع کے اختلافی مسائل میں سرفہرست ہے اور علامہ کشمیری کو حدیثوں کے وسیع علم کے نتیجے میں یہ معلوم تھا کہ ''رفع یدین'' ثابت ہے اور رفع یدین کرنا نہ کرنے پر راجح ہے۔ چنانچہ انہوں نے صریح لفظوں میں لکھ دیا ہے، بلکہ اعتراف کر لیا ہے کہ: ((فقد ثبت الامران عندی -الرفع و الترك- ثبوتا لا مرد له، و لا خلاف الا فی الاختیار، و لیس فی الجواز)) ''میرے نزدیک دونوں صورتیں -رفع یدین کرنا اور نہ کرنا- ناقابل تردید طریقے سے ثابت ہے اور اختلاف اگر ہے تو افضلیت

❶ فیض الباری: ص ۴۵-۴۷، ج ۱

Marfat.com

میں نہ کہ جواز میں۔'' ❶

پھر ابوبکر جصاص کا ایسا قول نقل کیا ہے، جس سے ''رفع یدین'' کرنے کے جواز کی تائید ہوتی ہے۔ یہاں ان کے قلم سے ایک ایسا نازیبا جملہ نکل گیا ہے جس نے امام العصر اور محدث ہونے کی ان کی شہرت پر بلڈوزر چلا دیا ہے، فرماتے ہیں:

"فاسترحت حيث تخلصت رقبتي من الاحاديث الثابتة في الرفع".

''رفع یدین کے مسئلہ میں ثابت احادیث سے اپنی گردن کے چھٹکارا پا لینے سے مجھے سکون قلب حاصل ہو گیا۔''

غور فرمایئے ایک عام مسلمان نہیں، بلکہ ایک امام زمانہ اس بات پر خوشی کا اظہار کر رہا ہے کہ اس کو کسی مسئلہ میں رسول اللہ ﷺ کی ثابت سنت پر عمل سے نجات مل گئی۔''

یہاں اپنے قارئین کے علم میں یہ بات لانا چاہتا ہوں کہ اس مسئلہ میں مولانا عبدالحی لکھنوی امام العصر پر سبقت لے گئے اور پوری شجاعت اور علمی امانت داری کے ساتھ اعلان کر دیا کہ:

''رفع یدین کرنے اور نہ کرنے دونوں کا ثبوت ملتا ہے، مگر رفع یدین کرنے کے راوی صحابہ کرام کی تعداد ''جم غفیر'' سے عبارت ہے اور رفع یدین نہ کرنے کے راویوں کی تعداد کم بھی ہے اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے علاوہ کسی اور صحابی سے رفع یدین نہ کرنے کی روایت صحیح بھی نہیں ہے۔''

مولانا عبدالحی لکھنوی نے ''رفع یدین'' کے نسخ کا دعویٰ کرنے والے طحاوی، ابن الہمام اور عینی وغیرہ پر سخت تنقید کی ہے اور لکھا ہے کہ اگر ''یہ ثابت ہو کہ کوئی صحابی رفع یدین نہیں کرتا تھا تو اس کا سبب یہ نہیں تھا کہ اس کے نزدیک رفع یدین منسوخ تھا۔ بلکہ اس کا سبب یہ تھا کہ اس کے نزدیک رفع یدین ''سنت مؤکدہ'' نہیں تھی۔'' ❷

یاد رہے کہ رفع یدین نہ کرنے کی ایک حدیث بھی صحیح نہیں ہے۔ عبداللہ بن مسعود کی حدیث بھی نہیں۔ اس کے باوجود رفع یدین نہ کرنا افضل ہے؟!!

چوری کے جرم میں ہاتھ کاٹنے کی سزا:

چوتھائی دینار یا تین درہم سے کم مالیت کی چوری میں قطع ید نہیں:

۱۔ ہم سے عبداللہ بن مسلمہ نے بیان کیا، کہا: ہم سے ابراہیم بن سعد نے، ابن شہاب سے، انہوں نے عمرہ سے اور انہوں نے عائشہ سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا کہ نبی ﷺ نے فرمایا ہے:

((تقطع اليد في ربع دينار فصاعدا))

''چوتھائی دینار اور اس سے زیادہ کی چوری میں ہاتھ کاٹا جائے گا۔'' ❸

❶ ص ۲۵۷-۲۵۹ ج ۲ ❷ التعليق الممجد على مؤطا محمد ص ۳۸۸-۳۸۹، ج ۱ ❸ بخاری: ۶۷۸۹، مسلم ۱۶۸۴

Marfat.com

۲۔ ہم سے اسماعیل بن ابی اویس نے، ابن وہب سے، انہوں نے یونس سے، انہوں نے ابن شہاب سے، انہوں نے عروہ بن زبیر اور عمرہ سے اور ان دونوں نے عائشہ سے اور انہوں نے نبی ﷺ سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا کہ آپ نے فرمایا:

((تقطع يد السارق في ربع دينار))

''چور کا ہاتھ ایک چوتھائی دینار کی چوری میں کاٹ دیا جائے گا۔'' ❶

ان کتابوں میں "فصاعداً" کا اضافہ ہے۔

۳۔ ہم سے عمران بن میسرہ نے بیان کیا، کہا: ہم سے عبدالوارث نے بیان کیا، کہا: ہم سے حسین نے، یحییٰ بن ابی کثیر سے، انہوں نے محمد بن عبدالرحمٰن انصاری سے، انہوں نے عمرہ بنت عبدالرحمٰن سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا کہ عمرہ نے ان سے بیان کیا کہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے ان لوگوں سے نبی ﷺ سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا کہ آپ نے فرمایا ہے:

((تقطع اليد في ربع دينار))

''ربع دینار کی چوری میں ہاتھ کاٹا جائے گا۔'' ❷

۴۔ ہم سے عثمان بن ابی شیبہ نے بیان کیا، کہا: ہم سے عبدہ نے، ہشام بن عروہ سے، انہوں نے اپنے باپ سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا کہ انہوں نے کہا: مجھے عائشہ نے خبر دی کہ:

((ان يد السارق لم تقطع على عهد النبي ﷺ الا في ثمن مجن ، جحفة او ترس))

''نبی ﷺ کے عہد میں چور کا ہاتھ نہیں کاٹا گیا، مگر ڈھال کی قیمت کی مساوی چیز کی چوری میں۔'' ❸

۵۔ مذکورہ حدیث کا متن اس سند سے بھی بیان کیا گیا ہے: ہم سے عثمان نے بیان کیا، کہا: ہم سے حمید بن عبدالرحمٰن نے بیان کیا، کہا: ہم سے ہشام نے اپنے باپ سے اور انہوں نے عائشہ سے اسی طرح کی حدیث بیان کی۔

۶۔ ہم سے محمد بن مقاتل نے بیان کیا، کہا: ہمیں عبداللہ نے خبر دی، کہا: ہمیں ہشام بن عروہ نے اپنے باپ سے اور انہوں نے عائشہ سے رویات کرتے ہوئے خبر دی کہ انہوں نے کہا:

((لم تكن تقطع يد السارق في ادنى من جحفة او ترس ، كل واحد منهما ذو ثمن))

---

❶ بخاری: ۶۷۹۰، مسلم: ۱۶۸۴، مسند امام احمد: ۲۴۰۷۹، ابوداود: ۴۳۸۴، نسائی: ۴۹۰۴، سنن کبری

❷ بخاری: ۶۷۹۱، مسلم: ۱۶۸۴

❸ بخاری ۶۷۹۲، مسلم ۱۶۸۵

Marfat.com

''چور کا ہاتھ چمڑے کی ڈھال یا لوہے کی ڈھال سے کم قیمت کی چوری میں نہیں کاٹا جاتا تھا اور ان میں سے ہر ایک قیمتی ہے۔'' ❶

مجن اور ترس لوہے کی ڈھال کو کہتے ہیں اور جحفہ لکڑی یا ہڈی سے بنی ایسی ڈھال کو کہتے ہیں جس پر چمڑے کا غلاف چڑھا ہو۔

اس حدیث کی روایت وکیع اور ابن ادریس نے ہشام سے اور انہوں نے اپنے باپ سے ''مرسل'' شکل میں بھی کی ہے۔

۷۔ مجھ سے یوسف بن موسیٰ نے بیان کیا، کہا: ہم سے ابو اسامہ نے بیان کیا، کہا: ہشام بن عروہ نے اپنے باپ سے اور انہوں نے عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہوئے ہمیں خبر دی: وہی سابقہ مضمون نمبر: ۶۷۹۴-۱۶۸۵-۵-۔

۸۔ ہم سے اسماعیل نے بیان کیا، کہا: مجھ سے مالک بن انس نے عبداللہ بن عمر کے آزاد کردہ غلام، نافع سے اور انہوں نے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا کہ:

((ان رسول اللہ ﷺ قطع فی مجن ثمنه ثلاثة دراهم))

''رسول اللہ ﷺ نے ایک ایسی ڈھال کی چوری میں قطع ید کی سزا دی جس کی قیمت تین درہم تھی۔'' ❷

اس حدیث کی روایت میں محمد بن اسحاق نے نافع کی متابعت کی ہے۔

صحیح بخاری حدیث نمبر ۶۷۹۶ بسند موسی بن اسماعیل، عن جویریہ، عن نافع، عن ابن عمر، اور حدیث نمبر ۶۷۹۷، بسند مسدود، عن یحیی، عن عبیداللہ، عن نافع، عن عبداللہ بن عمر اور حدیث نمبر ۶۷۹۸، بسند ابراہیم بن منذر، عن ابوضمرہ، عن موسی بن عقبہ، عن نافع، عن عبداللہ بن عمر کا مضمون یکساں ہے۔ ❸

میں نے اوپر جتنی حدیثیں نقل کی ہیں وہ سب صحیح بخاری کے الفاظ میں ہیں، لہٰذا اس مسئلہ پر بحث میں صحیح بخاری ہی کو بنیاد بنایا جائے۔

۹۔ ہم سے موسی بن اسماعیل نے بیان کیا، کہا: ہم سے عبدالواحد نے بیان کیا، کہا: ہم سے اعمش نے بیان کیا، کہا: میں نے ابو صالح کو کہتے ہوئے سنا ہے، انہوں نے کہا: میں نے ابو ہریرہ کو کہتے ہوئے سنا ہے، انہوں نے کہا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

((لعن الله السارق ، يسرق البيضة فتقطع يده و يسرق الحبل فتقطع يده))

''ایسے چور پر اللہ کی لعنت ہو جو خود چراتا ہے اور اس کا ہاتھ کاٹ دیا جاتا ہے اور رسی چراتا ہے اور اس کا ہاتھ کاٹ دیا جاتا ہے۔'' ❹

---

❶ بخاری ۶۷۹۲، مسلم: ۱۶۸۵-۵ ❷ بخاری: ۶۷۹۵، مسلم: ۱۶۸۶

❸ مسلم: ۱۶۸۶ ❹ بخاری: ۶۷۹۹، مسلم: ۱۶۸۷

Marfat.com

چوری کی سزا سے متعلق سلسلۂ احادیث کی آخری کڑی یہی ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے۔ صحیح بخاری کے رمز شناس امام و محدث و حافظ ابن حجر فرماتے ہیں:

''امام بخاری نے ایسے چور کی لعنت کے مسئلہ میں، جو ''خود'' کی چوری کرتا ہے اور اس کا ہاتھ کاٹ دیا جاتا ہے، ابوہریرہ کی حدیث سے اس باب کا اختتام کیا ہے اسی طرح اس امر کی جانب اشارہ کر دیا ہے کہ اس مسئلہ سے متعلق جب احادیث جمع کی جائیں تو عائشہ رضی اللہ عنہا سے عمرہ کی حدیث کو اصل اور بنیاد قرار دیا جائے اور قطع ید کی سزا ربع دینار یا اس سے زیادہ کی چوری یا کسی ایسی چیز کی چوری میں دی جائے جس کی قیمت ربع دینار - تین درہم - ہو، اور یہ حدیث لا کر گویا یہ کہہ دیا ہے کہ ''خود سے مراد وہ چیز ہے جس کی قیمت چوتھائی دینار اور اس سے زیادہ ہو یہی حال رسی کا بھی ہے۔ [1]

اوپر ام المومنین عائشہ، عبداللہ بن عمر اور ابوہریرہ رضی اللہ عنہم کی وہ حدیثیں متعدد سندوں سے اور ان کے اصل ماخذوں کے حوالہ سے بیان کر دی گئی ہیں جن میں چوری کے جرم میں قطع ید یا ہاتھ کاٹنے کی سزا چوتھائی دینار یا تین درہم کی مالیت رکھنے والی چیزوں کی چوری کی صورت میں مقرر کی گئی ہے جس کی مزید تفصیل یحییٰ بن یحییٰ غسانی کی زبانی سنیے! کہتے ہیں:

میں مدینہ آیا اور مدینہ کے گورنر ابوبکر بن محمد بن عمرو بن حزم سے ملا، جنہوں نے بتایا کہ: میرے پاس ایک چور لایا گیا، تو میری خالہ عمرہ بنت عبدالرحمٰن نے مجھے یہ پیغام بھیجا کہ میں اس چور شخص کے مسئلہ میں جلد بازی کر کے کوئی قدم نہ اٹھاؤں تا آنکہ وہ چور کے معاملہ میں عائشہ رضی اللہ عنہا سے سن کر مجھے صحیح حکم کی خبر نہ دے دیں، چنانچہ وہ میرے پاس آئیں اور مجھے بتایا کہ انہوں نے عائشہ کو کہتے ہوئے سنا ہے کہ:

((اقطعوا فی ربع الدینار، و لا تقطعوا فیما هو ادنی من ذلك))

''ربع دینار کی چوری میں ہاتھ کاٹو اس سے کم کی چوری میں مت کاٹو۔''

''ربع دینار ان دنوں تین درہم کے مساوی تھا اور ایک دینار ۱۲ درہم کے برابر ہوتا ہے، کہتے ہیں: اس شخص کی چوری کا مال چوتھائی دینار کی مالیت سے کم تھا، لہٰذا میں نے اس کا ہاتھ نہیں کاٹا۔''

یہ صحیح ترین حدیث ہے، اس کی سند میں امام اہل سنت و جماعت احمد اور ان کے شیخ ابونضر ہاشم بن قاسم بن مسلم لیثی کے علاوہ جو دوسرے راوی شامل ہیں، مثلاً محمد بن راشد خزاعی، یحییٰ بن یحییٰ غسانی اور ابوبکر بن محمد بن حزم ثقاہت کی اعلیٰ صفت سے موصوف تھے اور ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا سے اس حدیث کی راوی عمرہ بنت عبدالرحمٰن بن سعد بن زرارہ انصاریہ رضی اللہ عنہا کی ثقاہت اس سے اجل و ارفع تھی کہ اس کی چھان بین کی جائے۔ انہوں نے بیشتر حدیثیں ام المومنین ہی سے روایت کی ہیں۔

[1] فتح الباری: ص ۳۰۱۰، ج ۳

Marfat.com

دس درہم کی حدیثوں کی استنادی حیثیت

ا۔ پہلی حدیث:

امام احمد فرماتے ہیں: ہم سے ابن ادریس -عبداللہ- نے بیان کیا، کہا: ہم سے ابن اسحاق -محمد- نے عمرو بن شعیب سے انہوں نے اپنے باپ سے اور انہوں نے اپنے دادا سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا کہ: رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں ڈھال -مجن- کی قیمت دس درہم تھی۔ ❶

یہ حدیث ضعیف ہے جس کا سبب محمد بن اسحاق کا ''عنعنہ'' ہے جو مدلس تھے اور ائمہ حدیث کا ان کی ''معنعن'' حدیث کے ضعیف ہونے پر اتفاق ہے۔ اگر یہ روایت صحیح احادیث کے خلاف نہ بھی ہوتی تب بھی ناقابل اعتبار ہوتی۔ اب جبکہ یہ صحیح حدیثوں کے خلاف بھی ہے تو منکر ہے ویسے بھی عمرو بن شعیب اور ان کے والد شعیب عدالت کے سب سے نچلے درجہ پر تھے ایسے راوی اپنے سے قوی تر راوی کی تائید اور متابعت کے محتاج ہوتے ہیں، جبکہ یہاں صورت حال یہ ہے کہ ان کی روایت صحیح ترین حدیث کی مخالف ہے۔

یہ حدیث ایک دوسری سند سے بھی آتی ہے جس میں محمد بن اسحاق نہیں ہیں، بلکہ ان کی جگہ حجاج بن ارطاۃ ہیں، مگر ان کا حال محمد بن اسحاق سے بھی برا ہے۔ یہ حجاج تدلیس کی صفت سے موصوف ہونے کے ساتھ روایتِ حدیث میں غلطیوں کا بھی ارتکاب کرتے تھے۔ اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ کے حوالہ سے خبر دی گئی ہے:

((لا قطع فيما دون عشرة دراهم))

''دس درہم سے کم کی چوری میں قطع ید نہیں ہے۔'' ❷

۲۔ دوسری حدیث:

امام ابوداود کہتے ہیں: ہم سے عثمان بن ابی شیبہ اور محمد بن ابی سری عسقلانی نے بیان کیا، اور الفاظ عسقلانی کے ہیں اور زیادہ کامل ہیں، دونوں نے کہا: ہمیں ابن نمیر -عبداللہ- نے محمد بن اسحاق سے، انہوں نے ایوب بن موسیٰ سے، انہوں نے عطاء -بن رباح- سے، اور عطاء نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہوئے خبر دی، ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا:

((قطع رسول الله ﷺ يد رجل في مجن قيمته دينار او عشرة دراهم))

''رسول اللہ ﷺ نے ایک آدمی کا ہاتھ ایک ایسی ڈھال کی چوری میں کاٹ دیا جس کی قیمت ایک دینار یا دس درہم تھی۔'' ❸

اس سند میں جیسا کہ ظاہر ہے محمد بن اسحاق نے ایوب بن موسیٰ سے بذریعہ ''عن'' حدیث روایت کی ہے جو ان

---

❶ مسند: ۶۶۸۲ ❷ مسند: ۶۹۰۰ ❸ ابوداود ۴۳۸۷، نسائی کی سنن کبریٰ: ۷۴۳۷

Marfat.com

کے مدلس ہونے کی وجہ سے ضعیف ہے۔

امام نسائی نے یہ حدیث سنن کبری میں اسی سند سے مرسل بھی روایت کی ہے اور مرسل روایت بھی نا قابل استدلال ہے۔ مزید یہ کہ یہ حدیث صحیح ترین حدیثوں کے خلاف بھی ہے۔ ❶

۳۔ تیسری حدیث:

یہ حدیث عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے جس کی سند امام طحاوی کی شرح معانی الآ ثار میں اس طرح آئی ہے:

ہم سے ابراہیم بن مرزوق نے بیان کیا، کہا: ہم سے عثمان بن عمر نے، مسعودی - عبدالرحمٰن بن عبداللہ - سے اور انہوں نے قاسم بن عبدالرحمٰن سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا کہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے:

((لا قطع الا فی دینار او عشرة دراهم))

''صرف ایک دینار یا دس درہم کی چوری کی صورت میں قطع ید کی سزا ہے۔'' ❷

امام ترمذی فرماتے ہیں: یہ حدیث مرسل ہے، اس لیے کہ عبداللہ بن مسعود سے قاسم بن عبدالرحمٰن کا سماع ثابت نہیں ہے اور علی رضی اللہ عنہ سے بھی یہ مروی ہے کہ دس درہم سے کم کی چوری میں قطع ید کی سزا نہیں ہے۔ اس کی سند بھی متصل نہیں ہے۔ ❸

کوثری کا مسلک:

اوپر چوری کے جرم میں ''قطع ید'' کی سزا سے متعلق تین درہم اور اس سے زیادہ کی رقم یا مالیت کی چوری والی صحیح حدیثوں اور دس درہم اور اس کی مالیت والی ضعیف حدیثوں کی استنادی حیثیت مختصراً بیان کر دی گئی ہے جس کی روشنی میں یہ امر واضح ہو گیا ہے کہ تین درہم والی حدیثیں اپنے ثبوت اور دلالت دونوں اعتبار سے اس مسئلہ میں دلیل قاطع ہیں اور دس درہم والی تمام حدیثیں مرسل، منکر اور شاذ ہونے کی وجہ سے نا قابل التفات ہیں۔ مگر جس طرح شریعت کے دوسرے احکام میں احناف حدیثوں کی صحت پر نہیں، بلکہ امام ابوحنیفہ، ابو یوسف اور محمد کے اقوال، نقطہ ہائے نظر اور مسلک پر اعتماد کرتے ہیں، اسی طرح اس مسئلہ میں بھی احناف نے صحیح حدیثوں کے مقابلے میں ان ضعیف حدیثوں کو اپنا ماخذ بنایا ہے جن میں چوری کے جرم میں قطع ید کی سزا دینے کے لیے کم سے کم دس درہم یا اس کی مالیت کی چیز کی چوری شرط قرار دی گئی ہے اس لیے کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی طرف منسوب قول یہی ہے کہ اگر مسروقہ مال دس درہم نقد یا اس کی مالیت رکھنے والی چیز سے عبارت ہے تو چور کا ہاتھ کاٹا جائے گا ورنہ نہیں۔

چنانچہ حافظ خطیب بغدادی نے تاریخ بغداد میں ❹ ابوعوانہ وضاح بن عبداللہ کے حوالہ سے بیان کیا ہے، وہ کہتے ہیں:

---

❶ نمبر ۷۴۳۸ ❷ تحفۃ الاحوذی: ص ۱۳۵۸، ج ۱، نصب الرایہ: ص ۵۵۲، ج ۳

❸ حدیث نمبر: ۱۴۴۶ ❹ ص ۳۹۱-۴۰۸ ج ۱۳

Marfat.com

''میں ابوحنیفہ کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ ان کے پاس سلطان کی طرف سے ایک قاصد آیا اور عرض گزار ہوا کہ:
امیر کہتے ہیں:
''ایک شخص نے کھجور کے ایک پودے کی چوری کی ہے اس کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟''
اس کے جواب میں انہوں نے کسی ''ہچکچاہٹ'' کے بغیر کہا:
''اگر پودے کی قیمت دس درہم ہو تو اس کا ہاتھ کاٹ دو......''

کوثری اپنی کتاب تأنیب میں (ص۹۲) خطیب بغدادی کے بیان کردہ اس واقعہ کا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

''امام محمد بن حسن شیبانی ''الآثار'' میں فرماتے ہیں: ہمیں ابوحنیفہ نے حماد سے، اور انہوں نے ابراہیم سے روایت کرتے ہوئے خبر دی کہ:

((لا يقطع السارق في اقل من ثمن المجن ، و كان ثمنه يومئذ عشرة دراهم))

''چور کا ہاتھ ڈھال کی قیمت سے کم کی چوری میں نہیں کاٹا جائے گا جس کی قیمت ان دنوں دس درہم تھی۔''

اور امام محمد نے مؤطا میں کہا ہے:

''قطع ید کے مسئلہ میں لوگوں میں اختلاف ہے، اہل مدینہ کا قول ایک چوتھائی دینار کے حق میں ہے اور انہوں نے اس مسئلہ میں احادیث بھی روایت کی ہیں، اور اہل عراق کا قول ہے کہ دس درہم سے کم کی چوری میں ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا، انہوں نے بھی اس کی تائید میں نبی ﷺ، عمر، عثمان، علی، عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم اور کئی افراد سے حدیثیں روایت کی ہیں اور جب حدود کے معاملے میں اختلاف رونما ہو گیا تو ''معتمد علیہ'' کو اختیار کر لیا گیا جو ابوحنیفہ اور ہمارے تمام فقہاء کا مسلک ہے۔'' [1]

امام محمد کے قول کا ذکر کرنے کے بعد کوثری رقم طراز ہیں:

''ربع دینار تین درہم کی طرح ہے اور حدود کا شمار ان احکام میں ہوتا ہے جو شبہات کے موقع پر ٹال دیے جاتے ہیں اور نافذ نہیں کیے جاتے، اس تناظر میں قطع ید کے مسئلہ میں دس درہم کی روایت کو اختیار کرنے میں زیادہ احتیاط تھی، خاص طور پر جبکہ یہ بھی معلوم نہیں ہے ان مختلف آثار میں ناسخ کیا ہے اور منسوخ کیا؟''

تبصرہ:

کوثری کے اس مسلک یا طرز عمل پر مختصر تبصرہ یہ ہے کہ اگر قطع ید کے مسئلہ میں تین درہم اور دس درہم دونوں کی روایتیں صحیح ہوتیں اگرچہ ان کے درجۂ صحت مساوی نہ ہوتے، اس صورت میں احتیاط اور عدم احتیاط کی بات درست ہوتی، لیکن یہاں تو امر واقعہ یہ ہے کہ دس درہم سے متعلق کوئی بھی روایت صحیح نہیں ہے اور تین درہم کی روایت صحت کے

[1] ص ۶۳-۶۴، ج ۳

Marfat.com

اعلیٰ درجے پر ہے ایسی صورت میں دس درہم والی روایت ناقابل التفات تھی، نہ کہ اس پر عمل احتیاط کا تقاضا تھا، جو حدیث ثابت نہیں وہ حدیث نہیں اور جو حدیث نہیں وہ شرعی دلیل نہیں اور جو شرعی دلیل نہ ہو اس کو شرعی دلیل بنا کر اس پر عمل کرنا اپنے آپ کو شارع قرار دینا ہے جو اگر قصد وارادے سے ہو تو ایسا کرنے والے کو دائرۂ اسلام سے خارج کر دیتا ہے، کیونکہ یہ عمل ''اشہد ان محمد رسول اللہ'' کے خلاف ہے۔

فقہائے احناف کا یہ طرز عمل ایک عجیب وغریب طرز عمل ہے۔ رفع یدین نہ کرنے کی ایک حدیث بھی صحیح نہیں ہے اور رفع یدین کرنے کی دسیوں حدیثیں صحیح اور بے غبار ہیں، مگر امام ابوحنیفہ سے رفع یدین نہ کرنے کے ثبوت کی بنیاد پر رفع یدین نہ کرنا مطلوب قرار پایا اور کرنا ممنوع، بلکہ قابل عقاب، اور جن لوگوں نے حدیثوں پر بڑا کرم کیا ہے جیسے احکام القرآن کے مصنف ابوبکر احمد بن علی جصاص اور علامہ انور کشمیری تو انہوں نے رفع یدین کو جائز قرار دے کر اسلام پر احسان عظیم کیا ہے؟!!

رفع یدین والی کہانی قطع ید کے موقع پر بھی دہرائی گئی ہے اس طرح نہ جانے کتنی صحیح حدیثوں کو ٹھکرا دیا گیا اور کتنی ضعیف، منکر اور موضوع روایتوں کو شرعی دلائل قرار دے دیا گیا ہے۔

یہاں ناسخ اور منسوخ کی بات بھی بے محل ہے، کیونکہ یہ مسئلہ اس وقت پیدا ہوتا ہے جب کہ ایک ہی مسئلہ سے متعلق مثبت اور نافی دونوں طرح کی حدیثیں جمع ہو جائیں اور اپنی صحت اور ثبوت میں دونوں یکساں درجات کی حامل ہوں، لیکن یہاں قطع ید کے مسئلہ میں تو دس درہم والی روایتیں ثابت ہی نہیں ہیں کہ ان کے ناسخ یا منسوخ ہونے کا مسئلہ پیدا ہوتا، یہاں تو امام کے قول اور صحیح حدیثوں کے درمیان تعارض اور تصادم پیدا ہو گیا تھا اور از راہ تقلید اور نام نہاد احتیاط کے تقاضے سے حدیث رسول کو ترک کر دیا گیا اور قول امام پر عمل کو لازم قرار دے دیا گیا۔ ❶

تمام حدیثوں میں تطبیق کا انوکھا انداز:

امام محمد کے قول سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بتقاضائے احتیاط دس درہم والی روایت کو معیار عمل بنایا گیا، چنانچہ مولانا عبدالحیٔ لکھنوی نے اس احتیاط پسندی کی صراحت کر دی ہے۔ ❷ اور کوثری کی عبارت سے بھی اسی رجحان کا اظہار ہوتا ہے، البتہ امام العصر نے اپنے علمی مقام ومرتبے اور حدیث دانی کی شہرت کے پیش نظر حدیثوں میں تطبیق کا انوکھا انداز اختیار کیا ہے۔ یاد رہے کہ اپنے اسی جذبۂ انفرادیت کے تحت انہوں نے نزول وحی کی حدیث میں ''گھنٹی کی آواز'' کی مانند آواز کو نعوذ باللہ اللہ تعالیٰ کی آواز قرار دیا ہے اور یہ دعویٰ کیا ہے کہ اس سے اللہ کو مخلوق سے تشبیہ دینا لازم نہیں آتا، بلکہ اس طرح اللہ تعالیٰ کو مخلوق کے مشابہ قرار دینا ان کے امام، ابن عربی کے نزدیک اللہ تعالیٰ کی تنزیہ اور تقدیس میں داخل ہے اسی وجہ سے اس نے کہا ہے: ''تنزیہ کیے جا تشبیہ دیے جا''؟!!

❶ صحیح فرمایا ہے مولانا حالی نے: ''اماموں کا رتبہ نبی سے بڑھائیں۔'' ❷ التعلیق الممجد: ص ۶۴، ج ۳

Marfat.com

اپنے اسی جذبۂ انفرادیت کے تحت علامہ کشمیری نے دوسرے علمائے احناف کے برعکس "قطع ید" کی حدیثوں میں یہ فرما کر تطبیق دی ہے کہ:

"آغاز امر میں چوری کے جرم میں ہاتھ کاٹنے کی سزا اس وقت دی جاتی تھی جب "مال مسروق" کی مالیت ڈھال کی قیمت کے برابر ہو، جیسا کہ صحیحین میں مروی ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں آیا ہے اور ابتدا میں ڈھال کی قیمت کم تھی بھی، پھر مسلمانوں کی آسودگی میں اضافے کے ساتھ ڈھال کی قیمت میں بھی اضافہ ہو گیا اور وہ دس درہم ہو گئی اور اسی دس درہم کو معیار قرار دے دیا گیا اور ڈھال کی قیمت کو غیر معتبر قرار دے دیا گیا۔" [1]

علامہ کشمیری کو بجا طور پر یہ معلوم تھا کہ مجن - ڈھال - والی روایات ہی صحیح ہیں اور صحیحین میں آنے کی وجہ سے قطعی الثبوت بھی ہیں جیسا کہ ان کا عقیدہ تھا، جبکہ دس درہم والی روایتوں میں سے کوئی بھی روایت صحیح نہیں ہے۔ لیکن چونکہ امام ابوحنیفہ چور کا ہاتھ کاٹنے کے لیے "مال مسروق" کی قیمت دس درہم ضروری قرار دیتے تھے لہٰذا ان کے قول کے مقابلے میں صحیح ترین حدیثوں پر عمل بھی "تقلید کی شریعت" میں ناقابل معافی جرم تھا، اس طرح انہوں نے بیک جنبش قلم صحیح حدیث سے ثابت چوتھائی دینار یا تین درہم کو غیر معتبر اور صحت سے عاری روایات میں مذکور دس درہم کو معتبر قرار دے دیا اور اس کو "حلق" سے نیچے اتارنے کے لیے یہ تقریر کر ڈالی کہ "شروع میں ڈھال کی قیمت تین درہم تھی جو بڑھتے بڑھتے دس درہم ہو گئی، اور اسی کو "حد سرقہ" کا نصاب مقرر کر دیا گیا۔

کوثری کے عقائد:

محمد زاہد کوثری کا تعارف کراتے ہوئے میں یہ عرض کر چکا ہوں کہ ان کے دل میں غیر احناف، غیر متکلمین اور غیر صوفیا اور ائمہ میں امام ابوحنیفہ، امام ابو یوسف اور امام محمد اور متاخرین ائمہ احناف کے علاوہ دوسرے تمام ائمہ اور محدثین کے خلاف زہر بھرا ہوا تھا دوسرے لفظوں میں احناف کے سوا دوسرے تمام اہل حدیثوں اور اہل سنت و جماعت سے ان کو شدید عداوت اور دشمنی تھی اور اپنی تحریروں میں وہ موقع اور بے موقع ان اہل خیر کا ذکر نہایت نازیبا القاب سے کرتے رہتے تھے اور اہل سنت و جماعت کے علماء کو مجسمہ، مشبہہ اور حشویہ - اللہ کے لیے جسم کے قائل، اللہ کو مخلوق سے تشبیہ دینے والے اور رسول اللہ ﷺ کے کلام میں حشو و زوائد کے مدعی - سے یاد کرتے تھے، جبکہ امر واقعہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تنزیہ جس طرح اہل سنت و جماعت کے علماء کرتے ہیں کوئی نہیں کرتا، البتہ یہ اللہ تعالیٰ کے اسماء اور صفات کی کوئی تاویل کرنے کے بجائے ان کو ان کے حقیقی معنوں میں لیتے ہیں اور اسی کو متکلمین اور صوفیا تجسیم اور تشبیہ سے تعبیر کرتے ہوئے محدثین کو مورد الزام گردانتے ہیں۔

جہم بن صفوان متوفی ۱۲۴ھ کا ذکر اس کتاب میں آچکا ہے۔ جہمیہ فرقہ اسی کی طرف منسوب ہے۔ جہم کے تمام عقائد

[1] فیض الباری، ص: ۴۴۶-۴۴۷، ج ۴

Marfat.com

غیر اسلامی تھے وہ اللہ تعالیٰ کے حادث ہونے کا قائل تھا وہ اللہ کے عرش پر موجود ہونے کا منکر اور اپنی ذات کے ساتھ ہر جگہ موجود ہونے کا قائل تھا۔ وہ قرآن وحدیث میں مذکور اللہ تعالیٰ کی صفات کا بھی منکر تھا اور یہ دعویٰ کرتا تھا کہ اللہ تعالیٰ صفات، اسماء اور افعال سے موصوف نہیں ہے وہ اپنے افکار جعد بن درہم سے لیتا تھا جو اصلاً تو یہودی تھا، لیکن بظاہر مسلمان بن کر مسلمانوں میں یہودی افکار پھیلاتا تھا۔ ❶

محدثین میں سے امام احمد، امام عبدالرحمٰن بن ابی حاتم، امام عثمان بن سعید دارمی اور امام محمد بن اسحاق بن خزیمہ وغیرہ نے جہم بن صفوان کے عقائد اور افکار کے رد میں کتابیں لکھی ہیں اور کتاب وسنت کی نصوص سے ان کو باطل قرار دیا ہے۔ کوثری ائمہ سنت کے ان اعمال سے بہت نالاں تھے۔ چنانچہ اپنی کتاب تانیب الخطیب کے صفحہ ۱۱۵ پر علم جرح و تعدیل کے مسلم امام عبدالرحمٰن بن ابی حاتم کی کتاب "الرد علی الجهمیه" پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''کتاب کے مصنف کی عقل ماری گئی ہے...... وہ علم کلام سے ناواقف ہے اس کے باوجود علم اصول دین کے مشکل مسائل سے تعرض کر رہا ہے۔''

صفحہ ۱۵۱ پر امام احمد کے بیٹے امام عبداللہ بن احمد بن حنبل اور ان کی کتاب ''السنۃ'' کا ذکر کیا ہے، اور لکھا ہے:

''السنۃ کے مندرجات سے اس کے مصنف کا مبلغ علم معلوم کیا جا سکتا ہے، ابوحنیفہ کے حق میں ایسے شخص کی رائے نا قابل تصدیق ہے۔''

کتاب کے صفحہ ۱۶ پر امام عثمان بن سعید دارمی اور جہمیہ فرقہ کے رد میں ان کی کتاب ''النقض'' کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے:

''کھلا ہوا مجسم -اللہ کے لیے جسم کا قائل- ائمہ تنزیہ -اللہ کو صفات سے عاری قرار دینے والے- سے عداوت رکھنے والا ہے۔ ایسا شخص اللہ سبحانہ کے بارے میں جاہل ہوتا ہے۔''

صفحہ ۱۹ پر مشہور امام حدیث محمد بن اسحاق بن خزیمہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

''ابن خزیمہ کا اعتقاد کتاب ''التوحید'' سے ظاہر ہے جس کے بارے میں ''تفسیر کبیر'' کے مصنف کا قول ہے کہ یہ کتاب الشرک ہے۔''

صاحب تفسیر کبیر سے مراد فخر الدین رازی ہیں جن کو ''برعکس نام دھن زنگی را کافور'' کے طریقے پر امام کہا جاتا ہے۔ جبکہ انہوں نے تفسیر کبیر اور اپنی دوسری کتابوں میں جہم بن صفوان کے خیالات کی ترجمانی کی ہے۔ اس کتاب میں مناسب محل پر ان کے بعض افکار پر تبصرہ کیا جا چکا ہے۔

امام احمد، جن کا ذکر ان سے اختلاف رکھنے والے بھی احترام سے کرتے ہیں وہ بھی کوثری کی طعن وتشنیع سے نہیں بچے ہیں ایک جگہ ان کے بارے میں لکھا ہے:

❶ معجم الفاظ العقيدة: ص ۱۲۸-۱۲۹، میزان الاعتدال: ص ۱۵۹، ج ۲، لسان المیزان: ص ۱۷۹، ج ۲

Marfat.com

((یُسِرُّ حَسْوا فی ارتغاء))

''وہ جھاگ کی آڑ میں اصل مشروب پی جاتا ہے۔''

یہ مثل ایسے شخص کے بارے میں بولا جاتا ہے جو ظاہر کچھ کرتا ہو اور عمل کچھ۔

کوثری نے اپنے چہرے سے اس وقت نقاب پوری طرح الٹ دیا ہے جب ان ائمہ حدیث وسنت کو طعن و تشنیع کا نشانہ بنا لیا جن کو مامون اور آل مامون نے ظلم وتشدد اور آزمائشوں کا نشانہ بنایا تھا اس مسئلہ میں اپنی صرف ایک سطری عبارت میں کوثری نے حق اور اہل حق سے اپنی نفرتوں کو سمیٹ دیا ہے اور یہ واضح کر دیا ہے کہ اس کا ماخذ عقیدہ جہمیہ کا فلسفہ ہے۔ امام احمد اور ان کے ہم مسلکوں پر روا رکھنے والے جن مظالم اور آزمائشوں نے بہت سے غیر مسلموں، حتی کہ اس آزمائش کی آگ بھڑکانے والے معتزلہ کی ایک بڑی تعداد کو غم ''زدہ'' بنا دیا تھا ان کا ذکر بھی کوثری نے تنقیدی لب و لہجہ میں کیا ہے۔ صفحہ ۵ پر رقم طراز ہے:

''محدثین کے بعض شیوخ کی جانب سے اللہ سبحانہ اور اس کی صفات کے بارے میں ایسی لغزشیں اور فروگزاشتیں ظاہر ہونے لگیں جو فلسفی شریعت اور جہمی عقل کے نزدیک ناقابل قبول ہیں۔'' [1]

اگر کوثری نے ائمہ سنت پر عقلی اعتراضات کیے ہوتے اور درمیان میں دین کا ذکر نہ کرتا تو معاملہ کسی حد تک قابل برداشت ہوتا، مگر اس نے دینی نقطۂ نظر سے ان پر طعن کر کے اور ان کو عقائد اسلام سے ناواقف کہہ کر اور ان پر گمراہی، انحراف اور بدعت کا الزام لگا کر اپنے خبث باطن کا اظہار کر دیا اس طرح ان کا مقام ومرتبہ گھٹانے کے بجائے اپنے آپ کو رسوا کر دیا۔

کوثری نے محدثین اور اہل سنت و جماعت کو گمراہ، مبتدع، جاہل اور منحرف قرار دے کر یہ اعلان کر دیا ہے کہ اس کا ان سے کوئی تعلق نہیں ہے، پھر اس نے متکلمین اور فلاسفہ کی ان تاویلات کی تائید کر کے جو انہوں نے آیات صفات کی کی ہیں، یہ اعلان کر دیا ہے کہ وہ متکلمین، فلاسفہ اور ان کے ہم مشربوں سے تعلق رکھتا ہے۔

فقہاء کی نگاہوں میں قرآن وحدیث کا مقام ومرتبہ:

متقدمین احناف صرف کتاب وسنت کو شرعی ماخذ مانتے تھے اولاً تو وہ کسی مذہب اور مسلک کے بانی اور داعی نہ تھے اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی عزت و احترام کے باوجود ان کے نرے مقلد نہ تھے، ثانیاً اپنی کسی رائے، خیال اور رجحان کی تائید کے لیے قرآنی آیات کی من مانی تاویلات اور صحیح احادیث کے دانستہ انکار سے ان کا دامن پاک تھا، اور وہ ہر حال میں قرآن وحدیث ہی کو ماخذ شرع مانتے تھے اور عملاً اس کا مظاہرہ کرتے تھے۔

لیکن بعد میں یہ صورت حال باقی نہیں رہی اور قرآن وحدیث کی وہ ہیبت بھی دلوں میں قائم نہیں رہی جو تیسری صدی ہجری کے اختتام تک قائم تھی، بلکہ اب مسلک اور مسلک کی ترجمان کتابوں نے وہ مقام ومرتبہ حاصل کر لیا جو مقام

[1] التنکیل: ص ۳۲۵، ج ۲.

Marfat.com

و مرتبہ قرآن و حدیث کو حاصل تھا۔ کہنے کو تو اب بھی یہی کہا جاتا تھا کہ کتاب و سنت ہی شرعی ماخذ ہیں، لیکن فقہاء کا طرزِ عمل اس کے خلاف تھا اور فقہی مسلک سے ٹکرانے والی قرآنی آیات کی مطابقِ مسلک تاویل کا رجحان عام ہونے لگا تھا اور مخالف مذہب احادیث کا انکار ایک فیشن بن گیا تھا۔ چنانچہ ایک مشہور حنفی عالم عبداللہ کرخی متوفی ۳۴۰ھ کا قول ہے:

((کل آیة او حدیث یخالف ما علیه اصحابنا فهو مؤول أو منسوخ)) ❶

"ہر وہ آیت یا حدیث جو ہمارے اصحاب -احناف- کے مسلک کے خلاف ہے وہ یا تو قابل تاویل ہے یا منسوخ ہے۔"

ابوبکر احمد بن علی جصاص کی احکام القرآن:

مسلک حنفی سے تعلق رکھنے والے مفسرین میں جصاص ایک بہت بڑا نام ہیں، ان کے اسم گرامی سے پہلے امام اور حجۃ الاسلام کے القاب لکھے جاتے ہیں۔ معتزلی ہونے کے باعث ان کو امام اور حجۃ الاسلام قرار دینا تو روا نہیں ہے، البتہ ان کو مسلک حنفی کا بہت بڑا مدافع کہا جا سکتا ہے۔

جصاص کی زبان و قلم سے غیر احناف کے خلاف شعلے نکلتے تھے، خصوصیت کے ساتھ امام شافعی رحمہ اللہ کی تنقید اور مذمت میں جصاص کے قلم نے جو زہر افشانیاں کی ہیں ان کا ذکر بھی ایک شریف آدمی نہیں کر سکتا۔ مثال کے لیے دیکھیے: ❷

آیات احکام کی تفسیر کرتے وقت جصاص کے پیش نظر ان سے مسلکِ حنفی کی صحت پر استدلال رہتا ہے۔

قرآن کو مسلک کا تابع بنانے کی مثال:

امام ابوحنیفہ کا قول ہے کہ مرد کی طرح عورت بھی ولی اور اس کی اجازت کے بغیر نکاح کر سکتی ہے۔ ابوبکر جصاص نے احکام القرآن میں سورۂ بقرہ کی آیت نمبر ۲۳۲ سے اس مسلک کی صحت پر استدلال کیا ہے۔ آیت کے الفاظ ہیں:

﴿وَ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ یَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوْا بَیْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ﴾ (البقرة: ٢٣٢)

"اور جب تم بیویوں کو طلاق دو اور وہ عدت کی انتہاء کو پہنچ جائیں تو ان کو ان کے شوہروں سے نکاح کرنے سے مت روکو اگر وہ آپس میں بھلے طریقے سے راضی ہوں۔"

جصاص کا دعویٰ یہ ہے کہ آیت میں فعل "ینکحن" آیا ہے جس میں نکاح کرنے کی نسبت عورتوں کی طرف کی گئی ہے اس سے یہ حکم نکلتا ہے کہ عورت اپنا نکاح خود کر سکتی ہے۔

---

❶ تاریخ التشریع الاسلامی للسبکی و السایس و الربری ص۲۸۱ بحوالہ التفسیر و المفسرون: ص۴۷۰، ج۲.

❷ احکام القرآن: ص۱۴۷، ۴۵۱، ج۲

Marfat.com

جصاص اور ان کے ہم خیال دوسرے فقہاء کے اس دعویٰ کا جواب یہ ہے کہ اگر فعل ینکحن اس امر پر دلیل ہے کہ عورت اپنے نکاح میں ولی کی اجازت کی پابند نہیں یعنی اس فعل سے عورت کے لیے مرد کی ولایت کے غیر ضروری ہونے پر دلالت ہوتی ہے تو اس سے سابقہ فعل: "فلا تعضلوھن" ''تو ان کو مت روکو'' سے ولایت کے وجود کا ثبوت ملتا ہے۔ اسی طرح ایک ہی آیت میں آگے پیچھے اور متصلاً دو ایسے فعل آئے ہیں جن میں سے پہلے فعل سے عورت کے لیے مرد کے ولی ہونے کا ثبوت ملتا ہے، جبکہ دوسرے فعل سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ عورت اپنا نکاح خود کر سکتی ہے۔ اس طرح زیر بحث آیت نہ اس امر میں ''صریح الدلالۃ'' رہی کہ عورت ولی کی اجازت کے بغیر نکاح نہیں کر سکتی اور نہ اس امر میں کہ عورت اپنا نکاح ولی کی اجازت کے بغیر کر سکتی ہے۔

جصاص جیسے مجادلانہ ذہن رکھنے والے پر آیت کے یہ دونوں پہلو مخفی نہیں رہے ہوں گے اور ان کو یہ بھی معلوم رہا ہو گا کہ ایسے موقع پر کسی ایسی آیت کی تلاش کی جاتی ہے جس میں وہی مسئلہ دوٹوک طریقے سے بیان کر دیا گیا ہو اور ایسی آیت لازماً ہوگی۔

تو عرض ہے کہ ایسی آیت اسی سورۂ بقرہ میں گزر چکی ہے یعنی آیت نمبر ۲۲۱، لیکن چونکہ اس آیت سے ''جصاص'' کی کور دبتی تھی اس لیے اس کی تفسیر کیے بغیر آگے بڑھ گئے۔ میری مراد جس آیت سے ہے اس کے الفاظ ہیں:

﴿وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا﴾ (البقرة: ٢٢١)

''اور مشرکوں سے اپنی عورتوں کا نکاح مت کرو تاآنکہ وہ ایمان لے آئیں۔''

یہاں یہ توضیح تحصیل حاصل ہے کہ "لا تنکحوا" میں مخاطب ''اولیاء الامور'' ہیں اور اگر قرآن کے مطابق عورت اپنا نکاح خود کر سکتی تو جس طرح آیت کے آغاز میں مردوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے "ولا تنکحوا المشرکات" ''اور مشرک عورتوں سے نکاح مت کرو۔'' اسی طرح عورتوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا گیا ہوتا: "ولا تنکحن المشرکین" ''اور مشرک مردوں سے نکاح مت کرو۔''

اس طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد "ولا تنکحوا المشرکین حتی یؤمنوا" ''عورت کے نکاح کے لیے مرد کی ولایت پر نص صریح ہے۔

پھر اسلامی احکام کے بیان میں حدیث کا بھی تو کوئی کردار ہے، آخر اپنی کتاب میں اتنی کثرت سے ضعیف اور منکر روایتوں اور علماء کے اقوال نقل کرنے والے پر یہ بھی تو فرض تھا کہ وہ شرعی احکام بیان کرتے ہوئے صحیح احادیث کا بھی ذکر کرتا جس طرح دوسرے حق پسند مفسرین، بطور مثال قرطبی کرتے ہیں، حتیٰ کہ وہ اپنے امام ''مالک'' کے مسلک اور رائے کے خلاف صحیح احادیث نقل کر کے اپنی حق پسندی کا ثبوت دیتے ہیں، اس لیے کہ وہ اپنے امام کو اپنے رسول کا متبع مانتے تھے، ہم رتبہ اور ہم مقام نہیں جیسا کہ فقہائے احناف کا شیوہ ہے۔

Marfat.com

چنانچہ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

ہم سے وکیع اور عبدالرحمٰن نے اسرائیل سے، انہوں نے ابواسحاق سے، انہوں نے ابوبردہ سے اور انہوں نے اپنے والد۔ابوموسیٰ اشعری سے روایت کرتے ہوئے، بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

((لا نكاح الا بولى)) ❶

''ولی کی اجازت کے بغیر نکاح صحیح نہیں ہے۔''

اوپر جو سند بیان کی گئی ہے اس کی تمام کڑیاں متصل اور ملی ہوئی ہیں، اسرائیل بن یونس ثقہ راوی ہیں اور اپنے دادا ابواسحاق سبیعی ہمدانی سے ان کا سماع ثابت ہے کیونکہ وہ ان سے چمٹے رہتے تھے، اور ان کے ساتھ لگے رہتے تھے۔

امام دارمی کی سند میں، اسی طرح ترمذی، ابن حبان، طبرانی، بیہقی، تاریخ بغداد شرح معانی الآثار، الکفایہ وغیرہ کی سندوں میں شریک بن عبداللہ نخعی نے ابواسحاق سے اس حدیث کے سماع میں اسرائیل سے اتفاق کیا ہے۔

شریک بن عبداللہ کے علاوہ قیس بن ربیع، زہیر بن معاویہ اور عبدالحمید ہلالی نے بھی اسرائیل کی متابعت کی ہے، یہ متابع راوی اگرچہ انفرادی طور پر ضعیف تھے، مگر ضعف کے اس درجے پر نہیں تھے کہ ایک ثقہ راوی کے متابع اور مؤید نہ بن سکیں۔

دوسری حدیث:

امام احمد فرماتے ہیں:

ہم سے اسماعیل نے بیان کیا، کہا: ہم سے ابن جریج۔عبدالملک بن عبدالعزیز، نے بیان کیا، کہا: مجھے سلیمان بن موسیٰ نے، زہری سے، انہوں نے عروہ سے اور انہوں نے عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہوئے خبر دی کہ انہوں نے کہا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

((اذا نكحت المرأة بغير امر مولاها، فنكاحها باطل، فنكاحُها باطل، فنكاحها باطل، فان اصابتها، فلها مهرها بما اصاب منها، فان اشتجروا، فالسلطان ولى من لا ولى له)) ❷

''اگر عورت نے اپنے ولی کے حکم کے بغیر عقد نکاح کر لیا تو اس کا نکاح باطل ہے، اس کا نکاح باطل ہے، اس کا نکاح باطل ہے، اور اگر اس نے اس کے ساتھ مباشرت کر لی تو اس مباشرت کے باعث عورت کے لیے مہر لازم ہے، اور اگر لوگوں میں جھگڑا ہو جائے تو اس کا ولی حاکم ہے جس کا کوئی ولی نہیں ہے۔''

---

❶ مسند امام احمد: ۱۹۵۱۸، ۱۹۷۱۰، ۱۹۷۴۷۔ ترمذی: ۱۱۰۱۔ سنن دارمی: ۲۱۸۳۔ صحیح ابن حبان: ۴۰۷۷، ۴۰۹۰۔ المعجم الاوسط للطبرانی: ۶۸۰۵

❷ مسند: ۲۴۲۰۵، ۲۵۳۲۶۔ ابوداود: ۲۰۸۳، ترمذی: ۱۱۰۲۔ ابن ماجہ: ۱۸۷۹۔ مستدرک حاکم: ۲۷۵۷۔ شرح السنۃ: ۲۲۶۲

Marfat.com

یہ حدیث صحیح ہے جس کی تصحیح یحییٰ بن معین، ابوعوانہ دضاح یشکری، محمد بن اسحاق بن خزیمہ، ابو حاتم محمد بن حبان، ابوعبداللہ حاکم اور ابوبکر احمد بن حسین بیہقی وغیرہ نے کی ہے۔

عبدالملک بن عبدالعزیز بن جریج سے اس حدیث کے ثقفہ راویوں کی تعداد ۱۹ ہے، جن میں سفیان بن عیینہ، عبداللہ بن رجاء مزنی، مسلم بن خالد، عبدالمجید بن ابی رواد، سعید بن سالم، عبداللہ بن مبارک، سفیان ثوری، محمد بن عبداللہ انصاری، مومل بن اسماعیل اور حجاج بن محمد شامل ہیں۔

صحیح حدیث سے غلط استدلال:

صحیح مسلم میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((الایِّم احق بنفسها من ولیها، والبکر تستأذن فی نفسها وإذنها صُماتها))

''شوہر آشنا عورت اپنے ولی سے زیادہ اپنے آپ کی حقدار ہے، اور باکرہ سے اس کی ذات کے بارے میں اجازت طلب کی جائے گی اور اس کی اجازت اس کی خاموشی ہے۔'' ❶

اس حدیث کا موضوع عورت کے نکاح کی صحت کے لیے ''ولی کے ہونے یا نہ ہونے کا حکم بیان کرنا نہیں ہے، کیونکہ عورت کے لیے ولی کا ہونا، حدیث کے فقرہ: ''ولیها'' سے عیاں ہے، جو محتاج بیان نہیں ہے اس حدیث کا موضوع دراصل یہ بیان کرنا ہے کہ عورت اپنا شریک حیات چننے کا مکمل اختیار رکھتی ہے، بایں معنی کہ اس کا ولی اپنی پسند سے اس کے لیے ایسا شریک حیات نہیں منتخب کرسکتا جس کو وہ ناپسند کرتی ہو، پھر اس حق انتخاب اور اختیار کے اعتبار سے عورتوں کو دو قسموں میں تقسیم کر دیا گیا ہے، شوہر آشنا اور باکرہ یا شوہر نہ آشنا۔

شوہر آشنا کے لیے ایم یا ثیب کی تعبیر اختیار کی گئی ہے اور فرمایا گیا ہے کہ ایسی عورت جو ازدواجی تجربہ سے گزر چکی ہے، اپنا شریک حیات اختیار کرنے کا حق اپنے ولی سے زیادہ رکھتی ہے، یعنی اس کا ولی ہونے کی حیثیت سے وہ اپنا حق تو رکھتا ہے، مگر یہ حق عقد نکاح کی تنفیذ تک محدود ہے یعنی وہ اس پر اپنی پسند کا شوہر تھوپنے کا مجاز نہیں ہے، یہ حق تو صرف عورت کو حاصل ہے۔

مناسب شوہر یا شریک حیات کے انتخاب کا یہ حق باکرہ یا شوہر نہ آشنا عورت کو بھی مکمل طور پر حاصل ہے، مگر اسلامی معاشرے کی روایات کے بموجب وہ اپنے اس حق کا برملا اظہار نہیں کر سکتی، لہٰذا اس کی مرضی معلوم کرنے پر اکتفا کیا گیا اور اس کی خاموشی کو اس کی رضا کی دلیل قرار دے دیا گیا۔

مذکورہ وضاحت کی روشنی میں یہ حدیث، ولی کے بغیر عورت کے نکاح کی صحت کی دلیل نہیں بن سکتی جس کی وجہ

❶ مسلم: ۱۴۲۱

Marfat.com

مختصراً یہ ہیں:

۱۔ صحیح احادیث سے صراحتاً اور قرآن سے اشارۃً یہ ثابت ہے کہ عورت کے نکاح کی صحت اس کے ولی کے اذن پر موقوف ہے، لہٰذا کوئی دوسری صحیح حدیث اس شرعی حکم کے خلاف نہیں ہو سکتی، زبان نبوت سے دو متضاد باتیں نہیں نکل سکتیں۔

۲۔ اسلام نے عورت کے نکاح کے انعقاد کے لیے جو شرط عائد کی ہے وہ عقد نکاح کے نفاذ تک محدود ہے اور عورت کا یہ حق کہ وہ اپنا شریک حیات خود پسند کر سکتی ہے پوری طرح محفوظ ہے۔

۳۔ اسلام نے عورت کو شوہر کے پسند کا حق دے کر اس کو اولیاء الامور کے ہر ظلم سے محفوظ کر دیا ہے جس ظلم کے مظاہر عرب معاشرے میں بہت تھے اور آج کے نام نہاد اسلامی معاشرے میں اور بہت زیادہ ہیں۔

۴۔ اسلام نے عورت کے نکاح کے لیے مرد کی ولایت کی شرط لگا کر عورت کو جذبات کی رو میں بہنے اور معاشرے کے مفسدین اور مجرمین کے ہاتھوں میں کھلونا بننے سے مکمل طور پر محفوظ کر دیا ہے۔

۵۔ عورت کے لیے مرد کی ولایت خود اس حدیث کے پہلے فقرے: "الایم احق بنفسها من ولیها" سے ثابت ہے۔

مذکورہ بالا وضاحتوں کی روشنی میں صحیح مسلم کی حدیث سے عورت کے لیے مرد کی ولایت کے غیر مشروط ہونے پر استدلال بے محل بھی ہے اور غلط بھی۔

صحیح احادیث میں من مانی تبدیلی اور اضافہ:

فقہائے احناف کی کتابوں میں ضعیف اور منکر روایتوں سے استدلال اور صحیح ترین حدیثوں کے انکار یا عدم ذکر کی مثالوں کی بھرمار ہے، جس پر "الہدایہ" دلیل ہے اس کے علاوہ صحیح ترین حدیثوں کے متن میں تبدیلی، سلسلہ بیان میں تبدیلی اور احادیث میں بیان کردہ احکام میں اضافے کر لینا بھی عام سی بات ہے۔

نماز میں امامت کا حق دار کون؟

اسلام میں نماز عملی ارکان کے سرفہرست ہے اس تناظر میں نماز میں امامت کی اہمیت کو سمجھا جا سکتا ہے یہ امامت دراصل "امامت کبریٰ" کی نمائندگی کرتی ہے، اور نماز میں سورۂ فاتحہ کے علاوہ کسی اور سورت یا آیات کی تلاوت بنیادی عنصر کا درجہ رکھتی ہے، فاتحہ کی تلاوت تو رکن ہے، اسی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے ان اوصاف کو بیان کر دیا ہے جن سے نماز کے امام کو موصوف ہونا چاہیے اور ان کی ترتیب بھی بیان کر دی ہے، جس میں قراءت قرآن یعنی حفظ قرآن سرفہرست ہے، ذیل میں چند صحیح حدیثیں نقل کی جا رہی ہیں، جن سے ظاہر اور مرتب ہونے والے احکام کو بدل بھی دیا گیا ہے اور ان میں اضافے بھی کر دیے گئے ہیں۔

Marfat.com

پہلی حدیث:

ابو مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، کہتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

((یوم القوم اقرؤھم لکتاب اللہ، فان کانوا فی القراءۃ سواء، فاعلمھم بالسنۃ فان کانوا فی السنۃ سواء فاقدمھم ھجرۃ، فان کانوا فی الھجرۃ سواء فاقدمھم سلما ولا یومن الرجل الرجل فی سلطانہ، ولا یقعد فی بیتہ علی تکرمتہ الا باذنہ)) [1]

''جماعت کی امامت وہ کرے جوان میں اللہ کی کتاب کا سب سے زیادہ حافظ ہو، اگر حفظ میں سب برابر ہوں، تو وہ امامت کرے جوان میں سنت کا سب سے زیادہ علم رکھتا ہو، اور اگر سنت کے علم میں سب برابر ہوں، تو امامت وہ کرے جس نے سب سے پہلے ہجرت کی ہو، اور اگر ہجرت میں سب برابر ہوں تو وہ امامت کرے جو سب سے پہلے اسلام لایا ہو، اور کوئی کسی کی ریاست میں اس کی امامت نہ کرے اور نہ کوئی کسی کے گھر میں اس کی مسند پر اس کی اجازت کے بغیر بیٹھے۔''

حدیث کی تشریح:

۱۔ حدیث میں قراءت کتاب اللہ سے مراد کتاب اللہ کا حفظ ہے، رہا اصطلاحی لفظ ''حفظ قرآن'' تو احادیث میں یہ استعمال نہیں ہوا ہے اس طرح الاقرأ لکتاب اللہ کی تعبیر اس شخص کے لیے استعمال کی گئی ہے جس کو قرآن پاک کے زیادہ اجزاء زبانی یاد ہوں، صحیح بخاری میں عمرو بن سلمہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں اقروھم لکتاب اللہ کی جگہ "اکثر کم قرانا" کی تعبیر استعمال کی گئی ہے، جس کا مطلب ہے: تم میں سب سے زیادہ قرآن والا، یعنی جس کو سب سے زیادہ قرآن کے اجزاء یا سورتیں یاد ہوں، ویسے اس زمانے میں پورا قرآن نازل بھی نہیں ہوا تھا کہ کوئی اصطلاحی معنی میں ''حافظ قرآن'' ہوتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے صرف ۲۱ دن پہلے ''نزول قرآن'' مکمل ہوا ہے۔

۲۔ اس حدیث میں ہجرت میں اقدمیت یا سبقت میں جماعت کے تمام افراد کے برابر ہونے کی صورت میں سب سے پہلے اسلام لانے والے کو امامت کا حقدار قرار دیا گیا ہے، جبکہ مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ''عمر میں بڑے'' کو حقدار قرار دیا گیا ہے، تو دونوں میں کوئی تعارض نہیں ہے کیونکہ دین میں ''سبقت الی الاسلام'' کی جو اہمیت ہے وہ محتاج بیان نہیں ہے، قرآن کے مطابق ''السابقون الاولون'' کو خاص فضیلت حاصل ہے۔ (التوبۃ: ۱۰۰) لیکن یہ فضیلت عصر رسالت کے لیے خاص تھی جبکہ عمر میں بڑائی کا ہر زمانے میں اعتبار ہے اس تناظر میں عصر رسالت میں عمر میں بڑے کو امامت کا حق اس وقت حاصل تھا جب جماعت کے لوگ حفظ قرآن،

---

[1] مسلم: ۶۷۳۔ ابوداؤد: ۵۸۲

Marfat.com

سنت کے علم، ہجرت میں اقدمیت اور سبقت الی الاسلام میں برابر ہوں۔

مذکورہ وضاحت کی روشنی میں ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ کی حدیث سے امامت کے حق کی چار صورتوں کے بجائے بالترتیب تین صورتیں بنتی ہیں: (۱) قرآن پاک کے زیادہ اجزاء یا سورتوں کا حافظ (۲) سنت کا سب سے زیادہ علم رکھنے والا۔ (۳) عمر میں سب سے بڑا۔

۳۔ زیر بحث حدیث میں سب سے پہلے ہجرت کرنے والے، یا اقدم ہجرۃ کو تیسرے درجے پر رکھا گیا ہے تو یہ فضیلت، حدیث "لا هجرة بعد الفتح" ❶ سے پہلے تھی، موجودہ وقت میں ہجرت یا ترک وطن اختیاری نہیں ہے، بلکہ ناممکن ہے، البتہ عمر میں بڑائی کی فضیلت قائم ہے۔

دوسری حدیث:

مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، کہتے ہیں:

((اتینا رسول الله ﷺ ونحن شببة متقاربون، فاقمنا عنده عشرین لیلة، وكان رسول الله ﷺ رحیما رقیقا، فظن انا قد اشتقنا اهلنا، فسالنا عن من تركنا من اهلنا، فاخبرناه، فقال: ارجعوا الی اهلیكم، فاقیموا فیهم، وعلموهم، ومروهم، فاذا حضرت الصلوة فلیوذن لكم احدكم، ثم لیومكم اكبركم)) ❷

"ہم چند ہم سن جوان رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ کے پاس بیس راتیں قیام کیا، اور رسول اللہ ﷺ بے حد مہربان اور حد درجہ نرم دل تھے آپ کو خیال ہوا کہ ہم اپنی بیویوں کے مشتاق ہوگئے ہیں اور آپ نے ہم سے ان لوگوں کے بارے میں پوچھا بھی جن کو اپنے اہل خانہ کی صورت میں ہم چھوڑ آئے تھے، ہم نے آپ کو بتایا تو آپ نے فرمایا: اپنے اہل خانہ کے پاس واپس جاؤ، ان کے پاس قیام کرو، ان کو تعلیم دو اور فرائض ادا کرنے کا حکم دو، اور جب نماز کا وقت ہو جائے تو تم میں سے ایک تمہارے لیے اذان دے، پھر تم میں سب سے بڑی عمر والا تمہاری امامت کرے۔"

تیسری حدیث:

((كنا بماء مَمَرَّ الناس، وكان یمربنا الركبان، فنسالهم: ما للناس؟ ما للناس؟ ما هذا الرجل؟ فیقولون: یزعُم ان الله أرسله، أوحی إلیه، أو اوحی الله بكذا، فكنت أحفظ ذلك الكلام، وكانما یقر فی صدری، وكانت العرب تلوّم باسلامهم الفتح، فیقولون: اتركوه وقومه، فانه ان ظهر علیهم فهو نبی صادق، فلما كانت

❶ بخاری: ۲۷۸۳، ۳۰۷۸۔ مسلم: ۱۳۵۳
❷ مسلم: ۶۷۴

Marfat.com

وقعة اهل الفتح بادر كل قوم بإسلامهم، وبدر ابى قومى باسلامهم، فلما قدم قال: جئتكم والله من عند النبى ﷺ حقا، فقال: صلوا صلاة كذا فى حين كذا وصلوا صلاة كذا فى حين كذا فاذا حضرت الصلاة فليؤذن احدكم، وليؤمكم أكثركم قرآنا، فنظروا فلم يكن احد اكثر قرآنا منى، لما كنت اتلقى من الركبان، فقدمونى بين ايديهم وانا ابن ست او سبع سنين، وكانت علي بردة اذا سجدت تقلصلت عنى، فقالت امراة من الحى: الا تغطون عنا است قارئكم، فاشتروا، فقطعوا لى قميصا، فما فرحت بشئ فوحى بذلك القميص))

''ہم لوگوں کی گزرگاہ پر واقع ایک چشمہ کے پاس رہائش پذیر تھے اور قافلے ہمارے پاس سے گزرتے تو ہم ان سے پوچھا کرتے تھے کہ: لوگوں کا کیا حال ہے، لوگوں کا کیا حال ہے؟ اس شخص کا کیا ماجرا ہے؟ ان سوالوں کے جواب میں وہ کہتے: اس کا دعویٰ ہے کہ اللہ نے اسے رسول بنایا ہے، اس کو وحی کی ہے، یا اللہ نے اس کی طرف یہ وحی کی ہے، میں یہ باتیں اپنے لوح قلب پر محفوظ کر لیتا اور وہ میرے سینے میں گویا چمٹ جاتیں۔ عرب قبول اسلام کے لیے فتح مکہ کے منتظر تھے اور کہا کرتے تھے کہ اس کو اور اس کی قوم کو ان کے حال پر چھوڑ دو، اگر وہ ان پر غالب آ گیا تو وہ سچا نبی ہے، چنانچہ جب فتح والوں کا واقعہ ظہور پذیر ہو گیا تو ہر قوم اسلام لانے میں پہل کرنے لگی اور میرے والد قبول اسلام میں میری قوم کے لوگوں سے سبقت لے گئے اور جب وہ آئے تو کہا: اللہ کی قسم میں نبی برحق ﷺ کے پاس سے آ رہا ہوں، انہوں نے فرمایا ہے کہ: تم لوگ اس طرح کی نماز اس طرح کے وقت میں پڑھو اور اس طرح کی نماز اس طرح کے وقت میں پڑھو اور جب نماز کا وقت ہو جائے تو تمہارا ایک آدمی اذان دے اور تم میں جو زیادہ قرآن والا ہے، وہ تمہاری امامت کرے، لوگوں نے نظر دوڑائی تو مجھ سے زیادہ قرآن والا کوئی نہیں تھا، کیونکہ میں قافلے والوں سے قرآن سیکھا کرتا تھا، اس لیے لوگوں نے مجھے آگے بڑھا دیا، جبکہ میں چھ یا سات برس کا بچہ تھا، اور میرے اوپر ایک چادر ہوتی جو میرے سجدہ کرنے کی حالت میں سکڑ جاتی اس پر محلے کی ایک عورت نے کہا: کیا تم لوگ ہم سے اپنے قاری کا سرین نہیں چھپاؤ گے؟ تو لوگوں نے کپڑا خرید کر میرے لیے قمیض بنا دی۔ مجھے اس قمیص سے جو خوشی ہوئی ویسی خوشی کوئی اور چیز پانے سے نہیں ہوئی تھی۔''

فرمان نبوی کی صریح مخالفت:

میں نے اوپر یہ دعویٰ کیا ہے کہ فقہائے احناف نے اپنی کتابوں میں جہاں ضعیف اور منکر روایتوں سے بکثرت استدلال کیا ہے جس سے حدیث رسول سے ان کی عدم واقفیت کا پتہ چلتا ہے وہیں اپنے ائمہ کے مسلک کی تائید میں صحیح

Marfat.com

ترین حدیثوں کا انکار کیا ہے، جس سے ان کے دلوں میں حدیث رسول کے عدم احترام کا اشارہ ملتا ہے، اسی طرح انہوں نے صحیح احادیث کی عبارتوں میں تبدیلی اور ان سے حاصل ہونے والے احکام میں اضافے کر کے اور خود اپنے ذوق اور پسند سے بہت سارے احکام گھڑ کر ایسے ناقابل انکار دلائل فراہم کر دیے ہیں کہ شریعت سازی کا حق ان کو بھی حاصل تھا، اس طرح اپنے پیروؤں کے دلوں سے حدیث کی ہیبت کو نکال دیا ہے۔

ہدایہ میں امامت نماز کے لازمی اوصاف:

علامہ برہان الدین علی بن ابوبکر مرغینانی کی کتاب ''الہدایہ'' فقہ حنفی کی نہایت اہم اور بنیادی کتاب ہے ان کے نام سے پہلے ''امام'' لکھا جاتا ہے اور محمد زاہد کوثری نے ان کو محدثین میں شمار کیا ہے۔ ❶

مرغینانی اپنی کتاب کی کتاب الصلاۃ، باب الامامہ کے تحت تحریر فرماتے ہیں:

((وأولى الناس بالامامة اعلمهم بالسنة، وعن ابی یوسف رحمہ اللہ اقرؤهم لأن القراءة لا بدمنها، والحاجة الى العلم اذا نابت نائبة، ونحن نقول: القراءة مفتقر اليها لركن واحد والعلم لسائر الاركان، فان تساووا فاقرؤهم، لقوله عليه الصلاة والسلام: يؤم القوم أقرؤهم لكتاب الله تعالى، فان كانوا سواء فأعلمهم بالسنة، واقرؤهم كان اعلمهم، لانهم كانوا يتلقونه باحكامه فَقُدِّم فى الحديث، ولا كذلك فى زماننا، فقدمنا الاعلم))

لوگوں میں امامت کا سب سے زیادہ اہل وہ ہے جو ان میں سنت کا سب سے زیادہ علم رکھتا ہو، اور ابویوسف رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ قرآن کا سب سے زیادہ حافظ امامت کا سب سے زیادہ حق دار ہے اس لیے کہ حفظ قرآن لازمی ہے جبکہ علم کی ضرورت کوئی افتاد پڑنے پر ہوتی ہے۔ اور ہم یہ کہتے ہیں کہ حفظ کی ضرورت صرف ایک رکن کی وجہ سے ہے، جبکہ علم تمام ارکان کی وجہ سے ضروری ہے اور اگر لوگ سنت کے علم میں برابر ہوں تو ان میں قرآن کا سب سے زیادہ حافظ امامت کا مستحق ہے کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: لوگوں کی امامت وہ کرے جو ان میں اللہ تعالیٰ کی کتاب کا سب سے زیادہ حافظ ہو، اور اگر اس میں سب برابر ہوں تو سنت کا زیادہ علم رکھنے والا، اور صحابہ میں قرآن کا سب سے زیادہ حافظ، ان میں اس کا سب سے زیادہ علم رکھنے والا ہوتا تھا، اس لیے کہ وہ قرآن کو اس کے احکام کے ساتھ سیکھتے تھے، لہٰذا حدیث میں حفظ کو مقدم رکھا گیا ہے، اور ہمارے زمانے میں ایسا نہیں ہے اس لیے ہم نے زیادہ علم رکھنے والے کو پہلے درجہ پر رکھا ہے۔'' ❷

❶ مقدمہ نصب الرایہ: ص ۳۴ ❷ ج ۲ ص ۳۷

Marfat.com

تبصرہ:

رسول اللہ ﷺ کی حدیث میں، جس کی صحت اور ثبوت کے معترف مرغینانی خود ہیں، نماز میں امامت کا سب سے زیادہ حقدار قرآن پاک کے سب سے زیادہ حافظ کو قرار دیا گیا ہے اور امام ابوحنیفہ کے بعد احناف کے دوسرے سب سے بڑے امام ابویوسف (۲۲) نے بھی حدیث کے بموجب قرآن کے سب سے زیادہ حافظ کو امامت نماز کا سب سے زیادہ اہل قرار دیا ہے، مگر ان سے کوئی چار صدی بعد پیدا ہونے والے امام اور فقیہہ نے حدیث اور اس حدیث پر مبنی حکم کو بدل دیا، اور اہلیت امامت کا جو دوسرا درجہ تھا۔ اس کو پہلا درجہ قرار دے دیا؟

پھر ستم یہ کیا کہ اپنے اس فعل کی دلیل میں وہی صحیح حدیث پیش کر دی جس میں امامت کا پہلا درجہ کتاب اللہ کا حفظ بیان کیا گیا ہے اور حدیث کو نقل کرتے ہوئے اس کے ''متن'' کو بھی بدل ڈالا، حدیث کے الفاظ ہیں:

((یوم القوم اقرؤھم لکتاب الله، فان کانوا فی القراء ۃ سواء، فأعلمھم بالسنة))

اور ہدایہ کے الفاظ ہیں:

((یوم القوم اقرؤھم لکتاب الله تعالی، فان کانوا سواء فاعلمھم بالسنة))؟!!!

اگر علامہ مرغینانی کا یہ دعویٰ صحیح ہے کہ صحابہ کرام رسول اللہ ﷺ سے قرآن اس کے حکام کے ساتھ سیکھتے تھے، اس لیے "اقرأ لکتاب الله اعلم بالسنة" بھی ہوتا تھا تو دوسرے درجہ پر أعلمھم بالسنة فرمانے کی کیا ضرورت تھی، کیا قرآنی احکام کا علم سنت کا علم نہیں ہے؟

پھر جتنی حدیثوں میں امامت کا سب سے زیادہ حقدار قرآن کے سب سے زیادہ حافظ کو قرار دیا گیا ہے اور ان حدیثوں پر عمل کرنے والے صحابہ کے واقعات بیان کیے گئے ہیں، جیسے عمرو بن سلمہ رضی اللہ عنہ کی امامت کا واقعہ اور سالم رضی اللہ عنہ کا واقعہ تو کیا یہ حدیثیں اور یہ واقعات مرغینانی کے اس دعوے کی تائید کرتے ہیں کہ اس زمانے میں قرآن کا حافظ سنت کا سب سے زیادہ علم رکھنے والا تھا، کیا یہ بات درست ہوسکتی ہے کہ ابوحذیفہ رضی اللہ عنہ کے غلام سالم رضی اللہ عنہ عمر بن خطاب اور ابو سلمہ بن عبدالاسد رضی اللہ عنہما سے زیادہ سنت کا علم رکھتے تھے، جن کی وہ نماز میں دوسرے مہاجرین سمیت امامت کرتے تھے؟ ❶

باطل روایت سے استدلال:

علامہ مرغینانی نماز میں امامت کے استحقاق کے درجات بیان کرتے ہوئے مزید لکھتے ہیں:

فان تساووا فأورعھم، لقوله علیه الصلاة والسلام: من صلی خلف عالم تقی فکانما صلی خلف نبی))

''اگر لوگ سنت کے علم میں برابر ہوں تو ان میں سب سے زیادہ پرہیزگار ان کی امامت کرے، کیونکہ

❶ بخاری: ۶۹۲۔ ابوداود: ۵۸۵

Marfat.com

نبی ﷺ کا ارشاد ہے، جس نے کسی متقی عالم کے پیچھے نماز ادا کی تو گویا اس نے کسی نبی کے پیچھے نماز ادا کی۔'' ❶

عرض ہے کہ علامہ مرغینانی نے، جن کو کوثری نے حافظ اور محدث لکھا ہے، جس عبارت کو رسول اللہ ﷺ کا ارشاد فرمایا ہے، وہ حدیث نہیں جھوٹ ہے، جس کی کوئی اصل اور بنیاد نہیں ہے، حافظ زیلعی، حنفی نے نصب الرایہ میں اس کو ''غریب'' بتایا ہے۔ ❷ غریب زیلعی کی خاص اصطلاح ہے جس سے ان کی مراد ایسی روایت ہوتی ہے جس کی کوئی اصل اور بنیاد نہ ہو۔

حافظ محمد عبدالرحمٰن سخاوی نے "المقاصد الحسنة فی بیان کثیر من الاحادیث المشتهرة علی الالسنة" میں ہدایہ ہی کے حوالہ سے یہ عبارت نقل کی ہے اور لکھا ہے کہ ''ان الفاظ میں کسی روایت سے واقف نہیں ہوں۔'' ❸

ملا علی قاری کی غلط بیانی:

علامہ نورالدین علی بن محمد بن سلطان، جو ملا علی قاری کے نام سے مشہور ہیں، حدیث کے عالم تھے، اپنی مشہور کتاب ''الاسرار المرفوعہ فی الاخبار الموضوعہ'' میں انہوں نے بڑی تعداد میں ضعیف اور موضوع روایتوں کا ذکر کیا ہے، مگر انہوں نے بے بنیاد اور جھوٹی روایتوں پر ایک محدث یا عالم حدیث کی طرح حکم لگانے کے بجائے ایک صوفی اور مقلد عالم کی طرح حکم لگایا ہے، یعنی وہ یہ اعتراف بھی کرتے ہیں کہ فلاں حدیث ضعیف، موضوع یا بے اصل ہے مگر اسی کے ساتھ یہ دعویٰ بھی کر جاتے ہیں کہ اپنے معنی اور مفہوم میں صحیح ہے۔ یہ طرز بیان علمی دیانت کے خلاف ہے، جو چیز یا جو عبارت رسول اللہ ﷺ سے نسبت نہ رکھتی ہو، وہ باطل اور مردود ہے، ایسی عبارت معناً صحیح کس طرح ہو سکتی ہے، چنانچہ اس زیر بحث روایت کا بھی انہوں نے ہدایہ کے حوالہ سے ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ غیر معروف ہے جیسا کہ ہدایہ کی حدیثوں کی تخریج کرنے والے نے کہا ہے، پھر لکھا ہے کہ: لیکن میں کہتا ہوں کہ اس کے معنی صحیح ہیں، کیونکہ دیلمی نے جابر رضی اللہ عنہ کی جو مرفوع حدیث روایت کی ہے اس کے الفاظ ہیں: "قدموا خیارکم تزکوا اعمالکم" اپنے بہتر لوگوں کو امامت کے لیے آگے بڑھاؤ اس طرح اپنے اعمال کو پاک کرو۔'' ❹

یہ روایت ان الفاظ میں بھی مروی ہے:

۱۔ ((ان سرکم ان تقبل صلاتکم فلیومکم خیارکم))

''اگر تمہارے لیے یہ بات مسرت بخش ہے کہ تمہاری نماز قبول کی جائے تو چاہیے کہ تمہارے بہتر آدمی تمہاری امامت کریں۔''

۲۔ ((اجعلوا ائمتکم خیارکم، فانهم وفد کم فیما بینکم وبین الله عزوجل))

❶ ج ۲ ص ۲۹ ❷ ج ۲ ص ۲۸ ❸ ص ۳۶ نمبر ۷۶۴ ❹ ص ۲۳۵ نمبر ۲۶۴

Marfat.com

''اپنے ائمہ اپنے بہتر لوگوں کو بناؤ، اس لیے کہ وہ تمہارے اور اللہ عزوجل کے درمیان تمہارے قاصد ہوں گے۔''

۳۔ ((ان سرکم ان تقبل صلوتکم، فلیومکم علماؤ کم فانھم وفدکم فیما بینکم وبین ربکم))

''اگر تمہارے لیے یہ بات سرور بخش ہے کہ تمہاری نماز قبول کی جائے تو چاہیے کہ تمہاری امامت تمہارے علماء کریں، اس لیے کہ وہ تمہارے اور تمہارے رب کے درمیان قاصد ہوں گے۔''

تو ان روایتوں میں سے کوئی بھی روایت صحیح وثابت نہیں ہے اور اپنے متن میں صحیح حدیثوں کے خلاف ہونے کی وجہ سے سب منکر ہیں۔ ❶

پہلی حدیث امام دارقطنی نے سنن میں (ص ۱۹۷) اور ابن مندہ نے المعرفہ (ج ۲ ص ۱۷۴) میں یحییٰ بن یعلی اسلمی کے طریق سے روایت کی ہے، عبداللہ بن موسی نے قاسم سامی سے، انہوں نے مرثد بن ابی مرثد غنوی سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے، امام دارقطنی نے لکھا ہے: اس کی سند ثابت نہیں، عبداللہ بن موسی ضعیف ہے۔ امام ذہبی لکھتے ہیں، عبداللہ بن موسیٰ تیمی روایت حدیث میں حجت نہیں۔ ❷ یحییٰ بن معین کا قول ہے' سچا تھا، لیکن بے تحاشا غلطیاں کرتا تھا۔ ❸

رہا عبداللہ بن موسیٰ تیمی سے اس حدیث کا روایت کرنے والا یحییٰ بن لیلیٰ اسلمی جس کا لقب قطوانی بھی ہے، تو امام بخاری کا اس کے بارے میں قول ہے کہ اس کی حدیثوں میں اضطراب اور اختلاف ہے اور امام ابو حاتم نے اس کو ضعیف قرار دیا ہے۔ ❹

دوسری حدیث بھی امام دارقطنی نے سنن میں (ص ۱۹۷) اور بیہقی نے بھی سنن میں (ص ۹۰ ج ۳) حسین بن نصر سے روایت کی ہے، ہم سے سلام بن سلیمان نے بیان کیا، کہا: ہم سے عمر بن عبدالرحمٰن بن یزید نے، محمد بن واسع سے، انہوں نے سعید بن جبیر سے، اور انہوں نے عبداللہ بن عمر سے روایت کرتے ہوئے، بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے۔

امام بیہقی نے اس حدیث کی سند کو ضعیف کہنے پر اکتفا کیا ہے، ضعف کی تفصیلات نہیں بتائی ہیں، تفصیلات یہ ہیں کہ:

۱۔ عمر بن عبدالرحمٰن بن یزید: اس کے بارے میں دارقطنی کا کہنا ہے: میرے نزدیک یہ عمر بن یزید ہے جو مدائن کا قاضی تھا، امام عبداللہ بن عدی نے الکامل میں اس کو ''منکر الحدیث'' لکھا ہے۔ ❺

---

❶ ملاحظہ ہو الفوائد المجموعہ فی الاحادیث الموضوعہ ص ۳۲، ۶۹ ❷ میزان الاعتدال ترجمہ: ۴۶۳۵
❸ المجروحین، ترجمہ ۸۸۹. ❹ المیزان: ۹۶۶۵. ❺ ج ۶ ص ۵۵ ترجمہ: ۲۳۲

Marfat.com

حافظ ابن حجر نے لسان المیزان میں اس عمر بن یزید کو "ازدی مدائنی" لکھا ہے اور ابن عدی کے حوالہ سے "منکر الحدیث" قرار دیا ہے۔ ❶

۲۔ دوسرا راوی سلام بن سلیمان ہے، جس کے بارے میں امام ذہبی نے المیزان میں امام ابن عدی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ "منکر الحدیث" تھا اور اس کی بیشتر روایات میں اس کا کوئی متابع نہیں ہے۔ ❷

۳۔ تیسرا راوی حسین بن نصر ہے، جو مجہول ہے۔ ❸

۳۔ تیسری حدیث وہی پہلی حدیث ہے، جس میں "خیارکم" کی جگہ "علماؤکم" آیا ہے، اس کی روایت اسماعیل بن ابان وراق نے کی ہے: ہم کو یحییٰ بن یعلی اسلمی نے قاسم شیبانی سے، انہوں نے ابوامامہ سے مرفوعاً روایت کرتے ہوئے خبر دی" اس سند میں عبداللہ بن موسیٰ کے بجائے قاسم شیبانی ہے، یہ اسلمی کی کارستانی ہے اور اسلمی ضعیف تھا، جیسا کہ اوپر گزرا، اور یہ قاسم شیبانی مضطرب الحدیث تھا۔ ❹

کیا یہ حد درجہ ضعیف اور منکر روایتیں "ہدایہ" کی نقل کردہ بے اصل حدیث: "من صلی خلف عالم تقی فکانما صلی خلف بنی" کی دلیل بن سکتی ہیں؟

ملا علی قاری کو یہ بات معلوم رہی ہوگی کہ حدیث رسول اللہ ﷺ کے قول یا فعل یا تقریر کو کہتے ہیں اور جس قول، فعل اور تقریر کی نسبت رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہی نہ ہو، بلکہ جو کتب حدیث میں مذکور ہی نہ ہو اس کے معنیٰ کو صحیح قرار دینا غیر حدیث کو بھی شرعی ماخذ قرار دینا ہے جس کی سنگینی محتاج بیان نہیں ہے۔ مگر برا ہو اندھی تقلید کا جو رسول اللہ ﷺ کے علاوہ دوسرے لوگوں کو بھی "شارع" بنا سکتی ہے، بلکہ عملاً بنا دیا ہے۔

امامت کے مزید من گھڑت اوصاف:

فقہائے احناف کی کتابیں اس امر پر دلیل قاطع ہیں کہ شرعی احکام صرف کتاب وسنت میں نہیں ہیں، بلکہ ان فقہی کتابوں میں بھی ہیں اور اللہ و رسول کی طرح یہ فقہاء بھی اپنے ذوق اور اجتہاد سے شرعی احکام بیان کرنے کے مجاز ہیں اور جس طرح ان کو یہ حق حاصل ہے کہ کتاب وسنت کے بیان کردہ احکام میں اپنی طرف سے اضافے کریں اسی طرح ان کو یہ حق بھی حاصل ہے کہ جس چیز کو اللہ و رسول نے جائز قرار دیا ہے اس کو ناجائز اور جس کو ناجائز قرار دیا ہے اس کو جائز قرار دیں۔

اوپر ایسی چند صحیح ترین حدیثیں نقل کر دی گئی ہیں جن میں نماز کے امام کے اوصاف ترتیب وار بیان کر دیے گئے جن کے سرفہرست قرآن کے زیادہ اجزا کا حفظ ہے دوسرا وصف سنت کا زیادہ علم ہے اور تیسرا وصف عمر میں سب سے بڑا

---

❶ ص ۳۹۰ ج ۴ ترجمہ: ۱۸۲۵ ❷ ص ۲۵۵ ج ۳، ترجمہ: ۳۳۴۹۔ الکامل ص ۳۲۸ ج ۲ ترجمہ: ۴۰

❸ الضعیفہ: ۴/ ۳۰۳. ❹ الجرح والتعدیل ترجمہ: ۱۲۲۰۳.

Marfat.com

ہونا ہے۔ جن حدیثوں میں سب سے پہلے اسلام لانے اور سب سے پہلے ہجرت کرنے کا ذکر آیا ہے ان کے بارے میں عرض کر چکا ہوں کہ ان دو خصلتوں یا صفتوں کا تعلق اس وقت سے تھا جب ان کا ایک اعتبار تھا، مگر آج لوگوں کا اسلام موروثی ہے اور ہجرت غیر اختیاری بھی ہے اور کفر و اسلام کے درمیان حد فاصل بھی نہیں ہے جیسا کہ ''فتح مکہ'' سے پہلے تھی۔ اسی طرح قرآن کا سب سے زیادہ حافظ پہلے نمبر پر، سنت کا سب سے زیادہ عالم دوسرے نمبر پر اور عمر میں سب سے بڑا تیسرے نمبر پر امامت کا حق دار ہے۔ ان اوصاف کے علاوہ کسی بھی صحیح حدیث میں اہلیتِ امامت کا کوئی اور وصف بیان نہیں ہوا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے علاوہ امامت کی اہلیت یا استحقاق کے لیے کوئی اور وصف لازمی یا مستحب قرار دینا رسول اللہ ﷺ پر اپنی آواز بلند کرنا ہے جو ''حبطِ عمل'' کا موجب ہے۔

مذکورہ وضاحت کے بعد فقہ حنفی کی مشہور کتاب ''تنویر الابصار'' کی ایک عبارت نقل کر رہا ہوں جس سے میرے مذکورہ بالا دعاوی کی سو فیصد تائید ہوتی ہے۔ واضح رہے کہ یہ کتاب محمد بن عبداللہ بن احمد تمرتاشی غزی کی تصنیف ہے جن کا لقب ''شمس الدین'' تھا اور فقہ حنفی کی مشہور کتاب ''الدر المختار'' اسی تنویر الابصار کی شرح ہے جس کے مصنف محمد بن علی حصنی حصکفی ہیں۔ تنویر الابصار کے مصنف تحریر فرماتے ہیں:

((و الأحق بالامامة الاعلم باحكام الصلاة، ثم الأحسن تلاوة، ثم الأورع، ثم الأسن، ثم الأحسن خلقا، ثم الأحسن وجها، ثم الأشرف نسبا، ثم الأنظف ثوباً، فان استووا يقرع او الخيار الى القوم)) ❶

''امامت کا سب سے زیادہ حق دار نماز کے احکام کا سب سے زیادہ جاننے والا ہے، پھر سب سے اچھی تلاوت کرنے والا، پھر سب سے زیادہ پرہیز گار، پھر سب سے زیادہ عمر والا، پھر سب سے بہتر اخلاق والا، پھر سب سے زیادہ خوبصورت چہرے والا، پھر سب سے اعلیٰ نسب والا، پھر سب سے زیادہ خوش پوش۔''
اگر ان اوصاف میں سب برابر ہوں تو قرعہ اندازی کی جائے یا لوگوں کو اختیار دے دیا جائے کہ جس کو چاہیں چن لیں۔''

یہ تو تنویر الابصار کی عبارت تھی، اب اس کی شرح ''الدر المختار'' کی عبارت ملاحظہ فرمائیں:

((ثم أصبحهم اى اسمحهم وجها، ثم اكثر حسبا، ثم الاحسن صوتا، ثم الاحسن زوجة، ثم الاكثر مالا، ثم الاكثر جاها، ثم الاكبر راسا، ثم الاصغر عضوا، ثم المقيم على المسافر، ثم الحر الاصلى على العتيق، ثم المتيمم عن حدث على المتيمم عن جنابة، فان اختلفوا اعتبر اكثرهم)) ❷

❶ بحوالہ سبیل الرسول، ص: ۱۲۷-۱۲۸۔ ❷ ایضاً

Marfat.com

''پھر سب سے زیادہ روشن چہرے والا، پھر سب سے بڑے حسب والا، پھر سب سے اچھی آواز والا، پھر سب سے زیادہ خوبصورت بیوی والا، پھر سب سے زیادہ مال دار، پھر سب سے بڑے رتبے والا، پھر سب سے بڑے سر والا، پھر سب سے چھوٹے ''عضو'' والا، پھر مقیم کو مسافر پر مقدم رکھا جائے، پھر اصلی آزاد کو آزاد کردہ غلام پر ترجیح دی جائے، پھر حدث اصغر پر تیمّم کرنے والے کو جنابت پر تیمّم کرنے والے پر مقدم رکھا جائے، پھر اگر لوگوں میں اختلاف باقی رہے تو اکثریت کے اختیار کا اعتبار ہوگا۔''

تبصرہ:

ان دونوں عبارتوں میں نماز کے امام کے جو اوصاف بیان کیے گئے ہیں، حدیث سے ان کی کوئی دلیل نہیں دی گئی ہے اور ان کی کوئی دلیل ہے بھی نہیں۔ یہ قیاس اور اجتہاد پر بھی مبنی نہیں ہیں، کیونکہ قیاس اور اجتہاد ''نص'' کے نہ ہونے کی صورت میں کیا جاتا ہے، جبکہ صحیح احادیث میں رسول اللہ ﷺ نے امام کے اوصاف بیان فرما دیے ہیں، جو ان دونوں عبارتوں میں بیان کردہ اوصاف سے مختلف ہیں اور کم بھی۔

مذکورہ اوصاف میں ''خوبصورت بیوی رکھنے اور چھوٹا عضو رکھنے کی صفت کا ذکر بے حد شرم ناک ہے اور کسی مسلمان کے شایان شان یہ بات نہیں ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائیوں کی بیویوں کی خوبصورتی اور بدصورتی کی کھوج لگائے اور کسی کے عضو تناسل کی لمبائی اور چھوٹائی ناپنا تو ایسا مذموم اور مکروہ فعل ہے جس کا ایک شریف آدمی تصور بھی نہیں کر سکتا۔

مذکورہ بالا اوصاف پر عمل کرنا رسول اللہ ﷺ کی رسالت کی گواہی دینے کے منافی ہے، کیونکہ قرآن کے مطابق رسول بھیجا ہی اس لیے جاتا ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے۔ [1] اس تناظر میں رسول اللہ ﷺ کے کسی حکم میں تبدیلی کرنا، یا کمی بیشی کرنا، آپ کی اطاعت نہیں، آپ کی حکم عدولی، بلکہ کار رسالت میں آپ کے ساتھ اپنے آپ کو شریک بنانا ہے، جو کفر ہے۔

ایک بار پھر یہ واضح کر دوں کہ محمد بن عبداللہ قریشی ہاشمی ﷺ کو رسول ماننے اور آپ کی رسالت پر ایمان کی گواہی دینے کا مطلب مختصراً یہ ہے کہ آپ نے جو خبریں دی ہیں ان کی تصدیق کی جائے، جو حکم دیا ہے اس کی بے چون و چرا تعمیل کی جائے۔ جن چیزوں سے منع فرمایا ہے ان سے باز رہا جائے اور اللہ کی عبادت صرف اسی طریقے سے کی جائے جو آپ نے متعین فرما دیا ہے۔

مذکورہ اوصاف کو نماز کے امام کے اوصاف قرار دینے والا اپنے عقیدے، قول اور فعل سے یہ اعلان کرتا ہے کہ وہ تکمیل دین کے ''اعلان ربانی'' کو نہیں مانتا اور یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ فقہاء بھی شرعی احکام بنانے اور ان کو فرض و واجب قرار دینے کے مجاز ہیں۔

---

[1] سورۂ نساء: ۶۴

Marfat.com

امامت کے نااہل:

صاحب ہدایہ نے امامت کے نااہلوں کو دو گروپوں میں تقسیم کیا ہے، ایک گروپ تو ایسے نااہلوں پر مشتمل ہے جن کو امام بنانا مکروہ ہے، لیکن ان میں سے کسی کو امام بنا دیا جائے تو کراہت کے ساتھ نماز ہو جائے گی۔

دوسرا گروپ وہ ہے جس کی امامت میں نماز جائز ہی نہیں ہے۔

جن لوگوں کو امام بنانا مکروہ ہے یا جن کی امامت میں نماز کراہت کے ساتھ جائز ہے، ان میں غلام، دیہاتی -اعرابی، بدو- فاسق، نابینا اور ولد الزنا داخل ہیں۔ مرغینانی نے مذکورہ افراد کو امام نہ بنانے کے جو دلائل دیے ہیں وہ سب عقلی، قیاسی یا فرضی ہیں، ان میں سے کوئی دلیل بھی کتاب وسنت سے ماخوذ نہیں ہے۔ فرماتے ہیں:

''غلام کو امامت کے لیے آگے بڑھانا مکروہ ہے اس لیے کہ وہ تعلیم کے لیے فارغ اور یکسو نہیں ہو سکتا اور عرب دیہاتی کو اس لیے کہ ان میں جہالت عام ہوتی ہے اور فاسق کو اس لیے کہ وہ اپنے دینی امور کے ساتھ اہتمام نہیں برتتا اور نابینا کو اس لیے کہ وہ ناپاکی سے نہیں بچتا اور ولد الزنا کو اس لیے کہ اس کا کوئی باپ نہیں جو اسے شائستگی سکھائے اور اس لیے بھی کہ امامت کے لیے ان کو آگے بڑھانے میں جماعت کو متنفر بنانا مضمر ہے، لہٰذا مکروہ ہے اور اگر وہ آگے بڑھ جائیں تو جائز ہے، کیونکہ نبی ﷺ کا ارشاد ہے:

((صلوا خلف كل بر و فاجر)) ❶

''ہر نیک و بد کے پیچھے نماز پڑھو۔''

صاحب ہدایہ نے مذکورہ بالا جن لوگوں کو امام بنانا مکروہ قرار دیا ہے اولاً تو وہ ان کی رائے پر مبنی ہے ثانیاً ان میں غلام اور نابینا کی امامت صحیح احادیث سے ثابت ہے، ثالثاً ولد الزنا یا جس کا باپ نامعلوم ہو اللہ تعالیٰ نے اس کو مسلمانوں کا دینی بھائی قرار دیا ہے۔ ❷ ان تمام وجوہ سے مرغینانی کے بیان کردہ اس شرعی حکم پر عمل کرنا اللہ و رسول کی نافرمانی اور ان کے حکم پر غیر شارع کے حکم کو مقدم کرنا ہے جو حرام ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُقَدِّمُوا بَيْنَ يَدَيِ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ﴾

(الحجرات: ۱)

''اے وہ لوگو! جو ایمان لائے ہو اللہ اور اس کے رسول سے آگے مت بڑھو اور اللہ کے غضب سے بچو درحقیقت اللہ سب کچھ سننے والا، تمام چیزوں کا علم رکھنے والا ہے۔''

اس آیت کی رو سے ایسے کسی عمل کو مکروہ قرار دینا جس کو اللہ اور رسول نے مکروہ قرار نہ دیا ہو، ان سے آگے بڑھنا اور ان سے پیش قدمی کرنا ہے اور اللہ و رسول پر ایمان لانے کے منافی ہے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے یہ حکم بیان کرنے

❶ ص ۲۹، ج ۲ ❷ سورۂ احزاب: ۵

Marfat.com

سے پہلے حرف نداء استعمال کیا ہے اور منادیٰ کو صفتِ ایمان سے موصوف فرمایا ہے جس سے یہ تاکید مقصود ہے کہ اللہ و رسول کے احکام پر سرِ تسلیم خم کر دینا اور ان سے آگے نہ جانا ایمان کا تقاضا ہے۔

ا۔ غلام کی امامت:

امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں ایک باب اس عنوان سے قائم کیا ہے: "باب امامة العبد و المولی" "غلام اور آزاد کردہ غلام کی امامت کا باب۔"

اس باب کے تحت وہ پہلے ایک معلق حدیث لائے ہیں جس کا ماحصل یہ ہے کہ عائشہ ام المؤمنین رضی اللہ عنہا کے آزاد کردہ غلام ذکوان ان کی امامت کرتے تھے جو مصحف کو دیکھ کر تلاوت کرتے تھے۔ یہ حدیث اگرچہ معلق ہے، لیکن صحیح ہے اس لیے کہ امام بخاری نے اس کا ذکر یقینی صیغے میں کیا ہے۔

ذکوان کی امامت کے بعد "باب امامة العبد و المولی" کے لفظ المولی پر عطف کرتے ہوئے بخاری نے لکھا ہے:

((و ولد البغی و الاعرابی و الغلام الذی لم یحتلم لقول النبی ﷺ یؤمهم اقرؤهم لکتاب الله))

"اور ولد الزنا، اور دیہاتی اور نابالغ لڑکے کی امامت کیونکہ نبی ﷺ کا ارشاد ہے ان کی امامت ان میں کتاب اللہ کا سب سے زیادہ حافظ کرے۔"

اس کے بعد امام بخاری عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی وہ حدیث لائے ہیں جس کے الفاظ ہیں:

((لما قدم المهاجرون الاولون العصبة، موضع بقباء، قبل مقدم رسول الله ﷺ کان یؤمهم سالم مولی ابی حذیفة، و کان اکثرهم قرآنا)) ❶

"جب رسول اللہ ﷺ کی آمد سے پہلے پہلے مہاجرین قباء کے ایک مقام "عصبہ" پہنچے تو ابو حذیفہ کے "مولیٰ" سالم ان کی امامت کرتے تھے جو ان میں سب سے زیادہ قرآن والے تھے۔"

بخاری یہی حدیث دوبارہ نمبر ۷۱۷۵ کے تحت بھی لائے ہیں جس کی روایت نافع سے ابن جریج نے کی ہے، جبکہ اس زیر بحث حدیث کی روایت عبیداللہ نے نافع سے اور انہوں نے عبداللہ بن عمر سے کی ہے۔ اس دوسری روایت میں سالم کی امامت میں نماز ادا کرنے والوں میں عمر، ابوسلمہ، زید بن ثابت اور عامر بن ربیعہ کے ساتھ ابوبکر رضی اللہ عنہم کا بھی ذکر ہے، جبکہ یہ معلوم ہے کہ ابوبکر نے نبی ﷺ کے ساتھ ہجرت کی تھی، اس کی توجیہ امام بیہقی نے یہ کی ہے کہ سالم ان مہاجرین کی امامت رسول اللہ ﷺ کی تشریف آوری تک کرتے رہے تھے اور قباء آمد پر ابوبکر نے سالم کی امامت میں نمازیں ادا کی تھیں۔ ابن اسحاق کے مطابق پہلے مہاجرین میں ۲۰ افراد شامل تھے۔ ❷

---

❶ صحیح بخاری: ۶۹۲۔ ❷ فتح الباری: ص ۳۲۱۸، ج ۳۔

Marfat.com

حافظ ابن حجر نے یہ بھی لکھا ہے کہ سالم انصاری کی ایک خاتون کے غلام تھے جن کو انہوں نے بعد میں آزاد کر دیا تھا اور جب وہ مہاجرین کے پہلے قافلے کی امامت کر رہے تھے اس وقت تک آزاد نہیں کیے گئے تھے، اور آزاد کر دیے جانے کے بعد ابو حذیفہ بن عتبہ بن ربیعہ نے ان کو منہ بولا بیٹا بنا لیا تھا، اور وہ انہی کے ساتھ رہنے لگے تھے اسی وجہ سے ان کو مولیٰ ابی حذیفہ کہا جاتا تھا، ابوبکر رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں جنگ یمامہ میں شہادت سے سرفراز ہوئے۔ ❶

۲۔ نابینا کی امامت:

امام احمد فرماتے ہیں:

ہم سے عبدالرحمٰن بن مہدی نے عمران بن قطان سے، انہوں نے قتادہ سے اور انہوں نے انس سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا کہ:

((استخلف رسول الله ﷺ ابن ام مكتوم مرتين على المدينة))

"......رسول اللہ ﷺ نے ابن ام مکتوم کو دو بار مدینہ پر اپنا قائم مقام بنایا۔" ❷

اس حدیث میں یہ تصریح نہیں ہے کہ ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ نماز میں لوگوں کی امامت کرتے تھے، اگرچہ آپ کی قائم مقامی میں امامتِ نماز سرفہرست ہے، لیکن امام احمد نے یہی حدیث ایک دوسری سند سے روایت کی جس میں امامت کی تصریح ہے:

ہم سے بہز نے بیان کیا، کہا: ہم سے ابو عوام قطان نے جو عمران بن داور ہیں اور جو نابینا ہیں، بیان کیا، کہا: ہم سے قتادہ نے انس بن مالک سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا کہ:

((ان رسول الله ﷺ استخلف ابن ام مكتوم على المدينة مرتين يصلي بهم و هو اعمى)) ❸

"رسول اللہ ﷺ نے ابن ام مکتوم کو دو بار مدینہ میں اپنا جانشین بنایا جو لوگوں کو نماز پڑھاتے تھے، جبکہ وہ نابینا تھے۔"

ان دونوں سندوں کے تمام راوی، عمران بن قطان یا عمران بن داور کے علاوہ ثقاہت کے اعلیٰ درجہ پر فائز تھے، البتہ عمران حفظ وضبط میں "حسن" درجہ پر تھے۔

امام بخاری نے عمران بن قطان کی مرویات کا ذکر "معلق" صورت میں کیا ہے، لیکن ائمہ سنن نے ان کی مروی حدیثیں موصول صورت میں روایت کی ہیں اور زیر بحث حدیث کو امام ابو داود نے (۵۹۵، ۔ ۲۹۳۱) ابن جارود نے (۳۱۰) اور ابو یعلیٰ نے (۳۱۱۰، ۳۱۳۸) عبدالرحمٰن بن مہدی کے طریق سے نقل کیا ہے۔

---

❶ فتح الباری: ص ۵۹۱، ج ۱ ❷ ۱۲۳۴۴۔ ❸ ۱۳۰۰۰

Marfat.com

اس حدیث کی شاہد وہ حدیث ہے جو ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا نے روایت کی ہے جس کو امام محمد بن حبان نے اپنی صحیح میں بے داغ سند سے نقل کیا ہے، فرماتے ہیں:

ہم سے حسن بن سفیان نے بیان کیا، کہا: ہم سے حبیب معلم نے ہشام بن عروہ سے، انہوں نے اپنے باپ سے اور انہوں نے عائشہ سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا کہ:

((ان النبی ﷺ استخلف ابن ام مکتوم علی المدینة یصلی بالناس)) ❶

''نبی ﷺ نے ابن ام مکتوم کو مدینہ پر اپنا جانشین بنایا جو لوگوں کو نماز پڑھاتے تھے۔''

ان حدیثوں سے نابینا کی امامت کی صحت پر بصراحت دلالت ہوتی ہے۔

غیر معتبر روایت سے استدلال:

مرغینانی نے غلام، اعرابی، ولد الزنا، فاسق اور نابینا کی امامت کے، کسی شرعی دلیل کے بغیر مکروہ ہونے کا دعویٰ کرنے کے بعد لکھا ہے کہ ''اگر یہ امامت کے لیے آگے بڑھ جائیں تو جائز ہے'' اور اس کی دلیل میں نبی کریم ﷺ کی طرف منسوب یہ ارشاد پیش کیا ہے:

((صلوا خلف کل بر و فاجر))

''ہر نیک و بد کے پیچھے نماز پڑھو۔''

تو ان کا یہ استدلال دو وجہوں سے قابل گرفت ہے:

۱۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کی نسبت سے اپنے عدم ثبوت اور اپنی عدم صحت کی وجہ سے یہ قول نا قابل استدلال ہے اس روایت کے صحیح نہ ہونے کا حکم جن علمائے حدیث نے لگایا ہے ان میں ایک بڑا نام حافظ ابو محمد عبداللہ بن یوسف زیلعی حنفی کا بھی ہے جنہوں نے اپنی کتاب "نصب الرایہ" میں اس کی سند پر تفصیل سے گفتگو کی ہے اور محدثین کے حوالہ سے لکھا ہے کہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اس کے راوی مکحول کا ان سے سماع ثابت نہیں ہے اور سنن دارقطنی میں اس کی جو دوسری سند بیان ہوئی ہے اس میں عبداللہ بن محمد شامل ہے جو ''متروک الحدیث'' تھا۔ ❷

۲۔ صاحب ہدایہ کا دعویٰ دوسری جس وجہ سے قابل گرفت ہے وہ یہ ہے کہ ان کے نزدیک چونکہ یہ حدیث صحیح ہے، لہٰذا ان کا یہ دعویٰ مردود ہے کہ غلام، اعرابی، فاسق، نابینا اور ولد الزنا کی امامت مکروہ ہے، لیکن اگر وہ امامت کے لیے آگے بڑھ جائیں تو جائز ہے۔ کیونکہ اس روایت کے الفاظ سے ان کے مذکورہ دعویٰ کی تائید ہونے کے بجائے اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ مذکورہ صفات سے موصوف افراد کی امامت بلا کسی کراہت کے مطلقاً درست ہے؟!!

فاعتبروا یا اولی الابصار.

---

❶ صحیح ابن حبان، نمبر ۲۱۳۴-۲۱۳۵ ❷ ص ۲۹-۳۰، ج ۲

Marfat.com

۴۔ نابالغ لڑکے کی امامت:

علامہ مرغینانی تحریر فرماتے ہیں:

''مردوں کے لیے عورت اور بچے کی اقتداء جائز نہیں ہے، جہاں تک عورت کا مسئلہ ہے تو رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

((اخروھن من حیث اخرھن اللہ))

''ان کو وہاں سے پیچھے کرو جہاں سے اللہ نے انہیں پیچھے کیا ہے۔''

''رہا لڑکا تو چونکہ وہ نفل نماز ادا کرنے والا ہوتا ہے اس لیے فرض ادا کرنے والے کا اس کی اقتدا کرنا جائز نہیں ہے۔''[1]

تبصرہ:

صاحب ہدایہ نے نابالغ لڑکے کی امامت کو عورت کی امامت کی مانند قرار دے کر دونوں کی امامت پر ایک ہی حکم لگا دیا ہے، جبکہ عورت کی عدم امامت منصوص ہے اور لڑکے کی امامت حدیث سے ثابت ہے۔

جائز اور ناجائز اور مکروہ شرعی اصطلاحیں ہیں:

مرغینانی نے امامت اور غیر امامت کے مسائل میں مکروہ، غیر مکروہ، جائز اور ناجائز کی تعبیریں بکثرت استعمال کی ہیں، جبکہ ان کے جو دلائل دیے ہیں یا تو وہ بے اصل اور من گھڑت روایتیں ہیں، یا قیاسی ہیں، جیسا کہ یہاں عورت اور لڑکے کی امامت کے عدم جواز کے مسئلہ میں کیا ہے اور یہ بات معلوم ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے سوا کوئی بھی اس بات کا مجاز نہیں ہے کہ وہ بلا کسی دلیل کے کسی چیز کو جائز یا ناجائز یا مکروہ یا غیر مکروہ قرار دے اور دلیل نہ تو باطل روایتیں ہے اور نہ محض قیاس۔

بے اصل روایت سے استدلال:

مرغینانی نے ایک بار پھر عورتوں کی عدم امامت پر ایک بے اصل روایت سے استدلال کر کے حدیث سے اپنی عدم واقفیت کا ثبوت دے دیا ہے، حالانکہ اس مسئلہ میں صحیح حدیث موجود ہے اور انہوں نے جس عبارت کو رسول اللہ ﷺ کا ارشاد کہہ کر نقل کیا ہے اس کا ''حدیث رسول'' کی حیثیت سے کوئی وجود نہیں ہے خود زیلعی حنفی نے اس کو بے اصل اور باطل قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ مصنف عبدالرزاق میں وہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے قول کی حیثیت سے مروی ہے۔ (ص ۳۹) ضعیف، منکر اور موضوع اور بے اصل روایتوں کے تمام مجموعوں کے مصنفین نے ہدایہ کی اس روایت کو بے اصل قرار دیا ہے۔[2]

---

[1] ص ۳۹، ج ۲

[2] ملاحظہ ہو: المقاصد الحسنۃ نمبر ۴۱، الاسرار المرفوعۃ نمبر ۱۸، الضعیفۃ نمبر ۹۱۸، موسوعۃ الاحادیث الضعیفۃ والموضوعۃ نمبر ۸۸۴، تحذیر المسلمین نمبر ۸۰ وغیرہ

Marfat.com

نماز میں عورتوں کے تمام لوگوں کے پیچھے ہونے پر بصراحت دلالت کرنے والی حدیثیں مسند امام احمد، مسلم اور سنن اربع میں موجود ہیں۔ ❶

نابالغ لڑکے کی امامت کے عدم جواز کی دلیل میں صاحب ہدایہ نے جو دلیل دی ہے وہ دلیل نہیں دعویٰ ہے اس لیے خود محتاج دلیل ہے، فرماتے ہیں:

((اما الصبی فلانه متنفل فلا یجوز اقتداء المفترض به))

''رہا نابالغ لڑکا تو چونکہ وہ جو نماز ادا کرتا ہے وہ اس کے حق میں نفل ہوتی ہے اس لیے فرض ادا کرنے والے کا اس کی اقتدا میں نماز ادا کرنا جائز نہیں۔''

یہ بات تو درست ہے کہ نابالغ بچہ مکلف نہیں ہے، لہٰذا اس کی نماز اس کے حق میں فرض نہیں، نفل ہے، لیکن قرآن و حدیث کی کس نص میں یہ آیا ہے کہ فرض ادا کرنے والا نفل نماز پڑھنے والے کی اقتدا نہیں کر سکتا، بلکہ صحیح ترین احادیث سے یہ ثابت ہے کہ فرض پڑھنے والا نفل پڑھنے والے کی اقتدا کر سکتا ہے۔ یہ رسول اللہ ﷺ کے عمل سے بھی ثابت ہے، چنانچہ صحیح احادیث میں نماز خوف کی جو متعدد صورتیں بیان ہوئی ہیں ان میں سے ایک صورت یہ تھی کہ رسول اللہ ﷺ مجاہدین کی ایک جماعت کو نماز خوف کی دو رکعتیں پڑھاتے جو آپ کی اور اس جماعت کی فرض نماز ہوتی اور جب مجاہدین کی یہ جماعت واپس جا کر دشمن کے مقابلے میں اپنی پوزیشن سنبھال لیتی تو دوسری جماعت آ کر نبی کریم ﷺ کی امامت میں دو رکعتیں ادا کرتی جو نبی ﷺ کی نفل نماز ہوتی اور صحابہ کی فرض۔

۱۔ پہلی حدیث:

جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، کہتے ہیں:

((کنا مع النبی ﷺ بذات الرقاع ...... و اقیمت الصلاۃ، فصلی بطائفة رکعتین، ثم تأخروا، و صلی بالطائفة الأخری رکعتین، و کان للنبی ﷺ اربع و للقوم رکعتان)) ❷

''ہم نبی ﷺ کے ساتھ ذات الرقاع میں تھے...... اور نماز قائم کی گئی اور نبی ﷺ نے ایک گروہ کو دو رکعتیں پڑھائیں، پھر وہ پیچھے ہٹ گئے اور آپ نے دوسرے گروہ کو دو رکعتیں پڑھائیں، اور نبی ﷺ کے لیے یہ نماز چار رکعتیں تھیں اور لوگوں کے لیے دو دو رکعتیں۔''

---

❶ ۷۳۶۲، ۸۴۸۶، ۸۷۹۸، ۱۰۲۹۰، ۱۰۹۹۴، ۱۱۱۲۱، ۱۴۵۵۱، ۱۵۱۶، مسلم: ۴۴۰، ابوداود: ۶۷۸، ترمذی: ۲۲۴، نسائی: ۸۲۱، ابن ماجہ: ۱۰۰۰

❷ بخاری: ۴۱۳۶، مسلم ۸۴۳-۳۱۱-۳۱۲، مسند احمد: ۱۴۹۲۸، ۱۴۹۲۹، ۱۵۱۹۰

Marfat.com

۲۔ دوسری حدیث:

ابوبکرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، کہتے ہیں:

((صلی النبی ﷺ فی خوف الظهر ، فصف بعضهم خلفه و بعضهم بإزاء العدو ، فصلی بهم رکعتین ، ثم سلم ، فانطلق الذین صلوا معه فوقفوا موقف اصحابهم ثم جاء اولئك فصلوا خلفه فصلی بهم رکعتین ، ثم سلم ، فکانت لرسول الله ﷺ اربعا ، و لاصحابه رکعتین رکعتین)) [1]

''نبی ﷺ نے ظہر کی نماز خوف پڑھی، تو بعض صحابہ آپ کے پیچھے صف آرا ہو گئے اور بعض دشمن کے مقابلے میں ڈٹے رہے، آپ نے ان کو دو رکعتیں پڑھائیں، پھر سلام پھیر دیا اور جن لوگوں نے آپ کے ساتھ نماز پڑھی تھی چلے گئے اور اپنے ساتھیوں کی جگہ پوزیشن سنبھال لی، پھر وہ لوگ آئے اور آپ کے پیچھے صف بستہ ہو گئے اور آپ نے ان کو دو رکعتیں پڑھا کر سلام پھیر دیا، تو یہ نماز رسول اللہ ﷺ کے لیے چار رکعتیں ہوئی اور آپ کے اصحاب کے لیے دو دو رکعتیں۔''

سوال: ......دو سلاموں کے ساتھ نبی ﷺ نے جو چار رکعتیں ادا کی تھیں، وہ چاروں آپ کے حق میں فرض تھیں؟ یا دو رکعتیں تو فرض تھیں اور دو رکعتیں نفل؟

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَ الْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَ ذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًاؕ﴾ (الاحزاب: ۲۱)

''درحقیقت تمہارے لیے اللہ کے رسول کے (قول و فعل) میں بہترین نمونہ ہے، اس کے لیے جو اللہ کی (رضا) اور یوم آخر کی (کامیابی) کا امیدوار ہے اور اللہ کو بہت یاد کرتا ہے۔''

۳۔ تیسری حدیث:

جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

((ان معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کان یصلی مع النبی ﷺ ثم یأتی قومه فیصلی بهم الصلاة ، فقرأ بهم البقرة ، قال: فتجوز رجل فصلی صلاة خفیفة فبلغ ذلك معاذا ، فقال: انه منافق ، فبلغ ذلك الرجل ، فأتی النبی ﷺ فقال: یا رسول الله! انا قوم نعمل بایدینا و نسقی بنواضحنا ، و ان معاذا صلی بنا البارحة ، فقرأ البقرة ، فتجوزت ، فزعم انی منافق ، فقال النبی ﷺ: یا معاذ ، افتان انت؟ -ثلاثا- اقرأ:

[1] ابوداود: ۱۲۴۸، نسائی: ۱۵۵۲، مسند: ۲۰۴۰۸، ۲۰۴۹۷

Marfat.com

"والشمس و ضحاها" و "سبح اسم ربك الاعلى" و نحوهما)) ❶

''معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھتے، پھر اپنی قوم کے پاس آتے اور ان کو وہی نماز پڑھاتے، اور ان کو بقرہ پڑھا دی، جابر کہتے ہیں: ایک آدمی نے قراءت مختصر کر کے ہلکی نماز پڑھ لی، جس کی خبر معاذ کو ہوئی تو انہوں نے کہہ دیا: وہ منافق ہے اور یہ بات اس شخص کو پہنچی تو وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا اور عرض کیا: یا رسول اللہ! ہم لوگ اپنے ہاتھوں سے کام کرتے ہیں اور اپنے اونٹوں سے پانی پلاتے ہیں، اور معاذ نے گزشتہ رات ہمیں نماز پڑھائی تو بقرہ کی قراءت شروع کر دی، لہٰذا میں نے قراءت مختصر کر دی اور انہوں نے یہ دعویٰ کر دیا کہ ''میں منافق ہوں'' نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے معاذ! کیا تم فتنہ پرداز ہو؟ - یہ بات آپ نے تین بار فرمائی - "و الشمس و ضحاها" اور "سبح اسم ربك الاعلى" اور ان کی مانند سورتیں پڑھا کرو۔''

یہ حدیث اپنے مفہوم میں بالکل واضح ہے اور اس امر پر بصراحت دلالت کرتی ہے کہ معاذ رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتدا میں فرض نمازیں ادا کرنے کے بعد اپنی قوم میں واپس جا کر وہی نمازیں ان کو پڑھاتے جو ان کے حق میں تو نفل ہوتیں اور ان کی قوم کے لوگوں کے حق میں فرض اور اس حدیث کے مطابق جب ایک بار انہوں نے نماز میں سورۂ بقرہ کی تلاوت شروع کر دی تو ایک صحابی نے تلاوت مختصر کر کے ہلکی نماز پڑھ لی، زیر بحث حدیث میں انہی کا قصہ بیان ہوا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے سننے کے بعد معاذ رضی اللہ عنہ کو مختصر سورتیں پڑھنے کا حکم دیا اور ان کو یہ حکم نہیں دیا کہ میری امامت میں جو نمازیں پڑھتے ہو وہ اپنی قوم کو دوبارہ نہ پڑھاؤ، کیونکہ وہ تمہاری نفل نمازیں ہیں اور نفل نماز پڑھنے والے کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ فرض نماز پڑھنے والوں کی امامت کرے۔

۴۔ چوتھی حدیث:

یہ عمرو بن سلمہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے جو اوپر گزر چکی اور خود انہی کی امامت سے متعلق بھی ہے اس حدیث کے مطابق وہ اپنی قوم کے لوگوں کو چھ یا سات برس کی عمر میں امامت کراتے تھے اور یہ روز کا معمول تھا، کوئی اتفاقی امر نہیں تھا۔

اشکال: ......عمرو بن سلمہ رضی اللہ عنہ کی امامت کے مسئلہ میں یہ اشکال پیش کیا جا سکتا ہے اور پیش کیا بھی گیا ہے کہ یہ ان کا عمل تھا اور ان کی قوم کے لوگوں نے ان کو امامت کے لیے آگے بڑھا دیا تھا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے کسی ارشاد مبارک میں صراحتاً یا اشارۃً ایسا کوئی حکم نہیں دیا ہے جس سے نابالغ بچے کی امامت پر استدلال کیا جائے۔

۱۔ اس اشکال کے جواب میں پہلی بات تو میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ عمرو بن سلمہ کے والد سلمہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے شرف ملاقات حاصل کرنے اور آپ کے دست مبارک پر بیعت کرنے کے بعد اپنی قوم میں واپس آئے تھے اور اپنے

❶ بخاری: ۶۱۰۶، مسلم ۴۶۵، مسند احمد: ۱۱۹۸۲، ۱۲۲۴۷، ۱۴۱۹۰، ۱۴۰۲۲، ۱۴۳۰۷

Marfat.com

ساتھ نبی ﷺ کا یہ حکم بھی لائے تھے کہ:

((و لیؤمکم اکثرکم قرآنا)) ❶

''اور چاہیے کہ تمہاری امامت تم میں سے سب سے زیادہ قرآن والا کرے۔''

اگر نابالغ بچے کی امامت جائز نہ ہوتی تو آپ نے اسے بیان کر دیا ہوتا۔ جیسا کہ ابو مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث میں آپ نے امام کے مزید اوصاف بھی بیان فرمائے ہیں اور جس چیز سے رسول اللہ ﷺ نے کبھی بھی منع نہ فرمایا ہو وہ صاحب ہدایہ کے کہنے سے ناجائز نہیں ہوسکتی، یہ تو شارع کا منصب ہے۔

۲۔ دوسری بات میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ محمد بن عبداللہ ﷺ کے رسول ہونے کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ آپ کی حیات پاک میں دین وشریعت سے متعلق ہونے والا ہر فعل اور ہر قول آپ کے علم میں آئے، اس کی اطلاع صاحب فعل یا قول آپ کو خود دے یا صحابہ میں سے کوئی دے اور اگر کوئی نہ دے تو اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی آپ کو یہ اطلاع دے دی ہوتی کہ فلاں جگہ کچھ لوگ ایک نابالغ لڑکے کے پیچھے باقاعدہ فرض نمازیں پڑھ رہے ہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ نے بھی جو علام الغیوب ہے اپنے بندے اور رسول کو بذریعہ وحی نابالغ بچے کی امامت کے عدم جواز کی خبر نہیں دی۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ نابالغ لڑکے کی امامت کو ناجائز کہنا، شریعت سازی ہے یا اللہ و رسول کو چیلنج کرنا ہے۔

یاد رہے کہ ''فتاوی عالمگیری'' میں امامت کے نااہلوں کی فہرست چھ صفحات میں بیان ہوئی ہے، اس پر میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد نقل کر دینا چاہتا ہوں:

﴿وَ لَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هٰذَا حَلٰلٌ وَّ هٰذَا حَرَامٌ لِّتَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ اِنَّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُوْنَ﴾ (النحل: ۱۱۶)

''جس چیز کا تمہاری زبانیں جھوٹا وصف بیان کرتی ہیں اس کو یہ مت کہو کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام تاکہ اللہ پر جھوٹ گھڑو، درحقیقت جو اللہ پر جھوٹ گھڑتے ہیں وہ فلاح یاب نہیں ہوتے۔''

جمعہ کی نماز فجر میں سورۂ سجدہ اور سورۂ دہر کی تلاوت

ا۔ پہلی حدیث:

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، کہتے ہیں:

((کان النبی ﷺ یقرأ فی الجمعة فی صلاة الفجر "الٓمٓ تنزیل" و "هل اتی علی الانسان")) ❷

---

❶ بخاری: ۴۳۰۲، ابوداود: ۵۸۶، نسائی: ۷۸۸

❷ بخاری ۸۹۱، ۱۰۶۸، مسلم ۸۸۰، مسند احمد: ۱۰۱۰۲

Marfat.com

"نبی ﷺ جمعہ کے دن نماز فجر میں الم تنزیل اور ہل اتی علی الانسان پڑھا کرتے تھے۔"

۲۔ دوسری حدیث:

ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

((ان النبی ﷺ کان یقرأ فی صلاۃ الفجر یوم الجمعة الم تنزیل السجدة و هل اتی علی الانسان حین من الدهر و ان النبی ﷺ کان یقرا فی صلاۃ الجمعة سورة الجمعة و المنافقین)) ❶

"نبی ﷺ جمعہ کے دن نماز فجر میں الم تنزیل السجدة اور هل اتی علی الانسان حین من الدهر پڑھا کرتے تھے اور نبی ﷺ نماز جمعہ میں سورۂ جمعہ اور منافقون پڑھا کرتے تھے۔"

۳۔ تیسری حدیث:

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

((ان النبی ﷺ کان یقرأ فی صلاۃ الصبح یوم الجمعة "الم تنزیل السجدة" و "هل اتی علی الانسان" یدیم ذلك)) ❷

"نبی ﷺ جمعہ کے دن صبح کی نماز میں "الم تنزیل السجدة" اور "هل اتی علی الانسان" پڑھا کرتے تھے، ہمیشہ یہ کرتے تھے۔"

۴۔ چوتھی حدیث:

سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، کہتے ہیں:

((کان رسول الله ﷺ یقرأ فی صلاۃ الفجر یوم الجمعة الم تنزیل و هل اتی علی الانسان)) ❸

"رسول اللہ ﷺ جمعہ کے دن نماز فجر میں الم تنزیل اور هل اتی علی الانسان پڑھا کرتے تھے۔"

---

❶ مسلم: ۸۷۹، ابوداود: ۱۰۷۴-۱۰۷۵، ترمذی: ۵۲۰، نسائی: ۱۲۲۱، ابن ماجہ: ۸۲۸، مسند: ۱۹۹۳، ۲۴۵۲، ۲۷۹۹، ۲۹۰۶، ۳۰۳۹، ۳۰۹۶، ۳۰۹۷، ۳۱۶۰، ۳۳۲۵، ۳۳۲۶، ۳۴۰۴، ابن خزیمہ: ۵۳۳، طبرانی: ۱۲۳۷۷، ۱۲۴۲۲، ۱۲۴۶۲۔

❷ المعجم الصغیر للطبرانی: ۸۰-۸۱، ج ۲، ابن ماجہ: ۸۳۱

❸ ابن ماجہ: ۸۲۹

Marfat.com

مستحب نہیں سنت:

مذکورہ بالا چاروں حدیثوں کے اسلوب بیان اور ان حدیثوں کی مخالف کوئی حدیث نہ ہونے سے جو چیز یقینی طور پر ثابت ہوتی ہے وہ یہ کہ جمعہ کی نماز فجر کی پہلی رکعت میں سورۂ سجدہ اور دوسری رکعت میں سورۂ دہر کی تلاوت رسول اللہ ﷺ کا معمول تھی جس کی مزید تاکید طبرانی کی المعجم الصغیر میں عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت "یدیم ذلك" سے ہوتی ہے۔ اگر طبرانی کی روایت کی سند میں کوئی جھول ہوتا تو حافظ زیلعی اس کو ضرور بیان کر دیتے، کیونکہ اس سے ان کے حنفی مسلک پر زد پڑتی ہے۔ چاروں حدیثوں کے اسلوب بیان کی قوت کو حافظ زیلعی اور حافظ ابن حجر دونوں نے محسوس کیا ہے۔ دونوں محدث بھی تھے اور زبان داں بھی، حافظ زیلعی نے تو اپنا اصول توڑ کر ہدایہ کے فقہی حکم پر کلام کیا ہے، ورنہ ان کی کتاب "نصب الرایہ" کا موضوع ہدایہ کے فقہی احکام پر تبصرہ کرنا نہیں، بلکہ اس میں زیر استدلال حدیثوں کی صحت، وسقم کو دلائل کے ساتھ بیان کرنا ہے۔

جب یہ بات واضح اور مبرہن ہوگئی کہ رسول اللہ ﷺ جمعہ کی نماز فجر میں پوری پابندی سے اور بشکل دوام سورۂ سجدہ اور سورۂ دہر کی تلاوت فرماتے تھے تو آپ کے اس عمل کو مستحب قرار دینا، سنت نہ قرار دینا اتباع رسول کے حکم قرآنی کی خلاف ورزی ہے اور آپ کے عمل کو نمونہ تقلید بنانے سے اعراض بھی، مجھے غیر اہل حدیثوں سے کوئی گلہ نہیں ہے۔ اگر کوئی گلہ ہے تو اپنے بعض اہل حدیث بھائیوں سے جنہوں نے جمعہ کی نماز فجر میں سورۂ سجدہ اور سورۂ دہر کی تلاوت کو مستحب قرار دیا ہے۔ جس عمل کی رسول اللہ ﷺ نے اس اہتمام سے پابندی کی ہو اگر وہ سنت نہیں صرف مستحب ہے تو پھر آپ کے نمونۂ تقلید اور اسوۂ حسنہ ہونے کے کیا معنیٰ ؟!!!

صاحب ہدایہ کی مذموم جسارت:

ہدایہ کے مصنف علامہ مرغینانی کتاب الصلاۃ کے باب صفة الصلاة کے تحت تحریر فرماتے ہیں:

((و یکرہ ان یوقت بشیء من القرآن لشیء من الصلوات لما فیه ایهام من هجر الباقی و ایهام التفضیل)) [1]

"اور یہ مکروہ ہے کہ قرآن کے کسی حصے کو کسی نماز کے لیے متعین اور خاص کیا جائے، کیونکہ ایسا کرنے میں یہ خیال مضمر ہے کہ باقی قرآن قابل ترک ہے اور اس سے قرآن کے بعض حصے کے بعض سے افضل ہونے کا تاثر ملتا ہے۔"

اس قابل گرفت اور مذموم عبارت پر تبصرہ کرنے سے پہلے یہ یاد دلا دوں کہ مرغینانی نے اپنی اس کتاب میں اپنے من گھڑت فقہی احکام پر بے اصل، موضوع اور ضعیف روایتوں سے استدلال کر کے اپنی حدیث دانی کا ثبوت دیا ہے، مگر

[1] ص: ۱۰، ج: ۲

Marfat.com

اس مسئلہ کی کوئی دلیل دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی، گویا شریعت سازی کا حق ان کو بھی حاصل ہے، جبکہ ان کی اس عبارت کی زد براہ راست رسول اللہ ﷺ کے ایک ایسے عمل اور ایک ایسی سنت پر پڑتی ہے جس پر آپ کا دوام تھا۔

بحیثیت ایک فقیہ کے مرغینانی کو یہ بات معلوم رہی ہوگی کہ وہ جس عمل کو ''مکروہ'' قرار دے رہے ہیں وہ رسول اللہ ﷺ کا ایسا عمل ہے جو صحیح ترین احادیث سے ثابت ہے اور امت محمد کے ایک فرد ہونے کے ناطے ان کا یہ فرض تھا کہ وہ اپنے اس سنگین قول کے حق میں کوئی دلیل دیتے اور ان حدیثوں میں سے کسی حدیث کی ایسی تشریح کر کے اس کو قابل قبول بنانے کی کوشش کرتے جو حدیث کے سیاق وسباق اور اس کے مدلول سے ہم آہنگ ہوتی۔ مثال کے طور پر وہ یہ فرما سکتے تھے کہ:

''صحیح احادیث سے یہ ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ فداہ ابی و امی ﷺ جمعہ کی نماز فجر میں پابندی سے سورۂ سجدہ اور سورۂ دہر کی تلاوت فرماتے تھے جس پر ''کان یقرأ'' کا اسلوب واضح دلیل ہے، اور جو ائمہ بآسانی اس سنتِ رسول کی پابندی کر سکتے ہوں وہ اس کی پابندی کریں اور اس کو اپنے لیے باعث اجر و ثواب تصور کریں، اور جو کسی وجہ سے بصورت دوام ایسا نہ کرسکیں وہ کبھی کبھار ان دونوں سورتوں کی مذکورہ نماز میں تلاوت کرلیا کریں اور اگر کوئی جمعہ کی نماز فجر میں سورۂ سجدہ اور سورۂ دہر کی کبھی بھی تلاوت نہ کرے تو اگر اس کے ایسا نہ کرنے کا سبب یہ ہے کہ وہ اس کو سنت نہیں مانتا تو وہ گنہگار ہے، لیکن اس کی نماز صحیح ہے، اور اگر کوئی اس کو لازمی اور تاکیدی سنت نہیں مانتا تو اس کی نماز بھی صحیح ہے اور ایسا شخص اس کو سنت نہ ماننے والے سے زیادہ افضل ہے۔ رہا ایسا شخص جس کا دعویٰ ہے کہ جمعہ کی نماز فجر میں سورۂ سجدہ اور سورۂ دہر کی بصورت دوام تلاوت سے یہ تاثر ملتا ہے کہ بقیہ قرآن قابل ترک ہے اور قرآن میں درجات ہیں، اس لیے ان کی تلاوت مکروہ ہے تو ایسا شخص براہ راست نبی ﷺ پر معترض ہے جس کا حکم بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔

یہاں سلسلۂ کلام کے اندر رہتے ہوئے یہ بیان کر دوں کہ بعض نمازوں میں نبی ﷺ پابندی سے بعض سورتیں پڑھا کرتے تھے مثال کے طور پر جمعہ کی پہلی رکعت میں سورۂ جمعہ، یا سورۂ اعلیٰ اور دوسری رکعت میں سورۂ منافقون یا سورۂ غاشیہ پڑھا کرتے تھے زیادہ تر سورۂ اعلیٰ اور سورۂ غاشیہ اور عیدین کی نمازوں میں سورۂ اعلیٰ اور سورۂ غاشیہ کی بصورت دوام تلاوت فرماتے تھے اسی طرح فجر کی سنتوں میں سورۂ کافرون اور سورۂ اخلاص کی تلاوت فرماتے تھے۔'' [1]

قرآنی آیات اور سورتوں میں درجات:

موضوع کی مناسبت سے یہ واضح کر دوں کہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہونے کے اعتبار سے قرآن میں تفاضل اور درجات نہیں ہیں، لیکن موضوعات کے اعتبار سے قرآنی آیات اور سورتوں میں درجات ہیں اور احادیث سے ثابت بھی ہیں۔

[1] مسلم: ۸۷۷، ۸۷۸، ابو داود: ۱۱۲۳، ۱۱۲۴، ترمذی: ۵۱۹، نسائی: ۱۴۲۲، ابن ماجہ: ۱۱۱۸، ۱۱۱۹

Marfat.com

مثال کے طور پر آیۃ الکرسی قرآن پاک کی عظیم ترین آیت ہے جس میں اللہ تعالیٰ کے پانچ اسماء اور ۲۶ صفتیں بیان ہوئی ہیں اور حدیث میں اس کو عظیم ترین آیت قرار دیا گیا ہے۔ ❶

اسی طرح سورۂ اخلاص قرآن کی افضل ترین سورت ہے جو ایک تہائی قرآن کے برابر ہے۔ ❷

احادیث میں دوسری آیتوں اور سورتوں کے فضائل بھی بیان ہوئے ہیں۔

جہالت دلیل نہیں ہے:

حدیث سے لاتعلقی اور غیر وابستگی احناف کی پہچان ہے اوپر شاہ ولی اللہ کا یہ قول گزر چکا ہے کہ ''علمائے احناف ہمیشہ سے علم حدیث کے ساتھ کم وابستگی رکھتے رہے ہیں۔'' اس تناظر میں بہت ساری سنتوں کا احناف کی کتابوں اور اعمال میں کوئی ذکر نہیں ملتا، انہی سنتوں میں جمعہ کی نماز فجر میں سورۂ سجدہ اور سورۂ دہر کی تلاوت کا مسئلہ بھی ہے جس کا ذکر احناف اس اعتبار سے نہیں کرتے کہ یہ حدیث سے ثابت سنت نبوی ہے، بلکہ اس کو شوافع کے مسلکی عمل کے طور پر جانتے اور مانتے ہیں۔

مولانا عبدالحی لکھنوی کا مسلک:

برصغیر کے مشہور حنفی عالم مولانا عبدالحی لکھنوی اہل حدیثوں سے نفرت میں تو عام علمائے دیوبند سے مختلف نہیں تھے، البتہ علم بالحدیث اور عمل بالسنۃ میں ان سے کافی مختلف تھے۔ بسا اوقات امام ابوحنیفہ کے مخالفِ سنت قول و مسلک پر تنقید بھی کر جاتے تھے جو ان کی حق پسندی کی دلیل ہے۔

مولانا عبدالحی نے جمعہ کی نماز فجر میں سورۂ سجدہ اور سورۂ دہر کی تلاوت اور عدم تلاوت کے مسئلہ میں شوافع اور احناف دونوں کے طرز عمل کو غیر مستحسن قرار دیا ہے۔

ان کا دعویٰ ہے کہ شوافع کی طرح اس پر بصورت دوام عمل سے ان سورتوں کے تعیین و تخصیص کا تاثر ملتا ہے جو مکروہ اور ناپسندیدہ ہے۔ انہوں نے یہ دعویٰ بھی کیا ہے کہ اس سے بہت سے مفاسد رونما ہوتے ہیں خاص طور پر حرم محترم میں جن میں سے ایک کی مثال دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

> ''میں نے حرم میں اژدہام کے موقع پر یہ مشاہدہ کیا ہے کہ امام کے پہلی رکعت میں سجدۂ تلاوت کے موقع پر جاہل مقتدی رکوع میں چلے جاتے ہیں اور امام کے سجدہ سے کھڑے ہونے کے وقت اپنا سر اٹھا لیتے ہیں اور یہ خیال کر کے ان کو حیرانی ہوتی ہے کہ فجر کی تین رکعتیں ہیں۔''

آگے لکھتے ہیں:

> ''جو عجیب باتیں معلوم ہوئی ہیں وہ یہ کہ بعض عجمی حجاج جب بخاری واپس گئے تو وہاں کے لوگوں کو بتایا کہ

---

❶ مسلم: ۸۱۰ ❷ بخاری: ۵۰۱۳، ۵۰۱۵، مسلم: ۸۱۱

Marfat.com

شوافع فجر کی نماز تین رکعتیں پڑھتے ہیں اور ہمارے حنفی علماء نے جب یہ مفاسد دیکھے تو ان سورتوں کو پڑھنا ترک کر دیا۔“ ❶

مولانا لکھنوی سے ایک سوال ہے کہ سنت سے اس بے اعتنائی کا سبب کیا ہے اور کیا لوگوں کی جہالت ترکِ سنت کے لیے وجہ جواز ہے؟

نتیجہ بحث:

حدیث اور فقہاء کے اس باب میں میں نے حدیث رسول ﷺ کے بارے میں فقہائے احناف کے طرز عمل کا بڑی تفصیل سے جائزہ لیا ہے میں نے اس بات کی پوری کوشش کی ہے کہ اپنی ہر بات دلیل سے مدلل کر کے پیش کروں اور ہر دلیل کا حوالہ بھی دیتا جاؤں۔ مذکورہ بالا بحث سنجیدگی سے اور مسلکی تعصب کی عینک اتار کر پڑھنے والے ان شاء اللہ اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ حدیث کے قبول و رد کے مسئلہ میں فقہائے احناف نے جس چیز کو معیار بنایا ہے وہ رسول اللہ ﷺ کی نسبت سے حدیث کی صحت و سقم ہرگز نہیں ہے، بلکہ ان کے ائمہ کے اقوال سے اس کی موافقت اور عدم موافقت ہے، چنانچہ اپنے ائمہ کے اقوال اور اجتہادی و قیاسی احکام سے ہم آہنگ ضعیف سے ضعیف تر بلکہ موضوع اور باطل روایات تک کو انہوں نے لے لیا ہے اور ان اقوال اور احکام سے متعارض صحیح ترین حدیثوں کو رد کر دیا ہے جس کی مثالوں سے فقہ حنفی کی کتابیں بھری پڑی ہیں۔

اس بحث سے قارئین کرام کو یہ بھی معلوم ہوگا کہ فقہائے احناف میں جن لوگوں کا علم حدیث سے کوئی تعلق رہا ہے ان کا کردار عام فقہاء سے بہتر نہیں رہا ہے، بلکہ اگر میں یہ دعویٰ کروں کہ اپنی اس شہرت سے ان فقہاء نے مسلمانوں یا اپنے پیروؤں کے دلوں سے حدیث یا سنت کی ہیبت اور احترام کو نکالنے میں خاصا کام کیا ہے تو قطعاً مبالغہ نہ ہوگا۔

حدیث اور فقہاء کی اس بحث میں میں نے علامہ انور کشمیری اور محمد زاہد کوثری کے اسلام مخالف افکار و آراء کا جائزہ لے کر دکھایا ہے کہ ان بزرگوں نے اپنے علم حدیث کے ذریعہ مسلمانوں کو جہاں کتاب و سنت سے ماخوذ فقہی احکام سے دور کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے وہیں ان کے ذہنوں کو متکلمین اور صوفیا کے باطل عقائد سے مسموم بھی کیا ہے۔

---

❶ فتاویٰ: ص ۲۶۴

Marfat.com

باب نہم:

حدیث اور صوفیا

حدیث اور فقہاء کے بعد حدیث اور صوفیا کا باب اس لیے ضروری قرار پایا کہ اولاً تو حدیث سے تعلق کے حوالہ سے او پر جن فقہاء کے افکار اور طرز عمل کا جائزہ لیا گیا ہے وہ سب فقہائے احناف تھے، جبکہ صوفیا میں دوسرے فقہی مسلکوں سے وابستہ لوگ بھی شامل ہیں۔ ثانیاً فقہاء کے مقابلے میں صوفیا اپنے ظاہر کے اعتبار سے اللہ کے صالح بندے شمار ہوتے ہیں اور یہی ان کی شناخت بن چکی ہے، جبکہ فقہاء کے ذکر میں صلاح وتقویٰ سے تعرض نہیں کیا جاتا۔

صوفیا کے ساتھ ظاہری صلاح کی قید اس لیے لگائی گئی ہے کہ ظاہری صلاح اگر باطنی صلاح کا غماز اور آئینہ دار ہو تب تو عنداللہ معتبر ہے ورنہ فریب نظر اور مردود ہے اور امر واقعہ یہ ہے کہ صوفیا کی اکثریت اسی ظاہری صلاح سے موصوف رہی ہے اور ہے۔ رہا ان کا باطن تو ان کی بدعقیدگی، ان کی من گھڑت ریاضتوں، کتاب وسنت کی تعلیمات سے ان کی دوری اور اہل حق سے ان کی شدید نفرتوں کی وجہ سے صلاح وتقویٰ کی روح سے خالی رہا ہے۔

تصوف جس کی نسبت سے صوفیا کو صوفی کا نام ملا ہے ایسا مسلکِ حیات ہے جس کی صحیح اور دوٹوک تعریف آج تک کسی نے نہیں کی ہے۔ تصوف کے موضوع پر عربی اور اردو میں جو کتابیں ملتی ہیں ان کے لکھنے والے یا تو صوفی رہے ہیں یا غیر صوفی اور غیر صوفی مصنفین میں یا تو تصوف کے شدید مخالف رہے ہیں یا ایسے لوگ جنہوں نے محض ایک اسلامی مذہب اور مسلک کے اعتبار سے اس کو موضوع بحث بنایا ہے اور ان فریقوں میں سے کسی نے بھی تصوف کے ایسے خدوخال بیان نہیں کیے ہیں جن کی روشنی میں اس کی صحیح اور واضح تصویر سامنے آتی ہو۔

جہاں تک صوفی مصنفین کا تعلق ہے تو انہوں نے تصوف کا صحیح اور متعین تعارف کرانے کے بجائے اس کے بعض ایسے پہلوؤں کو بیان کیا ہے جو اسلامی تعلیمات سے متعارض نظر نہیں آتے، بلکہ بڑی حد تک ان سے ہم آہنگ نظر آتے ہیں، اور تصوف کے جو پہلو اسلام سے متعارض ہیں اور جن کی اکثریت ہے ان کو نہیں چھیڑا ہے۔

یہ تو عام صوفیا کا انداز ہے، رہے برصغیر کے صوفیا خاص طور پر اکابر دیوبند، تو ان کا دعویٰ ہے کہ جس احسان کا ذکر حدیث جبریل میں آیا ہے اور احادیث کے مطابق رسول اللہ ﷺ اپنے اصحاب کا جس طریقہ سے تزکیہ فرماتے تھے، صوفیا اسی پر کاربند ہیں، لیکن ڈاکٹر محمد عبدالحق انصاری نے، جو شیخ احمد سرہندی کے افکار پر سند اور اتھارٹی ہیں اپنی کتاب تصوف اور شریعت میں یہ انکشاف کیا ہے کہ تصوف کی آٹھ سو سالہ تاریخ میں شیخ سرہندی وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے نہایت جرات سے یہ اعلان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے تزکیہ واحسان اور صوفیا کے اختیار کردہ تزکیہ واحسان میں ایک

Marfat.com

بنیادی فرق ہے ان کے نزدیک صوفیہ کا طریقہ ''فنا و بقا'' سے عبارت ہے، یہی روحانی تجربہ اس کا امتیازی پہلو ہے۔ جہاں تک طریقۂ نبوت کا تعلق ہے تو اس میں اس تجربہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ ❶

تصوف کی دنیا کے امام ابوالقاسم عبدالکریم قشیری نے "الـرسـالـة القشيـريـه" میں اور ابواسماعیل ہروی نے ''منازل السائرین'' میں "فـنـا و بقا" پر تفصیل سے گفتگو کی ہے جس سے تصوف میں اس کی اہمیت پر روشنی پڑتی ہے۔ حافظ ابن القیم نے مدارج السالکین میں ہروی کے مغالطوں کو بیان کرتے ہوئے ان کے دعووں کا رد کیا ہے۔

میں اس باب میں ان شاء اللہ حدیث سے صوفیا کے تعلق کے تناظر میں ان کے عقائد اور اعمال کا جائزہ لوں گا، کیونکہ یہی میرا موضوع بحث ہے، لیکن اصل موضوع شروع کرنے سے قبل اپنے قارئین کے علم میں یہ بات لانا چاہتا ہوں کہ تصوف کے ایک منفرد محقق مولانا سید محمد علی حسینی نے تصوف وطریقت کو دین اسلام کے متوازی ایک مستقل دین قرار دیا ہے، مولانا موصوف کی باتوں میں اس اعتبار سے بڑا وزن ہے کہ ان کی پوری زندگی صوفیوں کے درمیان گزری ہے۔ انہوں نے ان کے افکار وعقائد کو عملی شکل میں دیکھا ہے اور تصوف کے مسائل پر ان سے تفصیلی بحثیں کی ہیں اور اپنی کتاب ''دین تصوف وطریقت'' میں جو کچھ لکھا ہے دلائل کے ساتھ لکھا ہے۔

تصوف کے مستقل دین ہونے کے دعوے کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ مولانا اشرف علی تھانوی نے یہ اعتراف کیا ہے کہ اللہ تک لے جانے والے راستے دو ہیں؛ طریق نبوت اور طریق ولایت ❷ اور یہ بتانا تحصیل حاصل ہے کہ طریق ولایت سے مراد تصوف ہے۔

طریق ولایت کے طریق نبوت سے مختلف ہونے کی تائید اس واقعہ سے بھی ہوتی ہے جس کا تذکرہ مولانا علی میاں نے اپنی کتاب ''سیرت سید احمد'' میں کیا ہے، وہ شاہ عبدالعزیز کے ہاتھ پر سید احمد کی بیعت اور تصوف کے تینوں طریقوں: چشتیہ، قادریہ، اور نقشبندیہ میں ان کے داخل کر لیے جانے کے بعد کا واقعہ بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

> ''تعلیم سلوک کے ضمن میں حضرت شاہ صاحب نے حسب معمول ''تصور شیخ'' کی تعلیم کی، سید صاحب نے نہایت ادب سے عرض کیا: حضرت اس میں اور بت پرستی میں کیا فرق ہے؟ اُس میں صورت سنگی اور قرطاسی ہوتی ہے اور اِس میں صورت خیالی جو دل میں جگہ پکڑ لیتی ہے اور اس کی طرف توجہ اور اس سے استعانت ہوتی ہے۔ شاہ صاحب نے حافظ کا یہ شعر پڑھا:
>
> بہ مے سجادہ رنگیں کن گرت پیر مغاں گوید
> کہ سالک بے خبر نہ بود زراہ و رسم منزلہا
>
> اگر پیر مغاں حکم دے تو جائے نماز کو شراب سے رنگین کر دو، کیونکہ راہ سلوک کا مسافر سلوک کی منزلوں کی

❶ ص ۸ ❷ ملاحظہ ہو شریعت وطریقت، ص ۴۵-۴۷

Marfat.com

راہ ورسم سے غافل نہیں ہوتا ہے۔

سید صاحب نے فرمایا: شرک کی کسی طرح ہمت نہیں ہوسکتی، ہاں کتاب وسنت واجماعِ امت سے کوئی سند لائیں اور اچھی طرح سے اطمینان ہو جائے کہ دونوں ایک چیز نہیں تو خطرہ دور ہوسکتا ہے۔ ❶

مقام عبرت:

اس واقعہ سے جس حقیقت کا اظہار ہو رہا ہے وہ یہ کہ صوفیا کے پاس اپنے بنیادی عقائد میں بھی کتاب وسنت کی کوئی دلیل نہیں ہے، سید احمد نے ''تصور شیخ'' کو صریح بت پرستی کہہ کر اس کو قبول کر لینے سے معذرت کر لی تھی، اور مولانا علی میاں نے سید صاحب کی اس معذرت کی توجیہ کرتے ہوئے تصور شیخ پر بڑی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے اور قرآن پاک اور سید صاحب کی کتاب ''صراط مستقیم'' کے اقتباسات سے اس کو صریح بت پرستی اور شرک ثابت کیا ہے۔ ❷

یہ سب کچھ واضح ہو جانے کے بعد اس واقعہ میں عبرت کا جو مقام ہے وہ یہ کہ شاہ عبدالعزیز نے سید احمد کی زبان سے ''تصور شیخ'' کو بت پرستی قرار دیے جانے پر یہ نہیں فرمایا کہ تمہاری بات صحیح نہیں ہے؛ یہ بت پرستی نہیں ہے، بلکہ ''دین تصوف'' کی ایک بنیادی کتاب دیوان حافظ کا ایک شعر پڑھ دیا جس میں شاعر نے ''پیر'' کو مطاع مطلق قرار دیتے ہوئے اس کے ہر حکم کی بجا آوری کی تعلیم دی ہے اگر چہ وہ ارتکاب کفر ہی کا حکم ہو، جبکہ رسول اللہ ﷺ نے گناہ کے کام میں کسی بھی شخص کی طاعت کرنے سے منع فرمایا ہے، چنانچہ علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

((لَا طَاعَةَ فِيْ مَعْصِيَةٍ، إِنَّمَا الطَّاعَةُ فِي الْمَعْرُوْفِ)) ❸

''معصیت میں کسی کی طاعت روا نہیں، طاعت تو صرف معروف کام میں ہے۔''

صوفی کا پیر اللہ کا پرتو ہے:

صوفیا کے یہاں پیر کو جو مقام و مرتبہ حاصل ہے وہ رسول اللہ فداہ ابی وامی ﷺ کو بھی حاصل نہیں ہے، تصوف کے قرآن مثنوی رومی میں پیر کو اللہ کا سایہ اور نائب قرار دیا گیا ہے:

پیر کامل صورت ظل علی
یعنی دید پیر دید کبریا
ہر کہ پیر و ذات را یکجانہ دید
نے مرید و نے مرید نے مرید

''پیر کامل ذات بلند کا پرتو ہے، یعنی پیر کو دیکھنا ذات کبریا کو دیکھنا ہے۔ جو کوئی پیر اور ذات الٰہی کو ایک مقام

❶ ص ۱۲۱ ❷ ملاحظہ ہو: ص ۱۲۴۔۱۲۶ ❸ بخاری: ۴۳۴۰، ۷۲۵۷، مسلم: ۱۸۴۰

Marfat.com

پر نہ دیکھے وہ مرید نہیں، مرید نہیں، مرید نہیں ہے۔"

پیر رومی کے ان اشعار سے صوفیا کے "تصور شیخ" کو سمجھنا آسان ہو جاتا ہے جس کی ترجمانی "سیرۃ النبی ﷺ" کے مصنف سابق علامہ اور لاحق مولوی سلیمان نے اپنے پیر مولانا تھانوی کی بابت کی ہے، فرماتے ہیں:

پا کر تجھے اپنے کو میں بھول گیا ہوں
ہر سو دوزیانِ دوسرا میں بھول گیا ہوں
جس دن سے مرے دل میں تری یاد بسی ہے
ہر ایک کو میں تیرے سوا بھول گیا ہوں
آتا ہے خدا بھی ترے صدقہ میں مجھے یاد
گویا کہ بظاہر میں خدا بھول گیا ہوں [1]

ولایت کا ہوّا:

تصوف میں اللہ تعالیٰ تک لے جانے والے دو راستوں، طریق نبوت اور طریق ولایت کے ذکر سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ قرآن کے مطابق محمد بن عبداللہ ﷺ جو دین و شریعت دے کر بھیجے گئے تھے اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو لوگوں کے تزکیہ و تطہیر کے جس طریقے کا مکلّف بنایا تھا صرف وہی کافی نہیں ہے، بلکہ اس کے بالمقابل ایک دوسرا طریقہ طریقۂ ولایت بھی ہے جو طریق نبوت ہی کی طرح، بلکہ اس سے بہتر صورت میں اللہ تک پہنچانے والا راستہ ہے، تصوف کی کتابوں اور صوفیا کے حلقوں میں اس ولایت کا جو ہوّا بھی پیش کیا جاتا ہو، قرآن و حدیث میں اس کا کوئی ذکر نہیں ہے؛ جہاں تک "ولایت" کا تعلق ہے تو اس کا ذکر پورے قرآن پاک میں صرف ایک بار آیا ہے اور یہ بھی اللہ تعالیٰ کی صفت کے طور پر:

﴿هُنَالِكَ الْوَلَايَةُ لِلّٰهِ الْحَقِّ﴾ (الکهف: ٤٤) "وہاں اختیار اللہ برحق کے لیے ہوگا۔"

"هُنَالِكَ" سے مراد قیامت کا دن ہے۔ مطلب یہ ہے کہ قیامت کے دن جزا اور سزا کا اختیار صرف اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہوگا اور اس دنیا کی زندگی میں طبعی امور میں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو جو محدود اور عارضی اختیارات دے رکھے ہیں اُن سے اس دن وہ سب چھن جائیں گے۔

یہ آیت مبارکہ سورۂ انفطار کی اس آیت کے مانند ہے:

﴿وَالْاَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ٥﴾ (الانفطار: ١٩) "اور اس دن حکم صرف اللہ کا ہوگا۔"

"اَلْاَمْرُ" سے مراد حکم اور اقتدار ہے۔

[1] دین تصوف و طریقت، ص ۸۱

Marfat.com

﴿لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ﴾ (المومن: ١٦)

''آج کس کی بادشاہی ہے؟ اللہ ہی کی ہے جو ایک غالب اللہ ہے۔''

قرآن پاک میں اولیاء بصورت جمع اللہ تعالیٰ کی طرف اضافت کے ساتھ صرف ایک بار آیا ہے:

﴿اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ۝﴾

(یونس: ٦٢-٦٣)

''سن لو، درحقیقت اللہ کے دوست وہ ہیں جن پر نہ کسی خوف کا موقع ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے اور جو اللہ کی ناراضی سے بچتے تھے۔''

یہ آیت مبارکہ اس امر میں نص قاطع ہے کہ اللہ کے ولی اس کے مومن و متقی بندے ہیں، اور اللہ کا مومن و متقی بندہ صرف وہ ہے جو رسول اللہ ﷺ کا متبع اور پیرو ہو۔

راہِ ہدایت صرف ایک ہے:

وہ سیدھا راستہ جس پر چل کر ایک انسان اللہ کا محبوب و مقبول بندہ بن سکتا ہے، صرف ایک ہے اور یہ وہی راستہ اور طریقہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت میں پوری وضاحت سے بیان کر دیا گیا ہے اور رسول اللہ ﷺ نے اپنی سیرت پاک کے ذریعہ اس کی تمام علامتیں واضح اور متعین فرما دی ہیں اس کے سوا تمام راستے گمراہی اور ضلالت کے راستے ہیں:

﴿وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝﴾ (الانعام: ١٥٣)

''اور درحقیقت یہ ہے میرا سیدھا راستہ تو اس کی پیروی کرو اور دوسرے راستوں کی پیروی مت کرو، ورنہ وہ تمہیں اس کی راہ سے جدا کر دیں گے اس نے تمہیں اسی کا تاکیدی حکم دیا ہے تاکہ تم اللہ کے غضب سے بچ سکو۔''

مطلوبِ مومن راہ:

سورۂ انعام کی مذکورہ بالا آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے مومن و موحد بندوں کو جس سیدھے راستے یا راہ ہدایت پر چلنے کا تاکیدی حکم دیا ہے اس کے موحد بندے نماز کی ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ کی قراءت کے ذریعے اللہ تعالیٰ سے اس کی ہدایت کی درخواست کرتے ہیں:

﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝﴾ (الفاتحة: ٥)

ہمیں سیدھے راستے کی ہدایت فرما ان لوگوں کے راستے کی جن پر تو نے انعام فرمایا ہے۔''

منعم علیہم کی فہرست میں اولیاء اللہ شامل نہیں ہیں:

Marfat.com

اللہ تعالیٰ نے اپنے اور اپنے رسول کے اطاعت گزار بندوں کو اپنے انعام یافتہ جن بندوں کی معیت سے سرفراز فرمانے کا وعدہ کیا ہے ان کی فہرست میں ''اولیا اللہ'' کا ذکر نہیں ہے، اس لیے کہ اللہ کا ہر مومن بندہ ولی ہے، جبکہ اس کے انعام یافتہ بندے اس کے خاص بندے ہیں:

﴿وَ مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَ الشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا﴾ (النساء: ۶۹)

''اور جو اللہ اور رسول کی اطاعت کرے تو یہ اُن لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام فرمایا ہے؛ نبیین اور صدیقین اور شہداء اور صالحین اور یہ لوگ بڑے اچھے ساتھی ہیں۔''

تصوف طریق نبوت نہیں ہے:

باعتراف اکابر صوفیا تصوفت راہ نبوت نہیں، راہ ولایت ہے اگرچہ اس میں اسلام کی بھی کچھ باتیں ہیں، مگر غلط انداز میں، لہٰذا صوفیا طریق نبوت کے پیرو نہیں ہیں اور چونکہ طریق نبوت کے سوا تمام طریقے گمراہی کے راستے اور طریقے ہیں، اس لیے تصوف سیدھا راستہ، یا راہ ہدایت یا اللہ کے انعام یافتہ بندوں کا مسلک نہیں ہے۔

صوفی ولی نہیں ہوسکتا:

صوفیا وحدۃ الوجود، تصور شیخ اور کائنات کے امور میں من گھڑت اولیاء اللہ کے صاحب تصرف ہونے کا عقیدہ رکھنے، فنا و بقا پر عمل پیرا ہونے، رسول اللہ ﷺ کے اختیار کردہ طریقۂ تزکیہ و احسان کو زمانے کے تقاضوں کے بدل جانے کے نتیجے میں ناکافی سمجھنے، اور ذکر و اذکار اور ریاضت کے خودساختہ طریقوں پر عمل کرنے کی وجہ سے اللہ کے ولی نہیں ہوسکتے، اس لیے کہ ولی ہونے کی بنیادی شرط رسول اللہ ﷺ کی غیر مشروط اور مطلق اتباع اور پیروی ہے۔

تزکیۂ نفس صرف طریقۂ نبوی کے ذریعہ ممکن ہے:

عبادات کی قسم کے جتنے طریقے رسول اللہ ﷺ نے اپنے قول و فعل سے بتا دیے ہیں، اسی طرح دلوں کے روگ کا علاج کرنے اور ان کو پاک کرنے کے جتنے طریقے کتاب و سنت میں منصوص ہیں وہی کافی و شافی ہیں، بایں معنیٰ کہ حالات کے بدل جانے کے نتیجے میں ان کو ناکافی سمجھنا اور پھر نئے نئے طریقے ایجاد کرنا محمد بن عبداللہ ﷺ کے رسول ہونے پر ایمان کے منافی ہے۔

شرفِ صحابیت اور اتباعِ رسول:

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو عام مسلمانوں پر جو فضیلت حاصل ہے، وہ صرف رسول اللہ ﷺ کی رفاقت کا نتیجہ نہیں ہے، بلکہ پہلے درجہ میں اللہ و رسول پر ایمان، اور اللہ و رسول کے احکام کی اطاعت اور رسول اللہ ﷺ کی بے چون و چرا پیروی پھر آپ ﷺ کی رفاقت ہے، تنہا آپ کی صحبت و رفاقت نہیں، کیونکہ یہ صحبت و رفاقت منافقین اور کفار کو بھی

Marfat.com

حاصل تھی اور وہ بھی دن و رات آپ کے رخ انور کو دیکھتے تھے اور منافقین تو جمعہ و جماعت میں شریک بھی ہوتے تھے، آپ کی مجلسوں میں حاضری بھی دیتے تھے اور کفار کے خلاف غزوات میں حصہ بھی لیتے تھے، پھر بھی اللہ و رسول کے بہت بڑے دشمن تھے۔

رائپوری کے مغالطے:

عبدالقادر رائپوری برصغیر کے صوفیوں کے اکابر میں شمار ہوتے ہیں یہ عالم دین تو نہیں تھے، لیکن اپنی صوفیانہ ریاضتوں اور اپنے صوفیانہ افکار و نظریات کی وجہ سے اس مقام پر پہنچے کہ مولانا محمد منظور نعمانی نے بھی ان کی خانقاہ کی چوکھٹ پر جبہہ سائی ضروری سمجھی اور تصوف و سلوک کے من گھڑت اعمال و اشغال سے متعلق ان کے مغالطوں کو اپنی کتاب ''تصوف کیا ہے؟'' میں بنظر استحسان نقل کر دینا ضروری خیال کیا ہے تاکہ راہ سلوک کے مسافران پر عمل کر کے اپنی عاقبت سنواریں؟ منظور نعمانی نے اپنی کتاب کے صفحات ۱۲، ۱۳، ۱۴، ۱۵، ۱۶، ۴۸، اور ۴۹ پر صوفیوں کی ایجاد کردہ بدعتوں سے متعلق رائپوری کے مغالطے ''افادات'' کے طور پر نقل کیے ہیں میں اُن کا ایسا خلاصہ بیان کر کے اس پر معروضی تبصرہ کر دینا چاہتا ہوں جس سے جہاں صوفیا کے عقائد کو سمجھنے میں مدد ملے گی وہیں ان کے بارے میں اسلامی نقطۂ نظر بھی ان شاء اللہ واضح ہو جائے گا، فرماتے ہیں:

> ''نبی ﷺ کے زمانے میں محض آپ کی صحبت ہی سے تعلیم و تربیت کی طرح ایمانی کیفیتیں، اللہ تعالیٰ کی محبت اور اس کی رضا کا فکر و خیال حاصل ہو جایا کرتا تھا، مگر بعد میں ماحول کے زیادہ بگڑ جانے اور استعدادوں میں کمی پیدا ہو جانے کی وجہ سے نفس کو توڑنے، شہوتوں کو مغلوب کرنے اور طبیعتوں میں نرمی اور ملاطفت پیدا کرنے کی غرض سے بعض مشائخ نے جہاں اپنی صحبتوں کے ساتھ ذکر و فکر کی کثرت تجویز کی ہے، وہیں خاص قسم کی ریاضتیں اور مجاہدے بھی تجویز کیے ہیں، جو فی نفسہ مقصود اور مامور بہ نہیں ہیں، بلکہ صرف علاج اور تدبیر کے طور پر ہیں اور اگر نبی ﷺ کی وفات کے بعد قرآن پاک کی جمع و تدوین، مدرسوں کے قیام اور نئے نئے علوم کی ایجاد جائز سمجھی گئی تو پھر ان نئے اذکار و اشغال کو بدعت سمجھنا کس طرح صحیح ہو سکتا ہے؟''

> ''اگر دین میں کوئی چیز مقصود اور مامور بہ ہو اور اللہ و رسول نے اس کا حاصل کرنا ضروری قرار دیا ہو، لیکن کسی وقت زمانہ کے حالات بدل جانے سے وہ اس طریقے سے حاصل نہ کی جا سکتی ہو جس طریقے سے رسول اللہ ﷺ اور صحابۂ کرام کے زمانے میں حاصل ہو جایا کرتی تھی، بلکہ اس کے واسطے کوئی اور طریقہ استعمال کرنے کی ضرورت پڑ جائے تو کیا اس نئے طریقے کے استعمال کو بھی آپ دین میں اضافہ اور بدعت کہیں گے؟''

Marfat.com

تبصرہ:

صوفی رائپوری کی مذکورہ بالا تمام باتیں یا تمام دعوے بلا استثنا باطل اور مردود ہیں اور دین سے ان کی عدم واقفیت کے ترجمان ہیں:

۱۔ صوفیانہ اذکار و اشغال اور مجاہدوں اور ریاضتوں کا تعلق عبادات اور تزکیہ نفس اور تہذیب اخلاق سے ہے اور عبادات اپنی تمام تر جزئیات اور تزکیہ نفس وتہذیب اخلاق کے تمام طریقے اسی صورت میں قابل عمل اور عند اللہ معتبر اور مقبول ہیں، جبکہ وہ منصوص ہوں، کیونکہ صرف رسول ہی کو بذریعہ وحی یہ معلوم ہے کہ اللہ کی عبادت کس طرح کی جائے، اس کو یاد کرنے کا صحیح طریقہ کیا ہے، دلوں کا تزکیہ کس طرح کیا جائے اور ان کو لاحق ہونے والی برائیوں اور بیماریوں سے ان کو پاک کس طرح کیا جائے اللہ تعالیٰ نے یہ ذمہ داری صرف رسول اللہ ﷺ کو سونپی تھی جس کو آپ نے کما حقہ ادا کر دیا، ارشاد الٰہی ہے:

﴿كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ﴾ (البقرۃ: ۱۵۱)

''جس طرح ہم نے تمہارے اندر تمہی میں سے ایک رسول بھیجا جو تمہیں ہماری آیتیں پڑھ کر سناتا ہے اور تمہیں پاک کرتا ہے اور تمہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور تمہیں وہ کچھ سکھاتا ہے جو تم نہیں جانتے تھے۔''

آیت مبارکہ میں ''يُزَكِّيْكُمْ'' رسول اللہ ﷺ کے فرض منصبی کا بیان ہے جس میں دلوں کو تمام رذائل، برائیوں اور کجیوں سے پاک کرنا اور تمام فضائل اخلاق سے ان کو سنوارنا داخل ہے۔ مثال کے طور پر نیکی، احسان، صلہ رحمی، صدق گوئی، رحم دلی اور دنیا اور آخرت کی تمام بھلائیوں کا حکم دینا اور عملاً اس کا نمونہ پیش کرنا ''يُزَكِّيْكُمْ'' میں داخل ہے، اسی طرح آپ نے جن رذائل سے منع فرمایا ہے، یعنی گناہوں کی تمام قسموں، قطع رحمی، ظلم و جارحیت، والدین کی نافرمانی، جھوٹ، دھوکہ دہی اور اخلاقی برائیوں کے ارتکاب سے منع کیا ہے، یہ بھی تزکیہ نفس میں داخل ہیں، اور جب رسول اللہ ﷺ نے اپنا یہ فرض منصبی دوسرے فرائض کے ساتھ ادا کر لیا اس کے بعد اس دنیا سے آپ کی رحلت ہوئی۔

۲۔ جس شخص کا یہ عقیدہ ہو کہ دین میں جو چیز مقصود اور مامور بہ ہو اور اللہ و رسول نے اس کا حاصل کرنا ضروری قرار دیا ہو، لیکن کسی وقت زمانہ کے حالات بدل جانے سے وہ اس طریقے سے حاصل نہ کی جا سکتی ہو جس طریقے سے رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے زمانے میں حاصل ہو جایا کرتی تھی، بلکہ اس کے واسطے کوئی اور طریقہ استعمال کرنے کی ضرورت پڑ جائے۔''

تو ایسا عقیدہ رکھنے والا مسلمان نہیں ہے، کیونکہ یہ تکمیل دین کے اعلان الٰہی کے انکار سے عبارت ہے۔

۳۔ یہ دعویٰ کہ نبی ﷺ کے زمانے میں محض آپ کی صحبت ہی سے تعلیم و تربیت کی طرح ایمانی کیفیتیں، اللہ تعالیٰ کی

Marfat.com

محبت اور اس کی رضا کا فکر وخیال حاصل ہو جایا کرتا تھا، مگر بعد میں ماحول کے زیادہ بگڑ جانے اور استعدادوں میں کمی پیدا ہو جانے کی وجہ سے نفس کو توڑنے، شہوتوں کو مغلوب کرنے اور طبیعتوں میں نرمی اور ملاطفت پیدا کرنے کی غرض سے بعض مشائخ نے جہاں اپنی صحبتوں کے ساتھ ذکر وفکر کی کثرت تجویز کی ہے، وہیں خاص قسم کی ریاضتیں اور مجاہدے تجویز کیے ہیں جو فی نفسہ مامور بہ نہیں ہیں، بلکہ صرف علاج اور تدبیر کے طور پر ہیں، اور اگر نبی ﷺ کی وفات کے بعد قرآن پاک کی جمع وتدوین، مدرسوں کے قیام اور نئے نئے علوم کی ایجاد جائز سمجھی گئی تو پھر ان نئے اذکار واشغال کو بدعت سمجھنا کس طرح صحیح ہو سکتا ہے؟

تو یہ دعویٰ سراسر جھوٹ ہے، خلط مبحث ہے اور قیاس مع الفارق ہے، جس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

''یہ دعویٰ بالکل غلط اور سیرت پاک سے عدم واقفیت سے عبارت ہے کہ نبی ﷺ کے زمانے میں محض آپ کی صحبت ہی سے تعلیم وتربیت کی طرح ایمانی کیفیتیں، اللہ تعالیٰ کی محبت اور اس کی رضا کا فکر وخیال حاصل ہو جایا کرتا تھا، کیونکہ قرآنی آیات، احادیث اور سیرت پاک کے واقعات اس بات پر گواہ ہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایمانی کیفیتیں، اللہ تعالیٰ کی محبت اور اس کی رضا کا فکر وخیال نبی ﷺ کی تعلیم و تربیت اور اس تعلیم وتربیت کے قبول اور اس کے مطابق زندگی گزارنے کا نتیجہ تھا اور اس میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اندر فرق مراتب بھی تھا دوسرے لفظوں میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ان صفتوں کا سبب محض صحبت رسول نہیں تھی، بلکہ یہ صحبت ایک خاص امتیاز تھی جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اتباع رسول کے ساتھ حاصل تھی، اگر ان ایمانی کیفیتوں اور اللہ ورسول سے ان کی محبت کا سبب محض صحبتِ رسول ہوتی تو منافقین بھی صحابہ میں شمار ہوتے، مگر اس صحبت کے باوجود ان کا شمار اللہ ورسول کے شدید دشمنوں میں ہوتا ہے۔ معلوم ہوا کہ بحالت ایمان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو رسول اللہ ﷺ کی جو رفاقت حاصل تھی وہ اپنی اس امتیازی شان کے باوجود رسول اللہ ﷺ کی بے چون وچرا پیروی سے ان کو بے نیاز نہیں بناتی تھی، دوسرے لفظوں میں صرف رسول اللہ ﷺ کی صحبت ان کی منفرد ایمانی کیفیتوں کا سبب نہیں تھی، بلکہ اس صحبت ورفاقت کے باوجود ان سے اللہ ورسول کی وہی طاعت، اللہ ورسول سے وہی محبت، رسول اللہ ﷺ کی وہی پیروی اور راہ حق میں وہی ایثار وقربانی مطلوب تھی جو ان کے بعد کے مسلمانوں سے مطلوب ہوئی، آج کے مسلمانوں سے مطلوب ہے اور قیامت تک پیدا ہونے والے مسلمانوں سے مطلبو ہوگی اور ہر دور کے سچے مسلمان، شرف صحابیت کے سوا دوسرے تمام امتیازات سے نوازے جائیں گے۔ حدیث میں عصر صحابہ کے بعد کے مسلمانوں کو رسول اللہ ﷺ نے ''اخوانی'' -میرے بھائی- کا لقب دیا ہے۔ [1]

---

[1] صحیح مسلم: ۲۴۹

Marfat.com

قرآن یہ صراحت کرتا ہے اور بار بار کرتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ صحابہ کرام کو باقاعدہ کتاب و سنت کی تعلیم دیتے تھے اور ان کو دین و شریعت، اللہ تعالیٰ کی محبت سے دلوں کو معمور کرنے، دلوں میں نرمی اور رقت پیدا کرنے اور ان کو حسن اخلاق سے سنوارنے کے لیے تمام ضروری باتیں سکھاتے تھے، یعنی ان کا ''تزکیہ'' فرماتے تھے، چنانچہ قرآن پاک میں آپ کے جو فرائض منصبی بیان ہوئے ہیں ان کی فہرست میں: ''وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ'' ''وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ'' اور ''وَيُزَكِّيْكُمْ'' اور اسی طرح ''وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ'' بھی شامل ہے۔ کیا ان قرآنی تصریحات کے بعد بھی یہ دعویٰ درست اور قابل قبول ہو سکتا ہے کہ ''نبی ﷺ کے زمانے میں محض آپ کی صحبت ہی سے تعلیم و تربیت کی طرح ایمانی کیفیتیں اللہ تعالیٰ کی محبت اور اس کی رضا کا فکر و خیال وغیرہ حاصل ہو جایا کرتا تھا''؟!!

جہاں تک شہوتوں کو مغلوب کرنے اور طبیعتوں میں نرمی اور ملاطفت پیدا کرنے کا تعلق ہے، تو حدیث کی امہات الکتب میں ''کتاب الرقاق'' کے تحت جو احادیث درج ہیں ان پر ایک طائرانہ نظر ڈال کر ہی یہ معلوم کیا جا سکتا ہے کہ یہ حدیثیں دلوں کی بیماریوں کے علاج اور ان کو ان سے پاک کرنے کے ایسے مکمل اور شافی نسخہ کا درجہ رکھتی ہیں جس کو برت کر اور جس پر عمل کر کے ہر انسان، ہر دور اور زمانے میں اللہ کا مومن و موحد اور صالح اور مقبول بندہ بن سکتا ہے۔

۴۔ صوفیانہ اذکار و اوراد اور روحانی اشغال و اعمال اور مجاہدوں اور ریاضتوں کو قرآن پاک کی جمع و تدوین، مدرسوں کے قیام اور نئے نئے علوم کی ایجاد پر قیاس کرنا خلط مبحث بھی ہے اور قیاس مع الفارق بھی؛ اولاً تو قرآن پاک کی کتابت متفرق اجزا کی صورت میں رسول اللہ ﷺ کی حیات پاک میں ہو چکی تھی، اب رہا ایک مصحف میں آیتوں اور سورتوں میں ترتیب کے ساتھ اس کو جمع کرنے کا مسئلہ تو اپنی اہمیت کے باوجود اس پر حیات نبوی میں عمل ممکن نہیں تھا، کیونکہ نزول قرآن کا سلسلہ جاری تھا۔ ثانیاً قرآن کی جمع و تدوین کا کام دینی کام ہونے اور مطلوب و مقصود ہونے کے باوجود اصطلاحی معنی میں عبادت نہیں تھا جس کا اپنی تمام جزئیات کے ساتھ منصوص ہونا ضروری ہو، بلکہ اس کا مقصد محض قرآن کی حفاظت تھا اور یہ مقصد ہر شکل میں حاصل کیا جا سکتا تھا بشرطیکہ اس کی آیتوں اور سورتوں کی ترتیب میں کوئی تبدیلی نہ ہو، اس میں کوئی کمی بیشی نہ ہو اور اس کے الفاظ میں کوئی تحریف نہ ہو۔

اس کے برعکس ذکر و اذکار، روحانی ریاضت اور مجاہدہ وغیرہ کا تعلق خالص عبادت سے ہے، کوئی بھی انسان اپنے ذوق اور اپنے علم سے یہ نہیں معلوم کر سکتا کہ اللہ کو یاد کس طرح کیا جائے، اس سے دعا کس طرح کی جائے، اللہ سے تعلق پیدا کرنے اور اس تعلق کو مضبوط بنانے کے لیے کون سے اعمال انجام دیے جائیں وغیرہ یہ اور اس قبیل کے تمام اعمال رسول اللہ ﷺ کی توجیہ، ارشاد اور عملی نمونے کے محتاج ہیں۔

ذکر و فکر میں کثرت، اگرچہ مقصود و مطلوب ہے، مگر بے ضابطہ نہیں ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ ہر ذکر کو منصوص ہونا

Marfat.com

چاہیے، دوسری بات یہ کہ جس ذکر کا اجر وثواب بیان کیا گیا ہے اسی کو لوگوں سے بیان کیا جائے۔ تیسری بات یہ کہ ذکر کرتے وقت صرف اللہ کو یاد کرنا اور صرف اس کی رضا اور خوشنودی کا حصول مقصود ہو، اگر ذاکر ذکر کے وقت اپنے دل میں اپنے پیر یا شیخ کا خیال اور تصور جمانے کی کوشش کرے گا تو یہ اللہ کا ذکر نہیں رہ جائے گا، بلکہ شرک بن جائے گا۔ چوتھی بات یہ کہ جن اذکار کے اوقات اور تعداد درست اور صحیح ہیں انہیں کی پابندی کی جائے کیونکہ اور کوئی بھی انسان اس بات کا مجاز نہیں ہے کہ وہ اپنے لیے یا دوسروں کے لیے ان کے اوقات اور تعداد کا تعین کرے، یاد رہے کہ من گھڑت اذکار اس دلیل سے درست نہیں ہو سکتے کہ ان کے نتائج بڑے اچھے نکلتے ہیں ایک مومن اللہ و رسول کے حکم کی تعمیل کا مکلف ہے تجربہ اور نتیجہ کی روشنی میں کوئی عبادت ایجاد کرنا شریعت سازی ہے جس کا ارتکاب کرنے والا اللہ و رسول پر ایمان کے دعوے میں جھوٹا ہے۔

۵۔ نبی کریم ﷺ اور عصر صحابہ کے بعد نئے نئے علوم کی ایجاد: مثلاً نحو و صرف، علم تفسیر، علم لغت اور بعد میں طب، انجینئرنگ، جراحت اور نئی نئی صنعتوں کی ایجاد، مدرسوں، کالجوں، یونیورسٹیوں، اسپتالوں وغیرہ کا قیام تو یہ چیزیں ضروری اور اہم ہونے کے باوجود نہ عبادات میں داخل ہیں، نہ نبی ﷺ اور صحابہ کے زمانے میں ان کے امکانات اور وسائل تھے، رہا علم نحو و صرف، علم تفسیر اور علم حدیث وغیرہ تو ان کی ضرورت اس لیے نہیں تھی کہ رسول اللہ ﷺ صحابہ ہی کی زبان بولتے تھے، عربی زبان ان کی اپنی زبان تھی، معلم انسانیت ان کے درمیان تھے اور آپ سے رجوع ہو کر صحابہ کرام دینی احکام معلوم کر لیتے تھے۔ احادیث نبی ﷺ کی زبان مبارک سے سن کر معلوم کر لیتے تھے سب کے سب عدول اور سچے تھے لہٰذا کسی ایسی بات کے آپ کی طرف منسوب ہونے کا امکان نہیں تھا جو آپ ﷺ نے نہ فرمائی ہو، عصر صحابہ کے بعد جب غیر عرب اسلام لانے لگے تو اس وقت نئے علوم کی ضرورت پڑی اور اس ضرورت کے تحت ان کی ایجاد کا آغاز ہوا۔

۶۔ مقاصد اور ذرائع: اذکار و اوراد، اشغال و اعمال اور ریاضتیں اور مجاہدے مقاصد بھی ہیں اور ذرائع بھی اور دونوں صورتوں میں عبادت ہیں مثال کے طور پر نماز مقصد بھی ہے اور اللہ کو یاد کرنے کا ذریعہ بھی:

﴿اِنَّنِیْٓ اَنَا اللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِیْ وَ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ٥﴾ (طٰہٰ: ۱۴)

"درحقیقت میں ہی ہوں اللہ، میرے سوا کوئی معبود نہیں، سو میری ہی عبادت کر اور میری یاد کے لیے نماز قائم کر۔"

اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ﴾ (العنکبوت: ۴۵)

"اور نماز قائم کر درحقیقت نماز بے حیائی اور برائی سے روکتی ہے۔"

Marfat.com

اب اگر کوئی یہ کہے کہ زمانے کے حالات بدل جانے کی وجہ سے اللہ سے غفلت بہت بڑھ گئی ہے اور برائیاں اور بے حیائیاں عام ہو گئیں ہیں اور اللہ و رسول نے جو نمازیں پڑھنے کا حکم دیا ہے یا بطور نوافل جن کی اجازت دی ہے وہ کافی نہیں رہیں لہٰذا کچھ نئی نمازیں ایجاد کر لینا اور ان کے لیے نئی ہیئتیں مقرر کر لینا بدعت نہیں، خاص طور پر علاج اور تدبیر کے طور پر تو اس کی یہ بات اس کے منہ پر مار دی جائے گی اور اس شریعت سازی کے نتیجے میں اس کو اسلام سے خارج کر دیا جائے گا، کیونکہ ایسا شخص دین کی تکمیل کے اعلان الٰہی کا منکر ہے۔

ویسے یہ صرف مفروضہ نہیں ہے، بلکہ صوفیا نے بہت سی نمازیں ایجاد کر بھی لی ہیں۔ ❶

ایک سوال:

اگر رائپوری نے دین کا علم نہ رکھنے کی وجہ سے یہ ساری بکواس کی بھی تھی تو مولانا منظور نعمانی کو کیا ہو گیا تھا کہ ان کی اصلاح کرنے اور ان کو صحیح بات سمجھانے اور بتانے کے بجائے ان کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے یہ فرما دیا:

''نہیں، دین میں اضافہ جب ہوتا، جبکہ مقصود اور امر شرعی بنا کر کیا جاتا، لیکن اگر کسی دینی مقصد کے حاصل کرنے کے لیے قدیمی طریقے ناکافی ہو جانے کی وجہ سے کوئی نیا جائز طریقہ اختیار کر لیا جائے تو اس کو دین میں ''اضافہ'' نہیں کہا جائے گا اور نہ وہ بدعت ہو گا۔''

کیا اس زہر آلود عبارت میں ''قدیمی طریقے ناکافی ہو جانے کی وجہ سے'' کے فقرے کی زد براہ راست اللہ و رسول یا کتاب و سنت پر نہیں پڑتی؟ اور کیا اللہ و رسول کے بتائے ہوئے طریقے کو قدیمی اور ناکافی طریقہ قرار دینے والا مسلمان ہے عالم دین ہونا تو دور کی بات ہے اور کیا اللہ و رسول کے بتائے ہوئے طریقے کے مقابلے میں کوئی طریقہ جائز بھی ہو سکتا ہے؟!!

مشائخ کون ہیں؟

تصوف کی کتابوں میں جن لوگوں کا ذکر مشائخ کہہ کر کیا جاتا ہے وہ کون ہیں، ان کی صفات کیا ہیں اور کیا ان کو بھی شریعت سازی کا اختیار حاصل ہے؟ اگر اس کا جواب اثبات میں ہے تو قرآن پاک کی کس آیت، یا کس حدیث میں ان کا ذکر آیا ہے؟ اور اگر جواب نفی میں ہے اور یہی حق ہے تو پھر ان کے نام پر لوگوں کو گمراہ کیوں کیا جاتا ہے؟ اور ان کو یہ حق کیوں دیا جاتا ہے کہ وہ نئے نئے اذکار ایجاد کریں اور ان کو وسائل و ذرائع کا نام دے کر ضروری قرار دیں۔

صوفیا اہل سنت و جماعت نہیں ہیں:

پہلی دلیل:...... صوفیا کے اہل سنت و جماعت نہ ہونے کی پہلی دلیل یہ ہے کہ حدیث سے تعلق کے حوالہ سے ان کا طرز عمل اہل سنت و جماعت، محدثین اور متقدمین فقہاء کے طرز عمل سے مختلف ہے۔ ان کے نزدیک کتاب و سنت

❶ روشنی، ص: ۱۳۲۔۱۸۱

Marfat.com

یکساں درجہ میں مآخذ شریعت ہیں، کیونکہ قرآن کے مطابق رسول اللہ ﷺ کی اطاعت اسی طرح فرض ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کی اطاعت فرض ہے، جبکہ صوفیا کے نزدیک حدیث کی تعلیم اور اس کی کتابت دنیا داری ہے ابوسلیمان بعدالرحمٰن دارانی کا قول ہے: ''جس کسی نے تین چیزیں کیں وہ دنیا کی طرف مائل ہوگیا؛ جس نے معاش کے لیے کوشش کی، عورت سے شادی کی، یا حدیث کی کتابت کی۔'' ان کا یہ بھی قول ہے کہ ''میں نے اپنے ساتھیوں میں سے کسی کو نہیں دیکھا کہ اس نے شادی کی ہو اور اپنے مقام پر قائم رہ سکا ہو'' ❶

دارانی کے اس قول کو ایک شخص کا قول نہیں سمجھنا چاہیے، بلکہ تمام صوفیوں کا عقیدہ سمجھنا چاہیے اس لیے کہ صوفیا اپنے اکابر کے اقوال کو وحی الٰہی سے کم نہیں سمجھتے اس تناظر میں ان میں سے کسی ایک کی بات بھی قابل ردّ کیا قابل تنقید بھی نہیں ہوتی اس کی دلیل یہ ہے کہ حلاج اور ابن عربی اپنے کفریہ اقوال وافکار کے باوجود اولیاء اللہ میں شمار ہوتے ہیں۔

دوسری دلیل:......بذریعہ کشف حدیث کے ثبوت و عدم ثبوت کا حکم:

احادیث کی صحت و سقم اور رسول اللہ ﷺ سے ان کی نسبت کو معلوم کرنے کا ذریعہ علم الاسناد ہے جو ان محدثین اور نقاد رجال کا وضع کردہ ہے جن کی پوری زندگی حدیثوں کی تحصیل، ان کی روایت اور راویان حدیث کے حالات کی چھان بین اور ان کی ثقاہت و عدم ثقاہت کی نقاب کشائی میں گزری ہے۔ محدثین کا گروہ اس اعتبار سے مسلمانوں کا مقدس ترین گروہ رہا ہے جو کتاب و سنت سے ماخوذ خالص اور بے آمیز عقائد رکھنے کے ساتھ ساتھ متبع سنت رسول بھی تھا وہ حدیثوں کے راویوں کو ثقہ اور ضعیف قرار دیتے ہوئے اپنے ذاتی رجحانات، اپنی پسند اور ناپسند اور مسلک و مذہب سے وابستگی سے بہت بلند ہو کر کوئی حکم لگاتے تھے اور راویوں کے حق میں ان کی جرح و تعدیل ان کے اجتہادات پر نہیں، بلکہ ان کے مشاہدات اور تجربات پر مبنی ہوتی تھی۔ ان محدثین اور نقاد رجال کی حق گوئی، صدق بیانی اور دیانت داری کا اعتراف غیر مسلم مغربی مورخین اور مستشرقین نے بھی کیا ہے۔ لہٰذا کسی حدیث کی صحت و سقم معلوم کرنے کا واحد ذریعہ علم الاسناد ہے جو علم روایت کے ساتھ علم درایت سے بھی عبارت ہے۔

صوفیا کی اکثریت حدیث کی روایت و درایت کے علم سے تہی دامن ہونے کے ساتھ ساتھ کشف اور ''علم لدنی'' کی مدعی رہی ہے اور ہے اور اکابر صوفیا ''اصول حدیث'' کے بجائے بذریعہ کشف احادیث کو صحیح اور ضعیف قرار دینے کے خوگر رہے ہیں، نیز صوفیا کی کتابوں میں ''علم لدنی'' کا ذکر بھی بہت ملتا ہے اس علم سے ایسا علم مراد ہے جو ان کے نزدیک کسی واسطہ کے بغیر اللہ تعالیٰ سے براہ راست حاصل ہو جاتا ہے یہ علم بھی صوفیا کے نزدیک ماخذ شریعت ہے۔ اس علم کی دلیل وہ سورۂ کہف میں مذکور خضر علیہ السلام کے واقعہ سے دیتے ہیں جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَ عَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا﴾ (الکھف: ۶۵) ''اور ہم نے اسے اپنے پاس سے ایک علم سکھایا۔''

❶ عوارف المعارف، ص: ۱۶۵ بحوالہ تصوف اور شریعت، ص ۲۶

Marfat.com

خضر اللہ کے مامور بندے تھے اللہ تعالیٰ نے کائنات کے مخفی امور میں سے بعض امر کی نقاب کشائی کی غرض سے ان کو جلیل القدر رسول موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ لگایا تھا اور اسلامی شریعت سے متصادم ان کے اعمال بیان کرنے سے پہلے ہی یہ فرما دیا تھا کہ ''ہم نے اسے اپنے پاس سے ایک علم سکھایا ہے۔'' تاکہ ان اعمال کی تفصیلات جاننے سے پہلے ہی یہ معلوم رہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو ایک خاص علم سے سرفراز فرما دیا ہے جو علم شریعت نہیں ہے، کیونکہ علم شریعت رسولوں کو فرشتوں کے ذریعہ دیا جاتا ہے اور یہ علم حاصل کرنے کے لیے موسیٰ علیہ السلام خضر کے محتاج نہیں تھے اس میں تو وہ ان سے بہت افضل تھے۔ فرمایا:

﴿قَالَ يٰمُوْسٰٓى اِنِّي اصْطَفَيْتُكَ عَلَي النَّاسِ بِرِسٰلٰتِيْ وَ بِكَلَامِيْ﴾ (الاعراف: ۱۴۴)

''اے موسیٰ! درحقیقت میں نے تجھے لوگوں پر اپنے پیغامات اور اپنے کلام کے ذریعہ فضیلت بخشی ہے۔''

کہاں خضر علیہ السلام اور کہاں صوفیا؛ چہ نسبت خاک را بعالم پاک؟ اگر ''علم لدنی'' رسولوں میں سے اللہ کے کسی صالح بندے یا بعض بندوں کو دیا بھی جا سکتا تھا تو وہ صوفیا تو ہرگز نہیں ہو سکتے، کیونکہ یہ کتاب و سنت کی تعلیمات سے بہت دور ہیں، بلکہ سب سے زیادہ دور ہیں۔

خضر اور ولی کی ملاقات کا ایک جھوٹا واقعہ:

''ابدال میں سے ایک شخص نے حضرت خضر سے دریافت کیا کہ کیا تم نے اپنے سے زیادہ مرتبے والا کوئی ولی بھی دیکھا ہے؟ فرمانے لگے: ہاں دیکھا ہے، میں ایک مرتبہ مدینہ طیبہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد میں حاضر تھا، میں نے امام عبدالرزاق محدث کو دیکھا کہ وہ احادیث سنا رہے ہیں اور مجمع ان کے پاس احادیث سن رہا ہے اور مسجد کے ایک کونے میں ایک جوان گھٹنوں پر سر رکھے علیحدہ بیٹھا ہے۔ میں نے اس جوان سے کہا کہ تم دیکھتے نہیں کہ مجمع حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں سن رہا ہے، تم ان کے ساتھ شریک نہیں ہوتے۔ اس جوان نے نہ تو سر اٹھایا نہ میری طرف التفات کیا اور کہنے لگا: اس جگہ وہ لوگ ہیں جو رزاق کے عبد سے حدیثیں سنتے ہیں اور یہاں وہ ہیں جو خود رزاق سے سنتے ہیں نہ کہ اس کے عبد سے۔ حضرت خضر نے فرمایا: اگر تمہارا کہنا حق ہے تو بتاؤ کہ میں کون ہوں؟ اس نے اپنا سر اٹھایا اور کہنے لگا کہ اگر فراست صحیح ہے تو آپ خضر ہیں۔'' حضرت خضر فرماتے ہیں: اس سے میں نے یہ جانا کہ اللہ جل شانہ کے بعض ولی ایسے بھی ہیں جن کے علو مرتبے کی وجہ سے میں ان کو نہیں پہچانتا، حق تعالیٰ شانہ ان سے راضی ہو اور ہم کو بھی ان سے نفع پہنچائے۔''[1]

میں نے یہ واقعہ نقل کرنے سے قبل ہی اس کے جھوٹ ہونے کا حکم لگا دیا ہے، اگرچہ اس کے ناقل مولانا زکریا کے نام کے ساتھ امام، محدث اور قطب الارشاد بھی لکھا جاتا ہے۔ موصوف کو یہ بات معلوم رہی ہو گی کہ اللہ کے برگزیدہ بندے رسول بھی اللہ تعالیٰ سے براہ راست اس کا کلام نہیں سنتے تھے صرف موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے ایک بار اپنی

[1] فضائل اعمال، فضائل حج، ص: ۱۲۸-۱۲۹

Marfat.com

ہم کلامی کا شرف بخشا ہے جس کا ذکر قرآن پاک میں متعدد مقامات پر آیا ہے۔

مولانا زکریا صاحب کو یہ بدیہی بات بھی معلوم رہی ہوگی کہ حدیث قول رسول، فعل رسول اور تقریر رسول کو کہتے ہیں، ایسی صورت میں اللہ تعالیٰ سے براہ راست حدیثیں سننے کا دعویٰ کرنے والا بہروپیا ''ولی'' کس طرح ہوسکتا ہے؟ اس لیے کہ مذکورہ تعریف کی رو سے حدیث یا تو رسول اللہ ﷺ کا کلام ہے یا کسی صحابی کا، نہ کہ اللہ تعالیٰ کا۔

مولانا زکریا نے یہ جھوٹا واقعہ ''ابدال میں سے ایک شخص نے حضرت خضر سے دریافت کیا'' فرما کر اپنی حدیث دانی کا مذاق اڑایا ہے، کیونکہ یہ انداز بیان کسی ایسے شخص کا نہیں ہوسکتا جس کا علم حدیث سے کوئی معمولی سا بھی تعلق ہو محدث ہونا تو بہت بڑی بات ہے، پھر اس واقعہ سے محدثین کی تحقیر کی گئی ہے، ان کے طریقۂ روایت کی قدر و قیمت گھٹائی گئی ہے، صوفیا کے من گھڑت اور خود ساختہ ابدال، اقطاب، اغواث وغیرہ کا وجود ثابت کیا گیا ہے، اور ان کو خضر پر فوقیت دینے کی کوشش کی گئی ہے اور صوفیا کے اس دعوے کو صحیح ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ خضر زندہ ہیں، ولی ہیں اور صوفیا کے ولیوں سے ملتے رہتے ہیں اور اس واقعہ کا سب سے بڑا نشانہ حدیث کی تشریعی حیثیت ہے جس کی تفصیل یہ ہے کہ محدثین کے حلقوں میں روایت حدیث اور سماع حدیث کا جو طریقہ رائج رہا ہے وہ اولیاء اللہ کا طریقہ نہیں ہے، اولیاء اللہ کا طریقہ یہ ہے کہ وہ براہ راست اللہ تعالیٰ سے حدیثیں سنتے ہیں، ان کے اور اللہ کے درمیان بندوں کا واسطہ نہیں ہوتا اس تناظر میں محدثین کے مروّجہ اصول روایت کے مطابق مروی احادیث کو ''من گھڑت اولیاء'' اپنے کشف کی بنیاد پر یا ''علم لدنی'' کی روشنی میں ردّ کر دینے کے مجاز ہیں، میں نے اس جھوٹے واقعہ سے جو استنتاج کیا ہے اس کی تائید حافظ جلال الدین سیوطی کے بیان کردہ اس واقعہ سے ہوتی ہے جس کا ذکر انہوں نے اپنی کتاب "الحادی للفتاوی" میں کیا ہے، لکھتے ہیں:

> ''بعض اولیاء کا یہ واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ وہ ایک فقیہ کی مجلس میں حاضر ہوئے جس نے ایک حدیث بیان کی تو مذکورہ فقیہ سے اس ''ولی'' نے کہا: ''یہ حدیث باطل ہے۔'' اس پر فقیہ نے ولی سے دریافت کیا کہ تم کو کہاں سے یہ معلوم ہوا؟ ولی نے جواب دیا: ''یہ نبی ﷺ تمہارے سر پر کھڑے ہیں اور فرما رہے ہیں: میں نے یہ حدیث بیان نہیں کی۔'' پھر اس ولی نے فقیہ پر کشف کیا تو اس نے بھی رسول اللہ ﷺ کو دیکھا۔'' (۱)

یہ ولی تو کچھ متواضع تھا، اگر امام العصر علامہ کشمیری ہوتے تو یہ فرماتے کہ ''میں اللہ تعالیٰ کو تمہارے سر پر کھڑا دیکھ رہا ہوں جو فرما رہا ہے کہ یہ حدیث باطل ہے۔'' کیا یہ نزول وحی کی حدیث میں ''صلصلة الجرس'' کو اللہ تعالیٰ کی آواز نہیں قرار دے چکے ہیں، جس کو اوپر تفصیل سے بیان کیا جاچکا ہے۔

دراصل بذریعہ کشف حدیث کی تصحیح و تضعیف نے اس دوسرے شرعی ماخذ کی ہیبت دلوں سے نکال دی ہے اور اس

(۱) ص ۱۹۷، ج ۲

Marfat.com

کی بنیاد پر صحیح ترین حدیثوں کا انکار کر دیا گیا ہے اور باطل اور جھوٹی روایتوں کو ماخذ شریعت قرار دے دیا گیا ہے جس کی مثالوں سے تصوف کی کتابیں بھری پڑی ہیں اور مولانا زکریا کی کتاب فضائل اعمال اس موضوع پر ''شاہکار'' کا درجہ رکھتی ہے جس میں مذکور روایات کم از کم پچاس فیصد اور اولیاء اللہ کے فضائل و مناقب سو فیصد جھوٹ ہیں اور حدیثوں کے درجات کے بیان میں انہوں نے اولاً تو یہ بددیانتی کی ہے کہ ان کا ضعف بہت گھٹا کر بیان کیا ہے ثانیاً یہ درجات عربی میں بیان کیے ہیں، جبکہ ''فضائل اعمال'' کے قارئین نوے فیصد عربی زبان سے نابلد ہیں اسی طرح اس میں منقول روایتوں کو حدیث رسول ہی سمجھ کر پڑھا جاتا ہے اور ان کو سچ مان کر ان کی تبلیغ کی جاتی ہے۔

دروغ گورا حافظہ نہ باشد:

مولانا زکریا نے زیر نظر واقعہ میں پہلے تو مسجد کے کونے میں صرف ایک جوان کو بیٹھا ہوا دکھایا ہے اور بعد میں اللہ سے حدیثیں سننے والوں کو جمع کر دیا ہے: ''اس جگہ وہ لوگ ہیں جو رزاق کے عبد سے حدیثیں سنتے ہیں اور یہاں وہ ہیں جو خود رزاق سے سنتے ہیں۔''

حدیث کا نور:

بلاشبہ صحیح حدیث سے روشنی بھی نکلتی ہے اور اس سے خوشبو بھی پھوٹتی ہے، مگر اس روشنی کو دیکھنے اور اس خوشبو کو سونگھنے کی قدرت و صلاحیت اللہ تعالیٰ کے انہی بندوں میں ہوتی تھی، جن کو دنیا محدثین کے نام سے جانتی ہے، اللہ کے یہ صالح بندے اپنے عقیدہ و عمل میں سنت کے متبع ہونے کے ساتھ ایسے تھے کہ ان کی پوری زندگی خدمت حدیث کے لیے وقف تھی اور ان کے شب و روز ان کے اعلیٰ اور غیر معمولی صلاحیتوں، حیرت ناک ذہانت اور نادر المثال قوتِ حافظ کے ساتھ حدیث کے درس و مطالعہ، راویان حدیث کے حالات اور روایتِ حدیث میں ان کی اہلیت و عدم اہلیت کی بحث و تحقیق میں گزرتے تھے، اگر اس طرح کے پاکباز اور صالح انسانوں میں سے کسی عظیم المرتبت امام حدیث کی نسبت سے یہ بیان کیا جائے کہ وہ حدیث کے الفاظ سن کر ہی ان سے نکلنے والی روشنی دیکھ کر اور ان سے پھوٹنے والی خوشبو سونگھ کر یہ محسوس کر لیتا تھا کہ یہ حدیث رسول ہے یا نہیں، جس طرح ایک ماہر جوہری اصلی ہیرے اور نقلی ہیرے پر ایک طائرانہ نظر ڈال کر ہی پورے یقین کے ساتھ یہ بتا دیتا ہے کہ یہ اصلی ہے اور یہ نقلی۔

لیکن ایک صوفی جس کے عقائد غیر اسلامی ہیں، جس کے اوراد و اذکار اور ریاضتیں من گھڑت ہیں اور جو توحید ناآشنا ہے، مزید یہ کہ اس کو حدیث اور غیر حدیث کا کوئی معمولی سا بھی علم حاصل نہیں ہے، بلکہ ان پڑھ ہے۔ اس کو کوئی حدیث سن کر یہ کس طرح معلوم ہو سکتا ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے اور یہ ضعیف ہے اور موضوع۔ اس وضاحت کے بعد درج ذیل دعویٰ پڑھیے اور سر دھنیے:

''شیخ عبدالعزیز دباغ ابھی قریب ہی زمانہ میں ایک بزرگ گزرے ہیں جو بالکل امی تھے، مگر قرآن شریف

Marfat.com

کی آیت، حدیث قدسی، حدیث نبوی اور موضوع حدیث کو علیحدہ علیحدہ بنا دیتے تھے اور کہتے تھے کہ متکلم کی زبان سے جب لفظ نکلتے ہیں تو ان الفاظ کے نور سے معلوم ہو جاتا ہے کہ کس کا کلام ہے اللہ پاک کے کلام کا نور علیحدہ ہے اور حضور ﷺ کے کلام کا نور دوسرا ہے اور دوسرے کلاموں میں یہ دونوں نور نہیں ہوتے۔'' ❶

مبالغہ، بلکہ جھوٹ کی بھی ایک حد ہوتی ہے، کاش مولانا زکریا صاحب اپنی کتاب ان کو سنا کر اس میں درج جھوٹی روایتوں اور جھوٹے واقعات کے بارے میں ان کی رائے معلوم کر لیتے اور اگر ان کی وفات ہو چکی تھی تو ان کی قبر پر بیٹھ کر ان کو پوری کتاب سنا دیتے اور وہ پردۂ غیب سے ان کو یہ بتا دیتے کہ فلاں روایات اور واقعات صحیح ہیں اور فلاں جھوٹ، کیونکہ ان کا عقیدہ ہے کہ ''عاشق یا صوفی مرتے نہیں ہیں۔'' ❷

اگر مولانا نے ایسا کر لیا ہوتا تو فضائل اعمال سے لاکھوں انسان گمراہ نہ ہوتے۔

تیسری دلیل:...... عقیدہ وعمل کا ماخذ کتاب وسنت نہیں:

صوفیا کے اہل سنت و جماعت نہ ہونے کی تیسری دلیل یہ ہے کہ یہ فقہی مسائل میں امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے مقلد ہیں، عقائد میں اشعری اور ماتریدی کے اور سلوک میں نقشبندیہ، چشتیہ، قادریہ اور سہروردیہ کے۔ ❸ مولانا خلیل احمد نے مذکورہ تینوں باتوں کی صراحت کرنے کے بعد لکھا ہے:

((فلو ادعی احد من العلماء إنا غلطنا فی حکم فإن کان من الاعتقادیات فعلیه أن یثبت بنص من ائمة الکلام و إن کان من الفرعیات فیلزم أن یبنی بنیانه علی القول الراجح من ائمة المذاهب))

''اور اگر کوئی عالم یہ دعویٰ کرے کہ ہم سے کسی حکم میں غلطی ہوئی ہے، تو اگر یہ غلطی اعتقاد کے قبیل سے ہے تو اس پر یہ لازم ہے کہ وہ اپنے دعویٰ کی صحت ائمہ کلام کی نص سے ثابت کرے اور اگر یہ غلطی فروعی مسائل سے متعلق ہے تو وہ اپنے دعویٰ کو ائمہ مذاہب کے راجح قول پر مبنی قرار دیتے ہوئے ثابت کرے۔'' ❹

علماء دیوبند کے ایک دوسرے بڑے عالم محمد ادریس کاندھلوی ہیں جو تصوف اور تبلیغ کے امام مانے جاتے ہیں، مولانا خلیل کی طرح دوسرے دینی علوم کے ساتھ موصوف حدیث کے بھی بہت بڑے عالم مانے جاتے ہیں، امام العصر علامہ کشمیری نے ان کی شرح مشکوٰۃ، ''تعلیق الصبیح'' کو ان الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا ہے:

---

❶ فضائل اعمال، فضائل ذکر، ص: ۳۵۴

❷ فضائل صدقات، ص: ۶۷۶

❸ المهند علی المفند، ص: ۳۰-۳۱ ❹ ص: ۳۲

Marfat.com

''علامہ مولانا محمد ادریس کاندھلوی کی شرح مشکوٰۃ کی مانند کوئی شرح روئے زمین پر موجود نہیں ہے۔'' ❶

یہی محدث کاندھلوی انسان کامل کی صفات بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''آدمی جب کامل ہوتا ہے جب اس میں تین صفتیں موجود ہوں؛ اس کا علم فقہاء جیسا ہو، عبادت اولیاء جیسی ہو اور اس کے اعتقادات متکلمین جیسے ہوں۔'' ❷

فقہاء سے موصوف کی مراد فقہائے احناف ہیں، کیونکہ احناف دوسرے مسلکوں کے علماء کو فقیہ نہیں مانتے، بلکہ یہ ان کے ائمہ کو بھی فقیہ نہیں مانتے۔ پھر تفقہ فی الدین تو مطلوب ہے، لیکن روایتی فقہاء کو اس سے موصوف مان کر ان کے علم کی تمنا کرنا اس لیے درست نہیں ہے کہ ان کو جو علم حاصل رہا ہے وہ کتاب وسنت کا علم نہیں، بلکہ ان کے مسلک کے فقہی مسائل کا علم تھا جو ''تقلید محض'' ہے اور تقلید علم نہیں ہے اور مقلد عالم نہیں ''إمعۃ'' طفیلی ہے۔

اولیاء سے شیخ کاندھلوی کی مراد صوفیا ہیں، کیونکہ اہل تصوف کے نزدیک کوئی غیر صوفی ''ولی'' نہیں ہوسکتا، اور صوفیا کی جو عبادتیں ثابت ہیں وہ بھی اپنی مبالغہ آمیزی اور اضافی ملاوٹوں کی وجہ سے سنت نہیں رہیں میرے اس دعوے کی دلیل تصوف کی کتابوں میں مذکور خاص طور پر فضائل اعمال میں بیان کردہ صوفیا کی عبادتیں ہیں۔

شیخ کاندھلوی نے متکلمین کے عقائد رکھنے والے کو انسان کامل کہہ کر یہ ثابت کر دیا ہے کہ ان کے نام کے ساتھ ''محدث'' کا لقب بے جوڑ ہے، کیونکہ متکلمین کے عقائد اہل سنت و جماعت کے عقائد نہیں ہیں، بلکہ ان کے ائمہ: امام ابوحنیفہ، امام ابو یوسف اور امام محمد ﷭ کے عقائد بھی نہیں ہیں اس طرح عقائد میں متکلمین سے اپنا رشتہ جوڑ کر انہوں نے اپنے ائمہ سے اپنا ناتا توڑ لیا ہے۔

یہاں میں قارئین کے علم میں یہ بات لانا چاہتا ہوں کہ امام طحاوی حنفی رحمہ اللہ نے عقیدہ پر جو مختصر، مگر جامع کتاب لکھی ہے اور جو ''عقیدۂ طحاویہ'' کے نام سے معروف ہے اس کے شروع میں انہوں نے یہ تصریح کر دی ہے کہ اس میں انہوں نے جو عقائد بیان کیے ہیں وہ امام ابوحنیفہ، امام ابو یوسف اور امام محمد کے عقائد ہیں، اور یہی اہل سنت و جماعت کے عقائد بھی ہیں، جن کے حقیقی نمائندے محدثین تھے اور ہیں اور ان عقائد میں سے کوئی بھی عقیدہ اہل کلام کا عقیدہ نہیں ہے۔ یہ کتاب علامہ ابن ابی العز حنفی کی شرح کے ساتھ اور شرح کے بغیر ہر جگہ دستیاب ہے۔ جس کو پڑھ کر قارئین میری ان باتوں کی تاکید کر سکتے ہیں اس سے صوفیا کی بدعقیدگی بھی معلوم ہو جائے گی۔

یہاں جو بات قابل غور ہے وہ یہ کہ خلیل احمد اور ادریس کاندھلوی نے محدث کا لقب رکھتے ہوئے بھی عقائد میں اپنا انتساب محدثین کی طرف نہیں کیا ہے، جبکہ محدثین ہی صحتِ عقیدہ، استقامت علی الحق، راست گوئی اور اتباع سنت میں اہل سنت و جماعت کے حقیقی ترجمان تھے۔

---

❶ اکابر علماء دیوبند، ص: ۲۱۹ ❷ ص: ۲۸۶

Marfat.com

متکلمین اہل سنت و جماعت نہیں ہیں:

اہل سنت و جماعت اور متکلمین کے عقائد میں مناسب مقام پر بڑی تفصیل سے بیان کر چکا ہوں، لیکن چونکہ مولانا خلیل اور صوفی ادریس نے اپنے عقائد کا ماخذ علم کلام کو قرار دیا ہے، اس لیے یہاں مختصراً دوبارہ یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ اہل کلام کا شمار اہل سنت و جماعت میں نہیں ہوتا، کیونکہ اہل سنت و جماعت کا اطلاق صحابہ، تابعین، ائمہ حدیث اور ائمہ فقہ پر ہوتا ہے، ائمہ فقہ سے مراد متقدمین فقہائے احناف اور غیر احناف ہیں اور متکلمین ان کے عقائد نہیں رکھتے تھے، زیادہ واضح لفظوں میں متکلمین کے عقائد خالص اور بے آمیز اسلامی عقائد نہیں ہیں، اس لیے کہ یہ عقائد کتاب وسنت سے ماخوذ نہیں، بلکہ خالص عقلی اور فلسفیانہ ہیں، متکلمین، صحابہ، تابعین اور محدثین کی طرح اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کو ان کے حقیقی معنوں میں نہیں لیتے، بلکہ ان کی تاویل کرتے ہیں، متکلمین اشاعرہ اللہ تعالیٰ کی صرف سات صفات: حیات، علم، قدرت، ارادہ، سمع، بصر اور کلام کے قائل ہیں اور ماتریدی متکلمین نے ان میں ایک نئی صفت ''تکوین'' کا اضافہ کر کے ان کی تعداد آٹھ کر دی ہے، رہیں بقیہ صفات تو یہ دونوں ان کے منکر ہیں۔

رہے اہل سنت و جماعت تو وہ اس طریقے کے متبع اور پیرو ہیں جو نبی ﷺ اور آپ کے اصحاب کا طریقہ تھا اور یہ طریقہ کتاب وسنت میں اس طرح کھول کر بیان کر دیا گیا ہے کہ اس کا کوئی بھی پہلو مبہم نہیں رہا ہے۔ اسی طریقے پر تابعین، محدثین اور متقدمین فقہاء گامزن رہے ہیں اور یہی ان لوگوں کا بھی طریقہ ہے جو اسلاف کو اپنے عقیدہ وعمل میں ''نمونہ'' مانتے ہیں۔

اہل سنت و جماعت کو یہ نام سنت کی پیروی اور اس پر متفق رہنے کی وجہ سے ملا ہے اور یہ ایک مسلمہ اور ناقابل تردید حقیقت ہے کہ عقائد، غیبیات پر ایمان اور احادیث کو دلیل و حجت ماننے میں صحابہ، تابعین اور محدثین اور ان کے مسلک پر چلنے والوں کے مابین جو مثالی اتفاق ہے وہ اتفاق اسلام سے نسبت کا دعویٰ کرنے والے کسی بھی فرقے میں نہیں ہے اور اس عدم اتفاق میں اہل کلام سب پر برتری رکھتے ہیں۔

چوتھی دلیل:......حدیث کے قبول ورد میں دوہرا معیار:

صوفیا روضۂ شریفہ کا غبار تو بطور سرمہ اپنی آنکھوں میں ضرور لگاتے ہیں ❶ اور نبی کریم ﷺ کی قبر مبارک کو عرش و کرسی اور کعبہ سے افضل تو ضرور مانتے ہیں ❷ لیکن احادیث کو علی الاطلاق دلیل و حجت نہیں مانتے، بلکہ ان کے قبول ورد میں ''دوہرا معیار'' رکھتے ہیں؛ اگر حدیث ان کے امام کے قول کے مطابق ہے تو قابل قبول ہے اور اگر مطابق نہیں ہے تو ناقابل التفات یا قابل تاویل ہے جس کی مثالوں سے فقہ کی کتابیں بھری پڑی ہیں۔

---

❶ نقش حیات: ۲-۱۰۲-۱۰۳۔

❷ المهند علی المفند، ص: ۳۶-۳۷، امداد الفتاوی: ۶/۱۱۳

Marfat.com

اس کے برعکس صوفیا نے اپنے خود ساختہ فضائل اعمال، خود ساختہ اوراد و اذکار، صحابہ، تابعین، ائمہ کے مناقب اور دوسرے دینی امور کے باب میں دل کھول کر ایسی بے اصل، جھوٹی اور باطل روایتوں کی ترویج کی ہے جن سے ان کے گمراہ کن اور فاسد عقائد کی تائید ہوتی ہے، میرے اس دعوی کی تائید مولانا زکریا کی فضائل اعمال سے ہوتی ہے۔

پانچویں دلیل:...... قرآن کے خلاف بدزبانی:

قرآن پاک اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور اس کا حرف حرف اور لفظ لفظ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، پورا قرآن پاک سورۂ فاتحہ سے لے کر سورۂ ناس تک اپنے حروف، الفاظ اور معانی کے ساتھ بذریعہ جبرائیل امین رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوا ہے، اس میں کوئی ایک حرف بھی نہ باہر سے داخل ہوا ہے، نہ اپنے نزول کے بعد سے اب تک اس کا کوئی حرف اس میں سے ضائع ہوا ہے اور نہ قیامت تک ضائع ہوگا اور اس کی آیتیں اور سورتیں جس طرح اپنے نزول کے وقت مرتب تھیں اور رسول اللہ ﷺ ان کی تلاوت کرتے تھے یہ ترتیب بلا ادنیٰ تبدیلی کے دنیا کے ہر حصے میں متداول اس کے نسخوں اور حفاظ کے سینوں میں محفوظ ہے اور قیامت تک محفوظ رہے گی۔

اللہ تعالیٰ کا کلام ہونے کی وجہ سے قرآن کے کسی ایک بھی جملے، اور ایک بھی آیت کے بارے میں کوئی بدزبانی یا بے ادبی، اسی طرح اس میں بیان کردہ احکام میں سے کسی حکم کی قدر و قیمت گھٹانے کی کوئی کوشش یا اس کی اہمیت کم کرنے کی غرض سے یہ کہنا کہ یہ حکم اس میں صرف ایک بار آیا ہے ایک انسان کو دائرہ اسلام سے خارج کر دیتا ہے، کیونکہ یہ اس کے اللہ کا کلام ہونے پر ایمان کے منافی ہے۔

مولانا زکریا نے فضائل اعمال میں دوسرے دینی موضوعات کی طرح تلاوت قرآن اور سورتوں کے فضائل کے بیان میں جھوٹی روایتوں کا انبار لگا دیا ہے، جس کی وجہ سے یہ کتاب لوگوں کے عقیدہ و عمل کی اصلاح کے بجائے ان کے اضلال و افساد کا سبب بن گئی ہے، بایں ہمہ انہوں نے صوفیا کی من گھڑت رہبانیت اور ترک دنیا کے عقیدے سے متعارض ایک قرآنی آیت کا جن الفاظ میں ذکر کیا ہے وہ ان کے ان افسادی اعمال میں سرفہرست ہے اور ان کے طرز تعبیر سے صاف طور پر یہ عیاں ہوتا ہے کہ موصوف اور ان کی جماعت اپنے فاسد عقائد کے خلاف قرآن پاک کی کوئی آیت بھی سننے کی روادار نہیں ہے، چنانچہ وہ سورۂ بقرہ کی آیت: ﴿وَ مِنۡهُمۡ مَّنۡ يَّقُوۡلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِى الدُّنۡيَا حَسَنَةً وَّفِى الۡاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ۝﴾ (البقرة: ٢٠١) ''اور ان میں سے کوئی ایسا ہے جو کہتا ہے، اے ہمارے رب! تو ہمیں دنیا میں بھی بھلائی دے اور آخرت میں بھی بھلائی اور ہمیں آگ کے عذاب سے بچا۔'' کے بارے میں فرماتے ہیں:

''ایک عام اشکال یہ کیا جاتا ہے کہ دین محمدی علیہ السلام میں رہبانیت کی تعلیم نہیں، اس میں دین و دنیا دونوں کو ساتھ رکھا گیا ہے، ارشاد باری عز اسمہ ہے: ﴿رَبَّنَآ اٰتِنَا فِى الدُّنۡيَا حَسَنَةً وَّفِى الۡاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّ

Marfat.com

قِنَا عَذَابَ النَّارِ○﴾ اور اس آیت شریفہ پر بہت زور دیا جاتا ہے، گویا تمام قرآن پاک میں عمل کے لیے یہی ایک آیت نازل ہوئی ہے۔''[1]

اس چھوٹی سی عبارت: ''گویا تمام قرآن پاک میں عمل کے لیے یہی ایک آیت نازل ہوئی ہے۔'' میں جو زہر بھرا ہوا ہے وہ اس جماعت تبلیغ سے وابستہ تمام لوگوں کی دینی ہلاکت کے لیے کافی ہے، اس لیے کہ یہ لوگ مولانا زکریا کو ''قطب الارشاد'' مانتے ہیں، کیا قرآن کے کسی حکم اور کسی آیت کو پڑھ کر اور سن کر دین کا معمولی سا علم رکھنے والا بھی اور صلاح وتقویٰ کا کوئی معمولی درجہ رکھنے والا بھی قرآن پاک کی کسی بھی آیت کے بارے میں ایسی سنگین بات زبان سے نکال سکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ موصوف نے اس زہریلی عبارت کے بعد جو ہرزہ سرائی کی ہے اس کو نقل کرنے سے پہلے میں اس آیت کے سیاق وسباق کی روشنی میں اللہ کے ان صالح بندوں کی ایک تصویر پیش کر دینا چاہتا ہوں جو حج جیسی عظیم عبادت کے مناسک ادا کر لینے کے بعد اپنے رب سے یہ دعا کرتے ہیں۔

یہ دراصل ایک دعا ہے جو ایک مومن بندہ مناسک حج ادا کر لینے کے بعد اپنے رب سے کرتا ہے جس نے اسے حج جیسی عظیم عبادت کرنے کی توفیق بخشی اللہ تعالیٰ نے دنیا پرستوں کی دعا کا ذکر کرنے کے بعد اس کا ذکر کر کے مومن اور دنیا دار کا فرق واضح کر دیا ہے، دنیا اور آخرت دونوں کی بھلائیاں حج، بلکہ پورے اسلام کا حاصل ہیں اس طرح اس دعا میں ایک سچے مومن کی تصویر نظر آتی ہے دنیا دار نے جو دعا مانگی تھی وہ تھی: ﴿رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا﴾ ''اے ہمارے رب! تو ہمیں دنیا میں دے دے۔'' اس نے دنیا میں اپنی مطلوبات کو مبہم رکھ کر گویا یہ کہہ دیا کہ ہمیں دنیا میں ہمارا حصہ ادا کر دے۔'' اسی وجہ سے فرمایا گیا کہ: ﴿وَ مَا لَهٗ فِی الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ﴾ ''اور آخرت میں اس کے لیے کوئی حصہ نہیں ہے، کیونکہ اس نے صرف دنیا مانگی تھی۔

مومن کی دعا میں لفظ ''حَسَنَةً'' دنیا اور آخرت دونوں کے لیے آیا ہے یہ لفظ ''نکرہ'' آیا ہے، تاکہ اس میں وہ تمام چیزیں شامل ہو جائیں جن پر بھلائی اور خیر کا اطلاق ہوتا ہے اور آخرت کے لیے بھی یہ ''نکرہ'' ہی آیا ہے، لہٰذا اس سے صرف جنت مراد لینا اس کے مفہوم کو محدود کرنا ہے جب اللہ تعالیٰ نے اسے عام رکھا ہے تو اس کو عام رکھنا ہی آیت کے مزاج کے مطابق ہے اس طرح اس میں قیامت کے دن چہرے کی رونق، نیکیوں کے پلڑے کا بھاری ہونا، اعمال نامہ داہنے ہاں میں دیا جانا اور پل صراط سے برق رفتاری کے ساتھ گزر جانا وغیرہ سب داخل ہے۔

آیت کے آخری فقرہ: ﴿وَّ قِنَا عَذَابَ النَّارِ○﴾ ''اور ہمیں آگ کے عذاب سے بچا'' میں دو چیزیں داخل ہیں:

۱۔ ان اعمال سے بچانا اور محفوظ رکھنا جو آگ کے عذاب کے موجب ہیں۔

۲۔ اور عذاب جہنم کا مستحق بنانے والے گناہوں کی بخشش۔

---

[1] فضائل اعمال، فضائل تبلیغ، ص: ۳۰۴

Marfat.com

حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک نہایت جامع دعا ہے اور احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ بکثرت یہ دعا مانگا کرتے تھے، چنانچہ انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

((كان أكثر دعاء النبى ﷺ: اَللّٰهُمَّ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّ فِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّ قِنَا عَذَابَ النَّارِ))

"نبی ﷺ جو دعا سب سے زیادہ مانگا کرتے تھے وہ یہ تھی: اَللّٰهُمَّ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّ فِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّ قِنَا عَذَابَ النَّارِ)) [1]

مولانا زکریا کا رسوخ فی العلم:

رسوخ فی العلم کے معنی ہیں، علم میں گہرائی، پختگی اور مہارت اس کی ضد علمی سطحیت ہے رسوخ فی العلم سے موصوف انسان کو "راسخ فی العلم" کہتے ہیں یعنی علم میں پختہ، گہرائی رکھنے والا اور ماہر، جبکہ سطحیت سے موصوف انسان سطحی انسان ہے جس کے علم میں کوئی گہرائی نہ ہو، جو عبارت کے اوپر سے گزر جاتا ہو اور اس کی گہرائی میں ڈوب کر اس کے حقیقی معنی اور مفہوم کو سمجھنے اور بیان کرنے کی صلاحیت نہ رکھتا ہو۔

حقیقی اہل علم کی پہچان یہ ہے کہ ان کے کلام اور تحریروں میں معانی کے لعل و جواہر ملتے ہیں، ان کی باتوں میں گہرائی ملتی ہے اور وہ نصوص کی ایسی صاف اور واضح تشریح کر دیتے ہیں کہ ان کو سننے والا اور پڑھنے والا ان کی تہہ تک پہنچ جاتا ہے اور ان کے معنی اس کی گرفت میں آجاتے ہیں۔

اس کے برعکس سطح بیں کاتب یا عالم اپنی تحریروں میں قرآن و حدیث کی نصوص کی عام فہم تفسیر و تشریح کرنے کے بجائے لوگوں کے اقوال نقل کر دینے پر اکتفا کرتا ہے، چونکہ خود ان نصوص کو سمجھنے سے قاصر ہوتا ہے اس لیے وہ اپنے نقل کردہ اقوال میں سے موقع و محل سے مناسبت رکھنے والے اقوال کا انتخاب کرنے کی صلاحیت بھی نہیں رکھتا، اس طرح اس کی باتیں قاری کو حقیقت سے دور کر دیتی ہیں۔

صوفیا کی تفسیر قرآن دراصل تحریف قرآن ہے میں اس کتاب میں تصوف سے تعلق رکھنے والے بعض علماء کے اقوال نقل کر چکا ہوں جنہوں نے صوفیا کی تفسیر کو تحریف قرآن قرار دیا ہے، ان کے سرفہرست حافظ سیوطی ہیں جو صوفی ہوتے ہوئے بھی قرآن کی باطنی تفسیر نہیں کرتے تھے، قرآن کی باطنی تفسیر صوفیا کا طرۂ امتیاز ہے۔

صوفیا کو یہ "غرہ" ہے کہ وہ "راسخین فی العلم" ہیں مولانا زکریا اپنی کتابوں میں راسخین فی العلم سے صوفیا ہی کو مراد لیتے ہیں، برعکس نام دھند زنگی را کافور" انہوں نے غیر اسلامی، بلکہ اسلامی مزاج سے متصادم طرز حیات "رہبانیت" کے دفاع میں سورۂ بقرہ کی آیت ۲۰۱ کی "تحقیر" کے بعد "راسخین فی العلم" کے حوالہ سے اس کی تفسیر بیان کی

[1] بخاری: ۶۳۸۹، مسلم: ۲۶۸۸

Marfat.com

ہے، فرماتے ہیں:

''لیکن اول تو یہ آیتِ شریفہ کی تفسیر راسخین فی العلم سے معلوم کرنے کی ضرورت تھی اور اسی وجہ سے علماء کا ارشاد ہے کہ صرف لفظی ترجمہ دیکھ کر اپنے کو عالم قرآن سمجھ لینا جہالت ہے، صحابہ کرام اور علماء تابعین سے جو آیت شریفہ کی تفسیریں منقول ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

حضرت قتادہ سے مروی ہے دنیا کی بھلائی سے مراد عافیت اور بقدر کفایت روزی ہے، حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے منقول ہے کہ اس سے صالح بیوی مراد ہے، حضرت حسن بصری سے مروی ہے کہ اس سے مراد علم اور عبادت ہے، سُدی سے منقول ہے کہ پاک مال مراد ہے، حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نیک اولاد اور خلقت کی تعریف مراد ہے، جعفر سے منقول ہے کہ صحت اور روزی کا کافی ہونا مراد ہے اور اللہ پاک کے کلام کا سمجھنا، دشمنوں پر فتح اور صالحین کی صحبت مراد ہے۔''

تبصرہ:

مولانا نے جو یہ فرمایا ہے کہ ''علماء کا ارشاد ہے کہ صرف لفظی ترجمہ دیکھ کر اپنے کو عالم قرآن سمجھ لینا جہالت ہے'' تو یہ بات سب سے زیادہ صوفیا اور ان کے مریدین پر صادق آتی ہے جو تصوف کی کتابیں اور فضائل اعمال پڑھ کر لوگوں میں دین کی تبلیغ کرتے پھرتے ہیں، جبکہ ان کا مبلغ علم ان کتابوں میں بیان کردہ جھوٹی روایات اور من گھڑت واقعات تک محدود ہوتا ہے۔

دوسرا تبصرہ یہ ہے کہ مولانا نے اپنی کتاب میں جھوٹی روایتیں اور خودساختہ واقعات بیان کر کے کذب بیانی میں اپنی جو شناخت بنالی ہے اس کی وجہ سے آیت کی تفسیر سے متعلق ان کے نقل کردہ اقوال کی ان کے قائلین سے نسبت محل نظر ہے، چنانچہ ایک حدیث کے مطابق جو شخص کذبِ بیانی کا عادی ہوتا ہے وہ اللہ کے نزدیک بہت بڑا جھوٹا لکھ لیا جاتا ہے، حدیث کے الفاظ ہیں:

((إن الصدق يهدي إلى البر و ان البر يهدي إلى الجنة و إن الرجل ليصدُق حتى يُكتب عند الله صديقًا و إن الكَذِبَ يهدي إلى الفجور و إن الفجور يهدي إلى النار و إن الرجل ليكذِبُ حتى يكتب عند الله كذابًا)) [1]

''درحقیقت سچائی نیکی کی راہ دکھاتی ہے اور نیکی جنت کی طرف لے جاتی ہے اور ایک آدمی صدق بیانی کو شعار بنالیتا ہے یہاں تک کہ اللہ کے یہاں سراپا راست گو لکھ لیا جاتا ہے اور کذب بیانی برائی کی راہ دکھاتی ہے اور برائی جہنم کے راستے پر ڈال دیتی ہے اور ایک آدمی کذب بیانی کا عادی ہو جاتا ہے یہاں تک کہ وہ

[1] بخاری: ۶۰۹۴، مسلم: ۲۶۰۷

Marfat.com

اللہ کے نزدیک بہت بڑا جھوٹا لکھ لیا جاتا ہے۔"

علامہ قرطبی نے "الجامع لأحکام القرآن" میں ان اقوال کو نقل کیا ہے؛ علی رضی اللہ عنہ کے قول کے بارے میں تو لکھا ہے کہ ان سے اس کی نسبت صحیح نہیں ہے، ویسے بھی مناسک حج ادا کر لینے کے بعد ایک مومن صادق کا اللہ تعالیٰ سے صالح بیوی کے لیے دعا کرنا آیت کے سیاق وسباق سے بے جوڑ ہے، دوسرے اقوال کو بھی قرطبی نے ردّ کر دیا ہے اور لکھا ہے کہ علماء کی اکثریت کی رائے یہ ہے کہ "حسنتین" سے مراد دنیا اور آخرت کی نعمتیں اور بھلائیاں ہیں اور یہی صحیح ہے، کیونکہ لفظ ان کے عموم کا مقتضی ہے، چونکہ "حسنۃ" نکرہ ہے اور دعا کے ضمن میں آیا ہے، اس لیے بدل کے طور پر تمام بھلائیوں پر مشتمل ہے۔ ❶

تیسرا تبصرہ یہ ہے کہ حسن بصری کے حوالہ سے جو یہ فرمایا ہے کہ اس سے مراد علم اور عبادت ہے اور جعفر کے نزدیک "اللہ پاک کے کلام کا سمجھنا، دشمنوں پر فتح اور صالحین کی صحبت مراد ہے۔" تو عرض ہے کہ ان چیزوں پر دنیا کی بھلائیوں کا اطلاق نہیں ہوتا، رہی صالحین کی صحبت تو جعفر صادق کے زمانے میں یہ اصطلاح کہاں متعارف تھی؟

مولانا زکریا کے مغالطے:

فضائل اعمال کے مصنف نے سورۂ بقرہ کی آیت مبارکہ سے رہبانیت کے غیر اسلامی طرز حیات ہونے پر استدلال پر اپنی تنقید کو درست ثابت کرنے کے لیے مغالطے پر مغالطے دیے ہیں اور قرآن پاک سے ایسی آیتوں کی مثالیں دے کر قارئین کو فریب دینے کی کوشش کی ہے جن میں دنیا طلبی یا دنیا پرستی کی مذمت کی گئی ہے، جبکہ زیر بحث آیت مبارکہ کا دنیا طلبی سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے، بلکہ یہ آیت تو طالب دنیا کی دعا کے بعد آئی ہے اس طرح اللہ تعالیٰ نے دنیا اور آخرت کی بھلائیوں کے طالب کی مدح فرمائی ہے اور دنیا اور آخرت کی بھلائیوں کا طالب دنیا پرست یا دنیا کا طالب ہرگز نہیں ہے۔

اسلام میں دین داری کا معیار:

اسلام میں جس دین داری کی تعلیم دی گئی ہے وہ "فضائل اعمال" کی دین داری سے بہت مختلف چیز ہے؛ اسلام جس چیز کو دین داری قرار دیتا ہے وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی کامل پیروی ہے، یعنی آپ کے اوامر کی تعمیل اور آپ کے نواہی سے اجتناب اور آپ کی سیرت پاک کو نمونہ عمل بنانا۔ اس کے برعکس تصوف میں دین داری اکابر صوفیا کے نقش قدم کی پیروی ہے جس کی مثالوں سے "فضائل اعمال" کے صفحات سیاہ کیے گئے ہیں اور یہ بتانا تحصیل حاصل ہے کہ صوفیا کے اعمال میں اتباع رسول یا اتباع سنت کی کوئی جھلک نہیں ہے، اگر ان کا کوئی عمل کسی حدیث پر مبنی بھی ہے تو تاویل کی خراد پر چڑھا کر اس حدیث کا حلیہ بگاڑ دیا گیا ہے، ورنہ صوفیا کے بیشتر عقائد واعمال خود ساختہ ہیں یا جھوٹی روایتوں پر مبنی ہیں اس دعوے کی صداقت پر فضائل اعمال کے صفحات گواہ ہیں۔

❶ ص ۳۴۴، ج ۲

Marfat.com

نمونۂ عمل صرف سیرت پاک ہے:

ارشاد الٰہی ہے:

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَ الْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَ ذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا﴾ (الاحزاب: ۲۱)

''درحقیقت اللہ کے رسول کے اندر تم لوگوں کے لیے بہترین نمونہ موجود ہے، اس شخص کے لیے جو اللہ اور یوم آخرت کا امیدوار ہو اور اللہ کو بہت یاد رکھتا ہو۔''

یہ آیت مبارکہ کسی تفسیر کی محتاج نہیں ہے اس کے الفاظ اپنے مفہوم میں بالکل واضح ہیں، یعنی جو مومن بندہ دوسری زندگی میں اللہ کی رضا اور خوشنودی اور اس زندگی میں فلاح و کامرانی کا امیدوار ہے اور جس کا دل اللہ کی یاد سے معمور رہتا ہو وہ ہر چیز میں اللہ کے رسول کو اپنے لیے نمونۂ عمل بنا لے۔

سنت سے اعراض کرنے والے کا آپ سے کوئی تعلق نہیں:

انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، کہتے ہیں:

((جاء ثلاثة رهط إلى بيوت أزواج النبي ﷺ يسألون عن عبادة النبي ﷺ، فلما أخبروا، كأنهم تقالوها، فقالوا: أين نحن من النبي ﷺ؟ قد غُفِرَ له ما تقدم من ذنبه و ما تأخر. قال أحدهم: أما أنا فإني أصلي الليل ابدًا، و قال آخر: أنا أصوم الدهر و لا أفطر، و قال آخر: أنا أعتزل النساء فلا أتزوج أبدا، فجاء رسول الله ﷺ فقال: أنتم الذين قلتم كذا و كذا؟ أما و الله إني لأخشاكم لله و أتقاكم له، لكني أصوم و أفطر، و أصلي و أرقد و أتزوج النساء، فمن رغب عن سنتي فليس مني.)) [1]

''تین افراد نبی ﷺ کی عبادت کا حال معلوم کرنے کی غرض سے نبی ﷺ کی ازواج کے گھروں کو آئے اور جب ان کو نبی ﷺ کی عبادت کی خبر دی گئی تو ایسا لگا گویا انہوں نے اسے کم سمجھا، اور کہا: نبی ﷺ سے ہماری کیا نسبت؟ آپ کے تو اگلے پچھلے گناہ معاف کر دیے گئے ہیں؛ ان میں سے ایک نے کہا: میں تو پوری رات نماز پڑھوں گا، دوسرے نے کہا: میں ہمیشہ روزہ رکھوں گا، کبھی بلا روزہ نہ رہوں گا، تیسرے نے کہا: میں عورتوں سے الگ تھلگ رہوں گا اور کبھی شادی نہ کروں گا۔ جب رسول اللہ ﷺ تشریف لائے تو فرمایا: کیا تمہی لوگوں نے ایسا اور ایسا کہا ہے؟ غور سے سن لو، اللہ کی قسم میں تم میں سب سے زیادہ للہ سے ڈرنے والا اور اس کی ناراضی سے بچنے والا ہوں، پھر بھی میں روزہ رکھتا بھی ہوں اور نہیں بھی رکھتا، نماز بھی

[1] بخاری: ۵۰۶۳، مسلم: ۱۴۰۱

Marfat.com

پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں اور عورتوں سے شادی بھی کرتا ہوں، سو جو کوئی میرے طریقے سے اعراض کرے وہ مجھ سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔''

غور فرمائیے، رسول اللہ ﷺ نے پوری رات عبادت کرنے اور نمازیں پڑھنے، اور ہمیشہ روزہ رکھنے اور بلا روزہ نہ رہنے اور شادی نہ کرنے کو اپنی سنت سے اعراض قرار دیا ہے اور ایسا کرنے والے سے اپنی لاتعلقی کا اظہار فرمایا ہے۔

کیا پوری فضائل اعمال اور تصوف کی دوسری کتابیں اس حدیث نبوی کی مخالفت پر ورغلانے سے عبارت نہیں ہیں اور کیا فضائل اعمال میں محمد زکریا صاحب نے اپنے اکابر صوفیا کی عبادتوں کا ذکر کر کے ان کی پیروی کی جو دعوت دی ہے اور جو ترغیب دی وہ اس حدیث کے خلاف ''چیلنج'' نہیں ہے۔

درحقیقت یہ حدیث پاک حقیقی دین داروں اور دین داری کا ڈھونگ رچانے والوں کے درمیان حد فاصل ہے اور صوفیا کی جماعت اسلام سے نسبت کا دعویٰ کرنے والی ایسی ''جری'' جماعت ہے جو رسول اللہ ﷺ کی سنت کی خلاف ورزی ہی کو حقیقی دین داری تصور کرتی ہے اور اس کی دعوت دیتی ہے اس تناظر میں تبلیغی جماعت ایک غیر اسلامی جماعت ہے جس نے اسلامی لباس زیب تن کر رکھا ہے۔

صرف یہی نہیں کہ صوفیا موحد نہیں ہیں، بلکہ صوفیا توحید سے واقف ہی نہیں ہیں اور صوفی ادبیات میں توحید کا کوئی ذکر ہی نہیں ہے، جبکہ اسلام اصلاً توحید ہی سے عبارت ہے، کیونکہ اس کے سارے احکام اسی توحید کے گرد گھومتے ہیں۔

مولانا زکریا نے اپنی کتاب فضائل اعمال میں کلمہ توحید، "لا الہ الا اللّٰہ" کے بکثرت ورد کے فضائل میں جھوٹی روایتوں کا ذکر تو بہت کیا ہے اور اس کلمہ کے ہزاروں کی تعداد میں مشائخ صوفیا کے حوالہ سے ورد کی تلقین تو بہت کی ہے اور اس کے نتائج کے جھوٹے واقعات بیان کر کے یقین تو بہت دلایا ہے، مگر کہیں بھول کر بھی اس کلمہ کا مطلب اور اس کے تقاضوں کو بیان نہیں کیا ہے، جس کا سبب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ وہ توحید کے مفہوم سے واقف ہی نہیں تھے۔

تبلیغی جماعت سے وابستہ لاکھوں افراد دنیا کے مختلف ملکوں میں پھیلے ہوئے ہیں اور لوگوں سے یہ کلمہ پڑھواتے پھرتے ہیں، مگر ان مبلغین اور داعیوں میں سے کوئی ایک فرد بھی حتیٰ کہ اُن کے ''حضرت جی'' بھی یہ نہیں جانتے کہ لا الہ الا اللّٰہ کا مطلب کیا ہے اور اس کا اپنے کہنے والے سے تقاضا کیا ہے، دوسرے لفظوں میں ان میں سے کسی کو بھی یہ نہیں معلوم ہے کہ توحید کیا ہے؟

فضائل اعمال میں من گھڑت اولیاء اللہ یا اکابر صوفیا کی غیب دانیوں کے جو جھوٹے واقعات بیان کیے گئے ہیں، امور کائنات میں ان کے تصرفات کے جو دعوے کیے گئے ہیں، ان کی عدم موت اور عدم فنا کے جو فرضی قصے بیان کیے ہیں اور مشائخ صوفیا کے حوالوں سے جو یہ دعوے کیے گئے ہیں کہ یہ بزرگان اپنی قبروں سے نکل نکل کر ان لوگوں کی مرادیں پوری کرتے ہیں جو مستغیث بن کر ان قبروں کی زیارت کرتے ہیں تو یہ ساری باتیں میرے اس دعوے کی تائید کرتی ہیں

Marfat.com

کہ فضائل اعمال کے مصنف، اس جماعت تبلیغ سے وابستہ لوگ اور اس میں جن بزرگوں کے واقعات بیان کیے گئے ہیں ان میں سے کوئی ایک بھی توحید سے واقف نہیں تھا، اور نہ ہے۔

جماعت صوفیا کے امام جُنید بغدادی جن کا لقب ''سید الطائفہ'' تھا جب ان سے پوچھا گیا کہ توحید کیا ہے؟ تو جواب دیا: ((هو إفراد القديم عن المحدث)) ''قدیم کو حادث سے بالکل علیحدہ کر دینے کا نام توحید ہے۔'' [1]

امام ابن القیم تحریر فرماتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ کو حادث ہونے سے پاک قرار دینا حق تو ہے، لیکن اس سے نہ اسلام حاصل ہوتا ہے اور نہ ایمان، یہ نہ تو کسی کو انبیاء کی شریعتوں میں داخل کرتا ہے اور نہ اہل کفر کے طریقوں سے نکالتا ہے۔''

توحید کا مسئلہ جس پہلے شخص نے اپنی کتاب میں بیان کیا ہے وہ ابو اسماعیل عبداللہ انصاری ہروی ہیں اور ان کی کتاب کا نام ''منازل السائرین'' ہے جس میں انہوں نے توحید کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:

((التوحيد تنزيه الله عز و جل عن الحدث)) [2]

''حادث ہونے سے اللہ عز وجل کو پاک کرنا توحید ہے۔''

حافظ ابن القیم رحمہ اللہ اپنی کتاب "مدارج السالکین" میں ہروی کی اس تعریف پر تبصرہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

''یہ تعریف اس توحید پر دلالت نہیں کرتی جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں کو بھیجا اور جس کے ساتھ اپنی کتابیں نازل کیں، اس توحید سے بندہ نہ آگ سے نجات حاصل کر سکتا ہے، نہ اس کے ذریعہ جنت میں داخل ہو سکتا ہے اور نہ شرک کے دائرہ سے باہر نکل سکتا ہے، اللہ کو حادث ہونے سے پاک قرار دینا تمام فرقوں میں قدر مشترک ہے جو بھی خالق سبحانہ کے وجود کا اقراری ہے وہ اس توحید کو مانتا ہے، بت پرست، مجوسی، نصاریٰ، یہود اور مشرکین اپنے طریقوں اور ملتوں میں اختلاف کے باوجود اللہ کو حادث ہونے سے پاک اور منزہ مانتے ہیں اور اس کے ''قدیم'' ہونے کے بھی قائل ہیں، حتیٰ کہ سب سے بڑے مشرک اور کفر و الحاد میں سب پر برتری رکھنے والے ''وحدۃ الوجود'' کے مدعی بھی یہ کہتے ہیں: اللہ تعالیٰ وجود مطلق ہے، قدیم اور ازلی ہے، حادث ہونے سے منزہ اور پاک ہے اور عدم سے وجود میں آنے والے اس کے وجود سے اپنا لباسِ وجود زیب تن کرتے ہیں اور اسے پہنتے اور نکالتے ہیں۔'' [3]

اس کے بعد ہروی نے اپنے خاص صوفیانہ اسلوب میں اور نہایت نپے تلے الفاظ میں توحید بیان کی ہے، پہلے انہوں نے توحید کو تین قسموں میں تقسیم کیا ہے، پھر ان میں سے ہر ایک کی تعریف کی ہے، ان کی بیان کردہ توحید کی تینوں قسمیں حسب ذیل ہیں:

[1] مدارج السالکین: ۳/۳۴۶۔ [2] ص: ۱۱۰ [3] مدارج السالکین: ۳/۳۴۵-۳۴۶

Marfat.com

۱۔ توحید کی پہلی قسم عوام کی توحید ہے جو بذریعہ شواہد صحیح ہے۔

۲۔ توحید کی دوسری قسم خواص کی توحید ہے جو حقائق کے ذریعہ ثابت ہوتی ہے۔

۳۔ توحید کی تیسری قسم وہ ہے جو قدیم زمانے سے قائم ہے اور یہ اخص الخواص کی توحید ہے۔

''شواہد'' سے ہروی کی مراد رسالت اور خالق کائنات کی صناعیاں ہیں۔

اور ''حقائق'' صوفیا کی خاص اصطلاح ہے اور اس سے مراد: مکاشفہ، مشاہدہ، معاینہ، حیات، قبض، بسط، سکر، صحو، اتصال اور انفصال ہے اور ان میں سے ہر حقیقت کا صوفیا کے نزدیک ایک خاص مفہوم ہے۔

شیخ ہروی کی بیان کردہ ان تینوں قسموں کی، ان کے الفاظ میں تفصیلات بیان کرنے اور اس پر تبصرہ کرنے سے پہلے یہ واضح کر دوں کہ اللہ کے بندوں سے جو توحید مطلوب ہے وہ صرف ایک ہے، کیونکہ فرائض و واجبات کے مکلّف ہونے کے اعتبار سے تمام انسان ایک ہی درجہ پر ہیں اور ان کے درمیان جو درجات ہیں وہ فرائض و واجبات کی تنفیذ اور تعمیل کے نتائج کے اعتبار سے نہ کہ مکلّف بنائے جانے کے لحاظ سے، دوسرے لفظوں میں جو توحید ایک نبی اور رسول سے مطلوب ہے وہی توحید اس کے پیرو ایک ''چرواہے'' اور ایک دیہاتی سے بھی مطلوب ہے، اسی طرح جو چیز ایک نبی اور رسول کے حق میں شرک ہے وہی معاشرتی اور اجتماعی حیثیت سے ایک ''پست'' انسان کے لیے بھی شرک ہے، لہٰذا انسانوں کو ایمان و عمل کے اعتبار سے عوام، خواص اور اخص الخواص کے خانوں میں بانٹنا غیر اسلامی اور غیر قرآنی ہے۔

۱۔ پہلی قسم (توحید الوہیت یا عوام کی توحید):

ابو اسماعیل ہروی توحید کی پہلی قسم بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''پہلی توحید یہ گواہی دینا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود (برحق) نہیں ہے وہ یکتا ہے اس کا کوئی شریک نہیں وہ سب سے بے نیاز اور سب اس کے محتاج ہیں، نہ اس نے کسی کو جنا اور نہ وہ جنا گیا ہے اور نہ کوئی اس کا ہمسر ہے۔''

یہی وہ ظاہر اور روشن توحید ہے جس نے شرک اعظم کی نفی کر دی ہے، اسی توحید پر قبلہ کی بنیاد ہے، اسی سے جان و مال کو تحفظ حاصل ہے، اسی توحید کی وجہ سے دار الاسلام کو دار الکفر سے علیحدگی ملی ہے اور اسی کے ذریعہ عوام کے لیے ''ملت'' صحیح قرار پائی ہے۔ اگرچہ وہ اس پر دلائل پیش کرنے کا حق نہ ادا کر سکیں، البتہ انہوں نے اس کو شک و شبہ اور حیرانی اور تذبذب سے پاک ہو کر ایسی سچی گواہی سے قبول کیا ہے جس کو دل نے قبول کر کے صحیح قرار دیا ہے۔'' [1]

''یہ عوام کی توحید ہے جو بذریعہ شواہد درست ہے اور شواہد سے مراد رسالت اور خالق کی صناعیاں ہیں۔''

---

[1] منازل السائرین، ص: ۱۱۰-۱۱۱

Marfat.com

یہ توحید بذریعہ سمع واجب التسلیم ہو جاتی ہے اور حق تعالیٰ کی عطا کردہ بصیرت سے وجود پاتی ہے اور دلائل وشواہد کے مشاہدے سے اس کو فروغ ملتا ہے۔"❶

ہروی کی لغزش:

ابو اسماعیل ہروی نے مذکورہ بالا عبارت میں جس "توحید" کی تعریف کی ہے وہ صوفیانہ طرز بیان کے باوجود درست اور قابل قبول ہے۔

لیکن انہوں نے یہ کہہ کر کہ "یہ عوام کی توحید ہے" ایسی سنگین ٹھوکر کھائی ہے اور ایسی بھیانک غلطی اور لغزش کا ارتکاب کیا ہے جس نے مذکورہ حسین تعبیر کی ساری خوبیوں کو کالعدم کر دیا ہے، کیونکہ اولاً تو انہوں نے جو توحید بیان کی ہے وہ عوام کی توحید نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کے اشرف ترین بندوں، انبیاء اور رسولوں کی توحید ہے اور اسی توحید کی دعوت دینے کے لیے ان کو مبعوث کیا گیا تھا:

﴿وَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِیْٓ اِلَیْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ۝﴾

(الانبیاء: ۲۵)

"اور ہم نے تم سے پہلے جو رسول بھی بھیجا اس کو یہی وحی کرتے رہے کہ درحقیقت میرے سوا کوئی معبود نہیں۔ سو میری ہی عبادت کرو۔"

اور نبی ﷺ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

﴿قُلْ اِنِّیْٓ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّیْنَ۝ وَ اُمِرْتُ لِاَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ الْمُسْلِمِیْنَ۝﴾

(الزمر: ۱۱-۱۲)

"کہہ دو، درحقیقت مجھے یہ حکم دیا گیا ہے کہ میں اللہ کی عبادت، عبادت کو اس کے لیے خالص کرتے ہوئے کروں اور مجھے یہ حکم دیا گیا ہے کہ میں اطاعت گزاروں میں پہلا بنوں۔"

ثانیاً عقیدہ و ایمان اور فرائض و واجبات کے اعتبار سے اللہ کے بندوں کو عام اور خاص میں تقسیم کرنا غیر اسلامی ہے؛ قرآن و حدیث سے اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا، بعد میں ان شاء اللہ یہ بتاؤں گا کہ توحید کے حوالہ سے اس تقسیم کے مآخذ مشرکانہ مذاہب ہیں۔

مذکورہ بالا وضاحت سے یہ معلوم ہوا کہ شیخ ہروی نے توحید کی جس قسم کو پہلی توحید قرار دیا ہے اور پھر اسے عوام کی توحید بتایا ہے تو یہ دونوں باتیں قرآن و حدیث کی صراحتوں اور اسلامی روح کے خلاف ہیں؛ قرآن و حدیث کے مطابق توحید الوہیت صرف ایک ہے اور یہی اللہ کے سارے مومن بندوں کی توحید ہے۔

---

❶ ص: ۱۱۱

Marfat.com

۲۔ توحید کی دوسری قسم:

''رہی دوسری توحید جو حقائق سے ثابت ہوتی ہے، خواص کی توحید ہے، یہ توحید ظاہری اسباب کو ساقط اور ناقابل اعتبار قرار دے دینے، عقلی حجت بازیوں اور شواہد سے تعلق رکھنے سے بلند ہو جانے کا نام ہے، جس کا مطلب ہے کہ تُو توحید کے مسئلہ میں کوئی دلیل نہ دیکھے، توکل کے معاملہ میں کسی سبب پر عمل نہ کرے، اور نجات کے لیے کوئی ذریعہ اور وسیلہ نہ اپنائے۔'' ❶

اس توحید کے بارے میں عرض ہے کہ اولاً تو یہ نہ عوام کی توحید ہے اور نہ خواص کی، کیونکہ اس کا ذکر قرآن اور حدیث میں اشارۃً بھی نہیں آیا ہے لہٰذا یہ صوفیا کی خانہ ساز ہے۔ ثانیاً اس توحید کی جو تعریف کی گئی ہے اور اس کے جو خدوخال بیان کیے گئے ہیں ان کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے؛ جن کی وجوہات حسب ذیل ہیں:

۱۔ ہروی کا یہ دعویٰ ہے کہ خواص کی یہ توحید حقائق سے ثابت ہوتی ہے، اوپر میں یہ بتا چکا ہوں کہ حقائق کوئی اسلامی اصطلاح نہیں، بلکہ صوفیانہ اصطلاح ہے اور حقائق سے مراد مکاشفہ، مشاہدہ، معاینہ، حیات، قبض، بسط، سکر، صحو، اتصال اور انفصال ہیں۔ حقائق اور غیر حقائق، کسی بھی نام سے ان کا ذکر کتاب وسنت میں نہیں آیا ہے۔ اگرچہ الفاظ سب عربی ہیں۔ ہروی نے ان کو "سلوك" یا "سیر الی اللہ" کے مقامات کے ضمن میں درج کیا ہے جو (ص ۹۲ سے ص ۱۰۱) تک پھیلے ہوئے ہیں اور انہوں نے ہر مقام کا آغاز قرآن پاک کی کسی آیت سے کر کے یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ ہر مقام کا ماخذ کتاب اللہ ہے، مثال کے طور پر پہلی حقیقت ''مکاشفہ'' ہے جس کے معنی کسی کو کوئی بات بتانے اور اس پر کسی معاملے کو منکشف اور ظاہر کرنے کے آتے ہیں۔ ہروی نے ''مکاشفہ'' کی تعریف کرنے سے قبل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد مبارک نقل کیا ہے: ﴿فَاَوْحٰی اِلٰی عَبْدِهٖ مَاۤ اَوْحٰی﴾ (النجم: ۱۰) ''تو اس نے اس کے بندے کی طرف وحی کی جو وحی کی۔'' سابقہ آیات ۸-۹ کی روشنی میں "اوحی" کا فاعل اللہ تعالیٰ بھی ہو سکتا ہے اور جبریل بھی؛ قرآن پاک میں وحی کی نسبت اللہ کی طرف بھی کی گئی ہے کہ حقیقی "موحی" وہی ہے اور جبریل کی طرف بھی کہ وحی پہنچانے کے ذمہ دار وہی تھے، لہٰذا اگر "أوحی" کا فاعل اللہ تعالیٰ ہے، تو مطلب ہوگا کہ اللہ نے جبریل کے ذریعہ اپنے بندے اور رسول کو وحی کی اور اگر مراد جبریل ہیں تو مطلب ہے کہ انہوں نے اللہ کے بندے اور رسول کو وحی کی، کیونکہ نبی ﷺ اللہ کے بندے تھے، جبریل کے بندے نہیں؛ جبریل تو خود اللہ کے بندے ہیں۔

''مکاشفہ'' کی صحت پر سورۂ نجم کی آیت سے ہروی کا استدلال بے محل ہے؛ یہ درست ہے کہ وحی کے ذریعہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو بعض مخفی حقائق سے آگاہ فرماتا رہا ہے، مگر اس کے یہ بندے اس کے نبی اور رسول ہوتے تھے جن کے دل شیطانی خیالات اور وسوسوں سے پاک ہوتے تھے، اسی وجہ سے نیند کی حالت میں بھی ان کے دل بیدار رہتے تھے۔ ❷

❶ ص: ۱۱۱ ❷ بخاری: ۳۵۶۹-۳۵۷۰، مسلم: ۱۷۳۳

Marfat.com

انبیاء کے علاوہ جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنی وحی سے سرفراز فرمایا ہے وہ موسیٰ آیت کی والدہ ماجدہ ہیں، بلاشبہ ان کو کی جانے والی وحی ''وحی الٰہی'' ہی تھی، الہام نہیں تھا، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اس وحی کے ذریعہ جن حقائق کی ان کو خبر دی تھی، الہام اُن کا ذریعہ نہیں ہوسکتا۔ الہام غیر واضح اور مبہم خیال کا نام ہے جس سے کوئی حکم ثابت نہیں ہوتا، جبکہ ام موسیٰ آیت کو جو حکم دیا گیا تھا وہ بالکل ایک انوکھا حکم تھا، یعنی وہ اپنے نوزائیدہ بچہ کو دریا میں ڈال دیں اور اس پر کوئی رنج وغم نہ کریں، وہ اس کو ان کے پاس واپس بھی لائے گا اور اس کو رسول بھی بنائے گا۔ (القصص: ۷)

اس حکم ربانی کی تعمیل کے لیے جو یقین واذعان درکار تھا وہ صرف وحی ہی کے ذریعہ ممکن تھا ورنہ ایک ماں اپنے ہاتھوں اپنے لخت جگر کو دریا میں نہیں ڈال سکتی تھی۔

شہد کی مکھی کی طرف وحی کرنے کا جو ذکر آیا ہے (النحل: ۶۸) تو اس سے مراد وہ فطری ہدایت ہے جس کی بنیاد پر جانور اپنے مخصوص افعال انجام دیتے ہیں۔

صوفیا کو جو مکاشفات ہوتے ہیں یا جن کا وہ اپنی مجلسوں اور کتابوں میں دعویٰ کرتے ہیں، اولاً تو ان کا ماخذ ومصدر مجہول ہوتا ہے، ثانیاً: وہ یقینی بھی نہیں ہوتے، ثالثاً: صوفیا اپنے عقیدہ وعمل میں کتاب وسنت کی پیروی کے بجائے اپنے خودساختہ عقائد اور نظریات کی پیروی کرتے ہیں، جن میں سے اکثر تو کتاب وسنت سے ماخوذ عقائد سے متعارض ہیں اور جن کی کوئی شرعی بنیاد بھی ہے ان کا بھی صوفیا کے یہاں خاص مفہوم ہے، ایسی صورت میں صوفیا کے مکاشفات پر اس آیت سے استدلال، جس میں رسول اللہ ﷺ کو کی جانے والی وحی کا ذکر ہے، غیر معصوم اور اپنی آراء کو دلیل وحجت بنانے والے صوفیا کو اللہ کے معصوم نبی اور رسول سے تشبیہ دینا ہے، جو حرام بھی ہے اور صوفیا کی خود فریبی کی دلیل بھی۔

ہروی نے اس طرح تمام صوفیانہ حقائق سے پہلے قرآنی آیات کا ذکر کیا ہے جو اپنے مفہوم اور اپنے سیاق وسباق کی روشنی میں ان خودساختہ ''حقائق'' کے بالکل برعکس ہیں۔

توحید کی دوسری قسم کے مآخذ:

ابو اسماعیل ہروی نے توحید کی اس دوسری قسم کی جو تعریف کی ہے وہ اسلامی نقطۂ نظر سے قابل گرفت ہے، لہٰذا اس کی وضاحت ضروری ہے:

۱۔ ہروی نے اس دوسری توحید کو جو ''خواص کی توحید'' کہا ہے تو خواص سے ان کی مراد صوفیا ہیں جو ارباب تصوف کے حلقوں میں ''راہ سلوک'' پر چلنے والے معروف ہیں، سوال یہ ہے کہ ایسے لوگ جن کے عقائد اور اعمال اور اوراد و اشغال کتاب وسنت کی منصوص تعلیمات سے قدم قدم پر ٹکراتے ہیں کیا ان کو ''خواص'' کا نام دینا ''برعکس نام دھند زنگی را کافور'' کے قبیل سے نہیں ہے؟

۲۔ انہوں نے جو یہ فرمایا ہے کہ ''یہ توحید ظاہری اسباب کو ساقط اور غیر معتبر قرار دے دینے کا نام ہے، پھر اس کی

Marfat.com

تفصیل بیان کرتے ہوئے جو یہ فرمایا ہے کہ: ''تو توحید کے مسئلہ میں کوئی دلیل نہ دیکھے، توکل کے معاملے میں کسی سبب پر عمل نہ کرے اور نجات کے لیے کوئی ذریعہ نہ اپنائے۔'' تو اسلامی نقطۂ نظر سے یہ ساری باتیں قابل گرفت، بلکہ مردود ہیں، حافظ ابن القیم اس پوری عبارت پر تبصرہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

ممکن ہے کہ ظاہری اسباب سے ان کی مراد حرکات اور اعمال ہوں اور ان کو ساقط اور غیر معتبر قرار دے دینے سے ان کی مراد یہ ہو کہ ان کو سعادت اور نجات کا موجب نہ مانا جائے، البتہ ان کو نظر انداز اور بے اثر نہ قرار دیا جائے، کیونکہ اسباب کو سعادت و نجات کا موجب قرار دینا کفر اور اسلام کے دائرہ سے مکمل طور پر نکل جانا ہے؛ بلکہ ان اسباب پر اس اعتبار سے عمل کرے کہ ان کو کامیابی اور نجات کا موجب نہ سمجھے، جیسا کہ نبی ﷺ کا ارشاد ہے:

((إعملوا، و اعلموا أن أحدًا منكم لن ينجيه عَملُه)) ❶

''عمل کرو، اور یہ بھی تمہارے علم میں رہے کہ تم میں سے کسی کو اس کا عمل نجات نہیں دے سکتا۔''

ان کی جو بھی مراد ہو، وہ اپنی اس عبارت میں راست گو نہیں ہیں؛ اس لیے کہ ظاہری اسباب کو ساقط کر دینے کا مطلب اگر یہ ہے کہ ان کو بے کار اور نظر انداز کر دیا جائے تو اس سے بڑا ''باطل'' کوئی نہیں اور اگر انہوں نے یہ کہنا چاہا ہے کہ ظاہری اسباب کو کامیابی اور نجات کا موجب اور مقتضی نہ مانو اور حقیقی موجب اللہ کی مشیت کو سمجھو، تو ایسی صورت میں ظاہری اسباب اور باطنی اسباب میں کوئی فرق نہیں ہے اور اگر ظاہری اسباب سے ان کی مراد وہ اسباب ہیں جن کو اختیار کرنے اور عمل میں لانے کا بندوں کو حکم نہیں دیا گیا ہے تو نہ ان کو غیر معتبر قرار دینا توحید ہے اور نہ ان پر عمل کرنا توحید کے منافی ہے۔

خلاصۂ کلام:

یہ کہ اسباب کو ساقط اور ناقابل عمل قرار دینا توحید نہیں ہے بلکہ ان کو عمل میں لانا، ان کا اعتبار کرنا اور ان کو وہ درجہ دینا جو اللہ نے ان کو دیا ہے، ہی خالص توحید اور اللہ کی بندگی ہے اور اسباب کو ساقط اور غیر معتبر قرار دینے کا نظریہ اس فرقہ کی توحید ہے جس کو 'جبریہ قدریہ' کہتے ہیں، یہ فرقہ انسان کے مجبور محض ہونے کے عقیدے میں جہم بن صفوان کا پیرو ہے۔ اس فرقہ کے نزدیک اللہ نے کوئی بھی چیز کسی سبب سے پیدا نہیں کی ہے اور نہ اسباب میں کوئی طاقت اور خاصیت ہی ودیعت کی ہے؛ نہ آگ میں جلانے کی خاصیت ہے اور نہ زہر میں ہلاک کرنے کی تاثیر ہے، نہ پانی اور روٹی میں پیاس بجھانے اور جسم کو نشو و نما دینے کی قدرت ہے اور نہ آنکھ میں دیکھنے کی طاقت، اور نہ کان اور ناک میں سننے اور سونگھنے کی صلاحیت، بلکہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ ان کے یہ اثرات جسم سے ان کے ملنے کے وقت پیدا کر دیتا ہے، خود ان سے یہ اثرات پیدا نہیں ہوتے، مثلاً: کھانے سے آسودگی اور شکم سیری نہیں ہوتی، پینے سے پیاس نہیں بجھتی، دلائل سے علم حاصل

❶ بخاری: ۳۹، ۵۶۷۳، مسلم: ۲۸۱۶

Marfat.com

نہیں ہوتا، توڑنے سے کوئی چیز نہیں ٹوٹتی، اور ذبح کرنے سے روح نہیں نکلتی، اسی طرح اللہ تعالیٰ کی توحید اور اس کی طاعت جنت میں داخل ہونے اور جہنم سے نجات پانے کا سبب ہے اور نہ شرک، کفر اور معصیت جہنم میں داخل ہونے کا سبب؛ جنت میں داخل ہونے والے کسی سبب اور حکمت سے نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کی مجرد مشیت سے داخل ہوں گے، اسی وجہ سے منازل السائرین کے مصنف نے کہا ہے:

''موحد، نہ توحید کے مسئلہ میں کوئی دلیل دیکھے، نہ توکل کے مسئلہ میں کسی سبب کا اعتبار کرے اور نہ نجات کے سلسلے میں کوئی ذریعہ اپنائے۔''

کیونکہ یہ عقیدہ رکھنے والوں کے نزدیک کائنات کی تمام اشیاء اور اوامر ونواہی محض مشیت الٰہی سے وقوع پذیر ہوتی اور صادر ہوتی ہیں ان کے پیچھے کوئی سبب، مقصد، غایت اور حکمت نہیں ہوتی، اسی کا اعتقاد ان کے نزدیک توحید کی انتہاء اور معرفت کی غایت ہے۔

مذکورہ نظریہ کو مسلک اور عقیدہ بنا لینا دنیا اور دین دونوں کو برباد کر دینے والا ہے۔ بلکہ یہ سارے رسولوں کے ادیان وشرائع کے خلاف ہے۔

''جن لوگوں نے ترک اسباب کو اپنا ضابطہ بنا رکھا ہے اور جو ان کا عقیدہ ہے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ سعادت و بدبختی کا اللہ تعالیٰ کو علم ہے اور وہ اس کا فیصلہ کر چکا ہے جس میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی، لہٰذا ہمارا عمل اور ترکِ عمل دونوں برابر ہیں؛ اگر اللہ کے علم ازلی میں ہم بدبخت ہیں اور ہماری بدبختی کا فیصلہ ہو چکا ہے تو ہم بدبخت ہی رہیں گے، عمل کریں یا عمل نہ کریں، اور اگر اللہ کے علم ازلی میں ہماری سعادت اور نیک بختی ثبت ہے تو ہم نیک بخت ہی رہیں گے چاہے عمل کریں یا نہ کریں۔''

اس عقیدہ واصل کو ضابطۂ حیات بنانے والوں نے ''دعا'' سے بھی کنارہ کشی اختیار کر رکھی ہے، ان کا دعویٰ ہے کہ جس چیز کے لیے دعا کی جاتی ہے اگر اس کے حصول کا علم اور فیصلہ ہو چکا ہے وہ حاصل ہو کر رہے گی ہم دعا کریں یا نہ کریں اور اگر اس کا عدم حصول اللہ کے علم میں ثبت ہے تو وہ حاصل نہیں ہوگی اگرچہ ہم اس کی دعا کریں۔''

ہمارے شیخ -ابن تیمیہ- کا قول ہے کہ ''یہ اصل اور قاعدہ فاسد ہے اور کتاب وسنت اور اسلاف اور ائمہ دین کے اجماع کے خلاف ہے، بلکہ عقل، حس اور مشاہدہ کے بھی خلاف ہے۔''[1]

قرآن میں اسباب وذرائع کا اثبات:

قرآن میں بکثرت ایسی آیات آئی ہیں جو بصراحت اسباب وذرائع کو ثابت کرتی ہیں اور مختلف طریقوں سے کونی اور شرعی احکام اور ثواب وعقاب کو اسباب کا نتیجہ قرار دیتی ہیں اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے سبب اور حکمت اور علت بیان

[1] مدارج السالکین: ۳/ ۳۸۷-۳۸۹

Marfat.com

کرنے والے حروف: باء، لام، ان اور کے وغیرہ استعمال کیے ہیں:

بادلوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿فَاَنْزَلْنَا بِهِ الْمَآءَ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ﴾ (الاعراف: ۵۷)

''تو ہم اس سے پانی نازل کرتے ہیں، پھر اس کے ذریعہ ہر قسم کے پھل نکالتے ہیں۔''

﴿وَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا﴾ (البقرة: ۱۶۴)

''اور اللہ نے آسمان سے جو پانی اتارا اور اس کے ذریعہ زمین کو اس کے مردہ ہو جانے کے بعد زندہ کر دیا۔''

﴿ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ وَ اَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِo﴾ (آل عمران: ۱۸۲)

''یہ اس وجہ سے ہے جو تمہارے ہاتھوں نے آگے بھیجا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اللہ بندوں کے لیے بالکل ظالم نہیں ہے۔''

﴿كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِ رَبِّهِمْ﴾ (ابراهيم: ۱)

''ایک کتاب ہے جو ہم نے تیری طرف نازل کی ہے تاکہ تو لوگوں کو ان کے رب کے حکم سے تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لے جائے۔''

﴿وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًاo وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ﴾ (الطلاق: ۲-۳)

''اور جو اللہ کی ناراضی سے بچے گا اس کے لیے وہ بچنے کا کوئی راستہ پیدا کر دے گا اور اس کو ایسی جگہ سے روزی دے گا جس کا اسے گمان بھی نہیں ہو گا۔''

﴿وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْ اَسْتَجِبْ لَكُمْ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دَاخِرِيْنَo﴾ (المومن: ۶۰)

''اور تمہارے رب نے فرمایا مجھے پکارو میں تمہاری دعا قبول کروں گا درحقیقت جو لوگ بڑائی میں میری عبادت سے اعراض کرتے ہیں وہ عنقریب ذلیل ہو کر جہنم میں داخل ہوں گے۔''

ان آیتوں سے جہاں اسباب و ذرائع کا اثبات ہوتا ہے وہیں ان سے اسباب و ذرائع پر عمل کی تاکید بھی ہوتی ہے۔''

صحیح مسلک:

اسباب و ذرائع کے باب میں قرآن و حدیث سے جس مسلک کا ثبوت ملتا ہے صرف وہی مسلک صحیح ہے اور وہ مسلک یہ ہے:

۱۔ اگر اسباب پر عمل کرنے والا ان پر مکمل اعتماد کر لے اور ان کو اختیار کرنے سے اس کو قرار آ جائے اور اطمینان قلب حاصل ہو جائے اور یہ سمجھ بیٹھے کہ یہ اسباب بذات خود اس کے مقصود کو بروئے کار لا سکتے ہیں؛ اس طرح وہ اسباب

Marfat.com

پیدا کرنے اور بنانے والے -مُسَبِّب- سے غافل ہو جائے اور اس سے اعراض برتنے لگے اور اس کی نگاہ اور توجہ اسباب ہی پر مرکوز ہو کر رہ جائے، تو یہ شرک ہے۔

۲۔ لیکن اگر وہ اسباب کی جانب اس خیال اور عقیدہ سے متوجہ ہو اور ان کو عمل میں لائے کہ اسباب پر عمل کا حکم دیا گیا ہے اور اسباب کو اختیار کر کے وہ حق بندگی ادا کر رہا ہے اور ان کو وہی درجہ دے رہا ہے جو اصلاً ان کو حاصل ہے اور جو اللہ نے انہیں دیا ہے اور اسباب پر عمل کرتے ہوئے وہ ''مسبب الاسباب'' سے غافل نہ ہو، تو یہی اللہ کی بندگی اور توحید ہے۔ [1]

۳۔ تیسری توحید:

ابواسماعیل ہروی نے توحید کی تیسری قسم کو ''اخص الخواص'' کی توحید قرار دیا ہے، اور اس کی تعریف میں بھی انہوں نے وہی صوفیانہ الفاظ اور تعبیرات استعمال کی ہیں جو توحید کی پہلی اور دوسری قسم، نیز تصوف کے دوسرے رموز اور مقامات کے بیان میں استعمال کی ہیں، میں پہلے ان کی عبارت کا واضح اور قابل فہم ترجمہ کر دیتا ہوں، پھر حافظ ابن القیم کا اس پر وہ تبصرہ نقل کروں گا جو انہوں نے "مدارج السالکین فی شرح منازل السائرین" میں کیا ہے۔ ہروی فرماتے ہیں:

''رہی تیسری توحید تو وہ ایسی توحید ہے جس کو ''حق'' نے اپنی ذات کے لیے خاص کر لیا ہے، اور جس کا وہ اپنے مقام و مرتبے کے اعتبار سے مستحق ہے اور جس کی ایک جھلک ہی اس نے اپنے منتخب بندوں میں سے کچھ بندوں کے باطن کو دکھائی ہے اور ان کو اس کا وصف بیان کرنے سے گونگا اور اس کو پھیلانے سے عاجز بنا دیا ہے۔''

''یہ وہ توحید ہے جس کی جانب اشارہ کرنے والوں کی زبانوں سے یہ اشارہ کیا جاتا ہے کہ یہ حادث ہونے کو ساقط اور غیر معتبر قرار دینے اور قدیم ہونے کو ثابت کرنے سے عبارت ہے، لیکن اس توحید کے حق میں یہ ''رمز'' ایک ایسی علت ہے جس کو غیر معتبر قرار دیے بغیر یہ توحید صحیح نہیں ہے۔''

''...... یہ وہ توحید ہے جس کا بیان اس کو مزید چھپا دیتا ہے، اس کا وصف اس سے متنفر کر دیتا ہے اور اس کی تفصیل اس کو مزید مشکل اور دشوار بنا دیتی ہے۔''

''اسی توحید کی طرف اہل ریاضت اور حال والے شوق سے دیکھتے ہیں، یہی اہل تعظیم کا مقصود ہے اور اسی کو ''جمع'' کی حقیقت بیان کرنے والے مراد لیتے ہیں۔''

''...... میں نے قدیم زمانے میں صوفیا کی توحید کے بارے میں ایک سائل کو جواب دیتے ہوئے تین اشعار

---

[1] ص ۳۸۹-۳۹۰، ج ۳

Marfat.com

کہے تھے:

ما وحّدَ الواحَد من واحد إذ کل من وحّده جاحِد

توحید من ینطق عن نعته عاریة أبطلها الواحد

توحیده إیاه توحیده و نعت من ینعته لاحد

''واحد کی توحید اللہ کے سوا کسی نے بیان ہی نہیں کی ہے، کیونکہ جس نے بھی اس کی توحید بیان کی ہے وہ اس کے حق کا انکاری ہے۔

اس شخص کی توحید جو اس کا وصف بیان کرتا ہے ''عاریت'' ہے جس کو ''واحد'' نے کالعدم کر دیا ہے۔ اللہ کی توحید وہی ہے جو اس نے خود بیان کی ہے اور جو اس کی توحید کا وصف بیان کرتا ہے تو یہ وصف ''الحاد'' ہے۔'' [1]

حافظ ابن القیم رحمہ اللہ نے ہروی کی عبارت کے ہر ہر فقرے کو واضح کر کے اس کے مَا لَهٗ وَ مَا عَلَيْهِ کو بیان کر دیا ہے ان کی یہ بحث بڑے سائز کے کوئی ۱۲ صفحات پر محیط ہے جس کا مکمل ترجمہ اس سے بھی زیادہ طویل ہوگا، لہٰذا طوالت سے بچنے کے لیے میں اس قیمتی بحث کا ایسا خلاصہ پیش کر دینا چاہتا ہوں جس سے ہروی کے دعووں کو سمجھنے اور ان کے بارے میں اسلامی نقطۂ نظر معلوم کرنے میں کوئی دقت نہ ہو، فرماتے ہیں:

''اللہ کے منتخب اور برگزیدہ بندے انبیاء تھے، جن سے افضل اللہ کے رسول تھے، اور رسولوں میں سب سے افضل ''اولوالعزم'' تھے اور ان میں افضل ترین ابراہیم خلیل اللہ اور محمد خلیل اللہ علیہما السلام تھے اور اللہ نے ان کے باطن کو جس توحید کی جھلک دکھائی تھی وہ بندوں کے علم و عرفان میں آنے والی کامل ترین اور صحیح ترین توحید تھی، اس کے سوا توحید کے باب میں جو کچھ بھی ہے وہ سب ''بڑ'' دعویٰ اور وسوسہ ہے۔ ہمارا اس بات پر ایمان ہے کہ ان تمام نبیوں اور رسولوں نے اس توحید کو اچھی طرح اور کھول کھول کر بیان کر دیا ہے اور اس کے ہر ہر پہلو کو بالکل واضح کر دیا ہے، کیونکہ یہی ان کی بعثت کا اصل اور بنیادی مقصد تھا، ایسی صورت میں یہ دعویٰ کسی طرح درست اور قابل قبول ہو سکتا ہے کہ اللہ کی مخلوق میں اس کے یہ برگزیدہ اور منتخب بندے، جو سب سے زیادہ علم و معرفت رکھتے تھے اور سب سے زیادہ قوت بیان کے مالک تھے اس توحید کے بیان سے عاجز اور گونگے تھے جس کی معرفت اللہ نے ان کو بخشی تھی اور لوگوں کو اس کی دعوت دینے کا ان کو مکلف بنایا تھا۔

یہ کون سی توحید ہے جس کو پھیلانے سے انبیاء اور رسول عاجز تھے، بلکہ ان کو اس کے بیان تک سے روک دیا گیا تھا، جبکہ قرآن یہ صراحت کرتا ہے کہ انہوں نے بلا استثنا یہ توحید بیان بھی کی اور اس کی دعوت بھی دی:

﴿وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ﴾ (الانبیاء: ۲۵)

[1] ص: ۱۱۲-۱۱۳

Marfat.com

''اور تم سے پہلے ہم نے کوئی بھی رسول نہیں بھیجا، مگر اس کی طرف یہی وحی کرتے رہے کہ درحقیقت میرے سوا کوئی معبود نہیں، سو میری ہی عبادت کرو۔''

اور سلسلۂ نبوت و رسالت کی آخری کڑی محمد بن عبداللہ ﷺ کو مخاطب کر کے فرمایا گیا ہے:

﴿قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ﴾ (الکھف: ۱۱۰)

کہہ دو، میں تو محض تمہاری طرح کا ایک انسان ہی ہوں، میری طرف وحی کی جاتی ہے کہ تمہارا معبود تو صرف ایک ہی معبود ہے۔''

اور جب نبی ﷺ نے معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یمن میں داعی اور امیر بنا کر بھیجا تو ان کو رخصت کرتے ہوئے فرمایا:

((إنك ستأتي قومًا أهل كتاب، فإذا جئتهم فادعهم إلى: أن يشهدوا أن لا إله إلا الله و أن محمدًا رسولُ الله.))

''تم ایسے لوگوں کے پاس جاؤ گے جو اہل کتاب ہیں تو جب ان کے پاس جانا تو ان کو یہ دعوت دینا کہ وہ یہ گواہی دیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد اللہ کے رسول ہیں۔'' ❶

کیا اس کے بعد بھی یہ بکواس قابل التفات ہے کہ توحید وہ ہے جس کا وصف بیان کرنے سے اللہ کے منتخب بندوں کو گونگا اور اس کو پھیلانے سے عاجز بنا دیا گیا ہے؟

اگر انبیاء اور رسولوں کو عمومی طور پر اور محمد ﷺ کو خصوصی طور پر توحید معلوم نہیں تھی تو پھر ان کے علاوہ کون ہے جس کو یہ توحید معلوم ہے؟ یہ سب اس صورت میں جبکہ اس سے وہ توحید مراد ہو جو اس کے لیے اس کی ذات کے ساتھ قائم ہے۔

اور اگر ہروی کی مراد وہ توحید ہو جو بندے کی صفت اور فعل ہے تو پھر یہ ان کے اس قول سے مطابقت نہیں رکھتی: ''جس کو حق نے اپنے لیے خاص کر لیا ہے اور جس کا وہ اپنے مقام کے اعتبار سے مستحق ہے'' اسی طرح یہ توحید ان تینوں اشعار سے بھی ہم آہنگ نہیں جو انہوں نے توحید کے بارے میں کسی سائل کو جواب دیتے ہوئے کہے ہیں، اور ان میں یہ دعویٰ کیا ہے کہ ''اس کی اپنی توحید ہی اصل ہے نہ کہ اس کے غیر کی۔''

''توحید کے بندے کی صفت اور فعل ہونے کی صورت میں یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ وہ اس کو پھیلانے اور عام کرنے سے عاجز و قاصر اور اس کو بیان کرنے سے گونگا ہے، کیونکہ جس چیز کا وجود بندے سے وابستہ ہے وہ اس کی تعبیر کر سکتا ہے اور اس کے لیے اس کو کھول کر بیان کرنا ممکن ہے۔''

لیکن اگر شیخ ہروی کی مراد یہ ہے کہ ''رب تعالیٰ ہی اپنے برگزیدہ بندوں کے دلوں مس اپنی توحید بیان کرنے والا

❶ بخاری: ۱۴۹۶، مسلم: ۱۹

Marfat.com

ہے، نہ کہ وہ اس کی توحید بیان کرنے والے ہیں، جیسا کہ ان کے تینوں اشعار سے معلوم ہو رہا ہے کہ ''اللہ عز وجل کی توحید اس کے سوا کسی نے بیان ہی نہیں کی ہے اور ہر وہ شخص، جس نے اللہ کی توحید بیان کی ہے تو وہ اس کی توحید کی حقیقت کا منکر ہے تو اس قول میں حق بھی ہے اور الحاد بھی جس کی تفصیل یہ ہے:

اگر اس قول: ''رب تعالیٰ ہی اپنے برگزیدہ بندوں کے دلوں میں اپنی توحید بیان کرنے والا ہے نہ کہ وہ اس کی توحید بیان کرنے والے ہیں'' کا ظاہری مفہوم مراد ہے یعنی اللہ خود اپنا موحد ہے نہ کہ غیر، تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنے برگزیدہ بندوں کے اندر حلول کر لیا ہے اسی طرح وہ اپنے اولیاء کے دلوں میں اپنی ذات کے لیے موحد بن گیا ہے اور یہ ان کے ساتھ اتحاد کر لینے اور ان کے اندر حلول کر جانے کی وجہ سے، تو یہ عین نصاریٰ کا قول ہے، بلکہ اس سے بھی زیادہ برا ہے، اس لیے کہ نصاریٰ صرف مسیح کے اندر اللہ کے حلول کے قائل ہیں، جبکہ صوفیا نے اس کو ہر توحید بیان کرنے والے کے لیے عام کر دیا ہے، بلکہ وحدۃ الوجود کا عقیدہ رکھنے والوں کا دعویٰ ہے کہ توحید بیان کرنے والا اور جس کی توحید بیان کی جائے یعنی مُوَحِّد اور مُوَحَّد دونوں ایک ہیں اور تعدد کا حقیقت میں کوئی وجود نہیں۔

لیکن اگر مذکورہ قول سے ان کی مراد یہ ہے کہ ''اللہ ہی نے ان کو اپنی توحید کے بیان کی توفیق دی ہے، بایں معنی کہ اسی نے ان کو یہ الہام کیا ہے کہ وہ اس کی توحید بیان کریں تو ان کو اپنی توحید کی معرفت بخش کر، اس کو ان کے دلوں میں ڈال کر اور اس کو اُن کی زبانوں پر جاری کر کے وہ خود اپنا مُوحِد ہے تو یہ معناً صحیح ہے، لیکن اس سے بندوں کے فعل کی نفی نہیں ہوتی، یعنی یہ نہیں کیا جا سکتا کہ اللہ ہی اپنی توحید بیان کرنے والا ہے نہ کہ اس کے بندے؛ یہ قول شرع، عقل اور حس تینوں اعتبار سے باطل ہے، کیونکہ اللہ کی توفیق، عون اور حکم سے اس کی توحید بیان کرنے والوں پر ''مُوحِد'' ہونے کا اطلاق صحیح ہے۔

ایک ضروری وضاحت:

حافظ ابن القیم نے ہروی کی صوفیانہ اور ملحدانہ عبارتوں کو قابل قبول بنانے کے لیے ان کی جو دور از کار توجیہات کی ہیں وہ ان کی طہارت قلبی پر دلالت کرتی ہیں، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ابو اسماعیل ہروی نے توحید کی اس تیسری قسم سے ''وحدۃ الوجود'' ہی مراد لیا ہے جس کی دلیل یہ ہے کہ انہوں نے اس کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے:

((و إلی هذا التوحید شخص أهل الریاضة و ارباب الأحوال و إیاه عنی المتکلمون فی عین الجمع))

''اسی توحید کی جانب اہل ریاضت اور ''حال'' والوں نے شوق بھری نظروں سے دیکھا ہے اور ''جمع'' کی حقیقت کے بارے میں کلام کرنے والوں نے یہی توحید مراد لی ہے۔''

یہ عبارت اور اس کا آخری فقرہ اس امر پر بصراحت دلالت کرتا ہے کہ یہ وحدۃ الوجود کے قائلین کی توحید ہے،

Marfat.com

کیونکہ صوفیا کے نزدیک جمع کے معنی ہیں ''خدا کے ساتھ سالک کا اس طرح جمع ہونا اور متحد ہونا کہ اس کی مشیت، صفات حتیٰ کہ اس کا وجود بھی اس ذات کے ساتھ جمع ہو جائے، غزالی نے اس مقام کو مجازاً اتحاد اور حقیقت کی زبان میں توحید کہا ہے۔ ❶

حافظ ابن القیم رحمہ اللہ نے منازل السائرین کے مصنف شیخ ابو اسماعیل ہروی کے اس دعوے کی، کہ ''اس توحید کی جو جھلک حق تعالیٰ نے اپنے منتخب بندوں کے باطن کو دکھائی ہے وہ اس کے بیان اور اس کی تبلیغ سے گونگے اور عاجز رہے ہیں'' تردید کرتے ہوئے قرآن و حدیث سے کوئی دلیل نہیں دی تھی جس کی وجہ یہ ہے کہ ''مدارج السالکین'' کے گزشتہ صفحات میں وہ توحید کے تمام پہلوؤں کو پوری تفصیل سے بیان کر چکے تھے اور سورۂ فاتحہ کے مطالب کی بے نظیر تفسیر کرتے ہوئے وہ قرآن و حدیث کے دلائل سے یہ واضح کر چکے تھے کہ اللہ و رسول کے نزدیک مطلوب توحید کیا ہے؟

لیکن میں نے یہ ضروری محسوس کیا کہ ان کی بحث کا خلاصہ پیش کرتے ہوئے میں قرآن و حدیث سے یہ ثابت کردوں کہ اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ اور منتخب ترین بندوں: انبیاء اور رسولوں نے کفر و اسلام کے درمیان حد فاصل ''توحید الوہیت'' کو بیان بھی کر دیا ہے اور اس کی تبلیغ بھی کر دی ہے، لہٰذا ان کی بحث کے درمیان یہ ضروری اضافہ اور ادراج میرا ہے۔

صوفیا کی توحید اہل شرک اور کفر کی توحید ہے:

شیخ ہروی نے توحید کو تین حصوں میں تقسیم کرتے ہوئے جو پہلی توحید بیان کی ہے وہ توحید الوہیت و عبادت ہے اور ان کی یہ بات صد فیصد درست اور کتاب و سنت کی صراحتوں کے مطابق ہے کہ یہ توحید اسلام اور کفر کے درمیان حد فاصل ہے، لیکن انہوں نے یہ دعویٰ کر کے کہ یہ عوام کی توحید ہے، یہ صراحت کر دی، بلکہ یہ اعتراف کر لیا ہے کہ اس توحید کا عقیدہ صوفیا نہیں رکھتے ہیں، بلکہ ان کی توحید دوسری اور تیسری توحید ہے؛ دوسری توحید کے بارے میں ان کا ارشاد ہے: ((یصح بعلم الفنا و یصفو فی علم الجمع)) ''یہ توحید علم فنا کے ساتھ صحیح قرار پاتی ہے اور جمع کے علم میں داخل ہو کر خالص ہوتی ہے۔'' ❷

اور تیسری توحید کے بارے میں فرمایا ہے: ((و إیاہ عنی المتکلمون فی عین الجمع)) ''اور جمع کی حقیقت بیان کرنے والے اسی توحید کو اپنی مراد اور مقصود قرار دیتے ہیں۔'' اور چونکہ فنا اور جمع دونوں تصوف کے مقامات اور مدارج ہیں، اسلام کے نہیں، جیسا کہ آگے واضح کیا جائے گا، اس لیے صوفیا کی یہ دونوں توحید اہل اسلام کی توحید نہیں ہے، کیونکہ فنا، بقا، فرق، جمع اور جمع الجمع وغیرہ کے قرآن و حدیث میں صراحتاً یا اشارۃً مذکور نہ ہونے کی وجہ سے ان کی ترجمانی یا ان پر مبنی توحید بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، تابعین، محدثین، ائمہ اربعہ رحمہم اللہ اور اہل سنت و جماعت

❶ تصوف اور شریعت، ص: ۶۰-۶۱ ❷ ص: ۱۱۲

Marfat.com

کی توحید نہیں ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر یہ کن لوگوں کی توحید ہے، دوسرے لفظوں میں توحید کو تین قسموں میں تقسیم کرنے کا ماخذ و مصدر کیا ہے؟

اس اہم سوال کا جواب اس عبارت میں موجود ہے جو مولانا ابو الکلام آزاد رحمہ اللہ نے سورۂ فاتحہ کی تفسیر کے حواشی میں تحریر فرمائی ہے وہ توحید و شرک سے متعلق اپنی معرکۃ الآراء بحث کے ضمن میں تحریر فرماتے ہیں:

> ''قرآن سے پہلے علوم وفنون کی طرح مذہبی عقائد میں بھی خاص و عام کا امتیاز ملحوظ رکھا جاتا تھا اور خیال کیا جاتا تھا کہ خدا کا ایک تصور تو حقیقی ہے اور خواص کے لیے ہے، ایک تصور عملی ہے اور عوام کے لیے، چنانچہ ہندوستان میں خدا شناسی کے تین درجے قرار دیے گئے تھے؛ عوام کے لیے دیوتاؤں کی پرستش، خواص کے لیے براہ راست خدا کی پرستش، اخص الخواص کے لیے وحدۃ الوجود کا مشاہدہ، یہی حال فلاسفۂ یونان کا تھا؛ وہ خیال کرتے تھے کہ ایک غیر مرئی اور غیر مجسم خدا کا تصور صرف اہل علم وحکمت ہی کر سکتے ہیں، عوام کے لیے اسی میں امن ہے کہ دیوتاؤں کی پرستاری میں مشغول رہیں۔
>
> لیکن قرآن نے حقیقت وعمل یا خاص و عام کا کوئی امتیاز باقی نہ رکھا، اس نے خدا پرستی کی ایک ہی راہ دکھائی اور سب کے لیے صفات الٰہی کا ایک ہی تصور پیدا کیا وہ حکماء وعرفاء سے لے کر جہال و عوام تک سب کو ایک ہی جلوہ دکھاتا ہے اور سب پر اعتقاد و ایمان کا ایک ہی دروازہ کھولتا ہے۔ اس کا تصور جس طرح ایک حکیم و عارف کے لیے سرمایۂ تفکر ہے، اسی طرح ایک چرواہے اور دہقان کے لیے سرمایۂ تسکین۔'' ❶

بات بالکل صاف ہوگئی اس لیے نہیں کہ مولانا ابو الکلام کی تحریر میں اس کی دلیل مل گئی، نہیں، بلکہ اس لیے کہ اولاً تو قرآن وحدیث میں عقیدہ وعمل کے اعتبار سے لوگوں کو مختلف خانوں اور درجوں میں تقسیم نہیں کیا گیا ہے ثانیاً فنا و بقا اور اتحاد و وحدۃ الوجود کا تصور یا عقیدہ یونان کے بت پرستوں اور ہندوستان کے مشرکوں کا تصور اور عقیدہ ہے۔ اور ہروی نے یہ اعتراف کیا ہے کہ توحید کی دوسری اور تیسری قسمیں فنا و بقا اور جمع کے قائلین کے لیے خاص ہیں اس طرح صوفیا اسلام کے بنیادی عقیدے توحید الوہیت وعبادت میں بھی اہل اسلام کے ساتھ نہیں ہیں!!

صوفیا کے بعض عقائد کا بیان:

یوں تو گزشتہ صفحات میں صوفیا کے جن افکار کا جائزہ لیا گیا ہے اور ''منازل السائرین'' میں بیان کردہ توحید کا جس دیانت داری کے ساتھ تعارف کرایا گیا ہے اس سے ان کے عقائد کا تعین ہو جاتا ہے، پھر بھی یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان کے بعض بنیادی عقائد بیان کر دیے جائیں، تاکہ قارئین کو یہ معلوم ہو جائے کہ احسان و تزکیۂ نفس کی مدعی یہ مسلمان نما جماعت درحقیقت ایسے عقائد رکھتی ہے جو ملحدانہ بھی ہیں اور مشرکانہ بھی۔

❶ ص: ۵۲۳-۵۲۵

Marfat.com

فنا و بقا:

ڈاکٹر محمد عبد عبدالحق انصاری مشہور صوفی بزرگ شیخ احمد سرہندی کے افکار پر سند کا درجہ رکھتے ہیں ان کی کتاب تصوف اور شریعت اس اعتبار سے ایک منفرد کتاب ہے کہ اس میں تصوف کا بے لاگ جائزہ لیا گیا ہے اور اس کی بہت سی باتوں پر تنقید کرتے ہوئے ان کو غیر اسلامی بتایا گیا ہے، بایں ہمہ ان کی اس کتاب میں تصوف کو ایک روحانی طریقہ تسلیم کیا گیا ہے۔

اسلام ایک مکمل دین ہے اس میں عقیدے سے لیکر عمل تک ہر چیز کے لیے مکمل ہدایت موجود ہے وہ انسان کے جسم و روح ہر ایک کے تزکیہ اور تطہیر کا اپنے اندر سامان رکھتا ہے۔ لہٰذا اسلامی نقطۂ نظر سے کسی غیر اسلامی مسلک حیات کو روحانی کہہ کر قبول کرنا یا اس کی تحسین کرنا اور کسی دوسرے کو غیر روحانی کہہ کر ردّ کرنا غیر مقبول ہے اور اس سے اسلام کے غیر کامل ہونے کا تاثر ملتا ہے، اور اس عقیدہ کا اظہار ہوتا ہے کہ اس میں قلب و روح کی تطہیر کا کوئی سامان نہیں ہے۔

تصوف میں جو باتیں اسلامی ہیں اور جن کا ذکر کتاب و سنت میں آیا ہے وہ بھی اپنی ٹھیٹھ اور خالص شکل میں نہیں ہیں؛ احسان، تزکیۂ نفس اور تہذیب اخلاق وغیرہ بھی جو اسلام کے نمایاں عنوان ہیں اور جن کا نعرہ لگا کر صوفیا تصوف کو صحیح ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں یہ بھی ان کے یہاں اپنا خاص مفہوم رکھتے ہیں اور ان کے حصول کے طریقے ان کے مشائخ کے بنائے ہوئے ہیں۔

دراصل جو چیزیں تصوف کو غیر اسلامی یا اسلام کے متوازی ایک دین قرار دیتی ہیں وہ ان کے عقائد ہیں؛ اسلام میں عقائد کا شمار اجتہادی مسائل میں نہیں ہوتا کہ ان میں صواب و خطأ کے احتمال کا دعویٰ کر کے ان کو نظر انداز کر دیا جائے، اسلام میں عقائد منصوص ہیں لہٰذا جو عقیدہ بھی کتاب و سنت کی نصوص سے متصادم ہوگا وہ مسترد کر دیا جائے گا خاص طور پر توحید کا عقیدہ خالص اور بے آمیز ہونا چاہیے، اگر اس میں شرک اور الحاد کی ایک بات بھی داخل ہوگئی تو پھر توحید توحید نہیں رہی اور اس توحید کے مدعی کے اعمال بھی ناقابل قبول ہو گئے، اور افسوس یہ ہے کہ صوفیا کے یہاں وہ توحید پائی ہی نہیں جاتی جس کی دعوت دینے کے لیے تمام انبیاء اور رسول مبعوث کیے گئے تھے اور جو توحید اس آخری دین، اسلام کا طرۂ امتیاز ہے۔ شیخ ابو اسماعیل ہروی کی کتاب ''منازل السائرین'' میں مذکور توحید کے مسائل کا میں نے جو بے لاگ جائزہ لیا ہے اس سے میرے اس دعوے کی تائید ہوتی ہے اور میں صوفیا کے جن عقائد کو بیان کرنے جا رہا ہوں ان سے میرا یہ دعویٰ مزید منقح ہو جائے گا۔

تصوف میں فنا و بقا کا عقیدہ سارے فساد کی جڑ ہے، ڈاکٹر انصاری کے مطابق بعض صوفیا کا دعویٰ ہے کہ ''نیکیاں کرنا، اور برائیوں سے اجتناب کرنا، یا اللہ تعالیٰ کی فرماں برداری کرنا اور اس کی نافرمانی سے بچنا فنا و بقا ہے۔''[1]

---

[1] تصوف اور شریعت: ۱/ ۵۷

Marfat.com

شیخ ہروی نے ''باب الفناء'' کے تحت جو کچھ لکھا ہے اس کا آغاز سورۂ رحمٰن کی اس آیت مبارکہ سے کیا ہے:

﴿كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ٥ وَيَبْقَى وَجْهُ رَبِّكَ﴾ (الرحمٰن: ٢٦-٢٧)

''زمین پر جو کچھ ہے سب فنا ہو جانے والا ہے اور تیرے رب کا چہرہ باقی رہے گا۔''

تو عرض ہے کہ فنا و بقا نہ مذکورہ قول سے عبارت ہے اور نہ قرآن کی اس آیت میں تمام مخلوق کے فنا ہو جانے اور اللہ کے باقی رہنے کی خبر اس پر دلالت کرتی ہے۔

اسی طرح عبدالکریم قشیری نے اپنے ''رسالہ'' میں فنا و بقا کی جو تعریف کی ہے وہ بھی حق و باطل کا مجموعہ ہے۔

دراصل فنا و بقا وحدۃ الوجود کی جانب سالک -صوفی- کا پہلا قدم ہے ڈاکٹر انصاری نے اس کا تعارف نہایت مختصر مگر عام فہم اسلوب میں کرا دیا ہے، پہلے انہوں نے نہایت جرأت کے ساتھ یہ اعلان کر دیا ہے کہ ''فنا فضائل اخلاق کے اختیار کرنے اور رذائل سے بچنے یا اللہ کی اطاعت اور اس کی نافرمانی سے اجتناب کا نام نہیں، بلکہ فنا ایک حال ہے، یہ ایک احساس ہے اور ایک کیفیاتی تجربہ ہے۔''

اس کے بعد تحریر فرماتے ہیں:

''فنا اور بقا ایک ہی کیفیت کے دو رخ ہیں؛ اس کیفیت پر ایک زاویے سے نظر ڈالیے تو یہ سالک کی نفی ہے، اس کے ارادے، صفات، خودی، بلکہ خود اس کے وجود کی نفی ہے دوسرے زاویے سے دیکھیے تو یہ خدا کے ساتھ سالک کا جمع ہونا اور اس طرح متحد ہونا ہے کہ اس کی مشیت، صفات اور حتیٰ کہ اس کا وجود بھی اس ذات کے ساتھ ضم ہو جائے۔'' [1]

ڈاکٹر انصاری نے اسلام کے عقیدۂ توحید کے تناظر میں فنا و بقا کے اس تجربے پر کوئی حکم نہیں لگایا ہے، لیکن اپنی اس کتاب کے مقدمے میں اس کے بارے میں شیخ احمد سرہندی کی رائے نقل کی ہے:

''صوفیہ کا طریقہ فنا و بقا سے عبارت ہے، یہی روحانی تجربہ اس کا امتیازی پہلو ہے، جہاں تک طریقۂ نبوت کا تعلق ہے، تو اس میں اس تجربے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔'' [2]

بات بالکل صاف ہو گئی، جس روحانی تجربہ کا رسول اللہ ﷺ کی سنت اور طریقہ سے کوئی تعلق ہی نہ ہو، کیا وہ اسلامی روحانی تجربہ ہو سکتا ہے اور کیا اسلامی نقطۂ نظر سے ایسا تجربہ کرنا جائز بھی ہے، بطور عقیدہ اختیار کرنا تو دور کی بات ہے، کیونکہ قرآن کے مطابق امت کے مزکی اور مربی تنہا رسول اللہ ﷺ تھے، اپنی حیات پاک میں آپ یہ قرآنی فریضہ اپنے قول و فعل سے انجام دیتے تھے اور اس دنیا سے آپ کی رحلت کے بعد یہ فریضہ آپ کی محفوظ قولی اور فعلی سنت کو منتقل ہو گیا ہے جس کا صحیح علم رکھنے والے محدثین تھے، ہیں اور قیامت تک رہیں گے، نہ کہ صوفیا جو مسلمانوں میں سنت

---

[1] ص: ٦٠ [2] ص: ٨

Marfat.com

کا سب سے کم علم رکھنے والے بھی ہیں اور سنت سے سب سے زیادہ دور بھی۔

فنا و بقا کا عملی طریقہ:

ڈاکٹر محمد عبدالحق انصاری نے شاہ ولی اللہ کی کتاب "القول الجمیل" کے حوالہ سے صوفیا کے تین بڑے سلسلوں: قادریہ، چشتیہ اور نقشبندیہ میں رائج فنا و بقا کے عملی طریقہ کو بیان کیا ہے، جس کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

''سالک اپنے عقائد درست کرنے، بری عادتیں ترک کرنے اور فرائض و نوافل کا اہتمام کرنے کے ساتھ اسم ذات ''اللہ'' کا ذکر بالجہر کرے جو صوفیا کے بتائے ہوئے مخصوص طریقہ سے ہونا چاہیے اس سے ذہن اللہ تعالیٰ پر مرکوز ہو جائے گا اور عشق الٰہی کی آگ دل میں بھڑک اٹھے گی۔''

اس مرحلہ کے بعد سالک مراقبہ کرے اور اس میں یہ تصور کرے کہ اللہ اس کے سامنے ہے اور اس کو دیکھ رہا ہے، اللہ سب کچھ سن رہا ہے اور اللہ تعالیٰ میرے ساتھ ہے اور ساتھ ہی چشم تصور میں یہ دیکھے کہ اللہ تعالیٰ سچ مچ سامنے موجود ہے اور مجھے دیکھ رہا ہے اللہ تعالیٰ کی لامکانیت کے اثبات کے ساتھ اس کی ذات میں اتنا غور وفکر کرے کہ اس میں جذب ہو جائے، ساتھ ہی آیاتِ صفات میں سے کسی آیت کا ورد کرے، مثلاً ﴿هُوَ مَعَكُمْ أَيْنَمَا كُنتُمْ﴾ (الحدید: ٤) ''وہ تمہارے ساتھ ہے جہاں بھی تم ہو۔'' ﴿فَأَيْنَمَا تُوَلُّوا فَثَمَّ وَجْهُ اللَّهِ﴾ (البقرة: ١١٥) ''تو تم جس طرف بھی رخ کرو وہیں اللہ کا چہرہ ہے۔'' ﴿وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ۝﴾ (ق: ١٦) ''اور ہم اس کی رگ جاں سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں۔''

اس طرح سالک پر اللہ تعالیٰ میں استغراق کا عالم طاری ہو جائے گا اور وہ خود کو خدا میں جذب ہوتا محسوس کرنے لگے گا۔ اگر سالک آیت کریمہ ﴿كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ﴾ (القصص: ٨٨) ''ہر چیز ہلاک ہو جانے والی ہے بجز اس کے چہرہ کے۔'' کا ورد کرے گا تو دنیا سے بے رغبتی پیدا ہو جائے گی اور اس پر سکر و محویت کا عالم طاری ہو جائے گا، پھر مکمل طور پر اللہ تعالیٰ کی ذات میں ضم ہو جائے گا۔''[1]

تبصرہ:

ڈاکٹر انصاری نے فنا و بقا کا عملی طریقہ جس کتاب کے حوالہ سے بیان کیا ہے وہ ایک ایسے عالم کی تصنیف ہے جس کی دقت اور صحت بیانی مسلم اور ناقابل تردید ہے میری مراد شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ سے ہے، جنہوں نے اس طریقہ کو تصوف کے معروف تین سلسلوں: قادریہ، چشتیہ اور نقشبندیہ میں رائج اور معمول بہ قرار دیا ہے اس طرح اس پر تبصرہ تصوف ہی کے طریقۂ فنا و بقا پر تبصرہ ہوگا اور کوئی اس تبصرہ کو یہ کہہ کر رد نہیں کر سکے گا کہ یہ تصوف کا طریقہ نہیں ہے۔

اس طریقہ میں جن اعمال کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں وہ سب خانہ ساز ہیں اور باطل ہیں، لہٰذا ان سے برآمد

[1] ص: ۵۷-۵۹، ج ۱

Marfat.com

ہونے والا نتیجہ بھی باطل ہے۔

صوفیا اسلامی عقائد کا علم ہی نہیں رکھتے کہ وہ عالم فنا و بقا میں تجرباتی قدم رکھنے والے سالک کے عقائد درست کریں، جہری ذکر غیر منصوص ہونے کی وجہ سے مردود ہے، اسم ذات ''اللہ'' کا مفرد ذکر اپنے مطلب و مقصود کے غیر واضح ہونے اور کتاب و سنت میں غیر مذکور ہونے کی وجہ سے نا قابل قبول ہے، عشق الٰہی قرآن و حدیث میں مذکور نہ ہونے اور شہوانی جذبہ ہونے کی وجہ سے مطلوب نہیں مردود ہے اس لیے دل میں اس عشق کی بھڑکنے والی آگ سالک کو جلا کر خاکستر کر دے گی، صوفیا آیات صفات کو حقیقی معنوں میں نہیں لیتے، بلکہ متکلمین کے طرز پر ان کی تاویل کرتے ہیں اس طرح ان کا ورد سالک کے لیے یا تو بے سود ہوگا یا اس کو غلط راہ پر ڈال دے گا۔ چونکہ خارجی دنیا میں کوئی شے اللہ کے مانند نہیں ہے اس لیے اس کو اس دنیا میں چشم تصور سے بھی نہیں دیکھا جا سکتا اس کی جو معرفت ممکن ہے وہ اس کے منصوص اسماء و صفات کے علم کے ذریعہ ممکن ہے۔

البتہ فنا و بقا کے اس تجربہ یا عملی طریقہ سے جو چیز یقینی طور پر حاصل ہوتی ہے وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ نعوذ باللہ ''اتحاد'' کا عقیدہ ہے جس کا معروف نام ''وحدۃ الوجود'' کا عقیدہ ہے یعنی وجود صرف ایک ہے یعنی اللہ تعالیٰ کا وجود اس کے سوا کوئی وجود نہیں۔ اس کی طرف فنا و بقا کے مذکورہ بالا تجربہ کے آخر میں واضح اشارہ موجود ہے: پھر مکمل طور پر اللہ تعالیٰ کی ذات میں ضم ہو جائے گا۔'' حلول اور وحدۃ الوجود کی تفصیلی وضاحت آگے آ رہی ہے۔

فنا و بقا کی مقبول صورت:

حافظ ابن القیم نے مدارج السالکین میں فنا و بقا کے مسئلہ میں بڑی تفصیل سے بحث کی ہے اور ہروی کے سورۂ رحمٰن کی آیت: ﴿كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ٥ وَيَبْقَى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ ٥﴾ سے اس پر استدلال کو بے محل قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ اس آیت مبارکہ میں تمام مخلوق کے فنا اور ہلاک ہونے اور اللہ عز و جل کے ہمیشہ باقی رہنے کی جو خبر دی گئی ہے وہ صوفیا کا فنا و بقا نہیں ہے۔ پھر انہوں نے اس کو صحیح مفہوم پر محمول کیا ہے، لکھتے ہیں:

کتاب اور سنت میں اور صحابہ اور تابعین کے کلام میں نہ تو فنا کی مدح آئی ہے اور نہ مذمت اور صوفیا جس معنی میں اسے استعمال کرتے ہیں اس معنی میں اس لفظ کا استعمال نہیں ہوا ہے حتیٰ کہ متقدمین مشائخ طریق نے بھی اس کا ذکر نہیں کیا ہے اور انہوں نے نہ تو اس کو مقصد و غایت قرار دیا ہے اور نہ مقام؛ جبکہ متقدمین اس میدان میں کمال کے زیادہ حق دار تھے اور ہر عمدہ مقصد کی طرف سبقت کرنے والے تھے۔''

متقدمین سے مراد پہلی صدی ہجری کے صلحاء ہیں جو کتاب و سنت کی سختی سے پابندی کرتے تھے اور صلاح و تقویٰ اور احسان و تزکیۂ نفس اور زہد و توکل کی جانب خصوصی توجہ دیتے تھے؛ لیکن معروف معنی میں صوفی نہ تھے اور نہ انہوں نے اس کے لیے کوئی خاص اصطلاح ہی ایجاد کی تھی، دوسری صدی ہجری میں عبادت میں غلو، گوشہ نشینی، کثرت صوم اور شب

Marfat.com

بیداری کا رجحان پیدا ہونا شروع ہوا۔

ابو عبداللہ حارث محاسبی متوفی ۲۴۳ھ مطابق ۸۵۷ء پہلا صوفی ہے جس نے تصوف میں متکلمین اور فلاسفہ کے افکار داخل کیے، اس کے بعد حلول کا عقیدہ پیدا ہوا اور قرآن پاک کی باطنی تفسیر کا آغاز ہوا اور نئی نئی اصطلاحات وضع کی گئیں۔

حافظ ابن القیم اہل توحید کے فنا کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ان کی فنا اللہ تعالیٰ کی ربوبیت اور قیومیت کے مظاہر کے مشاہدے میں غرق ہو جانے اور فنا ہونے سے عبارت ہے اس طرح وہ صرف اس کو خالق، رازق، معطی، مانع اور نفع وضرر کا مالک سمجھتے ہیں اور یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ اللہ کے ماسوا کوئی اور نفع وضرر کا مالک نہیں ہے، اسی کے ہاتھ میں تدبیر کائنات ہے اور بندہ اس کے مشاہدے میں اس کے ماسوا کے مشاہدے سے فانی اور معدوم ہو جاتا ہے اور فرائض اور نوافل کے ذریعہ بلند درجات حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

اور الوہیت کے مسئلہ میں موحد کی فنا یہ ہے کہ وہ ماسوی اللہ کے ارادے، محبت، اس کی طرف انابت و رجوع، اس پر توکل، اس سے خوف و امید اور اس کی تعظیم و اجلال سے فانی اور معدوم ہو جائے اور اس کی یہ ساری صفات معبود حقیقی اللہ کے لیے خاص ہو جائیں۔ ❶

علامہ شیخ عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز رحمہ اللہ "منهاج الكرامه فی شرح كتاب الاستقامه" میں تحریر فرماتے ہیں:

> "صوفیا فنا سے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے مشاہدے کے سوا ہر چیز سے فانی ہو جانے اور غافل ہو جانے یا خاطر میں نہ لانے کی تعبیر کرتے ہیں، وہ اپنے خیال میں اس کی عظمت و کبریائی اور اپنے اوپر اس کے حق کا مشاہدہ کرتے ہیں اور ان کے سوا ہر چیز کا شعور کھو دیتے ہیں اور ان کے سوا ہر چیز کو گھٹاتے اور کم کرتے جاتے ہیں، یہاں تک کہ اس چیز نے ان کو بہت سی معصیتوں میں مبتلا کر دیا اور بالآخر "وحدة الوجود" تک پہنچا دیا، اور اپنی عقل کی پاسداری نہ کرنے کی وجہ سے "فنا" کے عقیدے نے ان کو عظیم ترین برائیوں اور سنگین بگاڑ سے ہم کنار کر دیا اور انہوں نے اللہ کے اوامر و نواہی کو محل فکر و نظر بنانے کے بجائے "جمع" کو محل فکر و نظر بنا لیا اور اس اعتبار سے اللہ کی ذات میں غور و فکر شروع کر دیا کہ وہی سب کچھ ہے اور اپنی حیرانی اور خود فراموشی میں طاعت اور نافرمانی، خیر و شر، عبد اور معبود اور اللہ اور عابد کے مابین تمیز کھو بیٹھے اس طرح وہ بہت بڑی برائی اور سنگین فساد کے مرتکب ہو گئے اور ایسی غلطیاں کرنے لگے جن کا انجام غیر مستحسن ہے۔

فنا کا یہی وہ پہلو ہے جس کو مصنف رحمہ اللہ نے -ابن تیمیہ- بیان کیا ہے اور لکھا ہے کہ ایسا عقیدہ رکھنے والا گمراہ اور دائرۂ اسلام سے خارج ہے، اِلا یہ کہ وہ نادان ہو اور نادانی میں ایسی باتیں کہہ گیا ہو، ایسی صورت میں اس کو بتایا جائے گا

❶ ص: ۲۸۹-۲۹۰، ج ۳

Marfat.com

اور دلائل کے ذریعہ اس کی غلطی واضح کی جائے گی۔''

فنا کی ایک دوسری قسم مومنین اور اہل توحید کی فنا ہے، یہ غیر اللہ کی عبادت سے فنا اور اعراض اور غیر اللہ کی عبادت کا انکار ہے، معاصی کے ارتکاب سے فنا ہے، اللہ کی وحدانیت، اس کے لیے اخلاص، اس پر ایمان، اس کی شریعت کی پیروی، اس کے امر ونہی کی تعظیم سے عبارت ہے، یہی رسولوں اور ان کے پیروؤں کی فنا ہے۔ ❶

صحیح نقطۂ نظر:

صوفیا کی تعبیرات اور اصطلاحات ادائے مطالب میں قاصر رہنے کے ساتھ ان کے خاص عقائد اور افکار کی ترجمانی کرتی ہیں ان کو تصریحات کے بجائے ''اشارئیے'' کہنا زیادہ صحیح ہے، ان تعبیرات اور اصطلاحات کو، ان کی تاویل کر کے صحیح اسلامی عقائد کا ترجمان بنانے کے لیے بڑے تکلفات سے کام لینا پڑتا ہے، جیسا کہ حافظ ابن القیم اور علام ابن باز نے اپنی نیک نیتی کے جذبے سے کیا ہے، لیکن چونکہ ایسا کرنے سے یہ تاثر ملتا ہے کہ صوفیا نے یہ تعبیرات اور اصطلاحات نیک مقاصد کے جذبے سے وضع کی ہیں، جو امر واقعہ کے بالکل خلاف ہے، اس لیے ان کی عبارتوں کو تکلف کر کے صحیح معنی پہنانا اور ان کو صحیح مفہوم پر محمول کرنا ایک طرح سے ان کی ہم نوائی کرنا ہے جو اپنے نتائج کے اعتبار سے حد درجہ سنگین اور خطرناک ہے، کیونکہ جو لوگ تصوف کو درست مانتے ہیں، یا کم از کم اس کے لیے اپنے دلوں میں نرم گوشہ رکھتے ہیں وہ ابن القیم اور ابن باز جیسے بلند قامت علمائے اسلام کے اس طرز عمل سے تصوف کے صحیح مسلک حیات ہونے پر استدلال کرتے ہیں، جبکہ ضرورت اس کی ہے کہ تصوف کے مسئلے میں پوری وضاحت اور صاف گوئی کے ساتھ نیز دلائل کی زبان میں یہ بتا دیا جائے کہ تصوف اپنی بعض باتوں کے صحیح ہونے کے باوجود، عقیدہ وعمل کے اعتبار سے اسلام کے بالکل متوازی مسلک حیات ہے اور صوفیا، خاص طور پر ان کے اکابر کے عقائد غیر اسلامی، بلکہ مشرکانہ اور ملحدانہ ہیں اور عقیدۂ توحید جو اسلام کا طرۂ امتیاز ہے صوفیا کے یہاں پایا ہی نہیں جاتا۔

جمع:

یہ تصوف کا نہایت اہم مقام ہے، بلکہ یہی صوفیا کے ''تجربۂ فنا و بقا'' کا حاصل ہے۔ جمع کے معنی دو یا دو سے زیادہ متفرق اور منتشر چیزوں کو ایک دوسرے کے ساتھ جمع کر دینا اور ملا دینا ہے، اس کی ضد ''فرق یا تفریق'' ہے۔

فنا اور بقا کی بحث میں یہ بتایا گیا تھا کہ فنا سے مراد، سالک - راہ سلوک کا مسافر - کے ارادے، صفات، خودی، بلکہ خود اس کے وجود کی نفی ہے اور بقا کے معنی ہیں کہ وہ اللہ کے ساتھ اس طرح جمع اور متحد ہو جائے کہ اس اس کی مشیت، صفات، حتیٰ کہ اس کا وجود بھی اس کے ساتھ ضم ہو جائے اور مل جائے۔ اس طرح جمع اتحاد کا مترادف اور ہم معنی ہے۔

ڈاکٹر محمد عبدالحق انصاری تحریر فرماتے ہیں:

❶ ص: ۵۷۰-۵۷۱

Marfat.com

''جمع واتحاد کے دو مدارج بتائے گئے ہیں، پہلے درجے میں سالک اپنے کو خدا کی ذات میں متحد پاتا ہے، لیکن اس کے ساتھ وہ اپنے کو ایک معنی میں غیر بھی سمجھتا ہے۔ تمام صوفیہ اسے مقام جمع کہتے ہیں۔ دوسرے درجے میں غیریت کا احساس بالکلیہ ختم ہو جاتا ہے۔ سالک کو محض ایک ایسے وجود واحد کا شعور رہتا ہے جو ہر طرح کے فرق و امتیاز سے بلند ہو، صوفیہ اسے جمع الجمع کا مقام کہتے ہیں۔'' ❶

ڈاکٹر انصاری کے مطابق اللہ اور بندے، معبود اور عابد، اور خالق اور مخلوق کے درمیان دوئی، تعدد اور غیریت باقی نہیں رہتی، یہ اگرچہ صوفی کا احساس ہے، حقیقت نہیں، لیکن چونکہ فنا و بقا کے تجربے کے نتیجے میں پیدا ہونے والا اس کا یہ احساس اس کا عقیدہ بن جاتا ہے اور اسی عقیدے کے مطابق وہ راہ سلوک طے کرتا ہے اس لیے اس کی زندگی اپنی تمام ریاضتوں، اعمال و اشغال اور اوراد و اذکار کے ساتھ زندیقیت اور الحاد میں ڈھل جاتی ہے، کیونکہ عقیدے میں فساد کی صورت میں صلاح و تقویٰ بھی فاسد ہو جاتا ہے۔

ڈاکٹر انصاری نے اس کے بعد متکلم صوفی ابو حامد غزالی کا ایک اقتباس نقل کیا ہے جس سے جمع الجمع کے مقام کے بارے میں صوفیا کے عقیدے کو سمجھنے میں مدد ملے گی:

''جو صوفیہ اس مقام پر پہنچے ہیں ان کے بارے میں بلا استثناء سبھی نے کہا ہے کہ وہ کائنات میں ذات باری کے علاوہ اور کسی چیز کا وجود نہیں مانتے۔ ان میں سے بعض کے لیے یہ علمی ادراک ہوتا ہے اور بعض کے لیے حال اور ذوق کا مسئلہ ان کے لیے کثرت کے تمام جلوے یک لخت مٹ جاتے ہیں، وہ فردانیت محضہ میں جذب ہو جاتے ہیں اور اپنی عقل کھو دیتے ہیں اور مبہوت و حیران رہ جاتے ہیں، ان کو نہ کائنات کی کسی چیز کا ہوش رہتا ہے اور نہ اپنی ذات کا، ان کو سوائے خدا کے کچھ نظر نہیں آتا ان پر سکر کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے، جس میں کوئی "انا الحق" کہہ اٹھتا ہے، کوئی "سبحانی ما اعظم شانی" اور کوئی "لیس فی جبتی سوی اللّٰہ" کہنے لگتا ہے۔ اس کیفیت کو فنا یا فناء الفنا کہتے ہیں، اس لیے کہ اس حالت میں آدمی کو اپنی ذات کا احساس باقی نہیں رہتا، بلکہ اسے احساس کھو دینے کا بھی احساس نہیں ہوتا، اگر یہ احساس باقی رہتا تو اپنی بے ہوشی کا بھی احساس ہوتا۔ صوفیہ اس مقام کو مجازاً اتحاد اور حقیقت کی زبان میں توحید کہتے ہیں۔ ❷

اس لمبے اقتباس سے صوفیا کی ''توحید'' کی حقیقت معلوم ہوگئی، کیا اس توحید کا عقیدہ رکھنے والا قرآن و حدیث کی روشنی میں مسلمان ہے؟ یہ صحیح ہے کہ تمام صوفیا نہ ان تجربات سے گزرتے ہیں اور نہ ان کو خالق اور مخلوق کے درمیان اس ''عینیت'' کا احساس ہی ہوتا ہے، لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ تمام صوفیا ان ملحدانہ تجربات سے گزرنے

❶ ص ۶۰، ج ا ❷ بحوالہ تصوف اور شریعت: ۱/۶۰-۶۱۔

Marfat.com

والوں اور وحدۃ الوجود کا نعرہ لگانے والوں کو نہ صرف صحیح العقیدہ مانتے ہیں، بلکہ ان کو اکابر امت مانتے ہیں، حلاج اور ابن عربی جیسے ملحد و زندیق کو شیخ احمد سرہندی بھی ''ولی'' مانتے تھے، جبکہ ان کے افکار پر انہوں نے سخت تنقیدیں بھی کی ہیں اور ان کو ولی ماننے کا سبب یہ ہے کہ وہ روزانہ پانچ سو رکعتیں نفل نماز پڑھتے تھے اور ظالموں کا دیا ہوا کھانا نہیں کھاتے تھے۔ ❶

کیا شیخ احمد کو قرآن کی یہ آیت نہیں معلوم تھیں:

﴿وَلَقَدْ اُوحِيَ اِلَيْكَ وَاِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ لَئِنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ وَلَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْخَاسِرِيْنَ٥﴾ (الزمر: ٦٥)

''اور در حقیقت تمہاری طرف اور ان لوگوں کی طرف جو تم سے پہلے گزرے ہیں یہ وحی کی گئی ہے کہ اگر تم نے شرک کیا تو تمہارا عمل اکارت ہو جائے گا اور یقیناً تم خسارہ اٹھانے والوں میں سے ہو جاؤ گے۔''

اس آیت کی رو سے لوگوں میں الحاد، بے دینی اور شرک پھیلانے والے حلاج اور ابن عربی کی نمازیں اور نیک اعمال شمار کہاں ہو رہے تھے کہ ان کو ''ولی'' کہنا درست ہوتا، قرآن کے مطابق تو صرف اللہ کا مومن و متقی بندہ اس کا ولی ہے۔ (سورۃ یونس: ٦٢)

مقام جمع پر قرآن سے استدلال:

میں نے اوپر یہ بتایا ہے کہ ابو اسماعیل عبداللہ انصاری ہروی نے اپنی کتاب ''منازل السائرین'' میں تصوف کے ہر مقام کی تفصیلات بیان کرنے سے پہلے قرآن پاک کی کوئی آیت درج کی ہے جس سے انہوں نے یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ یہ مقام قرآن پاک ہی سے ماخوذ ہے۔ باب الجمع کے تحت بھی انہوں نے ایسا ہی کیا ہے، پھر جمع کی تعریف کی ہے، مگر دوسرے ابواب یا مقامات کی طرح اس باب کے تحت بھی ان کی درج کردہ قرآنی آیت بے محل درج کی گئی ہے۔ آیت کریمہ ہے: ﴿وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى﴾ (الانفال: ١٧) ''اور جب تم نے پھینکا تو تم نے نہیں پھینکا، بلکہ اللہ نے پھینکا۔''

اس آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے جس فعل ''رمی'' کا رسول اللہ ﷺ کی نسبت سے اثبات کیا ہے اس کی نفی بھی کی ہے اور کسی فعل کا ایک ہی وقت میں اثبات اور نفی دونوں صحیح نہیں ہو سکتے، اس لیے دونوں ''رمیوں'' میں فرق کرنا ضروری ہے، کیونکہ اللہ کا کلام ''تضاد'' سے پاک ہے۔

دراصل اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کی نسبت سے جس ''رمی'' کا اثبات کیا ہے وہ ''رمی'' یعنی پھینکنے کا فعل ہے جو آپ نے انجام دیا تھا اور جس ''رمی'' کی آپ سے نفی کی ہے وہ اس کے نشانے تک پہنچنا اور نشانے پر لگنا ہے، مطلب یہ ہے کہ دشمن کے چہروں کی جانب کنکریاں تو رسول اللہ ﷺ نے ہی پھینکی تھیں اس لیے اس کا اثبات ہے، لیکن ان کو

❶ تصوف اور شریعت: ۲/۳۱

Marfat.com

کفار کے چہروں اور آنکھوں تک پہنچانے والے آپ نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ تھے، اس لیے فعل ''رمی'' کا اعتبار کر کے ''اذ رمیت'' -جب تم نے پھینکا فرمایا- اور کفار تک پہنچانے کی نفی فرما کر ''و ما رمیت'' اور تم نے نہیں پھینکا، اس کو اپنی طرف منسوب کیا اور فرمایا: ''و لکن الله رمی'' اور لیکن اللہ نے پھینکا۔

جس طرح آیت کے اس فقرے میں نبی ﷺ سے فعل رمی کی نفی کر کے اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنا فعل قرار دیا ہے، اسی طرح آیت کے شروع میں صحابہ کرام سے کفار کو قتل کرنے کی نفی کر کے اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنی طرف منسوب فرمایا ہے: ﴿فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ﴾ ''تو ان کو تم نے قتل نہیں کیا، بلکہ ان کو اللہ نے قتل کیا۔''

لیکن آیت کے اس حصے میں، زیر بحث حصہ کے برعکس کفار کو تیروں اور تلواروں سے قتل کرنے کا فعل طبعی تھا، نبی کا معجزہ نہ تھا، اس لیے اذ قتلتموهم -جب تم نے ان کو قتل کیا- فرما کر فعل ''قتل'' کی نسبت ان سے نہیں کی، کیونکہ یہ معلوم تھا، اس کے برعکس نبی ﷺ نے کفار کے چہروں کی طرف جو مٹھی بھر کنکریلی مٹی پھینکی تھی وہ ایک معجزاتی فعل تھا جو خارق عادت تھا طبعی نہ تھا اس لیے آپ کے لیے اس کا اثبات کر کے، پھر اس کی نفی فرمائی اور اس کو اپنا فعل قرار دیا، تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ معجزاتی فعل بھی نبی اللہ کے اذن سے انجام دیتا ہے، مگر اس کو وقوع پذیر اللہ اپنے فضل اور اپنی قدرت سے بناتا ہے، ورنہ ہر چہار جانب پھیلی ہوئی اور منتشر فوج کی جانب پھینکی ہوئی مٹھی بھر مٹی نہ سب کی آنکھوں میں ایک انسان کی قدرت سے داخل ہو سکتی تھی اور نہ سب کے لیے کافی ہی ہو سکتی تھی۔

آیت سے غلط استدلال:

انسان کے اپنے افعال میں مجبور محض ہونے کا عقیدہ رکھنے والے فرقہ ''جبریہ'' کا دعویٰ ہے کہ ''آیت میں فعل رمی کو نبی ﷺ سے سلب کر کے اللہ کی طرف منسوب کیا گیا ہے جس سے بندوں کی طرف افعال کو منسوب کرنے کا ابطال ہوتا ہے۔'' لیکن یہ عقیدہ باطل ہے، کیونکہ قرآن پاک ایسی آیتوں سے بھرا ہوا ہے جن میں افعال کو بندوں کی طرف منسوب کیا گیا ہے اور ان کے نتیجے میں ان کے حق میں ثواب و عقاب کا حکم سنایا گیا ہے:

﴿مَنْ عَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ وَمَنْ اَسَاۗءَ فَعَلَيْهَا وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ۝﴾

(حٰمٓ السجدة: ٤٦)

''جس نے نیک عمل کیا تو اپنے لیے اور جس نے برائی کی تو اس کا وبال اس پر ہوگا اور تمہارا رب بندوں پر بالکل ظلم کرنے والا نہیں ہے۔''

اس آیت کی رو سے بندوں کے اعمال کا اعتبار ہے، چاہے وہ نیک ہوں یا بد اور اللہ تعالیٰ ان کی حق تلفی نہیں کرتا۔
ظلم کے اصل معنیٰ حق تلفی کرنے اور نقص حق کے ہیں اور ''و ما ربک بظلام'' نفی مبالغہ نہیں، مبالغہ فی نفی الظلم ہے،

❶ تصوف اور شریعت: ۲/ ۳۱

Marfat.com

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات ظلم کی صفت سے پاک ہے وہ کسی کی حق تلفی نہیں کرتا اور جو جیسا عمل کرے گا اس کا بدلہ پا کر رہے گا؛ اگر وہ نیک عمل کرے گا تو اللہ تعالیٰ اسے حسن جزا سے نوازے گا اور اگر برا عمل کرے گا تو اس کی سزا پائے گا۔

﴿اِنَّهٗ مَنْ يَّاْتِ رَبَّهٗ مُجْرِمًا فَاِنَّ لَهٗ جَهَنَّمَ لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَ لَا يَحْيٰى ۝ وَ مَنْ يَّاْتِهٖ مُؤْمِنًا قَدْ عَمِلَ الصّٰلِحٰتِ فَاُولٰٓئِكَ لَهُمُ الدَّرَجٰتُ الْعُلٰى ۝﴾ (طٰهٰ: ۷۵)

''درحقیقت جو اپنے رب کے پاس مجرم بن کر آئے گا تو یقیناً اس کے لیے جہنم ہے جس میں وہ نہ مرے گا اور نہ جیے گا اور جو اس کے پاس مومن بن کر آئے گا درآنحالیکہ اس نے نیک اعمال کیے ہوں گے تو یہی وہ لوگ ہیں جن کے لیے بلند درجات ہیں۔''

یہ آیتیں اعمال کی اضافت بندوں کی طرف کر کے ''جبریہ'' کے اس عقیدہ کو باطل قرار دے رہی ہیں کہ انسان عمل پر مجبور ہے۔

سورۂ حم سجدہ کی آیت میں لفظ ''عبید'' سے مراد اللہ تعالیٰ کے کونی بندے ہیں، شرعی نہیں، تکوینی طور پر عبودیت مومن اور کافر سب کو شامل ہے، لیکن اللہ کے شرعی بندے -عبید- وہ ہیں جو صرف اللہ کی عبادت کرتے ہیں۔

ایک ضروری وضاحت:

قرآن پاک میں اور احادیث میں بھی اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات سے ظلم کی نفی کی ہے، مثلاً: ﴿وَ لَا يَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا ۝﴾ (الکھف: ۴۹) ''اور تیرا رب کسی پر ظلم نہیں کرتا'' اور حدیث میں ہے: ((اِنِّیْ حَرَّمْتُ الظُّلْمَ عَلٰی نَفْسِیْ)) ''درحقیقت میں نے اپنی ذات پر ظلم کو حرام قرار دے دیا ہے۔'' ❶ تو کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ پر ظلم محال ہے، جیسا کہ جہمیہ -جہم بن صفوان کے پیرو- کا دعویٰ ہے یا اللہ تعالیٰ ظلم کر سکتا ہے، لیکن اپنی مدح کے طور پر اس نے اپنی ذات سے اس کی نفی کی ہے، لہٰذا اگر ظلم کرنا اس کے لیے ممکن نہ ہوتا تو پھر اس کا ترک ''ممدوح'' نہ ہوتا۔ خود حدیث قدسی: ((اِنِّیْ حَرَّمْتُ الظُّلْمَ عَلٰی نَفْسِیْ)) اس کی ذات سے اس کے امکان پر دلالت کرتی ہے، لیکن وہ ظلم نہیں کرتا، اس لیے کہ وہ تمام تر عمدہ صفات سے موصوف ہے اور وہ اپنی ہر صفت میں ''ممدوح'' ہے اور ظلم صفتِ نقص ہے جس سے اس نے اپنے آپ کو پاک رکھا ہے۔

ایک اعتراض:

منکرین حدیث ایک صحیح حدیث پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ وہ ''عدل'' کے خلاف ہونے کی وجہ سے ناقابل قبول ہے، حدیث کے الفاظ ہیں:

((لَوْ اِنَّ اللّٰهَ عَذَّبَ اَهْلَ سَمٰوَاتِهٖ وَ اَرْضِهٖ، لَعَذَّبَهُمْ وَ هُوَ غَيْرُ ظَالِمٍ لَّهُمْ)) ❷

---

❶ مسلم: ۲۵۷۷ ❷ ابو داود: ۴۶۹۹۔ ابن ماجہ: ۷۷۔ مسند: ۲۱۱۰۱

Marfat.com

''اگر اللہ اپنے آسمان والوں اور اپنی زمین والوں کو عذاب دے تو وہ ان کو عذاب دیتے ہوئے ان کے حق میں ظالم نہیں ہوگا۔''

تو عرض ہے کہ یہ حدیث نہ قرآن کے خلاف ہے، نہ حدیث کے اور نہ عدلِ الٰہی کے اور اس پر منکرین کا اعتراض ان کی سطحیت اور کور چشمی کی دلیل ہے، کیونکہ حدیث میں یہ نہیں ہے کہ ''اگر اللہ آسمانوں اور زمین والوں کو عذاب دے جو مستحق عذاب نہیں ہوں گے، تو وہ ان کے حق میں ظالم نہیں ہوگا۔'' اگر حدیث میں یہ فقرہ ہوتا: جو مستحق نہیں ہوں گے تو یہ حدیث ان آیتوں اور حدیثوں کے خلاف ہوتی جن میں اللہ تعالیٰ سے ظلم کی نفی کی گئی ہے، لیکن اس فقرہ کے مذکور نہ ہونے کی وجہ سے نہ یہ حدیث عدلِ الٰہی کے خلاف ہے اور نہ اُن آیتوں اور حدیثوں کے جن میں اس کے ظالم ہونے کی نفی کی گئی ہے، بلکہ حدیث کا یہ ٹکڑا: ((وَ هُوَ غَيْرُ ظَالِمٍ لَّهُمْ)) اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ ''وہ مستحق عذاب ہوں گے۔ لہٰذا ان کو عذاب دے کر وہ ان کے حق میں ظالم نہیں ہوگا۔

دراصل قرآنی آیات کو سمجھنے اور ان میں اور احادیث میں تطبیق دینے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ایک مضمون سے متعلق تمام آیات اور احادیث کو سامنے رکھا جائے اس صورت میں قرآنی آیات اور احادیث میں تضاد اور قرآن اور حدیث کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ملے گا، لیکن چونکہ منکرین حدیث بدنیت ہوتے ہیں اس لیے وہ قرآن و حدیث کے ایسے ٹکڑے نقل کر کے دونوں میں تضاد یا اختلاف ثابت کرنے کی مذموم حرکت کرتے ہیں جن میں بظاہر اختلاف اور تضاد نظر آتا ہے، حقیقت میں کوئی اختلاف اور تضاد نہیں ہوتا۔

شیخ ابو اسماعیل ہروی نے "باب الجمع" کے تحت سورۂ انفال کی آیت: ﴿وَ مَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى﴾ درج کر کے ''وحدۃ الوجود'' کے قائل صوفیا کے عقیدہ کی طرف اشارہ کیا ہے جو درحقیقت کسی نہ کسی شکل میں تمام اکابر صوفیا کا عقیدہ ہے، اس طرح انہوں نے یہ ثابت کرنے کی مذموم کوشش کی ہے کہ اللہ اور رسول میں غیریت اور فرق کے معدوم ہونے اور عینیت، اتحاد اور جمع ہونے کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ کی "رمی" اللہ ہی کی رمی تھی، کیونکہ وجود صرف اللہ کا ہے رسول کا کوئی وجود نہیں ہے، لیکن یہ عقیدہ جہاں ایک ملحدانہ اور غیر اسلامی عقیدہ ہے وہیں یہ آیت کریمہ سے ثابت بھی نہیں ہوتا۔ آیت نبی ﷺ کے لیے ''رمی'' —اذ رمیت— کے اثبات اور ''رمی'' کی نفی —و ما رمیت— سے اس فعل کے نبی ﷺ کا فعل ہونے پر دلالت کرتی ہے جو رسول اللہ ﷺ کے غیر اللہ ہونے کا بین ثبوت ہے، جبکہ ''وحدۃ الوجود'' کا مطلب یہ ہے کہ حق تعالیٰ جو مخلوق کی مشابہت اور مماثلت سے منزہ اور پاک ہے عین مخلوق ہے، بلکہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ ہی ہر موجود کے عین وجود، ماہیت اور حقیقت سے عبارت ہے، اس کے ماسویٰ کوئی وجود نہیں پایا جاتا۔

Marfat.com

تصوف اور اس کی اصطلاحات اسلام میں اجنبی ہیں:

میں نے اوپر تصوف کی جن اصطلاحات کا ذکر کیا ہے ان کا مقصد اس کا تعارف کرانا تھا، ورنہ فنا و بقا، جمع و فرق، اتصال، جمع الشواہد، جمع الوجود اور جمع العین وغیرہ اسلام میں اجنبی ہیں، اس لیے کہ قرآن وسنت میں ان کا ذکر نہیں آیا ہے اور نہ فقہا نے اپنی کتابوں میں ان کا ذکر کیا ہے، حتیٰ کہ خود صوفیا میں بھی بہت کم لوگ ان اصطلاحوں کو جانتے اور ان کے مدلولات کو سمجھتے ہیں، اور اکابر صوفیا جنہوں نے ان کی تشریح کی ہے تو ان کے یہاں ان کے مدلولات اور تقاضوں کے بارے میں خاصا اختلاف پایا جاتا ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ یہ صوفیا کے ذوق وخیال یا مسلمانوں میں پھیلے ہوئے اغیار کے افکار، عقائد اور نظریات کی پیداوار ہیں۔

دین وشریعت اور تزکیۂ نفس اور تہذیب اخلاق سے متعلق بعض صحابہ، تابعین اور پہلی صدی ہجری کے صلحاء اور زاہدین کے اقوال بھی ان صوفیانہ اصطلاحوں سے خالی ہیں، دراصل یہ غیر واضح اور معقد تعبیرات اور اسلامی روح اور مزاج سے متصادم یہ اصطلاحات اس وقت کی پیداور ہیں جب زہد وتوکل اور تزکیۂ نفس اور تہذیب اخلاق وغیرہ پر فلسفہ اور کلام کی چھاپ لگا دی گئی اور امت میں صلاح وتقویٰ کی شناخت رکھنے والے اور ایک خاص طرز کی دین داری سے موصوف افراد کتاب وسنت کی تعلیمات سے اس قدر بیگانے ہو گئے کہ اللہ تعالیٰ سے اپنے تعلق کے لیے بھی فلاسفہ اور متکلمین کے خوشہ چین ہو گئے، جبکہ یہ دونوں اسلام سے نسبت کا دعویٰ کرنے والوں میں سب سے زیادہ اسلام سے دور رہے ہیں اور ہیں اور ان کے دلوں میں ایمان ویقین کی ٹھنڈک اور حلاوت کبھی داخل ہی نہیں ہوئی اس کی تصدیق کے لیے رازی، جوینی، کشمیری اور کوثری وغیرہ کی تحریریں دیکھی جاسکتی ہیں جو لا حاصل مجادلانہ بحثوں کی شاہکار ہیں، اور ان میں سے بعض کے اعترافات اس بات کے گواہ ہیں کہ ان کو فلسفیانہ موشگافیوں اور متکلمانہ تاویلات سے حیرت وتذبذب کے سوا کچھ بھی نہیں ملا ہے۔

حلولی اور وحدۃ الوجود:

حَلَّ یَحِلُّ حَلًّا وَّ حُلُوْلًا کے معنی ہیں: اترنا، نازل ہونا، تحلیل ہو جانا۔ اس کے اصطلاحی معنی ہیں: دو جسموں میں اس طرح اتحاد ہو جائے کہ ان میں تمیز کرنا ممکن نہ ہو، جیسے پانی کا دودھ میں مل جانا یا دودھ کا پانی میں۔

بطور عقیدہ ''حلول'' کے معنی ہیں کہ نعوذ باللہ تعالیٰ، اللہ تعالیٰ ہر چیز اور ہر چیز کے ہر حصہ اور جز میں اس طرح مل گیا ہے اور تحلیل ہو گیا کہ اس چیز پر اللہ ہونے کا حکم لگانا درست ہے۔

اللہ تعالیٰ کے کائنات کی ہر چیز میں حلول کرنے کا عقیدہ کسی خاص فرقہ اور جماعت کا عقیدہ نہیں ہے، بلکہ متعدد فرقوں اور جماعتوں کا عقیدہ ہے۔ سب سے پہلے نصاریٰ نے یہ نعرہ لگایا کہ لاہوت - اللہ - ناسوت - عیسیٰ علیہ السلام - میں حلول کر گیا ہے۔ اسلام سے منسوب فرقوں میں ''روافض'' نے علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی ذات میں اللہ تعالیٰ کے حلول کا

Marfat.com

دعویٰ کیا۔ پھر معتزلہ اور جہمیہ فرقوں کی بعض جماعتوں نے بھی یہی مسلک اختیار کیا۔

صوفیا میں حلول کے عقیدہ کو ابو مغیث حسین بن منصور حلاج - ۲۴۴-۳۰۹ھ - کے ذریعہ رواج ملا اور نہایت تیزی سے صوفیا کا عقیدہ بن گیا، صوفیا میں جو لوگ بظاہر اس عقیدہ کو نہیں مانتے وہ بھی حلاج سے عقیدت رکھنے اور اس کو ولی ماننے کی وجہ سے اس کا قائل شمار ہوتے ہیں۔ ❶

حلول کے بطن سے وحدۃ الوجود کا عقیدہ نکلا ہے یا حلول وحدۃ الوجود کا پہلا قدم ہے۔ اس عقیدہ کی رو سے اللہ اور وجود ایک ہی ہیں اور نا قابل تقسیم ہیں دوسرے لفظوں میں دنیا کا وجود عین اللہ کا وجود ہے۔

مسلمانوں میں وحدۃ الوجود کا نعرہ سب سے پہلے محی الدین محمد بن علی ابن عربی (۵۶۰-۶۳۸ھ) نے لگایا جو حلول سے زیادہ مقبول ہوا اور کسی نہ کسی شکل میں تمام صوفیا کا عقیدہ بن گیا ہے۔

حلول اور وحدۃ الوجود میں یہ فرق ہے کہ حلول میں غیر اللہ کا وجود تسلیم کیا گیا ہے اور اس میں اللہ کے حلول کرنے کی وجہ سے اللہ اور غیر اللہ میں اتحاد پیدا ہوا ہے، جبکہ وحدۃ الوجود کی رو سے وجود صرف ایک اور عالم عین اللہ کے وجود سے عبارت ہے۔ یعنی خارج میں اللہ کے وجود کے سوا کوئی وجود نہیں پایا جاتا۔

ڈاکٹر محمد عبدالحق انصاری کے بارے میں، میں اوپر یہ لکھ چکا ہوں کہ وہ تصوف کی دنیا کے بہت بڑے صوفی شیخ احمد سرہندی کے افکار پر سند کا درجہ رکھتے ہیں اور خود بھی تصوف کا نہایت عمیق، وسیع اور غیر جانبدارانہ مطالعہ کیا ہے، اسی طرح ان کی کتاب ''تصوف اور شریعت'' اس موضوع پر مختصر ہونے کے ساتھ نہایت جامع ہے اور اس سے تصوف کے خدوخال بالکل واضح اور متعین ہو جاتے ہیں، انہوں نے شیخ سرہندی کی طرح تصوف اور اس کی اصطلاحات کا تعارف کراتے ہوئے، دوسرے مصنفین کی طرح اس کے صرف انہیں پہلوؤں کو اجاگر نہیں کیا ہے جو یا تو قرآن و سنت کی تعلیمات سے متعارض نہیں ہیں، یا کم از کم ان میں ان کی گنجائش ہے۔

ڈاکٹر انصاری نے اپنی اس کتاب کی پہلی جلد میں شیخ احمد سرہندی کے مکتوبات ❷ سے ایک مختصر عبارت نقل کی ہے جس میں انہوں نے توحید شہودی اور توحید وجودی کی جامع و مانع تعریف کر کے ان دونوں میں فرق کو بیان کر دیا ہے واضح رہے کہ صوفیا ''توحید'' سے ''وحدۃ'' مراد لیتے ہیں اور ''وحدۃ'' کا لفظ استعمال کرنے سے احتراز کرتے ہیں تاکہ قاری یا مخاطب اس سے متنفر نہ ہو اور اسلامی اصطلاح ''توحید'' دیکھ کر یا سن کر ان کے دام فریب میں آسانی سے پھنس جائے، فرماتے ہیں:

''توحید شہودی یکے دیدن است یعنی مشہود سالک جز یکے نباشد و توحید وجودی یک موجود دانستن است و غیر او معدوم انگاشتن با وجود عدمیت مجالے و مظاہر آں یکے پنداشتن۔''

❶ معجم الفاظ العقدۃ، ص: ۱۵۰-۱۵۱ ❷ ج ۱ م ۴۳، ص ۱۴۷

Marfat.com

ترجمہ:...... ''توحید شہودی صرف ایک ذات کے مشاہدے کا نام ہے، یعنی یہ کہ سالک کے مشاہدے میں ایک ذات کے علاوہ کوئی اور چیز نہیں ہے اور توحید وجودی اس اعتقاد کا نام ہے کہ موجود صرف ایک ہے اس کے علاوہ کوئی اور شے موجود نہیں ہے اور تمام اشیاء غیر موجود ہونے کے باوجود ایک ہی وجود کے مظاہر ہیں۔'' ❶

شیخ احمد کی مذکورہ بالا عبارت میں جس ''وحدۃ الوجود'' کی تعریف کی گئی ہے وہ ابن عربی کا ''وحدۃ الوجود'' ہے اس پر شیخ سرہندی کا تبصرہ نقل کرنے سے پہلے یہ وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ سالک یا غیر سالک ذات الٰہی کا نہ مشاہدہ کرتا ہے اور نہ کر سکتا ہے، کیونکہ اللہ اس دنیا میں غیر مرئی اور غیر مشاہد ہے۔ البتہ انسان کائنات کے جو مظاہر اور اشکال دیکھتا ہے وہ ذات الٰہی کے مظاہر و اشکال نہیں، اس کے وجود پر دلالت کرنے والے مظاہر اور اشکال ہیں، مثال کے طور پر جب ہم ایک عمارت کو دیکھتے ہیں تو ہم کو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کا کوئی بنانے والا ہے، اس لیے کہ کوئی عمارت آپ سے آپ وجود میں نہیں آتی، بلکہ کسی معمار کے بنانے اور تعمیر کرنے سے وجود میں آتی ہے، لہٰذا عمارت معمار کے وجود کی دلیل ہے، نہ کہ معمار کی ذات کا مظہر۔

وحدۃ الوجود پر سرہندی کی تنقید:

وحدۃ الوجود کے نظریہ پر شیخ احمد سرہندی کی تنقید یہ ہے کہ ''یہ انبیاء کے بیان کردہ تصور توحید کے منافی ہے، انبیاء کی تعلیم یہ نہیں کہ وجود صرف ایک ہے، ان کی تعلیم یہ ہے کہ خدا -معبود- ایک ہے، انبیاء یہ نہیں کہتے تھے کہ خدا کے علاوہ کسی بھی چیز کا وجود نہیں ہے وہ صرف یہ کہتے تھے کہ خدا کے سوا کوئی الٰہ -معبود- نہیں ہے، ابن عربی کے وحدۃ الوجود کے برعکس وہ یہ تعلیم دیتے تھے کہ کائنات کا اپنا وجود ہے اور یہ وجود خدا کے وجود سے مختلف ہے، خدا کائنات کی کسی بھی چیز میں شریک نہیں ہے وہ کائنات سے کلیۃً ماوراء ہے۔ انبیاء جس مذہب کے داعی رہے ہیں وہ خدا اور کائنات کی دوئی اور ''اثنینیت'' پر مبنی ہے نہ کہ ان کی عینیت پر، ان کا مذہب مخلوق کو خالق سے اور بندے کو رب سے الگ رکھتا ہے، وہ کبھی یہ نہیں کہتے تھے کہ خالق ہی مخلوق ہے یا رب ہی بندہ ہے، انبیائے کرام انسان یا دیگر مخلوقات کے علم و ارادہ اور قدرت اور فعل کی نفی نہیں کرتے تھے اور نہ ان کے اعمال و افعال کو خدا کی طرف محمول کرتے تھے وہ یہ نہیں کہتے تھے کہ کائنات میں صرف ایک ہی فاعل یا ایک ہی وجود ہے۔ ❷

شیخ سرہندی کے اس طویل اقتباس سے یہ بات بالکل واضح ہوگئی کہ ابن عربی کا نظریہ وحدۃ الوجود اس توحید کے بالکل منافی ہے جس کی طرف دعوت دینے کے لیے اللہ تعالیٰ کے نبی اور رسول مبعوث کیے گئے تھے۔

سرہندی نے اس وحدۃ الوجود کے اسباب میں مراقبوں کی کثرت اور کلمہ طیبہ لا الہ الا اللہ کو ''لا موجود الا اللہ'' سمجھنا اور صوفیانہ عشق کو بھی شمار کیا ہے۔ ❸

❶ ص ۱۳۴ ❷ ص: ۱۳۸ ❸ ص: ۱۴۱

Marfat.com

شیخ سرہندی نے ابن عربی کے نظریہ وحدۃ الوجود کے بارے میں یہاں تک صراحت کی ہے کہ تصوف کی تاریخ میں یہ نظریہ ایک نئی چیز ہے ابن عربی سے قبل کسی نے بھی اسے پیش نہیں کیا ہے۔ ❶

وحدۃ الوجود کے آثار بد:

حافظ ابن القیم نے مدارج السالکین میں وحدۃ الوجود کے جو برے اثرات بیان کیے ہیں ان کا خلاصہ بیان کر دینا مناسب خیال کرتا ہوں تا کہ ایک متبحر عالم کی رائے سامنے آجائے جو کتاب وسنت کا وسیع اور گہرا علم اور دین میں گہری بصیرت رکھنے کے ساتھ تصوف کی اصطلاحات اور اکابر صوفیا کے افکار ونظریات کے بارے میں غیر معمولی واقفیت رکھتے تھے، فرماتے ہیں:

> ''وحدۃ الوجود کے عقیدہ کی رو سے اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہر موجود کے عین وجود سے عبارت ہے، وہی ہر وجود کی حقیقت اور اصل ہے، وہی دلیل بھی ہے، وجہ دلیل بھی اور مدلول علیہ بھی، خارج میں جو تعدد اور کثرت ہے وہ اعتبارات کا فریب ہے حقیقی اور وجودی نہیں ہے، وہی نکاح کرنے والا بھی ہے، وہ بھی جس سے نکاح کیا جاتا ہے، وہی ذبح کرنے والا بھی ہے اور وہ بھی جس کو ذبح کیا گیا ہے، وہی کھانے والا بھی ہے اور وہی وہ چیز بھی ہے جو کھائی جاتی ہے۔ اس نظریہ کی رو سے فرعون اور اس کی قوم کے لوگ مکمل ایمان رکھنے والے مؤمن تھے، اللہ کی حقیقت کے عارف تھے، اس عقیدہ کی رو سے بت پرست حق وصواب پر ہیں، اور بتوں کی عبادت کر کے عین اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی عبادت کرتے ہیں اس کے بموجب ماں، بیٹی، بہن اور غیر محرم عورتوں میں حلت وحرمت کے اعتبار سے جو فرق کیا جاتا ہے وہ بے معنی ہے، پانی اور شراب اور نکاح اور زنا میں کوئی فرق نہیں جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام ہے وہ وجود کے ایک ہونے کے راز کے علم سے محروم ہیں۔ ہاں تم پر یہ چیزیں حرام ہیں، اس لیے کہ تم اس ''توحید'' کی حقیقت سے حجاب اور پردے میں ہو، انبیاء نے لوگوں پر اس راہ کو تنگ کیا ہے اور مقصود سے ان کو یا مقصود کو ان سے دور کر دیا ہے، جبکہ حقیقت اس کے علاوہ ہے جو لے کر وہ اس دنیا میں آئے تھے اور جس کی طرف لوگوں کو دعوت دیتے تھے۔'' ❷

اس کفر والحاد اور زندیقیت کے باوجود ابن عربی اکابر صوفیا کے نزدیک ''شیخ اکبر'' اور اللہ کا ولی تھا۔

تھانوی کے مغالطے:

مولانا اشرف علی تھانوی بہت بڑے صوفی گزرے ہیں ان کو اپنے ''مجدد'' ہونے کا بھی احساس تھا، مسائل تصوف کے بارے میں وہ گول مول بات کرنے کے عادی تھے، انہوں نے ''وحدۃ الوجود'' کے بارے میں بھی اظہار خیال کیا ہے فرماتے ہیں:

---

❶ ص: ۱۴۲ ❷ ص: ۳۴۹، ج: ۳

Marfat.com

یہ بات تو یقینی ہے کہ ممکن کا وجود حقیقی واصلی نہیں، عارضی وظلی ہے اب اگر وجود ظلی کا اعتبار نہ کیا جائے تو صرف وجود حقیقی کا ثبوت ہوگا اور وجود کو واحد کہا جائے گا جو ''وحدۃ الوجود'' ہے اور اگر اس کا اعتبار کیجیے کہ آخر کچھ تو ہے بالکل معدوم تو ہے ہی نہیں، گو غلبۂ نور حقیقی سے کسی مقام پر سالک کو نظر نہ آوے تو یہ وحدۃ الشہود ہے۔

قول فیصل:

مولانا تھانوی نے ایک باطل نظریہ اور عقیدہ کو حق ثابت کرنے کے لیے جو غلط بیانی کی ہے اور جو مغالطے دیے ہیں اس پر تعجب بھی ہوتا ہے اور افسوس بھی؛ تعجب اس بات پر کہ حکیم الامت کا لقب رکھنے یا اس لقب سے شہرت پانے کے باوجود ان کی زبان اور قلم سے ایسی خلاف حق باتیں نکلیں کیسے اور افسوس اس پر کہ اتنے بڑے بڑے علامہ قسم کے لوگوں پر انہوں نے کون سا جادو کر رکھا تھا کہ وہ ''وحی الٰہی'' کی طرح ان کے ''اکتشافات'' پر آمنا وصدقنا کہہ دیتے تھے جبکہ قرآنی آیات اور احادیث ان کی تکذیب کرتی ہیں؟

کائنات کا وجود ظلی نہیں ہے:

کائنات جس کا ایک فرد انسان بھی ہے، ظلی نہیں، حقیقی ہے اور انسان اور کائنات کے عارضی اور فانی ہونے سے اس کے اصلی وجود رکھنے کی نفی نہیں ہوتی، بلاشبہ ہمارا وجود اللہ تعالیٰ کی عنایت، فضل اور توفیق کی بدولت ہے اور ہم میں سے کوئی صفت کمال سے موصوف نہیں ہے، صفت کمال سے صرف اللہ تعالیٰ موصوف ہے، اور یہ بھی صحیح ہے کہ ہمارا اور کائنات کی ہر چیز کا وجود عارضی ہے، ازلی اور ابدی وجود صرف اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا ہے، مگر یہ ساری باتیں اس امر پر دلالت نہیں کرتیں کہ ہمارا وجود وجود الٰہی کا ظل اور سایہ ہے دراصل اللہ تعالیٰ ہمارا خالق ہے اور ہم اس کی مخلوق ہیں:

خلق الانسان علمه البيان اس نے انسان کو پیدا کیا اسے بیان کرنا سکھایا۔ (سورۂ رحمٰن: ۳-۴)

اللہ تعالیٰ ہمارا رب ہے:

﴿إِنَّ هَٰذِهِۦٓ أُمَّتُكُمۡ أُمَّةً وَٰحِدَةً وَأَنَا۠ رَبُّكُمۡ فَٱعۡبُدُونِ۝﴾ (الانبياء: ۹۲)

''درحقیقت یہ ہے تمہاری امت جو ایک ہی امت ہے اور میں ڈ تمہارا رب ہوں، سو میری عبادت کرو۔''

زمین اور آسمانوں اور ان کے اندر پائی جانے والی تمام اشیاء کا اللہ تعالیٰ خالق ہے اور وہ اس کی مخلوق ہیں، ظل، سایہ اور پرتو نہیں:

﴿مَا خَلَقَ ٱللَّهُ ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلۡأَرۡضَ وَمَا بَيۡنَهُمَآ إِلَّا بِٱلۡحَقِّ وَأَجَلٍ مُّسَمًّى﴾ (الروم: ۸)

''اللہ نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے نہیں پیدا کیا، مگر حق کے ساتھ اور ایک متعین وقت کے لیے۔''

اللہ تعالیٰ ہر چیز کو عدم سے وجود میں لایا:

Marfat.com

﴿بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ اَنّٰى يَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ وَّ لَمْ تَكُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ وَ خَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ وَ هُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ﴾ (الانعام: ۱۰۱)

''وہ آسمانوں اور زمین کا موجد، اس کی اولاد کیسے ہوگی جبکہ اس کی کوئی بیوی نہیں اور اس نے ہر چیز پیدا کی ہے اور وہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے۔''

اللہ تعالیٰ ازل سے ہے جب کسی شے کا وجود نہیں تھا:

((کان اللہ و لم یکن شیء قبلہ و کان عرشہ علی الماء، ثم خلق السموات و الأرض و کتب فی الذکر کل شیء)) ❶

''اللہ ہمیشہ سے ہے اور اس سے پہلے کوئی چیز نہیں تھی اور اس کا عرش پانی پر تھا، پھر اس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور ذکر میں ہر چیز لکھی۔''

اگر کائنات کی ہر چیز اس کا ظل اور سایہ ہوتی تو پھر وہ بھی ہمیشہ سے ہوتی، جبکہ قرآنی آیات اور احادیث یہ تصریح کرتی ہیں کہ وہ ہر چیز کا خالق ہے اور خلق کے معنی ہیں عدم سے وجود میں لانا۔

وحدۃ الوجود کا نظریہ پیش کرنے والا ابن عربی ملحد اور زندیق تھا اس کے ملحد اور زندیق ہونے پر صوفیا کے علاوہ علمائے اہل سنت و جماعت کا اتفاق ہے اس کی کتابیں، فصوص الحکم اور المفتوحات المکیہ اس کے الحادی افکار و نظریات پر گواہ ہیں، صوفیا صرف اس وجہ سے اس کا دفاع کرتے ہیں کہ وہ صوفی تھا۔

کلمۂ توحید سے وحدۃ الوجود پر استدلال:

میں اوپر یہ بتا چکا ہوں کہ صوفیا وحدۃ الوجود کو توحید سے تعبیر کرتے ہیں اور کلمہ توحید ''لا إلہ إلا اللہ'' میں إلٰہ'' کا ترجمہ ''موجود'' کرتے ہیں اس طرح اس کلمہ کا ترجمہ ''نہیں ہے کوئی موجود مگر اللہ'' کرتے ہیں۔ ''حکیم الامت'' یا ''مرشد تھانوی'' وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود کی صوفیانہ توضیح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''یہاں سے معلوم ہوا کہ حقیقت میں یہ اختلاف - وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود کا اختلاف- لفظی ہے مآل کار دونوں کا ایک ہے اور چونکہ اصل و ظل میں نہایت قوی تعلق ہوتا ہے اس کو اصطلاح صوفیہ میں ''عینیت'' سے تعبیر کرتے ہیں اس مقام سے ''لاموجود الا اللہ'' اور ہمہ اوست'' کے معنی معلوم ہو گئے۔'' ❷

تھانوی عربی داں تھے، انہوں نے قرآن پاک کی تفسیر بھی لکھی ہے، ان کو یہ بات تو معلوم رہی ہوگی کہ "إلٰہ" کے معنی ''موجود'' کے نہیں آتے، پھر ''موجود الا اللہ اور ہمہ اوست'' کا باطل صوفیانہ نظریہ کہاں سے معلوم ہوا۔

تھانوی کے اس مغالطے سے تو اسلام کے ''عقیدۂ توحید'' کا سارا امتیاز ہی ختم ہو گیا، البتہ اس سے اس اہم سوال کا

❶ بخاری: ۳۱۹۱، ۴۲۱۸ ❷ تجدید دین کامل: ص ۴۳۸

Marfat.com

جواب ضرور مل گیا کہ ''صوفیا نا آشنائے توحید کیوں ہیں؟

مولانا تھانوی نے "امداد المشتاق إلی اشرف الاخلاق" میں وحدة الوجود کے مسئلہ میں قرآن پاک کی ایک آیت سے اپنے پیر و مرشد حاجی امداد اللہ کے استدلال کا ذکر کرتے ہوئے اس کی تائید کی ہے جو ان کی کھلی ''مداہنت'' ہے، اس لیے کہ یہ استدلال خلاف حق ہونے کے ساتھ اس تفسیر کے بھی خلاف ہے جو انہوں نے بیان القرآن میں اس کی کی ہے، چنانچہ حاجی امداد اللہ کا قول ہے:

﴿اَللّٰهُ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ لَهُ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنٰى﴾ اس آیت میں ایک راز مکنون ہے: پہلے نفی غیر کی فرما کر اثبات وحدة الوجود کا فرمایا ہے، بعدہ فرماتا ہے کہ سوائے میرے جو کچھ ہے وہ اسماء وصفات میری ہے، یعنی جو کچھ غیر ذات اس کے معلوم ہو وہ سب مظاہر صفات ہیں۔

قرآن کی اس تفسیر باطنی، بلکہ تحریف کی تائید کرتے ہوئے مرشد تھانوی فرماتے ہیں:

''مطلب یہ ہے کہ جب "لا إلٰه إلا هو" سے غیر کی نفی ہوگئی تو سوال وارد ہوا کہ یہ کائنات کیا ہے؟ "له الأسماء الحسنی" میں اس کا جواب ہے کہ ان کے جو اسماء ہیں یہ کائنات ان کے مظاہر ہیں، موجود مستقل نہیں، یہ باب اشارہ سے ہے تفسیر نہیں۔'' ❶

مولانا تھانوی نے اپنے پیر و مرشد کی تحریف قرآنی کی تائید کرتے ہوئے جو یہ فرمایا ہے کہ ''جب ''لا إلٰه إلا هو'' سے غیر کی نفی ہوگئی'' اگر یہ صحیح ہے تو پھر اس کی تفسیر کرتے ہوئے انہوں نے اپنی کتاب میں جو یہ فرمایا ہے کہ ''اللہ ایسا ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود ہونے کا مستحق نہیں، اس کے بڑے اچھے اچھے نام ہیں جو اوصاف وکمالات پر دلالت کرتے ہیں'' وہ کیا ہے؟ ظاہر سی بات ہے کہ دونوں باتیں درست نہیں ہوسکتیں، کیونکہ ان میں حق و باطل کا فرق ہے: امداد المشتاق کی عبارت یہ اعلان کر رہی ہے کہ ''لا إلٰه إلا هو'' سے غیر اللہ کے وجود یا موجود ہونے کی نفی کی گئی ہے جو ایک باطل نظریہ اور عقیدہ ہے اور آیت کے الفاظ اشارةً بھی اس پر دلالت نہیں کرتے، جبکہ بیان القرآن کی عبارت اس امر پر بصراحت دلالت کر رہی ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں ہے اس کے لیے سب سے اچھے نام ہیں، یعنی بیان القرآن کی عبارت غیر اللہ کے وجود کی نہیں، بلکہ الوہیت غیر اللہ کی نفی کر رہی ہے: پہلی بات کفر و الحاد ہے اور دوسری بات توحید الوہیت کا اثبات۔

امداد اللہ نے عربی زبان اور دینی علوم سے نابلد ہونے، توحید کے لذت آشنا نہ ہونے اور وحدة الوجود کے داعی ہونے کی وجہ سے اگر کفر والحاد کی بات کہہ دی تھی تو صوفی اور مرید ہونے سے پہلے ایک عالم دین اور مفسر قرآن ہونے کی حیثیت سے آپ پر یہ فرض تھا کہ آپ ان کی غلطی واضح کر دیتے اور اس کو بشری کمزوری پر محمول کر کے اس کی شدت میں

---

❶ ص: ۹۰

Marfat.com

تخفیف بھی کر سکتے تھے اس طرح آپ کا قد مزید بلند ہو جاتا۔ آپ کے اس ارشاد ''یہ باب اشارہ سے ہے تفسیر نہیں'' سے اس قول کی شناعت اور سنگینی کم نہیں ہو سکتی۔

آپ نے اس کے بعد جو یہ فرمایا ہے کہ ''جب لا إله إلا هو'' سے غیر کی نفی ہوگئی تو سوال وارد ہوا کہ یہ کائنات کیا ہے؟ لـه الأسـمـاء الحسنى'' میں اس کا جواب ہے کہ ان کے جو اسماء ہیں یہ کائنات ان کے مظاہر ہیں موجود مستقل نہیں۔''

آپ سے باادب یہ سوال ہے کہ کیا واقعۃً یہ ساری باتیں اس آیت مبارکہ میں موجود ہیں اور کیا واقعۃً یہ آیت یہ بتا رہی ہے کہ کائنات اللہ کے اسماء کے مظاہر سے عبارت ہے؟ اگر آپ کا یہ دعویٰ درست ہے تو پھر آپ نے اپنی تفسیر میں یہ باتیں لکھنے سے کیوں گریز کیا اور ان کے برعکس یہ کیوں تحریر فرمایا کہ ''اس کے بڑے اچھے اچھے نام ہیں جو اس کے اوصاف وکمالات پر دلالت کرتے ہیں، سو قرآن ایسی ذات مستجمع الصفات کا نازل کیا ہوا ہے اور یقینی حق ہے؟ آپ کی اس عبارت سے وحدۃ الوجود کے قائلین کے اس دعویٰ کی تائید نہیں ہوتی، بلکہ اظہار تک نہیں ہوتا کہ کائنات اسمائے الٰہی کا مظہر ہے۔

شیخ احمد سرہندی شیخ تھانوی سے زیادہ حق گو تھے اور اعلان حق وحقیقت میں ان سے بہت زیادہ جری بھی تھے، وہ تصوف کے ''خول'' سے باہر تو نہیں نکلے، مگر انہوں نے تصوف کے بہت سے افکار پر سخت تنقید کرنے سے گریز بھی نہیں کیا جن میں سے ایک یہی ''وحدۃ الوجود'' کا نظریہ ہے جس کو انہوں نے صریح لفظوں میں باطل قرار دیا ہے اور یہاں تک لکھ دیا ہے کہ ابن عربی سے پہلے کے صوفیا کے یہاں اس کا ذکر نہیں ملتا۔

وحدۃ الوجود کی ایک مثال:

مولانا تھانوی نے ''امداد المشتاق'' میں حاجی امداد اللہ کے حوالہ سے ایک واقعہ بیان کیا ہے بطور لطیفہ اسے پڑھ کر، اس خشک بحث کے مطالعہ سے لاحق ہونے والی سرگرانی دور کر لیجیے۔

ایک موحد - وحدۃ الوجود کا عقیدہ رکھنے والا - سے لوگوں نے کہا کہ اگر حلوا اور غلیظ ایک ہیں تو دونوں کو کھاؤ، انہوں نے بشکل خنزیر ہو کر گوہ - بُراز، پاخانہ - کو کھا لیا، پھر بصورت آدمی ہو کر حلوا کھایا۔ اس کو حفظ مراتب کہتے ہیں جو واجب ہے۔

اس گندے اور خود اپنی تکذیب کرنے والے واقعہ کو نقل کرنے کے بعد ''حکیم الامت'' اس پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''اس معترض کی غباوت کے سبب اس تکلف وتصرف کی ضرورت پڑی، ورنہ جواب ظاہر ہے کہ یہ اتحاد مرتبۂ حقیقت میں ہے نہ کہ احکام وآثار میں۔'' [1]

---

[1] ص: ۱۰۰

Marfat.com

تھانوی نے جھوٹے موحد کے باطل عقیدے پر اعتراض کرنے والے کو غباوت سے موصوف کیا ہے جبکہ اس لقب کا مستحق وحدۃ الوجود کا مدعی تھا، نہ کہ معترض، اور مولانا نے یہ نہیں بتایا کہ مذکورہ صوفی خنزیر میں کس طرح تبدیل ہوا، پھر انسان کی شکل میں واپس کس طرح آیا، کیونکہ ایسا کرنا انسانی قدرت سے باہر ہے۔

پھر اگر حلوا اور غلاظت میں اتحاد اور عینیت بقول ان کے حقیقی تھی، تو ان کے احکام و آثار میں اختلاف یا دوئی کہاں سے آئی؟

پیر پرستی:

اسلام دین فطرت ہے اور بڑوں کی عزت، احترام اور توقیر اسلامی اخلاقیات کا اہم باب ہے، اسلامی معاشرہ اپنے افراد کے درمیان الفت و محبت اور رحم و شفقت کی بنیادوں پر قائم ہے، اسی لیے اسلام میں چھوٹوں پر رحم و شفقت اور بڑوں کے احترام، ادب اور توقیر پر زور دیا گیا ہے، چنانچہ انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

ایک بزرگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے شرف ملاقات حاصل کرنے کی غرض سے آئے تو لوگوں نے مجلس میں ان کے لیے کشادگی پیدا کرنے میں دیر کی اس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((لیس منا من لم یرحم صغیرنا و لم یؤقر کبیرنا)) [1]

''وہ ہم میں سے نہیں جو ہمارے چھوٹے پر رحم نہ کرے اور ہمارے بڑے کی عزت نہ کرے۔''

عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

((لیس منا من لم یرحم صغیرنا و یعرف شرف کبیرنا))

''وہ ہم میں سے نہیں ہے جو ہمارے چھوٹے پر رحم نہ کرے اور ہمارے بڑے کی بزرگی نہ پہچانے۔''

ان دونوں حدیثوں میں جو بات قابل توجہ اور قابل غور و تدبر ہے وہ یہ کہ ان میں چھوٹوں پر رحم و شفقت کو بڑوں کی عزت و توقیر پر مقدم رکھا گیا ہے، کیونکہ چھوٹوں پر رحم و شفقت انسانیت کا تقاضا اور انسانیت کی دلیل ہے اور اس صفت سے موصوف انسان ایسا محض اپنی بے آمیز فطرت اور انسانی جذبے سے کرتا ہے جس سے اس کی کوئی مادی غرض نہیں ہوتی، اور چھوٹے کسی کو کوئی مادی منفعت پہنچا بھی نہیں سکتے، جبکہ بڑوں کی عزت و توقیر مخلصانہ بھی ہوتی ہے اور مصلحت آمیز بھی اور منافقانہ بھی۔

بڑائی اور بزرگی عمر کے اعتبار سے بھی ہوتی ہے، رشتہ و قرابت میں اقدمیت سے بھی، علم و فضل میں بڑائی کے اعتبار سے بھی اور عہدہ و منصب کے اعتبار سے بھی اور اسلام میں ان تمام تمام اعتبارات کی، ان کے مقام و مرتبے کے لحاظ سے رعایت کی گئی ہے، کیونکہ اس میں جہاں دنیا اور آخرت کی بھلائی مضمر ہے، وہیں اس سے معاشرے میں توازن قائم رہتا ہے، اسلام کے ان بلند معانی سے ان نمبروں کی حامل حدیثوں سے واقفیت حاصل کی جا سکتی ہے۔ [2]

---

[1] ترمذی: ۱۹۱۹ [2] بخاری: ۶۰۲۷۔ مسلم: ۲۳۱۹۔ ابوداود: ۴۹۴۱، ۴۹۴۲۔ ترمذی: ۱۹۲۴

Marfat.com

بڑوں کی اس توقیر، عزت اور احترام کی تاکید کے باوجود رسول اللہ ﷺ کے علاوہ کوئی بھی شخص مطاع، متبوع اور مقتدی نہیں ہے، حتیٰ کہ خلفائے راشدین کی سنت کی اتباع اور پیروی بھی صرف اسی وجہ سے فرض ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس کا حکم دیا ہے، اور یہ بھی اس صورت میں جبکہ ان کا کوئی حکم یا قول، یا فعل قرآن وسنت کی کسی نص کے خلاف نہ ہو۔

تنہا رسول اللہ ﷺ کی ذات ایسی ہے جو غیر مشروط اور مطلق مطاع ہے اور یہ چیز شہادتین میں داخل ہونے کی وجہ سے کسی کے مومن ہونے کی بنیادی شرط ہے، مگر اس شرط کے ساتھ کہ آپ ﷺ کو صرف اللہ کا بندہ اور رسول مانا جائے اور الوہیت اور ربوبیت کی کسی بھی صفت سے آپ کو موصوف نہ مانا جائے۔

رسول اللہ ﷺ جن پاکیزہ صفات سے موصوف تھے، آپ اخلاق انسانی کی جس بلندی پر فائز تھے اور آپ کی حیات پاک جن ظاہری اور باطنی محاسن سے مزین تھی اور اس پر مزید یہ کہ آپ کو جو غیر معمولی اور بے مثال جسمانی اور روحانی قوت حاصل تھی ان میں سے کوئی ایک بھی لوگوں کو آپ کی پرستش پر آمادہ کرنے کے لیے کافی تھی، لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے اور رسول کے ذریعے ہمیں جو کلمہ دیا ہے؛ یعنی ''أشهد أن لا إلـه إلا الله و أشهد أن محمدا رسول الله'' میں یہ گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں اور یہ گواہی دیتا ہوں کہ محمد اللہ کے رسول ہیں۔'' تو اس کلمہ نے اللہ تعالیٰ کی الوہیت و ربوبیت میں رسول اللہ ﷺ کے شریک ہونے کا دروازہ قیامت تک کے لیے بند کر دیا ہے اور جو شخص بھی صدق دل سے یہ گواہی دے گا وہ کسی بھی حال میں یہ اعتقاد نہیں رکھ سکتا کہ رسول اللہ ﷺ اللہ تعالیٰ کی ربوبیت، الوہیت اور امور کائنات میں تصرف میں بھی شریک ہیں۔ اس کلمہ شہادت کا پہلا حصہ اس گواہی اور اعتراف سے عبارت ہے کہ صرف اللہ تعالیٰ معبود برحق ہے اور اس کے سوا لوگوں نے جو معبود بنا رکھے ہیں وہ سب معبودان باطل ہیں:

﴿ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَ اَنَّ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهِ الْبَاطِلُ وَ اَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ﴾

(لقمٰن: ۳۰)

''یہ اس لیے کہ درحقیقت اللہ ہی حق ہے اور اس کے سوا لوگ جس کو پکارتے ہیں بے شک وہ باطل ہے اور حقیقت میں اللہ ہی سب سے بلند اور سب سے بڑا ہے۔''

اس کلمۂ شہادت کا دوسرا حصہ محمد بن عبداللہ ﷺ کے رسول ہونے کی گواہی دینا ہے۔ جس کا تقاضا یہ ہے کہ آپ نے جو خبریں دی ہیں ان کی تصدیق کی جائے، آپ نے جو احکام دیے ہیں ان کی تعمیل کی جائے، جن باتوں سے روکا ہے ان سے باز رہا جائے، اور عبادت کا جو طریقہ بتا دیا ہے اور کر کے دکھا دیا ہے صرف اسی کے ذریعہ اللہ کی عبادت کی جائے، رسول اللہ ﷺ کی رسالت کی گواہی دینے کا تقاضا یہ بھی ہے کہ یہ اعتقاد دل میں جگہ نہ پائے کہ ربوبیت،

Marfat.com

الوہیت اور کائنات کے انتظام وانصرام میں بھی آپ کا کوئی حصہ ہے۔

اس کے علاوہ قرآن وحدیث میں رسول اللہ ﷺ کی بشریت، عبدیت اور نفع وضرر کے مالک نہ ہونے کو اتنی تفصیل اور تاکید کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے کہ الوہیت و ربوبیت کی کسی بھی صفت سے آپ کے موصوف ہونے کا خیال کسی ایسے ہی دل میں پیدا ہوسکتا ہے جس میں توحید کی روشنی کبھی داخل ہی نہیں ہوئی ہے اور اگر داخل ہوئی ہے تو وہ وحدۃ الوجود کے عقیدہ کی تاریکی ہے اس توحید کی روشنی نہیں جس کو اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء اور رسولوں کی بعثت کا مقصد اولیں فرمایا ہے:

﴿وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ۝﴾

(الانبیاء: ۲۵)

''اور تم سے پہلے ہم نے کوئی بھی رسول نہیں بھیجا، مگر اس کی طرف یہی وحی کرتے رہے کہ درحقیقت میرے سوا کوئی معبود نہیں، سو میری ہی عبادت کرو۔''

اب اگر سید ولد آدم، خیر البشر اور افضل الرسل ﷺ کا یہ حال تھا کہ آپ ''محض'' اللہ کے بندے اور رسول تھے اور الوہیت اور ربوبیت میں آپ کا کوئی حصہ نہیں تھا تو یہ نام نہاد پیر کہاں سے اللہ کے شریک بن گئے کہ پیر رومی نے یہ فرمادیا کہ:

ہر کہ پیر و ذات را یک جاندید
نے مرید و نے مرید و نے مرید

''جو کوئی پیر اور ذات الٰہی کو ایک مقام پر نہ دیکھے وہ مرید نہیں، مرید نہیں، مرید نہیں ہے۔''

اس مشرکانہ شعر میں مرید کو یہ تعلیم دی گئی ہے کہ وہ اپنے پیر کو اس نگاہ سے دیکھے کہ میں اللہ کو دیکھ رہا ہوں، اگر وہ ایسا نہ کرے تو مرید نہیں۔

اسی وجہ سے صوفیا کے من گھڑت ''اولیاء اللہ'' کے مناقب کی کتابوں میں ان کی جو کرامتیں بیان کی گئی ہیں ان میں ان کے واقعہ نگاروں نے ان کو ان تمام صفات سے موصوف کیا ہے جو اللہ تعالیٰ کی صفات ہیں مثال کے طور پر، تخلیق، رزق رسانی، زندگی دینا، موت دینا، آسمانوں اور زمین کے خزانوں کا مالک ہونا، غیب کا علم رکھنا، امور کائنات میں تصرف کرنا، مستحق عبادت ہونا، بندوں کے آفات ومصائب کو دور کرنا، اولاد دینا، بیماریوں سے شفا دینا، یہ اور اس طرح کی وہ تمام صفات جو قرآن پاک کے مطابق اللہ تعالیٰ کے لیے خاص ہیں، ان سے بلا استثنا صوفیا کے اولیا کو موصوف قرار دیا گیا ہے۔

اسی طرح صوفیا نے صراحۃً اور اشارۃً لوگوں کو اپنے خود ساختہ معبودوں- اولیاء- کی عبادت کی دعوت دی ہے، مثلاً:

Marfat.com

آفات و مصائب میں گھر جانے کے موقع پر ان کو پکارنا، ان کے نام پر جانور ذبح کرنا، ان کے لیے نذر ماننا اور ان کی قبروں کا طواف کرنا وغیرہ۔ کرامات الاولیاء کے موضوع پر لکھی گئی کتابوں میں سینکڑوں نہیں، ہزاروں ایسے دعوے کیے گئے ہیں کہ ان کے پیر اور ولی ہر فریادی کی فریاد پر اس کے پاس پہنچ کر اس کی فریاد رسی کرتے ہیں، اس کی مراد بر لاتے ہیں، اس کی مشکلات کو دور کر دیتے ہیں اور آفتوں سے اس کو نجات دیتے ہیں۔

قرآن مشرکین کے بارے میں یہ صراحت کرتا ہے کہ مصائب و آفات میں گھر جانے کے موقع پر وہ صرف اللہ کو پکارتے تھے اور صرف اس سے یہ درخواست کرتے تھے کہ وہ ان کو ان سے نجات دے۔ ❶

مشرکین کے اس طرز عمل کے بالمقابل ''محبوب الٰہی'' نظام الدین اولیا کے ملفوظات: ''فوائد الفؤاد'' میں درج ایک صوفی کا واقعہ ملاحظہ فرمالیجیے، فرماتے ہیں:

''ایک نقیب نیشاپوری محمد نام، مرد بزرگ راسخ الاعتقاد تھے، میں نے ان کی زبانی سنا وہ فرماتے تھے کہ ''ایک مرتبہ میں ملک گجرات کے سفر میں تھا، اس زمانہ میں وہاں ہندوؤں کا راج تھا، میرے ساتھ اور دو تین شخص ہم سفر تھے، الا ہمارے پاس کوئی ہتھیار نہ تھا، ان دنوں وہاں بازار غارت گری گرم رہتا تھا۔ ایک روز راستہ میں یکا یک ایک ہندو شمشیر برہنہ ہمارے پاس آیا، دیکھنے سے خوف کی حالت ہم پر طاری ہوئی، جس وقت وہ میرے نزدیک آیا میں نے بآواز بلند کہا: ''شیخ حاضر باش'' یہ سنتے ہی اس ہندو نے نہ جانے کیا دیکھا کہ لرزہ اس کے جسم میں پڑ گیا، تلوار ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑی۔ گڑگڑا کر کہتا تھا کہ ''مجھے امان دو'' میں حیران تھا کہ اسے کس بات سے امان دوں، ابھی یہی مجھ پر حاوی تھا آخر اسے میں نے امان دی وہ تلوار بھی اٹھا کر اسے دے دی اور وہ اپنی راہ اور ہم بھی اپنی راہ روانہ ہو گئے۔'' خواجہ ذکر اللہ بالخیر۔ نظام الدین اولیا۔ نے بعد اتمام اس حکایت کے ارشاد فرمایا کہ ''دیکھئے اس نے کیا دیکھا تھا اور کیا اسے دکھلایا گیا تھا۔'' ❷

تبصرہ:

یہ واقعہ صحیح ہوسکتا ہے، مگر نظام الدین اولیا کو اپنے نام، لقب اور شہرت کی لاج رکھتے ہوئے، آنکھوں میں آنسو لا کر اسے بیان کرنے کے بجائے اس پر اپنے گہرے افسوس کا اظہار کرنا چاہیے تھا، کیونکہ وہ مرد بزرگ اگر بقول ان کے راسخ الاعتقاد تھا بھی، تو مصیبت کی گھڑی میں اپنے پیر کو پکار کر اسلام سے خارج ہو گیا تھا اور وہاں غیر موجود اس کے پیر نے نہ اس کی پکار سنی تھی اور نہ سن سکتے تھے اور نہ وہ وہاں آئے، اگر وہ وہاں بالفرض آتے بھی تو انسانی شکل میں آتے، کیونکہ نہ تو وہ اپنی وہ شکل بدلنے پر قادر تھے جس شکل میں اللہ نے ان کو پیدا کیا تھا اور نہ وہ فرشتوں اور جنوں کی طرح کوئی ایسی غیر مرئی صورت ہی اختیار کر سکتے تھے، جس کو ہندو تو دیکھتا مگر وہ پکارنے والا شخص نہ دیکھا، میں نے یہ عرض کیا

❶ یونس: ۲۲۔ عنکبوت: ۶۵۔ لقمان: ۳۲۔ ❷ ص ۱۶۲۔۱۶۳

Marfat.com

ہے کہ یہ واقعہ صحیح ہوسکتا ہے اور ہندو نے اس موقع پر کوئی خوفناک اور مہیب چیز ضرور دیکھی تھی جس سے وہ لرزہ براندام ہوگیا تھا اور وہ چیز شیطان سے عبارت تھی اس لیے کہ اس شخص نے اللہ کے بجائے اس کے ایک کمزور بندے کو پکار کر ایمان کا طوق اپنی گردن سے اتار دیا تھا اور ابلیس کا بندہ بن گیا تھا اس لیے ضلالت و گمراہی میں غرق ایک شخص کی مدد کے لیے وہ وہاں پہنچ گیا، تا کہ وہ شرک کی تاریکی میں اپنا سفر جاری رکھے اور حق سے دور ہوتا جائے۔ اور فعلاً ایسا ہو رہا ہے کہ پیروں، اور ولیوں کو صفات الٰہی سے موصوف ماننے والے یہ اور اسی طرح کی حکایتیں پڑھ کر توحید کی روشنی سے نکل کر شرک کی اتھاہ تاریکیوں میں غرق ہوتے جا رہے ہیں ﴿اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَ يَمُدُّهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ٥﴾ (البقرۃ: ۱۵) ''اللہ ان کا مذاق اڑاتا ہے اور ان کو ان کی سرکشی - کفر و فجور - میں ڈھیل دے رہا ہے کہ وہ حیران سرگرداں پھر رہے ہیں۔'' ﴿وَ هُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا٥﴾ (الکھف: ۱۰۲) ''اور وہ سمجھتے ہیں کہ حقیقت میں وہ اچھا کام کر رہے ہیں۔''

میں نے اوپر جو کچھ عرض کیا ہے اس کی تاکید کر کے اس کو دلوں میں جگہ دینے اور اپنے عقیدۂ توحید کی تجدید و تصحیح کے لیے سورۂ نمل کی آیات ۶۰-۶۶ کو پڑھ لیجیے، اگر آپ عربی زبان جانتے ہیں اور قرآن سمجھتے ہیں تو فبہا، ورنہ کسی ترجمۂ قرآن میں ان آیتوں کا ترجمہ پڑھ لیجیے، ان شاء اللہ تعالیٰ پھر آپ اس طرح کے مشرکانہ واقعات کو پیروں کی کرامت نہیں سمجھیں گے۔

نظام الدین اولیا نے جو یہ فرمایا ہے کہ ''دیکھیے اس نے کیا دیکھا تھا اور کیا اسے دکھلایا گیا تھا؟'' تو اس پر عرض ہے کہ اس نے جو چیز دیکھی ہوگی اس کا تصور کچھ مشکل نہیں ہے دوسرے لفظوں میں اس نے کوئی ایسی خوفناک چیز دیکھی تھی جس سے اس کے ہوش و حواس اڑ گئے اور اس نے تلوار زمین پر پھینک دی، مگر وہ خوفناک چیز نہ تو اس کے پیر اور شیخ سے عبارت تھی اور نہ کسی فرشتہ سے، وہ اس کا پیر اور شیخ اس لیے نہیں ہوسکتا تھا کہ اس کے لیے اپنے مرید کی پکار سن کر اس کی مدد کے لیے چشم زدن میں وہاں پہنچنا ناممکن تھا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَ يُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ وَ سَخَّرَ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ وَ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ مَا يَمْلِكُوْنَ مِنْ قِطْمِيْرٍ٥ اِنْ تَدْعُوْهُمْ لَا يَسْمَعُوْا دُعَآءَكُمْ وَ لَوْ سَمِعُوْا مَا اسْتَجَابُوْا لَكُمْ وَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُوْنَ بِشِرْكِكُمْ وَ لَا يُنَبِّئُكَ مِثْلُ خَبِيْرٍ٥﴾ (الفاطر: ۱۳-۱۴)

''وہ رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے اور اس نے سورج اور چاند کو مسخر کر رکھا ہے، ہر کوئی ایک مقررہ وقت تک کے لیے دوڑ رہا ہے وہی اللہ تمہارا رب ہے اسی کی بادشاہی ہے اور اس کے سوا جن کو تم پکارتے ہو وہ کھجور کی گٹھلی کے چھلکے کے مالک بھی نہیں ہیں، اگر تم ان کو پکارو تو وہ تمہاری پکار

Marfat.com

نہیں سنیں گے اور اگر سن لیں تو تمہاری حاجت بر آری نہیں کریں گے اور قیامت کے دن تمہارے شرک کا انکار کر دیں گے اور تمہیں ایسی خبر ہر چیز کی خبر رکھنے والے کے مانند کوئی نہیں دے سکتا۔‘‘

ان آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے اپنی ربوبیت کاملہ اور اپنی قدرت مطلقہ کو بیان کرتے ہوئے تمام معبودان باطل کے عجز و تقصیر اور کمزوری کو بیان فرمایا ہے اور یہ یقین دلایا ہے کہ لوگ جن کو اللہ کے سوا مصائب و آفات کے موقعوں پر پکارتے ہیں اور ان سے مدد کی درخواست کرتے ہیں اولاً تو وہ ان کی پکار سنتے ہی نہیں، جیسے دور دراز موجود ان کے پیر اور اولیا اور قبروں میں مدفون ان کے بزرگ وغیرہ ثانیاً اگر بالفرض ان میں سے بعض ان کی پکار سن بھی لیں جیسے فرشتے اور جن وغیرہ تو وہ اُن کی پکار کے جواب میں ان کی حاجت بر آری کرنے سے عاجز ہیں اور جب قیامت آئے گی اور لوگوں سے حساب کتاب لیا جائے گا تو یہ معبودان باطل اور یہ من گھڑت پیر و مرشدان کے شرک سے اپنی براءت کا اعلان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے عرض کریں گے: ﴿سُبۡحَانَكَ أَنۡتَ وَلِيُّنَا مِنۡ دُونِهِمۡ﴾ (السبا: ٤١) ’’پاک ہے تو، تو ہمارا کارساز ہے نہ کہ وہ۔‘‘

یہ دراصل وہ جواب ہے جو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے سوال پر فرشتے عرض کریں گے۔

مذکورہ ارشاد الٰہی کی روشنی میں نظام الدین اولیاء کے ’’مرد بزرگ اور راسخ الاعتقاد‘‘ نے مصیبت کی گھڑی میں اللہ کے سوا اپنے پیر کی دہائی دے کر شرک کا ارتکاب کیا تھا، اسی طرح اس کے اس گندے فعل کو اس کی نظروں میں خوشنما بنانے اور شرک میں راسخ الاعتقاد بنانے کی غرض سے وہاں شیطان پہنچ گیا تھا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کو گمراہوں کو گمراہی میں ثابت قدم بنانے کے لیے ہر حربہ استعمال کرنے کا اختیار دے رکھا ہے:

﴿إِنَّ عِبَادِي لَيۡسَ لَكَ عَلَيۡهِمۡ سُلۡطَٰنٌ إِلَّا مَنِ ٱتَّبَعَكَ مِنَ ٱلۡغَاوِينَ﴾ (الحجر: ٤٢)

’’درحقیقت میرے بندے تو ان پر تجھے کوئی قدرت نہیں، سوائے گمراہوں سے تعلق رکھنے والے اس شخص کے جو تیری پیروی کرے۔‘‘

اللہ کے اذن سے وہاں کوئی فرشتہ بھی نہیں گیا تھا، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ اپنے فرشتوں کو صرف اپنے رسولوں اور ان کے پیرو صالح لوگوں کی مدد اور تائید کے لیے بھیجتا ہے، جیسا کہ اس نے غار ثور میں اپنے رسول ﷺ اور آپ کے رفیق سفر ابوبکر رضی اللہ عنہ کی، اپنے غیر مرئی فرشتوں کو بھیج کر کفار کی رسائی سے حفاظت فرمائی۔ (التوبة: ٤٠) غزوۂ بدر میں فرشتوں سے مسلمانوں کی مدد فرمائی۔ (الانفال: ٩) اور غزوہ احزاب میں کفار کو شدید ہوا اور غیر مرئی فوج -فرشتے- بھیج کر پسپا فرمایا۔ (الاحزاب: ٩)

کرامات الاولیا حق ہیں، مگر......

اولیاء اللہ کی وہ کرامتیں حق ہیں جو صحیح سندوں سے ثابت ہیں، لیکن قرآن کے مطابق اولیاء کے مومن و متقی ہونے

Marfat.com

کی شرط کی وجہ سے صوفیا کے نام نہاد اولیا اس صفت اور لقب کے مستحق نہیں ہیں اور تصوف کی کتابوں میں جن لوگوں کی کرامتوں کا ذکر ہے، اگر وہ سب نہیں تو ان کی اکثریت صحیح العقیدہ مسلمان نہیں تھی، بلکہ یہ سب فنا و بقا، جمع و فرق، وحدۃ الوجود اور تصور شیخ وغیرہ کے عقائد رکھتے تھے اور رکھتے ہیں اور ''قولاً'' نہ سہی تو زبان اعمال اور زبان حال سے اپنے پیروں اور بزرگوں کو ان تمام صفات سے موصوف مانتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے لیے خاص ہیں اور اپنے خاص اذکار و اشغال اور ریاضتوں کے حوالہ سے بہت بڑے ''مبتدع'' ہیں، ایسی صورت میں یہ اللہ کے ''ولی'' کیسے ہو سکتے ہیں اور جب اللہ کے ''ولی'' نہیں ہو سکتے تو ان سے منسوب کرامتیں بشرط صحت شیطانوں کے ''خلافِ عادت'' اور ''خلاف معمول'' - خارق عادت - اعمال ہو سکتے ہیں مثال کے طور پر تصوف کی کتابوں میں جن صوفیوں کے مناقب کے ضمن میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ وہ پانی پر چلتے تھے، ہوا میں اڑتے تھے، آگ ان پر اثر نہیں کرتی تھی اور درندہ جانوروں مثلاً شیروں وغیرہ پر سوار ہو کر سفر کرتے تھے، اولاً تو یہ واقعات ان کی ذہنی اختراع ہیں، کیونکہ یہ کسی قابل اعتماد سند سے نہیں بیان ہوئے ہیں اور یہ بات ثابت اور ناقابل تردید ہے کہ اس امت سے نسبت کا دعویٰ کرنے والوں میں رسول اللہ ﷺ کے حوالہ سے جھوٹی روایتیں بیان کرنے والوں میں سرفہرست صوفیا ہیں: ((یجری الکذب علی لسانھم و لا یتعمدون الکذب)) جھوٹ ان کی زبانوں پر جاری رہتا ہے اور وہ بالقصد کذب بیانی نہیں کرتے۔''[1] اس عبارت کا مطلب ہے کہ کذب بیانی ان کی عادت بن چکی ہے کہ وہ بلا ارادہ جھوٹ بولتے ہیں اور جھوٹی روایتیں بیان کرتے ہیں۔

اب اگر تحقیق کرنے سے یہ ثابت ہو جائے کہ یہ واقعات سند کے اعتبار سے صحیح ہیں جس کا امکان بہت کم ہے تو جس شخص سے یہ منسوب ہیں اس کی سیرت و کردار کو کتاب و سنت کی کسوٹی پر رکھ کر پرکھا جائے، دیکھا جائے کہ اس کے عقائد کا ماخذ کتاب و سنت ہے یا علم کلام وہ وہی عقیدۂ توحید رکھتا تھا جو کتاب و سنت میں کھول کھول کر بیان کر دیا گیا ہے اور جس کی دعوت دینے کے لیے تمام انبیاء اور رسول بھیجے گئے تھے یا وہ توحید سے وحدۃ الوجود مراد لیتا تھا، وہ اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات کو ان کے الفاظ سے نکلنے والے معنوں میں لیتا تھا، یا متکلمین کی طرح ان کی تاویل و تحریف کرتا تھا، یا صوفیا کی طرح ان کو کائنات کے مظاہر مانتا تھا؟

اسی طرح حدیث سے متعلق اس کا نقطۂ نظر کیا تھا؛ آیا وہ اس کو قرآن کی طرح شرعی حجت مانتا تھا یا اس میں اور قرآن میں فرق کرتا تھا؟ اگر صاحب کرامت کے عقائد مذکورہ بالا سوالوں کی پہلی شق کے ترجمان تھے تو اس کی عملی زندگی کو دیکھا جائے کہ آیا وہ سنتِ رسول کے مطابق تھی، یا وہ من گھڑت عبادتوں، اوراد و اذکار اور اعمال و اشغال پر عمل پیرا تھا؟ اگر اس سوال کا جواب اثبات میں ہے تو اس سے منسوب خارق عادت واقعات کو کرامت شمار کیا جائے گا، ورنہ بصورت دیگر اس طرح کے واقعات شیطان کے ہاتھوں رونما ہونے والے غیر معمولی اور خلاف معمول واقعات شمار کیے

---

[1] صحیح مسلم: نمبر ۳۹

Marfat.com

جائیں گے اور پانی پر چلنے والوں کے بارے میں کہا جائے گا کہ شیطان ان کو ڈوبنے سے بچا رہا تھا، ہوا میں اڑنے والے اس کے سہارے اڑ رہے تھے، انگاروں کی حرارت سے ان کے پیروں کو شیطان بچا رہا تھا اور جن شیروں پر وہ سواری کرتے تھے وہ حقیقی شیر نہیں تھے، بلکہ شیطانوں نے شیروں کی شکل اختیار کر رکھی تھی وغیرہ اسی پر ان سے منسوب دوسرے غیر معمولی واقعات کو قیاس کیا جا سکتا ہے۔

مذکورہ بالا تفصیلات کی روشنی میں اللہ تعالیٰ کا ولی صرف ایسا شخص ہے جو مومن و متقی ہو اور مومن و متقی کے اوصاف اوپر بیان کردہ تفصیلات میں موجود ہیں۔ اگر ان اوصاف کے حامل یا ان اوصاف سے موصوف کسی مرد صالح یا خاتون صالح سے منسوب کوئی کرامت صحیح سند سے ثابت ہو تو وہ حق ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی تکریم ہے اور ایسی کرامتیں اللہ تعالیٰ اپنے اس طرح کے صالح بندوں یا بندیوں کے ہاتھوں اس لیے ظاہر فرماتا ہے تاکہ ان سے ان کے عقائد کی سلامتی، ان کے صلاح و تقویٰ اور ان کے درست طرز حیات کا یقین حاصل ہو۔

صوفی اللہ کا ولی نہیں:

ولی اور ولایت کی بحث سب سے زیادہ صوفیا کے یہاں ملتی ہے اور صوفیا اپنے پیروں اور بزرگوں کے سوا کسی اور کو سچا مسلمان تک نہیں مانتے ولی ماننا تو دور کی بات ہے، جبکہ قرآن وسنت کا فیصلہ یہ ہے کہ اگر صوفی حد اعتدال پر بھی ہو اور اس کے عقائد و اعمال اکابر صوفیا کے عقائد و اعمال سے مختلف بھی ہوں تب بھی وہ اللہ کا ''ولی'' نہیں ہو سکتا جس کا سبب تصوف سے اس کی وابستگی ہے، کیونکہ ایک شخص کسی بھی درجے میں صوفی بھی ہو اور مومن و متقی بھی دونوں میں تضاد ہے، میں ان شاء اللہ آگے یہ دکھاؤں گا کہ صوفیا حق اور اہل حق کے سب سے بڑے دشمن رہے ہیں اور حارث محاسبی کے بعد آنے والوں یا دوسرے لفظوں میں متاخرین صوفیا میں کوئی بھی ایسا شخص نہیں پیدا ہوا ہے جس کے عقائد و اعمال کتاب وسنت کی تعلیمات پر مبنی رہے ہوں یا معروف زبان میں وہ اہل سنت و جماعت کے طریقے کا پیرو رہا ہو۔

صوفیا کو انبیاء سے تشبیہ دینا کفر ہے:

اللہ تعالیٰ کے نبی اور رسول اس کی مخلوق میں اس کے سب سے زیادہ برگزیدہ بندے رہے ہیں اللہ تعالیٰ نے ان کے دو ایسے اوصاف بیان فرمائے ہیں جن میں ساری خوبیاں جمع ہو گئی ہیں؛ یعنی مصطفون اور اخیار، مصطفون مصطفیٰ کی جمع ہے جس کا اطلاق ایسے شخص پر ہوتا ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے چن لیا ہو، منتخب فرما لیا ہو اور دوسروں پر فضیلت بخشی ہو اور اخیار خیر کی جمع ہے جس کے معنی ہیں: سب سے پسندیدہ، سب سے بہتر اور سب پر فوقیت رکھنے والا، مختصر لفظوں میں خیر و بھلائی کا جامع اور سراپا خیر۔

انبیاء اور رسولوں پر اجمالاً و تفصیلاً ایمان کسی کے مومن ہونے کی بنیادی شرط ہے، قرآن کے مطابق ان کے نبی و رسول ہونے اور خود اپنے نبی اور رسول ہونے پر ایمان کے مکلف نبی ﷺ بھی تھے، بلکہ اپنی امت کے ہر فرد سے پہلے

Marfat.com

مکلف تھے اور مومنین آپ کی اتباع میں اسی ایمان کے مکلف ہیں اور اس پر ان کے مومن ہونے کا انحصار ہے بایں معنی کہ جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے نام لے کر نبی یا رسول قرار دیا ہے اس کو اس کے نام کے تعین کے ساتھ نبی یا رسول ماننا کسی شخص کے مومن ہونے کی بنیادی شرائط میں سے ایک ہے، اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ قرآن و حدیث میں بیان کردہ نبیوں اور رسولوں کے ضمن میں جس شخص کا نام نہیں آیا ہے اس کو نبی یا رسول ماننا ایمان کے منافی ہے۔

ہر نبی اور رسول کی امت میں کسی شخص کے مقام و مرتبے کا تعین اس امر پر موقوف تھا کہ وہ اپنے نبی اور رسول کی اطاعت و اتباع میں کس درجے پر تھا جس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص اس اطاعت و اتباع میں سب پر امتیاز رکھتا تھا وہی اس امت کا افضل ترین شخص یا اس امت میں ''ولی'' تھا۔

اس امت میں بھی افضلیت کا معیار یہی اطاعت و اتباع رسول ہے اس تناظر میں اس امت کے افضل ترین فرد ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، پھر عمر رضی اللہ عنہ، پھر عثمان رضی اللہ عنہ اور پھر علی رضی اللہ عنہ ہیں۔ عثمان و علی رضی اللہ عنہما کی افضلیت کے مسئلے میں جن علمائے اسلام کا اختلاف ہے، یعنی جو عثمان رضی اللہ عنہ کو علی رضی اللہ عنہ سے افضل قرار دیتے ہیں، یا جو عثمان رضی اللہ عنہ پر علی رضی اللہ عنہ کی افضلیت کے قائل ہیں، یہ دونوں بھی اہل سنت و جماعت میں شمار ہوتے ہیں۔ [1]

خلفائے راشدین کی افضلیت کے بعد مجموعی طور پر تمام صحابہ اپنے بعد آنے والے مسلمانوں سے افضل ہیں۔

رسول اور غیر رسول کے درمیان موازنہ کرنا حرام ہے:

امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں خلیفۂ اول ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے افضل ترین فرد ہونے کے باوجود ان کے اور کسی سابق نبی یا رسول کے درمیان موازنہ کرنا حرام ہے، ایسا خیال اسی شخص کے دل میں پیدا ہو سکتا ہے جو ''رسول مطاع'' اور رسول کے تابع کے فرق سے ناواقف ہے۔

اتباع سنت سے سب سے زیادہ دور صوفیا ہیں:

گزشتہ صفحات میں تصوف اور اہل تصوف کے جو عقائد بیان کیے گئے ہیں ان کی روشنی میں پورے یقین قلب کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ حارث محاسبی کے بعد آنے والے صوفیا اپنے عقائد و اعمال میں سب سے زیادہ اتباع سنت سے دور رہے ہیں اور ہیں، محاسبی سے قبل یا دوسرے لفظوں میں دوسری صدی ہجری تک تصوف نے کوئی عقائدی یا نظریاتی رنگ نہیں اختیار کیا تھا، اور عام سور پر صوفیا کو صلحاء کہا جاتا تھا، جس کی وجہ یہ تھی کہ ظاہری صلاح و تقویٰ اور کثرت عبادات و اعمال خیر میں یہ لوگ عام مسلمانوں پر امتیاز رکھتے تھے، لیکن کتاب و سنت سے ثابت عقائد سے مختلف عقائد بھی نہیں رکھتے تھے اور ان کے اندر بدعتوں کا ظہور بھی نہیں ہوا تھا، البتہ صلحاء کی یہ جماعت عمومی طور پر روایت حدیث میں ناقابل اعتبار تھی۔ امام مسلم نے اپنی کتاب صحیح مسلم کے مقدمہ میں ان صلحاء کے روایت حدیث میں ناقابل اعتماد ہونے کے مسئلہ

[1] عقیدہ واسطیہ، ص: ۴۸

Marfat.com

کو بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے اور مشہور تابعی اور مدینہ کے فقیہ أبو عبدالرحمٰن عبداللہ بن ذکوان متوفی ۱۳۱ھ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ: مجھے مدینہ میں ایسے سو افراد ملے ہیں جو دین داری کے معاملہ میں تو قابل اعتماد تھے، لیکن ان سے حدیث نہیں روایت کی جاتی تھی، اور کہا جاتا تھا کہ یہ روایت حدیث کے اہل نہیں ہیں۔ ❶

حاجی امداد اللہ کی جسارت:

حاجی امداد اللہ کا مختصر ذکر اوپر آ چکا ہے اور آگے قدرے تفصیل سے آئے گا، موصوف ''وحدۃ الوجود'' کا عقیدہ رکھتے تھے اور قرآن کی باطنی تفسیر بھی کرتے تھے، دینی علوم سے تقریباً نابلد تھے، صوفیا کے گمراہ کن عقائد کے بیان میں بڑے جری تھے اور صوفیوں سے منسوب خرافاتی اور من گھڑت کرامتیں بیان کرنے میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ مولانا تھانوی نے اپنی کتاب ''امداد المشتاق'' میں صوفیوں کے درمیان فرق مراتب سے متعلق ایک بحث اور اس کے بارے میں ان کا نقطۂ نظر انہی کے الفاظ میں نقل کیا ہے جو پڑھنے کے قابل ہے، فرماتے ہیں:

''فرمایا کہ ایک روز دو آدمی آپس میں بحث کرتے تھے، ایک کہتا تھا کہ حضرت شیخ معین الدین چشتی حضرت غوث اعظم قدس سرہ سے افضل ہیں اور دوسرا حضرت غوث پاک کو شیخ پر فضیلت دیتا تھا۔ میں نے کہا کہ ہم کو نہ چاہیے کہ بزرگوں کی ایک دوسرے پر فضیلت بیان کریں، اگرچہ اللہ فرماتا ہے: ﴿فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ﴾ جس سے معلوم ہوا کہ واقع میں تفاضل ہے، لیکن ہم دیدۂ بصارت نہیں رکھتے اس واسطے مناسبِ شان ہمارے نہیں کہ محض رائے سے ایسی جرأت کریں۔'' ❷

تبصرہ:

صوفی امداد اللہ نے بزرگوں کے درمیان تفاضل پر قرآن پاک کی جس آیت مبارکہ سے استدلال کیا ہے اس کا تعلق رسولوں کے درمیان تفاضل سے ہے، چہ نسبت خاک را با عالم پاک! کہاں اللہ تعالیٰ کے رسولوں کا مقام و مرتبہ اور کہاں مقام فنا و بقا، جمع و فرق اور وحدۃ الوجود کے باطل اور غیر اسلامی نظریات کے حامل اور داعی صوفیا، اگر صوفی بزرگ متبع کتاب و سنت بھی ہوتے تب بھی رسول اللہ ﷺ کے کسی صحابی سے ان کا موازنہ درست نہ ہوتا، چہ جائیکہ اللہ کے رسولوں سے ان کی تشبیہ؟ جو دراصل اللہ کے رسولوں کے مقام و مرتبے سے عدم واقفیت، بلکہ اس کے انکار سے عبارت ہے اور ایسی جسارت کوئی ایسا شخص ہی کر سکتا ہے جس کے دل کو کبھی ایمان کی لذت ملی ہی نہیں ہے۔

یہ حال اس شخص کا تھا جو اکابر صوفیائے دیوبند کا پیر و مرشد تھا اور جس کو مولانا تھانوی، مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا اویس نگرامی وغیرہ ''قطب العالم'' اور ''شیخ العرب والعجم'' مانتے تھے؟

اس کے بعد حاجی امداد اللہ نے اس شخص - قادری - کی دلیل کا ذکر کیا ہے جو شیخ عبدالقادر کو معین الدین چشتی پر

❶ نمبر: ۳۰ ❷ حکایت نمبر: ۱۴، ص: ۴۴

Marfat.com

فضیلت دیتا تھا، اس سے پیروں اور بزرگوں کے بارے میں صوفیا کے عقائد پر مزید روشنی پڑتی ہے اور اس سوال کا جواب مل جاتا ہے کہ اس قوم میں ''پیر پرستی'' کہاں سے آئی ہے، فرماتے ہیں:

''اس شخص نے دلیل پیش کی کہ جس وقت حضرت غوث پاک نے "قدمی علی رقاب اولیاء الله" (میرا پاؤں اولیاء اللہ کی گردنوں پر) فرمایا، تو حضرت معین الدین نے فرمایا: "بل علی عینی" (بلکہ میری آنکھ پر) یہ ثبوت افضلیت حضرت غوث پاک کا ہے۔''

''میں نے کہا کہ اس سے تو فضیلت حضرت معین الدین صاحب کی حضرت غوث پر ثابت ہوسکتی ہے، نہ برخلاف اس کے، کیونکہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت غوث اس وقت مرتبہ ''الوہیت'' یعنی عروج میں تھے اور حضرت شیخ مرتبہ ''عبدیت'' یعنی نزول میں اور نزول کا افضل ہونا عروج سے مسلم ہے۔''[1]

غوث صرف اللہ تعالیٰ ہے:

غَاثَ یَغُوْثُ غَوْثًا کے معنی ہیں: مدد کرنا، اعانت کرنا اور مصیبت اور پریشانی سے نجات دینا، عربی قاعدہ کے مطابق اگر مصدر کو صفت کے طور پر استعمال کیا جائے تو اس میں مبالغہ کا مفہوم پیدا ہو جاتا ہے، یعنی بہت زیادہ مدد کرنے والا، ہر مصیبت اور پریشانی سے نجات دینے والا۔

اللہ تعالیٰ کی صفت کے طور پر یا نام کے طور پر قرآن و حدیث میں غوث یا مغیث نہیں آیا ہے، البتہ ''مستغاث'' کے طور پر آیا ہے۔ (الانفال: ۱۹ و الاحقاف: ۱۷)

صوفیوں نے شیخ عبدالقادر جیلانی کو ''غوث'' کا جو لقب دے رکھا ہے اس کے معنی ان کے من گھڑت فضائل و مناقب اور ان سے منسوب جھوٹی کرامتوں کی روشنی میں یہ ہیں کہ وہ غیر معمولی، غیر طبعی اور مافوق الاسباب امور میں لوگوں کی مدد کرتے ہیں، آفات و مصائب میں جو لوگ ان کو پکارتے تھے، ان کی دہائی دیتے تھے اور ان سے استغاثہ کرتے تھے وہ ان کی مدد کو پہنچ جاتے تھے یا اپنی جگہ بیٹھے ہوئے ان کو مصائب سے نجات دے دیتے تھے، اپنی زندگی میں تو وہ یہ کرتے ہی تھے، اپنی موت کے بعد بھی ان کی مدد، دست گیری اور اعانت کا سلسلہ جاری ہے تو کسی انسان کے بارے میں ایسا اعتقاد شرک ہے چاہے وہ رسول ہی کیوں نہ ہو، بلکہ غیر معمولی طاقت رکھنے والے فرشتوں یا جنوں سے بھی مذکورہ امور میں استغاثہ کرنا اور ان میں سے کسی کو ''غوث'' ماننا شرک اکبر ہے، چاہے اس کو غوث اعظم مانا جائے یا غوث اصغر:

﴿اَمَّنْ یُّجِیْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَ یَكْشِفُ السُّوْٓءَ وَ یَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ ط ءَ اِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ قَلِیْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ٥﴾ (النمل: ٦٢)

''آخر کون ہے جو لاچار کی دعا قبول کرتا ہے جب وہ اسے پکارتا ہے اور تکلیف دور کرتا ہے اور تمہیں زمین

[1] ص: ۴۴-۴۵

Marfat.com

کے جانشین بناتا ہے کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود ہے، تم بہت کم نصیحت قبول کرتے ہو۔"

مقام عروج ونزول:

عروج اور نزول صوفیا کی خود ساختہ اصطلاحیں ہیں، حاجی امداد اللہ کے اس دعوی: "حضرت غوث اس وقت مرتبۂ الوہیت میں تھے" کے معنی ہیں کہ اس وقت وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس طرح متحد ہو گئے تھے اور اس کی ذات میں وہ اس طرح ضم ہو چکے تھے کہ وہ خود اللہ اور معبود بن گئے تھے اور اللہ تعالیٰ اور ان کے درمیان غیریت اور دوئی باقی نہیں رہی تھی صوفیا اسے مقام جمع الجمع یا مرتبۂ عروج سے تعبیر کرتے ہیں امداد اللہ چونکہ اپنے شیخ اکبر ابن عربی کے عقیدۂ وحدۃ الوجود پر تھے اس لیے ان کے مشرکانہ قول کا مطلب ہے کہ جب عبدالقادر جیلانی نے یہ کہا تھا کہ میرا پاؤں اللہ کے ولیوں کی گردنوں پر ہے، اس وقت وہ یا تو حقیقتاً مقام الوہیت پر فائز تھے یا ان کو یہ احساس تھا کہ وہی الٰہ اور معبود ہیں۔

اسی طرح نزول بھی ایک صوفیانہ اصطلاح ہے جس کے معنی ہیں کہ جب فنا اور بقا کا تجربہ کرنے والا صوفی اللہ تعالیٰ کے ساتھ مکمل اتحاد اور انضمام کے احساس سے خالی الذہن ہو کر اپنے اور اللہ کے درمیان فرق اور غیریت کا احساس کرنے لگے۔

معین الدین چشتی کے قول: "عبدالقادر کا پاؤں میری آنکھ پر" کی رو سے امداد اللہ کے دعوی کہ "وہ مرتبۂ عبدیت یعنی نزول میں تھے" کا مطلب ہے کہ وہ معبود عبدالقادر کے عبد اور بندے کے مقام پر تھے، نہ کہ اللہ تعالیٰ کے بندے، اس لیے کہ انہوں نے جو یہ کہا تھا کہ "بل علی عینی" بلکہ میری آنکھ پر، تو اس سے ان کی مراد یہ تھی کہ ان کا پاؤں میری گردن پر نہیں، بلکہ میری آنکھ پر۔"

"معین الدین کی یہ عبدیت عبدالقادر کی الوہیت سے افضل تھی، لہٰذا وہ ان سے افضل تھے۔" یہ ہے قطب العالم اور شیخ العرب والعجم کے دعاوی کا ماحصل، سوال یہ ہے کہ ان مسائل کا اسلام سے کیا تعلق؟ اور کیا فنا و بقا، جمع وفرق اور عروج و نزول کے یہ احساسات شیطانی وسوسوں کے سوا کچھ اور ہیں؟ میرے یہ الفاظ بظاہر بڑے سخت ہیں مگر صوفیا کے دعوؤں کے مقابلے میں بہت ہلکے ہیں، برصغیر کے صوفیا میں سب سے بلند قامت صوفی شیخ احمد سرہندی تھے، جنہوں نے کفر وشرک کے خلاف جہاد بھی کیا ہے اور جن کی زبان بڑی محتاط تھی انہوں نے خود اپنا اور دوسرے صوفیوں کا احتساب بھی کیا ہے، بایں ہمہ انہوں نے اپنے مراقبوں کے دوران اپنے مشاہدے میں آنے والے مظاہر کو جن الفاظ میں بیان کیا ہے ان کو پڑھ کر دل کانپ جاتا ہے۔ شیخ احمد حاجی امداد اللہ سے بہت زیادہ پاکیزہ صفت تھے اور دین کا علم بھی وہ اُن سے بہت زیادہ رکھتے تھے اس لیے انہوں نے اپنے جو مشاہدے بیان کیے ہیں ان کو جھٹلایا بھی نہیں جا سکتا، مگر عقل وشرع دونوں کی میزان میں ان کے بے وزن ہونے کی وجہ سے ان کو تسلیم بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اپنے روحانی تجربے بیان کرتے ہوئے وہ فرماتے ہیں:

"پہلے ان پر بے خودی اور غیبت طاری ہوئی اس حال میں انہوں نے ایک بحر ذخار دیکھا جس میں اشیاء کی

Marfat.com

صورتیں سایوں کی طرح نظر آ رہی تھیں۔'' ان کے پیر باقی باللہ کے بقول: ''ان کو ایک طرح کی فنا حاصل ہو گئی تھی۔

اس کے بعد انہوں نے کائنات کو شیٔ واحد کی شکل میں دیکھا جو ذات واحد سے متحد ہے۔ اس کے بعد وہ بے شعوری کے عالم میں چلے گئے، جس میں انہوں نے خدا تعالیٰ کا براہ راست مشاہدہ کیا اور انہیں محسوس ہوا کہ ان کی تمام صفات درحقیقت باری تعالیٰ کی صفات ہیں، یہ فناء الفنا کا مقام تھا۔'' ❶

شیخ احمد کے یہ تجربات اور مشاہدات فنا سے عبارت تھے یا فناء الفنا سے، یہ بعد کی بات ہے، پہلے تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انہوں نے کائنات کو ''ذات واحد'' سے متحد دیکھا کیسے؟ ذات واحد غیر مرئی ہے، نہ وہ سر کی آنکھوں سے دیکھی جا سکتی ہے اور نہ چشم تصور سے؛ تصور کی گرفت میں وہی چیز آ سکتی ہے جس کی خارج میں کوئی مثال ہو اور اللہ تعالیٰ ''بے مثل'' ہے۔

پھر اگر انہوں نے بالفرض اللہ تعالیٰ کا مشاہدہ کیا بھی تھا تو یہ ان کے لوح قلب و ذہن پر مرتسم کس طرح ہوا وہ تو بے شعوری اور بے خودی کے عالم میں تھے اور صوفیا کی زبان میں ان پر سکر، مدہوشی اور بے خودی کی کیفیت طاری تھی، اس حال میں آنکھیں تو دیکھتی ہیں، لیکن ان کے مشاہدات دل و دماغ کے لوح پر مرتسم نہیں ہوتے اور انسان اس حال میں اپنی آنکھوں سے دیکھی جانے والی اشیاء کو اپنے دل و دماغ میں محفوظ نہیں کر پاتا، اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء کے دلوں کو نیند کی گرفت میں آنے سے محفوظ رکھا ہے تاکہ وہ نیند و بیداری دونوں حالتوں میں وحی الٰہی وصول کر سکیں، نبی کریم فداہ ابی وامی ﷺ کا ارشاد ہے:

((یا عائشة! إن عینی تنامان و لا ینام قلبی)) ❷

''اے عائشہ! میری آنکھیں تو سوتی ہیں اور میرا دل نہیں سوتا۔''

ایک دوسری حدیث میں نبی ﷺ کی نیند کے بارے میں فرشتوں کا یہ قول نقل ہوا ہے:

((و النبی ﷺ نائمة عیناه و لا ینام قلبه و کذلك الأنبیاء تنام أعینهم و لا تنام قلوبهم)) ❸

''نبی ﷺ کی آنکھیں سو رہی ہیں اور آپ کا دل نہیں سوتا، اسی طرح انبیاء کی آنکھیں سوتی ہیں اور ان کے دل نہیں سوتے۔''

یہاں یہ ذکر فائدے سے خالی نہیں کہ انسان بے ہوشی کی حالت میں خواب نہیں دیکھتا، جبکہ وہ زندہ ہوتا ہے، اس

---

❶ تصوف اور شریعت، ۱/ ۶۵-۶۶ ❷ بخاری: ۱۱۴۷، ۲۰۱۳۔ مسلم: ۷۳۸

❸ بخاری: ۳۵۷۰، ۴۹۶۴، ۵۶۱۰، ۶۵۸۱، ۷۵۱۷۔ مسلم: ۱۶۲

Marfat.com

کی وجہ یہ ہے کہ اس حالت میں اس کا دماغ کام نہیں کرتا اور نیند کی حالت میں بھی اس وقت خواب دیکھتا ہے جب صرف اس کی آنکھیں سوتی ہیں، دماغ بیدار رہتا ہے، لیکن جب دماغ بھی سو جاتا ہے تو وہ خواب نہیں دیکھتا یا دیکھتا بھی ہو تو دماغ اس کی روح کے مشاہدات کو ریکارڈ نہیں کرتا۔

معلوم ہوا کہ شیخ احمد نے پوری کائنات کے اللہ تعالیٰ سے متحد ہو جانے، اور اللہ تعالیٰ کے براہ راست مشاہدے کے جو دعوے کیے ہیں اور جو یہ فرمایا کہ ان کی صفات درحقیقت باری تعالیٰ ہی کی صفات ہیں تو یہ اور اس طرح کے دوسرے دعوے عالم شعور کے دعوے ہیں اور ان کی کوئی حقیقت نہیں ہے، بلکہ یہ سب صوفیانہ قوتِ متخیلہ کی کرشمہ سازیاں ہیں اور جس ماحول میں وہ پیدا ہوئے اور پلے بڑھے تھے اور رات و دن صوفیا کے جو مشاہداتی واقعات بشکل ''حقائق'' سنتے تھے، صوفیانہ مراقبوں کے دوران وہم وخیال کی صورت میں خود ان کا مشاہدہ کرنا کچھ عجیب نہیں ہے، بلکہ زیادہ امکان اس کا ہے کہ شیطان نے یہ سارے مشاہدات کرائے ہوں، کیونکہ بذریعہ مراقبہ ذات الٰہی کی معرفت حاصل کرنے کی کوشش یا اپنی ذات کو فنا کر کے ''ذات واحد'' سے متحد ہو جانے کا تجربہ غیر انبیائی طریقہ ہے، انبیائی طریقہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کی معرفت کتاب وسنت میں مذکور اس کے اسماء وصفات کے ذریعہ حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس طریقے کے سوا بقیہ تمام طریقے شیطانی طریقے ہیں۔

شیخ احمد اور ان جیسے محتاط صوفیا کے سوا جن دوسرے صوفیا سے منسوب اللہ تعالیٰ کے مشاہدے، اس کی معرفت اور کائنات اور اللہ تعالیٰ میں اتحاد کے واقعات کتابوں میں منقول ہیں وہ بھی تمام کے تمام عالم شعور کے واقعات ہیں اور ان اکابر صوفیا نے یہ سارے واقعات ہوش وحواس کی حالت میں بیان کیے ہیں، مگر یہ سب جھوٹے دعووں سے عبارت ہیں، عالم واقعہ اور حقیقت سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے اور ''حکایات الاولیاء'' کی قسم کی کتابوں میں ان صوفیا کے کشف و کرامت کے جو واقعات بیان کیے گئے ہیں ان کی روشنی میں ان کا جھوٹ ہونا محتاج دلیل نہیں ہے۔

دراصل اکابر صوفیا جس ماحول میں پیدا ہوئے اور پلے بڑھے ہیں اس میں اسی طرح کی باتیں ہوتی ہیں اور اسی طرح کے واقعات بیان کیے جاتے ہیں، اور ان صوفیا کے حلقوں میں قرآن کی تلاوت ختم کے لیے کی جاتی ہے اور اگر قرآن کی تفسیر بھی بیان کی جاتی ہے تو صوفیا کے عقائد اور نظریات کی روشنی میں، رہی حدیث تو ان کے کوچے میں اس کی گزر کہاں؟ اگر ان کی محفلوں میں احادیث بیان بھی کی جاتی ہیں تو وہ ۸۰ فیصد جھوٹی روایتیں ہوتی ہیں اور بقیہ ۲۰ فیصد کو صوفیانہ تاویل کی خراد پر چڑھا کر صوفی بنا لیا جاتا ہے، ایسی صورت میں ان کے من گھڑت مراقبوں میں ان کو وہی چیزیں تو نظر آئیں گی جو بچپن سے ان کو پلائی جاتی ہیں، اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کی ان کو لذت ملی ہی نہیں اور اس سے وہ واقف ہی نہیں، اگر کوئی واقف بھی ہے تو ''وحدۃ الوجود'' کی صورت میں، اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کے معانی اور مفاہیم کو وہ متکلمین کی تاویلوں کی شکل میں سمجھتے ہیں، مختصر طور پر یہ کہ حق وباطل اور صواب وخطا میں تمیز کے لیے ان کے پاس کوئی

Marfat.com

کسوٹی ہوتی ہی نہیں، اس پر مستزاد یہ کہ ان کے عقیدۂ ''پیر پرستی'' نے ان کے پیروں کی اطاعت کو اللہ و رسول کی اطاعت پر مقدم کر رکھا ہے۔

صحابۂ کرام کے عہد میں، تابعین کے عہد میں، ائمہ رشد و ہدایت، محدثین، اور ائمہ فقہ کی پاکیزہ سیرتوں میں ان روحانی تجربوں، کائنات اور اللہ میں اتحاد اور مشاہدۂ حق کا اشارۃً بھی ذکر نہیں ملتا، نبی ﷺ کے فرائض منصبی میں کتاب وسنت کی تعلیم اور تزکیۂ نفس بھی شامل تھی، مگر آپ نے فنا و بقا، فناء الفنا، جمع و فرق اور وحدۃ الوجود کی کوئی تعلیم نہیں دی، اگر یہ چیزیں حق ہوتیں تو آپ ان کی ضرور تعلیم دیتے۔

صحابہ کرام، تابعین، محدثین اور ائمہ فقہ کی سیرتوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے کسی پر بھی کبھی عالم بے شعوری، غیبت، مدہوشی اور سکر کی کیفیت طاری نہیں ہوئی اور کسی ایک زبان سے بھی کوئی کفریہ اور مشرکانہ لفظ نہیں نکلا اور کسی ایک نے بھی اللہ تعالیٰ کا مشاہدہ کرنے، کائنات کے ذات واحد کے مظاہر ہونے اور اپنی صفات کو اللہ کی صفات سے متحد ہونے کا دعویٰ نہیں کیا ہے، اگر ان کا اسلام سے کوئی معمولی سا بھی تعلق ہوتا تو ان کے یہاں بھی ان کا ذکر ملتا۔

صوفیا کو رسولوں سے تشبیہ دینے کی ایک اور مثال:

مولانا تھانوی کے بقول حاجی امداد اللہ نے فرمایا: مولانا روم مادر زاد ولی تھے، ایک بار عالم طفلی میں لڑکوں کے ساتھ کھیلتے تھے لڑکوں نے کہا: آؤ آج اس مکان سے دوسرے مکان پر جست لگائیں آپ نے فرمایا: یہ کھیل تو بندروں، کتوں اور بلیوں کا ہے انسان کو چاہیے کہ زمین سے آسمان پر جست لگائے، یہ کہہ کر غائب ہوئے لڑکوں میں شور وغل پیدا ہوا اور ان کے والدین کو بھی اضطراب ہوا، تھوڑی دیر بعد آپ ظاہر ہوئے اور بیان کیا کہ: جیسے ہی میں نے وہ کلمہ کہا مجھے دو فرشتے چہارم آسمان پر لے گئے، مجھے وہاں کے عجائب وغرائب دیکھنے سے گریہ طاری ہوا، میری یہ حالت دیکھ کر پھر زمین پر چھوڑ گئے۔'' ❶

تبصرہ، معراج نبی ﷺ:

کوئی شخص مادر زاد ولی نہیں ہوتا، اس لیے کہ اس کا تعلق انسان کے ایمان اور تقویٰ سے ہے اور ایمان وتقویٰ کا مکلف ایک بالغ انسان ہے، نابالغ بچے نہیں، پھر اس کی زد براہ راست رسول اللہ ﷺ کی معراج پر پڑتی ہے جو ایک معجزہ تھی جو رسول کریم ﷺ کے لیے خاص تھی، یہ درحقیقت ایک ایسا تاج ہے جس سے انبیاء سمیت تاریخ انسانی کے کسی بھی فرد کا سر مزین نہیں ہوا ہے۔ اسراء کا معجزہ سورۂ اسرا کی پہلی آیت اور معراج کا واقعہ یا معجزہ سورۂ نجم کی ۱۲ آیتوں ۷-۱۸ میں بیان ہوا ہے۔ رہیں احادیث تو ۲۵ صحابیوں سے ایسی حدیثیں مروی ہیں جن میں معجزۂ معراج کی تفصیلات بیان ہوئی ہیں اس معجزہ کی اہمیت اور عظمت اس امر سے واضح ہوتی ہے کہ مکہ مکرمہ کے حرم پاک سے بیت المقدس کے

❶ امداد المشتاق: ص ۱۴۳۔ حکایت نمبر: ۳۵۴۔

Marfat.com

سفر پر لے جانے سے پہلے سیّد البشر ﷺ کے مبارک سینے کو سیّد الملائکہ جبریل علیہ السلام نے کھولا، قلب مبارک کو آبِ زمزم سے دھویا اور اس کو ایمان و حکمت سے بھرا۔ ❶ اور معراج کے سفر میں ہر آسمان کا دروازہ کھولنے سے پہلے اس کے خازن فرشتے نے جبریل علیہ السلام سے نبی کریم ﷺ کے بارے میں پوچھا اور یہ بھی دریافت کیا کہ کیا آپ کو طلب کیا گیا ہے؟

لیکن امداد اللہ صوفی کے امام اور صوفیوں کے پیران پیر مولانا روم کو زبان سے یہ کلمہ ادا کرتے ہی: ''انسان کو چاہیے کہ زمین سے آسمان پر جست لگائے'' دو فرشتے چوتھے آسمان پر لے گئے اور وہاں کے عجائب و غرائب کا مشاہدہ کرا دیا، کیونکہ وہ مادر زاد ولی تھے اور ولی نبی سے افضل ہوتا ہے، اس لیے کہ ولی کا تعلق صرف خالق سے ہوتا ہے، جبکہ نبی خالق اور خلق دونوں سے تعلق رکھتا ہے۔

یاد رہے کہ معجزات انبیاء اور رسولوں کے لیے خاص ہیں قرآن میں معجزہ کی تعبیر نہیں آئی ہے، اس کے بجائے آیہ، آیات اور سلطان کی تعبیریں آئی ہیں، اور کوئی بڑے سے بڑا صوفی رسول اللہ ﷺ کے کسی صحابی کے برابر بھی نہیں ہو سکتا تو پھر مولانا روم سے اتنے بڑے معجزے کی نسبت کس طرح صحیح ہو سکتی ہے؟ اور وہ اتنے بڑے معجزے کے متحمل کیسے ہوئے؟

امداد اللہ کی تحریفات قرآنی:

حاجی امداد اللہ کسی دینی موضوع کے بارے میں لب کشائی کے اہل نہیں تھے، پھر بھی انہوں نے بہت سے دینی موضوعات میں رائے زنی کی ہے، جن میں سے ایک بعض قرآنی آیات کی تفسیر و تبیین بھی ہے، جو دراصل ان کی بے علمی، بدعقیدگی اور مسائل تصوف میں ان کے غیر معمولی غلو، اور وحدۃ الوجود اور ''باطنیت'' پر ان کے ایمان کی وجہ سے تفسیر نہیں، قرآن کی معنوی تحریف ہے اور طرفہ تماشا یہ ہے کہ وہ قرآنی آیات کی معنوی تحریف کرتے ہوئے جمہور مفسرین پر، ان کو اہل الظاہر کہہ کر چوٹ کرنے سے گریز بھی نہیں کرتے، اور ان کے مرید ''حکیم الامت'' صاحب تفسیر ہوتے ہوئے اسلام کے عقیدہ توحید سے متصادم ان کی باطل تفسیر کی تائید کر کے ان کے کار معصیت میں اشتراک سے احتراز نہیں کرتے، اس لیے کہ تصوف میں پیر کی مخالفت حرام اور اس کی اطاعت و ہمنوائی فرض ہے۔

تھانوی کی کتاب ''امداد المشتاق إلی اشرف الاخلاق'' میں ان کا ایک مشرکانہ قول بایں الفاظ نقل کر کے اس کی تائید کی گئی ہے:

''چونکہ آنحضرت ﷺ ''واصل بحق'' ہیں ''عباد اللہ کو عباد رسول'' کہہ سکتے ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ﴾ (الزمر: ۵۳)

❶ بخاری: ۳۴۹، ۱۶۳۶، ۳۳۴۲۔ مسلم: ۱۶۳

Marfat.com

''کہہ دو، اے میرے وہ بندوں جنہوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو۔''

نظریہ وحدۃ الوجود پر مبنی امداد اللہ کا اپنے مشرکانہ قول پر اللہ تعالیٰ کے ارشاد سے یہ استدلال کتاب اللہ کو اپنی خواہشات کے تابع بنانا ہے، تصوف کی زبان میں ''واصل بحق'' ایسا شخص ہے جو اللہ تعالیٰ سے متحد ہو گیا ہو اور اللہ اور اس کے درمیان ''غیریت'' باقی نہ رہی ہو، اس طرح وہی معبود بھی ہو اور وہی عبد بھی، وہی آمر بھی اور وہی مامور بھی اور جو اس کا بندہ ہو وہ اس کے بندے کا بندہ بھی ہو؟

حاجی امداد اللہ نے سورۂ زمر کی مذکورہ بالا آیت کی اپنی تفسیر کی تائید میں مولانا تھانوی کے قول کا حوالہ دیتے ہوئے فرمایا ہے کہ ''مولانا اشرف علی صاحب نے فرمایا: قرینہ بھی انہیں معنی کا ہے، آگے فرماتا ہے: لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ اگر مرجع اس کا اللہ ہوتا، فرماتا ''من رحمتی'' تا کہ مناسبت ''عبادی'' کی ہوتی۔''

مولانا تھانوی نے اس پر جو حاشیہ چڑھایا ہے اس میں فرماتے ہیں: قولہ: ''مرجع ضمیر متکلم نبی ﷺ ہیں۔'' اقول: یعنی اور بزرگوں کے کلام میں بھی یہ مضمون موجود ہے، یہ مرتبہ حقیقت میں ہے، جیسا کہ اس کا معنی ''واصل بحق'' ہونا اوپر فرمایا ہے جس کو عارفین ہی سمجھ سکتے ہیں اور باعتبار ظاہر کے چونکہ عبد بمعنی عابد آتا ہے اس لیے احتیاط کی جاتی ہے، البتہ عبد بمعنی مملوک لے کر توجیہ ممکن ہے، مگر عوام کو ابہام سے بچانا بھی واجب ہے، قولہ: مولانا اشرف علی صاحب نے فرمایا: ''اقول: منشا اس تقریر کا ''فناء فی الشیخ'' ہے اس لیے حجت نہیں۔'' ❶

توضیح اور تبصرہ:

مولانا تھانوی نے امداد اللہ کی مشرکانہ تفسیر، بلکہ تحریف کی نہ کھل کر تائید کی ہے اور نہ بصراحت تردید، لیکن ''اور بزرگوں کے کلام میں بھی یہ مضمون آیا ہے'' فرما کر اشارۃً اس کی تائید کی ہے اور ''یہ مرتبہ حقیقت میں ہے'' فرما کر یہ کہنا چاہا ہے کہ چونکہ نظریہ ''وحدۃ الوجود'' کی رو سے حقیقت میں ہر موجود عین اللہ تعالیٰ ہی ہے، اس لیے رسول اللہ ہے اور اللہ رسول ہے، لیکن یہ فرما کر کہ اس کو عارفین ہی سمجھ سکتے ہیں'' اس کے بیان اور اظہار کو ناپسند کیا ہے۔

حاجی امداد اللہ نے آیت میں ''عبادی'' کی مضاف الیہ ضمیر متکلم کا مرجع رسول اللہ ﷺ کو قرار دینے کے مسئلہ میں مولانا تھانوی کے جس قول کا حوالہ دیا ہے اس کو ''فناء فی الشیخ'' کہہ کر حجت ماننے سے انکار کر دیا ہے جس کا سبب یہ ہو سکتا ہے کہ انہوں نے اپنی تفسیر میں ''عبادی'' کی ضمیر متکلم کا مرجع رسول اللہ ﷺ کو نہیں مانا ہے، اسی وجہ سے تفسیری اور وضاحتی ترجمہ بایں الفاظ کیا ہے:

''آپ ان سوال کرنے والوں کے جواب میں میری طرف سے کہہ دیجیے کہ اے میرے بندو، جنہوں نے کفر و شرک کر کے اپنے اوپر زیادتیاں کی ہیں۔'' ❷

---

❶ ص: ۹۲ ❷ ص: ۹۰۳

Marfat.com

مولانا تھانوی کا اپنے علمی مقام و مرتبے، اپنی ذمہ داریوں اور اپنی شہرت کے لحاظ سے یہ فرض تھا اور ان پر اللہ تعالیٰ کا یہ حق تھا اور قرآن کے کتاب ہدایت ہونے پر ان کے ایمان کا ان سے یہ تقاضا تھا کہ وہ نہایت واضح اور صریح لفظوں میں یہ اعلان کر دیتے کہ حاجی امداد اللہ کا قول باطل اور مشرکانہ ہونے کے ساتھ ساتھ قرآن پاک کی تکذیب ہے، کیونکہ قرآن اول سے آخر تک تمام انسانوں، جنوں اور فرشتوں کو صرف اللہ تعالیٰ کا بندہ قرار دیتا ہے۔

رہی قرینہ کی بات تو قرینہ بذات خود دلیل نہیں ہے، بلکہ متکلم کی مراد کو متعین کرنے کا ایسا ذریعہ ہے جو صحیح بھی ہو سکتا ہے اور غلط بھی، اور اگر کسی سابقہ باطل اور گمراہ کن نظریہ اور عقیدہ کی روشنی میں قرآن پاک کی کسی تعبیر کی توضیح و تشریح کی جائے تو یہ مردود اور باطل ہے۔

رسول اللہ ﷺ مبلغ عن اللہ تھے، قرآن آپ پر نازل ہوا تھا اور آپ اس کی تلاوت اور تبیین کے مکلّف تھے، قرآن پاک میں جہاں جہاں ''قل'' آیا ہے اس کے ذریعہ آپ کو خطاب کر کے اس کے بعد وہ حکم بیان کیا گیا ہے جس کے مکلّف آپ یا دوسرے لوگ تھے، قرآن پاک میں ۳۳۲ مرتبہ بذریعہ ''قل'' نبی ﷺ کو حکم دیا گیا ہے، بعض مقامات پر ''قل'' کے بعد وہ احکام بیان کیے گئے ہیں جن کا تعلق براہ راست آپ کی بشریت اور رسالت سے ہے۔

(اسراء: ۵۳۔ کہف: ۱۱۰)

سورۂ زمر کی زیر بحث آیت میں '' قل '' کے بعد وہ اصل خطاب ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے ان بندوں سے کیا ہے جو گناہوں کا ارتکاب کر کے اپنے آپ پر زیادتیاں کر بیٹھتے ہیں اور پھر ان کے دلوں میں اللہ کی رحمت سے نا اُمیدی پیدا ہو جاتی ہے، صحیحین میں ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث کے مطابق بعض مشرکین اپنے دلوں میں نبی ﷺ کی دعوتِ توحید کو قبول کرنے کی استعداد پاتے تھے، لیکن جاہلی زندگی میں انہوں نے جس کثرت سے لوگوں کو قتل کیا تھا اور جس کثرت سے بدکاریاں کی تھیں ان کی وجہ سے ان کے دلوں میں یہ سوال اُبھرتا رہتا تھا کہ کیا ان گناہوں کا کفارہ ہے؟ اور جب انہوں نے اپنا یہ سوال رسول اللہ ﷺ کے سامنے پیش کیا تو یہ آیت نازل ہوئی۔ ❶

شانِ نزول کے اعتبار سے اگرچہ یہ آیت ایک خاص موقع پر نازل ہوئی ہے، مگر اپنے الفاظ کے عموم کی روشنی میں اس کا حکم تمام گنہگاروں کے لیے عام ہے، چاہے وہ کفار ہوں یا معصیت کار مومنین، یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنے تمام بندوں کو مخاطب کر کے فرمایا ہے کہ گناہوں کی مغفرت کرنے والا تنہا وہی ہے، اور وہ گناہوں سے توبہ کرنے والوں کو معاف کر دیتا ہے، اگر کوئی مشرک و کافر ہے تو اس کی توبہ یہ ہے کہ وہ ایمان لے آئے اور اگر گنہگار اہل ایمان ہے تو گناہ یا گناہوں سے توبہ کر لے اور ان سے کنارہ کش ہو جائے، توبہ و انابت ضروری ہے۔ ❷

اپنے بندوں کو اللہ تعالیٰ نے ''اے میرے بندو'' فرما کر اس لیے مخاطب کیا ہے کہ اس اندازِ تخاطب میں بندوں پر

❶ بخاری: ۴۸۱۰۔ مسلم: ۱۲۲۔ ❷ ابن کثیر، ص ۲۲۵، ج ۳۔

Marfat.com

اللہ تعالیٰ کی خاص عنایت، خاص توجہ، خاص تعلق اور خاص مہربانی مضمر ہے، لیکن رحمت کی اضافت اس اسم ذات اللہ کی طرف اس وجہ سے کی کہ یہ اس کی تمام صفاتِ کمال کا جامع ہے اور اللہ کی صفت ''رحمت'' اس کے فضل وکرم، اس کی قوت وعظمت، اس کے انعام واکرام اور اس کی توفیق اور اسباب خیر و بھلائی کی فراہمی پر دلالت کرتی ہے، متکلمین کی یہ بہت بڑی بدنصیبی اور محرومی ہے کہ انہوں نے رحمت کو ضعف وکمزوری سمجھ کر اللہ تعالیٰ کی اس عظیم صفت کا انکار کر دیا، جبکہ کائنات کا ذرہ ذرہ اللہ تعالیٰ کی صفت رحمت کی گواہی دے رہا ہے، قرآن صرف اللہ تعالیٰ کے معبود ہونے کی دلیل کے طور پر جہاں اس کی ربوبیت شاملہ کا ذکر کرتا ہے وہیں اس کے صفاتی ناموں، رحمٰن ورحیم کا بھی بکثرت ذکر کرتا ہے:

﴿وَ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ﴾ (البقرة: ١٦٣)

''اور تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں بے حد رحم کرنے والا، نہایت مہربان۔''

صرف اللہ تعالیٰ کے معبود ہونے کے سیاق میں اس کے ان دونوں عظیم ناموں کے ذکر سے یہ تاکید مقصود ہے کہ اس کی الوہیت اس کی رحمت پر مبنی ہے، جس طرح سورۂ فاتحہ میں الحمد للہ رب العالمین کے بعد ''الرحمٰن الرحیم'' فرما کر یہ تاکید کی گئی ہے کہ اس کی ربوبیت اس کی رحمت پر مبنی ہے، یاد رہے کہ قرآن میں رحمٰن ۵۷ بار اور رحیم ۹۵ بار آیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے اسم ''رحمٰن'' میں اس کی عمومی رحمت بیان ہوئی ہے جو ساری مخلوق کے لیے عام ہے اور ''رحیم'' اس خصوصی رحمت کو شامل ہے جس میں دوام ہے اور جو مومنین کے لیے خاص ہے۔

سورۂ زمر میں لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ اپنے سیاق میں لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَتِيْ سے زیادہ بلیغ ہے اور اس تعبیر نے ''توحید آشنا'' اور توحید کی لذت سے محروم لوگوں کے اس دعوے کے تار و پود بکھیر دیے ہیں کہ ''یا عبادی'' میں ضمیر متکلم کا مرجع اللہ تعالیٰ نہیں، نبی کریم ﷺ ہیں، اگر لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَتِيْ ہوتا تو ان زبانوں کو مزید ہرزہ سرائی کا موقع مل جاتا جن سے شیطان بولتا ہے۔

میری ان باتوں کی تائید صحیح بخاری کی ایک حدیث سے بھی ہوتی ہے جس کے الفاظ ہیں: ((لا ینبغی، لعبد أن یقول: انا خیر من یونس بن متی)) [1] تو ضمیر "انا" کا مرجع نبی ﷺ ہیں ''عبد'' نہیں ہے جو مذکور ہے، اس لیے کہ سیاق اسی پر دلالت کرتا ہے اور نبی کریم ﷺ کے سوا کوئی بندہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ یونس بن متی سے بہتر ہے۔

اس زیر بحث آیت کے اسلوب بیان کو سمجھنے کے لیے اسی سورت کی آیت نمبر ۱۰ پر بھی ایک نظر ڈال لیجیے جس کے الفاظ ہیں:

﴿قُلْ يٰعِبَادِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوْا رَبَّكُمْ﴾ (الزمر: ١٠)

''کہو، اے میرے بندو جو ایمان لائے ہو اپنے رب کی ناراضی سے بچو۔''

[1] نمبر ۳۳۹۵

Marfat.com

یہاں بھی عبادی کی مناسبت سے حاجی امداد اللہ کے بقول اِتَّقُوْا رَبَّکُمْ کے بجائے اِتَّقُوْنِیْ ہونا چاہیے تھا۔ یاد رہے کہ یہاں ''عباد'' کی مضاف الیہ یائے متکلم ''نداء'' کی وجہ سے محذوف ہے، جبکہ آیت نمبر ۵۳ میں مذکور ہے حالت نداء میں دونوں صورتیں جائز ہیں۔

امداد اللہ کی تحریف قرآنی کی دوسری مثال:

سورۂ تغابن میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿هُوَ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ فَمِنْکُمْ کَافِرٌ وَّمِنْکُمْ مُّؤْمِنٌ وَّاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ ۝﴾ (التغابن: ۲)

''وہی ہے جس نے تمہیں پیدا کیا ہے، پھر تم میں سے کوئی کافر ہے اور کوئی مومن اور تم جو کچھ کرتے ہو اللہ اسے خوب اچھی طرح دیکھ رہا ہے۔''

حاجی امداد اللہ نے اس آیت مبارکہ کا مطلب بیان کرتے ہوئے اس کی جو معنوی تحریف کی ہے، وہ ملاحظہ ہو، فرماتے ہیں:

''اس کی تفسیر نزدیک علماء ظاہر مشہور ہے اور علماء باطن کہتے ہیں کہ ہر کوئی مومن و کافر ہے، کیونکہ سب میں قوی محمودہ و مذمومہ ہوتے ہیں۔'' [1]

حاجی امداد اللہ اعلان باطل میں بڑے جری تھے، اسلام میں ظاہر و باطن نہیں ہے اسلام سے نسبت کا دعویٰ کرنے والے فرقوں میں سب سے پہلے شیعہ نے، بلکہ اسماعیل بن جعفر صادق کے پیروؤں نے یہ دعویٰ کیا کہ ''شرعی نصوص'' اشاروں اور رموز سے عبارت ہیں، جن کی ایسی تاویلیں ہیں جو ان کے ان معانی اور مفاہیم سے مختلف یا ان کے خلاف ہیں جو جمہور علمائے اسلام جانتے ہیں اور شرعی نصوص کی ان باطنی تاویلوں سے صرف اسماعیلیہ فرقہ کے لوگ واقف ہیں۔

یوں تو صوفیا اپنے آپ کو اہل سنت و جماعت میں شمار کرتے ہیں اور شیعہ فرقہ سے اپنی براءت اور بیزاری کا اعلان بھی کرتے رہتے ہیں، شاہ عبدالعزیز نے تو ان کے خلاف کتابیں بھی لکھی ہیں، بایں ہمہ صوفیا اپنے بہت سے عقائد و نظریات میں شیعہ کے ہم مسلک ہیں، خاص طور پر قرآن کی باطنی تفسیر میں، اور ان میں ایسے لوگ شاذ و نادر ہی گزرے ہیں جنہوں نے اہل باطن کی ہمنوائی نہ کی ہو۔

برصغیر کے اکابر صوفیا میں امداد اللہ کو یہ انفرادیت حاصل ہے کہ وہ اہل الظاہر کہہ کر جمہور مفسرین اور محدثین کے خلاف زبان تنقید دراز کرتے ہیں اور اہل الباطن سے اپنی نسبت و تعلق کا برملا اظہار و اعلان کرتے ہیں۔

حاجی امداد اللہ تفسیر، حدیث اور علم عقائد سے نابلد ہونے کے ساتھ عربی زبان کے اصول و قواعد سے بھی بالکل ناواقف تھے، دراصل ان کا سارا مطالعہ مثنوی رومی تک محدود تھا، وہی ان کا قرآن تھی، وہی ان کا عقیدہ تھی اور وہی ان کا ماخذ شریعت تھی۔

---

[1] ص: ۹۸

Marfat.com

الفاظ و معانی کا باہمی تعلق:

جس طرح ہر لفظ کا وہی معنی و مفہوم درست اور مقبول ہے جس معنی اور مفہوم میں اہل زبان نے اس لفظ کو استعمال کیا ہے اور ماہرین زبان کی کتابوں میں عربی زبان کے مستعمل الفاظ اپنے تمام معانی اور اپنے طریقہ استعمال کے ساتھ مدون ہیں۔ یاد رہے کہ عربی زبان دنیا کی ایسی واحد زبان ہے جس کا کوئی لفظ ''متروک'' نہیں ہوا ہے۔

معانی کے تعین میں قواعد زبان کا بھی زبردست کردار ہے اور اس کی رعایت کرنے والا کسی عبارت کی تاویل و تشریح میں غلطی سے محفوظ رہتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے سورۂ تغابن کی زیر بحث آیت میں انسانوں کو دو گروہوں میں تقسیم کر دیا ہے؛ کافر و مومن، اور یہ اسلوب بیان: فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّمِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ تم میں سے کوئی کافر ہے اور کوئی مومن- اور کافر و مومن کے درمیان یہ واضح تفریق اس امر پر بصراحت دلالت کرتی ہے کہ نہ سب انسان کافر ہیں اور نہ سب مومن، بلکہ ان میں کچھ کافر ہیں اور کچھ مومن، اور آیت میں کافر کو پہلے اس لیے لایا گیا ہے کہ اہل ایمان کے مقابلے میں اہل کفر ہمیشہ زیادہ رہے ہیں۔

اسی طرح فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّمِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ کی تعبیر اس امر میں قاطع ہے کہ کوئی بھی بیک وقت کافر و مومن نہیں ہوسکتا، کیونکہ ایمان و کفر میں تضاد ہے اور ایک ہی انسان کا بیک وقت ایمان و کفر سے موصوف ہونا محال ہے۔

امداد اللہ نے جو یہ دعویٰ کیا ہے کہ علمائے باطن کہتے ہیں کہ ہر کوئی مومن و کافر ہے، کیونکہ سب میں قوی محمودہ و مذمومہ ہوتے ہیں'' تو یہ دعویٰ باطل ہے اور قرآن کے اسلوب بیان سے یہ معنی نہیں نکلتے؛ قوی ''قوۃ'' کی جمع ہے جس کے معنی ہیں فطری اور پیدائشی امکان اور قدرت، کہتے ہیں: فلاں کے اندر بالقوۃ ایسا کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔ یہ قدرت و صلاحیت اچھی بھی ہوتی ہے اور بری بھی، لیکن جب تک یہ قدرت و توانائی فعل کی شکل نہ اختیار کر لے اس کا کوئی اعتبار نہیں قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے ایمان و کفر کو انسانوں کا اختیار فعل قرار دیا ہے اور جزا و سزا کو ایمان و عمل صالح، اور کفر و معصیت کا نتیجہ قرار دیا ہے، محض فطری استعداد اور امکان و قدرت کی بنیاد پر کسی کو مومن و کافر نہیں کہا جا سکتا امداد اللہ کی یہ تاویل باطنی تاویل اور وحدۃ الوجودی تاویل ہے، جس کی رو سے مشرکین مکہ مومن بھی تھے اور صحابہ کافر بھی۔

عجیب بات ہے کہ مولانا تھانوی نے اپنی تفسیر میں اپنے پیر کے مطابق آیت کا ترجمہ نہیں کیا ہے، بلکہ قواعد زبان کے مطابق کیا ہے۔ ''امداد المشتاق'' میں ان کو اپنے پیر کے اس ''الحادی'' قول کی پر زور تردید کرنی چاہیے تھی اور اگر ان کے اندر اتنی دینی جرأت نہیں تھی تو کم از کم اس کو اس میں نقل نہ کرتے۔

Marfat.com

تقلید پر قرآن سے غلط استدلال:

شاہ ولی اللہ حنفی رحمہ اللہ نے حجۃ اللہ البالغہ میں غیر معصوم کی تقلید کو دین میں تحریف کے اسباب میں سے ایک سبب قرار دیا ہے، تحریر فرماتے ہیں:

''دین میں تحریف کے اسباب میں سے ایک یہ ہے کہ غیر معصوم کی تقلید کی جائے، غیر معصوم سے میری مراد: نبی کے سوا ہر شخص ہے، جس کی عصمت ثابت ہے، اس تقلید کی حقیقت یہ ہے کہ امت کے علماء میں سے کسی نے کسی مسئلہ میں اجتہاد کیا اور اس کے پیروؤں نے یہ سمجھ لیا کہ اس کا اجتہاد قطعی طور پر صحیح ہے یا اس کی صحت کا غالب گمان ہے، اسی طرح اس اجتہاد کے مقابلے میں کسی صحیح حدیث کو رد کر دیں، تو یہ وہ تقلید نہیں ہے جس کے جواز پر ''امت مرحومہ'' کا اتفاق ہے، بلکہ امت نے مجتہدین کی جس تقلید کے جواز پر اتفاق کیا ہے وہ ایسی تقلید ہے جو اس علم کے ساتھ کی جائے کہ مجتہد غلطی بھی کرتا ہے اور کر سکتا ہے اور اس کا اجتہاد درست بھی ہو سکتا ہے اور اس اعتقاد کے ساتھ مقلد کی نگاہیں، مجتہد فیہ مسئلہ میں نبی ﷺ کے ارشاد کے انتظار میں اس عزم کے ساتھ اٹھی رہیں کہ اگر کوئی صحیح حدیث اس کی تقلید کے خلاف ظاہر ہو گئی تو وہ تقلید کو ترک کر کے حدیث کی پیروی کرے گا، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے ارشاد:

﴿اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَ رُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ (التوبۃ: ۳۱)

''انہوں نے اپنے علماء اور درویشوں کو اللہ کے سوا رب بنا لیا ہے۔''

کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا ہے:

((انهم لم يكونوا يعبدونهم، و لكنهم كانوا إذا احلوا لهم شيئا استحلوه و إذا حرموا عليهم شيئا حرموه)) ❶

''درحقیقت یہ لوگ ان کی عبادت نہیں کرتے تھے، بلکہ جب وہ کسی چیز کو حلال قرار دے دیتے تھے تو یہ اس کو حلال مان لیتے تھے اور جب وہ کسی چیز کو حرام قرار دے دیتے تھے تو اسے وہ اپنے اوپر حرام کر لیتے تھے۔''

شاہ ولی اللہ کا یہ قول تقلید کے جواز سے متعلق ہے، جبکہ امداد اللہ کی جو تقلید اس وقت زیر بحث ہے وہ ان کے اور تمام متاخرین احناف کے نزدیک فرض ہے اور عملاً کتاب و سنت پر مقدم ہے۔ حاجی صاحب فرماتے ہیں:

''غیر مقلدین انکار تقلید کرتے ہیں، ''يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ'' میں صاف اشارہ، بلکہ تصریح تقلید موجود ہے۔''

---

❶ ترمذی: ۳۰۹۵۔ طبرانی: ۲۱۸، ۲۱۹، و ابن حزم فی الاحکام: ۶/ ۱۳۲-۱۳۳، ۱/ ۳۵۲

Marfat.com

اس پر ان کے مرید مولانا تھانوی کا تبصرہ بھی ملاحظہ فرمالیجیے:

اقول: کیونکہ اکثر عوام مومنین دلیل نہ جانتے تھے اور نہ سب اہل مشاہدہ تھے، پھر ایمان تقلیدی نہ ہوا تو کیا ہوا، جب اصول میں تقلید مشروع ہے، فروع میں کیسے انکار کیا جاوے گا۔'' ❶

کیا ان فریب کاروں کو علماء میں شمار کرنا درست ہے، قطب الارشاد اور حکیم الامت کہنا تو دور کی بات ہے، حاجی امداد اللہ کی زبان سے ایسی غلط بات تعجب خیز نہیں، اس لیے کہ وہ ''عالم'' نہیں تھے، لیکن مولانا تھانوی پر انہوں نے کون سا جادو کر دیا تھا کہ وہ ایک غلط اور خلافِ حق دعویٰ میں ان کی ہمنوائی کر رہے تھے اور اس طرح اپنی علمی اور دینی شہرت پر داغ لگا رہے تھے۔

سورۂ بقرہ کی مذکورہ آیت کریمہ میں ''غیب'' سے مراد وہ غیبیات ہیں جن کی خبر اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے ہمیں دی ہے اور جن پر ایمان آیت نمبر ۲ میں مذکور ''متقین'' کی صفت ہے اور فرض ہے۔ کیا اللہ و رسول بھی اپنی کسی ''خبر'' کی صحت و صداقت کی دلیل پیش کرنے کے ''مکلف'' ہیں؛ اللہ و رسول تو بجائے خود دلیل ہیں۔ اللہ و رسول کی دی ہوئی خبروں پر بے چون و چرا ایمان تو مسلمان بننے کی شرطوں میں سے ایک ہے اور اللہ و رسول کی غیر مشروط اطاعت تو فرض ہے، بلکہ یہی حقیقی ایمان و اسلام ہے۔ کیا اللہ کو اپنا معبود برحق اور محمد بن عبداللہ ﷺ کو اپنا نبی اور رسول ماننے والے کسی انسان کے دل میں اللہ و رسول اور ائمہ مجتہدین اور فقہاء کے درمیان موازنہ کرنے کا خیال تک پیدا ہو سکتا ہے؟ اوپر شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کا جو قول نقل کیا گیا ہے اس میں ''غیر معصوم'' کی تعبیر اسی وجہ سے تو استعمال کی گئی ہے کہ ''معصوم'' اور رسول کی تقلید محل بحث ہے ہی نہیں، اس کو تو اللہ تعالیٰ نے مطلق مطاع، مطلق متبوع اور مطلق مقتدی بنایا ہے، کیا ان میں سے کوئی بھی حیثیت کسی غیر معصوم یا غیر نبی کو بھی حاصل ہے؟ اگر اس سوال کا جواب کوئی ''اثبات'' میں دیتا ہے تو وہ مسلمان نہیں ہے اور اسلام سے اس کا ادنیٰ سا بھی تعلق نہیں ہے۔

مولانا تھانوی نے غیب کی دلیل جاننے کی نفی صرف ''اکثر عوام مومنین'' سے کی ہے، جس کا مطلب ہے کہ ان کے نزدیک کچھ عوام اور سارے خواص غیب کے دلائل جانتے ہیں اور غیب کی جن باتوں پر ایمان رکھتے ہیں وہ ان کے مشاہدے میں آ چکی ہیں تو یہ قرآن کی تکذیب ہے، کیونکہ قرآن کے مطابق ''غیب'' اس کو کہتے ہیں جس کو کسی بھی ذریعۂ علم سے معلوم نہ کیا جا سکے؛ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں غیب کی جو خبریں دی ہیں وہ ''علام الغیوب'' کے بتانے سے دی ہیں:

﴿قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ وَ مَا يَشْعُرُوْنَ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ۝﴾ (النمل: ٦٥)

❶ ص: ۸۲، حکایت: ۱۵۴

Marfat.com

"کہہ دو، اللہ کے سوا، آسمانوں اور زمین میں کوئی غیب نہیں جانتا اور لوگوں کو تو یہ شعور ہی نہیں ہے کہ وہ کب اٹھائے جائیں گے۔"

رہے مشائخ صوفیا کی غیب دانی کے وہ واقعات جو حکایات الاولیاء، کرامات الاولیاء اور فضائل اعمال کی کتابوں میں مذکور ہیں، یا ابوالحسن شاذلی جیسے صوفیا نے اپنی غیب دانی کے جو دعوے کیے ہیں وہ سب جھوٹ ہیں اور ان کی تصدیق منافی ایمان ہے اس لیے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی صفت ہے جس میں اس کا کوئی شریک نہیں ہے اور یہ نہ اختلافی مسئلہ ہے اور نا قابل تاویل کہ اس میں دو رائیں ہوں اور دونوں صحیح ہوں۔

تصور شیخ، شیخ کا مقام و مرتبہ:

تصور شیخ کے بارے میں اسلامی نقطۂ نظر بیان کرنے سے قبل اس کے بارے میں صوفیا کا عقیدہ بیان کر دینا ضروری ہے۔

پاسبان حدیث نبوی کے نزدیک "شیخ" عدالتِ راوی کا سب سے کم تر اور پست درجہ ہے، جبکہ صوفیا کے نزدیک "شیخ" نبی کا ہم پلہ اور ہم رتبہ ہے، اسلامی نقطۂ نظر سے کسی غیر نبی کا کسی نبی سے موازنہ حرام ہے اس کے برابر اور مساوی قرار دینا تو بہت بڑی بات ہے، جبکہ اکابر صوفیا کی مجلسوں میں حدیث کے طور پر جو عبارتیں گردش کرتی ہیں ان میں سے ایک درج ذیل الفاظ میں ملتی ہے:

۱۔ الشیخ فی بیته کالنبی فی قومه.

"شیخ اپنے گھر میں وہی درجہ رکھتا ہے جو درجہ نبی اپنی قوم میں رکھتا ہے۔"

یہ حدیث نہیں جھوٹ ہے، امام عبدالرحمٰن ابن جوزی نے اپنی کتاب الموضوعات ❶ میں اسے انہی الفاظ میں نقل کیا ہے، لیکن امام ابن تیمیہ نے "حدیث القصاص" ❷ میں اس کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے: الشیخ فی قومه کالنبی فی امته" شیخ اپنی قوم میں ویسا ہی ہے، جیسا نبی اپنی امت میں۔"

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے فرمایا ہے: یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام نہیں، بلکہ کسی کا قول ہے۔ ❸

حاجی امداد اللہ اس جھوٹی روایت کو اپنے مریدوں کے حلقوں میں بیان کر کے ان کو اپنا معتقد بناتے تھے اور مولانا تھانوی نے اپنی کتاب "امداد المشتاق" میں اسے نقل کیا ہے۔ ❹

یہ جھوٹی اور بے اصل روایت تصور شیخ کی بنیاد ہے۔ امام ابو حاتم محمد بن حبان نے اس کی جو سند بیان کی ہے وہ یہ

---

❶ نمبر ۳۸۴ ❷ نمبر ۲۴ ❸ ص ۶۸
❹ ص: ۵۵، حکایت: ۵۴

Marfat.com

ہے: روى عبدالله بن عمر بن غانم قاضي افريقيا ، عن مالك ، عن نافع ، عن ابن عمر ، ان النبي ﷺ قال......

ابن حبان نے اس عبداللہ بن عمر بن غانم کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ امام مالک کی نسبت سے ایسی حدیثیں روایت کرتا تھا جو انہوں نے کبھی بیان ہی نہیں کی ہیں، اس کی روایت کردہ حدیثوں کا ذکر اور کتابوں میں اس سے حدیث کی روایت صرف ''اعتبار'' کی غرض سے جائز ہے۔ ❶

امام عبدالرحمٰن بن ابی حاتم الجرح والتعدیل میں اس عبداللہ کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں: میں نے اپنے والد -امام ابو حاتم محمد بن ادریس- سے اس کے بارے میں پوچھا، تو انہوں نے فرمایا: مجہول اور غیر معروف ہے۔ ❷

امام ذہبی نے میزان الاعتدال میں لکھا ہے کہ اس باطل روایت کی مصیبت شاید عبداللہ بن غانم کا شاگرد عثمان بن حشیش قیروانی ہو۔ ❸

حافظ سخاوی المقاصد الحسنۃ میں تحریر فرماتے ہیں: شاید اس موضوع روایت کی مصیبت افریقی کے علاوہ کوئی اور ہو، اور اس کے موضوع ہونے پر ہمارے شیخ -ابن حجر- اور ان سے پہلے ابن تیمیہ یقینی حکم لگا چکے ہیں۔ بعض لوگوں نے یہ روایت ان الفاظ میں بھی نقل کی ہے: ((الشيخ في جماعته كالنبي في قومه يتعلمون من علمه و يتأدبون من أدبه)) شیخ اپنی جماعت میں وہی درجہ رکھتا ہے جو درجہ نبی اپنی قوم میں رکھتا ہے، لوگ اس کے علم سے تحصیل علم کرتے ہیں اور اس کے ادب سے ادب سیکھتے ہیں۔'' ان تمام الفاظ میں یہ روایت باطل ہے۔ ❹

۲۔ ((بجلوا المشايخ فإن تبجيل المشايخ من تبجيل الله .))

''مشائخ کی تعظیم کرو، کیونکہ مشائخ کی تعظیم اللہ کی تعظیم ہے۔''

یہ بھی حدیث نہیں جھوٹ ہے اس کی روایت صخر بن محمد حاجبی نے لیث بن سعد سے کی ہے، امام ابن حبان کا قول ہے کہ صخر لیث کے حوالہ سے جھوٹی حدیثیں روایت کیا کرتا تھا۔ اس سے حدیث کی روایت جائز نہیں ہے۔ ❺

امام عبداللہ بن عدی نے الکامل میں لکھا ہے کہ صخر بن محمد حاجبی وضع حدیث کا مجرم تھا۔ انہوں نے اس کی روایت کردہ جن موضوع حدیثوں کی مثالیں دی ہیں ان میں سے ایک یہ جھوٹی روایت ہے۔ ❻

---

❶ المجروحین: ص ۵۳۳، ج ۱، ترجمہ: ۵۶۶

❷ الجرح والتعدیل، ص ۱۳۳، ج ۵، ترجمہ: ۷۸۲

❸ میزان الاعتدال، ص ۱۵۱، ج ۴۔

❹ المقاصد الحسنۃ، ص: ۳۰۵-۳۰۶ نمبر ۶۰۹

❺ المجروحین: ص ۴۸۳، ج ۱، ترجمہ ۵۰۴

❻ الکامل، ص ۱۴۵، ج ۵۔ ترجمہ: ۹۴۰،۳۳

Marfat.com

روایت بالمعنی:

حاجی امداد اللہ اور ان کے مرید مولانا تھانوی ''روایت بالمعنی'' کی تعبیر بہت استعمال کرتے ہیں اور اپنی کتابوں اور اپنے مریدوں کی مجلسوں میں جھوٹی اور بے بنیاد روایتیں نقل کرنے کے بعد عام طور پر یہ دعویٰ کر دیتے تھے کہ یہ روایت بالمعنی ہے، اس سے ان کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ حدیث صحیح تو ہے، البتہ الفاظ حدیث کے نہیں ہیں، یہ دراصل ایک فریب ہے جو یہ اور دوسرے صوفیا اپنے مریدوں کو دیتے رہے ہیں۔ حاجی امداد اللہ تو حدیث کی ابجد سے بھی واقف نہیں تھے، رہے مولانا تھانوی تو وہ اگرچہ عالم تھے، لیکن حدیث کے علم سے وہ بھی بے بہرہ تھے۔

محدثین کے نزدیک روایت بالمعنی کا مطلب یہ ہے کہ کوئی حدیث سند کے اعتبار سے تو صحیح ہو، مگر اس کے راوی نے اس کے بعض الفاظ بدل دیے ہوں اور یہ الفاظ اصل الفاظ یا اس کے شیخ کے بیان کردہ الفاظ کے ہم معنی اور مترادف ہوں۔ معلوم ہوا کہ کسی جھوٹی، بے اصل اور من گھڑت روایت کو ''روایت بالمعنی'' کہہ کر بیان کرنا لوگوں کو فریب دینا اور گمراہ کرنا ہے۔

۳۔ ((من اراد أن يجلس مع الله، فليجلس مع أهل التصوف))

''جو اللہ کے ساتھ بیٹھنا چاہے، وہ اہل تصوف کی ہم نشینی اختیار کرے۔''

حاجی امداد اللہ نے بے اصل روایت: الشیخ فی قومہ کالنبی فی امتہ نقل کرنے کے بعد مذکورہ عبارت بھی بطور حدیث نقل کی ہے اور فرمایا ہے کہ ''صوفیہ نے اسے حدیث کہا ہے، دراصل یہ سب احادیث ہیں اور دوسری حدیث میں بجائے ''اہل التصوف'' اہل الذکر صراحۃً موجود ہے اور اہل الذکر اہل التصوف ہیں، پس حدیث نقل بالمعنی ہوگی۔

مولانا تھانوی نے اپنے پیر کے اس باطل دعویٰ پر جو تبصرہ کیا ہے وہ انہی کے الفاظ میں یہ ہے:

''دوسری حدیث میری نظر سے نہیں گزری، نہ اہل التصوف کے لفظ سے، نہ اہل الذکر کے لفظ سے، مولانا رومی اس کو مثنوی میں لائے ہیں، مگر معناً یہ بھی ثابت ہے، اس طرح سے کہ حدیث ہے: ''أنا جليس من ذكرني'' میں اس کا ہم نشین ہوں جو مجھے یاد کرے۔ ❶

باطل کی ہمنوائی باطل ہے:

مولانا تھانوی نے اپنے پیر کی ذکر کردہ باطل روایتوں کے بارے میں اپنی ''لاعلمی'' کا اظہار کر کے جو مستحسن نقطۂ نظر اپنایا تھا اس پر، یہ فرما کر پانی پھیر دیا کہ ''مگر یہ معناً ثابت ہے۔'' پھر اس کی دلیل میں ایک ناقابل اعتبار روایت کی مثال دے کر اپنا اعتبار بھی کھو دیا۔ انہوں نے جو یہ فرمایا ہے کہ ((أنا جليس من ذكرني)) حدیث ہے۔ تو عرض کہ یہ عبارت حدیث نہیں ہے، اس لیے اس کا ذکر امام شیرویہ بن شہرداد دیلمی نے اپنی کتاب ''مسند الفردوس'' میں کیا ہے اور

❶ ص: ۵٦

Marfat.com

اس کی کوئی سند نہیں بیان کی ہے، جیسا کہ حافظ سخاوی نے ''المقاصد الحسنہ'' میں لکھا ہے۔

سخاوی نے ایک دوسری روایت امام بیہقی کی ''شعب الایمان'' کے حوالہ سے نقل کی ہے جس کے الفاظ ہیں:

((قال موسى علیہ السلام: يا رب أقريب أنت فأناجيك، أو بعيد فأناديك، فقال له: أنا جليس من ذكرني......))

''اے میرے رب! کیا تو قریب ہے کہ تجھ سے سرگوشی کروں، یا تو بعید ہے کہ تجھ کو پکاروں؟ تو اللہ نے ان سے فرمایا: اے موسیٰ! میں اس کا ہم نشین ہوں جو مجھے یاد کرتا ہے۔''

حافظ سخاوی نے اس روایت اور اس کی سند پر کوئی حکم نہیں لگایا ہے، یہ روایت حسین بن حفص نے سفیان ثوری سے کی ہے۔ امام ابن ابی حاتم نے اپنی کتاب "الجرح و التعديل" میں اس کی ثقاہت اور عدم ثقاہت کے بارے میں کچھ نہیں لکھا ہے۔ ❶

حافظ ابن حجر نے "تقريب التهذيب" ❷ میں حسین بن حفص کو ''صدوق کہا ہے جو کسی کے ثقہ ہونے کی دلیل نہیں ہے۔

یاد رہے کہ حدیث: رسول اللہ ﷺ کے اس قول، فعل اور تقریر کا نام ہے جس کی نسبت آپ سے ثابت ہو، لہٰذا جو قول یا فعل یا تقریر آپ کی نسبت سے صحیح اور ثابت نہ ہو اس کو حدیث کہنا، یا یہ کہنا کہ ''یہ معناً ثابت ہے'' یا روایت بالمعنیٰ کہنا'' بہت بڑی جسارت ہے اور اللہ کے رسول ﷺ پر افترا ہے، جس کا انجام معلوم ہے اور اگر اس کا مقصد کسی باطل نظریہ یا عقیدہ کو درست ثابت کرنا ہو تو اس کی سنگینی دو چند ہو جاتی ہے اور اس سے اس بات کا یقین ہو جاتا ہے کہ ایسا طرز عمل اختیار کرنے والے کو اپنا عقیدہ اور نظریہ عزیز ہے جس کو صحیح ثابت کرنے کے لیے وہ ہر قدم اٹھا سکتا ہے، اللہ و رسول کی اطاعت اس کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔

حدیث کشفی:

''صوفی شیخ'' کے خود ساختہ مقام و مرتبے کو بیان کرنے والی جھوٹی روایتوں کو روایت بالمعنی کہہ کر حدیث قرار دینے کے بعد جب ''قطب العالم'' حاجی امداد اللہ کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ لوگوں کو تو یہ معلوم ہے کہ حدیث کسے کہتے ہیں اور کسی حدیث کو معلوم کرنے کا طریقہ کیا ہے؟ ایسی صورت میں اگر کوئی یہ پوچھ بیٹھے کہ حضرت! اس ''روایت بالمعنیٰ'' کی رو سے تو ہر بے راہ رو، ہر بدعقیدہ اور ہر مبتدع کسی بھی قول اور عبارت کو روایت بالمعنی کہہ کر حدیث قرار دے سکتا ہے، پھر اس کو کیا جواب دیا جائے گا، اس اشکال کو دور کرنے کے لیے ''شیخ العرب والعجم'' نے ایک دوسرا جھوٹ گھڑ کر پیش کر دیا، فرماتے ہیں:

''حدیث کی دو نوع ہیں: (۱) حدیث بالمعنیٰ المتعارف اور (۲) حدیث کشفی۔ چنانچہ فرمایا حضرت رسالت

---

❶ الجرح والتعدیل، ص ۵۷، ج ۳، ترجمہ: ۲۵۱۷ ❷ ترجمہ ۱۳۱۹

Marfat.com

مآب ﷺ نے: "من رآنی فقد رأی الحق" اس کے دو معنی ہیں؛ اول یہ کہ: "من رآنی فقد رآنی یقینا فإن الشیطان لا یتمثل بی" جس نے مجھے دیکھا اس نے یقیناً مجھے ہی دیکھا اس لیے کہ شیطان میری مثال اور شباہت نہیں اختیار کر سکتا۔ دوم یہ کہ من رآنی فقد رأی الله تعالٰی جس نے مجھے دیکھا اس نے اللہ تعالیٰ کو دیکھا۔"

اس کے بعد فرماتے ہیں:

"جب زیارت آنحضرت ﷺ کی میسر ہوئی، یا دیدار پروردگار ہوگا، جو کچھ مسموع ہوگا: یا قلب پر وارد ہو گا، آنحضرت ﷺ کی طرف سے ہوگا، یا خدائے پاک کی طرف سے۔" ❶

حاجی امداد اللہ نے حدیث "من رآنی فقد رأی الحق" کے جو دوسرے معنی بتائے ہیں وہ کفر و الحاد ہے اور بیمار اور وحدۃ الوجودی دماغ کی پیداوار ہے اور اس کی جو تشریح کی ہے وہ صوفیا کی خود ساختہ حدیث کشفی کی تعریف ہے۔

حدیث کے دوسرے ترجمہ کے کفر و الحاد ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اس میں اللہ و رسول کو ایک قرار دینے کی کوشش کی گئی ہے جو اسلوب کلام اور سیاق حدیث اور اسلامی عقیدے کے خلاف ہونے کی وجہ سے باطل اور مردود ہے۔

دراصل یہ حدیث پاک جس سیاق میں آئی ہے وہ یہ ہے کہ جس نے نبی کریم ﷺ کو آپ کے حقیقی حلیے، ہیئت اور شکل میں خواب میں دیکھا تو یہ سچا خواب اور رویائے حق ہے، خواب پریشاں یا شیطانی خواب نہیں ہے اور اس نے آپ ہی کو دیکھا ہے۔

حدیث میں "من رآنی" کے بعد "فی المنام" محذوف ہے جس پر حدیث کا سیاق دلالت کرتا ہے اور اس سلسلے کی دوسری حدیثوں میں "فی المنام" کا فقرہ آیا ہے۔ ❷

حدیث میں "الحق" رؤیا کی صفت کے طور پر آیا ہے؛ مطلب یہ ہے کہ: "من رآنی فی المنام فقد رأی رؤیا حق لیست من تخیل الشیطان و لا من أضغاث احلام" جس نے خواب میں مجھے دیکھا، درحقیقت اس نے سچا خواب دیکھا وہ شیطانی خیال آرائی اور خواب ہائے پریشاں میں سے نہیں ہے۔

"فقد رأی الحق" میں "حق" سے اللہ تعالیٰ کو مراد لینا اس لفظ کے قرآنی استعمال کے بھی خلاف ہے اور عقیدۂ توحید کے بھی منافی ہے۔

"الحق" اللہ تعالیٰ کا صفاتی نام بھی ہے اور اس کی نازل کردہ کتابوں، اس کے نازل کردہ دین، اس کی عبادت اور اس سے منسوب تمام چیزوں کی صفت بھی اور لفظ کے معنی ہیں: پائیدار، ثابت، ہر نقص و عیب سے پاک، ہر طرح کے شکوک و شبہات سے پاک، ناقابل تغیر اور ٹھوس۔ اس کی ضد باطل ہے۔

❶ ص: ۵۵۔ ❷ بخاری: ۶۹۹۳، ۶۹۹۴۔ مسلم: ۲۲۶۶، -۱۰، -۱۱، ۲۲۶۸-۱۲، ۱۳۔

Marfat.com

اللہ تعالیٰ اپنی ذات وصفات میں حق ہے، اپنی الوہیت و ربوبیت میں حق ہے، اس کا قول حق، اس کا فعل حق، اہل ایمان کی اس سے ملاقات اور اس کی رویت حق، اس کی کتابیں حق، اس کے رسول حق اور اس سے منسوب ہر چیز حق ہے۔

قرآن پاک میں یا صحیح احادیث میں ''الحق'' لفظ ''جلالۃ'' اللہ کے بدیل کے طور پر یا اس کی جگہ استعمال نہیں ہوا ہے، بلکہ صرف اللہ تعالیٰ کے معبود ہونے کی تاکیدی خبر کے طور پر یا اللہ اور رب کی صفت کے طور پر استعمال ہوا ہے؛ پہلے کی مثال ہے:

﴿ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَ اَنَّ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ هُوَ الْبَاطِلُ﴾ (الحج: ٦٢)

''یہ اس لیے کہ درحقیقت اللہ ہی حق ہے اور لوگ اس کو چھوڑ کر جسے پکارتے ہیں حقیقت میں وہی باطل ہے۔''

دوسرے کی مثالیں:

۱۔ ﴿فَذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ﴾ (یونس: ۳۲) ''تو وہ اللہ ہی تمہارا سچا رب ہے۔''

۲۔ ﴿هُنَالِكَ الْوَلَايَةُ لِلّٰهِ الْحَقِّ﴾ (الکہف: ٤٤) ''وہاں سارا اختیار اللہ حق کے لیے ہوگا۔''

پہلی آیت میں ''الحق'' اللہ کی خبر ہے اور اس پر الف لام ''حصر'' کے لیے ہے۔

دوسری آیت میں الحق ''رب'' کی صفت ہے اور تیسری آیت میں الحق اللہ کی صفت ہے۔

"قطب العالم" نے حدیث کا دوسرا اور گمراہ کن ترجمہ کر کے یہ ثابت کرنے کی سعی مذموم کی ہے کہ نبی ﷺ کو دیکھنا اللہ کو دیکھنا ہے، دوسرے لفظوں میں نبی ﷺ ہی اللہ ہیں اور اللہ ہی نبی ہے۔ لیکن ''حق'' کے ذات الٰہی کی جگہ اور بدیل کے طور پر استعمال نہ ہونے اور عقیدۂ توحید کے منافی ہونے کی وجہ سے یہ حدیث کا ترجمہ نہیں اس کی معنوی تحریف ہے۔

اپنے اس غلط اور خلاف حق ترجمہ کی بنیاد پر انہوں نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ خواب کی صورت میں نبی ﷺ کی جو زیارت ہوتی ہے اور اس موقع پر جو کچھ آپ ارشاد فرماتے ہیں یا دل میں جو خیالات وارد ہوتے ہیں وہ یا تو رسول اللہ ﷺ دل میں ڈالتے ہیں، یا اللہ تعالیٰ، اور یہی مسموعات یا وارداتِ قلبی حدیث کشفی ہیں۔

تو عرض ہے کہ پہلی بات تو یہ کہ خواب میں نبی ﷺ کی رویت کے لیے ''آپ کی زیارت'' کی تعبیر بالکل غلط ہے عربی میں کسی کی زیارت کے معنی کسی زندہ انسان کے پاس جا کر اس سے ملاقات کرنے اور اس سے ملنے کے ہیں اس تناظر میں خواب میں کسی شخص کو دیکھنا اس کی زیارت نہیں ہے، اسی طرح کسی شخص کی قبر کی زیارت اس کی نہیں، بلکہ اس کی قبر کی زیارت ہے۔

دوسری بات یہ کہ خواب میں نبی ﷺ کی زبان مبارک سے ادا ہونے والے ارشادات اللہ تعالیٰ آپ کی آواز میں اسی طرح خواب دیکھنے والے کو سنوا دیتا ہے جس طرح آپ کو ''ممثل'' کر کے اسے دکھا دیتا ہے، ورنہ حقیقت میں

Marfat.com

آپ کا ''جسم اطہر'' قبر مبارک میں ہے اور قیامت تک قبر ہی میں رہے گا، لہٰذا نہ آپ اپنی قبر مبارک سے کبھی نکلے ہیں اور نہ ایسا کرنا بحکم الٰہی آپ کے لیے ممکن ہی ہے، کیونکہ قبر مبارک سے نبی ﷺ کا باہر آنا یہ معنی رکھتا ہے کہ آپ ''عالم برزخ'' سے ''عالم دنیا'' میں واپس آتے رہتے ہیں، جبکہ آپ کی وفات نے اس دنیا سے آپ کا رشتہ ہمیشہ کے لیے منقطع کر دیا ہے اور اس دنیا سے انتقال کر جانے والے سے متعلق یہ اللہ کا فیصلہ ہے کہ وہ اس میں دوبارہ واپس نہیں آئے گا، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کے ارشاد کے مطابق اللہ نے جابر رضی اللہ عنہ کے شہید ہو جانے والے والد عبداللہ رضی اللہ عنہ کی دنیا میں واپسی کی درخواست کے جواب میں فرما دیا تھا کہ:

((إنه قد سبق مني أنهم لا يرجعون)) ''درحقیقت میرا یہ فیصلہ ازل ہی میں جاری ہو چکا ہے کہ مر جانے والے دنیا میں واپس نہیں جائیں گے۔'' [1]

درحقیقت خواب میں رسول اللہ ﷺ کو دیکھنے والا آپ کے شبیہ اور مثیل کو دیکھتا ہے، یعنی آپ کا جسم اطہر تو آپ کی قبر مبارک ہی میں رہتا ہے اور اللہ تعالیٰ آپ کی روح مطہر کو اُسی طرح کا جسم عطا کر دیتا ہے اور اس کو گویائی بھی دے دیتا ہے جو آپ کے حقیقی جسم اور گویائی کے بالکل مطابق ہوتی ہے اور خواب دیکھنے والا آپ کی جو آواز سنتا ہے وہ آپ کی حقیقی آواز کے مانند ہی ہوتی ہے، البتہ یہ قبر مبارک میں مدفون جسم اطہر کی زبان سے نہیں، بلکہ اس جسم کی زبان سے نکلتی ہے جو اللہ تعالیٰ آپ کی روح کو عطا کر دیتا ہے۔

میں نے ابھی جو کچھ عرض کیا ہے اس کو سمجھنے کے لیے ''اسراء اور معراج'' کے واقعہ کو ذہنوں میں تازہ کر لیجیے، چنانچہ متعدد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مروی احادیث کے مطابق ''اسراء'' کے موقع پر نبی ﷺ نے مسجد اقصیٰ میں تمام انبیاء اور رسولوں کی نماز میں امامت فرمائی تھی، پھر معراج کے موقع پر، مختلف آسمانوں پر ان میں سے بعض سے آپ کی ملاقات اور گفتگو بھی ہوئی تھی، تو ان موقعوں پر یہ انبیاء اور رسول اپنے ان حقیقی جسموں میں ظاہر نہیں ہوئے تھے جن کے ساتھ وہ اپنی دنیوی زندگیوں میں تھے، کیونکہ یہ جسم تو ان کی قبروں میں مدفون ہیں اور قبل از قیامت ان جسموں کے ساتھ اپنی قبروں سے نکل کر کسی زندہ انسان سے ان کا ملنا محال ہے اور جب قیامت قائم ہو گی اس وقت بحکم الٰہی یہ انبیاء اور رسول علیہم السلام اپنی قبروں سے باہر نکلیں گے اور ہمارے نبی اور رسول محمد بن عبداللہ ﷺ قبر سے باہر نکلنے والوں میں پہلے ہوں گے۔ [2]

لہٰذا معلوم ہوا کہ اسراء اور معراج میں جن انبیاء اور رسولوں نے نبی کریم ﷺ کی اقتدا میں نماز پڑھی اور آسمانوں پر جن کو آپ نے دیکھا تھا اور جن سے آپ نے باتیں کی تھیں وہ اپنے حقیقی جسموں میں نہیں تھے، بلکہ ایسے جسموں میں تھے جو اللہ تعالیٰ نے ان کی روحوں کو عطا کر دیا تھا اور ان کے یہ عارضی جسم ان کے ان جسموں کے عین مطابق تھے جو

---

[1] ترمذی: ۳۰۱۰۔ ابن ماجہ: ۱۸۷، ۲۸۵ [2] مسلم: ۲۲۷۸

Marfat.com

قبروں میں مدفون ہیں۔

اس بات کو کہ نبی کریم ﷺ کو خواب میں دیکھنے والا آپ کو اس جسم میں نہیں دیکھتا ہے جو آپ کا حقیقی جسم ہے اور جس جسم کے ساتھ آپ اپنی وفات سے پہلے تھے، بلکہ خواب دیکھنے والا آپ کو آپ کے حقیقی جسم کے عین مطابق تمثیلی جسم میں دیکھتا ہے جو اللہ تعالیٰ آپ کی روح کو عطا کر دیتا ہے اور اس جسم کی صورت گری میں شیطان کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو اس بات سے عاجز اور درماندہ بنا دیا ہے کہ وہ آپ کی شکل اختیار کرے، یا آپ کا مماثل اور مشابہ بن کر ظاہر ہو، اس بات کو قابل فہم بنانے اور اس کو ذہنوں سے قریب تر کرنے کے لیے میں ایک مثال دیتا ہوں:

ہم میں سے ہر شخص خواب دیکھتا ہے اور خواب میں وہ مرجانے والوں کو بھی دیکھتا ہے اور ان کو بھی جو اس کی طرح زندہ ہیں، تو کیا جو زندہ انسان کسی کو اس کے خواب میں نظر آتے ہیں اور اس سے باتیں کرتے ہیں اور خواب دیکھنے والا بھی ان سے باتیں کرتا ہے اپنے حقیقی جسموں میں ہوتے ہیں؟ ہرگز نہیں، اس لیے کہ ہر شخص کو یہ بات معلوم ہوگی کہ خواب میں نظر آنے والے خواب دیکھنے والے کو اس جگہ نہیں نظر آتے جہاں وہ موجود ہوتے ہیں اور نہ اس حالت اور ہیئت ہی میں نظر آتے ہیں جو اس وقت فعلاً اور واقعتاً ان کی حالت اور ہیئت ہوتی ہے، مثلاً: ابراہیم علیہ السلام نے خواب میں یہ دیکھا تھا کہ وہ اپنے بیٹے اسماعیل علیہ السلام کو ذبح کر رہے ہیں قرآن کے مطابق انہوں نے بیٹے سے اپنے اس خواب کا مضمون بیان کرنے کے بجائے اس کی منظر کشی کرتے ہوئے فرمایا تھا:

﴿يَا بُنَيَّ إِنِّي أَرَىٰ فِي الْمَنَامِ أَنِّي أَذْبَحُكَ﴾ (الصافات: ۱۰۲)

''کہا، اے میرے پیارے بیٹے! درحقیقت میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ میں حقیقت میں تجھے ذبح کر رہا ہوں۔''

یہ تھا خواب کا منظر جس کو جوں کا توں ابراہیم علیہ السلام نے اسماعیل علیہ السلام کے سامنے رکھ دیا تھا۔ ظاہری بات ہے کہ اس وقت ابراہیم علیہ السلام سو رہے تھے، کیونکہ خواب سونے والا ہی دیکھتا ہے، جبکہ خواب یہ منظر پیش کر رہا ہے کہ وہ اس وقت سو نہیں رہے تھے، بلکہ ہاتھ میں چھری لیے ہوئے ''ذبح'' کا فعل انجام دے رہے تھے اور ان کی یہ دوسری حالت اور ہیئت پہلی حالت اور ہیئت سے بالکل مختلف تھی اور جب یہ طے ہے کہ ان کی پہلی حالت حقیقی تھی تو پھر یہ لازمی قرار پایا کہ ان کی یہ دوسری حالت تمثیلی تھی جو ابھی تک وجود میں بھی نہیں آئی تھی، بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان کی روح کو وہ شکل اور کیفیت عطا کر دی تھی جو خواب کو فعل کی صورت دیتے وقت ظاہر ہونے والی تھی۔

رہے اسماعیل علیہ السلام تو امر واقعہ کے اعتبار سے وہ بھی بستر پر سو رہے ہوں گے، جبکہ خواب ان کا جو منظر پیش کر رہا ہے وہ یہ ہے کہ وہ پیشانی کے بل گرے ہوئے ہیں اور باپ پیچھے سے ان کی گردن پر چھری چلانے والے ہیں؛ ان کی بھی یہ صفت اور کیفیت حقیقی اور واقعی نہیں تھی، بلکہ ابھی وجود میں بھی نہیں آئی تھی اور علام الغیوب نے ان کو اس صفت

Marfat.com

سے موصوف اور ممثل کر کے ابراہیم علیہ السلام کو خواب میں دکھا دیا تھا۔

میں نے اتنی تفصیل سے نبی کریم ﷺ کو خواب میں دیکھنے اور عام خوابوں کے بعض گوشوں کو دو وجہوں سے بے نقاب کیا ہے:

۱۔ پہلی وجہ اس حقیقت کا بیان ہے کہ جو شخص رسول اللہ ﷺ کو اس حلیے اور شکل میں خواب میں دیکھے جو صحیح احادیث سے ثابت ہے صرف اسی نے آپ کو دیکھا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کے علاوہ کسی اور کی شکل میں آپ کو دیکھنے والا، آپ کو نہیں، بلکہ اس شخص کو دیکھنے والا ہے اور اگر خواب میں نظر آنے والا خواب دیکھنے والے کو یہ یقین دلائے کہ میں تمہارا نبی ہوں تو وہ اپنے اس دعویٰ میں جھوٹا ہے، اس پر یہ حدیث پاک بصراحت دلالت کرتی ہے:

((من رآنی فی المنام فقد رآنی فان الشیطان لا یتمثل بی .)) [1]

''جس نے خواب میں مجھے دیکھا تو درحقیقت اس نے مجھے ہی دیکھا، اس لیے کہ شیطان میری شباہت نہیں اختیار کر سکتا۔''

اس حدیث کی رو سے غیر رسول' پر "من رآنی" کی تعبیر صادق نہیں آتی، لہٰذا جن صوفیا نے اپنے پیروں اور شیوخ کو خواب میں دیکھنے کے بعد یہ دعوے کیے ہیں کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کو اپنے پیروں اور شیوخ کی شکل میں دیکھا ہے، تو انہوں نے انہی پیروں اور شیوخ کو دیکھا ہے، نبی ﷺ کو نہیں، ورنہ "مــن رآنــی" کی تعبیر بے معنی اور غیر ضروری ہو جائے گی۔

۲۔ میرے تفصیلی بیان کی دوسری وجہ اس امر کی تاکید ہے کہ نبی کریم ﷺ کو صرف خواب میں دیکھا جا سکتا ہے، لہٰذا جن بزرگوں نے عالم بیداری میں آپ کو دیکھنے کے دعوے کیے ہیں وہ ناقابل التفات ہیں اور اگر اس کی کوئی حقیقت ہوتی تو صحابہ کرام، تابعین، ائمہ حدیث وفقہ وصلحائے امت کی سیرتوں میں اس کا تذکرہ ہوتا، صرف اکابر صوفیا ہی اس کے مدعی نہ ہوتے، دراصل بحالت بیداری نبی کریم ﷺ کو دیکھنے کے مدعی صوفیا اس وجہ سے ہیں کہ ان کا یہ عقیدہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کو ''دنیوی زندگی'' حاصل ہے اس عقیدے کے کتاب وسنت کی نصوص سے متصادم ہونے اور اہل سنت و جماعت کے عقیدے کے خلاف ہونے کے باوجود تمام صوفیا نہ صرف یہ کہ آپ کی دنیوی زندگی کے قائل ہیں، بلکہ ان کے اکابر کی سیرتوں میں آپ سے ان کی ملاقاتوں یا کم از کم آپ کی دیدار کے دعوے ضرور ملتے ہیں، اور قطب العالم حاجی امداد اللہ اس جھوٹے دعوے میں دوسروں سے دو قدم آگے تھے اور نبی ﷺ کو دوسروں کی شکل میں دیکھنے کے دعوے دار تھے، چنانچہ حاجی محمد مرتضیٰ خاں مصنف شمائم امدادیہ اپنی

---

[1] مسلم: ۲۲۶۶

Marfat.com

اس کتاب میں مدعی ہیں:

''حاجی امداد اللہ نے جب منبر اور روضہ شریفہ کے درمیان مراقبہ فرمایا تو آنحضرت ﷺ اپنی قبر مقدس سے بصورت حضرت میانجیو صاحب قدس سرہ نکلے اور لپٹا ہوا تر عمامہ غایت درجہ شفقت سے ان کے سر پر رکھ دیا اور کچھ نہ فرمایا اور واپس تشریف لے گئے۔'' ❶

میں نے اس عبارت کو قابل فہم بنانے کے لیے اس کے الفاظ میں کچھ تقدیم و تاخیر کر دی ہے، یوں تو ایک سلیم الفطرت اور صحیح العقیدہ انسان اس عبارت کو پڑھتے ہی ''من گھڑت'' قرار دے دے گا، لیکن اتمام حجت کے طور پر میں اس کی نکارت کو لفظوں میں بیان کر دینا چاہتا ہوں:

۱۔ نبی کریم ﷺ قرآن و حدیث کی تصریحات کے مطابق بشر تھے اور بحکم بشریت اپنی شکل بدلنے اور کسی دوسرے انسان کی شکل اختیار کرنے کی قدرت نہیں رکھتے تھے، پھر کس طرح ایک صوفی میانجیو کی شکل اختیار فرمائی جو اس وقت ہندوستان میں موجود تھا؟

۲۔ صحیح حدیث اس امر میں قاطع ہے کہ نبی ﷺ کی قبر مبارک قیام قیامت کے موقع پر پھٹے گی اور آپ اس سے نکلیں گے، ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

((أنا سيد ولد آدم يوم القيامة ، و اول من ينشق عنه القبر ، و أول شافع و أول مشفع)) ❷

''میں قیامت کے دن اولاد آدم کا سردار ہوں گا، اور میں پہلا وہ شخص ہوں گا جس کی قبر کھلے گی اور پہلا شفاعت کرنے والا اور پہلا وہ شخص ہوں گا جس کی شفاعت قبول کی جائے گی۔''

۳۔ حاجی امداد اللہ کے اس خیالی دعوے کے مطابق جس وقت نبی ﷺ اپنی قبر سے نکلے تھے، کیا اس وقت مسجد نبوی نمازیوں سے خالی تھی کہ کسی اور نے آپ کو قبر سے باہر نکلتے نہیں دیکھا؟ پھر قبر سے آپ کے باہر نکلنے کے لیے جو شگاف درکار تھا وہ کس طرح بنا اور کس طرح درست ہوا کہ کسی نے نہیں دیکھا؟ پھر آپ نے اپنی صورت اور شکل میں قبر مبارک سے باہر آنے کے بجائے ایک صوفی کی صورت کیوں اختیار کیا جو تصوف کے چاروں طریقوں: چشتیہ، قادریہ، نقشبندیہ اور سہروردیہ پر تو عمل پیرا تھا، مگر اس کا شمار ان علمائے اسلام میں نہیں ہوتا جنہوں نے اسلام کی خدمت کے میدان میں کوئی قابل ذکر کارنامہ انجام دیا ہو؟ یہ سارے سوالات اپنا تشفی بخش جواب نہ رکھنے کے باعث اس دعوے کی تکذیب کرتے ہیں۔

---

❶ ص: ۲۴ بحوالہ تذکرہ حاجی امداد اللہ، ص: ۲۳

❷ مسلم: ۲۲۷۸

Marfat.com

۴۔ کسی کے سر پر لپٹا ہوا اور تر عمامہ رکھ کر اس کے کردار اور سلوک پر اپنی رضا اور اطمینان کا اظہار نبی ﷺ نے کبھی بھی نہیں کیا ہے اور عمامہ کی فضیلت میں کوئی ایک بھی صحیح حدیث موجود نہیں ہے یہ صحیح ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کبھی کبھار عمامہ باندھا ہے، مگر عمامہ باندھنا آپ کا شعار کبھی نہیں تھا اور نہ صحابہ کا۔

۵۔ ہجرت کے موقع پر، جبکہ مشرکین آپ کی کھوج اور تلاش میں تھے آپ نے اپنی اور اپنے رفیق سفر ابوبکر رضی اللہ عنہ کی حفاظت کے لیے وہی مادی تدابیر اختیار فرمائیں جو اس طرح کے مواقع پر اختیار کی جاتی ہیں، کیوں نہ آپ نے انہی میں سے ایک شخص کی شکل اختیار کر لی اور آسانی سے اور بلا خوف وخطر مکہ سے مدینہ پہنچ گئے؟ صوفیا اور حاجی امداد اللہ کے پیرو کہہ سکتے ہیں کہ نبی ﷺ کسی مشرک کی صورت کس طرح اختیار کر سکتے تھے؟ تو اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ یہ حالت اضطرار تھی جس میں آپ نے ایک مشرک عبداللہ بن اریقط کو دلیل راہ بنایا تو کیا اس حالت میں اپنی صورت نہیں بدل سکتے تھے؟ دوسرا جواب یہ ہے کہ مشرکین مکہ تو صرف عبودیت اور الوہیت میں شرک کرتے تھے، مگر ربوبیت میں شرک نہیں کرتے تھے، جبکہ صوفیا توحید کی کوئی قسم جانتے تک نہیں ہیں اور ان کے نزدیک ''موحد'' وہ ہے جو وحدۃ الوجود کا قائل ہو حاجی امداد اللہ تو وحدۃ الوجود کے بہت بڑے داعی اور علم بردار تھے اور ان کے نزدیک "لا الہ الا اللہ" کا سب سے عمدہ ترجمہ ہے: اللہ کے سوا کوئی موجود نہیں''۔ فرماتے ہیں:

کلمہ لا الـہ الا اللہ کے باعتبار مراتب مردمان تین معنی ہیں: لا معبود، لا مطلوب، لا موجود الا اللہ ''اللہ کے سوا کوئی مطلوب نہیں اور اللہ کے سوا کوئی موجود نہیں، اور یہ آخری سب مراتب سے اعلیٰ ہے۔ ❶

موصوف کا یہ دعویٰ قرآن کی تکذیب ہے، کیونکہ اس میں اولاً تو اسی بات کو کھول کھول کر بیان کیا گیا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی اور معبود نہیں ہے اس کے علاوہ کسی اور توحید کی دعوت نہیں دی گئی ہے۔ ثانیاً: توحید الوہیت یعنی اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔'' تمام انبیاء کی توحید تھی اور اصلاً اسی کی دعوت دینے کے لیے وہ مبعوث کیے گئے تھے اور اسلام کے سارے احکام اسی توحید کے گرد گھومتے ہیں۔ تو کیا یہ توحید کا سب سے ادنیٰ مرتبہ ہے؟

خواب ماخذ شرع نہیں ہے:

رسول اللہ ﷺ کی وفات سے پہلے یہ دین تکمیل پا چکا تھا، لہٰذا آپ خواب میں اس شخص کو کوئی شرعی حکم دیتے ہیں اور نہ دے سکتے ہیں جو آپ کو خواب میں دیکھتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ خواب سے جو کچھ معلوم کیا جا سکتا ہے وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ اس کے ذریعہ اپنے کسی بندے کی استقامت فی الدین، اس کی دینی جدوجہد اور اس کے کردار پر اپنے رسول کی رضامندی، یا اس کے کسی غلط رویہ پر تنبیہ کر دے، وغیرہ۔

حاجی امداد اللہ نے حدیث "من رآنی فقد رأی الحق" جس نے مجھے دیکھا درحقیقت اس نے مجھے ہی دیکھا،

❶ امداد المشتاق، ص: ۴۵

Marfat.com

کے جو دوسرے معنی بتائے ہیں کہ جس نے مجھے دیکھا درحقیقت اس نے اللہ کو دیکھا۔" کی نکارت میں نے استعمال زبان، قرآنی تعبیرات اور اسلامی عقیدے کی روشنی میں پوری تفصیل سے بیان کر دی ہے اپنے اس غیر اسلامی اور گمراہ کن دعوے کے پس پردہ انہوں نے یہ جو فرمایا ہے کہ "پس جب زیارت آنحضرت ﷺ کی ہوئی یا دیدار پروردگار جو کچھ مسموع ہوگا یا قلب پر وارد ہوگا آنحضرت ﷺ کی طرف سے ہوگا یا خدائے پاک کی طرف سے۔

اس عبارت میں حاجی صاحب نے یہ کہنا چاہا ہے کہ خواب میں نبی ﷺ کی رویت یا تو آپ کی زیارت سے عبارت ہے یا اللہ تعالیٰ کی رویت سے، دونوں صورتوں یا معنوں میں خواب دیکھنے والا جو باتیں سنے گا یا جو خیالات اس کے دل میں وارد ہوں گے ان کا مصدر یا تو نبی ﷺ کی ذات ہوگی یا اللہ تعالیٰ کی اور یہی مسموعات اور واردات قلبی "حدیث کشفی" ہیں۔

موصوف نے پہلے تو حدیث کی غلط تاویل کر کے یا اس کی معنوی تحریف کر کے لفظ "الحق" سے اللہ تعالیٰ کو مراد لیا ہے، پھر اس حدیث سے حدیث کشفی کا وجود ثابت کرنے کی سعیٔ لاحاصل کی ہے، جس کا ماحصل یہ ہے کہ اگر صوفیا کے حلقوں میں گردش کرنے والی یہ روایتیں: شیخ اپنی قوم میں وہی درجہ رکھتا ہے جو درجہ نبی اپنی امت میں رکھتا ہے" اور جو کوئی اللہ کی ہم نشینی چاہتا ہے وہ اہل تصوف کی ہم نشینی اختیار کرے" محدثین کے معروف اصولوں کے مطابق حدیث نہیں ہیں تو نہ سہی، حدیث کشفی ضرور ہیں اور اصطلاحی حدیثوں کی طرح ان کی نسبت بھی نبی ﷺ سے ثابت ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ سے نسبت رکھنے کی وجہ سے حدیث کشفی کو اپنی قوت استدلال میں اصطلاحی حدیثوں پر برتری حاصل ہے۔

موصوف کے یہ سارے دعاوی محض صوفیانہ مفروضے ہیں جن کا عالم واقعہ میں کوئی وجود نہیں، جن کی وجوہات حسب ذیل ہیں:

۱۔ نبی ﷺ کو خواب میں دیکھنا آپ کی زیارت نہیں ہے۔

۲۔ نبی ﷺ خواب دیکھنے والے کو نہ کوئی شرعی حکم دیتے ہیں، نہ کسی کام سے روکتے ہیں اور نہ کسی فرد یا جماعت کا کوئی ایسا درجہ اور مرتبہ ہی بتاتے ہیں، جن کا اور جن کے درجہ و مرتبہ کا قرآن و حدیث میں ذکر نہ آیا ہو، کیونکہ ان تمام اعتبارات سے یہ دین مکمل ہے؛ اس میں تمام فرائض، واجبات، سنن، مستحبات اور فضائل اخلاق بیان کر دیے گئے ہیں اور تمام ممنوعات اور منہیات کی پوری تفصیل بھی بیان کر دی گئی ہے، اسی طرح قرآن و حدیث میں اللہ تعالیٰ کے محبوب اور منعم علیہ بندوں کے اوصاف بھی بیان کر دیے گئے ہیں اور ان کے بھی جو ملعون اور مبغوض ہیں اور ان تمام باتوں کو جاننے اور معلوم کرنے کا ذریعہ صرف قرآن اور حدیث ہے اور حدیث سے مراد نبی ﷺ کے وہ اقوال، افعال اور تقریرات ہیں، جن کی نسبت محدثین کے وضع کردہ قواعد وضوابط اور اصولوں کی رو سے نبی ﷺ سے ثابت ہے یہ قواعد وضوابط اور اصول ان پاکباز لوگوں نے بنائے اور وضع کیے ہیں، جن سے زیادہ پاکباز،

Marfat.com

امانت دار، متبع سنت، اللہ و رسول کے شیدائی اور فضائل اخلاق سے موصوف انسان چشم فلک نے نہیں دیکھے ہیں۔

اپنے ان عقائدی اور عملی اوصاف کے علاوہ محدثین قوت حافظہ، فہم دین اور قرآن وسنت کے نصوص سے مسائل اور احکام کے حسن استنباط کے جس منفرد اور امتیازی مقام پر فائز تھے اس کا اعتراف ان کے مخالفین کو بھی ہے۔

لہٰذا کسی حدیث پر صحت وسقم کا حکم لگانے کا حق صرف محدثین کی پاکباز اور باصلاحیت جماعت کو حاصل تھا، نہ کہ خواہشات نفس کے پیرو، دینی نصوص کی معنوی تحریف کرنے والوں اور اپنی خود ساختہ عبارتوں کو حدیث قرار دینے والوں کو ہے۔

حاجی امداد اللہ نے نبی کریم ﷺ کو خواب میں دیکھنے کے موقع پر خواب دیکھنے والے کے واردات قلبی کے بارے میں جو یہ فرمایا ہے کہ یہ یا تو نبی ﷺ کی طرف سے ہوتے ہیں یا اللہ تعالیٰ کی طرف سے'' تو عرض ہے کہ اولاً تو خواب کے موقع پر کسی کے دل میں کوئی خیال پیدا ہی نہیں ہوتا اور وہ جو کچھ دیکھتا ہے اگر وہ حق وصدق ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اور اگر وہ جھوٹ، فریب نفس اور شکم کے ابخرات کا نتیجہ ہے تو حدیث کے مطابق پہلے کو رویائے صالحہ یا صادقہ کہتے ہیں یعنی صالح اور سچے خواب اور دوسرے کو ''حلم'' کہتے ہیں، یعنی خواب پریشان، ابوقتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا ہے:

((الـرؤيـا الصالحة من الله و الحلم من الشيطان فاذا حلم احدكم ، فليتعوذ منه و ليبصق عن شماله ، فإنها لا تضره))

''اچھا خواب اللہ کی طرف سے ہے اور خواب پریشان شیطان کی طرف سے، لہٰذا اگر تم میں سے کوئی خواب پریشان دیکھے تو اس سے اللہ کی پناہ طلب کرے اور بائیں طرف تھوک دے، اس طرح یہ خواب اس کے لیے باعث ضرر نہیں ہوگا۔'' [1]

اور یہ بات واضح کی جا چکی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو آپ کی شکل، حلیے اور ہیئت میں خواب میں دیکھنا رویائے صالحہ اور صادقہ ہے اور یہ خواب اللہ تعالیٰ دکھاتا ہے جس میں شیطان کی خیال آرائی، صورت گری اور تمثیل نہیں ہوتی اور نبی ﷺ خود سے کسی کے خواب میں نہیں آتے، بلکہ اللہ تعالیٰ ''رفیق اعلیٰ'' میں موجود آپ کی روح پاک کو آپ کے حقیقی جسم کے عین مطابق جسم عطا کر دیتا ہے۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ نبی ﷺ نہ کسی کو خواب ہی دکھاتے ہیں اور نہ کسی کے دل میں کوئی خیال ہی پیدا کرتے یا ڈالتے ہیں۔ حدیث کشفی صوفیا کی اختراع ہے:

ہمارے اسلاف حدیث کشفی سے واقف نہیں تھے، یہ تو صوفیا کی ایجاد ہے، صوفیا سے میری مراد دوسری صدی ہجری کے بعد پیدا ہونے والے وہ مدعیان زہد وتوکل ہیں، جن کے عقائد، عبادات، زہد وتوکل، نام نہاد روحانی ریاضتوں،

[1] بخاری: ۶۹۸۶، مسلم: ۲۲۶۱

Marfat.com

اوراد واذکار اور اعمال و اشغال میں اسلام کے ساتھ، فلسفہ، کلام، ہندوازم، بدھ ازم اور رہبانیت اور باطنیت کی آمیزش ہے ایسی صورت میں ان کو اپنے باطل اور غیر اسلامی عقائد، اعمال اور ریاضتوں کو مقبول عام بنانے کے لیے جھوٹی روایتوں کا سہارا لینا پڑا اور ان جھوٹی روایتوں کو لوگوں سے منوانے کے لیے انہوں نے حدیث کشفی کی اصطلاح ایجاد کر لی اور اپنے مقصد کی ہر بے بنیاد، بے اصل، جھوٹی اور من گھڑت روایت کو یہ کہہ کر اپنے حلقوں میں پھیلا دیا کہ اگر محدثین کے نزدیک یہ حدیث صحیح نہیں ہے تو نہ ہو اہل کشف کے نزدیک تو صحیح ہے۔ امداد اللہ تو خیر ''ان پڑھ'' تھے، جو لوگ کتاب وسنت کا علم رکھتے تھے یا رکھتے ہیں، اگر چہ ان کا یہ علم کتابی ہی ہو، باطل روایتوں کو بذریعہ کشف صحیح قرار دینے میں جاہلوں سے بھی آگے ہیں، آخر کون ہے جس کو سیوطی، قسطلانی، زرقانی اور شعرانی کے علمی مقام و مرتبے اور حدیث دانی کا اعتراف نہیں ہوگا، مگر یہ کشف ہی کی کرشمہ سازی تو ہے جس نے ان کی کتابوں کو جھوٹی روایتوں سے بھر دیا ہے اور عبدالوہاب بن احمد شعرانی قلقشندی تو اسلامی علوم کے جامع تھے، فہم نصوص میں بھی اعلیٰ مقام پر فائز تھے اور برصغیر کے صوفیا کے برعکس حدیث کا گہرا علم بھی رکھتے تھے اور محدثین کا بے حد احترام بھی کرتے تھے، بایں ہمہ بذریعہ کشف جھوٹی روایتوں کو صحیح کہہ کر ان سے استدلال میں کسی معمولی صوفی سے پیچھے نہیں تھے۔

جھوٹی روایتوں کی تصحیح کا ایک اور انداز:

اگر حاجی امداد اللہ نے اُن جھوٹی روایتوں کو، جن میں صوفیوں کے شیوخ اور پیروں کو انبیاء کا مقام دے دیا گیا ہے حدیث کشفی کہہ کر صحیح ثابت کرنے کی کوشش کی ہے تو تعجب نہیں کرنا چاہیے کہ یہی ان کا مبلغ علم بھی تھا اور عقیدہ بھی، مگر ملا علی قاری تو عالم حدیث بھی تھے اور فقیہ بھی، پھر انہوں نے ایسا دعویٰ کیوں کر ڈالا کہ ایک طرف تو ابن تیمیہ اور سخاوی کی تائید کرتے ہوئے یہ اعتراف بھی کر لیا کہ یہ روایتیں صحیح اور ثابت نہیں ہیں، اور اسی کے ساتھ یہ دعویٰ بھی کر بیٹھے کہ معناً یہ صحیح ہیں، اور اس پر بس نہیں کیا، بلکہ ان کی صحتِ معنی پر ایک ایسی صحیح حدیث اور قرآن پاک کی ایک ایسی آیت سے استدلال کرنے سے بھی باز نہیں رہے جن کا مذکورہ جھوٹی روایتوں سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے، اسی طرح اہل کتاب کے اس فریق میں اپنا نام لکھوالیا جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ۝﴾ (البقرة: ١٤٦)

''وہ لوگ جنہیں ہم نے کتاب دی ہے اس کو اسی طرح پہچانتے ہیں جس طرح اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں اور درحقیقت ان میں سے کچھ لوگ حق کو جانتے بوجھتے چھپاتے ہیں۔''

چنانچہ موصوف حاجی امداد اللہ کی ذکر کردہ روایتوں اور ان کی ہم معنی دوسری روایتوں پر عدم صحت اور عدم ثبوت کا حکم لگانے کے بعد تحریر فرماتے ہیں:

Marfat.com

اور معنی کے اعتبار سے ان کی ایک صحیح حدیث: ((اَلْعُلَمَآءُ وَرَثَةُ الْاَنْبِیَاءِ)) ''علماء انبیاء کے وارث ہیں۔''
سے تقویت اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد: ﴿فَاسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ (النحل: ٤٣)
''اگر تم نہ جانتے ہو تو اہل ذکر سے پوچھ لو۔'' سے تائید ہوتی ہے۔ ❶

شیخ عالم کا ہم معنی نہیں ہے:

ملا علی قاری کا یہ استدلال چند وجوہ سے بے محل اور قابل ردّ ہے:

۱۔ قرآن و حدیث میں اہل حق کے ضمن میں شیخ کا ذکر نہیں آیا ہے۔

۲۔ جرح و تعدیل کے علماء کے نزدیک ''شیخ'' عدالتِ راوی کا سب سے پست درجہ ہے۔

۳۔ زبان اور لغت میں شیخ ''عالم'' کا مترادف اور ہم معنی نہیں اور امر واقعہ کے اعتبار سے علم اور اتباع سنت سے تہی دامن ہے۔

۴۔ قرآن و حدیث کے مطابق علماء اللہ تعالیٰ سے سب سے زیادہ ڈرنے والے لوگ ہیں، جبکہ صوفیا کا شیخ مطاع مطلق ہوتا ہے، وہ شریعت سازی کرتا ہے، وہ اپنے مریدوں سے اللہ و رسول کی نہیں اپنی اطاعت اور اتباع کرواتا ہے۔

۵۔ انبیاء کی میراث ان کی سنت تھی اور ہمارے نبی ﷺ کی میراث بھی سنت ہے، لہٰذا آپ کے وارث علماء وہ ہیں جو آپ کی سنت کا علم رکھتے ہیں، اس کی حفاظت کرتے ہیں اور اس کی اتباع کرتے ہیں، جبکہ صوفیوں کا شیخ اپنے ذوق و رائے کا پیرو ہے اور اپنے مریدوں کو اسی راہ پر چلاتا ہے۔

۶۔ قرآنی آیت میں ''اہل الذکر'' سے مراد علمائے اہل کتاب ہیں اور یہ سیاق آیت اور شان نزول کے اعتبار سے اور لفظ کے عموم کے اعتبار سے کتاب و سنت کا علم رکھنے والے مراد ہیں۔

۷۔ حدیث اور قرآنی آیت میں علماء کو انبیاء کے مقام پر فائز نہیں کیا گیا ہے، ان کو اللہ تعالیٰ کی صفات سے موصوف کرنا تو دور کی بات ہے، جبکہ صوفیا کے نزدیک شیخ قولاً نبی کا مقام و درجہ رکھتا ہے اور عقیدۃً اور عملاً اللہ تعالیٰ کی صفات سے موصوف ہوتا ہے تصوف کی کسی بھی کتاب میں ''نام نہاد اولیاء اللہ'' کی سیرتوں کا مطالعہ کر لیجیے میرے اس دعوے کے بے شمار دلائل مل جائیں گے۔

۸۔ صوفیا کے مقامات سلوک: فنا و بقا، جمع و فرق، اذکار و اوراد اور اشغال و اعمال اور حقائق کے عنوان سے ان کی اصطلاحیں ان کی خانہ ساز ہیں کتاب و سنت سے ماخوذ نہیں۔

تصور شخص کا تعارف:

میں نے اوپر ''شیخ'' کے بارے میں صوفیا کے عقیدے کو تفصیل سے بیان کر دیا ہے اور اس سے متعلق صوفیا کے

---

❶ الاسرار المرفوعۃ، ص: ۲۳۲، نمبر: ۲۵۳

Marfat.com

حلقوں میں گردش کرنے والی بعض جھوٹی روایتوں کا ذکر بھی کر دیا ہے اور جن صوفیا نے ان سے شیخ کے مقام و مرتبہ پر استدلال کیا ہے اس کی غلطی بھی واضح کر دی ہے، اب تصور شیخ کے تعارف کا مرحلہ ہے، کیونکہ جب تک کوئی چیز واضح نہ ہو اس وقت تک اس کے صحیح یا غلط اور مقبول یا غیر مقبول ہونے کا حکم نہیں لگایا جا سکتا۔

تصور شیخ کا تعارف میں ایک ایسے صوفی کے الفاظ میں بیان کرنا چاہتا ہوں جو برصغیر کے صوفیا میں سرفہرست ہے اور سید سلیمان ندوی ثم صوفی کے الفاظ میں جو تصوف کا ''مکتشف اعظم'' تھا، میری مراد مولانا تھانوی سے ہے، موصوف تصور شیخ کے خدوخال واضح کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

''شیخ کی صورت اور اس کے کمالات کے تصور کرنے سے اس سے محبت پیدا ہو جاتی ہے اور نسبت قوی ہوتی ہے اور قوتِ نسبت سے طرح طرح کی برکات حاصل ہوتی ہیں ...... اصل مقصود تصور حق تعالیٰ کا ہے، مگر چونکہ اللہ تعالیٰ مرئی نہیں ہے، اس لیے جن لوگوں کی قوتِ فکریہ ضعیف ہوتی ہے ان کو یہ تصور جچتا نہیں، کیونکہ ان کے ذہن میں خیالات بہت آتے ہیں، ایسے لوگوں کو یکسوئی حاصل کرنے کے لیے ''تصور شیخ'' تجویز کیا گیا ہے، کیونکہ یہ علاج بالضد ہوتا ہے، یعنی ایک خیال کو دفع کرنے کے لیے دوسرے خیال کو ذہن میں جمایا جائے گا، خواہ وہ کوئی خیال ہو، پس ان خیالات مختلفہ کے دفع کرنے کے واسطے ہر دیکھی ہوئی چیز کا تصور کافی ہے جس پر خیال جم سکے، لیکن ان سب خیالات میں سے شیخ کا تصور انفع ہے کہ وہ محبوب ہونے کی وجہ سے ذہن میں زیادہ جمے گا اس لیے دفع خیالات میں زیادہ مؤثر ہوگا۔

تصور شیخ کوئی بالذات مطلوب نہیں ہے، صرف توجہ الی اللہ کے وقت جو وساوس مجرد کا ہجوم ہوتا ہے، وہ قطع وساوس کے لیے ہے، اس سے یکسوئی حاصل ہو جاتی ہے، پھر اس یکسوئی سے توجہ الی اللہ کی استعداد پیدا ہو جاتی ہے، پھر اس استعداد کو مقصود میں صرف کرنا اور جب مقصود حاصل ہو جائے تو پھر ان ہیئات و قیود کی ضرورت نہیں رہتی۔'' [1]

مولانا تھانوی تصوف کے بنیادی، بلکہ عقائدی مسائل کے بیان میں قدرے محتاط الفاظ استعمال کرتے تھے جس کی وجہ سے ان کا نقطۂ نظر سمجھنے میں دقت ہوتی تھی، ان کے برعکس مولانا حسین احمد مدنی صاف گو تھے، یوں تو مولانا تھانوی کا علمی مقام و مرتبہ مولانا مدنی سے بلند تھا اور تصوف کے رموز و نکات بھی وہ مدنی سے بہتر سمجھتے تھے، پھر بھی مولانا مدنی کے مریدوں اور عقیدت مندوں کا حلقہ بھی کافی وسیع تھا اور اکابر صوفیائے دیوبند کے نزدیک ان کے صوفیانہ اقوال سند کا درجہ رکھتے تھے اس لیے تصور شیخ پر کوئی تبصرہ کرنے سے قبل یہ مناسب ہے کہ اس مسئلہ میں ان کا نقطۂ نظر بھی بیان کر دیا جائے، فرماتے ہیں:

[1] شریعت وطریقت، ص: ۲۸۵.

Marfat.com

''کسی صورت کو ذہن میں جمانے اور حاصل کرنے کو لغت میں ''تصور'' کہتے ہیں، خواہ وہ صورت جاندار کی ہو، یا غیر جاندار کی، خواہ معمولی شخص کی ہو، یا غیر معمولی شخص کی، کسی بزرگ اور ولی کی یا اپنے مرشد، باپ ماں کی، خواہ اس صورت سے نفع کی امید ہو یا نہ ہو، مگر ''عرف'' میں تصور شیخ کسی مقدس اور بزرگ کی صورت کو ذہن میں دھیان لانے اور جمانے کا نام ہے، بالخصوص اپنے مرشد کے چہرے کو خیال میں جمانے اور حاصل کرنے کو تصور شیخ کہتے ہیں۔''[1]

مولانا مدنی نے یہ نہیں بتایا کہ ''تصور شیخ'' ہمہ وقت مطلوب ہے یا کسی خاص موقعہ پر مولانا تھانوی نے اس کو واضح کر دیا ہے، یعنی توجہ الی اللہ کے وقت اس تصور شیخ کی ضرورت پڑتی ہے، تاکہ اس موقع پر ذہن میں پیدا ہونے والے خیالات اور دل پر ہجوم کرنے والے وسوسوں پر قابو پا کر اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ کو مبذول اور یکسو رکھا جا سکے۔

ایک سوال:

دونوں بزرگوں کے نزدیک تصور شیخ سے کسی عام انسان، دوسرے لفظوں میں کسی غیر صوفی بزرگ کا تصور مقصود نہیں ہے، بلکہ کسی ایسے صوفی بزرگ کا تصور مقصود ہے جس کی بزرگی اور تقدس پر اہل تصوت کا اتفاق ہے، اور جس کا جامع لقب ''شیخ'' ہے اور جو صوفی اپنے ذہن میں کسی شخص کا تصور جمائے وہ اس کا پیر اور مرشد ہو، اور مولانا تھانوی کے نزدیک اس تصور کا موقع و محل اور وقت وہ ہے جب سالک اللہ کی طرف متوجہ ہو۔

مولانا تھانوی نے اللہ کی طرف یکسوئی کے لیے تصور شیخ کو ''علاج بالضد'' بتایا ہے اور اس کا سبب یہ بتایا ہے کہ چونکہ اللہ تعالیٰ غیر مرئی ہے اس لیے اس کا تصور تو کیا نہیں جا سکتا، البتہ شیخ کے مرئی اور محبوب ہونے کی وجہ سے اس کا تصور بھی کیا جا سکتا ہے اور اس سے اللہ کی طرف یکسوئی بھی ہو سکتی ہے۔

مگر سوال یہ ہے کہ سالک اپنے ذہن میں توجہ الی اللہ کے وقت، مثلاً نماز پڑھتے ہوئے جو افضل ترین ذکر ہے اپنے شیخ اور پیر کی صورت کو جماتا ہے اور اس کو تصور میں لاتا ہے، جو شیخ اس کے عقیدے کی رو سے انبیاء کے برابر، بلکہ ان سے افضل ہے اور اکابر صوفیا کے اعترافات اور تصریحات کی رو سے وہ ان تمام صفات سے موصوف ہے جو اللہ تعالیٰ کے لیے خاص ہیں۔ مثلاً وہ عالم الغیب ہے، غیر مستقل رب ہے، مافوق الاسباب امور میں مستعان ہے، اپنی زندگی اور موت دونوں حالتوں میں امور کائنات میں صاحب تصرف ہے، وہ بیماریوں سے شفا دیتا ہے، اولاد دیتا ہے، آفات و مصائب میں مبتلا ہو جانے والے اپنے مریدوں کو ان کے آفات و مصائب سے نجات دیتا ہے اور وہ اپنے مریدوں کے دلوں میں پیدا ہونے والے خیالات تک سے بروقت واقف ہو جاتا ہے اور ''پیر رومی'' کے مطابق جس صوفی مرید کی نگاہ میں اللہ اور پیر کا ایک ہی مقام اور درجہ نہ ہو وہ مرید نہیں ہے۔

[1] ارواح ثلاثہ

Marfat.com

ان صفات کے حامل شیخ کے تصور کو ذہن میں جمائے رکھنے کے بعد کیا خاک اللہ کا خیال آئے گا، اس کی طرف توجہ میں یکسوئی کی بات تو بہت دور ہے۔ میں اپنے اس دعوے پر ایک ایسی دلیل پیش کر دینا چاہتا ہوں جو اس مسئلہ میں ''شاہد عدل'' ہے۔

مولانا سیّد سلیمان ندوی نے اپنی حیات مستعار کا بہت بڑا مرحلہ سیرت پاک کے زیر سایہ گزارا تھا، وہ سیرت پاک کے مصنف بھی ہیں، مگر سیرت مصطفوی کی عطر بیز فضاؤں میں بھی توحید کی خوشبو سے ان کے مشام جاں معطر نہ ہو سکے اور ایک صوفی کی چرنوں میں پہنچ کر خالق اور معبود تک کو بھول گئے جس کا انہوں نے اعتراف کیا ہے اور اعتراف ''سید الادلہ'' ہے، فرماتے ہیں:

پا کر تجھے اپنے کو میں بھول گیا ہوں
ہر سود و زیانِ دوسرا میں بھول گیا ہوں
جس دن سے مرے دل میں تری یاد بسی ہے
ہر ایک کو میں تیرے سوا بھول گیا ہوں
آتا ہے خدا بھی ترے صدقہ میں مجھے یاد
گویا کہ بظاہر میں خدا بھول گیا ہوں ❶

عبادات ہوں یا غیر عبادات کوئی بھی انسان اپنے ذہن وقلب کو بیرونی خیالات اور وسوسوں سے پاک نہیں کر سکتا، اگر یہ ممکن ہوتا تو اللہ رب العالمین یا سیّد المرسلین نے اس کا کوئی طریقہ بتایا ہوتا۔ اللہ سے تعلق پیدا کرنے اور مضبوط بنانے کا سب سے عمدہ اور موثر ذریعہ عبادات ہیں، جن کی معراج نماز ہے اور نماز میں عاجزی اور فروتنی کا اظہار کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ نے کامیابی کی سند عطا کی ہے:

﴿قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ٥ الَّذِیْنَ هُمْ فِیْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ٥﴾ (المؤمنون : ۱، ۲)

''یقیناً کامیاب ہو گئے وہ مومنین جو اپنی نماز میں عاجزی کا اظہار کرتے ہیں۔''

حدیث جبریل میں احسان کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

((أن تعبد الله كأنك تراه ، فان لم تكن تراه فإنه يراك .)) ❷

''تم اللہ کی عبادت اس طرح کرو گویا تم اسے دیکھ رہے ہو اور اگر تم اسے نہیں دیکھ رہے تو وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔''

اللہ کی عبادت کو اس کے لیے جس خشوع وخضوع، جس تذلل اور عاجزی اور جس فروتنی اور خود سپردگی کا مظہر ہونا چاہیے

❶ دین تصوف وطریقت، ص: ۸۱ ❷ مسلم: ۱

Marfat.com

ایسی عبادت ہے جو اس احساس کے ساتھ کی جانی چاہیے کہ عبادت کرنے والا اللہ کو دیکھ رہا ہے اور چونکہ اللہ کی رؤیت اس دنیا میں محال ہے۔ (لَنْ تَرَانِیْ) اس لیے فرمایا کہ کَاَنَّکَ تَرَاہُ گویا تم اسے دیکھ رہے ہو اور تمہارا یہ احساس تمہاری عبادتوں کو عاجزی، فروتنی اور تذلل کی تصویر بنا دے گا، اور اس کیفیت اور حالت اور صفت سے عابد کی عبادت کو دوسری جو چیز موصوف بناتی ہے وہ اس کا یہ ایمان ہے کہ اگر میں اپنے رب اور معبود کو نہیں دیکھ رہا تو وہ یقیناً مجھے دیکھ رہا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے عبادت کو عمدگی سے ادا کرنے کا جو طریقہ بتایا ہے وہی مطلوب بھی ہے اور ممکن بھی اور اس کے سوا کوئی اور طریقہ مردود ہے۔

تصور شیخ بت پرستی ہے:

مولانا تھانوی اور مولانا مدنی نے ''تصور شیخ'' کا جو تعارف کرایا ہے اس کی رو سے یہ نظریہ اور عقیدہ سراسر شرک اور بت پرستی ہے جس سے اللہ کی جانب توجہ میں یکسوئی نہیں، بلکہ اللہ کے ماسوا ''شیخ'' کی طرف توجہ میں یکسوئی پیدا ہوتی ہے اور چونکہ یہ تصور شیخ قصداً کیا جاتا ہے لہٰذا ایسا کرنے والا ہر انسان مشرک اور بت پرست ہے۔ چنانچہ اس پر بت پرستی کا حکم لگانے والے ایسے تین بزرگ ہیں جن کی بزرگی، خدا رسیدگی اور صلاح و تقویٰ کے معترف تمام صوفیائے دیوبند ہیں۔ میری مراد سیّد احمد بریلوی، مولانا ابوالحسن علی ندوی اور شاہ عبدالعزیز ہیں۔

جیسا کہ میں اوپر ذکر کر چکا ہوں کہ جب سیّد احمد بریلوی شاہ عبدالعزیز کے ہاتھ پر تصوف کے تین طریقوں: چشتیہ، قادریہ اور نقشبندیہ میں بیعت ہو گئے تو شاہ عبدالعزیز نے انہیں تعلیم سلوک کے ضمن میں حسب معمول تصور شیخ کی تلقین کی اور انہوں نے اس کو بت پرستی قرار دیتے ہوئے نہایت ادب و احترام سے قبول کرنے سے انکار کر دیا اور فرمایا: ''اس میں -بت پرستی میں- صورت سنگی اور قرطاسی ہوتی ہے اور اس میں -تصور شیخ میں- صورت خیالی جو دل میں جگہ پکڑ لیتی ہے اور اس کی طرف توجہ اور اس سے استعانت ہوتی ہے۔'' [1]

تصور شیخ کے بارے میں سیّد صاحب کی یہ رائے کتنی دقیق اور مبنی برحق تھی، لگتا ہے کہ شاہ عبدالعزیز نے ان سے تصور شیخ کا اسی طرح تعارف کرایا تھا جس طرح مولانا تھانوی اور مولانا مدنی نے اپنے اپنے انداز میں اس کا تعارف کرایا ہے اور سیّد احمد بریلوی کے توحید آشنا ذہن اور توحید کی لذت سے سرشار دل نے فوراً یہ تاڑ لیا کہ یہ تو شیخ کی خیالی پرستش ہے جو دل میں جڑ پکڑنے کے بعد اس کو اسی کی جانب متوجہ رکھے گی اور اسی سے استعانت کرائے گی۔

''تصور شیخ'' کے بارے میں سیّد احمد کی یہ رائے کہ: اس میں صورت خیالی دل میں جگہ پکڑ لیتی ہے اور اس کی طرف توجہ اور اس سے استعانت ہوتی ہے'' سونے کے پانی سے لکھی جانے کے قابل ہے اور اس مختصر مگر مبنی برحق قول نے مولانا تھانوی کے اس دعوے کی جڑ ہی کاٹ دی ہے کہ تصور شیخ بالذات مطلوب نہیں بلکہ قطع وساوس کے لیے ہے اور اس کا

---

[1] سیرت سیّد احمد شہید: ۱/۱۲۱

Marfat.com

مقصد توجہ الی اللہ کی استعداد پیدا کرنا ہے۔

سیّد احمد بریلوی رحمہ اللہ نے ان دو لفظوں میں تصور شیخ کی اتنی عمدہ اور صحیح تشخیص کر دی تھی کہ فلسفہ و منطق پر عبور رکھنے والے ایک صوفی ''حدیث داں'' کو بھی ان کی رائے کو غلط قرار دینے کی جرات اور ہمت نہیں ہوئی اور اس نے اپنی اس مشرکانہ تعلیم و تلقین کے حق میں قرآن و حدیث سے کوئی دلیل دینے کے بجائے حافظ شیرازی کا وہ شعر پڑھ دیا جس میں اطاعت پیر کا حکم دیا گیا ہے اگر چہ وہ صریح معصیت ہی کا حکم کیوں نہ ہو:

بہ مے سجادہ رنگیں کن گرت پیر مغاں گوید
کہ سالک بے خبر نہ بوذ راہ و رسم منزلہا

اگر پیر مغاں تم سے کہے تو جائے نماز کو شراب سے رنگین کر دو، کیونکہ سالک مقامات سلوک کی راہ و رسم سے بے خبر نہیں ہوتا۔

شاہ عبدالعزیز نے جس موقع و محل میں یہ شعر پڑھا تھا اس موقع و محل میں اس کا صاف اور واضح مطلب یہ تھا کہ ''اگر تمہارے خیال میں ''تصور شیخ'' صریح بت پرستی ہے تو ہو، لیکن تم راہ سلوک طے کرنے کی غرض سے میرے ہاتھ پر بیعت ہونے کے لیے آئے ہو، تو کان کھول کر سن لو، میں تمہارا پیر ہوں اور تم میرے مرید، اس راہ سلوک میں حلال و حرام اور توحید و بت پرستی کی بحثوں میں پڑ کر اپنا اور میرا وقت مت ضائع کرو اور اپنے ذہن و دماغ سے اللہ و رسول کا نام کھرچ دو اور پیر کو ''مطاع مطلق'' مان کر اس کے حکم پر چلو۔ اس وقت وہی تمہارا نبی بھی ہے اور وہی تمہارا معبود بھی۔

مگر قابل تعریف اور قابل رشک تھا اس نوجوان کا عقیدۂ توحید جس کا نام سیّد احمد بریلوی ہے، یہ کفریہ شعر بن کر بھی وہ ''ٹس سے مس'' نہ ہوا اور تصور شیخ کے بارے میں اس کا نقطۂ نظر نہ بدلا اور بقول علی میاں فرمایا:

''شرک کی کسی طرح ہمت نہیں ہو سکتی، ہاں کتاب و سنت و اجماع امت سے کوئی سند لائیں اور اچھی طرح اطمینان ہو جائے کہ دونوں ایک چیز نہیں تو خطرہ دور ہو سکتا ہے۔'' [1]

علی میاں نے سیّد صاحب کا ارشاد انہی الفاظ میں نقل کیا ہے اور حوالہ مخزن احمدی کا دیا ہے، میرے خیال میں انہوں نے نقل واقعہ میں تصرف سے کام لیا ہے، اس لیے کہ ۱۷-۱۸ سال کے ایک نوجوان کے منہ سے، جس نے کوئی خاص دینی تعلیم نہ پائی ہو کتاب و سنت کے الفاظ کا نکلنا تو تعجب خیز نہیں، لیکن اجماعِ امت کا لفظ اس کے منہ سے نہیں نکل سکتا تھا، یہ ان کے مقام و مرتبے اور عمر سے بہت بڑا ہے۔

اسی مخزن احمدی سے مولانا غلام رسول مہر نے بھی یہ واقعہ نقل کیا ہے جو علی میاں کی عبارت سے مختلف بھی ہے اور زیادہ تفصیلی بھی، اس میں اجماع امت نہیں ہے:

[1] ص ۱۲۱، ج ۱

Marfat.com

''سیّد صاحب نے دوبارہ عرض کیا کہ میں بہر حال فرماں بردار ہوں اس لیے کہ کسب فیض کی غرض سے آیا ہوں، لیکن تصور شیخ تو صریح بت پرستی معلوم ہوتا ہے اس خدشے کو زائل کرنے کے لیے قرآن وحدیث سے کوئی دلیل پیش فرما دیں، ورنہ اس عاجز کو اس شغل سے معاف رکھیں۔''❶

اس کے بعد مہر صاحب تحریر فرماتے ہیں:

''شاہ صاحب نے یہ سنتے ہی سیّد صاحب کو سینے سے لگا لیا، رخساروں اور پیشانی پر بوسے دیے اور فرمایا: اے فرزند ارجمند! خدائے برتر نے اپنے فضل ورحمت سے تجھے ولایت انبیاء عطا فرمائی ہے۔''

مہر صاحب آگے لکھتے ہیں:

''سیّد صاحب نے ولایت انبیاء اور ولایت اولیاء کی تشریح پوچھی تو شاہ صاحب نے فرمایا: جس شخص کو ولایت اولیا عطا ہوتی ہے، وہ دن رات ریاضت ومجاہدات، صوم وصلوٰۃ اور کثرت نوافل میں مشغول رہتا ہے، لوگوں کی صحبت پسند نہیں کرتا، چاہتا ہے کہ گوشۂ تنہائی میں خدا کی یاد سے لذت اندوز ہوتا رہے اسے فاسقوں اور فاجروں کو وعظ ونصیحت سے کچھ سروکار نہیں ہوتا، صوفیہ کرام کی اصطلاح میں اسے ''قرب بالنوافل'' کہتے ہیں۔''

ولایت انبیاء کا درجہ جس خوش نصیب کو مرحمت ہو، اس کے دل میں محبت الٰہی اس طرح سما جاتی ہے کہ اس کے سوا کسی چیز کے لیے گنجائش باقی نہیں رہتی وہ ہر وقت بندگان خدا کو نیکی کی راہ پر لگانے کے لیے کوشاں رہتا ہے، مرضیات باری تعالیٰ کے کسی کام میں دنیا داروں کے طعن وملامت کی پروا نہیں کرتا، وہ توحید کی اشاعت میں بے خوف اور سنن رسول پاک کے احیاء میں بے باک ہوتا ہے، ضرورت پیش آئے تو مخالفوں کے ساتھ مجاہدات میں مال وجان قربان کرتے وقت بھی متامل نہیں ہوتا وہ للہ فی اللہ تمام محفلوں اور مجلسوں میں جاتا ہے، سب کو وعظ ونصیحت سناتا ہے، اس کار خیر میں جو تکلیفیں اور اذیتیں پیش آئیں، ان پر صبر کرتا ہے۔ اسے اصطلاح میں ''قرب بالفرائض'' کہتے ہیں۔''❷

تبصرہ:

شاہ عبدالعزیز نے ولایت اولیاء اور ولایت انبیاء کی جو تشریحات فرمائی ہیں وہ ان کے سوال پر اور ان کے ''تصور شیخ'' کو صریح بت پرستی قرار دینے کے بعد، اس موقع ومحل میں، غیر اسلامی اور کتاب وسنت پر مبنی نہ ہونے کے ساتھ یہ دونوں اصطلاحیں، یا یہ دونوں ''ولایتیں'' ناقابل ذکر تھیں، کیونکہ اپنے ذہن ودماغ میں شیخ کے تصور کو جمانے والے کے اندر ''خدا کی یاد سے لذت اندوز ہونے'' کی استعداد کہاں رہ جاتی ہے اس کا خدا تو اس کا شیخ ہوتا ہے جس کے تصور پر اس کی توجہ مرکوز ہوتی ہے اس تناظر میں شاہ صاحب کو ''ولایت اولیا'' کی تعریف ان الفاظ میں کرانی چاہیے تھی کہ:

---

❶ سیّد احمد شہید، ص: ۸۰ ❷ ص: ۸۰-۸۱

Marfat.com

''ولایت اولیا'' -اولیاء کی محبت اور دوستی- یہ ہے کہ سالک اور صوفی دن ورات ریاضت اور مجاہدے کر کے اور صوم و صلوٰۃ اور کثرت نوافل کے ذریعہ اور لوگوں سے کٹ کر اور گوشۂ تنہائی میں بیٹھ کر اپنے اس شیخ اور پیر کی یاد کو تازہ کرتا رہے جس کے تصور کو اس نے اپنے دل و دماغ میں بسایا اور جمایا ہے۔''

رہی ''ولایت انبیاء'' تو اپنے اوصاف، اعمال اور اشغال سے قطع نظر ایک غیر اسلامی اصطلاح ہے جس کا ماخذ کتاب وسنت نہیں ہے؛ دراصل ایک انسان یا تو اللہ کا ولی ہوتا ہے یا شیطان کا، اگر وہ مومن و متقی ہے تو اللہ کا ولی ہے اور اللہ اس کا ولی ہے اور اگر کافر و فاجر ہے تو شیطان کا ولی ہے اور شیطان اس کا ولی ہے:

﴿اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْلِيٰٓـئُهُمُ الطَّاغُوْتُ يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ﴾ (البقرة: ۲۵۷)

''اللہ ان کا دوست ہے جو ایمان لائے وہ ان کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لے جاتا ہے اور وہ جنہوں نے کفر کیا ان کے دوست طاغوت ہیں جو ان کو روشنی سے نکال کر تاریکیوں کی طرف لے جاتے ہیں۔''

رسول اللہ ﷺ سے دنیا کی ہر چیز سے بڑھ کر، حتیٰ کہ والدین اور اپنی جان سے زیادہ محبت کے مطلوب ہونے اور صحت ایمان کی شرط ہونے کے باوجود کتاب و سنت میں اہل ایمان کو نبی یا رسول کا ولی نہیں کہا گیا ہے، اگر کہا گیا ہے تو یہ کہ اللہ، اس کا رسول اور نماز قائم کرنے والے اور زکوٰۃ دینے والے مومنین کے ولی بمعنی دوست اور بہی خواہ ہیں:

﴿اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَ هُمْ رٰكِعُوْنَ۝﴾ (المائدة: ۵۵)

''تمہارے دوست تو اللہ، اور اس کا رسول اور وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے، جو نماز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور جھکنے والے ہیں۔''

شاہ صاحب کی ان دونوں تعبیروں کی جگہ دوسرے ''صوفیا''، مثلاً: مولانا تھانوی وغیرہ نے طریق ولایت اور طریق نبوت کی تعبیریں استعمال کی ہیں۔ [1]

اور یہ دونوں طریقے ایک دوسرے سے مغایر ہیں اور چونکہ صوفیا طریق ولایت پر کاربند ہیں اس لیے تصوف اسلام نہیں اسلام کے متوازی دوسرا دین ہے۔

طریق ولایت یا تصوف کے طریق نبوت کے مغایر ہونے کی وجہ سے سالک یا صوفی کے ''متبع سنت'' ہونے کی بات محض صوفیانہ ''بڑ'' ہے، جس کا امر واقعہ سے کوئی دور کا بھی تعلق نہیں۔

---

[1] شریعت وطریقت، ص: ۴۷

Marfat.com

مولانا مدنی کی غلط بیانی:

اوپر ''تصور شیخ'' کے بت پرستی ہونے کے مسئلہ میں جو کچھ عرض کیا گیا ہے وہ محض دعویٰ نہیں، بلکہ امر واقعہ کا بیان ہے اسی وجہ سے شاہ عبدالعزیز بھی سید صاحب کی رائے کی تردید نہ کر سکے اور مولانا علی میاں نے تو سیّد صاحب کے ملفوظات، صراط مستقیم سے ایک طویل اقتباس نقل کر کے ان کی رائے کی تائید کر دی ہے۔ ❶

لیکن مولانا حسین احمد مدنی نے نہ صرف یہ کہ ''تصور شیخ'' کو بالاتفاق جائز قرار دیا ہے، بلکہ یہ غلط بیانی بھی کی ہے کہ صحابہ کرام اور رسول اللہ ﷺ نے اس کو پسند فرمایا ہے۔

مولانا مدنی نے ایک تو ایک نہایت ہی ضعیف حدیث سے اپنے دعوے پر استدلال کیا ہے دوم انہوں نے کچھ الفاظ گھڑ کر راوی کی طرف منسوب کر دیے ہیں، فرماتے ہیں:

> ''ذہن میں اپنے مرشد کی تصویر اور تمثال کو جمانا اور حاصل کرنا بالاتفاق جائز ہے، بلکہ مفید بھی ہے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور جناب رسول اللہ ﷺ نے اس کو پسند فرمایا ہے۔ امام حسن نے جناب رسول اللہ ﷺ کی تمثال اور سراپا کو اپنے ماموں ہند بن ابی ہالہ سے بار بار پوچھ کر اپنے ذہن میں جمایا ہے اور جناب رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ وغیرہم علیہم السلام کی شکل وصورت اور لباس وغیرہ کو صحابہ کرام کے سامنے ذکر فرمایا ہے۔ جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان اکابر کی صورت اور شکل کو مخاطبین کے دماغ میں تمثل اور جگہ دینا ہے۔'' (ارواح ثلاثہ)

اوپر تصوف کی دنیا کے امام تھانوی کی رائے تصور شیخ کے بارے میں نقل کی جا چکی ہے جس کو دوبارہ نقل کر دیتا ہوں، فرماتے ہیں:

> ''تصور شیخ کوئی بالذات مطلوب نہیں ہے، صرف توجہ الی اللہ کے وقت جو وساوس مجرد کا ہجوم ہوتا ہے وہ قطع وساوس کے لیے ہے اس سے یکسوئی حاصل ہو جاتی ہے، پھر اس یکسوئی سے توجہ الی اللہ کی استعداد پیدا ہو جاتی ہے......''

عبارت بالکل واضح اور قابل فہم ہے، مطلب یہ ہے کہ جب انسان اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ اور دھیان دے، مثلاً سب سے بڑی عبادت اور ذکر ''نماز'' میں تو اس وقت چونکہ وسوسے اور خیالات بہت پیدا ہوتے ہیں اور اس توجہ میں یکسوئی نہیں رہتی، لہٰذا ان وسوسوں اور خیالات پر قابو پانے اور توجہ الی اللہ پر ذہن کو مرکوز کرنے کے لیے اپنے شیخ اور پیر کی صورت کو تصور میں لے آیا جائے، اس طرح ذہن کی توجہ اللہ تعالیٰ کی طرف یکسو ہو جائے گی؟

یہ ہے مولانا تھانوی کا بتایا ہوا ''تصور شیخ'' کا طریقہ جس کو سیّد احمد نے ''بت پرستی'' سے تعبیر کیا ہے، کیونکہ یہ تصور

---

❶ ص ۱۲۴-۱۲۶، ج ۱

Marfat.com

انسان نے قصداً کیا ہے جو اس کا اختیاری فعل ہے، جبکہ ذہن میں جو خیالات اور وسوسے خود پیدا ہوتے ہیں وہ اختیاری نہیں ہوتے، اس لیے انسان ان کے بارے میں نہ تو جواب دہ ہے اور نہ ان کے وجہ سے اس کی عبادت متاثر ہوتی ہے، پھر بھی ان پر اس طرح قابو پایا جا سکتا ہے کہ عبادت کرنے والا یہ سوچ لے کہ وہ اللہ کو دیکھ رہا ہے اس کی یہ سوچ اس کو بڑی حد تک متوجہ الی اللہ بنا دے گی اور اللہ کو دیکھنا چونکہ ناممکن ہے اس لیے اس یقین کو تازہ کر لے کہ اللہ اس کو دیکھ رہا ہے اس طرح اس کی توجہ میں بڑی حد تک یکسوئی پیدا ہو جائے گی وہیں اس کی حرکات میں خشوع وخضوع پیدا ہو جائے گا۔

لیکن توجہ الی اللہ کے وقت ذہن میں بت -شیخ اور پیر- کے تصور سے توجہ میں یکسوئی تو پیدا ہو سکتی ہے، مگر یہ یکسوئی اسی بُت کی طرف ہوگی نہ کہ اللہ کی طرف، اس لیے کہ اللہ کا خیال تو صوفی کے ذہن میں ہے ہی نہیں فتدبروافہم۔

مولانا تھانوی نے یہ عندیہ دیا کہ جب اس تصور شیخ سے توجہ الی اللہ کی استعداد پیدا ہو جائے تو پھر اس تصور کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی، مگر مولانا مدنی نے اس تصور کو رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کا پسندیدہ فعل قرار دے کر اسے سنت بنا دیا۔ یہ ہے بت پرست اور پیر پرست صوفی ذہن کی کرشمہ سازی۔

موصوف نے حسن بن علی رضی اللہ عنہما سے منسوب روایت کی بنیاد پر یہ دعویٰ کیا ہے کہ ''انہوں نے جناب رسول اللہ ﷺ کی تمثال اور سراپا کو اپنے ماموں ہند بن ابو ہالہ سے بار بار پوچھ کر اپنے ذہن میں جمایا ہے۔''

جس روایت پر اعتماد کر کے ''شیخ الحدیث'' نے اتنا بڑا دعویٰ کیا ہے اولاً تو اس میں ''تمثال اور سراپا'' اور ''بار بار'' کا ذکر نہیں ہے، ثانیاً یہ روایت بے حد ضعیف اور ناقابل اعتبار ہے، میں اس کی استنادی حیثیت بیان کرنے سے پہلے اس طویل روایت کا وہ حصہ نقل کر دینا چاہتا ہوں جو ان کے الفاظ میں ان سے منسوب ہے، فرماتے ہیں:

((سألت خالي، هند بن أبي هالة، و كان وصافا عن حلية النبي ﷺ، و أنا اشتهي أن يصف لي منها شيئا أتعلق به)) ❶

''میں نے اپنے ماموں، ہند بن ابو ہالہ سے، جو وصف بیان کرنے میں ماہر تھے نبی ﷺ کے حلیے کے بارے میں پوچھا درآنحالیکہ میری خواہش تھی کہ وہ اس کا وہ حصہ مجھ سے بیان کر دیں جس سے میرا لگاؤ ہے۔''

کیا اس عبارت سے بار بار نبی ﷺ کی تمثال اور سراپا کے بارے میں سوال کرنے کا مفہوم نکلتا ہے؟

یہ تو اس صورت میں جب یہ روایت صحیح ہوتی، اور اب جبکہ یہ بے حد ضعیف اور ناقابل اعتبار ہے تو یہ ''تصور شیخ'' کے جواز پر کس طرح قابل استدلال ہو سکتی ہے، ایسی ضعیف روایت تو قابل ذکر بھی نہیں ہے جس کا علم ایک ''شیخ الحدیث'' کو تو ہونا چاہیے تھا۔

اس روایت کی استنادی حیثیت بیان کرنے سے پہلے یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ حسن بن علی رضی اللہ عنہما شعبان ۳ ہجری

❶ شمائل ترمذی، نمبر: ۶

Marfat.com

میں پیدا ہوئے تھے اور رسول اللہ ﷺ کی وفات ۱۲ ربیع الاول ۱۱ ہجری میں ہوئی ہے، اس طرح وہ آپ کی وفات کے وقت لگ بھگ ۸ برس کے تھے اور ان کی ہونہاری کے پیش نظر اسی بات کی توقع ہے کہ اس عمر میں ان کے ذہن میں نبی کریم ﷺ کا حلیۂ شریفہ مرتسم رہا ہوگا، ویسے بھی نبی ﷺ حسن بن علی رضی اللہ عنہما کے محبوب نانا تھے اور وہ جلوت وخلوت میں آپ سے چمٹے رہتے تھے۔

امام عبداللہ بن عدی نے الکامل میں اس روایت کی جو سند بیان کی ہے وہ درج ذیل ہے:

ہم سے عمر بن سنان نے بیان کیا، کہا: ہم سے سفیان بن وکیع نے بیان کیا، کہا: ہم سے جُمیع بن عبدالرحمٰن عجلی نے ''املاء'' کراتے ہوئے بیان کیا، کہا: مجھ سے بنوتمیم کے ایک آدمی نے، جو خدیجہ کے شوہر ابوہالہ کی اولاد میں سے تھا اور جس کی کنیت ابوعبداللہ تھی، ابوہالہ سے، اور انہوں نے حسن بن علی سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا، انہوں نے کہا:

''امام ابن عدی نے یہ روایت بیان کرنے سے پہلے امام بخاری کے استاذ ابونعیم فضل بن دُکین کے حوالے سے لکھا ہے کہ ''نبی ﷺ کا وصف بیان کرنے والا جُمیع بن عبدالرحمٰن فاسق تھا۔'' ❶

امام ذہبی نے میزان الاعتدال میں لکھا ہے کہ ''جُمیع بن عبدالرحمٰن عجلی جمیع بن عمر عجلی کے نام سے بھی معروف ہے، انہوں نے اس کے فاسق ہونے پر امام ابونعیم کے قول کا ذکر کرنے کے بعد امام ابوداود کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ مجھے اس کے جھوٹا ہونے کا اندیشہ ہے۔'' امام ابن حبان نے جُمیع کو ثقہ لکھا ہے (مگر جرح وتعدیل کا علم رکھنے والے محدثین کا اس امر پر اتفاق ہے کہ ابن حبان کی جرح اور تضعیف تو حجت ہے، لیکن تنہا ان کی توثیق اور تعدیل نا قابل اعتبار ہے۔'' ❷

حافظ ابن حجر نے تقریب التهذیب میں اس کو ضعیف اور رافضی لکھا ہے۔ ❸

امام ابن ابی حاتم نے الجرح والتعدیل میں اس جُمیع کا ذکر تو کیا ہے، لیکن اپنے والد ابوحاتم کے حوالہ سے اس کی جرح وتعدیل کے بارے میں کچھ نہیں لکھا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ مجہول ہے۔ ❹

رہا ابوعبداللہ جو حسن بن علی رضی اللہ عنہما سے اس روایت کا راوی ہے، اور جس کا لقب تمیمی ہے تو حافظ ابن حجر نے اس کو مجہول بتایا ہے اور لکھا ہے کہ: کہا جاتا ہے کہ: اس کا نام یزید بن عمر تھا۔ ❺

مولانا مدنی نے جو یہ فرمایا ہے کہ: جناب رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ وغیرہم علیہم السلام کی شکل وصورت اور لباس وغیرہ کو صحابہ کرام کے سامنے ذکر فرمایا ہے جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان اکابر کی صورت اور شکل کو مخاطبین کے دماغ میں تمثل اور جگہ دینا ہے۔''

اگر آپ احادیث میں، ابراہیم، موسیٰ، اور عیسیٰ علیہم السلام کے بیان کردہ بعض اوصاف کے بارے میں یہ فرماتے کہ ان

---

❶ ص ۴۱۹-۴۲۰، ج ۲، ترجمہ: ۳۰/۳۵۵۔ ❷ ص ۱۵۲، ج ۲ ❸ ترجمہ: ۹٦٦۔

❹ ص ۴٦۵-۴٦٦، ج ۲، ترجمہ: ۲۲۱۰۔ ❺ التقریب، ص: ۵۷۵، ترجمہ: ۸۲۰٦

Marfat.com

سے مقصود ان کا تعارف ہے اور تعارف کے لیے حُلیے کا بیان ایک خاص اہمیت رکھتا ہے تو آپ کے اس ارشاد پر لب کشائی کی ضرورت نہ پڑتی، مگر آپ نے یہ بات یا استدلال صوفیانہ ''تصور شیخ'' کے بالاتفاق جائز ہونے پر کیا ہے اور بقول آپ کے:

''عرف میں تصور شیخ کسی مقدس اور بزرگ کی صورت کو ذہن میں دھیان لانے اور جمانے کا نام ہے، بالخصوص اپنے مرشد کے چہرے کو خیال میں جمانے اور حاصل کرنے کو تصور شیخ کہتے ہیں۔''

اور مولانا تھانوی کے بقول: ''صرف توجہ الی اللہ کے وقت توجہ الی اللہ کی استعداد پیدا ہونے کے لیے ''تصور شیخ'' مطلوب ہے۔''

آپ کے اور مولانا تھانوی کے ان ارشادات سے یہ بات واضح ہوگئی کہ اصل مقصود صرف اپنے شیخ کے تصور، صورت، سراپا اور تمثال وغیرہ کو ذہن میں جمانے کے لیے درکار ہے، کسی اور کے سراپا اور تمثال کو جمانا نہ مقصود و مطلوب ہی ہے اور نہ صوفیا کے ''عرف'' میں اس کو تصور شیخ کہتے ہی ہیں، اس تناظر میں احادیث میں جن رسولوں کے اوصاف اور سراپے بیان ہوئے ہیں ان سے صوفیانہ ''تصور شیخ'' پر استدلال درست نہیں ہے، کیونکہ اولاً تو تصور شیخ بت پرستی ہے اور نعوذ باللہ رسول اللہ ﷺ بت پرستی کی دعوت نہیں دے سکتے تھے؛ آپ کی بعثت تو بت شکنی اور اقامت توحید کے لیے ہوئی تھی۔

ثانیاً: ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ علیہم السلام اللہ کے نبی اور رسول تو ضرور تھے اور ان کی نبوت و رسالت پر ایمان ارکان ایمان میں سے ایک ہے، مگر ہمارے نبی محمد بن عبداللہ قریشی ہاشمی ﷺ کی بعثت کے بعد وہ سب ہمارے نبی اور رسول نہیں رہے، نیز وہ ہمارے شیخ اور پیر بھی نہیں ہیں، ایسی صورت میں ان کے بیان کردہ اوصاف سے ایک خاص اور صوفیانہ اصطلاح ''تصور شیخ'' پر استدلال کرنا کہاں کی دیانت داری ہے جو دراصل بت پرست اور پیر پرست ذہن کی پیداوار ہے۔

ثالثاً: جن احادیث میں آپ کے ذکر کردہ نبیوں اور رسولوں کے اوصاف بیان ہوئے ہیں انہی میں ملعون ''دجال'' کے اوصاف بھی بیان ہوئے ہیں اور زیادہ تفصیل سے بیان ہوئے ہیں تو کیا آپ کے طرز استدلال سے استفادہ کرتے ہوئے ہم ''حضرتِ دجال'' کو بھی ''مقدس اور بزرگ'' مان لیں؟ چنانچہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی صحیح حدیث میں آیا ہے:

((و رأى الدجال فى صورته رؤيا عين، ليس رؤيا منام، و عيسى، و موسى و إبراهيم صلوات الله عليهم، فسئل النبى ﷺ عن الدجال، فقال: أقمر، هِجَانٌ -قال حسن: قال: رأيته فيلمانيًا أقمر هجانا- إحدى عينيه قائمة كأنها كوكب

Marfat.com

دری، كأن شعر رأسه أغصان شجرة))

"......اور نبی ﷺ نے دجال کو اس کی شکل میں بیدار آنکھوں سے دیکھا، خواب میں نہیں، اور آپ نے عیسیٰ، موسیٰ اور ابراہیم صلوات اللہ علیہم کو دیکھا، نبی ﷺ سے دجال کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا: روشن وسفید، حسن -ابو زیاد- نے کہا: فرمایا: میں نے اس کو بھاری بھرکم اور گورا چٹا دیکھا، اس کی ایک آنکھ ٹھہری ہوئی تھی جیسے وہ روشن تارا ہو اور اس کے بال کسی درخت کی شاخوں کے مانند کھڑے ہوئے......" [1]

مولانا مدنی سے سوال ہے کہ کیا رسول اللہ ﷺ نے دجال کی تصویر بھی اس لیے بیان فرمائی تھی کہ صوفیا کے عرف کے مطابق اس کی تمثال اور سراپا کو ذہن میں جما اور بسا لیا جائے اور مولانا تھانوی کے مطابق عبادات اور اذکار کے موقعوں پر اس ملعون کے تصور سے اللہ کی طرف توجہ میں یکسوئی پیدا کی جائے؟

صوفیا کے اکابر تنقید سے بالاتر ہیں:

صوفیا کی کتابیں، صوفیا کی جماعتِ تبلیغ کے قطب الارشاد مولانا زکریا کی کتاب فضائل اعمال اور اکابر صوفیا کے معمولات کی روشنی میں صوفی شیخ یا صوفی پیر تنقید سے بالاتر ہے، بے چون و چرا اس کی اطاعت و اتباع فرض ہے، اس کے سامنے مردہ بن کر رہنا مرید کے لیے لازمی ہے، اس کے حکم کی فوری تعمیل ضروری ہے اور اس کی منہیات سے اجتناب میں پس و پیش روا نہیں، حتیٰ کہ مرید اپنے پیر کو کوئی مشورہ بھی نہ دے، ورنہ اس کی مریدی باقی نہیں رہے گی اور وہ عقاب اور سرزنش کا مستحق قرار پائے گا۔

ایک مثال:

برصغیر کے صوفیا میں نظام الدین اولیاء ایک بہت بڑا نام ہیں، مولانا علی میاں نے اپنی کتاب تاریخ دعوت و عزیمت میں ان کو سلطان المشائخ کا لقب دیا ہے، یہ بھی بہت بڑا پیر اور شیخ بننے سے پہلے مرحلۂ مریدی اور دور طالب علمی سے گزرے ہیں ان کی مجلسوں میں حاضری دے کر ان کے ملفوظات کو "فوائد الفواد" نامی کتاب کی صورت دینے والے امیر علا سنجری نے ان کے دور طالب علمی کا ایک واقعہ خود انہی کی زبانی نقل کیا ہے جس میں چشم بینا اور حق شناس دل کے لیے بڑی عبرت مضمر ہے اس پر میں تبصرہ تو بعد میں کروں گا پہلے اس واقعہ کا خلاصہ بیان کر دینا چاہتا ہوں، فرماتے ہیں:

ایک مرتبہ میں نے بلا قصد و بے اختیار خدمت مبارک حضرت شیخ الاسلام -شیخ کبیر- میں جرأت کی تھی اور وہ اس طرح کہ ایک روز شیخ الاسلام خانقاہ مبارک میں تشریف فرما تھے اور شیخ شہاب الدین عمر سہروردی کی تصنیف: "عوارف المعارف" سامنے تھی جس میں سے فوائد بیان فرما رہے تھے، یہ نسخہ باریک قلم سے لکھا ہوا اور کرم خوردہ تھا، حضرت کو بوجہ

---

[1] مسند امام احمد: ۳۵۴۶، مسند ابو یعلی: ۲۷۲۰، السنن الکبری للنسائی: ۱۱۲۸۳، ۱۱۲۸۲، کتاب البعث و النشور للبیهقی: ۵۲۶، الدر المنثور للسیوطی: ۱۹۱۶، ۲۳۲۲، ۲۵۰۱، ۲۸۱۹

Marfat.com

کرم خوردگی بیان میں کچھ دشواری ہوتی تھی، میں نے عرض کیا کہ میں نے نسخۂ صحیح بخدمت شیخ نجیب الدین متوکل دیکھا ہے، یہ بات ناگوار خاطر ہوئی اور ارشاد فرمایا، درویش کو فرصت تصحیح نسخۂ سقیم نہیں ہے۔'' یہ الفاظ آپ نے دو تین مرتبہ فرمائے۔ مجھے مطلقاً اس امر کا خیال نہ ہوا کہ آپ یہ میرے حق میں ارشاد فرما رہے ہیں، کیونکہ میں نے وہ بات بطریق حکایت عرض کی تھی نہ کہ بطریق اعتراض مولانا بدرالدین اسحاق نے مجھ سے فرمایا کہ حضرت یہ بات میرے حق میں فرما رہے ہیں، میں یہ سنتے ہی اٹھ کھڑا ہوا اور سر ننگا کر کے حضرت کے قدموں میں گر پڑا اور بہت معذرت کی، مگر اثر نارضامندی دور نہ ہوا، میں بہت پریشان تھا، پھر میں نے اس کا تذکرہ حضرت کے لڑکے شہاب الدین سے کیا جو میرا دوست تھا اس نے ان کی خدمت میں جا کر کچھ عرض کیا کہ وہ خفگی جاتی رہی، پھر دوسرے روز مجھے بلا کر فرمایا: میں تم سے خوش ہوں اور یہ امر تمہارے کمال کے مزید ہونے کے واسطے کیا گیا ہے۔''[1]

ایک غلط توجیہ:

نظام الدین اولیاء نے اپنے پیر اور شیخ کبیر سے ان کے زیر مطالعہ عوارف المعارف کے کرم خوردہ نسخہ کے مقابلے میں ایک صحیح اور واضح نسخہ کی جو اطلاع دی تھی اس میں شیخ پر کسی طرح کے اعتراض کا کوئی شائبہ بھی نہیں تھا، مگر اس مخلصانہ اطلاع سے خود فریبی میں مبتلا صوفی پیر نے یہ محسوس کیا کہ ''ہونہار'' طالب علم اور مرید نے ان کی کم علمی بھانپ لی ہے اس سے ان کی مشیخت اور تقدس کا قصر خود ان کے سر پر گر سکتا ہے جس سے ان کی بناوٹی شہرت خاک میں مل سکتی ہے اور دوسری زبانیں بھی یہ کہہ سکتی ہیں کہ شیخ کبیر تصوف کی ایک کتاب بھی سمجھنے میں دشواری محسوس کرتے ہیں تو وہ قرآن و حدیث اور دوسری دینی اور علمی کتابیں کیا سمجھیں گے؟ یہ چیز ''پیر پرستی'' کے لیے بہت بڑا خطرہ تھی جس کا بروقت ازالہ کر کے شیخ کا ''بھرم'' بحال کرنا اشد ضروری تھا اور چالاک پیر نے نہایت ہوشیاری سے اسے بحال کر لیا کہ سانپ بھی مر گیا اور لاٹھی بھی نہیں ٹوٹی۔''

مولانا علی میاں رحمہ اللہ دوسرے صوفیا میں یہ امتیاز رکھتے تھے کہ ان کو تصوف کی حقیقت بھی معلوم تھی اور اکابر صوفیا کے کردار سے بھی واقف تھے وہ کتاب وسنت کا وسیع اور گہرا علم بھی رکھتے تھے اور سیرت پاک کی عطر بیزیوں سے ان کے مشام جاں معطر بھی تھے اوپر تصور شیخ کے بارے میں ان کی دوٹوک اور واضح رائے بیان کی جا چکی ہے، بایں ہمہ خاندانی خانقاہیت ان کو اظہار حق سے باز رکھتی تھی وہ احمد بن حنبل اور ابن تیمیہ کے جہاد قلم وسیف کے روشن کارناموں سے بھی واقف تھے اور محدثین اور ائمہ اربعہ اور ان کے عالی مقام تلامذہ کی حق گوئیوں کے واقعات بھی ان کو معلوم تھے، وہ اپنی کتاب میں جس کا موضوع دعوت وعزیمت کا بیان ہے، نظام الدین اولیاء اور ان کے پیر شیخ کبیر کے اس واقعہ کی معقول اور مقبول توجیہ کرتے ہوئے یہ بھی کہہ سکتے تھے کہ نظام الدین نے عوارف المعارف کے ایک عمدہ اور واضح نسخہ کی اطلاع

---

[1] ص: ۹۰-۹۱

Marfat.com

دے کر اپنے پیر کی علمی خدمت کی تھی جس پر ان کے پیر کو ان کا شکریہ ادا کرنا چاہیے تھا، مگر افسوس ہے کہ مولانا علی میاں نے اس واقعہ کی صوفیانہ توجیہ کر کے جہاں اپنا قد چھوٹا کر لیا ہے، وہیں قرآن وحدیث سے ثابت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کے واقعہ سے اس واقعہ کو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سرزنش سے نظام الدین اولیا کے پیر کی سرزنش کو تشبیہ دے کر ایک ایسی فحش دینی غلطی کا ارتکاب کیا ہے جس کی کوئی بھی توجیہ قابل قبول نہیں ہے؛ کعب بن مالک رضی اللہ عنہ نے ایک نہایت اہم غزوہ سے پیچھے رہ کر ایک ایسے فریضہ کو ترک کیا تھا جو اسلام کی سب سے بلند چوٹی ہے اس طرح انہوں نے اللہ ورسول کی حکم عدولی کی تھی، رہے نظام الدین تو انہوں نے اللہ ورسول کیا، خود اپنے پیر کی بھی حکم عدولی نہیں کی تھی، بلکہ نہایت نیک نیتی سے ان کو یہ اطلاع دی تھی کہ جس کتاب کے کرم خوردہ نسخہ کو پڑھانے میں ان کو دشواری ہو رہی ہے اس کا ایک بہترین اور خوشخط نسخہ اُن کے بھائی کے پاس موجود ہے جس کو ان سے عاریۃً ہی سہی لیا جا سکتا ہے اس اطلاع یا مشورہ پر وہ اپنے شیخ کے شکریے کے مستحق تھے، نہ کہ عتاب کے، بہر حال مولانا علی میاں کا حاشیہ پڑھیے اور صوفیانہ ''کج فکری'' پر سر دھنیے:

''یہاں پر کوئی یہ شبہ نہ کرے کہ شیخ کامل نے تلمیذ رشید کی ایک معمولی سی اطلاع اور معروض پر اتنی برافروختگی اور آزردگی کا اظہار فرمایا، اس لیے کہ جیسا کہ خود شیخ کے جملہ سے معلوم ہوتا ہے، یہ سب آزردگی یہ تکلف طالب رشید کی ترقیٔ باطنی اور خود شکنی کے لیے ہے۔ شیخ مجتہد ومخلص اس کے لیے اپنے اجتہاد سے مختلف ذرائع استعمال کر سکتا ہے اور اس کے لیے کسی تقریب وموقع کا بھی انتخاب کر سکتا ہے۔ حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کے واقعہ اور ان کو اس کوتاہی پر جو ان سے بلا ارادہ سرزد ہوئی تھی جو سرزنش کی گئی اور ان کے ساتھ جو رویہ اختیار کیا گیا اور کرایا گیا اس سے بھی روشنی اور رہنمائی حاصل کی جا سکتی ہے۔'' ❶

سلطان المشائخ نہیں پیر کا بندہ:

مولانا علی میاں نے اسی پر بس نہیں کیا، کاش وہ اسی پر بس کرتے اور ان کا بھرم قائم رہتا، مگر ان کے خانقاہی ذہن نے اس کو ناکافی تصور کیا اور انہوں نے مناظر احسن گیلانی کا اقتباس نقل کر کے اپنی اس کتاب کو داغ دار بنا دیا جس میں انہوں نے انسانوں کو انسانوں کا بندہ بنا دینے کو عزیمت کی دعوت سے تعبیر کیا ہے اور گیلانی کے ''ارشاد'' کو صحیح قرار دیا ہے؛ گیلانی تحریر فرماتے ہیں:

''صادق وکاذب طلب میں امتیاز کا وقت آ گیا دنیا دیکھ رہی تھی اب مولانا نظام الدین کا فیصلہ کیا ہوتا ہے؟ کیا مولانا بحاث اور محفل شکن ہی کے لقب کو لے کر دنیا سے چلے جائیں گے، جیسے لاکھوں ہی بحاث ومحفل شکن آئے اور چلے گئے، یا مشائخ کے سلطان کا جو تخت خالی ہے اس پر قدم رکھنے کی ہمت کرتے ہیں......''

''ظرف کے چھوٹے ہوتے تو کہہ سکتے تھے کہ بھلا میرا کیا قصور میں نے غلطی ہی کیا کی ہے، ایک اچھے نسخہ کا علم تھا

---

❶ ص: ۶۳-۶۴، ج ۳

Marfat.com

اس کا اظہار کیا تھا، پھر اس پر اتنی برہمی کے کیا معنی؟ یہی شوشہ اگر سامنے آ جاتا وہی لمبی لکیر بن سکتا تھا...... بلکہ دین کی آڑ لے کر سلطان جی چاہتے تو ''اسوۂ حسنۂ نبویہ'' کے معیار پر شیخ کبیر کے اس طرز عمل کو کھوٹا بتا کر لوگوں کو دکھا سکتے تھے، لیکن ظاہر ہے کہ وہ اپنا علاج کرانے کے لیے آئے تھے شیخ کبیر کی کمزوریوں کا علاج ''اجودھن'' آنے سے مقصود نہ تھا۔ اس کو طے کر چکے تھے کہ یہ معالج طبیب ہے اس کے تنقید کا حق ان کے لیے باقی ہی کب رہا تھا۔'' [1]

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو اپنا بندہ بنایا ہے، نظام الدین اولیاء کی طلب صادق جب ہوتی جب وہ اپنے جیسے غلاموں کی غلامی اور بندگی کا طوق اپنی گردن سے اتار کر لوگوں کو اللہ کی بندگی کی دعوت دینے والے بن جاتے اس صورت میں ان سے مشائخ کا تخت تو چھن سکتا تھا، مگر ان کا نام ''عباد الرحمٰن'' کی فہرست میں شامل ہو جاتا، جو سرخروئی اور کامیابی کی معراج ہے۔

دین آڑ نہیں ہے اور ''اسوۂ حسنہ نبویہ'' معانی سے خالی صرف ایک عنوان نہیں ہے، بلکہ ایک طالب صادق کا واحد منہج حیات ہے، چونکہ اہل تصوف اسلام ہی کا نام لیتے ہیں اس لیے عرض ہے کہ جو منہج حیات، سلوک کی جو راہ اور تعلیم و تربیت کا جو طریقہ بھی ''اسوہ حسنہ'' کا ترجمان نہ ہو وہ نا قابل قبول ہے اور جو سلطان المشائخ بھی مکمل طور پر ''سنت نبویہ'' کا پیرو نہ ہو وہ اللہ کا نہیں انسانوں کا بندہ ہے اور جو کتاب وسنت کی تعلیمات کا پیرو اور متبع نہ ہو وہ خود مریض ہے حاذق طبیب نہیں وہ دوسروں کا کیا علاج کر سکتا ہے؟

دراصل معمولی سی تنقید، معمولی سا مشورہ، اور معمولی سی ہونہاری کتنے ''قدس سرہ'' اور کتنے ''سلاطین المشائخ'' کے مبلغ علم، صلاح وتقویٰ اور استقامت علی الحق کے بھانڈے پھوڑ دیتی ہے، اسی وجہ سے خانقاہوں میں شیخ کے پجاری اور بندے اس کے اشاروں پر ناچتے ہیں، اس طرح مسند مشیخت قائم ہے۔

سیرت پاک کا ایک تابناک واقعہ:

اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی اور رسول کو غیر مشروط مطاع اور متبوع بنایا ہے، آپ کی اطاعت کا حکم ہمیشہ اپنی اطاعت کے ساتھ دیا ہے، آپ کے ہر حکم اور فیصلے پر سر تسلیم خم کر دینے کا حکم دیا ہے اور آپ کی سیرت پاک کو اہل ایمان کے لیے اسوۂ حسنہ اور نمونۂ تقلید بنایا ہے، ایک نبی اور رسول ہونے کی حیثیت سے آپ کا کوئی قول یا فعل محل بحث نہیں، بلکہ محل طاعت واتباع تھا، پھر بھی رحمۃ للعالمین ﷺ اپنے اصحاب کے ساتھ وہ معاملہ نہیں کرتے تھے جو آقا غلاموں کے ساتھ اور بادشاہ رعایا کے ساتھ کرتا ہے، جو لوگ آپ کے دست مبارک پر ایمان لائے تھے ان کو غلام اور خادم کا نام نہیں، اصحاب کا نام دیا گیا تھا۔

نبی کریم ﷺ کے کسی قول یا فعل پر بصورت سوال یا اعتراض کچھ بولنے کی اجازت کسی کو بھی نہیں تھی، اس کے باوجود صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آپ سے ایسے استفسارات بھی کرتے تھے جو ''خانقاہی شریعت'' میں شیخ کے ساتھ گستاخی ہونے کے ناطے قابل سرزنش اور قابل عقاب ہیں۔

[1] ص ۴۵-۶۴، ج ۳

Marfat.com

عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بیٹھ کر نماز پڑھنے والے کی نماز کے بارے میں پوچھا تو آپ نے فرمایا:

((إن صلى قائما فهو أفضل، و من صلى قاعدا فله نصف أجر القائم، و من صلى نائما فله نصف أجر القاعد)) ❶

"اگر وہ کھڑے ہو کر پڑھے تو زیادہ بہتر ہے اور جو بیٹھ کر نماز پڑھے تو اسے کھڑے ہو کر پڑھنے والے کے ثواب سے آدھا ثواب ملے گا اور جو لیٹ کر پڑھے تو اسے بیٹھ کر پڑھنے والے سے آدھا ثواب ملے گا۔"

عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، کہتے ہیں:

((حدثت أن رسول الله ﷺ قال: صلاة الرجل قاعدا نصف الصلوة، قال: فأتيته فوجدته يصلي جالسا، فوضعت يدي على رأسه، فقال: مالك يا عبدالله بن عمرو؟ قلت: حُدثت يا رسول الله! أنك قلت: صلوة الرجل قاعدا على نصف الصلوة، و أنت تصلي قاعدا! قال اجل، و لكني لست كأحد منكم)) ❷

"مجھ سے بیان کیا گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ بیٹھے ہوئے کی نماز آدھی نماز ہے۔ کہتے ہیں: میں آپ کی خدمت میں آیا تو آپ کو بیٹھ کر نماز پڑھتے ہوئے پایا، تو میں نے اپنا ہاتھ آپ کے سر مبارک پر رکھ دیا، اس پر آپ نے فرمایا: اے عبداللہ بن عمر! کیا بات ہے؟ میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! مجھ سے بیان کیا گیا ہے کہ آپ نے فرمایا ہے: بیٹھے ہوئے کی نماز آدھی نماز کے برابر ہے، جبکہ آپ بیٹھ کر پڑھ رہے ہیں؟! فرمایا: صحیح ہے، لیکن میں تم میں سے کسی کی طرح نہیں ہوں۔"

وجہ استدلال:

اس حدیث سے وجہ استدلال یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کی رو سے جو شخص نفل نماز بلا کسی عذر کے بیٹھ کر پڑھے تو جائز ہے، مگر اس کی یہ نماز اپنے اجر و ثواب میں کھڑے ہو کر پڑھنے والے کی نماز سے آدھی شمار کی جائے گی، اور یہ امر مسلم اور ناقابل بحث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم افضل ترین عمل کرتے تھے، اسی وجہ سے عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما نے جب آپ کو بیٹھ کر نماز پڑھتے ہوئے دیکھا تو انہوں نے از راہ تعجب آپ کے سر مبارک پر اپنا ہاتھ رکھ دیا اور آپ کے اس کا سبب دریافت کرنے پر عرض کیا کہ مجھے تو آپ کی یہ حدیث پہنچی ہے کہ بیٹھ کر پڑھنے والے کی نماز اپنے اجر و ثواب میں آدھی شمار ہوتی ہے اور آپ خود یہی عمل کر رہے ہیں۔ اس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا: تمہیں

❶ بخاری: ۱۱۱۵۔ ابوداود: ۹۵۱۔ ترمذی: ۳۷۱۔ نسائی: ۱۶۵۹۔ ابن ماجہ: ۱۲۳۱۔

❷ مسلم: ۷۳۵۔ مسند امام احمد: ۶۵۱۲، ۶۸۹۴۔ السنن الکبری للنسائی: ۱۳۶۱۔ ابوداود: ۹۵۰۔ بغوی: ۹۸۴۔ المعجم الاوسط للطبرانی: ۸۷۴۔ والصغیر: ۹۵۴

Marfat.com

میری جو حدیث پہنچی ہے وہ صحیح ہے، مگر میں تم لوگوں کی طرح نہیں ہوں، میری یہ خصوصیت ہے کہ اگر میں قدرت کے باوجود کھڑے ہو کر نماز پڑھنے کے بجائے بیٹھ کر پڑھوں، پھر بھی اس کا اجر کم نہیں ہوتا۔''

غور فرمایئے افضل الرسل، خیر البشر اور سیّد اولاد آدم ﷺ اپنے قول مبارک سے ایک شرعی حکم فیان فرماتے ہیں، پھر جو عمل کرتے ہیں وہ اس قول مبارک کے خلاف ہوتا ہے اور یہ چیز ایک صحابی کے لیے باعث تشویش بن جاتی ہے تو وہ بلا کسی خوف و خطر کے آپ سے اس اختلاف کا سبب دریافت کرتا ہے اور صاحب ''خلق عظیم'' اس کی اس حرکت پر برافروختہ نہیں ہوتا، اور اس کو گستاخی قرار دے کر اس کو کوئی سزا نہیں دیتا، بلکہ نہایت پیار و محبت سے اس کو یہ بتا دیتا ہے کہ تمہیں ملنے والی میری حدیث تو صحیح ہے، مگر اس کا حکم میرے اوپر منطبق نہیں ہوتا۔

اس حدیث کو اپنے سامنے رکھیے اور اکابر صوفیا کی ''استعبادی'' حرکتوں کا جائزہ لیجیے تو آپ کو ان مدعیان صلاح و تقویٰ کی ان حرکتوں اور سیرت پاک اور اسوۂ حسنہ کے درمیان وسیع سمندر نظر آئے گا۔ یہ اکابر، جن کے تصور کو ذہن میں جمانے اور بسانے کو دین اور توجہ الی اللہ میں یکسوئی پیدا کرنے کا اہم ذریعہ قرار دے لیا گیا ہے اپنے مریدوں سے اپنی عبادت اور پرستش کراتے ہیں، اپنے مشرکانہ اقوال و افعال کو دین اور شریعت کی طرح واجب الاتباع قرار دیتے ہیں اور قرآن و حدیث کی نصوص سے متصادم اپنی جھوٹی کرامتوں، اوراد و اذکار کے اپنے من گھڑت طریقوں اور فضائل و مناقب کی جھوٹی اور خود ساختہ روایتوں کی ان سے تصدیق کرواتے ہیں، اور ندوی اور گیلانی جیسے لوگ ان کے ان اعمال کو ''تجدید و احیائے دین'' سے تعبیر کرتے ہیں!!

ذکر ایک معشوق الٰہی کا:

نظام الدین اولیاء، جن کو مولانا ندوی اور مولانا گیلانی نے ''سلطان المشائخ'' کا لقب دیا ہے ان کے ملفوظات کے مجموعہ ''فوائد الفواد'' کی اکتیسویں مجلس کی دوسری حکایت امیر علا سنجری نے ''سلطان المشائخ'' کی زبانی ان الفاظ میں نقل کیا ہے:

> ''آپ نے فرمایا کہ شیخ احمد معشوق طوسی ایک مرتبہ جاڑے کے چلے میں اپنے مقام سے باہر نکلے دریا کو گئے، وسط دریا میں کھڑے ہو کر مناجات کی کہ الٰہی جب تک مجھے یہ معلوم نہ ہو جائے کہ میں کون ہوں میں پانی سے باہر نہ نکلوں گا اسی وقت یہ آواز سنی کہ تم وہ عالی درجہ شخص ہو کہ تمہاری شفاعت سے بروز حشر میں ہزارہا اشخاص خطا کار بخش دوں گا، اور وہ بہشت میں جائیں گے۔ آپ نے جواب دیا کہ مجھے اس سے صبر نہیں آیا۔ دوبارہ آواز آئی کہ تم وہ شخص ہو کہ تمہاری خاطر و شفاعت سے ہزار اشخاص دوزخ سے خلاص کروں گا۔ آپ نے فرمایا: مجھے اس امر سے کچھ غرض نہیں۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ تو مجھے بتلا دے کہ میں کون ہوں، اسی وقت آواز آئی کہ ہم نے حکم دیا کہ جس قدر درویش و عارف ہیں وہ میرے عاشق ہیں

Marfat.com

اور تو میرا معشوق ہے۔''

خواجہ احمد یہ سنتے ہی پانی سے نکلے اس کے بعد جو شخص آپ سے ''ملاقی'' ہوتا تھا سلام بالفاظ: السلام علیک یا احمد معشوق'' کرتا تھا۔''

حضرت خواجہ ذکر اللہ بالخیر-نظام الدین- یہ بیان فرما کر زور سے رو پڑے۔ حاضرین میں سے کسی شخص نے عرض کیا کہ وہ نماز نہیں پڑھتے تھے'' آپ نے ارشاد فرمایا: ہاں یہ امر صحیح ہے، جس وقت لوگوں نے ان سے نماز پڑھنے کے بارے میں بہت کہا، آپ نے قبول فرمایا، اور کہا کہ سورۂ فاتحہ نہ پڑھوں گا۔ علماء نے جواب دیا کہ بغیر اس کے نماز نہ ہو گی، آپ نے فرمایا: خیر إیاك نعبد و ایاك نستعین نہ پڑھوں گا، کہا گیا کہ یہ آیت بھی پڑھنی ہو گی۔''

''القصہ بعد گفتگوئے بسیار نماز پڑھنے کھڑے ہوئے جب إیاك نعبد و ایاك نستعین پڑھا، ہر بنِ مو سے خون جاری ہوا، اس وقت حاضرین سے مخاطب ہو کر ارشاد فرمایا: میں ''زن حائض'' ہوں، میرے واسطے نماز روا نہیں ہے۔ [1]

مولانا علی میاں نے اپنی کتاب تاریخ دعوت وعزیمت کے مقدمہ میں فوائد الفواد کی بڑی تعریف کی ہے، مجھے یقین ہے کہ انہوں نے یہ کتاب نہیں پڑھی ہو گی اور کاش نہ پڑھی ہو اس طرح اس کی تعریف سنی سنائی قرار دے کر نظر انداز کر دی جائے گی اور اگر انہوں نے پڑھ کر اس کی تعریف کی ہے تو وہ باطل کے مدافع قرار پائیں گے، میں نے ان کے حق میں یہ بڑی ہلکی تعبیر اختیار کی ہے ورنہ فوائد الفواد ''ظلمات بعضہا فوق بعض'' سے عبارت ہے اور اس سے میں نے جو یہ حکایت نقل کی ہے وہ اس کتاب کے مندرجات کے کفر و شرک اور گمراہ کن ہونے پر واضح دلیل ہے۔

۱۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب عزیز میں اپنے نبی و رسول اور صاحب شفاعت کبریٰ سے بھی یہ وعدہ نہیں کیا ہے کہ وہ آپ کی شفاعت سے ہزاروں خطا کاروں کی مغفرت فرما دے گا تو ایک بد عقیدہ اور بد عمل سے اس کا وعدہ کیسے کر لیا۔

۲۔ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کے علاوہ اپنے کسی نبی اور رسول سے براہ راست کلام نہیں کیا ہے جس پر قرآن صریح ہے اور ان کو اپنی ہم کلامی کا شرف صرف ایک بار بخشا ہے۔

۳۔ شیخ احمد معشوق نے کوئی آواز سنی ہو گی ویسے صوفیا کی بیان کردہ ۹۰ فیصد حکایتیں جھوٹی ہوتی ہیں جس دور میں تصوف نے عقائدی اور کلامی صورت نہیں اختیار کی تھی اس دور کے ارباب زہد و توکل بھی دروغ گوئی اور کذب بیانی میں مشہور تھے تو متاخرین جن کی خانقاہیں اسی کذب بیانی پر قائم ہیں اس سے احتراز کس طرح کر سکتے ہیں مذکورہ صوفی کے کردار کی روشنی میں بشرط صحت ان کو شیطان نے آواز دی ہو گی اور اس طرح کا اور ایسے شخص سے یہ وعدہ شیطان نے کیا ہو گا۔

---

[1] ص: ۳۹۲-۳۹۳

Marfat.com

۴۔ قرآن و حدیث میں عشق، عاشق اور معشوق کے الفاظ نہیں آئے ہیں، بلکہ ان کو صوفیا کی کتابوں اور ایرانی ادب و شعر کے ذریعہ شہرت ملی ہے اور ایران کے شعرا اور ادبا سے عربوں کے اختلاط کے نتیجے میں عربی ادب و شعر میں ان الفاظ کا استعمال شروع ہوا ہے، پھر صوفیا کے حلقوں میں ان کا سب سے زیادہ رواج ہوا اور یہ ان کی شناخت بن گئے۔

۵۔ ایک مرد کا اپنے کو ''زن حائض'' کہنا اور ادائے نماز کا اپنے آپ کو غیر مکلّف قرار دینا صوفیا ہی کی زبانوں سے بھلا لگ سکتا ہے، اور انہی کے حلقوں میں فضیلت ہو سکتا ہے۔

۶۔ مذکورہ جھوٹی حکایت کی رو سے شخص مذکور نے جو آواز سنی تھی اس میں صاحب آواز نے اس کو اپنا معشوق کہا تھا، اس وقت وہاں کوئی نہیں تھا، مگر دریا سے اس کے باہر نکلنے کے بعد جو بھی اس سے ملتا اس کو السلام علیک یا احمد معشوق' کہہ کر سلام کرتا فوراً ان تمام لوگوں کو اس کی معشوقیت کی خبر کیسے ہو گئی؟

۷۔ کس بنیاد پر ایک بدبخت سے متعلق اس جھوٹی حکایت کی لوگوں نے تصدیق کر دی اور تو اور کیا سلطان المشائخ کے علم میں بھی شفاعت سے متعلقہ آیتیں نہیں تھیں؟

اہل حق سے عداوت و دشمنی:

یوں تو جھوٹی روایت: اختلاف اُمتی رحمۃ'' کی ترویج کرنے والوں میں اہل تصوف پیش پیش رہے ہیں، مگر تصوف سے معمولی اختلاف رکھنے والوں اور اتباع سنت اور عمل بالسنۃ کو مسلک حیات بنانے والوں سے عداوت و دشمنی اور کینہ و بغض رکھنے والوں میں سرفہرست بھی یہی صوفیا رہے ہیں، جبکہ اس جھوٹی روایت کا تقاضا ہے کہ اس کو صحیح ماننے والے اور اختلاف کو رحمت قرار دینے والے اپنے باطل عقائد اور اعمال سے اختلاف رکھنے والوں کو برداشت کریں اور انہیں کتاب وسنت پر عمل کرنے دیں۔

۱۸۶۰ء سے ۱۹۰۰ء تک کا زمانہ مکہ مکرمہ میں اہل توحید کے لیے بڑا پر آشوب تھا، ان دنوں البلد الحرام میں توحید کے پانچ بڑے دشمنوں: شیخ احمد زینی دحلان متوفی ۱۸۸۲ء، مولانا ابوالکلام آزاد کے والد مولانا خیر الدین متوفی ۱۹۰۸ء، حاجی امداد اللہ متوفی ۱۸۹۹ء، مولانا رحمت اللہ کیرانوی متوفی ۱۸۹۱ء اور قبوری جماعت کے پیشوا مولانا فضل رسول بدایوانی کے صاحب زادے مولانا عبدالقادر بدایونی کا بڑا اثر و رسوخ تھا اور اہل توحید کی مخالفت میں یہ پانچوں باہم شیر وشکر تھے اور ہر کتاب وسنت پر عمل کرنے والے پر وہابی کا الزام لگا کر اس کا جینا دوبھر بنائے ہوئے تھے، چونکہ عثمانی حکام خود شیخ محمد بن عبدالوہاب متوفی ۱۷۹۲ء کی دعوت توحید سے شدید پرخاش رکھتے تھے، اس لیے یہ پانچوں جس شخص پر وہابیت کا الزام لگا کر اس کی شکایت عثمانی حکام سے کر دیتے اس کو فوراً گرفتار کر لیا جاتا اور بعد از تعذیب اس کو مکہ مکرمہ سے نکال دیا جاتا۔

ا۔ پہلا واقعہ:

صالحین کی قبروں کی زیارت کی ترغیب میں ضعیف اور جھوٹی روایتیں بھی نہیں ہیں، بلکہ جن صحیح حدیثوں میں صالحین

Marfat.com

کی قبروں کو سجدہ گاہ بنانے والوں کو ملعون اور بدترین مخلوق قرار دیا گیا ہے ان کے فحوا سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ مخصوص طور پر صلحاء کی قبروں کی زیارت ممنوع ہے، الا یہ کہ زائر توحید شناس ہو اور صرف موت اور آخرت کی یاد تازہ کرنے کی غرض سے عام قبروں کی زیارت کے ضمن میں ان کی بھی زیارت کر لے تو یہ صرف جائز ہے۔

رہی نبی کریم ﷺ کی قبر مبارک کی زیارت تو اس کی فضیلت میں کوئی ایک بھی روایت صحیح نہیں ہے، اس سے متعلق جتنی بھی روایتیں لوگوں میں پھیلی ہوئی اور کتابوں میں متداول ہیں ان کی اکثریت موضوع اور منکر ہے، اور جو سند کے اعتبار سے ضعیف ہیں وہ بھی متن کے اعتبار سے منکر ہیں، ابتدائی تین صدیوں میں علمائے امت اور فقہاء کے درمیان یہ متعارف نہیں تھیں یہ دراصل صوفی ذہن کی پیداوار ہیں، جن کو رواج دینے اور پھیلانے میں غالی اور متعصب صوفی تقی الدین سبکی متوفی ۷۵٦ھ کا زبردست ہاتھ ہے۔

۱۸۸۰ء اور ۱۸۸۳ء کے درمیانی زمانے میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے ان پانچوں ''پیشوایان امت'' کے مکروہ چہرے سے صلاح وتقویٰ کا مصنوعی نقاب الٹ دیا اس لرزہ خیز واقعہ کی تفصیلات مولانا آزاد رحمہ اللہ نے اپنی کتاب: ''آزاد کی کہانی آزاد کی زبانی'' میں ثبت کر دی ہیں جو اس واقعہ کی سب سے زیادہ صحیح تفصیلات ہیں اس لیے کہ ان کا ماخذ مولانا آزاد کے والد مولانا خیر الدین ہیں جو اس اہم اور عبرت ناک واقعہ کے بنیادی کردار تھے اور اس کی زد براہ راست ان کی ذات پر پڑتی ہے اور کوئی بھی شخص اپنے باپ کی منقبت میں تو غلط بیانی یا مبالغہ آرائی کر سکتا ہے، مگر مذمت میں نہیں کر سکتا، اسی طرح کوئی شخص اپنی تعریف اور منقبت میں تو غلط بیانی اور مبالغہ آرائی کر سکتا ہے، مگر خود ہی اپنی مذمت نہیں کر سکتا اور اپنی طرف ایسے اعمال منسوب نہیں کر سکتا جن سے اس کی بدنامی ہوتی ہو، خاص طور پر صوفیا جن کی خود ساختہ بڑائی، عظمت اور تقدس من گھڑت حکایتوں پر مبنی ہے اور جن کی صحیح نفسیات اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد مبارک میں بیان کر دی گئی ہے:

﴿لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَفْرَحُوْنَ بِمَآ اَتَوْا وَّ يُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ﴾ (آل عمران : ۱۸۸)

''تم ان لوگوں کو، جو اپنے اعمال پر خوش ہوتے ہیں اور انہیں یہ پسند ہے کہ ان اعمال پر ان کی تعریف کی جائے جو انہوں نے نہیں کیے ہیں عذاب سے محفوظ مت خیال کرو اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔''

چنانچہ ایک طرف تو صوفیا کی پوری زندگی شرک و بدعت اور اس کی دعوت کے محور کے گرد گھومتی ہے اور انہوں نے خود اور ان کے پیروؤں نے ان کو الوہیت اور ربوبیت کے مقام پر بٹھا دیا ہے اور یہ صوفیا اور ان کے پیرو اپنے ان مشرکانہ اعمال پر خوش ہیں اور اپنی مجلسوں اور کتابوں میں ان کے تذکرے اس مقصد سے کرتے ہیں کہ ان کی تعریف کی جائے اور بیان کیا جائے کہ فلاں حضرت تو صلاح وتقویٰ کے مقام بلند پر فائز تھے، فلاں بزرگ عالم الغیب اور امور

Marfat.com

کائنات میں تصرف کے مالک تھے، فلاں کے ہاتھ میں بیماریوں سے شفا، مصیبتوں سے نجات اور لوگوں کے فقر ومحتاجی کو دولت وتونگری میں بدل دینے کا اختیار تھا، اور یہ اپنے مریدوں کو روز حشر میں حساب کتاب کے بغیر جنت میں داخل کر دیں گے۔

مولانا آزاد فرماتے ہیں:

''والد مرحوم کے سفر قسطنطنیہ سے پہلے مکہ معظمہ میں ایک نہایت اہم واقعہ پیش آیا، جسے افسوس ہے، کسی نے بھی قلم بند نہیں کیا ہے، حالانکہ وہ نہایت عبرت انگیز اور تاریخی ہے۔ اس زمانے میں ہندوستانی علمائے ''وہابیہ'' کی جو جماعت وہاں تھی اس میں مولوی محمد انصاری سہارنپوری، مفتی محمد مراد بنگالی، شیخ عبداللطیف اور قاضی محمد سلیمان جونا گڑھی بھی تھے۔

والد مرحوم نے شریف-مکہ-کو ان لوگوں کے برخلاف سخت برانگیختہ کر دیا۔

اتفاق سے اسی زمانے میں یہ واقعہ پیش آیا کہ قاضی محمد مراد طائف گئے، جب واپس آئے، تو شیخ عبداللہ مَرداد امام حنفی ان سے ملنے گئے اور دستور کے مطابق سلام کے بعد ''زیارت مقبول'' کہا، جس سے مراد حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی قبر کی زیارت تھی۔ قاضی صاحب نے جواب دیا: میں کسی قبر کی زیارت کے لیے نہیں گیا تھا، بلکہ محض تفریح کے لیے گیا تھا۔'' اس بات کا بہت چرچا ہوا اور شریف تک پہنچائی گئی اور اس کے یہ معنی ٹھہرائے گئے کہ یہ لوگ بھی محمد بن عبدالوہاب کی طرح قبور صالحین کی زیارت کے مخالف ہیں۔

نتیجہ یہ نکلا کہ چند دنوں کے بعد اچانک اس جماعت کے اکتیس آدمی گرفتار کر لیے گئے، جن میں مولانا رحمت اللہ، صاحب ''اظہار الحق'' بھی تھے، لیکن یہ بعد کو رہا کر دیے گئے، کیونکہ انہوں نے اپنی حنفیت کے بہت واضح دلائل پیش کر دیے تھے۔

شریف نے ایک مجلس مقرر کی اور والد مرحوم سے کہا: ان لوگوں کے عقائد کی تحقیقات کریں ان پر یہ الزام لگایا گیا تھا کہ وہ محمد بن عبدالوہاب کی جماعت سے ہیں، انہوں نے اس سے انکار کیا، اس پر والد مرحوم نے سترہ سوال مرتب کر کے پیش کیے، جن میں:

وجوب تقلید شخصی، استحباب قیام، زیارت قبور کے لیے سفر اور استمداد وتوسل بالصالحین وغیرہ سوالات تھے۔

افسوس ہے اس موقعہ پر بجز تین شخصوں کے اور سب نے تقیہ کیا اور کسی نے بھی استقامت نہ دکھائی، مولوی محمد انصاری، مولوی عبداللطیف اور قاضی محمد مراد نے بڑی جرأت و دلیری کے ساتھ اپنے صحیح عقائد پیش کر دیے اور کہا: اگر قرآن وسنت پر عمل کرنا اور بدعت سے اجتناب کرنا جرم ہے، تو ہم مجرم ہیں اور ہر طرح کی سزا برداشت کرنے کو تیار ہیں۔

Marfat.com

جدہ میں برٹش قونصل کی مداخلت سے یہ لوگ مجبوراً چھوڑ دیے گئے، لیکن انہیں یہ سزا دی گئی کہ سب کے سب خارج البلد کر دیے گئے اور حجاز کی پولیس نے انہیں جدے میں لا کر برٹش قونصل کے حوالے کر دیا۔

جدے سے یہ لوگ جہاز میں بٹھا کر بمبئی بھیجے گئے، لیکن ہندوستان میں ان پر یہ بلا آئی کہ ان کے مخالفین نے یہ کارروائی کی کہ وہاں کے تمام ''نقاط'' کو یہ اطلاع بھیج دی کہ یہ لوگ مخذول اور مردود کر کے حرم سے خارج کر دیے گئے ہیں۔

بمبئی میں قاضی سلیمان کو جب معلوم ہو گیا کہ وہ گرفتار کیے جائے والے ہیں تو اپنے بعض دوستوں کی مدد سے بغداد چلے گئے، مگر قاضی محمد مراد کسی طرح بھی نہ بچ سکے اور کلکتہ پہنچتے ہی گرفتار ہو گئے اور جیل میں سخت تکالیف کے صدمے سے انتقال کر گئے۔''❶

مولانا آزاد نے یہ تو صراحت کر دی ہے کہ قاضی محمد مراد بنگالی رحمہ اللہ کی سفر طائف سے واپسی کے بعد جن اکتیس آدمیوں کو گرفتار کیا گیا تھا ان کے عقائد کی تحقیقات کے لیے شریف مکہ نے ایک مجلس مقرر کی تھی جس کا صدر اس نے ان کے والد مولانا خیر الدین کو بنایا تھا، مگر انہوں نے یہ نہیں لکھا ہے کہ اس مجلس کے ممبران کون تھے، البتہ انہوں نے بقول اپنے ''علماء وہابیہ'' کے تذکرہ سے پہلے کے فقرہ میں یہ لکھا ہے کہ ''جو ہندوستانی علماء اس وقت مکہ میں مقیم تھے انہوں نے علمائے حجاز اور شریف کو مطلع کیا تھا کہ یہاں مکہ میں ایک ایسی جماعت مقیم ہے جو باعتبار عقائد محمد بن عبدالوہاب کی جماعت ہے اور ہندوستان سے خاص اس لیے آئی ہے کہ یہاں اپنی تحریک پھیلائے۔''❷

اور یہ معلوم ہے اور آنے والے دوسرے واقعہ سے مزید معلوم ہو گا کہ اہل توحید کے علاوہ جو ہندوستانی علماء اس وقت مکہ معظمہ میں مقیم تھے ان میں سرفہرست مولانا خیر الدین، مولانا عبدالقادر بدایونی، مولانا رحمت اللہ کیرانوی اور حاجی امداد اللہ تھے، لہٰذا یہی اس مجلس کے ممبر زرہے ہوں گے۔

تبصرہ:

قاضی محمد مراد بنگالی نے، حنفی امام عبداللہ ترداد کے ''زیارت مقبول'' کہنے پر جو فرمایا تھا، وہ صرف یہ تھا کہ: میں کسی قبر کی زیارت کے لیے نہیں گیا تھا، بلکہ محض تفریح کے لیے گیا تھا۔'' تو ان کا یہ ارشاد کتاب وسنت کی کس نص کے خلاف تھا کہ اس پر اتنا بڑا طوفان کھڑا کیا گیا اور ''البلد الحرام'' کی حرمت پامال کی گئی، پھر خیر الدین کی صدارت اور مذکورہ قبر پرست جماعت کی رکنیت میں جو مجلس تشکیل دی گئی اور اس نے ان حق پرستوں کے سامنے جو سوالات رکھے، یعنی: وجوب تقلید شخصی، استحباب قیام، زیارت قبور کے لیے سفر اور استمداد و توسل۔ توصل۔ بالصالحین وغیرہ وہ قرآن و حدیث کی کس نص، بلکہ ائمہ اربعہ میں سے کسی بھی امام کے کس قول کی رو سے اسلامی عقائد شمار ہوتے ہیں، عقائد کی بات تو بہت بڑی

❶ ص: ۷۰، ۷۳، ۷۴، ۷۵، ۷۶ ❷ ص: ۷۳

Marfat.com

ہے ان کو تو جائز بھی ثابت نہیں کیا جا سکتا، پھر ان حق پرستوں کو کس جرم کی سزا دی گئی؟ کیا اس واقعہ پر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد صادق نہیں آتا:

﴿وَمَا نَقَمُوا مِنْهُمْ إِلَّا أَنْ يُؤْمِنُوا بِاللَّهِ الْعَزِيزِ الْحَمِيدِ﴾ (البروج: ۸)

''اور انہوں نے تو ان سے صرف اس کا بدلہ لیا کہ وہ سب پر غالب، لائق تعریف اللہ پر ایمان رکھتے ہیں۔''

اس صالح، موحد اور پاکباز جماعت نے افترا پردازوں اور قبر پرستوں کی تحقیقات کے دوران جو یہ فرمایا تھا کہ:

''اگر قرآن و سنت پر عمل کرنا اور بدعت سے اجتناب کرنا جرم ہے، تو ہم مجرم ہیں اور ہر طرح کی سزا برداشت کرنے کو تیار ہیں۔''

تو اس کا یہ اعتراف سونے کے پانی سے لکھے جانے کے قابل ہے اور یہ ایک روشن تاج ہے جس سے نبیوں، صدیقین، شہداء اور صالحین کے سر مزین رہے ہیں اور جس کو اللہ تعالیٰ نے انعام یافتہ جماعت قرار دیا ہے اور للہ کے موحد بندے اپنے نمازوں کی ہر رکعت میں اللہ تعالیٰ سے اس کی راہ پر چلنے کی ہدایت طلب کرتے ہیں۔

۲۔ دوسرا واقعہ:

مولانا سیّد نذیر حسین بن جواد علی بن سیّد احمد شاہ دہلوی متوفی ۱۳۲۰ھ مطابق ۱۹۰۲ء برصغیر میں حدیث نبوی کے بہت بڑے عالم گزرے ہیں، ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں میں اپنے والد ماجد سے حاصل کی اور چھ سال کی عمر میں دہلی کا سفر کیا جہاں کئی اساتذہ سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد مولانا شاہ محمد اسحاق دہلوی کے حلقۂ درس میں شامل ہو گئے جو اپنے وقت میں حدیث کے بہت بڑے عالم تھے اور مسلکاً حنفی تھے، مولانا سیّد نذیر حسین مسلسل ۱۳ سال تک مولانا محمد اسحاق کی صحبت میں رہے اور جب شوال ۱۲۵۸ھ مطابق ۱۸۴۲ء میں شاہ اسحاق نے ہندوستان سے مکہ معظمہ ہجرت کی تو محرم ۱۲۵۹ھ مطابق ۱۸۴۳ء میں اللہ تعالیٰ نے مولانا سیّد نذیر حسین کو ان کی جانشینی کا شرف بخشا اور مسلسل چالیس برس تک درس حدیث کی خدمت انجام دینے کے بعد ان کے دل میں زیارت حرمین شریفین کی سعادت حاصل کرنے کا شوق پیدا ہوا۔

۴۰ سال کی مدت بڑی لمبی مدت ہے اس مدت میں ملک کے کونے کونے سے علم حدیث کے شائقین ان کی خدمت میں حاضر ہو کر حدیث پاک کی تعلیم حاصل کرتے رہے جن کی تعداد ہزاروں تک پہنچ گئی اور ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرنے والوں میں ایسے علماء کا نام بھی شامل ہے، جن کو محدث کا لقب ملا، علم حدیث سے وابستگی رکھنے والوں میں کون ہے جو علامہ عبدالرحمٰن مبارکپوری مصنف تحفۃ الأحوذی، علامہ شمس الحق عظیم آبادی مصنف عون المعبود، محدث محمد بشیر سہسوانی مصنف صیانۃ الانسان عن وسوس دحلان اور فاتح قادیان مولانا ثناء اللہ امرتسری کو نہیں جانتا ہوگا۔

برصغیر کے علاوہ بلاد نجد کے شیخ اسحاق بن عبدالرحمٰن بن حسن، شیخ علی بن قاضی شیخ عبداللہ بن سعد اور شیخ سعد بن عتیق، نیز ان دسیوں مشاہیر نجد نے ان سے حدیث کی تعلیم حاصل کی تھی جن کے نام شیخ بسام کی کتاب، علمائے نجد خلال

Marfat.com

ثمانیہ قرون میں درج ہیں اس زمانے میں جزیرۂ عرب سے ہندوستان کا سفر کس قدر پُر مشقت اور مادی اعتبار سے کتنا گراں بار تھا وہ محتاج بیان نہیں ہے۔

بلادنجد کے ان محبان حدیث کے علاوہ سوڈان کے شیخ عبداللہ ادریس اور کابل باغستان، بخاری، سمرقند، غزنہ، قندھار، خوقند اور حبشہ وغیرہ کے شیدائے حدیث نے ان سے حدیث کا فیض حاصل کیا تھا۔

مولانا سیّد نذیر حسین صحیح معنوں میں محدث تھے اور فن حدیث کی باریکیوں سے واقف وہ حدیث کا ''دورہ'' نہیں کراتے تھے، بلکہ حدیث، علوم حدیث، علم الرجال، حدیث سے مسائل واحکام کے استنباط کے طریقے سب کی تعلیم دیتے تھے اور قرآن کی طرح حدیث کو بھی ماخذ شرع مانتے تھے۔

علم حدیث میں اپنی اس گہرائی اور گیرائی کے باوجود ان کا سب سے بڑا لقب ''میاں صاحب'' تھا جو ان کے تواضع کی دلیل ہے، جبکہ حدیث کا دورہ کرنے اور کرانے والوں کے القاب امام العصر، زبدۃ المحدثین، امام اوحد وغیرہ سے کم نہیں ہوتے۔

میاں صاحب کی سب سے بڑی پہچان ان کا تواضع، ان کی مسلکی رواداری اور ان کی وسیع القلبی تھی، دہلی میں انہوں نے ساٹھ ستر برس درس حدیث دیا اور اس میں ان کے قیام کی مدت کوئی ۹۴ سال ہے اس لیے کہ وہ چھ برس کی عمر میں وہاں گئے تھے اور سو (۱۰۰) برس کی عمر میں وہیں انتقال کیا، مگر پوری زندگی نماز جمعہ جامع مسجد میں حنفی امام کے پیچھے پڑھتے رہے۔

میاں صاحب دوسرے مسلک کے علماء خاص طور پر علمائے احناف یا علمائے دیوبند سے کوئی پرخاش نہیں رکھتے تھے، مناظرانہ طبیعت بھی نہیں پائی تھی، تدریس اور افتاء نویسی کے علاوہ کسی اور چیز سے دلچسپی نہیں تھی اور ان کے فتوے محدثین کے طرز پر کتاب وسنت سے ماخوذ ہوتے دوسرے مسلکوں اور ان سے وابستہ علماء کی تنقید وتنقیص سے ان کی زبان اور ذات، پاک تھی، بایں ہمہ ان کا وجود اقطاب عالم، ائمہ دوراں، اساتذہ عرب وعجم اور غبار روضۂ شریفہ آنکھوں میں لگانے والوں کے دلوں میں کانٹے کی طرح چبھتا تھا۔

مولانا رحمت اللہ کیرانوی اور حاجی امداد اللہ ہندوستان سے فرار ہو کر مکہ مکرمہ میں مقیم تھے اللہ تعالیٰ نے ان کو امن و اطمینان دونوں عطا کر دیا تھا، مریدوں کے نذرانے بھی ان کو برابر مل رہے تھے اس طرح معاشی آسودگی تھی، مولانا کیرانوی کو مدرسۂ صولتیہ کی تاحیات نظامت بھی حاصل ہو چکی تھی ان تمام نعمتوں کے باوجود وہ حرم پاک میں بیٹھ کر مولانا نذیر حسین کو اذیت دینے کی تدبیریں سوچا کرتے تھے، گویا اس وقت اسلام اور مسلمانوں کے لیے ان سے بڑا کوئی اور خطرہ نہیں تھا۔

مولانا محمد حسین بٹالوی ہندوستان میں اہلحدیثوں کے ایک بڑے عالم گزرے ہیں وہ ان دنوں مکہ مکرمہ ہی میں تھے ان کا بیان ہے کہ:

Marfat.com

''مولانا رحمت اللہ کیرانوی مولانا سیّد نذیر حسین کی تکلیف دہی کی فکر میں رہتے تھے جو لوگ بغرض حج ہندوستان سے وہاں گئے تھے ان میں سے بعض نے مولانا کیرانوی کی زبان سے یہ سنا ہے کہ: اگر مولوی سیّد نذیر حسین یہاں مکہ میں آ جاوے تو پھر جان سلامت نہ لے جاوے۔''❶

جماعت اہل حدیث سے تعلق رکھنے کے باعث مولانا محمد حسین بٹالوی کا یہ بیان ''فن روایت'' کی رو سے محل بحث ہو سکتا ہے، لیکن چونکہ اس کے بعد جو واقعات رونما ہوئے اس کے شاہد ہیں، اس لیے یہ بیان صدفی صد مبنی بر صدق ہے۔

بالآخر وہ گھڑی آن پہنچی:

۱۳۰۰ھ مطابق ۱۸۸۳ء میں ''میاں صاحب'' کے دل میں زیارت حرمین شریفین کی سعادت حاصل کرنے کا شوق پیدا ہوا اور جب ان کے عزم سفر حج کی خبر مشہور ہوئی تو صوفیا کی خانقاہوں اور علمائے احناف کے ایوانوں کے در و دیوار لرزنے لگے اور جوں ہی آپ دہلی سے روانہ ہوئے تو آپ کے چند مخالفین بھی پنجاب، دیوبند، دہلی اور بدایوں وغیرہ میں حرکت میں آ گئے، بمبئی پہنچنے پر چند اوباشوں نے آپ پر حملہ بھی کرنا چاہا۔

اور جب بمبئی میں میاں صاحب جہاز پر سوار ہوئے تو مخالفین بھی اسی پر سوار ہوئے اور اس میں آپ سے چھیڑ چھاڑ شروع کر دی، مگر آپ کے اعراض کی وجہ سے ان کو کامیابی نہیں ہوئی۔

ادھر مکہ مکرمہ میں یہ اطلاع دی گئی کہ ''وہابیہ'' کا سب سے بڑا سرغنہ آ رہا ہے، اگر یہاں کوئی کارروائی نہ کی گئی تو اس بات کو ''وہابی'' حجاز میں اپنی فتح سے تعبیر کریں گے اور عوام کو اس سے بہت فتنہ ہو گا۔

واقعہ کے اس اجمال کے بعد اس کی تفاصیل مولانا ابو الکلام آزاد کی زبان سے ملاحظہ فرمایئے، جن کے والد ''مفسدین'' کی ٹولی کے سرغنہ تھے، مولانا فرماتے ہیں:

''ہندوستان میں چونکہ اس وقت تقلید و عدم تقلید کا فتنہ زور پر تھا اور مولانا نذیر حسین، غیر مقلدین کے سب سے بڑے شیخ سمجھے جاتے تھے، اس لیے فوراً مکے میں اطلاع دے دی گئی کہ ''وہابیہ'' کا سب سے بڑا سرغنہ آ رہا ہے، اگر یہاں کوئی کارروائی نہ کی گئی تو اس بات کو وہابی، حجاز میں اپنی فتح سے تعبیر کریں گے اور عوام کو اس سے بہت فتنہ ہو گا ساتھ ہی مولانا نذیر حسین کی کتابوں اور فتاویٰ کے بعض مطالب کا عربی میں ترجمہ کر کے پیش کیا گیا۔ ان میں بعض چیزیں تو واقعی ان کی کتاب ''معیار الحق'' سے لی گئی تھیں، اور اکثر ایسے الزامات تھے جو ایسے موقعوں پر فریقین ایک دوسرے سے فریقانہ جذبات کے ماتحت منسوب کر دیتے ہیں۔

اس زمانے میں ہندوستان میں ایک فتویٰ ''جامع الشواہد فی اخراج الوہابیین عن المساجد'' کے نام سے مرتب ہوا تھا اس میں چند عقائد تو واقعی اس جماعت کے تھے، اور بڑا حصہ منسوبات کا تھا، یا خود الزامی طور پر ان

❶ اشاعة السنة، جلد ۶، شمارہ ۱۰، ص: ۱۲۹۰

Marfat.com

کے عقائد کا استخراج کیا گیا تھا، مثلاً: شحم خنزیر کی حلت، بول طفل صغیر کی طہارت، مادۂ انسانی کا پاک اور قابل اکل ہونا، خالہ سے مناکحت کا جواز، اور جواز کذب باری تعالیٰ وغیرہ۔

بہر حال مولانا نذیر حسین اور مولانا تلطف حسین عظیم آبادی مع ایک اور رفیق کے گرفتار کر لیے گئے اور ایک نہایت ہی تنگ و تاریک ''محبس'' میں قید کر دیے گئے......

اس اثناء میں ان کی گرفتاری کی خبر جدے میں برٹش قونصل کو پہنچ گئی اور وہاں سے برابر زور دیا جاتا رہا تھا بالآخر نو دن کے بعد ایک تحریر پر دستخط کرانے کے بعد انہیں رہا کر دیا گیا۔'' ❶

مولانا آزاد کی حق گوئی:

''ایک توبہ نامہ بھی مولانا نذیر حسین مرحوم کا بعض رسالوں میں میری نظر سے گزرا ہے، لیکن اس کے فرضی ہونے پر میں ایسی شہادتیں رکھتا ہوں، جن سے زیادہ قابل اعتبار شہادتیں اور نہیں ہوسکتیں، کیونکہ جو تحریر مولانا نذیر حسین نے دی تھی، وہ بارہا والد مرحوم نے مجھے حرف بحرف سنائی ہے اور وہ تحریر یہ تھی کہ، میں ائمہ اربعہ کی تقلید کو فرائض و واجبات شرعیہ کی طرح فرض نہیں سمجھتا، لیکن عوام کے لیے اور ان کے لیے جو فقہ و حدیث میں نظر نہیں رکھتے ہیں، جب تک کہ قرآن و حدیث کے خلاف کوئی صریح بات پیش نہ آئے، کتب فقہ متداولہ پر عمل کرنے کو مستحسن سمجھتا ہوں۔'' ❷

اس تحریر کے بارے میں زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس میں فتنے سے بچنے کے لیے ایجابی طور پر جس وضاحت سے انہیں اپنے عقائد بیان کرنا چاہیے تھا اس سے انہوں نے گریز کی، لیکن منفی طور پر انہوں نے اپنے اصلی عقائد سے ہرگز انکار نہیں کیا، اور ان حالات کو دیکھتے ہوئے، جو انہیں وہاں پیش آئے تھے، ان کے اس تسامح کو کوئی بھی قابل الزام کمزوری نہیں قرار دے سکتا، یہ صاف ظاہر ہے کہ اگر وہ حریف کے ساتھ بحث و جدال پر اتر آتے تو نتیجہ نہایت ہولناک ہوتا۔'' ❸

فتنہ پرداز کون تھے؟

مولانا آزاد نے مکہ مکرمہ میں مولانا سیّد نذیر حسین کے خلاف فتنہ کھڑا کرنے والوں کے ناموں کا ذکر نہیں کیا ہے، صرف اس بات پر زور دیا ہے کہ قاضی محمد مراد اور ان کے ساتھیوں اور ہم عقیدہ لوگوں اور پھر مولانا سیّد نذیر حسین کے خلاف مکہ مکرمہ میں جو فتنہ کھڑا کیا گیا اس کے روح رواں ان کے والد تھے، البتہ قاضی محمد مراد کے واقعہ میں انہوں نے یہ صراحت کر دی ہے کہ اس میں اصل کردار ان ہندوستانی علماء نے ادا کیا تھا جو اس وقت وہاں مقیم تھے۔ ❹ اور مولانا سیّد نذیر حسین کے واقعہ کے ضمن میں یہ لکھا ہے کہ جن لوگوں نے ہندوستان میں ان کا پیچھا کیا تھا، انہوں نے مکہ

❶ ص: ۸۹، ۹۰، ۹۲ ❷ ص: ۹۲ ❸ ص: ۹۳، ۹۴ ❹ ص: ۷۳

Marfat.com

میں مقیم علماء کو یہ اطلاع دے دی تھی کہ ہندوستان میں وہابیہ کا سب سے بڑا سرغنہ وہاں پہنچ رہا ہے، اگر اس کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی گئی تو ''وہابی حجاز میں اس کو اپنی فتح سے تعبیر کریں گے۔'' ❶

اب یہ دیکھنا ہے کہ اس وقت مکہ مکرمہ میں مقیم ہندوستان کے کون سے علماء تھے جن کا وہاں سب سے زیادہ اثر و رسوخ تھا اور جو شریف مکہ تک رسائی رکھتے تھے اور جو تصوف سے اپنی گہری وابستگی رکھنے اور حنفیت میں غیر معمولی اور بے لچک تعصب کے باعث اہل توحید -وہابیوں اور اہل حدیثوں- سے دلی نفرت وعداوت رکھتے تھے اور ان کے درپۂ آزار رہنے کو صلاح وتقویٰ اور جہاد تصور کرتے تھے، تو وہاں کے حالات کا تتبع کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت وہاں جو ہندوستانی علماء، عوام اور ارباب حل وعقد میں سب سے زیادہ اثر و رسوخ رکھتے تھے، بلکہ ایک طرح سے وہاں کے سیاہ وسفید کے مالک تھے وہ تھے: مولانا آزاد کے والد مولانا خیر الدین، قبوری جماعت کے پیشوا مولانا عبدالقادر بدایونی، عیسائیوں سے کامیاب مناظروں میں شہرت رکھنے والے مولانا رحمت اللہ کیرانوی اور صوفیائے دیوبند کے پیر حاجی امداد اللہ، اور ان عناصر اربعہ کا وہاں کے ایک عرب شیخ احمد زینی دحلان سے بڑا گہرا تعلق تھا۔ ان پانچوں میں جو چیزیں قدر مشترک تھیں ان میں سرفہرست، صوفیت میں غلو، شیخ محمد بن عبدالوہاب کی اصلاحی دعوت توحید کی شدید مخالفت اور اہل حدیثوں سے دلی نفرت وعداوت تھی، شیخ دحلان سے مولانا آزاد کے والد کے تعلقات کی نوعیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے دحلان کی خواہش اور طلب پر مولانا خیر الدین نے ''وہابیت'' کے ردّ میں ایک ضخیم کتاب لکھی، اسی طرح ان کی خواہش پر ایک رسالہ بھی لکھا جس میں انہوں نے اپنے مشرکانہ عقائد کو اہل سنت و جماعت کے عقائد سے تعبیر کیا ہے اور دحلان کا ذکر ''بھائی'' کہہ کر کیا ہے۔ ❷

دحلان کے کردار کا اندازہ اس سے کیجیے کہ انہوں نے حجاز کے مفتی اور شیخ حرم کا عہدہ حاصل کرنے کے لیے شافعیت چھوڑ کر حنفیت اختیار کر لی تھی، اس لیے کہ ان عہدوں کے امیدوار کے لیے حنفی ہونا لازمی تھا۔ ❸

مولانا رحمت اللہ کو یوں تو ردّ عیسائیت میں کافی مہارت حاصل تھی اور انہوں نے انجیل کی تحریفات پر عبور رکھنے والے اور انگریزی اور عبرانی کے ماہر ڈاکٹر وزیر خان اکبر آبادی کے تعاون سے ان تحریفات کی نقاب کشائی کی ہے۔ ❹

لیکن اہل توحید، خاص طور پر علم حدیث سے وابستگی رکھنے والوں سے ان کا بغض وعناد دحلان سے کچھ کم نہ تھا، دونوں کے باہمی تعلقات بھی بڑے گہرے تھے، مرکز خلافت قسطنطنیہ سے بھی دونوں کا تعلق تھا اور دحلان ہی کی خواہش پر انہوں نے ''اظہار الحق'' لکھی تھی۔ ❺ اس مجاہد معمار کو حدیث اور علمائے حدیث سے جو بغض تھا اس کا ذکر ایک ہندوستانی عالم حدیث مولانا محمد حسین بٹالوی نے اشاعۃ السنۃ میں کیا ہے اور اس پر دلالت کرنے والے جن واقعات کو اپنی مذکورہ کتاب

❶ ص: ۸۹ ❷ آزاد کی کہانی آزاد کی زبانی، ص: ۷۷-۷۸۔ ❸ ص: ۷۸، اور البیان والاشہاد، ص: ۴۵۔

❹ مقدمہ حیات شبلی، ص: ۱۵۔ ❺ ایک مجاہد معمار، ص: ۳۵۔

Marfat.com

میں بیان کیا ہے وہ ان کے چشم دید ہیں، لکھتے ہیں:

''ایک بزرگ شیخ محمد نامی حرم محترم میں حدیث پڑھایا کرتے تھے، انہوں نے ان کو حکماً اس سے ہٹا دیا، پھر وہ ایک مدت تک ایک حلوائی عبداللہ کی دکان کی ایک کوٹھری میں چھپ کر حدیث پڑھاتے رہے اس کو بھی انہوں نے جب مطلع ہوئے بند کرا دیا۔

ایک دفعہ حدیث کی ایک کتاب ''سفر السعادۃ'' تصنیف علامہ مجد الدین صاحب ''القاموس المحیط'' مکہ میں آئی اور شائقین حدیث نے اس کی ترویج و اشاعت چاہی تو اس کو بھی انہوں نے جاری نہ ہونے دیا، خاکسار نے مکہ مکرمہ میں چار مہینے رہ کر اکثر ان حالات کو بچشم خود ملاحظہ کیا ہے صرف سنی سنائی باتوں کو بیان نہیں کر دیا ہے۔'' ❶

حاجی امداد اللہ کا کافی ذکر خیر سطور بالا میں آ چکا ہے، ان کے مبلغ علم اور ان کے مشرکانہ عقائد کے نمونے بھی بیان کر دیے گئے ہیں نیز انہوں نے بعض قرآنی آیتوں میں جو معنوی تحریفات کی ہیں ان کو بھی واضح کر دیا گیا ہے۔ موصوف دینی اور عصری دونوں علوم سے تہی دامن تھے، وحدۃ الوجود کے قائل اور داعی صوفی تھے، ان کی حیات مستعار کے آخری ایام حرم پاک میں مثنوی رومی کی تلاوت میں گزرتے تھے، جی ہاں موصوف مثنوی کی قراءت کو ''تلاوت'' سے تعبیر کرتے تھے، حکیم الامت تھانوی حکایات الاولیاء میں تحریر فرماتے ہیں: جب مثنوی کے درس کا وقت آتا تو حضرت حاجی صاحب یوں فرمایا کرتے تھے کہ آؤ بھائی مثنوی کی تلاوت کر لیں، ایک شعر ہے:

مثنوی مولوی معنوی ہست قرآن در زبان پہلوی

اس کا لوگوں نے اس طرح حل کیا ہے کہ اس میں زیادہ مضامین قرآن شریف کے ہیں، لیکن حضرت نے عجیب تفسیر فرمائی کہ بھائی قرآن سے مراد کلام الٰہی ہے اور کلام الٰہی کبھی وحی سے ہوتا ہے اور کبھی الہام سے ہوتا ہے، تو معنی مصرعہ کے یہ ہیں کہ مثنوی کلام الٰہی یعنی الہامی ہے۔ ❷

قرآن اللہ تعالیٰ کا، اپنے حروف، الفاظ اور معانی کے ساتھ کلام ہے اور بذریعہ وحی اللہ کے رسول ﷺ کے قلب مبارک پر نازل ہوا ہے اور حدیث بھی وحی ہے جس کے صرف معانی بذریعہ وحی نبی ﷺ کے قلب مبارک پر نازل ہوئے ہیں، الفاظ اور تعبیر نبی ﷺ کی اپنی ہے۔

الہام اللہ کی طرف سے بھی ہوتا ہے اور شیطان کی طرف سے بھی، انبیاء پر نازل ہونے والی وحی کو الہام سے تعبیر کر سکتے ہیں، مگر اس میں شیطانی خیالات کا کوئی گزر نہیں۔

صوفیا کے الہامات بیشتر شیطانی ہوتے ہیں اس لیے کہ ان میں توحید اور قرآن و حدیث کے مضامین اور تعلیمات

❶ جلد ۶، شمارہ ۱۰، ص: ۲۸۹ بحوالہ اہل حدیث اور سیاست، ص: ۳۵۷-۳۵۸۔

❷ ص: ۲۰۷، حکایت نمبر: ۱۷۴۔

Marfat.com

کے خلاف اور منافی باتیں ہوتی ہیں ویسے بھی محققین صوفیا کے نزدیک الہام ماخذ شریعت نہیں ہے۔

مثنوی رومی مولانا رومی کے استاذ و پیر شمس تبریز کا ''عشق نامہ'' ہے اس میں کفر و شرک کی باتیں بھی ہیں اور جھوٹی روایتوں کے مضامین بھی، اگر بعض اشعار کے مفاہیم قرآنی آیتوں سے ماخوذ بھی ہوں تو بھی مثنوی کو قرآن کہنے والا مسلمان نہیں ہے، حتی کہ حدیث کو بھی قرآن کہنا اور قرآن سے تشبیہ دینا کفر ہے، البتہ قرآن و حدیث کے احکام یکساں ہیں، اس لیے کہ قرآن کی رو سے اللہ و رسول کی طاعتوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔

حاجی امداد اللہ محدثین اور برصغیر کے اہل حدیثوں سے بغض و عناد اور نفرت میں اپنی کوئی مثال نہیں رکھتے تھے۔ مولانا تھانوی نے اپنی کتاب ''امداد الامشتاق'' میں اہل حدیثوں کی بابت ان کے جو الفاظ نقل کیے ہیں، وہ حد درجہ جارحانہ اور ان کی سیاہ قلبی کے ترجمان ہیں، فرماتے ہیں:

''متعصب غیر مقلد کہ فی زمانہ دعویٰ حدیث دانی و عمل بالحدیث کرتے ہیں، حاشا وکلا کہ حقانیت سے بہرہ نہیں رکھتے تو اہل حدیث کے زمرے میں کب شامل ہو سکتے ہیں، بلکہ ایسے لوگ دین کے ''راہزن'' ہیں، ان کے اختلاط سے احتیاط چاہیے۔'' [1]

یہ جارحانہ الفاظ اس شخص کے ہیں جس کو اکابر صوفیا، مولانا تھانوی، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا سیّد سلیمان ندوی، مولانا ابوالحسن علی ندوی، اور مولانا اویس ندوی وغیرہ نے قطب عالم اور شیخ العرب والعجم کے القاب سے نوازا ہے۔

اوپر تصوف اور شرک و بدعت کے جن عناصر خمسہ کا مختصر، مگر صحیح و جامع تعارف کرایا گیا ہے، اس کی روشنی میں یہ فیصلہ کرنا آسان اور مبنی برحق ہو جاتا ہے کہ مکہ مکرمہ میں مولانا سیّد نذیر حسین کے خلاف اور ان سے پہلے قاضی محمد مراد اور ان کے رفقا کے خلاف جو فتنہ بھڑکایا گیا اور ان کو شہید کرانے کے لیے جو سازشیں کی گئیں ان میں بنیادی کردار انہی پانچوں نے ادا کیا تھا۔

فتنہ کا سبب کیا تھا؟

مکہ مکرمہ میں مولانا سیّد نذیر حسین کے خلاف جو طوفان بدتمیزی برپا کیا گیا اور ملک سے ان کی روانگی کے فوراً بعد سے، بلکہ عزم سفر کے وقت ہی سے ہندوستان سے لے کر مکہ مکرمہ پہنچنے تک جس شر پسند ٹولی نے ان کا پیچھا کیا اور شہر مقدس میں مقیم اکابر صوفیا کے ساتھ مل کر ان پر اور ان کے ساتھ پوری جماعت اہل حدیث پر جو جھوٹے الزامات لگائے گئے اور جن کے باعث ان کو گردن زدنی قرار دیا گیا وہ خود انہی اکابر کے خود ساختہ تھے، پھر ان کو درپۂ آزار بنانا کس شریعت اور کس مسلک کی رو سے جائز تھا؟

اوپر یہ بات بیان کی جا چکی ہے کہ مولانا سیّد نذیر حسین مشہور حنفی عالم، محدث اور صوفی مولانا شاہ محمد اسحاق دہلوی

---

[1] ص: ۳۹

Marfat.com

کے شاگرد تھے اور ان کی ہجرت مکہ کے بعد درس حدیث میں ان کی جانشینی کا شرف بھی انہی کو حاصل ہوا اور مسلسل کوئی چالیس برس یہ خدمت ادا کرنے کے بعد ان کے دل میں زیارت حرمین شریفین کا اشتیاق پیدا ہوا اس طویل مدت میں ان کے ہزاروں شاگرد ملک اور بیرون ملک پھیل چکے تھے اور حدیث کی تدریس اور حدیث کی ترویج واشاعت کی خدمت انجام دے رہے تھے، تو کیا ایسے محدث کو شہید کرانے کے لیے، اور وہ بھی البلد الحرام میں فتنہ کھڑا کرنا بجائے خود ایک نہایت مجرمانہ عمل نہیں تھا اور ایسا کرنے والے اسلامی شریعت کی رو سے مجرم نہیں تھے؟

مولانا سیّد نذیر حسین بغرض حج حجاز گئے تھے، اس کے سوا ان کی کوئی اور غرض نہیں تھی اور ان اکابر صوفیا اور اقطاب عالم کے زمانۂ قیام مکہ میں ہزاروں ایسے لوگ وہاں حج کی غرض سے گئے تھے اور بسلامت وہاں سے واپس ہوئے تھے جو فاسد عقائد رکھتے تھے اور گمراہ فرقوں سے تعلق رکھتے تھے، مگر ان ''صلحائے امت'' نے ان میں سے کسی کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی اور کسی کو بھی درپۂ آزار نہیں بنایا، اگر ان کی ''نظر عنایت'' کا کوئی مرکز توجہ بنا بھی تو ایک ایسا محدث جس کی حدیث دانی کا اعتراف ہندوستانیوں سے پہلے عربوں نے کیا ہے تو کیا اس کا سبب اس کے سوا کچھ اور تھا کہ ''روضۂ شریفہ کا غبار'' آنکھوں میں لگانے والی اور قبر مبارک کو عرش، کرسی اور کعبہ سے زیادہ افضل اور اشرف سمجھنے والی یہ ٹولی ''میاں صاحب'' کی آڑ میں اپنی حدیث دشمنی کا مظاہر کر رہی تھی؟

مولانا سیّد نذیر حسین کو مطعون اور بدعقیدہ قرار دینے کے لیے ہندوستان میں جو دو رسالے ''جامع الشواهد فی اخراج الوهابيين عن المساجد'' اور ''انتظام المساجد بإخراج أهل الفتن و المفاسد'' شائع کیے گئے تھے ان میں جو عقائد ''میاں صاحب'' کی طرف منسوب کیے گئے تھے وہ تو خود مخالفین کے تیار کردہ تھے، پھر ان کے مندرجات کا ذمہ داران ان کو قرار دے کر ان کو شہید کرانے کی سازش کس ضابطۂ اخلاق کی رو سے روا تھی، میں نے دین وشریعت کے بجائے ''ضابطۂ اخلاق'' کی تعبیر قصداً اختیار کی ہے، کیونکہ ان ''اکابر'' کے نزدیک دین وشریعت بے معنی الفاظ ہیں، البتہ ان کے ''اخلاق عالیہ'' کا ذکر ان کے مریدوں کے حلقوں میں بہت کیا جاتا ہے۔

میں تھوڑی دیر کے لیے یہ مان لیتا ہوں کہ سیّد نذیر حسین ایک معمولی انسان تھے، مگر تھے تو مسلمان، اور کم از کم وحدۃ الوجود کے قائل باطنیت کا عقیدہ رکھنے والے اور مثنوی رومی کو فارسی زبان کا قرآن کہنے والے حاجی امداد اللہ سے تو زیادہ بہتر عقائد رکھتے تھے، تو پھر ان سے پہلے تو یہ اور ان کے پیرو گردن زدنی تھے، مگر اہل حدیثوں نے کبھی بھی ان کے یا ان کے مریدوں اور صوفیائے دیوبند کے خلاف زبان درازی نہیں کی، جبکہ تصوف اور صوفیا کے خلاف لکھنا اور ان کے مشرکانہ عقائد کو طشت ازبام کرنا اسلامی فریضہ ہے، کیونکہ یہ جماعت اسلام کے نام سے غیر اسلام اور توحید کے نام سے وحدۃ الوجود، الحاد اور شرک پھیلا رہی ہے جس پر تصوف کی کتابیں شاہد ہیں۔

مولانا سیّد نذیر حسین کے مخالفین نے صوفیائے ہندوستان مقیمین مکہ کے ساتھ مل کر، مکہ مکرمہ کے ارباب حل وعقد

Marfat.com

کے یہاں ان کے خلاف جو شکایت کی تھی اس میں ان کو ''وہابیہ'' کا سرغنہ قرار دیا تھا اس طرح انہوں نے خود یہ اعتراف کیا تھا کہ ان کے عقائد وہی ہیں جو عقائد شیخ محمد بن عبدالوہاب کے ہیں، محمد بن عبدالوہاب کے عقائد ان کی کتابوں میں بے کم و کاست اور پوری صحت کے ساتھ موجود ہیں، کیا ان میں سے کسی ایک عقیدے کو بھی کتاب و سنت میں بیان کردہ عقائد کے خلاف ثابت کرنے والا کوئی آج تک پیدا ہوا ہے، جبکہ تصوف کی کتابوں میں جو عقائد بیان کیے گئے وہ اسّی فیصد اسلامی عقائد کے خلاف ہیں اور روح اسلام ''توحید'' کا تو ان میں کوئی ذکر ہی نہیں، پھر اسلامی قانون کی رو سے گردن زدنی کون تھے، میاں صاحب یا ان کے مخالفین؟

ان واقعات کے ذکر کا مقصد؟

قارئین یہ سوال کر سکتے ہیں کہ منکرین کے ردّ میں لکھی جانے والی اس کتاب میں عموماً اور حدیث اور صوفیا کے باب کے ضمن میں خصوصاً ان واقعات کے ذکر کا مقصد کیا ہے؟

اس سوال کا جواب تو خود سطور بالا میں موجود ہے، مگر میں اس مقصد کو واضح کرتے ہوئے عرض گزار ہوں کہ مصنوعی صلاح و تقویٰ کے لباس میں ملبوس یہ جماعت روایتی منکرین حدیث سے زیادہ حدیث کی دشمن رہی ہے، متکلمین کے عقائد بیان کرتے ہوئے میں نے مثالوں سے یہ واضح کیا ہے کہ صوفیا کی اکثریت متکلمین ہی کی ہم عقیدہ رہی ہے، میں نے متعدد صوفی متکلمین کے ناموں کا ذکر بھی کیا ہے اور حدیث کے شرعی حجت ہونے سے متعلق ان کے نقطہ ہائے نظر بھی بیان کر دیے ہیں۔

مکہ مکرمہ میں قاضی محمد مراد اور ان کے رفقا اور مولانا سیّد نذیر حسین کے خلاف فتنہ بھڑکانے والے سب کے سب ہندوستانی صوفیا تھے اور یہ سب عقائد میں متکلمین کے پیرو تھے، انہوں نے کبھی بھول کر بھی یہ اعتراف نہیں کیا ہے کہ ان کے عقائد کے مآخذ قرآن و حدیث ہیں یہ ایک طرف۔

دوسری طرف مولانا سیّد نذیر حسین کو درپۂ آزار بنانے والوں نے یہ سب کچھ اہل حدیثوں سے بغض و عناد کے اظہار میں کیا تھا اور ان کی نظر میں اہل حدیثوں کا سب سے بڑا اور ناقابل معافی جرم حدیث کو بنیادی ماخذ شریعت ماننا ہے، اس طرح اس باب کے تحت ان واقعات کے ذکر کا مقصد واضح ہے۔

Marfat.com

قبر پرستی

جب اہل کتاب خاص طور پر یہود ونصاریٰ نے توحید کا سبق بھلا دیا اور اپنے رسولوں کی دعوت سے منحرف ہو گئے تو ان کے اندر دو ایسی برائیاں پیدا ہوگئیں جنہوں نے ان کو اللہ تعالیٰ کی نظر عنایت سے دُور کر دیا اور وہ اللہ کے غضب کے مستحق قرار دے دیے گئے اور ان کا شمار گمراہوں میں ہونے لگا۔

۱۔ ان کی پہلی برائی اور گمراہی یہ تھی کہ انہوں نے اپنے علماء اور راہبوں کو ''شارع'' قرار دے دیا۔ جبکہ شریعت سازی کا حق صرف اللہ تعالیٰ کو ہے اللہ تعالیٰ نے سورۂ توبہ میں پہلے تو یہ بیان فرمایا کہ:

﴿وَ قَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ نِ ابْنُ اللّٰهِ وَ قَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ ذٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ يُضَاهِئُوْنَ قَوْلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ۝﴾ (التوبة: ۳۰)

''اور یہودیوں نے کہا کہ عزیر اللہ کا بیٹا ہے اور نصاریٰ نے کہا کہ مسیح اللہ کا بیٹا ہے یہ ان کے مونہوں سے نکلنے والی بات ہے یہ ان لوگوں کے قول کی مشابہت کر رہے ہیں جو ان سے پہلے کفر کے مرتکب ہو چکے ہیں اللہ انہیں مارے وہ کدھر بہکائے جا رہے ہیں۔''

اس کے بعد فرمایا:

﴿اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَ رُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ الْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَ مَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ۝﴾ (التوبة: ۳۱)

''انہوں نے اپنے علماء اور درویشوں کو اللہ کے سوا رب بنا لیا ہے اور مسیح ابن مریم کو بھی، جبکہ انہیں اس کے سوا کوئی حکم نہیں دیا گیا تھا کہ وہ صرف ایک معبود کی عبادت کریں جس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، وہ ان کے شرک سے پاک ہے۔''

غور فرمایئے اللہ تعالیٰ نے یہودیوں اور نصاریٰ کے اپنے علماء اور درویشوں کو شریعت سازی کا درجہ دے دینے کو ان کو رب بنا لینے اور ان کو اپنا شریک بنانے سے تعبیر کیا ہے، چنانچہ عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے بارے میں فرمایا ہے کہ ''وہ ان کی عبادت نہیں کرتے تھے، لیکن وہ جس چیز کو حلال قرار دیتے تھے وہ اس کو حلال مان لیتے تھے اور جس چیز کو حرام کر دیتے تھے اس کو حرام مان لیتے تھے۔ [1]

[1] ترمذی: ۳۰۹۵

Marfat.com

۲۔ یہود ونصاریٰ جس دوسری برائی میں پڑ کر اللہ تعالیٰ کے مغضوب قرار پائے تھے اور جس کی وجہ سے وہ گمراہ قرار دیے گئے تھے، یہ تھی کہ انہوں نے اپنے صالحین کی قبروں کو سجدہ گاہوں میں تبدیل کر دیا تھا اور ان پر مسجدیں تعمیر کر لی تھیں۔ اس بات کو متعدد صحیح حدیثوں میں پوری وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے۔

((أُولٰئِكَ قَوْمٌ إِذَا مَاتَ فِيهِمُ الْعَبْدُ الصَّالِحُ أَوِ الرَّجُلُ الصَّالِحُ ، بَنَوْا عَلٰى قَبْرِهٖ مَسْجِدًا ، وَ صَوَّرُوْا فِيْهِ تِلْكَ الصُّوَرَ ، أُولٰئِكَ شِرَارُ الْخَلْقِ عِنْدَ اللّٰهِ .))

''وہ ایسے لوگ ہیں کہ جب ان میں کوئی صالح بندہ یا صالح شخص مر جاتا تو وہ اس کی قبر پر مسجد تعمیر کر لیتے تھے اور اس میں وہ تصویریں بنا لیتے تھے وہ اللہ کے ہاں بدترین مخلوق ہیں۔'' ❶

اس حدیث کی بعض روایتوں میں ان لوگوں پر قیامت کے دن اللہ عزوجل کے نزدیک بدترین مخلوق ہونے کا حکم لگایا گیا ہے، اور اس گرجا کا نام ماریا- مریم- بتایا گیا ہے۔

۲۔ انہی ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی اس بیماری میں جس سے آپ جاں بر نہ ہو سکے، فرمایا ہے:

((لَعَنَ اللّٰهُ الْيَهُوْدَ ، اِتَّخَذُوْا قُبُوْرَ أَنْبِيَاءِ هِمْ مَسَاجِدَ ، قَالَتْ عَائِشَةُ: لَوْ لَا ذٰلِكَ لَأُبْرِزَ قَبْرُهٗ ، خُشِيَ أَنْ يُتَّخَذَ مَسْجِدًا))

''یہودیوں پر اللہ کی لعنت ہو، انہوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو مسجد بنا لیا، عائشہ فرماتی ہیں: اگر یہ اندیشہ نہ ہوتا تو آپ کی قبر نمایاں کر دی جاتی، مگر خوف ہوا کہ مسجد بنا لی جائے گی۔'' ❷

حدیث کی وضاحت:

ام المومنین نے رسول اللہ ﷺ کی قبر مبارک کو نمایاں اور کھلی جگہ نہ بنانے کا جو سبب بیان کیا ہے کہ ایسا اس اندیشہ اور خوف سے کیا گیا تھا کہ اس کو لوگ سجدہ گاہ بنا لیں گے، جبکہ حجرے میں آپ کو دفن کرنے سے اس طرح کا اندیشہ نہیں تھا، تو یہ نبی ﷺ کو حجرے سے باہر کھلی جگہ یا مسلمانوں کے قبرستان میں دفن نہ کرنے کا ایک سبب تھا۔

اس کا دوسرا سبب نبی ﷺ کا وہ ارشاد تھا جس میں آپ نے یہ خبر دی ہے کہ ہر نبی اسی جگہ دفن کیا گیا ہے جہاں اس کی روح قبض کی گئی ہے۔ چنانچہ ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ:

((لما قبض رسول الله ﷺ اختلوا في دفنه ، فقال ابوبكر: سمعت من رسول الله ﷺ شيئا ما نسيته قال: ما قبض الله نبيا إلا في الموضع الذي يحب أن يدفن فيه))

---

❶ بخاری: ۴۳۴۔ مسلم: ۵۲۸ ❷ بخاری: ۴۴۴۱، مسلم: ۵۳۱

Marfat.com

''جب رسول اللہ ﷺ کی روح قبض کی گئی تو صحابہ میں آپ کے دفن کے مسئلہ میں اختلاف ہو گیا، ابوبکر نے کہا: میں نے رسول اللہ ﷺ سے ایک ایسی بات سنی ہے جسے میں بھولا نہیں ہوں، آپ نے فرمایا ہے: اللہ نے ہر نبی کی روح اسی جگہ قبض کی ہے جہاں وہ دفن ہونا چاہتا تھا۔'' ❶

۳۔ ام المومنین عائشہ اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم سے روایت ہے کہ:

((لما نزل برسول الله ﷺ طفق يطرح خميصة له على وجهه، فاذا اغتم كشفها عن وجهه، و هو كذلك يقول: لعنة الله على اليهود و النصارى اتخذوا قبور انبياء هم مساجد يحذر ما صنعوا)) ❷

''جب رسول اللہ ﷺ کے پاس موت کا فرشتہ نازل ہوا یا آپ شدت مرض میں مبتلا ہوئے تو آپ اپنی ایک دھاری دار چادر اپنے چہرے پر ڈال لیتے اور جب اس سے تکلیف محسوس کرتے تو اسے اپنے چہرے سے ہٹا لیتے اور اس حالت میں آپ فرما رہے تھے: یہود و نصاریٰ پر اللہ کی لعنت ہو، جنہوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو مسجد بنا لیا۔'' آپ ان کے برے اعمال سے خبردار کرتے ہوئے یہ فرما رہے تھے۔

۴۔ جندب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، کہتے ہیں: میں نے نبی ﷺ کو اپنی موت سے پانچ دن پہلے یہ فرماتے ہوئے سنا ہے:

((...... أَلَا وَ إِنَّ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ كَانُوْا يَتَّخِذُوْنَ قُبُوْرَ أَنْبِيَاءِ هِمْ وَ صَالِحِيْهِمْ مَّسَاجِدَ، إِنِّيْ أَنْهَاكُمْ عَنْ ذٰلِكَ)) ❸

''خبردار! دراصل تم سے پہلے جو لوگ گزرے ہیں وہ اپنے انبیاء اور صالحین کی قبروں کو مسجدیں بنا لیا کرتے تھے، میں تم لوگوں کو اس سے منع کرتا ہوں۔''

قبروں کو مسجد بنانے کا مفہوم:

عرف عام میں مسجد اس عمارت کو کہتے ہیں جو مخصوص طور پر نماز ادا کرنے کے لیے تعمیر کی جاتی ہے، جس کا دوسرا نام بیت اللہ ہے، لیکن شرعی نقطۂ نظر سے ہر وہ جگہ مسجد ہے جہاں نماز ادا کی جائے، اگر چہ وہ نماز کے لیے مخصوص نہ ہو، مسلم ممالک خاص طور پر سعودی عرب کی ہر وزارت، کمپنی اور کارخانے میں نماز کے لیے کوئی کمرہ خاص کر دیا جاتا ہے اور اس کو مسجد کہا جاتا ہے، جبکہ وہ جگہ یا وہ کمرہ مسجد کی نیت سے نہیں بنایا جاتا۔ اس وضاحت کی روشنی میں ہر وہ جگہ جہاں نماز ادا کی جائے مسجد ہے، قطع نظر اس کے کہ وہ نماز کے لیے مخصوص ہے، یا نہیں۔ وہاں مستقل طور پر نماز ادا کی جاتی ہے یا

❶ ترمذی: ۱۰۱۸، ابن ماجہ: ۱۶۲۸ ❷ بخاری: ۴۴۴۳۔ مسلم: ۵۳۱
❸ مسلم: ۵۳۲

Marfat.com

عارضی طور پر؟

قبروں کو مسجد بنانے کی مختلف صورتیں ہو سکتی ہیں؛ مثلاً ایک صورت تو یہ ہے کہ مسجد کی تعمیر قبر پر کی جائے اور وہ اس طرح کہ قبر اس کے اندر آ جائے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ کسی صالح انسان کی قبر کے پاس مسجد تعمیر کی جائے جو ہو تو الگ، مگر اس کی تعمیر کا اصل مقصد اس قبر کی زیارت ہو، تو ایسا کرنا اگر چہ جائز ہے، اس لیے کہ قبر مسجد کے اندر نہیں ہے۔ لیکن چونکہ قبر سے مسجد کا یہ قرب اس کو زیارت گاہ بنا دیتا ہے اور نماز پڑھنے والے اس قبر کی بھی زیارت کرنے لگتے ہیں اور صاحب قبر سے وہی سب کچھ طلب کرتے ہیں جو صرف اللہ تعالیٰ سے طلب کرنا جائز ہے اور وہاں میلے لگنے لگتے ہیں، اس طرح یہ مسجد بھی شرک کا سبب اور ذریعہ بن جاتی ہے، جیسا کہ برصغیر کے ملکوں میں مزاروں، درگاہوں وغیرہ کا حال ہے کہ ان میں سے بعض قبریں مسجدوں سے باہر ہیں اور بعض ان کے اندر، مگر ان مزاروں اور درگاہوں میں ایک ہی طرح کے مشرکانہ اعمال کا ارتکاب ہوتا ہے تو یہ مسجدیں بھی قبروں پر مسجدیں تعمیر کرنے کے حکم میں داخل ہیں۔

قبروں کو مسجد یا سجدہ گاہ بنانے کی تیسری صورت یہ ہے کہ کسی قبر کے پاس کوئی عمارت وغیرہ نہ بنائی جائے، مگر اس کے پاس نماز ادا کی جائے، تو یہ بھی قبروں کو سجدہ گاہ بنانا ہے اور حدیث کے مطابق ایسے لوگ بھی ملعون ہیں، کیونکہ مسجد، جیسا کہ واضح کیا گیا نماز کے لیے بنائی گئی مخصوص عمارت کو بھی کہتے ہیں اور اس جگہ کو بھی جہاں سجدہ کیا جائے اس کی دلیل وہ حدیث ہے جس میں زمین کو مسلمانوں کے لیے مسجد فرمایا گیا ہے، نبی ﷺ کا ارشاد ہے:

((جُعِلَتْ لِيَ الْأَرْضُ مَسْجِدًا وَّ طَهُوْرًا)) [1]

''زمین میرے لیے مسجد اور پاک بنا دی گئی ہے۔''

یہاں مسجد سے مراد سجدہ گاہ ہے جس میں اصطلاحی مسجد بھی داخل ہے۔

قبروں پر مسجد تعمیر کرنا بدترین شرک ہے:

اوپر جو چار حدیثیں نقل کی گئی ہیں ان میں قبروں پر مسجدیں تعمیر کرنے والوں پر لعنت کی گئی ہے دینی زبان میں لعنت کے معنی دھتکارنے، خیر و بھلائی سے محروم کر دینے اور اللہ کے غضب کا مستحق قرار دینے کے ہیں اور ملعون ایسا شخص ہے جو دھتکارا ہوا، خیر و بھلائی سے محروم اور غضب الٰہی کا مستحق ہے۔ یہ بھیانک سزا جرم کے بھیانک ہونے پر دلالت کرتی ہے اور ہے بھی یہ بھیانک جرم، کیونکہ اس سے بڑا جرم اور کیا ہو سکتا ہے کہ اللہ کے صالح اور نیک بندوں کی قبروں کو، جو پوری عمر اللہ کے موحد بندے بن کر رہے اور ان کے اعمال صلاح و تقویٰ کے ترجمان رہے اور وہ لوگوں کو توحید کی دعوت دیتے رہے عبادت گاہوں اور سجدہ گاہوں میں تبدیل کر دیا جائے؟!!

نبی کریم ﷺ کے یہ ارشادات آپ کی زبان مبارک سے آپ کے مرض الموت میں جاری ہوئے ہیں جس سے

[1] بخاری: ۳۳۵۔ مسلم: ۵۲۱

Marfat.com

جہاں توحید کی اہمیت اور شرک کی سنگینی کا پتا چلتا ہے کہ اس نازک موقع پر بھی آپ اپنے منصب رسالت کے سب سے اہم اور بنیادی پہلو کو بیان کرنا نہ بھولے، جبکہ آپ اپنا پیغام مکمل طور پر پہنچا چکے تھے اور چند لمحوں بعد آپ کی روح پاک ''رفیق اعلیٰ'' کی طرف پرواز کرنے والی تھی، وہیں آپ کے ان ارشادات مبارکہ سے یہ یقین دہانی بھی ہوتی ہے کہ قبروں کو مسجدوں میں تبدیل کرنا، قبروں پر مسجدیں تعمیر کرنا، قبروں کے پاس سجدے کرنا اور وہاں سجدہ گاہیں، خانقاہیں، مزارات اور درگاہیں بنانا بدترین شرک ہے۔

اہل کتاب کے صلحا کی قبروں اور صوفیا کی قبروں میں فرق:

مذکورہ بالا حدیثوں میں جن لوگوں کی قبروں کو مسجدیں اور سجدہ گاہیں بنانے والوں پر لعنت کی گئی ہے ان میں رسول اللہ ﷺ نے ان کو صالحین کا لقب مرحمت فرمایا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ سب کچھ ان کی مرضی اور خواہش کے علی الرغم ہوا ہے اس طرح وہ اپنے ان عقیدت مندوں کے ان جرائم کے ذمہ دار نہیں تھے، اس کے برعکس مسلم ممالک میں عموماً اور برصغیر کے ملکوں میں خصوصاً جن صوفیا کی قبروں کو مسجدوں، سجدہ گاہوں اور درگاہوں میں تبدیل کیا گیا ہے وہ ان کی مرضی اور خواہش، بلکہ ایک طرح سے ان کے اشارے پر کیا گیا ہے، سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین اولیا اپنے ملفوظات: ''فوائد الفواد'' میں فرماتے ہیں: ایک شخص خواجہ کریم نامی تھے شروع عمر میں کتابت کیا کرتے تھے اور آخر عمر میں دنیا سے منہ موڑ کر مشغول طاعت الٰہی میں ہوئے کہ واصلان الٰہی سے ہو گئے، غلبات عشق میں فرماتے تھے کہ: جب تک میری قبر دہلی میں سلامت رہے گی کافر اس شہر پر مسلط نہ ہو سکیں گے۔ [1]

یہ تو ایک توحید نا آشنا، تصوف کی گود میں پلنے والے دین سے ناواقف، فریب خوردہ انسان کی بڑھتی، مگر سلطان المشائخ نظام الدین اولیا تو عالم و فاضل تھے ان کو کیا ہو گیا تھا کہ فرما گئے ہیں: جب حج کا شوق غالب ہوتا تو میں اجودھن جا کر اپنے پیر کی قبر کی زیارت کرتا اور اس سے میرا مقصود حج سے بھی زائد حاصل ہوتا۔ [2]

کیا اوپر نقل کردہ احادیث کی روشنی میں یہ دونوں واقعات اللہ و رسول سے اعلان جنگ نہیں ہیں؟

عجیب اور قابل عبرت ہے یہ بات کہ برصغیر میں جتنی قبریں، مزاروں، درگاہوں اور سجدہ گاہوں میں تبدیل کی گئی ہیں اور جہاں ہر سال عرس منائے جاتے ہیں، ہزاروں کی تعداد میں ان کے زائرین ان کو سجدہ کرتے ہیں اور ان میں مدفون نام نہاد ''واصلان الٰہی'' سے مرادیں مانگتے ہیں اور جہاں جوان مرد اور جوان عورتیں بن سنور کر جاتی ہیں اور فواحش کا ارتکاب ہوتا ہے صرف صوفیا کی قبریں ہیں جن میں سے ایک نظام الدین اولیا کی بھی قبر ہے جو مرجع خلائق ہے، جبکہ احادیث میں قبروں کو پختہ بنانے اور ان پر عمارتیں بنانے سے منع کیا گیا ہے۔

۱۔ ابو ھیاج اسدی سے روایت ہے، کہتے ہیں: مجھ سے علی بن ابو طالب نے فرمایا:

---

[1] آٹھویں مجلس، ص: ۶۸ [2] بحوالہ دین تصوف و طریقت، ص: ۱۵۷

Marfat.com

((ألا ابعثك على ما بعثني عليه رسول الله ﷺ؟ أن لا تدع تمثالا إلا طمسته، و لا قبرا مشرفا إلا سويته)) ❶

''کیا میں تمہیں اس مہم پر نہ بھیجوں جس پر مجھے رسول اللہ ﷺ نے بھیجا تھا، وہ یہ کہ تم کسی مجسمہ کو مٹائے بغیر اور کسی اونچی قبر کو زمین کے برابر کیے بغیر نہ چھوڑو۔''

۲۔ جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، کہتے ہیں:

((نهى رسول الله ﷺ أن يُجصَّصَ القبر ، و أن يُقعد عليه و أن يُبنى عليه)) ❷

''رسول اللہ ﷺ نے قبر پختہ کرنے، اس پر بیٹھنے اور اس پر عمارت بنانے سے منع فرمایا ہے۔''

نماز میں قبر کو قبلہ بنانا حرام ہے:

نماز میں قبر کو قبلہ بنانے کے دو معنی ہیں، ایک تو یہ کہ اصل قبلہ تو کعبہ مشرفہ ہی کو بنایا جائے، مگر اپنے اور قبلہ کے درمیان کسی قبر کو کر لیا جائے، جیسا کہ بعض نادان لوگ مسجد نبوی میں اس جگہ نماز پڑھنے کی کوشش کرتے ہیں جہاں ان کے اور قبلہ کے درمیان قبر مبارک آ جاتی ہے۔ دوم یہ کہ تنہا قبر ہی کی طرف رخ کر کے نماز پڑھی جائے، یہ دونوں صورتیں حرام ہیں۔

ابو مرثد غنوی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، کہتے ہیں: رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

((لا تجلسوا على القبور و لا تصلوا إليها)) ❸

''قبروں پر مت بیٹھو اور ان کی طرف رخ کر کے نماز مت پڑھو۔''

قبروں کی زیارت صرف جائز ہے:

یہود و نصاریٰ نے اپنے انبیاء اور صالحین کی قبروں سے متعلق جو طرز عمل اختیار کیا تھا اس کا حال رسول اللہ ﷺ کے ارشادات سے آپ کو معلوم ہو گیا، اس اندیشے کے پیش نظر ابتدائے اسلام میں رسول کریم ﷺ نے مسلمانوں کو زیارتِ قبور سے مطلقاً منع فرما دیا تھا کہ مبادا ان کے دلوں میں شرک کے جراثیم پیدا ہو جائیں، لیکن جب صحابہ کے دل توحید آشنا ہو گئے اور انہوں نے توحید کی لذت اور مٹھاس پا لی اور یہ خطرہ پوری طرح ٹل گیا کہ ان کے دلوں میں شرک داخل ہو سکے گا، تو آپ نے ایک دوسرے اہم مقصد کے لیے قبروں کی زیارت کی اجازت دے دی اور وہ مقصد یہ تھا کہ اس طرح ان کو موت اور آخرت کی یاد آتی رہے گی، چنانچہ سلیمان بن بریدہ اپنے والد بریدہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا: رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

---

❶ مسلم: ۹۶۹ ❷ مسلم: ۹۷۰
❸ مسلم: ۹۷۲

Marfat.com

((نهيتكم عن زيارة القبور ، فزوروها)) ❶

''میں نے تم لوگوں کو قبروں کی زیارت سے منع کر دیا تھا، تو ان کی زیارت کرو۔''

اس حدیث پاک میں اگرچہ ''زُوْرُوْهَا'' امر کا صیغہ آیا ہے، لیکن نہی کے بعد آنے کے وجہ سے اس سے صرف ''جواز'' کا حکم نکلتا ہے، اس کی تائید ایک دوسری حدیث سے ہوتی ہے جو علقمہ بن مرثد نے، سلیمان بن بریدہ سے اور انہوں نے اپنے والد بریدہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

((قد كنت نهيتكم عن زيارة القبور ، فقد أذن لمحمد في زيارة قبر أمه ، فزوروها ، فإنها تذكر الآخرة)) ❷

درحقیقت میں نے تم لوگوں کو قبروں کی زیارت سے روک دیا تھا، لیکن محمد کو اپنی ماں کی قبر کی زیارت کی اجازت دے دی گئی ہے، سو ان کی زیارت کرو، کیونکہ وہ آخرت کو یاد دلاتی ہیں۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس ارشاد مبارک میں اپنی والدہ ماجدہ کی قبر کی زیارت کے جس اذن اور اجازت کا مجملاً ذکر فرمایا ہے، دوسری حدیث میں اس کی تفصیل موجود ہے؛ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

((زار النبي ﷺ قبر أمه فبكى و أبكى من حوله ، فقال: استأذنت ربي في أن أستغفر لها ، فلم يؤذن لي ، و استأذنته أن أزور قبرها ، فأذن لي . فزوروا القبور ، فإنها تذكركم الموت)) ❸

''نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ماں کی قبر کی زیارت کی تو خود روئے اور اپنے پاس کے لوگوں کو رُلایا اور فرمایا: میں نے اپنے رب سے ان کے لیے استغفار کرنے کی اجازت مانگی تو مجھے اجازت نہیں دی گئی اور اس سے ان کی قبر کی زیارت کرنے کی اجازت مانگی، تو اس نے مجھے اجازت دے دی۔ لہٰذا قبروں کی زیارت کرو، کیونکہ وہ موت کو یاد دلاتی ہیں۔''

بریدہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ قبریں آخرت کو یاد دلاتی ہیں اور اس میں ہے کہ وہ موت کو یاد دلاتی ہیں، تو دونوں میں کوئی تضاد اور اختلاف نہیں ہے، اس لیے کہ موت آخرت کا دروازہ ہے اور دونوں کا ایک دوسرے سے گہرا تعلق ہے؛ موت کی یاد سے آخرت کی یاد اور آخرت کی یاد سے موت کی یاد جڑی ہوئی ہے۔

مذکورہ بالا حدیثوں میں ''قبور'' کی تعبیر آئی ہے جو عام لوگوں کی قبروں اور انبیاء اور صلحاء کی قبروں کے لیے عام ہے، اور ''زیارت قبور'' کے مقصد کو بیان کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اشارۃً ''موت اور آخرت'' کی یاد تازہ کرنے کے علاوہ

❶ مسلم: ۹۷۷، نسائی: ۲۰۳۱ ❷ ترمذی: ۱۰۵۴

❸ مسلم: ۹۷۶۔ ابو داود: ۳۲۳۴۔ نسائی: ۲۰۳۳۔ ابن ماجہ: ۱۵۷۲

Marfat.com

دوسرے تمام مقاصد کو غیر شرعی قرار دے دیا ہے، بلکہ سنن نسائی کی ایک حدیث میں نبی کریم ﷺ نے زیارت قبور کے موقع پر زبان سے کوئی غلط بات نکالنے سے منع فرما کر موت اور آخرت کی یاد تازہ کرنے کے علاوہ کسی اور غرض سے قبروں کی زیارت کو ممنوع قرار دے دیا ہے اور یہ بھی تصریح فرما دی ہے کہ اس شرط کے ساتھ قبروں کی زیارت صرف جائز ہے کہ اس موقع پر کوئی غلط اور گندی بات زبان سے نہ نکالی جائے، حدیث کے الفاظ ہیں:

((نهيتكم عن زيارة القبور، فمن أراد أن يزور، فليزُر، و لا تقولوا هُجرًا)) ❶

''میں نے تم لوگوں کو قبروں کی زیارت سے منع کر دیا تھا، تو جو کوئی زیارت کرنا چاہے وہ زیارت کرے اور کوئی گندی بات مت کہو۔''

''هُجر'' کسی غلط، گندی اور خلاف شرع بات کو کہتے ہیں اور مشرکانہ بات سے زیادہ غلط اور گندی بات کیا ہو سکتی ہے؟

زیارت قبور کا مقصد اصحاب قبور کی تعظیم نہیں ہے:

یوں تو لفظ ''قبور'' میں جس طرح عام لوگوں کی قبریں داخل ہیں اسی طرح صالحین کی قبریں بھی داخل ہیں، بلکہ غیر مسلموں کی قبروں پر بھی ان کا اطلاق ہوتا ہے اور رسول کریم ﷺ کے فعل سے اس کا ثبوت ملتا ہے کہ موت اور آخرت کو یاد دلانے کا ذریعہ غیر مسلموں کی قبریں بھی ہیں، یہاں یہ وضاحت غیر ضروری ہے کہ نبی کریم ﷺ کی والدہ ماجدہ کا شمار مومنین میں نہیں ہوتا، کیونکہ جہاں ان کی وفات قبل از بعثت اور زمانہ ''فترہ'' میں ہوئی تھی، وہیں ان کا شمار زمانہ جاہلیت کے موحدین -حنفاء- میں بھی نہیں ہوتا، ورنہ رسول اللہ ﷺ کی درخواست پر اللہ تعالیٰ ان کے لیے ''استغفار'' کی اجازت دے دیتا، لیکن اس نے رسول اللہ ﷺ کو ان کی قبر کی زیارت کی اجازت تو دے دی، مگر استغفار کی اجازت نہ دی۔

مزید یہ کہ احادیث کے مطابق چونکہ یہود و نصاریٰ نے اپنے انبیاء اور صلحاء کی قبروں پر سجدہ گاہیں اور گرجے ان کی تعظیم اور عقیدت ہی کے جذبے سے تعمیر کیے تھے اور اللہ تعالیٰ کی لعنت اور غضب کے مستحق قرار پائے تھے اور صوفیا کے اندر یہ جذبات ان سے ''فزوں تر'' ہیں، اس لیے قبروں کی زیارت کے موقع پر اصحاب قبور کی تعظیم و عقیدت کا جذبہ زائر کو اس اصل مقصد سے دور کر دیتا ہے جس کے لیے قبروں کی زیارت کی اجازت دی گئی ہے اور اگر اس کے ساتھ صوفیا کے اس ''عقیدہ'' کو بھی شامل کر لیجیے کہ ان کے خود ساختہ اولیاء اور صالحین ''مرتے ہی نہیں'' بلکہ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہو جاتے ہیں، تو پھر ان کے صلحاء کی قبروں کی زیارت ممنوع قرار پاتی ہے، کیونکہ اس عقیدہ کے ہوتے ہوئے، ان کی زیارت سے موت و آخرت کو یاد کرنے کا کوئی امکان ہی نہیں رہ جاتا اور میں نے اوپر یہ عرض کیا ہے کہ احادیث کے اسلوب بیان کی رُو سے قبروں کی زیارت صرف جائز ہے اور یہ بھی اس شرط کے ساتھ کہ زیارت کرتے ہوئے زبان سے کوئی ایسی بات نہ نکالی جائے جو خلاف شرع ہو یا جس سے یہ معلوم ہو کہ زائر صاحب قبر، یا اصحاب قبور کو صاحب تصرف

❶ ص ۲۰۳۲

Marfat.com

سمجھتا ہے اور ان کو اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے کسی صفت سے موصوف مانتا ہے۔ اس سلسلے میں اگر کسی مسلمان کا گزر مسلمانوں کی قبروں کے پاس سے ہو تو وہ ان کی سلامتی کے لیے وہ دعا کرے جس کی تعلیم ہمارے نبی فداہ ابی و امی ﷺ نے دی ہے:

((السلام عليكم أهل الديار من المؤمنين و المسلمين ، و إنا إن شاء الله للاحقون أسأل اللهَ لنا و لكم العافية)) ❶

''اے مومنوں اور مسلمانوں کی بستی کے رہنے والو، تم پر سلامتی ہو ان شاء اللہ ہم تم سے ملنے والے ہیں، میں اللہ سے اپنے لیے اور تمہارے لیے عافیت کا سوال کرتا ہوں۔''

اور ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا کی ایک طویل حدیث کے آخر میں آیا ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ زیارت قبر کے موقع پر وہ کیا کہیں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا:

((قولى السلام على أهل الديار من المؤمنين و المسلمين ، و يرحم الله المستقدمين منا و المستأخرين ، و إنا إن شاء الله بكم للاحقون)) ❷

''کہو: مومنوں اور مسلمانوں کی بستی والوں پر سلامتی ہو اور اللہ ہم میں سے ان لوگوں پر رحم فرمائے جو آگے جا چکے اور جو بعد میں جانے والے ہیں ان شاء اللہ ہم تم سے ملنے والے ہیں۔''

خاص طور پر صلحاء کی قبروں کی زیارت کا ذکر کسی حدیث میں نہیں آیا ہے اور زیارت کا مقصد واضح کر دینے اور بیان کر دینے کے بعد یہ تخصیص بے معنی تھی اور کلام نبوت اس عیب سے پاک ہے۔ ''زیارت قبور صالحین'' تو صوفیا کی ایجاد ہے جو ان کی مشرکانہ ذہنیت کی پیداوار ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے اپنی قبر مبارک کی زیارت کا حکم نہیں دیا ہے:

حدیث کی مستند کتابوں میں ''حسن'' درجہ کی بھی ایسی کوئی حدیث منقول نہیں ہے جس میں رسول اللہ ﷺ نے اپنی قبر مبارک کی زیارت کا حکم دیا ہو، یا اس کی زیارت کی ترغیب دی ہو اور اس زیارت کا کوئی اجر و ثواب ہی بیان کیا ہو، اس مضمون کی حامل جتنی روایات کتابوں میں متداول اور صوفیا اور غیر صوفیا کے حلقوں میں زبان زد ہیں وہ حدیث نہیں جھوٹ ہیں اور ان کا ذکر چوتھی صدی ہجری اور پانچویں صدی ہجری میں مرتب کی جانے والی کتابوں میں آیا ہے اور ان کو منظم اور مرتب شکل میں منظر عام پر لانے والے تقی الدین سبکی متوفی ۷۵۶ھ مصنف ''شفاء السقام فی زیارة سید الأنام'' اور حافظ سیوطی متوفی ۹۱۱ھ مصنف ''الدر المنثور'' ہیں اور برصغیر کے صوفیا اور احناف ان جھوٹی روایتوں سے مکہ مکرمہ میں مقیم شیخ احمد زینی دحلانی متوفی ۱۳۰۴ھ کی کتاب ''الدرر السنية فی الرد علی الوهابية'' کے ذریعہ

❶ مسلم: ۹۷۵ ❷ مسلم: ۹۷۴

Marfat.com

سے واقف ہوئے ہیں جن سے حاجی امداد اللہ، مولانا رحمۃ اللہ کیرانوی اور مولانا خیر الدین کا بڑا یارانہ تھا جس کا ذکر اوپر آ چکا ہے اور دحلان کا اپنی مذکورہ کتاب میں تمام تر اعتماد سبکی کی کتاب پر تھا۔

محدثین کی طرح ائمہ اربعہ اور جمہور علمائے اہل سنت و جماعت کی کتابیں بھی قبر مبارک کی زیارت کی مسنونیت یا استحباب کے ذکر سے چوتھی اور پانچویں صدی تک خاموش ملتی ہیں۔

دعائے رسول ﷺ: اے اللہ! میری قبر کو بت نہ بننے دیجیو!

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ نبی ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

((اللّٰهم لا تجعل قبري وَثَنًا، لعن الله قومًا اتخذوا قبور أنبيائهم مساجدَ)) [1]

''اے اللہ! تو میری قبر کو بت نہ بننے دیجیو، ان لوگوں پر اللہ کی لعنت ہو جنہوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو سجدہ گاہیں بنالیا۔''

رسول اللہ ﷺ نے اپنی اس دعا میں، اللہ تعالیٰ سے یہ درخواست کرنے کے بعد کہ وہ آپ کی قبر مبارک کو بت بننے سے محفوظ رکھے ان لوگوں پر بددُعا کی ہے جنہوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو سجدہ گاہوں میں تبدیل کر دیا ہے اس طرح حدیث کے دونوں فقروں میں یہ ربط ہے کہ انبیاء ﷷ کی قبروں پر خصوصاً اور دوسرے صالحین اور بزرگوں کی قبروں پر عموماً مسجدیں تعمیر کرنا، خانقاہیں، درگاہیں اور قبے بنانا اور ان کو مزاروں میں تبدیل کرنا وغیرہ ان کو بت بنانا ہے، کیونکہ یہ سب غیر اللہ کی عبادت اور پرستش ہی کے مظاہر ہیں، جن کی امر واقعہ کی روشنی میں دلیل یہ ہے کہ ان تمام جگہوں پر جن افعال کا ارتکاب کیا جاتا ہے وہ سب غیر اللہ کی عبادت میں داخل ہیں؛ کیا نام نہاد اولیا کی قبروں کو سجدے نہیں کیے جاتے، کیا قبروں پر بنے مزاروں، خانقاہوں اور درباروں میں، اصحاب قبور سے فریادیں نہیں کی جاتیں، ان سے اولاد نہیں مانگی جاتی، ان سے بیماریوں سے شفا اور مصائب و آفات سے نجات اور دشمنوں پر فتح و غلبہ طلب نہیں کیا جاتا اور رزق میں کشادگی کی درخواست نہیں کی جاتی وغیرہ، جبکہ ان میں سے ہر چیز پر صرف اللہ تعالیٰ قادر ہے؛ تنہا وہی مستغاث اور مستعان ہے، بایں معنی کہ مافوق الاسباب امور میں صرف اسے پکارا جائے، اور صرف اس سے مدد طلب کی جائے، کیونکہ کسی کو اولاد دینے پر صرف وہی قدرت رکھتا ہے، بیماریوں سے شفا دینے والا صرف وہی ہے، رزق کے خزانوں کا مالک تنہا وہی ہے اور اس کے علاوہ کوئی اور نہیں ہے جو مصائب و آفات سے کسی کو نجات دے سکے اور دشمنوں پر فتح و غلبہ سے ہمکنار کر سکے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے اور رسول کی اس دعا کو شرف قبولیت سے نوازا اور آپ کی قبر مبارک کو بت بننے سے ہر

---

[1] مسند امام احمد: ۷۳۵۸۔ حمیدی: ۱۰۲۵۔ طبقات ابن سعد، ص: ۲/۲۴۱-۲۴۲۔ التمهيد لابن عبدالبر: ۵/۴۳-۴۴۔ التاريخ الكبير للبخاري: ۳/۴۷

Marfat.com

طرح محفوظ رکھا کہ کسی بھی دور میں آپ کی قبر مبارک کے پاس ان مشرکانہ افعال کا ارتکاب نہیں ہوا جن کا ارتکاب برصغیر میں موجود مزاروں پر ہوتا ہے۔ البتہ دلوں کی بات الگ ہے اور شیخ محمد بن عبدالوہاب کی اصلاحی دعوت کے برگ و بار لانے سے پہلے، اس کے بعد اور موجودہ وقت میں زائرین کی اکثریت جس نیت اور ارادے سے قبر مبارک کی زیارت کرتی ہے، پھر غیر مسموع آواز میں براہ راست آپ سے دعائیں مانگتی ہے، آپ سے شفاعت کی درخواست کرتی ہے، آپ کا واسطہ دے کر اللہ سے بخشش طلب کرتی ہے اور آپ سے اپنی پریشانیوں کے ازالے، رزق میں کشادگی اور بیماریوں سے شفا کی درخواست کرتی ہے وغیرہ تو یہ سب کچھ اگرچہ صریح شرک ہے، مگر بدعقیدہ اور گمراہ لوگوں کے دلوں اور زبانوں کو ان سے پاک کرنا نبی ﷺ کی دعا میں داخل نہیں ہے، اور چونکہ لوگ ان مشرکانہ باتوں کا باآواز بلند اظہار نہیں کر سکتے اس لیے ان سے لوگوں کو روکنا اور منع کرنا ان محافظوں کی ذمہ داری بھی نہیں ہے جو وہاں ہر وقت تعینات رہتے ہیں، البتہ یہ محافظ کسی بھی زائر کو قبر مبارک کی طرف رخ کر کے طویل دعا نہیں مانگنے دیتے۔

قبر مبارک کے پاس میلہ لگانا منع ہے:

رسول اللہ ﷺ نے اپنی قبر مبارک کے پاس، میلہ لگانے، اور جم گھٹا کرنے سے منع فرمایا ہے، ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، کہتے ہیں: رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

((لا تجعلوا بيوتكم قبورا، و لا تجعلوا قبري عيدًا، و صلوا عليَّ، فإن صلاتكم تبلغني حيث كنتم)) [1]

''اپنے گھروں کو قبرستان مت بناؤ اور میری قبر کو جشن گاہ مت بناؤ اور میرے اوپر درود بھیجو؛ تمہارا درود، تم جہاں کہیں بھی ہو مجھے پہنچ جائے گا۔''

گھروں کو قبرستان بنانے سے اس لیے منع کیا گیا ہے، تاکہ ان میں نفل نمازوں کا اہتمام کیا جائے اور قرآن پاک کی تلاوت اور دوسرے اذکار سے ان کو معمور رکھا جائے اور ان کا حال قبرستان کا نہ بنا دیا جائے، جہاں شرعاً کسی طرح کی کوئی عبادت نہیں کی جاتی، ذکر و اذکار اور تلاوت قرآن وغیرہ کی تلاوت بھی نہیں کی جاتی۔

اور رسول اللہ ﷺ نے اپنی قبر مبارک کو ''جشن گاہ'' بنانے سے جو منع فرمایا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے پاس جمع ہونے، جم گھٹا لگانے، میلہ لگانے اور اجتماع کرنے اور جمع ہونے کو معمول نہ بنایا جائے عربی میں عید کا اطلاق ایسی تقریب، اجتماع، جشن اور میلے پر ہوتا ہے جو بار بار آئے اور بار بار اس کا مظاہر کیا جائے اور ایک طرح سے اس کو معمول بنا لیا جائے، برصغیر کے ملکوں میں موجود مزاروں پر جو سالانہ عرس منائے جاتے ہیں، ملک کے طول و عرض سے جہاں لوگ جمع ہوتے ہیں اور مرد و عورتیں ایک ساتھ میلے لگاتے ہیں اس سے حدیث کے اس فقرے کو سمجھا جا سکتا ہے۔

[1] ابو داود: ۲۰۴۲

Marfat.com

اس فقرے سے یہ مطلب بھی نکلتا ہے کہ قبرِ مبارک کی زیارت کو معمول نہ بنایا جائے، بلکہ جب کوئی مسجد نبوی کی زیارت کے لیے مدینہ جائے تو اس موقع پر اس کی بھی زیارت کر لے۔

قبروں کے پاس یا قبرستان میں قرآن کی تلاوت کی عدم مشروعیت اس حدیث سے واضح ہے:

((لا تجعلوا بيوتكم مقابرَ، فإن الشيطان يفر من البيت الذى يُقرأ فيه سورة البقرة.)) ❶

اپنے گھروں کو قبرستان مت بناؤ، کیونکہ شیطان اس گھر سے بھاگتا ہے جس میں سورۂ بقرہ پڑھی جاتی ہے۔"

حدیث میں جو یہ فرمایا گیا ہے کہ "شیطان اس گھر سے بھاگتا ہے جس میں سورۂ بقرہ پڑھی جاتی ہے" تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ گھروں میں صرف سورۂ بقرہ ہی پڑھی جائے، بلکہ یہ دراصل سورۂ بقرہ کی ایک خصوصی فضیلت کا بیان ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے جو یہ فرمایا ہے کہ: "تمہارا درود و سلام مجھے پہنچ جاتا ہے" تو عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی ایک حدیث میں یہ تصریح ہے کہ زمین میں اللہ کے کچھ فرشتے گھومتے پھرتے رہتے ہیں، وہی نبی ﷺ کو آپ کی امت کا سلام پہنچاتے رہتے ہیں:

((إن لله فى الأرض ملائكة سياحين يبلغونى من أمتى السلام.)) ❷

"درحقیقت زمین میں اللہ کے کچھ فرشتے گھومتے پھرتے ہیں وہ مجھے میری امت کا سلام پہنچا دیتے ہیں۔"

اس حدیث سے دو باتیں معلوم ہوئیں:

۱۔ رسول کریم ﷺ ہمارا درود و سلام خود نہیں سنتے، چاہے وہ قریب سے کیا جائے یا دور سے، بلکہ فرشتے یہ دورد و سلام آپ کو پہنچا دیتے ہیں، رہی وہ حدیث جس میں آیا ہے کہ:

((من صلى عليَّ عند قبرى سمعته، و من صلى علىٰ نائيا أبلغته)) ❸

"جو میری قبر کے پاس سے مجھ پر درود بھیجتا ہے وہ میں سنتا ہوں اور جو مجھ پر دور سے درود بھیجتا ہے وہ مجھے پہنچا دیا جاتا ہے۔"

تو یہ حدیث نہیں جھوٹ ہے اس کا راوی محمد بن مروان سدی کذاب تھا، اس کا متن بھی اسلامی عقیدہ کے خلاف ہے، کیونکہ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو دنیوی زندگی حاصل ہے جو اسلامی عقیدے کے خلاف ہے۔

یاد رہے کہ رسول اللہ ﷺ کو صرف اہل توحید کا درود و سلام پہنچایا جاتا ہے، رہے وہ لوگ جن کے عقیدہ و عمل میں ذرہ برابر بھی شرک ہے ان کا کوئی بھی عمل شمار ہی نہیں ہوتا، اور درود و سلام بھی عمل ہے، اللہ تعالیٰ اپنے نبی کو مخاطب کر

---

❶ ۲۸۲۱۔ مسلم: ۷۸۰ ❷ السنن الکبریٰ للنسائی: ۹۲۰۴۔ مسند امام احمد: ۳۶۶۶، ۴۲۱۰، ۴۳۲۰، ۴۲۲۴

❸ مشکوٰۃ المصابیح: ۹۳۴

Marfat.com

کے فرماتا ہے:

﴿ .... لَئِنْ أَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ وَلَتَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ ۝﴾ (الزمر: ٦٥)

''اگر تم نے شرک کیا تو یقیناً تمہارا عمل ضائع ہو جائے گا اور تم یقیناً نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو جاؤ گے۔''

۲۔ حدیث سے دوسری جو چیز معلوم ہوتی ہے وہ یہ کہ درود وسلام کی غرض سے بھی قبر مبارک کی زیارت غیر ضروری ہے۔

قبر مبارک کی ترغیب دلانے والی روایتوں کی حقیقت:

اوپر زیارت قبور، صالحین کی قبروں پر سجدہ گاہیں تعمیر کرنے کی نکارت اور رسول اللہ ﷺ کی قبر مبارک کے بت بنائے جانے سے تحفظ اور قبر مبارک کے پاس میلہ لگانے کی ممنوعیت سے متعلق جو صحیح حدیثیں پیش کی گئی ہیں ان سے روزِ روشن کی طرح یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی قبر مبارک کی زیارت عام قبروں کی زیارت کے حکم میں داخل ہے اور ان لوگوں کے لیے جائز ہے جو مخصوص طور پر مسجد نبوی میں نماز ادا کرنے کی غرض سے مدینہ کا سفر کریں۔ لیکن اس زیارت کا کوئی خاص اجر وثواب نہیں ہے، اگر اجر وثواب ہے تو صرف درود وسلام پڑھنے کا ہے جو دنیا کے کسی بھی حصے سے پڑھنے والے ''موحد'' کے حق میں درج کیا جاتا ہے، قبر مبارک کی زیارت کا مخصوص اجر وثواب اس صورت میں ہوتا جب آپ کی یا آپ کی قبر کی تعظیم کی نیت سے اس زیارت کی ''مشروعیت'' ثابت ہوتی، لیکن جہاں یہ مشروعیت غیر ثابت ہے، وہیں اسلام کے توحیدی مزاج اور رسول اللہ ﷺ کے ارشادات کے منافی بھی ہے اس تناظر میں یہ زیارت غیر مرغوب فیہ ہے۔

ان باتوں کے واضح ہو جانے کے بعد ایسی روایتوں کے ذکر کی چنداں ضرورت نہیں تھی جن سے قبرِ مبارک کی زیارت کی فضیلت کا اشارہ ملتا ہے۔ لیکن چونکہ صوفیا کے حلقوں میں یہی روایتیں معروف ہیں اور ان کی بنیاد پر انہوں نے قبر مبارک کی زیارت کو جواز کے دائرہ سے نکال کر وجوب اور شبہِ وجوب کے درجے تک پہنچا دیا ہے اس لیے ان کی حقیقت کا بیان ضروری ٹھہرا۔

میں نے اپنی کتاب۔ ''موضوع اور منکر روایات'' ۔ میں ان روایتوں کی سند اور متن کے موضع اور من گھڑت ہونے کو دلائل سے بیان کر دیا ہے تفصیل کے خواہش مند اس سے رجوع کر سکتے ہیں (ص: ۳۹۷ تا ۴۱۸) یہاں میں ان کی استنادی حیثیت پر گفتگو نہیں کروں گا، صرف مختصراً ان کے درجات بیان کرنے پر اکتفا کروں گا۔

:...... ((...... من حج و لم یزرنی فقد جفانی))

''جس نے حج کیا اور میری زیارت نہیں کی اس نے مجھ سے بے رخی برتی۔''

یہ حدیث نہیں جھوٹ ہے، جس کا گھڑنے والا محمد بن محمد، یا اس کا دادا نعمان بن شبلی ہے، بہر حال دونوں جھوٹے تھے۔ ❶

❶ الکامل: ۷/ ۲۲۸۔ الضعفاء: ۳/ ۷۳۔ الموضوعات: ۲/ ۵۹۷، ۵۹۸

Marfat.com

اس کا متن شرعاً باطل ہے، کیونکہ مسجد نبوی اور قبر مبارک کی زیارت حج کے اعمال میں داخل نہیں ہے۔

۲:...... ((من حج فزار قبری بعد موتی ، کان کمن زارنی فی حیاتی))

''جس نے حج کیا اور میری موت کے بعد میری قبر کی زیارت کی وہ اس شخص کے مانند ہے جس نے میری زندگی میں میری زیارت کی۔''

اس روایت کی سند میں متعدد ضعیف، جھوٹے اور حدیث وضع کرنے والے راوی شامل ہیں۔ ❶

اس روایت کے باطل ہونے کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ اس میں قبر مبارک کی زیارت کرنے والے کو صحابی کے برابر قرار دے دیا گیا ہے جو مسلمہ اسلامی عقیدہ کے خلاف ہے۔

یاد رہے کہ نبی ﷺ کی قبر مبارک کی زیارت کرنے والا آپ کی زیارت کرنے والا اس اعتبار سے بھی نہیں قرار دیا جا سکتا کہ ''زیارت'' کا لفظ کسی کی زندگی میں اس سے ملاقات کرنے کے لیے بنا ہے، لہٰذا قبر کی زیارت صاحبِ قبر کی زیارت نہیں قبر کی زیارت ہے، اسی طرح خواب میں کسی کو دیکھنے اور اس سے ملنے پر بھی اس کی زیارت کی تعبیر صحیح نہیں ہے۔

۳:...... ((من زارنی بعد موتی فکأنما زارنی فی حیاتی))

''جس نے میری موت کے بعد میری زیارت کی، اس نے گویا میری زندگی میں میری زیارت کی۔''

یہ بھی حدیث نہیں جھوٹ ہے اور زبان اور شرع دونوں اعتبار سے باطل ہے یہ دراصل صوفیا کے عقیدہ کی ترجمان ہے جو نبی ﷺ کو خصوصاً اور اپنے نام نہاد ''اولیاء'' کی موت کے قائل نہیں ہیں۔

سند کے اعتبار سے یہ صرف ضعیف ہے اس کا راوی ہارون ابو قزعہ ضعیف ہے جس کو بعض لوگوں نے ہارون بن قزعہ بتایا ہے۔ ❷

٤:...... ((من زار قبری وجبت له شفاعتی))

''جس نے میری قبر کی زیارت کی اس کے لیے میری شفاعت واجب ہوگئی۔''

یہ بھی جھوٹ ہے اور متن کے اعتبار سے منکر ہے۔ اس کا ایک راوی عبداللہ بن ابراہیم غفاری اور دوسرا عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم منکر اور جھوٹے تھے۔ ❸

قیامت کے دن نبی ﷺ کی شفاعت کا مستحق صرف ایسا موحد ہوگا جس نے صدق دل سے ''لا إله إلا الله'' کہا ہوگا۔ ❹

---

❶ المعجم الکبیر: ۳/۲۰۳۔ المعجم الأوسط: ۴/۲۲۲، حدیث نمبر: ۳۴۰۔ الکامل: ۲/۷۸۸-۷۸۹۔ سنن دارقطنی، ص: ۲۷۹۔ سنن بیہقی: ۵/۲۴۶

❷ الصارم المنکی، ص: ۳۰۔ الضعیفہ: ۳/۸۹-۹۱، حدیث نمبر: ۱۰۲۱۔ ❸ الصارم المنکی، ص: ۳۳۔ الإرواء: ۱۱۲۸)

❹ بخاری: ۹۹، ۶۵۷۰

Marfat.com

مذکورہ روایت ان الفاظ میں بھی زبان زد ہے: ((من زار قبری حلت له شفاعتی)).

۵:...... ((من جاء نی زائرا لا تعمله حاجة إلا زيارتی كان حقا علیّ أن أكون شفيعا له يوم القيامة))

''جو میری زیارت کے لیے میرے پاس آئے، میری زیارت کے سوا اس کی کوئی اور غرض نہ ہو تو میرے اوپر یہ واجب ہے کہ بروز قیامت میں اس کے لیے شفاعت کرنے والا بنوں۔''

یہ روایت اپنی سند اور متن میں منکر ہونے کے باوجود قبر مبارک کی زیارت کے لیے محل استدلال نہیں ہے اور اس سے نبی ﷺ کی حیات پاک میں آپ سے ملاقات کرنے کی غرض سے آپ کی خدمت میں حاضر ہونے والے کے مستحق شفاعت ہونے پر بھی استدلال صحیح نہیں ہے، کیونکہ کسی شخص کے، آپ کی شفاعت کا مستحق ہونے کی بنیادی شرط اس کا مومن ہونا یا ایمان لانے کے لیے آپ کی خدمت میں حاضر ہونا ہے، اور یہ دونوں چیزیں اس روایت میں مفقود ہیں اور یہ ثابت ہے کہ کفار ایمان لانے کے علاوہ دوسری غرض سے بھی مدینہ حاضری دیتے تھے اور نبی ﷺ سے ملاقات کرتے تھے، خصوصیت کے ساتھ ''عام الوفود'' میں اور اس کے بعد۔

اس کی سند کا حال یہ ہے کہ اس کی روایت میں ایک ایسا راوی منفرد ہے جس کو حدیث کی روایت اور تحمل میں کوئی شہرت حاصل نہیں اور نہ اس کا حال ہی معروف ہے یعنی وہ مجہول ہے اس کا نام مسلمہ بن سالم جہنی بصری ہے اور اس سے اس کی روایت کرنے والا عبداللہ بن محمد عبادی ہے جس کی منفرد مرویات نا قابل استدلال ہیں۔ [1]

میرے خیال میں یہ دکھانے کے لیے کہ نبی ﷺ کی قبر مبارک کی زیارت کی فضیلت میں کوئی ایک بھی روایت صحیح نہیں ہے، صرف اتنی جھوٹی اور منکر روایتوں کا ذکر کافی ہے۔

صحابہ اور تابعین کا طرزِ عمل:

مشہور محدث محمد شبیر سہسوانی رحمہ اللہ کی کتاب: ''زیارتِ قبرِ نبوی'' کے مقدمہ میں امام ابن تیمیہ کی کتابوں کے منفرد محقق اور حدیث کے مستند عالم مولانا محمد عزیر شمس تحریر فرماتے ہیں:

''صحابہ کرام اور تابعین کے زمانے میں لوگ قبر کے پاس حجرے کے اندر جاتے نہ باہر کھڑے ہوتے، حالانکہ وہ دن رات میں پانچ بار نماز کے لیے مسجد نبوی آتے تھے۔ اس طرح دور دور سے لوگ خلفائے راشدین سے ملنے اور دوسرے کاموں کے لیے مدینہ آتے، مسجد میں نماز پڑھتے اور نماز میں نبی ﷺ پر درود وسلام پڑھتے اور ایسا ہی مسجد میں داخل ہوتے اور اس سے نکلتے ہوئے درود وسلام پڑھتے، قبر کے پاس نہیں جاتے، کیونکہ ایسا کوئی حکم رسول اللہ ﷺ نے نہیں دیا تھا، ہاں ابن عمر اور بعض صحابہ نے قبر کے پاس

[1] الصارم المنکی، ص: ۴۹

Marfat.com

جا کر سلام پڑھا ہے، اس لیے علماء اسے جائز سمجھتے ہیں، ضروری نہیں۔

چنانچہ خلفائے راشدین اور جمہور صحابہ حج یا جہاد وغیرہ کے لیے مدینہ سے نکلتے، پھر لوٹتے، مگر قبر نبوی کے پاس حاضری نہ دیتے، کیونکہ اس طرح کی کوئی سنت ان کے علم میں نہیں تھی، ازواج مطہرات بھی خلفائے راشدین کے زمانے میں اور ان کے بعد حج کے لیے سفر کرتیں، پھر واپس اپنے گھر چلی جاتیں، قبر نبوی کا رُخ نہ کرتیں، نیز ابوبکر اور عمر فاروق کے زمانے میں یمن وغیرہ سے جہاد کے لیے فوجیں مدینہ آتیں، وہ مسجد نبوی میں نماز پڑھتیں ان میں سے کوئی نہ قبر نبوی والے حجرے میں جاتا اور نہ ہی اس سے باہر نماز یا دعا یا درود وسلام کے لیے کھڑا ہوتا، اگر ایسا کرنا سنت ہوتا تو اس پر کثرت سے ان کا عمل ہوتا اور وہ ان کے درمیان معروف ومشہور بات ہوتی، مگر ایسا کوئی عمل حدیث وتاریخ کی کتابوں سے ثابت نہیں۔"

امام مالک متوفی ۱۷۹ھ مدینہ والوں کے لیے زیارت قبر مبارک کو ضروری نہیں بتاتے، بلکہ جو سفر سے واپس آئیں یا جو باہر سے مدینہ آئیں ان کے لیے وہ اسے جائز سمجھتے ہیں کہ ایسا کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ لوگوں نے امام صاحب سے پوچھا کہ مدینہ کے کچھ لوگ سفر کے بغیر بھی ہر دن ایک یا اس سے زیادہ بار زیارت کرتے ہیں، بلکہ جمعہ اور دوسرے دنوں میں کئی کئی بار قبر کے پاس جا کر دیر تک کھڑے رہتے ہیں اور سلام ودعا کرتے ہیں ان کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ آپ نے فرمایا: ہمارے شہر (مدینہ) میں کسی فقیہ وعالم سے یہ منقول نہیں اور اس پر عمل نہ کرنا ہی بہتر ہے، اس امت میں بعد میں آنے والوں کی اصلاح اسی طریقے سے ممکن ہے جس طریقے سے دورِ اوّل میں ہوتی تھی، مجھے علم نہیں کہ دور اوّل میں صحابہ وتابعین نے ایسا کیا ہو، اس لیے مدینہ سے سفر پر جانے یا آنے والوں کے علاوہ دوسروں کے لیے ایسا کرنا مکروہ ہے۔ [1]

مزید یہ کہ جزیرۂ عرب کے ہمسایہ ملکوں میں کثیر تعداد میں انبیاء اور رسول مدفون ہیں۔ خلفائے راشدین کے دور میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ان ملکوں کو فتح کیا، فلسطین اور شام میں تو بڑی تعداد میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے سکونت اختیار کر لی تھی، مگر کوئی ایک بھی ایسا واقعہ نہیں ملتا کہ کسی بھی صحابی نے کسی نبی یا رسول کی قبر کی زیارت کی ہو، اور تو اور خلیفۂ دوم عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں بیت المقدس فتح ہوا اور اہل ایلیا (نصاریٰ) کے لیے امان نامہ لکھنے کی غرض سے خلیفہ دوم نے بنفس نفیس بیت المقدس کا سفر کیا اور امان نامہ لکھ کر اہل ایلیا کو دیا۔ اس موقع پر امیر الجیش ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ سمیت متعدد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم موجود تھے فرحت وشادمانی اور اللہ تعالیٰ کے شکر کا موقع تھا اور بیت المقدس سے قریب ہی "حبـــرون" موجودہ الخلیل واقع ہے جہاں ابراہیم خلیل اللہ ان کے بیٹے اسحاق اور پوتے یعقوب (۲۸) مدفون ہیں کیا تصوف کی قبوری شریعت کی رو سے یہ مناسب نہیں تھا کہ وہ اور صحابہ "فاتحہ خوانی" کے لیے ان کی قبروں پر حاضری دیتے؟

[1] الشفاء للقاضی عیاض: ۹۲/۲۔ مقدمہ، ص: ۱۰-۱۱

Marfat.com

جیسا کہ اکابر صوفیا خوشی اور غم کے موقعوں پر اپنے مشائخ کی قبروں پر حاضر ہوتے ہیں۔

صوفیا کے دلائل:

صحیح احادیث کی روشنی میں آپ کو عام قبروں کی زیارت اور نبی ﷺ کی ''قبرِ مبارک'' کی زیارت کا حکم معلوم ہو گیا اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ قبروں کی زیارت کی اجازت صرف موت اور آخرت کی یاد تازہ کرنے کے لیے دی گئی ہے، دوسرے لفظوں میں ''اصحاب قبور'' کی تعظیم اس زیارت کی مشروعیت کا سبب نہیں ہے اس طرح صالحین کی قبروں کی زیارت کی تخصیص صوفیانہ ذہنیت کی پیداوار ہے جو نہ اسلامی ہے اور نہ اسلام کے توحیدی مزاج سے ہم آہنگ ہی ہے۔

اسی طرح یہ حقیقت بھی واضح ہو گئی کہ کسی بھی صحیح حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے مخصوص طور پر اپنی قبر کی زیارت کی اجازت نہیں دی ہے، لہٰذا یہ زیارت، زیارتِ قبور کی عمومی اجازت میں داخل ہے اور صرف جائز ہے بشرطیکہ آپ پر درود وسلام پڑھنے پر اکتفا کیا جائے اور آپ کو مخاطب کر کے دعا کی شکل میں کچھ بھی طلب نہ کیا جائے، ورنہ یہ زیارت شرک میں تبدیل ہو جائے گی اور ایسا کرنے والا ان یہود و نصاریٰ کے مانند ہو جائے گا جن پر رسول اللہ ﷺ نے لعنت بھیجی ہے۔

یہ ساری باتیں صرف صحیح احادیث کی روشنی میں بیان کی گئی ہیں اور کوئی بات بھی اپنے ذوق و پسند سے، یا محض صوفیا کی مخالفت میں نہیں کہی گئی ہے۔

اب آیئے یہ دیکھیں کہ نبی کریم ﷺ کی قبر مبارک کی زیارت کے مسئلہ میں اکابر صوفیا کیا عقیدہ رکھتے ہیں اور ان کے اس عقیدہ کا ماخذ کیا ہے؟

۱۔ مولانا خلیل احمد متوفی ۱۳۴۶ھ (مطابق ۱۹۲۷م) کا شمار دیوبند کے اکابر صوفیا میں ہوتا ہے۔ یاد رہے کہ دار العلوم کے مؤسسین، اور ان کے رفقاء سب کے سب صوفی اور حنفی تھے اور مولانا خلیل احمد کی کتاب ''المھند علی المفند'' دراصل صوفیائے دیوبند اور علمائے دیوبند کے عقائد کی کتاب ہے جو درحقیقت انہوں نے بریلوی عقیدہ کے بانی مولانا احمد رضا خاں کے ان الزامات کے جواب میں تحریر فرمائی تھی جو انہوں نے علمائے دیوبند پر لگائے تھے اور ان کو وہابی قرار دیتے ہوئے اہل سنت و جماعت سے خارج کر دیا تھا، یہ واقعہ ۱۳۲۳ھ (مطابق ۱۹۰۵ء) کا ہے۔

مولانا خلیل احمد کا علمی مقام و مرتبہ اور صلاح و تقویٰ، صوفیائے دیوبند کے نزدیک جس مقام بلند پر تھا اس کا اندازہ تبلیغی جماعت کے معلم و مربی مولانا زکریا صاحب کے اس دعویٰ سے لگایا جا سکتا ہے کہ ''جب وہ حرم پاک میں داخل ہوتے تھے تو پورا حرم بقعہ نور بن جاتا تھا۔ [1] یہ اس وقت کا واقعہ ہے جب حرم میں بجلی نہیں داخل ہوئی تھی۔

مولانا خلیل نے زیارت قبر نبوی کا حکم ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے بیان فرمایا تھا، سوال و جواب حسب ذیل ہے:

[1] فضائل اعمال: ۱/۳۵۴، فضائل ذکر

Marfat.com

سوال:...... ۲۔ أی الأمرين أحب إليكم و أفضل لدى أكابركم للزائر هل ينوى وقت الارتحال للزيارة زيارته ﷺ أو ينوى المسجد أيضا و قد قال الوهابية أن المسافر إلى المدينة لا ينوى إلا المسجد النبوی .

''آپ کے نزدیک اور آپ کے اکابر کے نزدیک زیارت کرنے والے کی ان دو باتوں میں سے کون سی بات زیادہ پسندیدہ اور بہتر ہے: آیا یہ کہ وہ وقتِ سفر نبی ﷺ کی زیارت کا قصد کرے یا مسجد نبوی کی بھی، جبکہ وہابیوں کا عقیدہ ہے کہ مدینہ کا سفر کرنے والا صرف مسجد نبوی کا قصد کرے۔''

جواب:...... عندنا و عند مشائخنا زيارة قبر سيد المرسلين "روحی فداه" من أعظم القربات و أهم المثوبات و الحج لنيل الدرجات ، بل قريبة من الواجبات و إن كان حصوله بشد الرحال و بذل المهج و الأموال دينوى وقت الارتحال زيارته عليه الف الف تحية و سلام و ينوى معها زيارة مسجده ﷺ و غيره من البقاع و المشاهد الشريفة ، بل الأولى ما قال العلامة الهمام ابن الهمام أن يجرد النية لزيارة قبره ﷺ ...... و يوافق ذلك قوله ﷺ: من جاء نی زائرا لا تُعمِلُه حاجة إلا زيارتی كان حقا علیَّ أن أكون له شفيعا يوم القيامة ، و كذا نُقِل عن العارف السامی الملاجامی أنه أفرد الزيارة عن الحج و هو أقرب إلى مذهب المحبين .

''ہمارے اور ہمارے مشائخ کے نزدیک رسولوں کے سردار کی قبر کی زیارت، میری جان آپ پر فدا اعلیٰ درجہ کی قربت، اہم ترین ثواب اور حصول درجات کا سبب ہے، بلکہ واجب کے قریب ہے، اگر چہ اس کا حصول کجاوا کس کر اور جان و مال قربان کر کے ممکن ہو اور بوقت سفر زائر آپ کی زیارت کا قصد و ارادہ کرے، آپ پر لاکھوں تحیہ وسلام اور اسی کے ساتھ آپ کی مسجد اور دوسرے مقامات و آثار متبرکہ کی زیارت کی بھی نیت کر لے، بلکہ اولیٰ یہ ہے جیسا کہ ہمام ابن ہمام نے فرمایا ہے کہ اپنی نیت نبی علیہ السلام کی قبر کی زیارت کے لیے خالص کر لے ...... یہ چیز نبی ﷺ کے اس ارشاد کے مطابق ہے: ''جو میری زیارت کے لیے میرے پاس آئے، میری زیارت کے سوا اس کی کوئی اور غرض نہ ہو، تو میرے اوپر یہ واجب ہے کہ بروز قیامت میں اس کے لیے شفاعت کرنے والا بنوں۔'' اور ایسا ہی بلند مرتبہ عارف ملا جامی سے منقول ہے کہ انہوں نے زیارت کو حج سے علیحدہ کر کے سفر کیا اور یہی طرز عمل محبین کے مسلک کے زیادہ قریب ہے۔'' [1]

---

[1] ص: ۳۵-۳۶

Marfat.com

مقام عبرت:

۱۔ مقامِ عبرت ہے کہ ایک فخر المحدثین اور زبدۃ المحدثین سفر مدینہ کے موقع پر مسجد نبوی کی زیارت کو قبر مبارک کی زیارت کے تابع قرار دے رہا ہے، جبکہ مسجد نبوی میں نماز کی فضیلت منصوص ہے اور وہ ان تین مسجدوں میں سے ایک بھی ہے جن میں نماز پڑھنے کی نیت سے سفر کو جائز قرار دیا گیا ہے، جبکہ مخصوص طور پر قبر مبارک کی زیارت کے جواز پر دلالت کرنے والی کوئی ایک حدیث بھی نہیں ہے، حسن ہی درجے کی سہی۔

۲۔ فخر المحدثین اپنے دعویٰ کی دلیل ایک ایسی روایت کو بتا رہا ہے جو اپنی سند اور متن کے منکر ہونے کے علاوہ ''قبر کی زیارت'' کے ذکر سے خاموش ہے اور اس کی زبان اور اسلوب بیان بصراحت اس امر پر دلالت کر رہا ہے کہ اس میں ''زیارت'' سے مراد نبی ﷺ سے شرف ملاقات ہے۔

۳۔ ایک دیانت دار محدث کی دیانت داری ملاحظہ ہو کہ اس کو اپنے دعویٰ کے حق میں خود اپنے مسلک کے قدیم فقہاء میں سے کسی کا قول نہیں ملا اور اس نے دور تعصب کے ایک فقیہ محمد بن عبدالواحد بن ہمام متوفی ۸۶۱ھ کے قول اور ایک غالی صوفی ملا جامی کے عمل سے استدلال کرنے سے بھی خجالت نہیں محسوس کی۔

۴۔ ایک دوسرے صوفی بزرگ جن کے نام سے پہلے امام، محدث اور قطب الارشاد لکھا جاتا ہے، یعنی مولانا محمد زکریا صاحب اپنی کتاب فضائل اعمال کے فضائل حج کے تحت تحریر فرماتے ہیں:

> ''ملا علی قاری جو مشہور عالم فقیہ محدث حنفی ہیں، انہوں نے لکھا ہے: چند حضرات کے علاوہ جن کا خلاف کچھ معتبر نہیں بالاتفاق تمام مسلمانوں کے نزدیک حضور اقدس ﷺ کی زیارت اہم ترین نیکیوں میں ہے اور افضل ترین عبادات میں ہے اور اعلیٰ درجات تک پہنچنے کے لیے کامیاب ذریعہ اور پُرامید وسیلہ ہے اور اس کا درجہ واجبات کے قریب ہے، بلکہ بعض علماء نے واجب کہا ہے اس شخص کے لیے جس میں وہاں حاضری کی وسعت ہو۔'' ❶

افسوس ہے کہ اتنے بڑے بڑے القاب کے حامل مولانا زکریا نے اس مختصر سی عبارت میں جتنے دعوے کیے ہیں سب جھوٹ ہیں:

۱۔ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی ''قبر مبارک کی زیارت'' کی جگہ حضور اقدس کی زیارت کی جو تعبیر اختیار کی ہے اور مراد قبر کی زیارت لی ہے تو یہ غلط ہے؛ نبی ﷺ کی زیارت، آپ کی قبر مبارک کی زیارت ہرگز نہیں، آپ کی زیارت سے مراد آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر آپ سے شرف ملاقات حاصل کرنا ہے، جو آپ کے وفات پا جانے کی وجہ سے ناممکن اور محال ہے، لہٰذا آپ کی قبر کی زیارت، آپ کی نہیں، آپ کی قبر کی زیارت ہے۔ کتاب

❶ ص: ۹۲

Marfat.com

وسنت سے بصراحت ثابت آپ کی وفات کے انکار اور اس باطل عقیدہ سے کہ قبر مبارک میں آپ کو دنیوی زندگی حاصل ہے حقیقت نہیں بدل سکتی اور قبر مبارک کی زیارت پر ''آپ کی زیارت'' کا اطلاق درست نہیں ہوسکتا۔

۲۔ رسول اللہ ﷺ کی حیات پاک میں بحالت ایمان آپ کی زیارت کرنے والا یا آپ سے ملاقات کرنے والا ''صحابی'' کہلاتا ہے، جو انبیاء (۲۸) کے بعد اس زمین پر بسنے والے سب سے مقدس گروہ: ''صحابہ'' کا ایک فرد تھا اور ۱۱۰ھ میں وفات پانے والے آخری صحابی ابوطفیل عامر بن واثلہ اس مقدس جماعت کی آخری کڑی تھے اور صحابہ کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

((لا تسبوا أصحابی ، فلو أن أحدكم أنفق مثل أُحُد ذهبا ما بلغ مُدَّ أحدهم و لا نصيفه))

''تم میرے اصحاب کو برامت کہنا، کیونکہ اگر تم میں سے کوئی احد پہاڑ کے برابر بھی سونا اللہ کی راہ میں خرچ کر دے تو اس کا ثواب صحابہ کے خرچ کیے ہوئے ایک مُد یا آدھے مُد کے برابر نہیں ہوسکتا۔''[1]

جبکہ قبر مبارک کی زیارت کرنے والا، اگر صحیح العقیدہ ہے تو عام مسلمان ہے اور اس زیارت سے اس کے درجات میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا، اور یہ بھی اس صورت میں جب وہ مسجد نبوی میں نماز پڑھنے کی نیت سے باہر سے وہاں گیا ہو اور مسجد نبوی میں اپنی موجودگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے نبی ﷺ کی قبر اور صاحبین کی قبروں کی زیارت کر لے اور درود و سلام پڑھنے پر اکتفا کرے اور اس زیارت کی کسی فضیلت کا اعتقاد نہ رکھے، تو قبروں کی زیارت کی جو اجازت نبی ﷺ نے دی ہے اس کی رو سے وہ ایک جائز فعل کرنے والا شمار ہوگا، لیکن اگر اس نے نبی ﷺ کی قبر مبارک کی زیارت آپ کی تعظیم و توقیر، قبر مبارک میں آپ کی حیات دنیوی کے اعتقاد اور آپ کو اللہ تعالیٰ کی کسی بھی صفت سے موصوف ماننے کے عقیدہ سے کیا ہے تو اسلامی نقطۂ نظر سے اس نے ایک غیر مشروع فعل کا ارتکاب کیا ہے جس کی شاہد وہ دسیوں صحیح احادیث ہیں، جن میں بعض کا ذکر گزشتہ صفحات میں آچکا ہے۔

۳۔ مسجد نبوی میں نماز پڑھنے کی نیت سے، جس کی فضیلت منصوص ہے مدینہ سفر کرنے والے کے لیے قبر مبارک کی زیارت کے صرف جواز کے قائل تمام صحابہ، تمام تابعین، تمام ائمہ اربعہ اور تمام محدثین ہیں، ان کا ذکر ''چند حضرات'' سے کرنا مسلمانوں کو گمراہ کرنا ہے اور ''زیارت'' کے اہم ترین نیکیوں اور افضل ترین عبادات'' میں ہونے پر تمام مسلمانوں کے اتفاق کا دعویٰ ''مکابرہ'' ہے، کیونکہ اگر آپ اپنے ان دعاوی میں سچے ہوتے اور واقعتا تمام مسلمانوں کے نزدیک قبر مبارک کی زیارت ''اہم ترین نیکیوں اور افضل ترین عبادات میں ہوتی'' تو آپ متقدمین علمائے احناف، محدثین اور فقہاء میں سے کسی کے قول کو اپنے ان دعاوی پر دلیل بناتے، مگر چونکہ ایسا کرنا آپ

[1] بخاری: ۳۶۷۳۔ مسلم: ۲۵۴۱

Marfat.com

کے لیے جوئے شیر لانے کے مترادف تھا، اس لیے آپ نے ''فضائل اعمال'' کے دین سے ناواقف اور نابلد قارئین کو دھوکے میں رکھنے کے لیے اپنے ان دعاوی کی بنیاد ایک ایسے حنفی صوفی کے ''بے دلیل'' قول پر رکھی جس کی وفات ۱۰۱۴ھ میں ہوئی ہے۔

۴۔ رسول اللہ ﷺ کی تعظیم وتوقیر اور آپ سے محبت، آپ کی بے چون و چرا پیروی اور آپ کے احکام کی برضا و رغبت اطاعت سے عبارت ہے اور رسول اللہ ﷺ کی قبر مبارک کی زیارت اگر اتنی ہی اہم ہوتی جتنی آپ نے دکھانے کی سعی لا حاصل کی ہے تو جس طرح رسول اللہ ﷺ نے اپنی قبر کو اجتماع گاہ، جشن گاہ بنانے اور اس کے پاس میلہ لگانے سے منع فرمایا ہے اور یہ فرما کر یہود ونصاریٰ پر لعنت بھیجی ہے کہ:

((قاتل اللہ الیهود و النصاری اتخذوا قبور انبیائهم مساجد))

''اللہ یہود ونصاری کو غارت کرے جنہوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو سجدہ گاہیں بنالیا ہے۔'' ❶

اسی طرح اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کرنے کے بعد اس دنیا سے رسول اللہ ﷺ کی رحلت ہوئی ہے کہ: اے اللہ تو میری قبر کو بت بنائے جانے سے محفوظ رکھ۔ ❷ اور اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کی دعا کو شرف قبولیت سے نوازا اور آپ کی قبر کو بت بنائے جانے سے محفوظ رکھا۔

اگر نبی ﷺ کی قبر مبارک کی زیارت اہم ترین نیکیوں اور افضل ترین عبادات میں سے ایک ہوتی تو ایک ہی بار سہی آپ نے اسے بیان فرما دیا ہوتا، کیونکہ ایسا کرنا آپ کے فرائض منصبی میں داخل تھا۔

۵۔ نبی کریم ﷺ کے ارشادات کو ماخذ شریعت مانتے ہوئے جو اہل حق اور توحید کے داعی یہ کہتے ہیں کہ قبر مبارک کی زیارت عام قبروں کی زیارت کے حکم میں داخل ہونے کی وجہ سے صرف جائز ہے اور جس طرح عام قبروں کی زیارت کے لیے سفر کرنا جائز نہیں اسی طرح اس کی زیارت کے لیے بھی سفر جائز نہیں ایسے حق پرستوں کو ''وہابی'' کا لقب دے کر بدنام کرنا کیا مشرکین کے اس قول کے مانند نہیں ہے جو وہ رسول اللہ ﷺ کے حق میں کہتے تھے کہ:

﴿أَجَعَلَ الْآلِهَةَ إِلَٰهًا وَاحِدًا إِنَّ هَٰذَا لَشَيْءٌ عُجَابٌ﴾ (ص: ۵)

''کیا اس نے سارے معبودوں کو ایک معبود بنا دیا درحقیقت یہ تو بڑی عجیب بات ہے۔''

---

❶ بخاری، ۴۳۷۔ مسلم: ۵۳۰ ❷ مسند: ۷۳۵۸

Marfat.com